www.paksociety.com

سرگزشت
15 — **سودیشی لکھاری** — ادارہ
ایک صفحہ میں مکمل، مختصر مختصر ایک نادر روزگار کا تعارف

گفت و شنید
16 — **شہرِ خیال** — مدیر اعلیٰ
آپ کی باتیں آپ کے خیال آپ کے مشورے اور آپ کے سوال

شخصیات
24 — **پیش گو** — ڈاکٹر ساجد امجد
ایک صاحبِ کمال نجی کا زندگی نامہ آپ پیش گوئی کے ماہر تھے

زندگی نامہ
51 — **استنبول کا عاشق** — ابن کبیر
نوبل پرائز حاصل کرنے والے ایک مسلمان مصنف کی کتھا

واقعاتِ عالم
71 — **جنونِ آزادی** — سلیم فاروقی
آزادی حاصل کرنے کی چاہ میں وہ زندگی کو داؤ پر لگا رہا تھا

بقیہ واقعات
88 — **باربی ڈول** — محمد اختر
اس کے حسن فسوں ساز نے نوجوان نسل کو پاگل بنا دیا تھا

جنگ عظیم
123 — **خطرناک مہم** — ڈاکٹر عبدالرب بھٹی
انسان اگر ٹھان لے تو ناممکن مہم بھی آسان ہو جاتی ہے

تاریخی جھوٹ
135 — **راگ کی آگ** — یعقوب جمیل
تان سین سے جڑی ایک مفروضہ روایت، دلچسپ پیرائے میں

فلم و صحافت
147 — **فلمی الف لیلہ** — علی سفیان آفاقی
فلم صحافت اور ادب کی ان کہی کہانیاں فلم نگری کی باتیں یادیں

روداد زندگی
167 — **مقدر کی بات** — تنویر ریاض
بالی ووڈ کے ایک لیجنڈ شاعر و کہانی کار کی سرگزشت

معلومات
175 — **سینٹ لوجی** — محمد امجد
ایک پُراسرار مذہب کا تذکرہ جو تیزی سے پھیل رہا ہے

ایمان افروز
179 — **شہید مرتے نہیں** — زین مہدی
ڈیڑھ سو سال بعد بھی ان کی لاشیں تر و تازہ ہیں

معاشرت
184 — **سراب** — کاشف زبیر
بلند حوصلوں اور بے مثل ولولوں سے گندھی تہلکہ خیز داستان

شعر و ادب
221 — **بیت بازی** — قارئین
شعر و ادب سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے ایک دلچسپ سلسلہ

مقابلہ
224 — **علمی آزمائش** — ادارہ
ذہین قارئین کے ذوقِ جستجو کی تسکین کے لیے انعامی سلسلہ

پہلی سچ بیانی
226 — **انتقام** — طلعت
منگیتر کا پیار ٹھکراتے وقت یہ نہیں سوچا تھا کہ نتیجہ اتنا بھیانک نکلے گا

دوسری سچ بیانی
238 — **ڈھول بھرا سناٹا** — انور علی
اس نے جو کھڈا کھودا تھا اس میں اس کی زندگی گر پڑی

تیسری سچ بیانی
252 — **دوسری شادی** — نوید احسن
ایک بدقماش شخص کی عیاری و مکاری کا تذکرہ

چوتھی سچ بیانی
257 — **اپیل** — محمد سلیم اختر
ایک گھر سے دوسرے گھر تک ہم سب ایک نادیدہ ڈور میں بندھے ہیں

پانچویں سچ بیانی
260 — **بلف** — محمد طفیل
چور پر کبھی کبھی مور پڑ جاتے ہیں، ایک ایسا ہی واقعہ

چھٹی سچ بیانی
265 — **کمبل** — انصار حسین
وہ لڑکی پسند کر کے مصیبت میں پھنس گیا ہے

ساتویں سچ بیانی
269 — **بے گناہ گنہگار** — شہزاد حسین زاہد
ایک قابلِ قدر جج کی زندگی کا اچھوتا واقعہ

آٹھویں سچ بیانی
273 — **گہرا کنواں** — بانو
وہ شوہر پرست تھی مگر شوہر کی قاتلہ بن گئی

نویں سچ بیانی
285 — **ٹوٹے رشتے** — کوثر
اس نے شوہر کو قتل کر کے بچوں کی زندگی میں خوشیاں بھر دیں

ماہ نامہ سرگزشت میں شائع ہونے والی ہر تحریر کے جملہ حقوقِ طبع و نقل بحق ادارہ محفوظ ہیں، کسی بھی فرد یا ادارے کے لئے اس کے کسی بھی حصے کی اشاعت یا کسی بھی طرح کے استعمال سے پہلے تحریری اجازت لینا ضروری ہے۔ بصورتِ دیگر ادارہ قانونی چارہ جوئی کا حق رکھتا ہے۔

● تمام اشتہارات نیک نیتی کی بنیاد پر شائع کیے جاتے ہیں۔ ادارہ اس معاملے میں کسی بھی طرح ذمے دار نہ ہوگا۔

قرآن حکیم کی مقدس آیات و احادیث نبوی آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور تبلیغ کے لئے شائع کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے لہذا جن صفحات پر آیات درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بے حرمتی سے محفوظ رکھیں۔

www.Paksociety.com

جلد 22 ❖ شمارہ 07 ❖ مئی 2012ء

ماہنامہ سرگزشت کراچی

مدیرِ اعلیٰ : عذرا رسول

مصور : شاہد حسین

شعبۂ اشتہارات

منیجر اشتہارات محمد شہزاد خان 0333-2256789

نمائندہ کراچی محمد رمضان خان 0333-2168391

رانا محمد حمید 0323-2695528

نمائندہ لاہور افراز علی ہاشمی 0300-4214400

◆◆◆

قیمت فی پرچہ 50 روپے ❖ زرِ سالانہ 600 روپے

پبلشر و پروپرائٹر: عذرا رسول

مقامِ اشاعت: C-63 فیز II ایکسٹینشن ڈیفنس کمرشل ایریا مین کورنگی روڈ کراچی 75500

پرنٹر: جمیل حسن

مطبوعہ: ابن حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی

خط کتابت کا پتا ● پوسٹ بکس نمبر 982 کراچی 74200

Phone :35804200 Fax :35802551
E-mail: jdpgroup@hotmail.com

MEMBER APNS CPNE

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

قارئین کرام!

السلام علیکم!

لوڈشیڈنگ ایک ایسا مسئلہ ہے جو ہمیں تباہی کی جانب لے جارہا ہے۔ صنعتیں بند ہونے لگی ہیں۔ اندھیرے اور گرمی سے پریشان لوگ سڑکوں پر آنے لگے ہیں۔ مظاہرے پُرتشدد شکل اختیار کرنے لگے ہیں۔ بے روزگاری بڑھ رہی ہے اور بے روزگار جرم کی جانب بڑھنے لگے ہیں۔ گویا ملک کو ایک خاص جانب دھکیلنے کی سازش ہے۔ اس پر میڈیا کا کردار، ایک ٹی وی چینل نے تو قیامِ پاکستان کے مخالف مولانا ابوالکلام آزاد کی تقاریر اور ان کی کتابوں سے اقتباسات بھی نشر کرنا شروع کر دیے ہیں جس میں مولانا نے قیامِ پاکستان کی مخالفت مکمل کر کی تھی۔ گویا نئے اذہان میں پُرانا زہر منتقل کرنے کی کوشش ہے۔ ایک ایسے وقت میں جب عوام گوناں گو مسائل سے دوچار ہیں، مسائل بھی ایسے کہ انسان مایوسی کی اتھاہ گہرائیوں میں گر جائے۔ زندگی سے مایوس کرنے کے لیے مسائل کا انبار تو ہے ہی ساتھ میں دہشت گردی بھی عروج پر ہے جو مزید مایوسی پھیلا رہی ہے۔ شہر کوئٹہ کو ہی لے لیں۔ وہاں اس قبیلے کو مسلسل نشانہ بنایا جارہا ہے جو افواجِ پاکستان میں شمولیت کے اعتبار سے بہت اہمیت کا حامل ہے۔ جنرل موسیٰ خان سے محمد علی حیدری شہید تک بہت بڑی تعداد میں نامور افسران اسی قبیلے کے تھے۔ گویا اس قبیلے کو برگشتہ کر کے افواج کو زک پہنچانا مقصود ہے اسی طرح صدیوں سے امن کی سرزمین گلگت، بلتستان کے امن کو تہ و بالا کر کے وہاں والوں کی سوچ کو منفی رُخ پر موڑنے کی سازش ہو رہی ہے جبکہ ہر ایک اس مسئلے سے آگاہ ہے کہ وہ علاقہ دفاعی اعتبار سے اہمیت کا حامل ہے اور صرف ایک سڑک کے ذریعے ملک کے دیگر شہروں سے جڑا ہوا ہے جبکہ سرحد کی دوسری جانب کارگل ولداخ کا علاقہ ہے جو انتہائی حساس ہے اور ہمارا دیرینہ دشمن بڑی آسانی سے وہاں شورش کو ہوا دے سکتا ہے۔ یہ تمام مسائل دیکھنے میں الگ نظر آتے ہیں مگر بہ غور دیکھیں تو تانے بانے ایک جیسے ہیں کہ پاکستان کو مسائل میں اُلجھا کر عوام میں مایوسی پیدا کی جائے۔ اس لیے ضرورت اس امر کی ہے کہ ان پر فی الفور قابو پایا جائے۔ امن و آشتی، اخوت و محبت کو بڑھاوا دیا جائے۔ اس کے لیے خود عوام کو آگے آنا ہوگا۔ عوام کو مضبوط کرنے کے لیے قانون نافذ کرنے والے اداروں کو اپنا کردار نبھانا ہوگا تاکہ جرائم پیشہ کمزور سے کمزور ہوتے جائیں۔ قانون شکنی کا کسی کے پاس حوصلہ نہ رہے۔ ایک کنڈا لگانے والا بھی گھنٹوں سوچے کہ اس کی سزا ملے گی ورنہ منفی سوچ پروان چڑھتی ہی رہے گی بہ قول جاذب قریشی

پتھروں کا ہے سامنا مجھ کو
اے میرے چہرہ گر بچا مجھ کو

معراج رسول

سودیشی لکھاری

سرگزشت

بندرابن شہر کے ایک کوتوال تھے۔ نام ان کا منشی صدیق احمد تھا۔ اولاد کے لیے ترستے تھے۔ بڑی منتوں مرادوں کے بعد بیگم کے پاؤں بھاری ہوئے۔ اس وقت تک شادی کو پورے بارہ برس ہو چکے تھے۔ اتنے دنوں کے بعد خوشی کی نوید تو ملی مگر سنبھلی نہیں تھی۔ جب ولادت کا وقت قریب آیا تو چراغاں کروا دیا۔ پیدا ہوئی تو لڑکی۔ خاندان والوں نے ناک بھوں چڑھائی مگر صدیق احمد خوش تھے کہ گود تو ہری ہوئی۔ وقت گزرتا رہا۔ پھر پورے چار سال بعد 2 فروری 1904ء کی تاریخ آ گئی۔ اس روز گھر والوں کی خوشی دیدنی تھی۔ نٹوں نے کرتب دکھانے کی محفل سجائی، بھانڈوں نے ڈھول سنبھال لیے، سپاہیوں نے گولے داغے۔ صدیق احمد نے پورے شہر میں مٹھائی تقسیم کرنے کا اعلان کرا دیا۔ خوب خوب خوشیاں منائی جانے لگیں۔ بچے کا تاریخی نام عقیقہ والے دن تسخیر احمد رکھا گیا مگر اصل نام محمد عمر تجویز ہوا۔ بچہ پیدائشی طور پر کمزور تھا اس لیے ہر روز ایک نہ ایک بیماری گھیرے رہتی۔ دروازے پر وید و حکیم کا ڈیرا لگا رہتا۔ بیماریوں کی یلغار کو مدِنظر رکھتے ہوئے طبیبوں نے سخت پرہیز کا مشورہ دیا۔ ابھی عمر صرف سات سال تھی کہ زبردستی کی فاقہ کشی نے پہلا شعر کہلوا دیا۔

نہ دانا نہ پانی میں کس سے کہوں
ارے میرے اللہ میں اب کیا کروں

صدیق احمد تھے تو مظفرنگر ضلع کے تھانہ بھون نامی علاقے کے مگر نوکری کی خاطر نگر نگر گھومتے رہے تھے۔ بندرا سے بھوپال آ گئے۔ یہاں رہتے ہوئے بچے کی تعلیم کا خیال آیا اور فوراً ماسٹر کی تلاش شروع ہو گئی۔ ماسٹر صاحب آئے، انہوں نے مولوی محمد اسماعیل میرٹھی کی کتاب کو رٹوانا شروع کرایا۔ اتفاقاً ایک دن صدیق احمد نے آموختہ سن لیا۔ غلط تلفظ پر چراغ پا ہو گئے اور ماسٹر صاحب کی چھٹی ہو گئی۔ ایک دوسرے ماسٹر کو ڈھونڈا گیا۔ وہ ذرا مزاج کے سخت تھے اور بچوں کی پٹائی میں بہت آگے تھے۔ ان کی بھی چھٹی کر دی گئی، اب ایک تیسرے ماسٹر کو بلایا گیا۔ نام ان کا میر امجد علی، چھوٹا سا قد، ناک کی پھننگی پر روپہلی عینک منہ میں دو چار دانت باقی پان۔ جیب میں گھڑی اور گھڑی کی زنجیر میں لٹکا قطب نما تھا۔ ان کے پڑھانے کا انداز کچھ یوں تھا۔ آرا ے ٹی، ریٹ۔ ریٹ معنی چوہا۔ اتنا کہا اور غنودگی میں چلے گئے۔ اونگھنے، پڑھانے کا یہ سلسلہ بھی زیادہ طویل ثابت نہ ہوا اور ان کی بھی چھٹی کر دی گئی۔ پھر الیگزینڈر ہائی اسکول کے جماعت اطفال میں داخلہ دلا دیا گیا۔ سیاہ شیروانی اور نیلے صافے میں ایک سپاہی کے ساتھ اسکول جاتا پھر ایک دوسرا سپاہی ٹفن کیریئر میں کھانا لے آتا۔ 1914ء میں صدیق احمد بھوپال کی نوکری چھوڑ کر لکھنؤ آ گئے۔ لکھنؤ پہنچ کر محمد عمر کو مدرسہ فرقانیہ میں بٹھا دیا گیا مگر یہاں آ کر دینی تعلیم میں دلچسپی کم اور غیر نصابی سرگرمیوں میں زیادہ حصہ لینے لگے۔ ماسٹر پیارے لال نے انگریزی اور حساب کی تعلیم دی پھر مولانا عبدالرحیم کلیم کے سپرد کیا گیا۔ انہوں نے فارسی میں طاق کر دیا۔ پھر لال اسکول میں خالو مدن کے سہارے چوتھی جماعت میں داخلہ دلوایا گیا اور وہاں سے گورنمنٹ ہائی اسکول حسین آباد آ گئے۔ گھر پر ٹیوشن کے لیے جونپور کے بخشش احمد رکھے گئے۔ ان کی کوشش سے محمد عمر نے تعلیم میں دلچسپی لینا شروع کر دی۔ اسی دوران بھائی جان ارشد تھانوی لکھنؤ تشریف لائے تو ماسٹر بخشش احمد نے ذکر کر دیا کہ ہمارا شاگرد شاعری بھی کر سکتا ہے۔ انہوں نے مصرع طرح دے دیا ”سب چاند ستارے ماند ہوئے خورشید کا نور ظہور ہوا“ اور کہا کہ اس پر گرہ لگاؤ۔ عمر احمد نے شعر کہہ دیا ”سب چاند ستارے ماند ہوئے، خورشید کا نور ظہور ہوا۔ غم ناک سیاہی رات کی تھی اب اس کا اندھیرا دور ہوا“ بھائی جان نے خوشی سے گلے لگا لیا۔ پھر تو شاعری کا چسکا لگ گیا اور ماہنامہ ”ترچھی نظر“ میں غزلیں بھیجنے لگے۔ افسانے بھی لکھنے لگے۔ 1924ء میں حکیم مولوی محمد سجاد حسین کی منجھلی صاحب زادی سے نکاح اس شرط پر ہوا کہ انٹر کے بعد رخصتی ہوگی۔ اسی زمانے میں علی گڑھ کالج میں داخلہ دلوایا گیا۔ ترچھی نظر امین سلونوی کی ادارت میں آ کر ”نظر“ بن چکا تھا اس کے ہر شمارے میں ایک نہ ایک تحریر ضرور ہوتی۔ اسی میں میٹھے چاول کے نام سے ایک مزاحیہ تحریر لکھ بھیجی جو بہت پسند کی گئی اور پھر یہ سلسلہ دراز ہوتا چلا گیا۔ ”ہمدم“ کی ادارت میں شامل ہوئے تو دو دو باتیں کے عنوان سے مزاحیہ کالم لکھنے لگے۔ ہمدم بند ہوا تو اودھ اخبار میں چلے گئے۔ 1931ء میں لکھنؤ سے ”سرپنچ“ خود نکالا، ان کے ساتھ امین سلونوی اور نسیم انہونوی بھی شامل تھے۔ پھر روزنامہ ہند میں آ گئے جہاں تنخواہ بھی زیادہ تھی۔ پھر روزنامہ حق میں چلے گئے۔ پھر آل انڈیا ریڈیو میں آ گئے۔ قیامِ پاکستان کے بعد کراچی تشریف لے آئے۔ اس مشہور زمانہ قلم کار محمد عمر جسے سودیشی ریل نے دنیا بھر میں مشہور کر دیا کو ہم شوکت تھانوی کے نام سے جانتے ہیں جنہوں نے مئی 1963ء کو اس جہانِ فانی سے کوچ کیا۔ □

www.Paksociety.com

شہرِ خیال

☒ راجا ثاقب نواز ثاقب، رتی ٹبی، ساہیوال سے ''اپریل کا سرگزشت ارتھ ڈے کے آس پاس ملا۔ بھری دنیا میں کوئی نہیں جو پاکستانی قوم کو ہر روز یہ دن پورے جوش و خروش سے منانے پر مبارک باد پیش کرے۔ ٹائٹل پر کسی ہمدم کی منگنی کی انگوٹھی بھول چوک سے رہ گئی ہے۔ نشانی ہتلا کر لے جائیں۔ سرزمینِ بنگال کے غالب، رضا علی وحشت کلکتوی سے ملاقات کی۔ محفل و ہتک میں رانا محمد سجاد ہمارے جمہوری صدر ٹھہرے۔ ناصر حسین رند سرگزشت اور سسپنس میں میری آمد، میرا کارنامہ نہیں بلکہ ان کا اعلیٰ معیار ہے جو دھڑلے سے مجبور کرتا ہے کہ ان کے بارے میں لکھا جائے (آپ کی محبت کا شکریہ) ایم اے خالد بھٹی، آپ کا مشورہ۔ کھالو، پی لو، خوب موج اُڑالو۔ یار میں سیاست دان تو نہیں ہوں۔ احمد خان توحیدی، علی مغل اور مظفر گڑھ سے ہماری دیرینہ ساتھی جویریہ قاضی نے متاثر کیا۔ معراج الدین، ویلکم جی، ویلکم۔ اور لیجیے صاحب، ہمارے خط کو ''او ایس ڈی'' کر دیا گیا (ہماری معذرت قبول فرمائیں) باربی ڈول میں تو محمد اختر نے جیسے جنیٹر لو ہیوٹ کے پورے حالاتِ زندگی کو کھنگال دیا۔ اختتامی حصے کا ابھی سے انتظار ہے۔ سفید سرزمین معلومات کا خزانہ تھی۔ نیا جنم قدرے طویل ہوئی۔ قوالی نے جھومنے پر مجبور کر دیا۔ عزم کی پیکر شرمین عبید چنائے نے فاخرہ کا دکھ تازہ کر دیا۔ بدقسمت ہیمنگ وے کے بارے میں اتنا ہی کہا جا سکتا ہے کہ شہرت کے ساتھ ساتھ بُرے نصیب نے بھی عمر بھر اس کا ساتھ نبھایا۔ ذرہ آدھی میں میدانِ جنگ میں کبھی نہ جھکنے والے منگولوں پر مکافاتِ عمل نے فتح پائی۔ بھگوان شکاری کا خاتمہ ہوا۔ ٹوپی ڈراما میں مصنف نے آخری سطور میں ہمارے سیاست دانوں کے بھی خوب لتے لیے ہیں۔ ہمت مرداں پڑھ کر لبوں سے بے اختیار نکلا، ہمت مرداں مددِ خدا۔ آفاقی صاحب کی بے حد کمی محسوس ہوئی (آفاقی صاحب کی جانب سے آپ سب کی محبت اور دعاؤں کا شکریہ) ٹائٹل پچ بچی میں فریدہ کے دھندلے ماضی نے چونکا دیا۔ بزنس از بزنس میں ابا نے آخری سودا بہت کمال کا کیا اور اپنی عاقبت سنواری۔ خالہ روشنا نے آنکھوں کے گوشوں کو نم کر دیا۔ سعید کوا میں شاہ ماموں تو ڈبل شاہ ثابت ہوئے۔ بے اماں میں فرازنہ نے اللہ بخشے سلطان راہی مرحوم کو ہمارے سامنے لاکھڑا کیا۔ ہتھیلی پر انگارہ کا ٹائٹل ہتھیلی پر سرسوں جمانا جیسا لگا۔ بانجھ میں شازیہ کی جان بال بال بچی۔ کاش میں عنبر کی روح کو تو قرار آ گیا مگر عرفان رضا مسلسل بے چینی کا شکار ہو گئے۔ آخری کہانی جدائی میں کہانی کی آڑ لے کر مصنف نے ہمیں آئینہ دکھانے کی متاثر کن کوشش کی ہے۔ سرگزشت کا عشق نا کام نمبر کی آمد بھی سسپنس بنتی جارہی ہے۔''

☒ سدرہ بانو ناگوری کا خلوص نامہ، کراچی سے ''اس دفعہ کا شمارہ 25 تاریخ تک مل گیا تھا لیکن آج یکم اپریل ہے، دل نہیں چاہتا ہے کہ کچھ پڑھیں، کچھ لکھیں۔ جب چاروں طرف آگ اور خون کی بارش ہو۔ ٹی وی کی اسکرین چیختی دھاڑتی ہیڈ لائنز سے بھری ہوں۔ موبائل پر بیڈ نیوز موصول ہوں تو بندہ ایسے میں کیا مطالعہ کرے، کیا پڑھے، جب گھر کے بڑے کام پر جائیں تو ان کے آنے کی منتظر آنکھیں دروازے پر اور کان موبائل فون کی گھنٹیوں پر ہوں تو کیونکر سرگزشت کو چھوا جائے، جبکہ جیتے مسکراتے لوگ خاک میں مل کر سرگزشت بنتے جارہے ہوں، گولیوں کی بوچھاڑ اس قدر ہو کہ چھت پر جانے اور سونے سے منع کر دیا جائے۔ بھائی گھر دوں سے باہر ہوں تو بہنوں کے آنچل دعاؤں کے لیے پھیلے رہیں، شوہر کام پر جائے تو سہاگن اپنے سہاگ کی خیر کی دعا مانگے، بچے اسکول سے لیٹ ہو جائیں تو ماں کا کلیجہ چھلنی ہونے کو آئے۔ تقریبات ماضی کا قصہ بننے لگیں تو کیا پڑھا جائے اور کیا لکھا جائے، سو شہرِ خیال کے باسیو! کراچی کے امن کی دعا کو اپنی دعاؤں میں شامل کر لینا کہ ہم اہلِ کراچی بارود کے ڈھیر پر بیٹھے ہیں، جانے کب کوئی چنگاری ہمیں بھی یادوں میں تبدیل کر دے۔'' (سدرہ بی بی! اللہ ہم سب کو اپنی امان میں رکھے، آمین۔ اللہ کی قدرت اور رحمت سے مایوس نہیں ہونا چاہیے اور ہم سب کو ''لاحول و لاقوۃ الاباللہ العلی العظیم'' کا ورد کرتے رہنا چاہیے کیونکہ اللہ سے بڑی کوئی طاقت نہیں اور وہی ہم سب کا حامی و ناصر ہے)

☒ اعجاز حسین سحار نے نور پور تھل سے لکھا ہے ''اس بار پرچا بروقت مل گیا ہے۔ پڑھنے اور لکھنے کے لیے وقت، ذہنی یکسوئی اور صحت کی خاصی اہمیت ہے۔ اس کے بعد تخلیق کا عمل شروع ہوتا ہے۔ یہ سب مرحلے بخیر و خوبی طے کرنے کے باوجود ڈاک تقسیم کرنے والے دوریاں پیدا کر رہے ہیں۔ میں نے بڑی محنت سے تبصرہ لکھا لیکن اس محکمہ کی غفلت کی وجہ سے چھپ نہ سکا جس کا مجھے سخت افسوس ہے۔ اس ماہ ہمارا پسندیدہ سلسلہ قلمی الف لیلہ پھر غائب ہے اس کے ساتھ ہی ہم بزرگ بھائی آفاقی صاحب کی صحت و تندرستی کے لیے دل سے دعا گو ہیں (جزاک اللہ) ''عزم کی پیکر'' پڑھ کر حیران رہ گیا ہوں۔

پاکستانی بچے اور بڑے کتنے کارنامے اور اعزازات سمیٹ رہے ہیں لیکن اپنے گھر میں ان کی قدر ہی نہیں ہے۔ پچھلے دنوں انبکہ کے ہائی اسکول کے طالب علم نے پوری دنیا سے ریاضی کا مقابلہ جیتا کہیں ان کا بھی ہم ارفع کریم جیسا انجام نہ کر دیں (اگر آپ سے ممکن ہو سکے تو اس بچے کی تصویر اور تعارف کے ساتھ بھجوائیں تو ہمیں شائع کر کے خوشی ہوگی) زندگی میں قدر نہیں کرتے اور مرنے کے بعد جلسے کر کے اور بیان دے کر اپنے جذبات کا اظہار کرتے ہیں۔ خدارا یہ بے حسی ترک کر دیں اور حالات کے مطابق سپورٹ کریں، یہی زندہ قوموں کا شیوہ ہے (درست فرمایا آپ نے) عنوان ''ٹی، وی، پی'' بہت اچھے انداز میں تحریر کی گئی ہے۔ مسعود کھدر پوش نے بھیلوں کی بود و باش اپنا کر انہیں اپنا اسیر بنا لیا۔ اس سلسلے کی کہانیوں کا ہمیں ہر ماہ انتظار رہتا ہے، امید ہے قارئین کا اس سے اولی مطالعہ کا شوق پورا ہوتا رہے گا (انشاء اللہ! ہم کوشش کریں گے کہ آپ کی پسند کے مطابق مضامین شائع کرتے رہیں) سراب میں واقعات بڑی روانی سے چل رہے ہیں۔ برٹ شا کی سرگوشی فتح خان نے نہ سنی ہوتی ورنہ شہباز کا قیام یہاں بڑھ سکتا ہے اور مشکلات سے بھی سامنا رہے گا۔ سچ بیانوں میں بہترین ''دھندلا ماضی'' معاشرتی کہانی ہے۔ فریدہ ضدی اور انا پرست عورت ہے لیکن وہ محض ایک انکشاف کے بعد ہی ڈھے گئی ورنہ ایک نئی کہانی جنم لیتی۔ عرفان کی ثابت قدمی اور بھرپور محبت نے رضوانہ کے قدم اُکھاڑ دیے تھے یوں کوئی المیہ جنم لیتا یا پھر کیا خبر حالات کیا رُخ اختیار کرتے اور کتنی ٹوٹ پھوٹ ہوتی، پھر انجام کا کچھ کہا نہیں جا سکتا تھا، یہ دونوں کی نیک نیتی کا پھل ہے کہ گھر کی چار دیواری کے اندر خوشیوں نے ڈیرے ڈال دیے ہیں جو لوگ جذبات سے کام لے کر شیطان کے بہکاوے میں آ جاتے ہیں، جب بھی ماضی سامنے آ کھڑا ہوتا ہے تو شرمندگی سے نظریں زمین پر گڑ جاتی ہیں اور فریدہ کی طرح ناپسندیدہ فیصلے کر کے مصالحت کی زندگی گزارنا پڑتی ہے لیکن یہی قدم انسانی ہمدردی اور سہارا دینے کے لیے اُٹھایا جائے تو آخرت کی منزل آسان بن جاتی ہے۔ بزنس از بزنس میں شروع میں بزرگ کا کیا کردار تھا، وہ قبروں کے کاروبار جیسا کریہہ کام کر رہے تھے۔ میں سمجھتا ہوں کہ عالیہ نے خود کو پیش کر کے دراصل ان کے اندر مردہ انسانیت کے جذبے کو جگانے کی کوشش کی تھی جس میں وہ کامیاب رہی۔ ''سعید کوا'' کے شاہ ماموں کا کردار نیا نہیں ہے، آج بھی عورتیں سونا ڈبل کرانے کے چکر میں اپنے حصے کے سونے سے ہاتھ دھو بیٹھتی ہیں (یہ صرف عورتوں ہی تک محدود نہیں، گزشتہ دنوں اخبارات میں ایک ایسے شخص کی روداد بھی شائع ہوئی جو سونے کی دیگ حاصل کرنے کے چکر میں ایک کروڑ روپے سے زائد رقم گنوا بیٹھا)'' بے اماں'' دلچسپ اور معاشرتی کہانی ہے، اس کا پلاٹ دیہاتی زندگی سے متعلق ہے اس لیے کردار، ماحول اور واقعات دیکھے بھالے لگے ہیں۔ ''ہتھیلی پر انگارہ'' میں وسیم پر ترس آتا ہے، انہوں نے بیوی بچوں کے لیے کیا کچھ نہ کیا، ہر سہولت اور آسائش فراہم کی، اس کے باوجود انہیں قابلِ نفرت جان کر گھر سے دربدر کر دیا گیا۔ ''کاش'' پڑھنے کے بعد یہ یقین ہونے لگا ہے کہ مظلوم ہونے کے ساتھ نیک روحیں کوئی بھی روپ دھار سکتی ہیں جیسے امبر نے اپنی لاش کی نشاندہی کی۔ ''جدائی'' میں کامران کی شوخی اور چٹنے مسکرانے کی عادت زیادہ قابلِ گرفت نہیں ہے۔ محفل میں سب دوستوں نے یاد کیا اور تبصرے کو سراہا جس کے لیے دلی شکریہ قبول فرمایئے۔ غلام یٰسین نوناری صاحب، میں ہر ماہ طویل تبصرہ لکھتا ہوں لیکن پالیسی کی قینچی اسے مختصر کر دیتی ہے۔'' (اگر ہم تراش خراش سے کام نہ لیں تو بہت سے خطوط جگہ پانے سے رہ جائیں)

☒ عبدالعزیز جی آنے چکوال سے لکھا ہے ''عشق ناکام نمبر کے اشتہار پر نظر پڑی، کیا ہی اچھا ہوتا کہ مہینا بھی لکھ دیتے۔ شہرِ خیال سے قبل معراج رسول صاحب کا ابتدائیہ اور غالب بنگالہ بھی پڑھا مگر جلدی جلدی قارئین کے خطوط پر آ کر بریک لگی۔ جی ہاں رانا محمد سجاد صاحب، صدارت کی کرسی پر براجمان تھے مگر تبصرہ بھی خوب لائے۔ باقی سب کے تبصرے بھی حسبِ معمول پسند آئے۔ کہانیوں میں باربی ڈول کی پہلی قسط بالکل پسند نہ آئی۔ اس سے اگلی اسٹوری سفید سرزمین پڑھی، معلوماتی تحریر تھی، گڈ طارق عزیز خان۔ آرٹ کی دنیا میں محمد عفان آزاد کی کہانی نیا جنم بھی کوئی خاص تاثر نہ چھوڑ سکی۔ مختار آزاد کی کہانی قوالی بہت پسند آئی۔ عزم کا پیکر قوم کی بیٹی، جس کا نام پوری کہانی میں کہیں شامل نہیں کیا گیا (سرگزشت عام ڈائجسٹوں سے مختلف مزاج کا ہے اور اس میں شامل تحریریں اعلیٰ انداز کی ہوتی ہیں۔ یہی اس تحریر کی انفرادیت ہے کہ پوری کہانی بیان کر دی مگر کردار کا نام شامل نہیں کیا گیا پھر بھی قاری سمجھ گیا کہ یہ کہانی کس کی ہے۔ ہمارے خیال سے آپ غیر ملکی تحریریں نہیں پڑھتے ورنہ یہ شکایت آپ کو نہ ہوتی۔ اعلیٰ معیار کی تحریریں ضرور پڑھا کریں تاکہ نئے انداز تحریر سے واقفیت ہوتی رہے)'' بدقسمت'' بہت پسند آئی اور آخری دس کہانیاں ہی دراصل رسالے کی جان ہوتی ہیں۔ محترم، میں نے آپ کو ایک نظم ارسال کی تھی، اس کا کیا بنا؟'' (آپ کسی اچھے شاعر سے جو تختی کا ماہر ہو، اس سے اوزان و بحور پر صلاح مشورہ کر لیا کریں)

☒ ظہیر احمد تبسم، کراچی سے ''معراج صاحب ڈھیروں دعائیں وسلام۔ آپ کا شکریہ، آپ نے میرا خط شیخ الطاف صاحب کو ای میل کر دیا، ان کا کوئی جواب نہیں آیا، میں نے یہ عرض کرنا تھا کہ طاہر جاوید مغل صاحب کی میں بہت فین ہوں ان کی ہر تحریر اپنی مثال آپ ہوتی ہے۔ اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ۔ میرا خیال ہے کہ للکار ختم ہونے کے قریب ہے (یہ اندازہ آپ کو کیونکر ہوا، للکار کا تو ابھی درمیان بھی نہیں آیا) ان سے کہیے کہ سسپنس کے لیے بہت خوبصورت ناول تیار رکھیں (اس ماہ سسپنس میں ان کی ایک مختصر مگر دلچسپ کہانی شامل ہے۔ انشاء اللہ جلد وہ آخری صفحات کے لیے بھی تحریر کریں گے) دوسری بات یہ کہ سرگزشت میں اشفاق احمد سرکی خیر پور میرس سے لکھتے ہیں کہ آپ کو پُرانے سرگزشت کی ضرورت ہے، میرے پاس کافی سرگزشت ہیں۔ آپ ان کا ایڈریس دے دیں، مہربانی ہوگی۔'' (اشفاق صاحب، آپ مکمل پتا ہمیں بھجوا دیں)

☒ سعید احمد چاند، کراچی سے لکھتے ہیں ''بعد سلام عرض ہے کہ پرچا حسبِ معمول لیٹ۔ اب اتنے کم وقت میں کیا لکھیں اور کیا پڑھیں۔ غضب تو یہ ہے کہ ہمارا نام دیر سے آنے والوں کی فہرست میں بھی نہیں ہوتا۔ اس مہنگائی کے دور میں تقریباً 60 روپے خرچ کرنا فضول سا لگتا ہے مگر دل ہے

کہ ماننا نہیں، پرانے قارئین کی یاد پھر اسے خریدنے پر مجبور کردیتی ہے۔ اتنے عرصے سے سرگزشت سے وابستہ رہنے کے بعد اب اس سے چھٹکارا بھی مشکل ہے۔ ہم ڈاکٹر روبی کا مزاج بھی نہیں رکھتے کہ ایک حاضری کے بعد مہینوں شکل ہی نہیں دکھاتیں۔ ناصر حسین رند، غلام حسین لوناری، ایم اے خالق بھٹی، جویریہ قاضی، معراج الدین کا شکریہ جو انہوں نے مجھے یاد رکھا۔ آفاقی صاحب کی بیماری کا پڑھ کر افسوس ہوا، خدا انہیں شفا عطا فرمائے۔ یعقوب جمیل صاحب بھی ساتھ چھوڑ گئے۔ ثمی کیور کی آپ بیتی واقعی مختصر تھی۔ اگر اس آپ بیتی کو یعقوب جمیل لکھتے تو چار چاند لگ جاتے مگر پھر بھی غنیمت تھی۔ ہمارے ملک میں ٹیلنٹ کی کمی نہیں مگر ڈھونڈنے والی آنکھ چاہیے۔ ڈاکٹر روبی یا تو بہت معروف ہیں یا اپنی دوسری مصروفیات کی وجہ سے شاید وقت نہیں نکال پارہی ہیں۔ نہ وہ بیت بازی میں نظر آتی ہیں اور نہ ہی شہرِ خیال میں۔ اس دفعہ جن قارئین کے تبصرے پسند آئے وہ یہ ہیں۔ رانا محمد سجاد، رانا محمد شاہد، ناصر حسین رند، غلام حسین نانوری، معراج الدین، مہوش رفیق، ایم اے خالق بھٹی، احمد خان تو حیدی، منظر علی خان، جام اکبر علی ماہڑہ، ملک ثاقب شاد تنولی، جویریہ قاضی، سدرہ بانو نا گوری، ملک جاوید محمد خان سرکانی درانی، طاہرہ صوابی، علی مغل۔ جو مضمون پسند آئے، وہ یہ ہیں۔ کاشف زبیر کا ''سراب'' طیبہ شیریں مصطفیٰ کا ''عکس ماضی'' محمد منور کا ''سفید کوا'' فراز خان کا ''بے اماں'' عرفان رضا کا ''کاش'' اختر قزلباش کی ''جدائی'' باقی زیرِ مطالعہ ہیں۔ میں دل سے آفاقی صاحب کی صحت کے لیے دعاگو ہوں۔''

✉ **ملک ثاقب شاد تنولی**، ضلع ایبٹ آباد سے لکھتے ہیں ''اپریل کا سرگزشت یکم اپریل کو فیصل ٹاؤن لاہور سے خریدا۔ اداریے میں اس دفعہ بھی آپ نے حق اور سچ لکھا لیکن افسوس صد افسوس کہ اس ملک کے حالات دن بہ دن بدتر ہوتے جارہے ہیں۔ مہنگائی اور لوڈشیڈنگ سے تنگ آکر جب عوام نے لاہور سمیت پنجاب کے دیگر شہروں میں سڑکوں پر آکر احتجاج شروع کیا تو نااہل حکمران ٹس سے مس نہ ہوئے اور ظلم کی حد تو اس وقت ہوگئی جب گیس، پیٹرول، ڈیزل مزید مہنگا کردیا گیا۔ کرپٹ حکمران عوامی مشکلات سے آشنائی کے باوجود عیاشی میں مصروف ہیں۔ مجھے تو سمجھ نہیں آتی کہ اس ملک میں عوام کے ساتھ کیا ہورہا ہے۔ اب تو یہی امید ہے کہ کوئی خدائی معجزہ ہوجائے۔ اس دفعہ شہرِ خیال میں رانا محمد سجاد نمبر ون پر نظر آئے۔ رانا جی، تبصرے کی پسندیدگی کا شکریہ۔ بورے والا سے رانا محمد شاہد اپنی شادی کی نوید کے ساتھ محفل کی رونق بنے، جناب ہم تو دعوت کا سوچ رہے تھے لیکن ناصر حسین رند صاحب اور آپ کے لفظ کرکرانے سارے تبصرے کا مزہ کرکرا کردیا۔ ایم اے خالق بھٹی، مہوش رفیق کا تبصرہ بھی اچھا لگا۔ احمد خان تو حیدی، آپ بھی اتنا مفصل تبصرہ لکھیں گے۔ واہ بھئی واہ! آپ نے تو کمال کردیا۔ غلام یٰسین نانوری، آپ نے بجا فرمایا کہ پڑھے لکھے نوجوان اچھی نوکری نہ ملنے پر چور لٹیرے بن جاتے ہیں۔ ایک نوجوان پڑھ لکھ کر بھی جب دربدر کی ٹھوکریں کھائے اور کوئی اچھی ملازمت نہ حاصل کرسکے تو اس کی ذہنی حالت کیا ہوتی ہے اور وہ پھر کیا کرے گا، یہ یقیناً ہم سب جانتے ہیں۔ ایم اے خالق بھٹی، چاند پر جانا کہاں مقدر ٹھہرا ہمارا۔ جام اکبر علی، آپ سے یہ کس نے کہہ دیا کہ شہرِ خیال میں مخصوص لوگوں اور چہیتے افراد کی اجارہ داری ہے۔ آپ کی یہ بات تو آپ پر ہی دلالت کررہی ہے کیونکہ آپ کا تبصرہ بھی شہرِ خیال میں شامل ہے، سوچیے۔ میرے خیال میں سرگزشت کا یہ خاصا ہے کہ اس میں شائع ہونے والی ہر تحریر اور ہر خط تفریق کے بغیر شامل ہوتے ہیں۔ صرف اور صرف معیار کو جانچا جاتا ہے۔ معراج الدین صاحب آف مردان، آپ نے دوڈھائی میل کی مسافت طے کی لیکن یقین جانیے میں نے اس دفعہ اس گوہرِ نایاب کو حاصل کرنے کے لیے پورے 6 میل کا پیدل سفر طے کیا۔''

✉ **مونا گل** آف بنوں لکھتی ہیں ''شہرِ خیال میں ہم صرف خیال میں ہی پہنچ سکتے ہیں۔ اتنی دیر سے سرگزشت ملتا ہے کہ ہر ماہ پڑھنے کے باوجود ہم اپنی رائے کا اظہار کرنے سے رہ جاتے ہیں۔ جب تک پڑھتی ہوں، تاریخ گزر جاتی ہے (جس طرح اس ماہ آپ نے خط بھیجا ہے، اگر اسی طرح بھیجتی رہیں تو انشاء اللہ ضرور شامل ہوگا۔ دوسری صورت ای میل ہے جو فوراً مل جاتی ہے۔ آپ اگر کسی طرح اپنا خط ای میل کروا سکیں تو ہمارے خیال میں شرکت کے امکانات بھی بڑھ جائیں گے اور ہمیں بھی آپ کی رائے معلوم ہوسکے گی) نئے سال کے لیے اتنی تک و دو کی پھر رہ گئی، بس افسوس ہے کہ خط نہ ملا۔ آپ کو ماہ جنوری کے رسالۂ سرگزشت میں خالد کبیر صاحب نے جو تمام سال پر بھرپور خیال واظہار پیش کیا، بہت خوب اور بہترین تھا۔ ہر ماہ کی طرح اس ماہ بھی پہلے پہل ''سراب'' پڑھی۔ بے حد زبردست ہمیشہ کی طرح۔ سچ بیانیوں میں صرف رقصِ زندگی ابھی پڑھی ہے، بہت زبردست۔ ہمارے معاشرے میں جہاں کیپٹن اشفاق احمد اور ڈاکٹر شفیق جیسے فرشتے ہیں، وہاں رئیس خانوں کی بھی بہتات ہے۔ ہر لحاظ سے زبردست۔ باقی رسالہ ابھی نہیں پڑھا لیکن تسلسل سے سرگزشت اور جاسوسی دونوں پڑھتی رہتی ہوں (آپ اگر سسپنس اور پاکیزہ بھی پڑھیں تو یقیناً لطف اندوز ہوں گی۔ خاص طور پر سسپنس کے نئے سلسلے مسافر اور کشکول یقیناً آپ کو پسند آئیں گے۔ جبکہ پاکیزہ میں عمیرہ احمد کا ناول عکس اور ناہید سلطانہ اختر کا زندگی اور ساتھ ہی نمرہ احمد اور صنیزہ سید کو بہت پسند کیا جارہا ہے۔ اس ماہ ہمارا مشورہ ہے کہ آپ پاکیزہ ضرور پڑھیں)

✉ **مجاہد مصطفیٰ کوریہ** کا خورشید آباد، مظفر گڑھ سے پیام ''میں سرگزشت کو اس وقت سے جانتا ہوں جب اس کا پہلا شمارہ آیا۔ اس دن سے لے کر آج تک اتنا بے قراری سے انتظار ہوتا ہے کہ اب بک شاپ والا بھی مجھ سے تنگ ہے اور وہ کہتا ہے کہ آخر اس ماہنامہ میں کیا ہوتا ہے، جواب میں بس یہی کہوں گا کہ اس کے اندر دنیا جہاں کے علم کا ایک خزانہ چھپا ہوتا ہے (آپ کی محبت اور خلوص کا شکریہ) اس مہینے یعنی اپریل 2012ء کا شمارہ کافی دیر سے ملا۔ بھاگا بھاگا گھر پہنچا اور سب سے پہلے سراب کو کھولا۔ سراب کے پیچھے بھاگتے بھاگتے بھگوان شکاری تک جا پہنچے اور مسعود کھدر پوش کے بارے میں پتا چلا

کہ وہ ایک اچھے، نیک فطرت آئی سی ایس افسر کے ساتھ ساتھ ایک اچھے شکاری بھی تھے۔ ابھی ہم اسموں میں کھوئے ہوئے تھے کہ بد قسمتی میں روشنی نہ رہی۔ مطلب لائٹ چلی گئی۔ پھر باقی مطالعہ سرگزشت موبائل کی لائٹ میں پورا کیا۔ (زندہ باد موبائل زندہ باد) (واہ، آپ کی مستقل مزاجی پائندہ باد) پاکستان کا فخر شرمین چنائے کے بارے میں پڑھا اور پتا چلا کہ ہم بھی کسی سے کم نہیں۔ زندہ قومیں کبھی ہار نہیں مانتیں چاہے مشکلات راستے میں حائل کیوں نہ ہوں۔ پاکستان شرمین کو سلیوٹ کرتا ہے، زندہ باد شرمین چنائے، پائندہ باد پاکستان۔ باقی شمارہ ابھی زیرِ مطالعہ ہے۔''

✉ **ایم اے خالق بھٹی** کا خلوص نامہ، اللہ آباد ضلع رحیم یار خان سے ''انکل معراج سیاست دانی کی حرص اور دلالی کا پردہ چاک کرتے اور عوام کا دکھ بیان کرکے ہماری محکومیت کی صحیح ترجمانی کی ہے جس پر ان کا مشکور ہوں۔ مختصر بیتی میں رضا علی وحشت کلکتوی کا زندگی نامہ متاثر کرگیا۔ باربی ڈول، محمد اختر۔ سفید سرزمین، طارق عزیز خان۔ عزم کی پیکر، زرین مہدی اور ظفر سعید کی دوسری زندگی سب سے پہلے پڑھیں۔ معلومات اور ماضی و حال کے حوالے سے ہمارے اکلوتے دماغ کی چولیں ہلاکر رکھ دی ہیں۔ واقعی یہ رائٹرز خراجِ تحسین کے مستحق ہیں لیکن دوسری زندگی پڑھ کر جو ذہن پر خوف سوار ہوا ہے، ابھی تک دہشت زدہ ہوں اور اپنی بیٹیوں کو سرگزشت پڑھنے کے لیے نہیں دیا ہے۔ مختار آزاد کی قوالی، مسعود کھدر پوش کی بھگوان شکاری اچھی اور معلومات سے مزین تھیں۔ محمد ایاز راہی کی تحریر ٹوپی راما بھی خاصی متاثر کن تھی، مبارک باد۔ سچ بیانیوں میں حامد تابانی کی خالہ روشنا، صبا شفیق کی ہمت مرداں، طیبہ شیریں مصطفیٰ عکس ماضی اور انور فرہاد کی ہتھیلی پر انگارہ ابھی تک پڑھی ہیں۔ واقعی خاصے کی چیز تھیں۔ رانا محمد سجاد کرسی صدارت پر خوب جچ رہے تھے۔ ہماری تین گمشدہ شخصیات کو ضرور رابطہ کرنا چاہیے۔ لگتا ہے ہماری عینی باجی (قرۃ العین زینب) حق و سچ کا بول بالا کرنے کے لیے کسی کورس میں لگی ہوئی ہیں ورنہ ضرور حاضری لگواتیں۔ رانا محمد شاہد ابھی تو آپ کے ہاتھ پیلے ہوئے ہیں، یہ عشق نا کام نمبر کے لیے بے چینی کیوں؟ غلام یٰسین نوناری، تعریف کرکے میرا مزاج نہ بگاڑیں۔ ناصر حسین رند، مہوش رفیق، طاہر الدین بیگ، احمد خان تو حیدی، منظر علی خان، جام اکبر علی ماہڑہ، سدرہ بانو نا گوری اور علی مغل کے تبصرے متاثر کن تھے۔''

✉ **رانا محمد شاہد** کی تشریف آوری، بورے والا سے ''اپریل کا شمارہ ایک اداس دوشیزہ اور کونے میں عزم کی پیکر ایک قابلِ فخر پاکستانی دوشیزہ کے سرورق کے ساتھ ملا۔ اداریے میں معراج رسول صاحب کا خیال حقیقت پر مبنی تھا۔ ہم ہمیشہ کہتے ہیں کہ بھارت میں جمہوریت اور سیاست کو ہمیشہ پروان چڑھایا گیا جبکہ پاکستان میں یکے بعد دیگرے فوجی آمر آتے رہے لیکن ہم یہ نہیں دیکھتے کہ ہمارے سیاست دان بھارتی سیاست دانوں کے مقابلے میں کس قدر کرپٹ ہیں۔ ایک سروے کے ذریعے یہ بات سامنے آئی تھی کہ پاکستانی سیاست دان بھارتی سیاست دانوں کے مقابلے میں تین گنا زیادہ کرپٹ ہیں۔ باربی ڈول، ایک معروف دوشیزہ کا زندگی نامہ، دلچسپی و جذبات سے بھرپور تھا۔ اگلی قسط کا انتظار رہے گا۔ سفید سرزمین، معلومات سے بھرپور تحریر تھی۔ انٹارکٹیکا کے قدیم باسی پینگوئن کے حوالے سے معلومات میں خاص اضافہ ہوا۔ عزم کی پیکر شرمین عبید چنائے کی زندگی پر زرین مہدی نے بڑی تفصیل سے روشنی ڈالی۔ شرمین عبید جیسی پختہ عزم اور جواں حوصلہ خواتین ہی پاکستان کے ماتھے کا جھومر اور دوسری خواتین کے لیے رول ماڈل ہیں۔ پاکستان میں ٹیلنٹ کی کمی نہیں ہے لیکن اصل مسئلہ یہ ہے کہ یہاں ٹیلنٹ کی قدر نہیں کی جاتی، ٹیلنٹ گلیوں میں ضائع ہورہا ہوتا ہے جبکہ نااہل لوگ ایوان اقتدار، مختلف وزارتوں اور مختلف شعبوں کی افسر شاہی کے مزے لوٹ رہے ہیں۔ یہ ناانصافی ہمارے معاشرے اور ملک کا ایک بڑا المیہ ہے۔ خود سوچیے جہاں ایم ایس سی کرنے والوں کو جاب نہ ملے اور میٹرک پاس اس ملک کے مختلف شعبے چلا رہے ہوں۔ ایک بڑے ناول نگار کی بدقسمتی کو بیان کرتی سرگزشت بدقسمت کو ابنِ کبیر نے بڑے اچھے پیرائے میں پیش کیا۔ یہاں یہ بات تو طے ہے کہ عزت، دولت و شہرت بھی آپ کو اچھی قسمت نہیں دلاسکتے۔ منگولیا کے قبائل پر مریم کے خان کی تحریر بہت زبردست تھی۔ چنگیز خان، ہلاکو خان جیسے لوگوں نے دنیا میں بے پناہ تباہی پھیلائی لیکن تحریر کی سب سے خوبصورت بات اس کا اینڈ تھا۔ وہ جگہ جہاں سے یہ زرد آندھی اٹھی تھی، اب وہاں صرف زرد ریت اڑتی ہے۔ صرف یہی ریت اس زرد آندھی کی یادگار ہے جو آٹھ صدی قبل یہاں سے اٹھی تھی۔ مختصر مگر دلچسپ تحریر محمد ایاز راہی کی ٹوپی راما تھی۔ البتہ اسے مزید طوالت دے کر معلوماتی و دلچسپ بنایا جاسکتا تھا۔ صبا شفیق ہر دفعہ ہی ایک اچھی تحریر کے ساتھ آتی ہیں۔ 23 مارچ کو میری برات واپس آرہی تھی۔ میانوالی سے تقریباً ڈیڑھ گھنٹے کی مسافت پر کار ایک حادثے کا شکار ہوگئی۔ حادثہ شدید نوعیت کا تھا لیکن اللہ تعالیٰ نے سبھی کو محفوظ رکھا۔ ہمشیرہ کی ناک کی ہڈی فریکچر ہوئی، بھائی کی ٹانگ پر زخم آیا، باقی سب خیر ہے۔ قارئین سے دعاؤں کی درخواست ہے۔''

✉ **محمد ایاز راہی** کا مکتوب، مانسہرہ سے ''یوں تو سرگزشت نے آغاز ہی میں متوجہ کرلیا تھا جب وحید مراد مرحوم کی سرگزشت شائع ہوئی تھی مگر سرگزشت سے قلمی تعلق کو پندرہ برس بیت چکے ہیں۔ اکتوبر 1998ء کے شہرِ خیال میں میرا پہلا خط شائع ہوا تھا۔ ان پندرہ برسوں میں مختلف خطوط، اقتباسات اور مضامین شائع ہوئے جس کے لیے میں سرگزشت سمیت ادارہ کے تمام افراد کا ازحد شکرگزار ہوں۔ سرگزشت کے تمام ستارے، ہر دلعزیز لکھاری اور سلما ستارے، خواتین لکھاری لائقِ داد اور قابلِ دعا ہیں کہ اپنے محبوب ماہنامے کے لیے خوب محنت کرتے ہیں۔ اسی طرح شہرِ خیال کے تمام جگنو مرد اور جگنیاں خواتین بھی تحسین و توصیف کی حق دار ہیں کہ بھی مرد و خواتین ہر ماہ سرگزشت کے میلے میں شریک ہوکر اسے رونق بخشتے ہیں۔ خدا کرے کہ یہ بھرا میلہ سدا قائم رہے، آمین۔ آفاقی صاحب کو اللہ تعالیٰ روحانی و جسمانی صحت سے سرفراز فرمائے کہ وہ بھی میرے قلم کے مربی اور محسن ہیں۔''

✉ **طاہرہ گلزار** کی آمد، پشاور سے ''اللہ سے دعا ہے کہ انکل آفاقی کو صحت دے (آمین) اور یعقوب جمیل صاحب کو اللہ جنت میں جگہ عطا

www.Paksociety.com

فرمائے اور ان کے گھر والوں کو صبر عطا فرما دیں۔ میرا نام شاہدہ گلزار غلط شائع کیا گیا ہے (خط دوبارہ نکال کر دیکھا، شاہدہ ہی پڑھا جا رہا ہے) انکل پشاور والوں کو بہت دیر سے تینوں ڈائجسٹ ملتے ہیں۔ اسی وجہ سے ہمارے خطوط بھی آپ کو لیٹ ملتے ہیں۔ رانا محمد شاہد صاحب لگتا ہے آپ کو عشقیہ داستان پڑھنے کی حد تک پسند ہے یا حقیقی زندگی میں بھی؟ آپ نے صحیح کہا کہ ہم وہ قوم ہیں کہ دوسروں کی بنی بنائی چیزوں کی حفاظت تک نہیں کر سکتے۔ سائنس مسلمانوں کے گھر کی لونڈی تھی لیکن اب دیکھو کہ کیا ہمارے پاس کچھ ہے، ہم صرف لوٹنے، بگاڑنے اور ختم کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔ غلام یٰسین، آپ نے صحیح کہا کہ اب تو ہم بس صرف ڈگری حاصل کرنا چاہتے ہیں جو سرکاری جاب کے حصول کے کام آئے۔ جو نوجوان ملک کو چھوڑ کے جا رہے ہیں، میں ان کو انسان ہی نہیں کہتی۔ ایم اے خالق بھٹی صاحب، آپ اور تفسیر عباس بابر بھائی کا تبصرہ تو لاجواب ہوتا ہے۔ آپ نے راجا ثاقب نواز کے بارے میں بہت صحیح فرمایا ہے کہ کھالو، پی لو اور موج اڑا لو۔ مہوش رفیق، آپ نے صحیح کہا کہ عورت ہی قربان ہوتی ہے اور پستی بھی ہے، اس کی اپنی کوئی زندگی نہیں۔ چار مرد ہر وقت اس کو نچاتے ہیں لیکن مرد اتنا دشمن نہیں جتنا عورتیں ہیں۔ مثالیں ساس، نند، دیورانی اور سوکن۔ شکریہ طاہر الدین بیگ صاحب کہ آپ نے میرا اسلام قبول کیا ورنہ یہاں کچھ لوگ ہیں جن سے جلنے کی بو آ رہی ہے۔ طاہر صاحب، اب تو لوگ اتنے بے حس ہو گئے ہیں کہ طمانچے سے کام نہیں ہوتا، ان پر توپ چلانا چاہیے۔ احمد خان توحیدی، عشق ناکام کے لیے اتنی بے تابی، ویسے ہمارے پشاور ریڈیو سے پہلے ایک گلوکار گزرے ہیں احمد خان، بہت میٹھی آواز تھی ان کی، بہت اچھا گاتے تھے۔ جام اکبر علی ماہڑہ، آپ اپنی ننھی منی عقل پہ زور نہ ڈالیں ورنہ وقت سے پہلے ختم غلامی۔ چھوٹے بھائی معراج الدین آف مردان، پیارے بھائی میں بھی چارسدہ، کلاڈھنڈ بالا کی ہوں اور F.C.W پشاور میں جاب کرتی ہوں۔ خط پسند کرنے کا شکریہ۔ ویسے جہاں تو دوست تو ایک دشمن بھی ہوتا ہے اور وہ دشمن تینوں ڈائجسٹ میں حاضر ہے۔ ملک جاوید محمد خان سرکانی درانی کیوں خفا ہو رہے ہو، یہ تو اس ملک کے نوے فیصد لوگوں کی عادت ہے کہ دوسروں کی باتیں کاٹتے ہیں لیکن آپ بتائیں کہ آپ کے نام کے ساتھ سرکانی کا کیا مطلب ہے؟ ویسے لکھتے آپ خوب ہیں۔ میں آپ اور تفسیر عباس بھائی کا تبصرہ بہت غور سے پڑھتی ہوں۔ کہاں غائب ہیں تفسیر بھائی، اب تو اللہ کا شکر ہے کہ آپ کی طبیعت ٹھیک ہوگی ہے۔ اب تو تبصرے سے محروم نہیں ہونا چاہیے۔ ویسے کافی پرانے دوست غائب ہیں۔ ان کو واپس آنا چاہیے۔ انکل، آپ بھی اگر کوئی تبصرہ اچھا ہو اور لیٹ بھی پہنچے تو آخری وقت تک شائع ضرور کیا کریں۔ انکل، کبھی پشاور کے قلعہ بالاحصار، مسجد مہابت خان اور اسلامیہ کالج پر بھی لکھیں۔ اگر میں اپنے کالج فرنٹیئر کالج برائے خواتین کی ہسٹری بھیج دوں تو آپ شائع کریں گے؟ (آپ بھیج دیں، اسے ہم بورڈ کے سامنے پیش کر دیں گے) اب کہانیوں پر تھوڑا تبصرہ۔ پگلی بچی آپ بیتی میں دوسروں کو نصیحت کرنا بہت آسان ہے لیکن خود اس پر عمل کرنا بہت مشکل۔ اور ہم جو نقصان اٹھا رہے ہیں، اس میں کافی ہاتھ ہمارے بڑوں کی غلط تربیت کا بھی ہے۔ خود میں سچ سننے کی طاقت نہیں اور بچوں کو ہر وقت تنقید کا نشانہ بنایا جاتا ہے۔ خود کا فیصلہ غلط ہو جائے تو اس کو مقدر پر ڈال دیتے ہیں کہ بس اللہ کو یہی منظور تھا اور وہی فیصلہ چھوٹے کر لیں تو پھر قیامت آ جاتی ہے۔ اولاد نافرمان کہلاتی ہے۔ ہر وقت کا طعنہ اس وقت پھر اللہ کو بھول جاتے ہیں۔ طیبہ نے فریدہ کو صحیح آئینہ دکھایا۔ تب ہی تو رضوانہ اور عرفان کا گھر بن گیا۔ دوسری کہانی بزنس از بزنس تو یہ آج کل کے دور میں کوئی نئی بات تو نہیں ہے، یہ بے حسی تو کب سے جاری و ساری ہے۔ قبر بیچنا تو بڑی بات ہے لوگ تو قبروں سے مردے کا کفن نکال لیتے ہیں۔ وہ تو چلو سامنے لوگوں سے قبر کی قیمت لے رہا تھا۔ تیسری کہانی سفید کوا کچھ یاد دلا رہا ہے کہ کچھ عرصہ پہلے کچھ اسی طرح کی کہانی سسپنس میں پڑھی تھی اور سرورق کی لڑکی بھی دیکھی بھالی ہے۔''

✉ سہیل احمد عباسی کی بنو عاقل سے تشریف آوری ''اداریہ در حقیقت عوام کے دل کی آواز ہے۔ دہشت کلکوی کی منفرد داستانِ حیات ہمیشہ کی طرح معلومات افزا ہے اور ایک شاعر بے بدل کی جہد مسلسل کا افسانہ سناتی ہے۔ شہرِ خیال میں اگرچہ ہم موجود نہیں تھے پھر بھی یاروں نے بھلایا نہیں تھا اس لیے سرائیکی خطے کی مٹھاس والے ناصر حسین رند کا بہت شکریہ۔ اب ہمیں محسوس ہونے لگا ہے کہ سرائیکی کو شہد سے میٹھی زبان کیوں کہا جاتا ہے۔ رانا محمد سجاد کا صدارتی خط بہت اچھا ہے جس میں وہ غیر ملکی یونیورسٹیوں سے کیے گئے معاہدے کو پورا نہ کرنے پر دکھی تھے۔ رانا صاحب کیا کیجیے اور کس کس بات کا شکوہ کیجیے کہ آوے کا آوا ہی بگڑا ہوا ہے۔ رانا محمد شاہد اپنی شادی کا اعلان کر رہے تھے، کہتے ہیں کہ جس نے شادی کی وہ بھی پچھتایا اور جس نے نہ کی وہ بھی پچھتایا۔ مگر ہمارا خیال ہے کہ کر کے پچھتانا ٹھیک رہے گا۔ پریس کلب، اللہ آباد کے تاحیات صدر ایم اے خالق بھٹی کا تبصرہ بھی اچھا ہے جس میں میرے سوا سب لوگوں کے نام انہوں نے لکھے ہیں۔ ارے بھٹی صاحب ایسی بھی کیا بے مروتی۔ احمد خان توحیدی، سچ بیانیوں پر اس طرح تبصرہ کر رہے تھے جس طرح کرکٹ میں ماہر کھلاڑی کرتے ہیں۔ ملک ثاقب شاد تنولی سرگزشت کا جادو بالکل ایسا ہی ہے جیسا آپ نے بیان فرمایا۔ ہمیں تو 22 سال ہونے کو آئے، اس کے سحر سے نکلنے میں کامیاب نہیں ہوئے اور یہ واقعی اردو کا ریڈرز ڈائجسٹ ہے۔ جویریہ قاضی، خط وقت پر لکھا جائے تو مایوسی نہیں ہوتی۔ سدرہ بانو نا گوری، آپ کا انسانیت کے بلند تر ہونے کا نظریہ قابلِ ستائش ہے، اسلام میں بھی انسانیت کی خدمت سے بڑھ کر کوئی عبادت نہیں ہے اور یہ اسلام کے دینِ فطرت ہونے کی دلیل ہے۔ ملک جاوید خان درانی حسبِ معمول تاریخ پر جامع تبصرہ فرما رہے تھے، خدا کرے زورِ قلم اور زیادہ۔ جنیفر لوہیوٹ کی داستان ہوشربا کافی طویل ہوگئی ہے۔ انٹارکٹیکا پر پاکستانیوں کے پہنچنے کا نظارہ سفید سرزمین کی صورت میں خاصے کی چیز ہے، بہت معلومات افزا اور سرگزشت کے معیار کی چیز ہے۔ قوالی اور روحانیت کا چولی دامن کا تعلق ہے۔ مختار آزاد صاحب نے دلوں کو اجالنے والی تحریر لکھی اگرچہ مسئلہ سماع، سلسلہ تصوف کا متنازع مسئلہ رہا ہے۔ آسکر ایوارڈ یافتہ شرمین عبید کا قصہ خوب ہے لیکن ان کی تربیت کی وجہ سے وہ بھی مغربی میڈیا کا حصہ لگتی ہیں اور ان ہی موضوعات کو شوٹ کرتی ہیں جسے مغربی میڈیا اہمیت دے اور دکھانا پسند کرے، ان کی شہرت بھی اسی وجہ سے ہے ورنہ یون رڈلی جو کہ برطانوی نومسلم صحافی ہے اسے تو مغربی میڈیا حتی انداز

سے پیش کرتا ہے کیونکہ وہ مسلم معاشرے کے مسائل کو اجاگر کرتی ہیں۔ ارنسٹ ہیمنگوے کی داستانِ حیات کا نام بدقسمت ہمیں تو اچھا نہیں لگا۔ 62 سالہ بھرپور کامیابیوں والی زندگی گزارنے والے کو بدقسمت کہنا مناسب نہیں لگتا۔ محترمہ مریم کے خان صاحبہ کی رو شفیق نا شاہکار، منگولوں کی داستان اس ماہ کا سب سے شاندار مضمون ہے۔ مریم کے خان اپنے موضوع کی ہر سمت کا اس انداز سے احاطہ کرتی ہیں کہ بندہ مسحور ہو کر رہ جاتا ہے۔ پچھلی قسط کا بے صبری سے شدت سے انتظار ہے، اس میں جواہر لال نہرو کی بہن وجے لکشمی پنڈت اور سید حسین کے عشق بلا خیز کا احوال بھی آنا چاہیے۔'' (آپ کی فرمائش نوٹ کر لی ہے)

✉ افتخار احمد گھمن کا مکتوب، لاہور سے ''کافی عرصہ کے بعد شہرِ خیال میں حاضری دے رہا ہوں۔ اس ماہ کے شمارے میں ہالی وڈ کی امریکن حسینہ کے بارے میں پڑھنے کو ملا، ایسی کیا بات ہے اس کی زندگی کے واقعات میں کہ دو قسطوں پر شائع کی جا رہی ہے؟ (مارلن منرو اگر ہالی وڈ کے شائقین کی سب سے چہیتی اداکارہ ہے اور ہم ہر مشہور شخصیت کی روداد زندگی کو ترجیح دیتے ہیں) شہرِ خیال میں رانا محمد سجاد کا خط اچھا رہا۔ ناصر حسین رند، آپ کی یاد آوری کا بہت شکریہ۔ آپ خود بھی کم آتے ہیں لیکن میری کمی کو محسوس کیا۔ علی سفیان آفاقی کی علالت کا پڑھ کر تو ان کے لیے بے ساختہ دعا نکلی۔ آفاقی صاحب فلمی الف لیلیٰ جولائی وڈ کا انسائیکلوپیڈیا ہے، تحریر کرتے ہیں اور ہمیں وہ معلومات دی جو کئی کتب اور رسائل پڑھنے کے بعد بھی نہ ملتی۔ ایم اے خالق بھٹی، طاہر الدین بیگ، احمد خان توحیدی، معراج الدین اور ملک جاوید خان سرکانی درانی کے خطوط اچھے رہے۔ قرآن مجید میں انسان کے لیے خلیفہ کا لفظ استعمال ہوا ہے، میں یہاں لغت کے معنی کے چکر میں نہیں پڑنا چاہتا (صحیح کہا) ماہ جنوری کے شمارے میں سرگزشت کے تجزیہ کار خالد کبیر صاحب نے سال گزشتہ کے بارے میں خوب تجزیہ کیا لیکن کئی نام لکھنا بھول گئے۔ کئی قارئین نے اس کا ذکر اپنے خطوط میں کیا۔ وقت ملا تو آئندہ تفصیل سے خط لکھوں گا۔''

✉ معراج الدین کا خلوص نامہ، مردان خیبر پختون خواہ سے ''شہرِ خیال میں اپنا خط پا کر خوشی کی انتہا نہ رہی۔ اس حوصلہ افزائی کے لیے ہم مشکور و ممنون ہیں۔ اداریے سے ہم سو فیصد متفق ہیں۔ ہمارے معاشرے کا المیہ یہ ہے کہ یہاں اربابِ اقتدار کا انتخاب سوچ سمجھ کر نہیں کیا جاتا۔ آج ہمیں جن حالات کا سامنا ہے اور جو کرپٹ اور دو غلے حکمران ہم پر مسلط ہیں، اس کے لیے ہمارے عوام برابر کے ذمے دار ہیں کیونکہ عوام نے ہی ان کو منتخب کیا ہے۔ جب تک ہمارے عوام میں ووٹ کی صحیح استعمال کا شعور نہیں آئے گا، ہماری تقدیر نہیں بدل سکتی۔ یک مٹھی سرگزشت میں غالب بنگالہ سے متعارف ہوئے۔ باربی ڈول میں جنیفر لوہیوٹ کا جوش و جذبہ اور ہمت و حوصلہ واقعی لاجواب تھا۔ مسعود کھدر پوش صاحب کی طرح انسانیت کی خدمت کرنے والے لوگ اب بہت کم رہ گئے ہیں۔ ٹوپی راما نے ہماری معلومات میں خاطر خواہ اضافہ کیا۔ ہمت مرداں ایک سبق آموز تحریر تھی۔ ضرب المثل ہمت مرداں مددِ خدا اس کہانی پر صادق آتی ہے۔ سراب کی 60 ویں قسط بھی پچھلی اقساط کی طرح بہترین اور سنسنی خیز تھی۔ برٹ شا کی موت نے ایمن شا کی وجہ سے کافی افسردہ کر دیا۔ عکس ماضی بہترین تحریر تھی۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو طیبہ کی طرح دکھی انسانوں کی خدمت کی توفیق عطا فرمائیں۔ بزنس از بزنس عبرت ناک تحریر تھی۔ ہمارا معاشرہ اس قسم کے کئی دوسرے گھناؤنے کاروباروں سے بھرا پڑا ہے۔ خالہ روشنا نے ہماری پرانی یادیں تازہ کر دیں۔ جنگ و جدل کے ان حالات میں ہم ایسے بے شمار دکھی لوگوں سے ملیں جو اپنے عزیز و اقارب کو کھو چکے تھے۔ سفید کوا نے ہمارے معاشرے کا ایک برا پہلو ہمیں دکھا دیا۔ آج کل تو جعلسازی کے ایسے طریقے نکل آئے ہیں کہ انسانی عقل حیران رہ جاتی ہے۔ بے اماں سب سے اچھی تحریر تھی۔ ہتھیلی پر انگارہ میں وسیم احمد کی کوئی غلطی نہیں تھی۔ اس کی بیوی کو شادی سے پہلے اسے سب کچھ بتا دینا چاہیے تھا۔ بانجھ عجیب ترین تحریر تھی۔ کاش نے اپریل کے شمارے میں پراسراریت کے Ingrodiont کا کام کیا تھا۔''

✉ ملک جاوید محمد خان سرکانی درانی کی خیال آفرینی، بروزئی جھنگ سے ''اس ماہ یک مٹھی سرگزشت کی شخصیت تاریخ وفات 1952ء لکھی گئی جو کہ 1956ء بھی بیان کی جاتی ہے (آپ کی اطلاع غلط ہے۔ وہ صرف دو سال پاکستان میں گزار پائے تھے۔ 1950ء میں وہ مشرقی پاکستان آئے، دو سال بعد انتقال کر گئے) رانا محمد شاہد زندگی کا نیا سفر مبارک ہو۔ رند صاحب ہم نے تو صرف یہ کہا تھا دل چھوٹا نہ کریں۔ اس ماہ سرگزشت کے خاص مضامین میں سفید سرزمین، نیا جنم، عزم کی پیکر، بدقسمت، ٹوپی راما تھے۔ زرد آدمی نے سسپنس میں منگولوں پر لکھی گئی الیاس سیتاپوری کی کہانیوں کی یاد تازہ کر دی۔ مسعود کھدر پوش کی دلچسپ شکار کہانی کی دوسری قسط پہلے سے اچھی رہی۔ کیا یہ وہی مسعود کھدر پوش ہیں جنہوں نے سندھ ہاری رپورٹ مرتب کی تھی، پنجابی زبان و ادب کے سرپرست تھے اور جن کی یاد میں مسعود کھدر پوش ایوارڈ برائے پنجابی ادب کا اجرا کیا گیا تھا؟ (جی ہاں، یہ وہی قابلِ قدر ہستی ہیں) مختار آزاد کا مضمون قوال جامع نہیں تھا، اس میں اضافے کی کافی گنجائش تھی۔ مصنف نے خواتین قوالوں کا ذکر تو سرے سے کیا ہی نہیں اور مرد قوالوں کے ناموں میں سے عالمی اور ملکی سطح پر مشہور بہت سارے قوالوں کے نام تحریر نہیں کیے جیسا کہ یوسف آزاد، اسماعیل آزاد، منا آزاد، مسیح آزاد، قمر آزاد، احمد آزاد، اختر آزاد ڈھاکے والے۔ قلندر آزاد۔ حبیب پینٹر، عبدالرحمان کانچ والا، جیو قوال، شیخ لعل، ماسٹر ایاز علی محمد تاجی، واجد علی منگے والے۔ گلن قوال بھی دو تھے۔ میانداد قوال اور ان کے فرزند بدر میانداد، شیر میانداد، صالح محمد چھوٹے اور صالح محمد بڑے۔ مہر علی، شیر علی، مستان قوال، عزیز نازاں جانی بابو، فیض علی فیض اور ہمارے علاقہ جھنگ سے تعلق رکھنے والے فضل الرحمان عرف فقیر محمد اور ان کے فرزند حاجی شیر الرحمان بروزئی والے۔ ایوب خان، ماسٹر غلام سرور اقبال خان راہی، نوشاد احمد کو تکلے والے، یعقوب خان قوبا، عبدالکریم پہنگا، عبدالرحیم کھیسا، غلام اکبر غور غشتی والے، صدیق بنگشی، شمروز چیتی، مولوی فقیر، فیاست مرزا والے، احسن ٹیڈی، افروز عدل زئی، حافظ غلام رسول حمید، زمرد مومن پور، علی اکبر غازی، ایوب قوال قبلہ بانڈی، شبیر شاہ رومیاں، افضل بائی والے وغیرہ ان کے فنی معیار اور مقام کا اندازہ ماہرینِ فن ہی کر سکتے ہیں۔ آزاد صاحب کی خدمت میں عرض ہے ایسا لکھا کریں کہ تشنگی نہ رہے بلکہ

مضمون جامع ہو۔"

✉ منظر علی خان کا تبصرہ، لاہور سے "باربی ڈول جیفر لوہیوٹ فلمی میدان میں ایک مسلسل جدوجہد کی کہانی ہے جو بالآخر کامیابی اور حصول دولت وشہرت پر منتج ہوئی۔ عالمی پیمانے پر فلمی دنیا میں دلچسپی لینے والے لوگوں کے لیے یہی ایک بہترین سبق ہے۔ نیا جنم آرٹسٹ اور تصویر کشی کے پس منظر میں بیان کردہ پینٹنگ اور اس کے متعلق تحقیق آرٹ کی دنیا میں رہنے والوں کے لیے بیش قیمت ہے۔ آسکر ایوارڈ لینے والی پاکستانی خاتون پر مضمون خوب ہے۔ ناول نگار ارنسٹ کی داستان روداد غم سہی مگر اسے بدقسمتی سے منسوب نہیں کر سکتے۔ زرد آندھی منگولیا کے چرواہوں نے کس طرح فوجی جنگ جوئی کا راستہ اختیار کرتے ہوئے دو تین سو سال تک بڑے اہم حکمرانوں کو تخت وتاراج کیا اور انسانی سروں کے مینار بنائے۔ 1258ء میں بغداد کی تباہی اور عباسی خلافت کا خاتمہ، مسلم دنیا کے لیے ایک المیہ سے کم نہیں تھا مگر اس کا پس منظر کیا تھا؟ اس سے کما حقہ پردہ نہیں اُٹھایا جاتا۔ وقت کرتا ہے پرورش برسوں، حادثہ ایک دم نہیں ہوتا۔ اموی اور عباسی خلفا کے مظالم پر نظر ڈالیں گے تو وجوہات اُبھر کر سامنے آجائیں گی۔ زیادہ طوالت میں نہیں جا سکتا۔ بھگوان شکاری کا طرزِ تحریر پسند آیا۔ مسعود کھدر پوش صاحب بیوروکریٹ ہونے کے باوجود کس قدر ملنسار اور ملی ہوئی طبیعت کے مالک تھے۔ ایسے انسان دوست لوگ کم کم ملتے ہیں۔ دوسری زندگی اس پُراسرار دنیا کے مخفی امور کے بارے میں تیار کردہ فلموں اور کہانیوں میں بیان کردہ ڈریکولا ٹائپ کہانی ہے۔ ٹوپی راما مضمون ہے سرگزشت نہیں۔ اگر اسے افسانوی انداز میں لکھا جاتا اور درمیان میں ٹوپی کی تاریخ اور ٹوپی راما کے احوال درج ہوتے تو زیادہ پُرکشش ہوتا۔ ہمت مرداں کے عنوان سے ایک بچے کے عزم اور ولولے کا قصہ ہے۔ عکس ماضی کے عنوان سے دلچسپ سچ بیانی ہے۔ سچ یہ ہے کہ عیب جوئی لعنت ہے اور کوشش کرنی چاہیے کہ اگر کوئی راست روی اختیار کیے ہوئے ہے تو اس کی مدد کرنی چاہیے ورنہ ہر انسان مکمل نہیں ہوتا۔ بزنس از بزنس کی کہانی گھاٹے کا سودا نہیں۔ انسان کسی ذہنی ٹھوکر سے سنبھل جائے تو خوب ہو جاتا ہے۔ خالہ روشنا فاطمہ کی ایک کہانی ہے۔ قدرت کیا کر رہی ہے، ہم کیا بھگت رہے ہیں، اجتماعی حالات پر نظر پڑتی ہے تو کانپ جاتے ہیں۔ سفید کوا نوسر بازی کی کہانی ہے۔ نہ جانے کتنے لوگ سونا دگنا کرنے کا لالچ دے کر سب کچھ لوٹ لے جاتے ہیں۔ بے اماں کے راوی کی قسمت اچھی تھی۔ شیب وفراز تو زندگی میں آتے ہی رہتے ہیں۔ ہتھیلی پر انگارہ سبق آموز ہے۔ کسی بھی خاتون کو ناپسندیدگی کی صورت میں اپنی ہتھیلی پر انگارہ رکھنے کے بجائے صاف انکار کر دینا چاہیے، بہ صورت دیگر کسی شریف انسان کو خوار کرنا بھی کسی طرح مناسب نہیں ہے مگر ہمارے معاشرے میں تضادات ہیں وسیم صاحب سے ہمدردی محسوس ہوئی۔ کاش تضادات کا مجموعہ تھی۔ خاصی دلچسپ مگر کسی فلمی کہانی کا مغلوبہ نظر آئی۔ جدائی حب الوطنی کا درس دیتی ہے۔"

✉ رانا محمد سجاد کا خط، توانا شہر مظفر گڑھ سے "وطن عزیز کی صورتِ حال خصوصاً عروس البلاد کے حالات سن کر تو پریشانی کی لہر رگ و پے میں دوڑ جاتی ہے۔ پھر سوچ پیدا ہوتی ہے کہ آخر اہالیانِ کراچی سے ایسا کون سا گناہ سرزد ہوا ہے کہ جس کی سزا اب تک ختم نہیں ہوئی۔ وزیرستان، سوات اور دوسرے علاقے امن کی شاہراہ پر گامزن ہیں اور یہ شہر...... بس خدا کی بارگاہ میں ایک بار پھر رحم کی التجا ہے۔ کبھی وہ دن بھی خدا دکھلائے کہ کراچی کی شاہراہوں اور فضاؤں میں امن کا راج ہو اور بانیٔ پاکستان کا یہ شہر ٹارگٹ کلنگ جیسی لعنت سے محفوظ ہو جائے (آمین) اوراق پلٹتے ہوئے عشق ناکام نمبر کے اشتہار پر پہنچے، دیکھتے ہیں کب تک یہ شمارہ ہماری پہنچ سے دور رہتا ہے۔ معراج رسول صاحب کے خیالات سے سو فیصد متفق ہیں۔ جمہوریت عوام کے خیالات کا ذریعہ ہے لیکن اقتدار پر قابض لوگوں نے اپنی اغراض ومقاصد اور اپنی خواہشات کو پورا کرنے کا نام دیا ہے گزشتہ مہینے جس مشہور زمانہ کیس کا بڑا چرچا رہا، بالآخر عدالت عظمیٰ نے اس کی سماعت تو بہت سارے چہرے بے نقاب ہوئے اور ان کا حقیقی اور مکروہ چہرہ قوم کے سامنے رونما ہوا اور پھر کرائے کے بجلی گھروں کا معاملہ تو سب کے سامنے ہے کہ کس طرح عوام کے سرمائے پر ڈاکا ڈالنے کا منصوبہ بنایا گیا تھا اور 2009ء میں بجلی کی لوڈشیڈنگ کے خاتمے کا اعلان بھی شرمندہ تعبیر نہ ہوا۔ رہا حزب اختلاف کا معاملہ تو بقول شاعر کہ دل جلانے کی بات کرتے ہو، یہ سب ٹوپی ڈراما ہے جس طرح ڈرون حملوں پر اربابِ اقتدار شور وغل کرتے ہیں، عوام کو خوش کرنے کے لیے اب یہی وتیرہ ان کا بن گیا ہے۔ اس پر جتنا کچھ دکھ افسوس کا اظہار ہو کم ہے۔ اب سرگزشت کی طرف بڑھتے ہیں۔ غالب بنگالہ کے بارے میں اپنی لاعلمی کا اعتراف ہے، پہلی بار آگاہی نصیب ہوئی۔ بہت شکریہ اہلِ ادب کے لیے خصوصی تحفہ تھا۔ شہرِ خیال میں داخل ہوئے اپنا خط پا کر خوشی ہوئی۔ رانا شاہد صاحب، مبارک باد قبول کیجیے گا۔ مٹھائی اُدھار رہی۔ ناصر حسین رند صاحب اپنے خوبصورت تبصرے کے ساتھ حاضر ہوئے۔ شمی کپور کے بارے میں جو آپ کا خیال ہے، وہی ہمارا ہے لیکن جس کی قسمت میں ہدایت ہو تو ملتی ہے۔ غلام یٰسین نوناری غالباً پہلی بار حاضر ہوئے ہیں۔ مہوش رفیق اب باقاعدگی کے ساتھ آئیے گا۔ احمد خان تو حیدی صاحب صبر کا پھل میٹھا ہوتا ہے۔ منظر علی خان کا تبصرہ بھی جاندار تھا۔ جام علی اکبر حیات آپ نے یہ کیا کہہ دیا کہ اس میں مخصوص لوگوں کی اجارہ داری ہے۔ اگر ہوتی تو آپ کا تبصرہ شہرِ خیال میں نہ ہوتا۔ غضنفر علی خان کا تبصرہ مختصر لیکن اچھا لگا۔ غیر حاضر ساتھیوں کو یاد کرنے کا شکریہ۔ جویریہ قاضی اپنے تبصرے کے ساتھ حاضر ہوئیں۔ عبدالغفور ناسخ کے بارے میں ہم نے تو نہیں پڑھا تھا (پہلی بار ہی سہی، پڑھ تو لیا) پروین شاکر کے بارے میں کسی تحریر کا ہمیں بھی شدت سے انتظار ہے۔ سدرہ بانو ناگوری صاحبہ کا خوبصورت تبصرہ پڑھنے کو ملا۔ معراج الدین کا مکتوب واقعی خاص تھا۔ ساتویں کلاس سے ہی اس معیاری رسالے کی رفاقت نصیب ہوئی، میڈیکل جیسی تعلیم کے باوجود آپ سرگزشت کے لیے وقت نکالتے ہیں، لائقِ تحسین ہے، اس کو اپنے حلقۂ یاراں میں بھی متعارف کرائیں۔ طاہرہ، آپ نے اُڑن طشتریوں کے بارے میں کہا اس سے قطعاً اتفاق نہیں ہے۔ ادارہ نے جواب دیا ہے وہی ہمارا ہے۔ ملک جاوید خان بھئی، ذرا جلدی خط لکھا کریں تاکہ فرنٹ سیٹ کا مزہ اُٹھائیں۔

صداقت حسین ساجد، شورکوٹ، "امید ہے خط لکھنے کا سلسلہ اب مستقبل میں بھی جاری رہے گا۔ [illegible] اور خصوصی نمبر کے لیے آپ نے جس بے چینی کا اظہار کیا ہے اسی میں ہم بھی مبتلا ہیں۔ خطوط کے آخر میں محترم یعقوب جمیل کے انتقال کی خبر [illegible] لکھنے والوں میں شمار کیے جاتے تھے۔ پروردگار انہیں اپنی جوارِ رحمت میں جگہ دے، آمین۔ "باربی اول" [illegible] میں کوئی سرگزشت شائع ہوئی ہے، کافی پسند آئی۔ اگلی قسط کا شدت سے انتظار رہے گا۔ نیا جنم، محمد عرفان آزاد [illegible] بارے میں اور اس کے خالق کے بارے میں کچھ معلومات پہلے سے تھیں اس لیے تحریر سے کافی لطف اُٹھایا۔ میرے خیال میں [illegible] قوالی، فنِ موسیقی پر ایک دلکش تحریر۔ تحریر اپنے موضوع کے اعتبار سے مختصر تھی لیکن بہرحال پسند آئی۔ بہتر ہوتا اگر عزیز میاں قوال کے بارے میں بھی کوئی تحریر شائع ہو جائے۔ واقعی، قوالی میں جو وسعت ہے، وہ کم ہی کسی دوسری صنف موسیقی میں ہے۔ قوال کے بارے میں جاننے کا شوق ہے اگر ہو [illegible] پر بھی لکھوایا جائے۔ قوالی کے شائقین کے لیے ایک تحفہ خاص ہوگا۔ عزم کی پیکر شرمین عبید چنائے کے بارے میں تحریر تھی۔ سرگزشت نے [illegible] قارئین کی پسند کا خیال کرتے ہوئے اس بار بھی بروقت تحریر دے کر سبھی کے دل جیت لیے۔ واقعی بہت بڑا اعزاز جس کا کوئی تصور بھی نہیں کر سکتا تھا، ایک ایسے ملک میں جہاں فلمی صنعت تباہی کے آخری مراحل سے گزر رہی ہے، وہاں آسکر لینا کمال ہی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ ایک اور بات یاد آ رہی ہے کہ وطنِ عزیز کے دو طالب علموں موسیٰ فیروز اور حسنین نے بالترتیب پہلی اور دوسری پوزیشن حاصل کی، پچھلے ہی دنوں یورپ والوں نے اس بات کا اعلان کیا کہ ذہانت کے اعتبار سے پاکستان پوری دنیا میں چوتھے نمبر پر ہے۔ کاش اربابِ اقتدار بھی اس بات کو سمجھیں۔ موسیٰ فیروز کو ابھی تک کسی حکومتی عہدے دار نے نہیں بلایا اور نہ اس کو خراجِ تحسین پیش کیا ہے (ہم کوشش کریں گے کہ ان ہونہاروں کے بارے میں تفصیلی مضمون جلد شائع کریں) ابن کبیر کی بدقسمت ایک جاندار تحریر تھی۔ ارنسٹ ہمینگ وے عالمی ادب کا معتبر نام اس کا افسوس ناک انجام۔ شمارے کی بہترین تحریروں میں سے ایک اور تحریر زرد آندھی، مریم کے خان کی ایک اور دلکش تحریر، منگولوں نے جس طرح ایک عالم کو تہس نہس کر دیا، وہ انسانیت کی تاریخ کا ایک دردناک باب ہے اور سب سے بڑھ کر مسلمانوں کے مرکز بغداد کو جس طرح برباد کیا وہ قابلِ عبرت ہے۔ بھگوان شکاری منفرد انداز کی کتھا اختتام پذیر ہوئی۔ امید ہے اسی قسم کی تحریریں پیش کی جاتی رہیں گی۔ ہندو قوم کی فطرت بھی بے نقاب ہوئی جو کہ ایک مسلمان کو ترقی کرتا نہیں دیکھ سکتے، ایک سوال بھی پیدا ہوتا ہے کہ آخر انہوں نے ان کو دینِ اسلام کی طرف مائل کرنے کی کوشش کیوں نہیں کی؟ ٹوپی راما ایک معلوماتی تحریر تھی۔ ہمت مرداں میں لیری کی ہمت واقعی قابلِ تحسین ہے اور ان لوگوں کے لیے قابلِ مثال ہے جو سب کچھ ہونے کے باوجود کچھ نہیں کرتے۔ سراب اپنے مخصوص انداز میں جاری ہے۔ سچ بیانیوں میں بزنس از بزنس، بے اماں، بانجھ، کاش پسند آئیں۔ آخر میں محترم آفاقی صاحب کے لیے دعا، پروردگار انہیں جلد از جلد صحت یاب کرے، آمین۔"

✉ رانا حبیب الرحمٰن نے گوجرہ سے لکھا ہے "میں جب چوتھی کلاس میں تھا تو کہانیاں پڑھنے کا شوق تھا، ایک دفعہ میرے کلاس فیلو کے بھائی کو سسپنس پڑھتے دیکھا تو اس سے مانگ کر پڑھا پھر کیا تھا بس سسپنس کے بعد جاسوسی اور اس کے بعد سرگزشت پڑھنا شروع کر دیا اور اسی کے ہو کر رہ گئے۔ 9 سال کی عمر میں بچے کو صحیح طرح اردو پڑھنا نہیں آتی، میرے ساتھ ایسا کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ میرے لیے یہ بہت آسان تھا، گھر والوں کے روکنے کے باوجود میں چوری چھپے کمرے میں بند ہو کر پڑھنے بیٹھ جاتا، اب مسئلہ یہ ہے کہ میں تقریباً 6 ماہ سے سسپنس، جاسوسی میں خط لکھتا ہوں لیکن اتنی بے رخی کے ساتھ اسے ردی کی ٹوکری میں پھینک دیا جاتا ہے اور بلیک لسٹ میں نام دے کر نظر انداز کر دیا جاتا ہے (آپ کی شکایت بجا ہے لیکن کبھی جگہ کی کمی کے باعث خطوط شائع ہونے سے رہ جاتے ہیں، سرگزشت میں خوش آمدید) اب ہر رسالے میں عشق ناکام نمبر کا اشتہار آ رہا ہے، جس کا تقریباً ہر قاری کو شدت سے انتظار ہے۔ غالب بنگالہ کی سرگزشت کے بعد شہرِ خیال میں پہنچے اور سب سے آخر میں سرگزشت کے لکھاری یعقوب جمیل کے انتقال کا سن کر بہت زیادہ افسوس ہوا، یعقوب جمیل صاحب ایک قابلِ فخر کہانی نویس تھے جن کی کہانیاں بہت ہی عمدہ ہوتی تھیں۔ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے اور جنت میں جگہ دے اور لواحقین کو صبرِ جمیل عطا فرمائے، آمین۔ سب سے پہلے رانا محمد سجاد صاحب، اگر عشق ناکام نمبر کی تاریخ کا اعلان کر دیا جاتا تو جیسے اب قارئین کے دلوں کی دھڑکنیں تیز ہیں، ایسی تیز نہیں ہوتی تھیں اور آپ کو تو پتا ہی ہے کہ اصل سسپنس اسی کا نام ہے اور آپ کی اطلاع کے لیے کہ ساگر کلوکر صاحب پہلے سسپنس اور جاسوسی میں بھی لکھتے ہیں، اب پتا نہیں سرگزشت کی سرحد میں کیسے داخل ہوئے؟ ناصر صاحب، شکر ہے کہ آپ کو جھجک کے بارے میں معلوم ہو گیا ورنہ پتا نہیں آپ کیا سمجھنے لگے تھے۔ اس کے بعد مہوش رفیق اور جویریہ قاضی، سدرہ بانو ناگوری، معراج الدین، طاہر صوابی کے تبصرے جاندار تھے۔ باقی میری طرح بس ایویں تھے۔ اس کے بعد سفید سرزمین، زرد آندھی، ٹوپی راما جیسی کہانیاں پڑھ کر معلومات کا خزانہ ہاتھ آ جاتا ہے۔ اس کے بعد سراب کا سلسلہ بہت اچھا جا رہا ہے اور سچ بیانیوں میں خالہ روشنا، سفید کوا، بانجھ، کاش بہت ہی پسند آئیں۔ اس کے بعد بیت بازی بہت ہی اچھا سلسلہ ہے۔ اس میں اپنا شعر، پروین صبا، حافظ آباد کے جواب پر لکھا تھا، چھپا دیکھا تو خوشی ہوئی۔"

اب آخر میں ان قارئین کے اسمائے گرامی جن کے محبت نامے شاملِ اشاعت نہ ہو سکے۔

سمندر خان، اکوڑہ خٹک۔ خاقان میرانی، پستی۔ خلیل خاٹخیلی، میانوالی۔ اکرم ضیا، فیصل آباد۔ شہریار، حسن ابدال۔ فیروز خان، منچور۔ طلحہ یاسین، سرگودھا۔ نادر قائم خانی، میرپور خاص۔ قائم شاہ، میرپور بٹھورو۔ شہزاد خلیل، گوجرانوالہ۔ عبدالقدیر، شیخوپورہ۔ عمران خان، لاہور۔ ارباز خان، پشاور۔

✉

پیش گو

ڈاکٹر ساجد امجد

وہ خدا کے برگزیدہ بندے تھے مگر بادشاہِ وقت کے قیدی تھے۔ نبوت کے حامل تھے مگر مجبور بنادیے گئے تھے۔ پیش گوئی میں ملکہ حاصل تھامگر اپنی قسمت کا لکھا پڑھ نہیں پارہے تھے۔ وقت سے پہلے نوشتۂ دیوار پڑھ لیتے تھے۔ جو کہتے سچ ثابت ہوتا۔ آپؑ کی اسی خوبی نے آپؑ کو ممتاز بنایا۔ مگر حادثات تو گویا ان کے تعاقب میں رہتے تھے۔ ایسے ایسے عجیب وغریب سانحات درپیش آتے تھے کہ لوگ انگشت بدنداں رہ جاتے تھے۔ آپ کی روداد زیست خود میں منفرد ہے۔

ایک معجزنما، برگزیدہ تر صاحبِ کمال شخصیت کا تذکرۂ خاص

بنی اسرائیل کی سرکشی اور شرارت حد سے تجاوز کر چکی ہے اور ظلم وفساد کا بازار گرم۔ ہے کہ خدا کی جانب سے اس زمانے کے پیغمبر یرمیاہ علیہ السلام پر وحی آتی ہے کہ بنی اسرائیل میں منادی کردو کہ وہ ان حرکات بد سے باز آجائیں ورنہ گزشتہ قوموں کی طرح ان کو تباہ وبرباد کردیا جائے گا۔ یہ ساتویں صدی قبل مسیح کے نصف کا زمانہ ہے۔

یرمیاہ علیہ السلام نے خدا کا یہ پیغام جب بنی اسرائیل تک پہنچایا تو انہوں نے کوئی اثر قبول نہ کیا بلکہ یرمیاہ علیہ السلام کا مذاق اُڑاتے رہے۔ یرمیاہ علیہ السلام انہیں برابر آگاہ کرتے رہے کہ وہ بابل کے بادشاہ کے ہاتھوں برباد ہوں گے اور وہ ان کو قید کرکے بابل لے جائے گا اور یروشلم کو مٹا دیا جائے گا۔

لوگ اپنے نبی کی پیش گوئی کو مذاق میں اُڑا رہے تھے، لیکن خدائی عہد کے پورا ہونے کے اسباب بنتے جارہے تھے۔ اسی زمانے میں بخت نصر کو بابل کی بادشاہت ملی تھی۔ اس نے اپنی قاہرانہ اور جابرانہ طاقت سے قرب وجوار کی تمام حکومتوں کو مسخر کرلیا تھا۔ ساحلی علاقوں کے بیش بہا خزانے بابل پہنچے تو جھونپڑیوں اور کچے گھروں کا یہ شہر دلکش عمارتوں میں تبدیل ہونے لگا۔

بخت نصر اس بات کو تشویش سے دیکھ رہا تھا کہ یروشلم کا بادشاہ، مصریوں کا باج گزار بنا ہوا ہے۔ یہویقیم یروشلم پر حکومت کررہا تھا کہ مصریوں کو بابل کے ہاتھوں شکست ہوئی۔ بخت نصر نے جنوبی فلسطین کے اندر کافی دور تک پیش قدمی کرلی، خزانے لوٹ لیے اور ہزاروں بنی اسرائیل کو بھیڑ بکریوں کی طرح ہنکاتا ہوا بابل کی طرف چل دیا۔

یرمیاہ علیہ السلام جس روز بد سے ڈرا رہے تھے، وہ آن پہنچا تھا۔ ہزار میل کا یہ سفر ان اسیروں کو پیدل طے کرایا جارہا تھا۔ پیروں میں زنجیریں تھیں اور پیچھے پیچھے بابلیوں کے گھوڑے تھے جو ان قیدیوں کو تیز دوڑنے پر مجبور کررہے تھے۔ کبھی کبھی کسی کمزور مسافر کو ٹھوکر لگتی تو بابل کے فوجیوں کے قہقہے گونجنے لگتے۔

"یہ جو ٹھوکریں کھاتے، گرتے، پڑتے چلے جارہے ہیں، اپنے آپ کو انبیا کی اولاد کہتے ہیں۔ ان کی اللہ تعالیٰ نے کوئی مدد نہیں کی۔ ہمارے بادشاہ نے انہیں قتل بھی کیا اور اسیر بنا کر بھی لے جارہا ہے۔" بابل کا ایک فوجی اپنے ساتھی سے کہہ رہا تھا۔

"جب انہوں نے گناہ کیے، ظلم کیا اور حد سے بڑھ گئے تو ان پر ہمارے بادشاہ کو مسلط کردیا گیا۔ قوموں کے درمیان یہی ہوتا ہے۔"

"بخت نصر اب ان کے ساتھ کیا سلوک کرے گا؟"

"کیا خبر قتل کرادے یا ان کو غلام بنا کر رکھے یا ہمیشہ قید میں پڑے رہیں، کیا کہا جاسکتا ہے۔"

"ان میں تو میں معصوم، کم سن نوجوان بھی دیکھ رہا ہوں۔ یہ بھی بے موت مارے جائیں گے۔ ذرا اس نوجوان کی طرف دیکھو جس کی عمر بہ مشکل سترہ سال ہوگی۔ اس کے ماں باپ قتل کردیے گئے ہوں گے اور اسے قید کرکے لے جایا جارہا ہے۔ مجھے تو اس پر رحم آتا ہے۔"

"خبردار! ان لوگوں کے لیے ہمدردی کا کوئی لفظ زبان

www.Paksociety.com

سے مت نکالنا۔ جاسوس اِدھر اُدھر پھر رہے ہیں۔ کسی نے سن لیا اور بخت نصر تک بات جا پہنچی تو تیرے ساتھ میری بھی مصیبت آجائے گی۔"

اس فوجی نے اپنے ساتھی کی بات سنی اور چپ ہوگیا' لیکن اس کی نظریں اب بھی اس نوجوان پر جمی ہوئی تھیں جو نہایت متانت سے سر جھکائے بیٹھا تھا۔ اس کے چہرے پر نہ خوف تھا نہ گھبراہٹ۔ بس کسی سوچ میں گم تھا۔ وہ کیا سوچ رہا ہے اس کی تہ تک کون پہنچ سکتا تھا؟

یہ نوجوان مستقبل کے نبی دانیال علیہ السلام تھے جن کو ابھی بارِ نبوت عطا نہیں ہوا تھا لیکن اپنی صالح طبیعت اور سنجیدگی کی وجہ سے یروشلم میں اچھی نظروں سے دیکھے جاتے تھے۔ اسیری کے اس سفر میں بھی ان کی بے خوفی اور اطمینان دوسروں کو حوصلہ دلانے کا باعث بن رہا تھا۔

ان اسیروں کا قافلہ بابل میں داخل ہوا اور انہیں آباد کرنے کا مسئلہ درپیش ہوا تو بخت نصر نے نہایت عقل مندی سے انہیں مختلف حصوں میں بانٹ کر مختلف جگہوں پر آباد کرنے کے احکام صادر کیے تاکہ ان سے کام لیا جاسکے۔ لکڑی کا کام کرنے والے ایک حصے میں آباد ہوگئے۔ طلائی اور نقرئی ظروف بنانے والے ایک محلّے میں بسائے گئے۔ ان صناع گروں سے بابل کی تزئین و آرائش کا کام لیا جانے لگا۔ جتنے کاشتکار تھے انہیں کھیتوں میں کام کرنے کے لیے چھوڑ دیا گیا جو کوئی ہنر نہ جانتے تھے یا کم عمر تھے انہیں مختلف دیہات میں بسا دیا گیا۔ یہ لوگ آزاد تھے کہ محنت مزدوری کر کے جس طرح چاہیں روزی پیدا کریں۔

بخت نصر نے اپنے خواجہ سراؤں کے سردار اسپنز کو ان اسیروں کا افسر مقرر کیا تھا۔

ایک عرصہ گزر جانے کے بعد جب تمام اسیر اپنے اپنے ٹھکانے سے لگ گئے تو بخت نصر کو خیال آیا کہ اسیروں میں سے کچھ لوگ ایسے بھی ہوں' جو اس کے دربار میں ہر وقت حاضر رہیں اور اسے یاد دلاتے رہیں کہ وہ انہیں یروشلم سے قیدی بنا کر لایا ہے۔ وہ انہیں مہذب غلاموں کی شکل میں دیکھنا چاہتا تھا۔ اس نے اس منصوبے پر عمل کرنے کے لیے خواجہ سرا اسپنز کو طلب کیا۔

"اے خواجہ سرا سن! میں چاہتا ہوں کہ ان اسیروں سے کچھ ایسے لوگ تلاش کر جو عقل و دانش میں اور ظاہری حسن میں ایسے ہوں جو میرے دربار میں کھڑے رہنے کے لائق ہوں۔"

"ان معمولی قیدیوں میں ایسے لوگ کہاں دستیاب ہوں گے؟"

"یہ معمولی لوگ نہیں ہیں۔ ان میں ایسے بھی ہیں جو بادشاہوں کی اولاد ہیں اور انبیازادے ہیں۔ انہیں تلاش کر، اپنی زبان سکھا، ان کی خوراک کا خیال رکھ اور جب وہ تندرست و توانا ہو جائیں تو انہیں میرے سامنے پیش کر۔ اس مقصد کے لیے میں ان کے لیے شاہی خزانے سے وظیفہ مقرر کروں گا۔"

"اگر ایسے نوجوان مجھے مل بھی گئے تو ان کی تربیت محض چند روز میں تو نہیں ہو جائے گی۔"

"میں تجھے تین سال دیتا ہوں۔ اس عرصے میں تو ایسے نوجوان تیار کر کے میرے پاس حاضر ہو۔"

اسپنز نے سپاہیوں کو مختلف علاقوں کی طرف دوڑا دیا اور خود بھی مطلوبہ لوگوں کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا۔ کئی روز کی تگ و دو کے بعد ایک دیہات میں اسے چار نوجوان ملے۔ انہی میں ایک دانیال علیہ السلام جو اپنے تین ساتھیوں کے سرپرست تھے۔ ان تینوں کے نام بالترتیب خنیاہ، میسائیل اور عزریاہ (عزیز) تھے اور چوتھے دانی ایل یعنی دانیال۔

اسپنز نے معلومات کرنے کے بعد اس جھونپڑے پر دستک دی جہاں یہ تینوں مقیم تھے۔ خنیاہ نے دروازہ کھولا اور اپنے سامنے اسپنز اور چند سپاہیوں کو کھڑے دیکھا تو حیرانی کے سوا ان کے پاس کہنے کو کچھ نہیں تھا۔ ایک قیدی کے دروازے پر سرکاری کارندوں کی موجودگی عتاب کے سوا اور کیا ہو سکتی تھی۔ دوسری طرف اسپنز کا حال بھی یہی تھا۔ وہ دروازہ کھولنے والے کے حسن و جمال میں گم تھا۔

"ہم سے کیا خطا ہوئی جو آپ نے ہمیں ڈھونڈ نکالا؟"

"تمہارے نصیب جاگے ہیں۔ بادشاہ تمہیں اور تمہارے بقیہ ساتھیوں کو اپنا مقرب بنانا چاہتا ہے۔"

"ہم سے ہمارا دیار چھوٹ گیا ہے۔ ہمارے کلیجے صدموں سے چاک ہیں۔ ہم بھلا بادشاہ کے دربار میں کیسے کھڑے ہو سکتے ہیں۔"

"میں تمہارے صدموں کا ازالہ کرنے ہی تو آیا ہوں۔ کیا تم مجھے اپنے ساتھیوں سے نہیں ملواؤ گے؟"

"اندر آجاؤ۔ باقی باتیں ہمارے سرپرست دانیال سے کرنا کیونکہ وہ جو کہتا ہے، ہم وہ کرتے ہیں، جس سے روکتا ہے، رک جاتے ہیں۔"

اسپنز اندر پہنچا اور دانیال علیہ السلام پر اس کی نظر پڑی تو جیسے حواس گم ہوگئے۔ اس نے ایسا حسن اس سے پہلے نہیں دیکھا تھا۔ اب چاروں لڑکے اس کے سامنے تھے اور اسے یہ اندازہ کرنا مشکل ہو رہا تھا کہ کس کو زیادہ حسین کہے۔

اس نے ان چاروں کو بادشاہ کے ارادے سے آگاہ کیا اور درخواست کی کہ وہ اس کے ساتھ بادشاہ کے پاس چلیں تاکہ وہ بادشاہ سے اپنے انتخاب کی داد پا سکے۔ دانیال علیہ السلام نے کچھ اور پوچھنا چاہا' لیکن اسپنز نے انہیں یہ کہہ کر خاموش کر دیا کہ باقی باتیں خود بادشاہ انہیں بتائے گا۔

اسپنز انہیں لے کر بادشاہ کے حضور پہنچا تو بادشاہ بھی ان نوجوانوں کے حسن سے مرعوب ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ ان سے گفتگو کی تو عقل و دانش سے بھی متاثر ہوا اور قائل ہوا کہ یہ واقعی انبیازادے ہیں۔

"تمہارا نام کیا ہے؟" بخت نصر نے دانیال علیہ السلام سے پوچھا۔

"دانیال!"

"آج سے تمہارا نام بیلطشفر ہوگا۔"

دوسرے سے پوچھا "تمہارا نام کیا ہے؟"

"خنیاہ!"

"ہماری زبان کے مطابق آج سے تمہارا نام سدرک ہے۔"

میسائیل سے پوچھا اور ان کا نام مشاج تجویز کیا۔ اسی طرح جب عزریاہ (عزیز) کی باری آئی تو ان کا نام عبدنجو یعنی غلام آتش رکھا گیا۔

"خبردار! اپنے پُرانے ناموں کو بھول جانا۔ اب تمہیں نئے ناموں سے پکارا جائے گا۔" اس کے بعد اسپنز کو حکم دیا کہ انہیں کلدانی زبان سکھاؤ، بابلی لباس پہناؤ اور شاہی آداب سکھاؤ تاکہ یہ جب ہمارے دربار میں آئیں تو پوری طرح تربیت یافتہ ہوں۔ ان کو خوب اچھی خوراک کھلاؤ تاکہ ان کے چہرے خوب تر و تازہ ہو جائیں۔

"تمہیں شاہی خوراک کھلائی جائے گی اور وہ شراب جو شاہی خاندان کے لیے مخصوص ہے، پلائی جائے گی۔"

دانیال علیہ السلام اس وقت تو خاموش رہے لیکن دربار سے باہر آتے ہی انہوں نے اسپنز سے وضاحت طلب کی۔ "شاہی خوراک سے بادشاہ کی مراد کیا تھی؟"

"وہ گوشت جو عام لوگوں کو نصیب نہیں ہوتا، جس کے کھانے سے رگوں میں خون دوڑنے لگتا ہے۔"

"ہمیں معلوم ہے۔ یہ وہ گوشت ہوگا جو دیوتاؤں کے نام پر ذبح ہوتا ہے۔ ہمارے مذہب میں یہ حرام ہے۔ ہم کلدانی زبان سیکھ سکتے ہیں۔ بابلی لباس پہن سکتے ہیں' لیکن حرام گوشت نہیں کھا سکتے۔"

"پھر تو تم شراب پینے سے بھی انکار کرو گے؟"

"یقیناً۔ ہم تجھ سے درخواست کریں گے کہ تو ہمیں ان دونوں چیزوں سے معذور سمجھ۔ ہمیں تو معمولی سبزیاں کھلا اور پینے کے لیے پانی بہت ہے اور ہمیں بت پرستی پر بھی مجبور مت کر۔"

یونیورسٹی آف لوبک (Lubeck) میں ہونے والے ایک مطالعے کے بعد ماہرین نے بتایا ہے کہ گلاب کی خوشبو سے ذہنی صحت میں بہتری واقع ہوتی ہے اور خاص طور پر رات کو سوتے وقت گلاب کی خوشبو سونگھنے والے افراد کی ذہنی صحت کی کارکردگی پر انتہائی مثبت اثرات مرتب ہوتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ بیشتر طالب علم امتحانات کے دنوں میں گلاب کی خوشبو کا اسپرے کرنے کو زیادہ ترجیح دیتے ہیں۔ گلاب کی خوشبو کے ذہنی صحت پر مثبت اثرات کے حوالے سے یہ مطالعہ ڈاکٹر جان بورن کی سربراہی میں ہوا جسے برطانوی جریدے ہفت روزہ "نیچر" نے اپنی حالیہ اشاعت میں شامل کیا ہے، ماہرین کا کہنا ہے کہ دن کے برعکس رات کو گلاب کی خوشبو ذہنی صحت کی کارکردگی کو زیادہ فعال کر دیتی ہے، گلاب کی خوشبو سونگھنے کے بعد سونے والے افراد کی ذہنی صحت پر انتہائی مفید اثرات مرتب ہوتے ہیں اور ماضی کی وہ یادداشت جو ایک طویل عرصہ گزر جانے کے بعد وہ بھول چکے ہوتے ہیں، رات کو سوتے وقت گلاب کی خوشبو سونگھنے سے اس کے بحال ہونے کے امکانات بہت بڑھ جاتے ہیں۔ ماہرین کا کہنا ہے کہ انسانی دماغ کا ایک انتہائی اہم حصہ Hippocampus ہے جس میں نئی اطلاعات موصول ہونے کے بعد کچھ عرصے تک رہنے کے بعد یہ اطلاعات پیک ہو جاتی ہیں جس کے بعد یہ اطلاعات ایک طویل عرصے تک محفوظ رہتی ہیں۔ اکثر اوقات سونے کے دوران Hippocampus سے یہ معلومات دماغ کے بیرونی حصے Cortex کو منتقل ہو جاتی ہے جس کے سبب پُرانی اطلاعات متحرک ہو جاتی ہیں۔

اقتباس: سائنس کے کرشمے از عاطف عزیز

مرسلہ: نہال احمد، کوٹ ادو

اسپنز نے یہ سن کر سر پیٹ لیا "گوشت نہیں کھاؤ گے اور شراب نہیں پیو گے تو تمہارے چہروں پر سرخی کس طرح آئے گی۔ بادشاہ تمہارے مرجھائے ہوئے چہرے دیکھے گا تو میری گردن اڑا دے گا کہ میں نے تم لوگوں کی مناسب دیکھ بھال نہیں کی۔"

حضرت دانیال علیہ السلام نے اسے تسلی دی "تو ہماری فکر مت کر۔ دس دن کے بعد تو دیکھے گا کہ ہمارے چہرے اب سے بڑھ کر شگفتہ ہو چکے ہیں۔ تجھے بادشاہ کے سامنے شرمندگی نہیں ہوگی۔"

"یہ کس طرح ممکن ہے کہ شراب اور گوشت کے بغیر تمہارے چہرے تروتازہ ہو جائیں اور اگر بادشاہ کو یہ معلوم ہو گیا کہ میں نے تمہیں گوشت کے بجائے سبزیاں کھلائی ہیں تو وہ تو یہی سمجھے گا کہ میں نے بے ایمانی کی ہے۔ بادشاہ اسے اپنی بے عزتی بھی تصور کرے گا۔"

"ہم تجھے یقین دلاتے ہیں کہ بادشاہ کو کچھ معلوم نہ ہو سکے گا۔ ہماری اچھی صحت دیکھ کر اسے اندازہ نہیں ہوگا۔ ہم بھی اس سے کچھ نہیں کہیں گے۔"

اسپنز کسی طرح ماننے کو تیار نہیں تھا مگر مصیبت یہ تھی کہ وہ انہیں بادشاہ کے حضور پیش کر چکا تھا اور اب ان کی جگہ دوسرے نوجوانوں کو منتخب نہیں کر سکتا تھا۔ بادشاہ سے بھی یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ یہ نوجوان اس کی حکم عدولی کر رہے ہیں۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ ایسے حسین چہرے خاک و خون میں نہلائے جائیں۔ ان پر بادشاہ کا عذاب نازل ہو۔ بادل ناخواستہ اسے تیار ہونا پڑا کہ وہ انہیں کھانے کے لیے سبزیاں اور پینے کے لیے سادہ پانی فراہم کرے۔ وہ یہ اہتمام بھی کر رہا تھا کہ روز انہیں آ کر دیکھ جایا کرتا تھا اور یہ دیکھ کر حیران ہو رہا تھا کہ ان کے چہروں پر وہی رنگ چڑھ رہا تھا جو شراب اور گوشت کے استعمال سے چڑھتا ہے۔

جب دس دن گزر گئے اور اسپنز نے دیکھا کہ دانیال علیہ السلام اور ان کے ساتھیوں کے چہرے ان سے بھی زیادہ چمک رہے ہیں جو گوشت اور شراب استعمال کرتے ہیں تو اسے قدرے حیرانی ہوئی۔ وہ چند لوگوں کو ان کے پاس لایا تاکہ تصدیق ہو سکے۔

"دیکھو تو، ان کے چہرے کیسے چمک رہے ہیں۔" اسپنز نے ان لوگوں سے کہا۔

"چمکیں گے کیوں نہیں۔" ان لوگوں نے کہا "آخر گوشت کھا رہے ہیں اور شراب بھی پی رہے ہیں جو بادشاہوں کو نصیب ہوتی ہے۔"

اسپنز کو یقین آ گیا کہ یہ اس کی نظروں کا دھوکا نہیں۔ اب وہ انہیں بے خوف و خطر بادشاہ کے سامنے پیش کر سکتا تھا۔ وہ انہیں بادشاہ کے پاس لے گیا کہ وہ ان کی صحت ملاحظہ کر لے۔ اس نے بادشاہ کو کچھ نہیں بتایا کہ وہ ان نوجوانوں کو گوشت نہیں ساگ پات کھلا رہا ہے۔ بادشاہ ان کی صحت دیکھ کر بہت خوش ہوا، بلکہ دس دن میں وہ اپنی عمر کے دوسرے نوجوانوں کے مقابلے میں زیادہ صحت مند نظر آ رہے ہیں۔ پھر اس نے اسپنز کو حکم دیا کہ ان نوجوانوں کو کلدانی زبان سکھا اور ہر علم میں طاق کر دے اور میرے پاس تین سال بعد لے آ۔

اب اسپنز کو یقین آ گیا کہ یہ اس کی نظر کا دھوکا نہیں تھا۔ دانیالؑ اور ان کے ساتھیوں کی صحت واقعی قابلِ رشک ہے۔ یہ بات البتہ اس کے ذہن میں کھٹک رہی تھی کہ محض سبزیاں کھانے اور سادہ پانی پینے سے کسی کی صحت کیسے بحال رہ سکتی ہے؟

اب اسپنز کو دوسرے منصوبے پر عمل پیرا ہونا تھا۔ اس نے ان نوجوانوں کے لیے شاندار مکان کا انتظام کیا اور انہیں اسی میں ٹھہرا دیا۔ بہترین اساتذہ ان کی تعلیم و تربیت کے لیے مقرر کیے۔

تین سال کے عرصے میں انہوں نے کلدانی زبان میں خوب مہارت حاصل کی۔ دانیالؑ خاص طور پر ان علوم میں خوب طاق ہو گئے۔ علم نجوم، حکمت و ریاضی اور تعبیر خواب بتانے میں انہیں خوب مہارت ہو گئی تھی۔ لوگ دور دور سے چل کر آتے تھے اور اپنی خواب بیان کر کے تعبیر پوچھا کرتے تھے۔ یہ باتیں بادشاہ کے علم میں بھی لائی جاتی رہتی تھیں بالآخر جب تین سال پورے ہو گئے تو بادشاہ نے حکم جاری کیا کہ نوجوانوں کو میرے روبرو پیش کیا جائے۔

اسپنز مکان پر حاضر ہوا۔ اس وقت دانیال علیہ السلام کہیں گئے ہوئے تھے جبکہ اسپنز کو انہیں دربار لے جانے کی جلدی تھی۔ ان کے ساتھیوں نے اسے بتایا کہ وہ قریبی جنگل میں ہوں گے۔ اللہ کی عبادت کرنے وہ جنگل میں چلے جاتے ہیں اور اکثر دن دن بھر وہیں گزار دیتے ہیں۔ اس وقت بھی وہ وہیں ہوں گے۔ اسپنز کو حیرت ہوئی کہ وہاں کون سا بت ہے جس کی وہ پرستش کرتے ہیں۔

"وہاں تو "بعل" کا کوئی بت نہیں ہے پھر وہ کس کی

وہ عشق جو ہم سے روٹھ گیا
اب اس کا حال بتائیں کیا

مگر ہم آپ کو بتائیں گے اور خوب بتائیں گے۔

جی ہاں ...... ماہنامہ سرگزشت کراچی کا ایک اور معرکتہ الآرا خاص نمبر

عشقِ ناکام نمبر

عشق ...... جس میں مہر بھی ہے اور قہر بھی، وصل بھی ہے اور فراق بھی ...... عشق، انسان سے کیا کچھ نہیں کراتا انہوں نے بھی اپنی شہرت و ناموری کو داؤ پر لگا دیا۔

مشہور و معروف ہستیوں، تاریخ ساز افراد کے ناکام عشق کی داستانیں ...... دل پر اثر کرنے والی سچ بیانیاں، ایسی دلچسپ سچی کہانیاں جو آپ کو چونکا دیں گی۔

بہت جلد آپ کے ہاتھوں میں ہوگا

ایک ایسا خاص شمارہ جسے آپ محفوظ رکھنا ضروری سمجھیں گے

www.Paksociety.com

پرستش کرتے ہیں؟"

"دانیال علیہ السلام کسی بت کی نہیں، خدا کی عبادت کرتے ہیں۔"

"دربار سے وابستہ ہوجانے کے بعد اسے بت پرستی اختیار کرنی پڑے گی۔"

"ہم نے تجھ سے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ ہمیں مذہب بدلنے پر مجبور نہ کیا جائے۔"

"بادشاہ کے احسانات کا بدلہ یہ ہے کہ تم اس کے بتوں کی پرستش کرو۔"

"یہ دانیال کا مسئلہ ہے۔ تم خود اس سے بات کرکے دیکھ لو۔"

"مگر وہ ہے کہاں؟"

"ہم نے کہا تو ہے وہ جنگل میں ہوگا۔"

اسپنز نے اسی وقت اپنے آدمی دوڑادیے کہ دانیال جہاں کہیں ہو اسے تلاش کرکے لائیں۔ وہ روانہ ہوئے اور تھوڑی دیر میں دانیال علیہ السلام کو تلاش کرکے لے آئے۔ اسپنز نے بت پرستی کا تذکرہ اس سے بھی کیا۔ انہوں نے بھی وہی جواب دیا۔ جو ان کے ساتھی دے چکے تھے۔ اسپنز نے اس وقت بات کو بڑھانا مناسب نہ سمجھا اور ان سے کہا، وہ دربار چلنے کے لیے تیار ہوجائیں۔ انہیں کلدانی لباس پہنایا اور شاہی بگھی میں سوار کرکے بادشاہ کے محل پہنچ گیا۔

بادشاہ انہیں تین سال بعد دیکھ رہا تھا اور سوچ رہا تھا، کیا یہ وہی نوجوان ہیں؟ کلدانی لباس میں ملبوس بالکل مقامی معلوم ہورہے تھے۔ روانی سے مقامی زبان بول رہے ہیں۔ بادشاہ نے مختلف علوم کے اساتذہ کو طلب کیا اور ان سے کہا کہ وہ دانیال علیہ السلام کا امتحان لیں اور یہ جانچیں کہ انہیں مختلف علوم پر کتنی دسترس حاصل ہوئی ہے۔

یہ اساتذہ ان کا امتحان لینے کے لیے حاضر ہوئے تھے لیکن تھوڑی دیر بعد ہی شاگردوں کی طرح ان کے سامنے بیٹھنے پر مجبور ہوگئے۔ بادشاہ نے دانیال علیہ السلام اور ان کے ساتھیوں کو دیگر اساتذہ سے دس درجہ بہتر پایا۔ بادشاہ نے انہیں خدمت سونپی کہ وہ دربار میں اس کے مقابل کھڑے رہا کریں۔

یہ چاروں اپنی خدمات نہایت مستعدی سے انجام دینے لگے۔ بادشاہ ان کی قابلیت سے ایسا خوش تھا کہ اپنے قریب سے ہٹنے نہیں دیتا تھا۔

انہی دنوں ایک ایسا واقعہ پیش آگیا جس نے بخت نصر کی پوری سلطنت کو ہلادیا۔ جتنے بڑے بڑے کاہن، نجومی اور اہلِ حکمت تھے جان کے خوف سے روپوش ہوگئے۔ عام آدمیوں کو بھی اپنی جان کا خطرہ لاحق ہوگیا۔ بادشاہ اتنے جلال میں تھا کہ قتلِ عام کا حکم بھی دے سکتا تھا۔ ہوا یہ تھا کہ بادشاہ نے کوئی خواب دیکھا لیکن بیدار ہونے پر خواب اسے یاد نہ رہا۔ بس اتنا یاد تھا کہ یہ خواب نہایت بھیانک تھا۔ ایسا بھیانک کہ اس رات کے بعد وہ کسی رات نہ سوسکا۔ اس کے دربار میں اور حدودِ سلطنت میں نجومیوں اور خواب کی تعبیر بتانے والوں کی کمی نہیں تھی۔ اس نے ان سب کو طلب کیا اور منادی کرادی کہ جو میرے خواب کی تعبیر بتائے گا، میں اسے انعام سے مالا مال کردوں گا لیکن اگر انہوں نے میرے خواب کی تعبیر نہ بتائی تو میں ان کی گردنیں اُڑادوں گا اور ان کے گھروں کو مسمار کردوں گا۔

اپنے علم پر نازاں اہلِ علم صفیں باندھے ان کے سامنے حاضر ہوگئے۔ بادشاہ کا چہرہ خوف اور خطرے کے اثر سے سفید ہورہا تھا۔ وہ غصے میں تھا لیکن غصے کی سرخی چہرے سے ظاہر نہیں ہورہی تھی۔ جیسے خوف نے سارا خون نچوڑ لیا ہو۔

"میں نے ایک خواب دیکھا ہے اور اب اس خواب کی تعبیر دریافت کرنے کے لیے بے تاب ہوں۔"

"اے بادشاہ تو ابد تک جیتا رہ۔" تمام نجومیوں نے بہ یک وقت کہا "تو اپنا خواب ہم سے بیان کر۔ کیا مجال جو ہم اس کی تعبیر نہ بتاسکیں۔"

"وہ خواب میں بھول چکا ہوں۔ میں تو یہ چاہتا ہوں کہ وہ خواب بھی تم بتاؤ اور اس کی تعبیر بھی بیان کرو۔"

"اے بادشاہ تو ابد تک جیتا رہ۔ ایسا کون ہوگا جو بادشاہ کے دل کی بات بتاسکے اور ایسا سوال بھی کسی امیر یا حاکم نے کبھی کیا ہوگا؟ دیوتاؤں کے سوا کون ہوگا جو یہ بتاسکے؟"

"مجھے خوب معلوم ہے کہ تم حیلے بہانے کررہے ہو جبکہ تم جانتے ہو کہ میں تم سب کے قتل کے احکام جاری کرچکا ہوں۔ اگر تم نے میرے خواب کی تعبیر نہیں بتائی تو میں تم سب کو ہلاک کردوں گا۔"

"بادشاہ، ہم پر رحم کی نظر ڈالے۔ یہ ہمارے اختیار سے باہر ہے کہ ہم بھولے ہوئے خواب کو دُہراسکیں۔ ہاں اگر ہمیں خواب معلوم ہوجائے تو ہم ضرور تعبیر بتاسکتے ہیں۔"

"یہ کیوں نہیں کہتے کہ تم اب تک اپنے علم کا ڈھونگ رچاتے رہے ہو۔ تم میں اتنی اہلیت ہی نہیں، میں تمہیں وظیفے دیتا رہا۔ اب امتحان کا وقت آیا تو تم سب بھاگ رہے ہو۔"

بادشاہ نے کہا "میں تمہیں دو تین دن کی مہلت دیتا ہوں، اس کے بعد تم جابہ جا قتل کیے جاؤ گے۔"

بادشاہ کے غضب سے ہر بدن کانپنے لگا۔ تمام حکیم خواب کی تعبیر بتانے سے قاصر تھے۔ اب تو وہ صرف یہی کرسکتے تھے کہ جنگلوں میں جاکر روپوش ہوجائیں کیونکہ تین دن گزر چکے تھے اور بادشاہ کی طرف سے قتل کے احکام جاری ہوچکے تھے۔

بابل کی سرزمین اہلِ علم سے اچانک خالی ہوگئی۔ جتنے اہلِ نجوم اور خواب داں تھے اس طرح غائب ہوگئے جیسے کبھی تھے ہی نہیں۔

بادشاہ کے سپاہی ننگی تلواریں ہاتھوں میں لیے گلی گلی گھوم رہے تھے۔ انہیں دانیال علیہ السلام اور ان کے ساتھیوں کی بھی تلاش تھی لیکن وہ روپوش نہیں ہوئے تھے۔ خدا نے انہیں سپاہیوں کی نظروں سے دور کردیا تھا۔ اسپنز اور اس کے سپاہی کئی مرتبہ حضرت دانیال علیہ السلام کے مکان میں آکر تلاشی لے چکے تھے لیکن وہاں کوئی بھی نہیں تھا۔ اس کا یہ سمجھنا بجا تھا کہ دانیال علیہ السلام بھی کہیں روپوش ہوچکے ہیں۔

چند دن کے تگ ودو کے بعد بھی کوئی حکیم قتل نہ کیا جاسکا تو بادشاہ کا قہر اپنے اہلکاروں پر برسنے لگا۔ اس نے احکام جاری کردیے کہ اگر اب بھی تمام حکیم ہلاک نہیں کیے گئے تو وہ لوگ قتل کیے جائیں گے جو ان حکیموں کے قتل پر مامور کیے گئے ہیں۔

اسپنز کو دانیال علیہ السلام کی یاد آرہی تھی۔ وہ نوجوان بہت دانش مند ہے۔ میں نے اس کی مدد بھی بہت کی ہے۔ کاش! وہ اپنی روپوشی ختم کرکے مجھے مل جائے اور کسی طرح بادشاہ کے خواب کی تعبیر بتادے تو میری جاں ہلاکت میں پڑنے سے بچ جائے پھر یہ ہوا کہ دانیال علیہ السلام اچانک اس کے سامنے آگئے۔

"بادشاہ سے کہو، دانیال مل گیا ہے۔ اگر مجھے قتل کرنے سے اس کا غصہ کم ہوسکتا ہے تو میں حاضر ہوں۔"

"بادشاہ سے کہنے کی کیا ضرورت ہے۔ یہ کام تو میں خود بھی کرسکتا ہوں۔ مجھے اسی کام پر متعین کیا گیا ہے مگر تمہیں قتل کرکے مجھے ہرگز خوشی نہیں ہوگی۔ بہتر ہے کہ تم کہیں روپوش ہوجاؤ۔"

"مجھے بادشاہ کے پاس لے چلو۔ شاید میں اسے مطمئن کرسکوں۔"

"اس وقت وہ کوئی بات سننے کو تیار نہیں۔ وہ قتل کے احکام صادر کرچکا ہے جس میں تم بھی شامل ہو۔"

"اگر میرے قتل سے باقی لوگوں کی جان بچ جائے تو مجھے خوشی ہوگی۔"

"یہ کام مجھ سے نہیں ہوگا۔"

"پھر میں خود بادشاہ کے پاس جاتا ہوں۔"

"ایسا غضب مت کرنا۔ بادشاہ کا عتاب مجھ پر نازل ہوگا۔ وہ کہے گا، میں تمہیں تلاش نہ کرسکا۔"

"تو پھر مجھے اپنے ساتھ لے کر چلو اور کہو کہ تم مجھے تلاش کرلائے ہو۔"

اسپنز مجبور ہوگیا اور اس نے دانیال علیہ السلام کو بادشاہ کے روبرو پیش کردیا۔

"دانیال! تمہیں تو اپنے علم پر بڑا بھروسا تھا مگر اب معلوم ہوا کہ تمہارا علم اُدھورا ہے اس لیے تم میری نظروں سے پوشیدہ ہوگئے۔"

"مجھے اپنے علم پر کبھی بھروسا نہیں رہا۔ مجھے تو اپنے خدا پر بھروسا ہے۔ وہی مجھے حقیقت سے آگاہ کرے گا۔ مجھے اگر مہلت ملے تو میں بادشاہ کے حضور تعبیر بیان کروں گا۔"

"تم بھی وہی حیلے بہانے کررہے ہو جو دوسروں نے کیے ہیں مگر یاد رکھو جس طرح اب پکڑے گئے ہو آیندہ بھی پکڑے جاؤ گے۔"

"میں کہیں بھاگنے والا نہیں۔ بس مجھے ایک رات اور ایک دن کی مہلت مل جائے۔"

"میں تجھے یہ مہلت دیتا ہوں۔"

دانیال علیہ السلام گھر پہنچے اور اپنے ساتھیوں کو تمام معاملات سے آگاہ کیا اور ان سے استدعا کی کہ وہ بھی ان کے ساتھ مل کر خدا سے اس کی رحمت طلب کریں۔

یہ چاروں پاک نفوس اللہ کے حضور عبادت کے لیے کھڑے ہوگئے۔

"اے رب العزت! تو نے ہم پر کرم کیا ہے کہ ہمیں ایسی باعزت زندگی سے نوازا ہے۔ بادشاہ نے ہمیں اپنا مقرب کیا ہے لیکن اب اس کے تیور بدل گئے ہیں۔ وہ ہماری جان کے درپے ہے۔ ہمیں اس کے عتاب سے بچالے۔ وہ راز ہم پر آشکار کردے جس کی وجہ سے وہ ہماری ہلاکت پر تلا ہوا ہے۔ اس نے جو خواب دیکھا ہے، وہ ہمیں دکھادے اور اس کی تعبیر بھی بتادے۔ ہمیں باقی حکیموں کے ساتھ ہلاک نہ کر۔"

یہ دعا مانگنے کے بعد آپ سونے کے لیے لیٹ گئے۔

www.Paksociety.com

حقیقت کی چاندنی ہر طرف بکھر گئی۔ نیند کی دنیا نے انہیں ایک محل میں پہنچا دیا۔ وہاں بخت نصر محو خواب تھا۔ جو کچھ وہ دیکھ رہا تھا، دانیال علیہ السلام کی آنکھوں پر بھی وہ سب ظاہر ہو گیا۔ بادشاہ جو خواب دیکھ رہا تھا، دانیال علیہ السلام بھی دیکھ رہے تھے۔

جب یہ خواب ختم ہوا تو اللہ نے اس کی تعبیر بھی آپ کو بتا دی اور آپ نے اسے اچھی طرح ذہن نشین کر لیا۔ آنکھ کھلی تو خواب اور تعبیر دونوں اچھی طرح یاد تھے۔ آپ ایک مرتبہ پھر خدا کے حضور سجدے میں گر گئے۔

خدا کا نام تا ابد مبارک ہو۔
کیونکہ حکمت اور قدرت اسی کی ہے۔
وہی وقتوں اور زمانوں کو تبدیل کرتا ہے۔
وہی بادشاہوں کو معزول اور قائم کرتا ہے۔
وہی حکیموں کو حکمت اور دانش مندوں کو دانش عنایت کرتا ہے۔
وہی گہری اور پوشیدہ چیزوں کو ظاہر کرتا ہے
اور جو کچھ اندھیرے میں ہے اسے جانتا ہے
اور نور اسی کے ساتھ ہے۔
میں تیرا شکر کرتا ہوں اور تیری ستائش کرتا ہوں،
اے میرے باپ دادا کے خدا!
جو کچھ ہم نے تجھ سے مانگا تو نے مجھ پر ظاہر کیا،
کیونکہ تو نے بادشاہ کا معاملہ ہم پر ظاہر کیا۔

دانیال علیہ السلام شاہی محل پہنچے تو بادشاہ کو بے تابی سے ٹہلتے ہوئے پایا۔ اس کی نظر جیسے ہی دانیال علیہ السلام پر پڑی اس کی زبان پر پہلا سوال یہی تھا کہ میرے خواب کی تعبیر کا کیا ہوا؟

"میں آپ کو خواب کی تعبیر بتا سکتا ہوں لیکن پہلے ان حکیموں کی معافی کا اعلان کریں جو قتل کے خوف سے روپوش ہو چکے ہیں کیونکہ ان میں میرے کئی استاد بھی شامل ہیں۔"

"اس میں تیری کوئی چال تو نہیں کہ میں ان سب کو معاف کر دوں اور پھر تو غائب ہو جائے؟"

"میرے خدا نے مجھ پر ہر راز آشکارا کر دیا ہے۔ اب میں کہیں غائب ہونے والا نہیں۔"

"جب تک تو میرا خواب مجھے یاد نہیں دلا دیتا اور اس خواب کی تعبیر نہیں بتا دیتا، میں تجھے محل سے نہیں جانے دوں گا۔"

"مجھے منظور ہے۔"

بادشاہ نے عام معافی کا اعلان کر دیا۔ دوسرے دن تمام کاہن اور نجومی جو روپوش ہو گئے تھے، بلوائے گئے۔ دانیال علیہ السلام کو بھی پیش کیا گیا۔

دانیال علیہ السلام نے کہنا شروع کیا "وہ بھید جو بادشاہ نے پوچھا، حکما اور نجومی اور جادوگر اور فال گیر بادشاہ کو نہیں بتا سکتے مگر آسمان پر ایک خدا ہے جو راز کی باتیں آشکارا کرتا ہے۔ اس نے خواب کے ذریعے تجھ پر ظاہر کیا ہے کہ آخری دنوں میں کیا وقوع میں آئے گا۔"

"یہ تو مجھے بھی معلوم ہے۔ مجھے تو تُو یہ بتا کہ میں نے خواب کیا دیکھا تھا۔ ہو سکتا ہے تیرے بتانے سے مجھے یاد آ جائے۔"

"اے بادشاہ! تو نے ایک بڑی مورت دیکھی۔ وہ بڑی مورت تیرے سامنے کھڑی ہوئی ہے اور اس کی صورت ہیبت ناک تھی۔ اس مورت کا سر خالص سونے کا تھا۔ اس کا سینہ اور اس کے بازو چاندی کے اس کا شکم اور اس کی رانیں تانبے کی تھیں۔ اس کی ٹانگیں لوہے کی اور اس کے پاؤں کچھ لوہے کے اور کچھ مٹی کے تھے۔ تو اسے دیکھتا رہا یہاں تک کہ ایک پتھر ہاتھ لگائے بغیر ہی کاٹا گیا اور اس مورت کے پاؤں پر جو لوہے اور مٹی کے تھے، لگا اور ان کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔ تب لوہا اور مٹی اور تانبا اور چاندی اور سونا ٹکڑے ٹکڑے کیے گئے اور ہوا ان کو اُڑا کر لے گئی یہاں تک کہ ان کو پتا نہ چلا اور وہ پتھر جس نے اس مورت کو توڑا اور ایک بڑا پہاڑ بن گیا اور تمام زمین میں پھیل گیا۔"

بادشاہ حیرت سے ان کا منہ تکتا رہا اور پھر یکدم چیخ اُٹھا "تو نے صحیح کہا۔ مجھے سب یاد آ گیا۔ یہ خواب اسی طرح تھا جس طرح تو نے بیان کیا۔ اب تو مجھے اس کی تعبیر بتا۔"

"اے بادشاہ! اب تو اس کی تعبیر سن! اے بادشاہ! تو وہ شہنشاہ ہے جس کو آسمان کے خدا نے بادشاہی قدرت وشوکت بخشی ہے اور جہاں کہیں بنی آدم سکونت کرتے ہیں اس نے میدان کے چرندے اور ہوا کے پرندے تیرے حوالے کر کے تجھ کو ان سب کا حاکم بنایا ہے۔ وہ سونے کا سر تو ہی ہے اور تیرے بعد ایک اور سلطنت برپا ہو گی جو تجھ سے چھوٹی ہو گی۔ اس کے بعد ایک اور سلطنت تانبے کی جو تمام زمین پر حکومت کرے گی اور چوتھی سلطنت لوہے کے مانند مضبوط ہو گی اور جس طرح لوہا توڑ ڈالتا ہے اور سب چیزوں پر غالب آتا ہے۔ اسی طرح وہ ٹکڑے ٹکڑے کرے گی اور کچل ڈالے گی۔ اور تو نے دیکھا کہ اس میں لوہا مٹی سے ملا ہوا

تھا اس میں لوہے کی مضبوطی ہو گی اور چونکہ پاؤں کی انگلیاں کچھ لوہے کی اور کچھ مٹی کی تھیں اس لیے سلطنت کچھ قوی کچھ ضعیف ہو گی اور جیسا تو نے دیکھا کہ لوہا مٹی سے ملا ہوا تھا وہ بنی آدم سے آمیختہ ہوں گے لیکن جیسے لوہا مٹی سے میل نہیں کھاتا ویسے ہی وہ بھی باہم میل نہیں کھائیں گے اور ان بادشاہوں کے ایام میں آسمان کا خدا ایک سلطنت برپا کرے گا جو تا ابد برباد نہیں ہو گی اور اس کی حکومت کسی دوسری قوم کے حوالے نہ کی جائے گی بلکہ وہ ان تمام مملکتوں کو ٹکڑے ٹکڑے اور نیست کرے گی اور وہی ابد تک قائم رہے گی۔ جیسا تو نے دیکھا کہ وہ پتھر ہاتھ لگائے بغیر ہی پہاڑ سے کاٹا گیا اور اس نے لوہے اور تانبے اور مٹی اور چاندی اور سونے کو ٹکڑے ٹکڑے کیا، خدا تعالیٰ نے بادشاہ کو وہ کچھ دکھایا جو آگے ہونے والا ہے اور یہ خواب یقینی ہے اور اس کی تعبیر یقینی ہے۔"

خواب کی تعبیر سنی تو بادشاہ اپنی مسند سے اُترا اور دانیال علیہ السلام کو سجدہ کیا اور حکم دیا کہ دانیال علیہ السلام کو ہدیہ دیا جائے اور ان کے سامنے بخور جلایا جائے۔ گویا بادشاہ انہیں اپنا دیوتا قرار دے رہا تھا۔ بخور دیوتاؤں کے سامنے جلایا جاتا تھا۔

بادشاہ نے بھرے دربار میں اعلان کیا "تیرا خدا معبودوں کا معبود اور بھیدوں کا کھولنے والا ہے۔ اسی لیے تو اس راز کو کھول سکا جس سے تمام اہلِ نجوم عاجز تھے۔"

اس کے بعد بادشاہ نے دانیال علیہ السلام کو انعامات سے سرفراز کیا۔ بابل کے تمام حکیموں پر حکمرانی عنایت کی اور انہیں تمام حکیموں کا سربراہ بنا دیا۔

حضرت دانیال علیہ السلام کو ان اعزازات سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ انہوں نے بادشاہ سے استدعا کی کہ ان کے ساتھیوں کو صوبوں کا سربراہ بنا دیا جائے۔ وہ خود صوبوں کی سربراہی کے بجائے حکیموں پر حکمرانی سے خوش ہیں۔ بادشاہ نے ان کی درخواست قبول کی۔

حضرت دانیال علیہ السلام کو یہ مناصب ملے تو بابلیوں کو سخت ناگوار ہوا۔ وہ کب یہ گوارا کر سکتے تھے کہ ایک غلام ان پر حکمرانی کرے۔ دانیال علیہ السلام نے بابل کے نجومیوں کو قتل ہونے سے بچایا تھا۔ انہیں ان کا احسان مند ہونا چاہیے تھا لیکن وہ حسد کی آگ میں جلنے لگے اور بڑے پیمانے پر ان کی مخالفت شروع کر دی تاکہ انہیں بادشاہ کی نظروں سے گرا دیا جائے۔ انہیں اور کوئی کمزوری تو ہاتھ نہیں آئی۔ بس یہی ایک کمزوری تھی کہ وہ بتوں کی پرستش سے دور تھے۔ محض یہ کمزوری بھی انہیں سزا نہیں دلوا سکتی تھی کیونکہ بادشاہ نے یروشلم سے آئے ہوئے اسیروں کو مذہب تبدیل نہ کرنے کی ضمانت دے رکھی تھی۔ اب ایک ہی صورت تھی کہ بادشاہ کو یہ کہہ کر بھڑکایا جائے کہ دانیال علیہ السلام اور ان کے ساتھی بابلیوں کے دیوتاؤں کو بُرا بھلا کہتے ہیں۔ بادشاہ کے قریب رہنے والوں نے بادشاہ کے کان بھرنے شروع کر دیے۔

"جب ہم ان کے مذہب میں دخل نہیں دے رہے ہیں تو وہ کون ہوتے ہیں ہمارے دیوتاؤں کو بُرا کہنے والے۔ اگر یہی حالات رہے تو ہمارے لوگ ہمارے دین سے برگشتہ ہو جائیں گے۔"

"اگر انہوں نے کسی جادو کے زور سے بادشاہ کے خواب کی تعبیر بتا دی تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ ہمارے دین کے خلاف بولنا شروع کر دیں۔"

"وہ یہاں رہ رہے ہیں تو ان پر یہ بھی لازم ہے کہ وہ ہمارا مذہب بھی قبول کریں۔ اس کے بعد ہی انہیں احساس ہو گا کہ وہ غلام ہیں ہمارے آقا نہیں۔"

بادشاہ پر زور دیا جانے لگا کہ وہ ان کو دی ہوئی رعایت سے ہاتھ اُٹھا لے۔ انہیں مجبور کرے کہ ہماری مورتیوں کو سجدہ کریں۔"

بادشاہ کو یہ باور کرا دیا گیا کہ عوام کی بے چینی بڑھتی جا رہی ہے۔ یروشلم سے آئے ہوئے یہودیوں کو مجبور کیا جائے کہ وہ ہمارے بتوں کو سجدہ کریں اور یہ اسی وقت ہو گا جب دانیال علیہ السلام اور ان کے تینوں ساتھی ایسا کریں گے۔ اس کے بعد عام یہودیوں کی ہمت بھی ٹوٹ جائے گی۔ بادشاہ کا رعب اسی وقت قائم ہو گا جب اس کے غلام اس کی فرمانبرداری کریں گے۔

بادشاہ کو اتنا بھڑکایا کہ وہ کہہ اُٹھا "میں یہ برداشت نہیں کروں گا کہ یروشلم کے قیدی اور غلام ہمارے دیوتاؤں کو بُرا بھلا کہیں۔ انہیں ان دیوتاؤں کی عزت کرنی ہو گی۔"

یہ باتیں چل ہی رہی تھیں کہ بادشاہ کی برہمی کا ایک اور موقع نکل آیا۔ بخت نصر نے سونے کی ایک مورت بنوائی تھی جس کی لمبائی ساٹھ ہاتھ اور چوڑائی چھ ہاتھ تھی اور اسے دورا کے میدان صوبہ بابل میں نصب کیا گیا تھا۔ جب اس کی تعمیر ہو چکی تو بادشاہ نے یہ اعلان جاری کیا کہ تمام ناظم، حاکم، سردار، قاضی، خزانچی، مشیر اور تمام صوبوں کے منصب دار اس مورت کی تقدیس پر حاضر ہوں۔

www.Paksociety.com

اس اعلان کے جواب میں تمام عہدے دار اس کی تقدیس کے لیے اس مقام پر جمع ہو گئے جہاں اس مورتی کو نصب کیا گیا تھا۔ حضرت دانیال علیہ السلام کے ساتھی، حننیاہ، میسائیل اور عزریاہ بھی چونکہ منصب دار تھے، حاضر ہوئے۔ یروشلم کے قیدیوں نے ان کی حاضری کو نفرت سے دیکھا کہ یہ لوگ بالکل ہی کلدانی بن گئے ہیں اور انہوں نے بابلیوں کا مذہب اختیار کرلیا ہے جو اس طرح مورت کی تقدیس کے لیے حاضر ہو گئے ہیں۔

اس مورتی کو شہر کے وسط میں نصب کیا گیا تھا۔ اس کے چاروں طرف حاکم، سردار، منصب دار، خزانچی صفیں بنائے کھڑے تھے۔ حضرت دانیال علیہ السلام کے ساتھی بھی ایک طرف کھڑے تھے کہ منادی کرنے والے نے منادی کی۔

"اے لوگو! جتنے لوگ یہاں جمع ہیں ان کے لیے یہ حکم ہے کہ جس وقت قرنا اور نے اور ستار اور رباب اور بربط اور چغانہ اور ہر طرح کے ساز کی آواز سنو تو اس سونے کی مورت کے سامنے جس کو بخت نصر بادشاہ نے نصب کیا ہے، منہ کے بل گر کر سجدہ کرو اور جو کوئی سجدہ نہیں کرے گا اسی وقت آگ کی جلتی بھٹی میں ڈالا جائے گا۔"

اس اعلان کے ختم ہوتے ہی سازوں کی آواز گونجنے لگی اور وہاں موجود لوگ منہ کے بل زمین پر گر گئے۔ اس میدان میں صرف تین آدمی تھے، جو اپنی جگہ کھڑے ہوئے تھے۔ یہ تینوں حضرت دانیال کے ساتھی تھے۔ پہرے پر متعین سپاہیوں نے قہر آلود نظروں سے ان کی طرف دیکھا۔

"تم سجدے میں کیوں نہیں گرے؟"

"اس لیے کہ ہم ان مورتیوں کی پرستش نہیں کرتے۔ ہمارا خدا آسمان پر ہے۔ ہم اسی کی عبادت کرتے ہیں۔"

"کیا تم یہ بات بادشاہ کے سامنے بھی کہہ سکتے ہو؟"

"ہمیں کوئی خوف نہیں ہوگا۔"

ان تینوں کو اسی وقت گرفتار کرلیا گیا۔ بابل کے شہریوں میں یہ خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی کہ صوبہ داروں کو بادشاہ کی حکم عدولی کے جرم میں گرفتار کرلیا گیا ہے۔

ان تینوں کو عام قیدیوں کی طرح رسیوں میں جکڑ کر بادشاہ کے حضور پہنچا دیا گیا۔ سزا کا اعلان تو پہلے ہی ہو چکا تھا کہ جو سجدہ نہیں کرے گا، اسے آگ میں ڈالا جائے گا لیکن بادشاہ پھر بھی اتفاق کرنا نہیں چاہتا تھا کہ جو خبریں اس تک پہنچی ہیں وہ سچی ہیں یا نہیں؟

"کیا یہ سچ ہے کہ جو سونے کی مورت میں نے بنوائی تھی تم نے اسے سجدہ نہیں کیا؟"

"یہ سچ ہے محترم بادشاہ!"

"کیا تم نے میرا اعلان نہیں سنا تھا؟"

"اعلان بھی سنا تھا۔"

"کیا تم اسے حکم عدولی نہیں سمجھتے؟"

"ایک بادشاہ تم سے بھی بڑا ہے۔ ہم نے اس کا حکم مانا ہے۔"

"کیا تمہیں آگ میں ڈالے جانے سے خوف نہیں آتا؟"

"ہمارا خدا جس کی ہم عبادت کرتے ہیں اتنی قدرت رکھتا ہے کہ ہمیں اس آگ سے چھڑا لے گا۔"

"اب میں بھی دیکھتا ہوں کہ کون سا معبود تم کو میرے ہاتھ سے چھڑائے گا۔"

بادشاہ نے حکم دیا کہ ایک بڑا کنواں تیار کیا جائے اور اس میں کئی دن رات آگ کے بڑے بڑے الاؤ روشن کیے جائیں۔ اس کی آنچ معمول سے سات گنا زیادہ کریں۔ جب اس آگ کی تپش دور تک محسوس کی جانے لگے کنویں کا فرش اور دیواریں تپتے ہوئے لوہے کے مانند ہو جائیں تو مجھے خبر کی جائے۔

اس کنویں کی آگ سات دن تک دہکتی رہی۔ جب یہ خوب گرم ہو گیا تو بخت نصر کو خبر کی گئی "بھٹی تیار ہے۔" بخت نصر نے اپنے لشکر کے چند زور آور پہلوانوں کو طلب کر کے انہیں حکم دیا کہ ان تینوں کو جلتی ہوئی آگ میں پھینک دیں۔ آگ کی تپش اتنی زیادہ تھی کہ کوئی اس کے قریب جانے کی ہمت نہیں کر رہا تھا لیکن بادشاہ کا حکم ٹالا بھی نہیں جا سکتا تھا۔ ان پہلوانوں نے حضرت دانیال علیہ السلام کے تینوں ساتھیوں کو رسیوں میں جکڑا اور آگ کے بنے ہوئے کنویں کی طرف چلے۔ آگ اتنی تیز تھی کہ یہ پہلوان کسی نہ کسی طرح وہاں تک چلے تو گئے۔ تینوں کو کنویں میں پھینک بھی دیا لیکن خود اتنی بُری طرح جھلس گئے کہ اسی وقت دم توڑ گئے۔

یہ تماشا دیکھنے کے لیے ایک خلقت جمع ہو گئی تھی۔ بھٹی میں آگ کے شعلے بلند ہو رہے تھے اور وہ تینوں اندر تھے۔ دانیال علیہ السلام اچانک غائب ہو گئے تھے۔ کچھ لوگوں نے انہیں جنگل کی طرف جاتے ہوئے دیکھا تھا۔ بعض لوگ یہ خیال کر رہے تھے کہ دانیال علیہ السلام اپنے ساتھیوں کو مشکل میں چھوڑ کر کہیں فرار ہو گئے ہیں جبکہ وہ خدا کے سامنے سربہ سجود تھے اور گڑگڑا کر دعا کر رہے تھے۔

خدا کا نام تا ابد مبارک ہو
حکمت اور قدرت اسی کی ہے
تو ہی مارتا ہے اور تو ہی زندہ کرتا ہے
تجھے آگ کو گلزار بنانا آتا ہے
تو انگاروں کو پھولوں میں بدل دے
پردیس میں ہماری عزت رکھ لے
اپنے دین کا نام اونچا کر
اور اس کا ذریعہ ہمیں بنا۔

☆☆☆

آگ کے شعلے آسمان سے باتیں کر رہے تھے لیکن دیکھتے ہی دیکھتے یہ شعلے ہوا میں تحلیل ہو گئے۔ آگ سے بھرے کنویں کی جانب سے ٹھنڈی ہوائیں آرہی تھیں جیسے باغ کا دروازہ کھلا ہوا ہو۔ کسی کی اب بھی ہمت نہیں ہو رہی تھی کہ کنویں کے قریب جائے۔ کچھ لوگ دوڑتے ہوئے بادشاہ کے پاس پہنچے۔ وہ بھی مسند سے اُٹھا اور وسط شہر میں پہنچا۔ جب اچھی طرح اطمینان ہو گیا کہ آگ ٹھنڈی ہو گئی ہے تو وہ اپنے ارکانِ دولت کے ہمراہ کنویں پر پہنچا۔ اس نے دیکھا کہ کنویں کے اندر چار آدمی آرام سے ٹہل رہے ہیں۔ آگ انہیں جلانے سے پہلے خود جل گئی ہے۔ اسے یہ دیکھ کر بھی تعجب ہوا کہ تین آدمی آگ میں ڈالے گئے تھے، یہ چار کیسے ہو گئے؟

اس نے اپنے وزیروں اور مشیروں سے پوچھا "ہم نے تین شخصوں کو بندھوا کر آگ میں نہیں ڈلوایا؟" سب نے گواہی دی کہ آگ میں پھینکے جانے والے تین ہی تھے۔

"پھر یہ چوتھا کون ہے؟" بادشاہ نے کہا "انہیں باہر نکالو تاکہ یہ معما حل ہو۔ خود وہی بتائیں گے کہ چوتھا کون ہے؟"

انہیں باہر نکالا گیا تو یہ پھر تین تھے۔ چوتھا نہیں تھا اور یہ تینوں صحیح سلامت تھے۔ ان کے کپڑے تک نہیں جلے تھے۔ آگ نے انہیں کوئی ضرر نہیں پہنچایا تھا۔

بادشاہ نے ان سے پوچھا "میں نے تمہارے ساتھ ایک چوتھے کو بھی دیکھا تھا۔ وہ کون تھا اور اب کہاں ہے؟ یہ کیا ماجرا ہے؟"

"اس چوتھے شخص کے بجائے یہ بھی تو پوچھو کہ آگ کا کام جلانا ہے، اس نے ہمیں جلایا کیوں نہیں؟"

"مجھے یہ بھی پوچھنا ہے مگر چوتھے شخص کا احوال تو بتاؤ۔"

"اے بادشاہ! تو نے یہ کہہ کر ہمیں آگ میں بھیجا تھا کہ دیکھتا ہوں کون سا معبود تمہیں میرے ہاتھوں سے چھڑاتا ہے؟"

"ہاں کہا تھا۔"

"اور ہم نے کہا تھا کہ وہ خدا جس کی ہم عبادت کرتے ہیں، ہمیں اس آگ سے چھڑا لے گا۔"

"مجھے یہ بھی یاد ہے۔"

"پس وہ چوتھا اللہ کا بھیجا ہوا فرشتہ تھا جس نے آگ کو گلزار بنا دیا اور ہم جلنے سے محفوظ رہے۔ اب تمہیں یقین آجانا چاہیے کہ وہی معبود عبادت کے لائق ہے جو اپنے بندوں کو مظالم سے رہائی دلواتا ہے۔"

بخت نصر سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ چکا تھا۔ اس لیے تسلیم کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ دل پر مہر لگی ہوئی تھی۔ خدا پر ایمان تو نہیں لاسکتا تھا لیکن اس نے اتنا کیا کہ اعلان کر دیا کہ دانیال علیہ السلام اور ان کے ساتھیوں کے خلاف کوئی نامناسب بات زبان پر نہ لائی جائے۔

"میں یہ فرمان جاری کرتا ہوں کہ جو قوم یا امت بنی اسرائیل کے خدا کے حق میں کوئی نامناسب بات کہے گا تو اس کے ٹکڑے ٹکڑے کیے جائیں گے اور اس کے گھر مسمار کیے جائیں گے کیونکہ کوئی دوسرا معبود نہیں جو اس طرح رہائی دے سکے۔"

اس فرمان کے بعد اس نے ان تینوں کو دوبارہ اپنے مناصب پر فائز کر دیا۔

بادشاہ کی طرف سے صرف ان کی عزت افزائی نہیں ہوئی تھی بلکہ اس واقعے کے بعد تمام اہلِ یروشلم کو جو قید ہو کر آئے تھے، عزت کی نگاہ سے دیکھا جانے لگا۔

بخت نصر کی فتوحات کا دائرہ بڑھتا جا رہا تھا۔ دنیا کی نامور قومیں اس کی برتری کو تسلیم کر رہی تھیں۔ اس نے مصر کے فرعون پر بھی غلبہ پا لیا تھا۔ یروشلم کو کھنڈر میں تبدیل کر چکا تھا۔ ہیکل سلیمانی کو جلا کر خاکستر بنا چکا تھا۔ اس نے دس ہزار مزید قیدی بنا لیے تھے جنہیں بابل کے اطراف میں آباد کیا گیا تھا۔ اس کے باوجود وہ مطمئن نہیں تھا۔ اب اسے یہ فکر رہنے لگی تھی کہ اس کے بعد اس سلطنت کا کیا ہوگا؟

ایک روز یہ خیالات اس کے دل و دماغ پر بُری طرح حاوی ہو گئے۔ وہ کچھ دیر اپنے پلنگ پر بے چینی سے کروٹیں بدلتا رہا پھر اسے نیند آگئی۔ کیا دیکھتا ہے کہ زمین کے وسط میں ایک نہایت اونچا درخت ہے۔ وہ درخت بڑھا اور مضبوط ہوا اور اس کی چوٹی آسمان تک پہنچی اور وہ زمین کی انتہا تک

www.Paksociety.com

دکھائی دینے لگا۔ اس کے پتے خوش نما تھے اور اس میں پھل لگے ہوئے تھے۔ میدان کے چرندے اس کے سائے میں اور ہوا کے پرندے اس کی شاخوں پر بسیرا کرتے تھے۔ دیکھتے دیکھتے ایک فرشتہ آسمان سے اُترا۔ اس نے بلند آواز سے پکار کر یوں کہا کہ درخت کو کاٹو۔ اس کی شاخیں تراشو اور اس کے پتے جھاڑو اور اس کا پھل بکھیر دو۔ چرندے اس کے نیچے سے چلے جائیں اور پرندے اس کی شاخوں پر سے اڑ جائیں۔ جڑوں کا کندہ زمین میں باقی رہنے دو۔ ہاں لوہے اور تانبے کے بندھن سے بندھا ہوا میدان... ہری گھاس میں رہنے دو اور وہ آسمان کی شبنم سے تر ہو اور اس کا حصہ زمین کی گھاس میں حیوانوں کے ساتھ ہو۔ اس کا دل انسان کا دل نہ رہے بلکہ اس کو حیوان کا دل دیا جائے اور اس پر سات دور گزر جائیں۔ یہ حکم نگہبانوں کے فیصلے سے ہے اور یہ امر قدسیوں کے کہنے کے مطابق ہے تاکہ سب ذی حیات پہچان لیں کہ حق تعالیٰ آدمیوں کی مملکت میں حکمرانی کرتا ہے اور جس کو چاہتا ہے اسے دیتا ہے بلکہ آدمیوں میں سے ادنیٰ آدمی کو اس پر قائم کرتا ہے۔"

آنکھ کھلی تو رات ختم ہونے کو تھی۔ اسے ڈر تھا کہ اگر وہ دوبارہ سو گیا تو دیکھے ہوئے خواب کی تفصیلات اس کے حافظے سے فراموش ہو جائیں گی۔ وہ پورے خواب کو اپنے ذہن میں دُہرانے لگا۔ پھر بھی کچھ باتیں اس کے حافظے سے محو ہو گئی تھیں لیکن اسے یقین تھا کہ دانیال (علیہ السلام) اس خواب کے ٹکڑوں کو جوڑ کر اس کی تعبیر ضرور بتا دیں گے۔ اس نے صبح ہونے کا انتظار بھی نہیں کیا اور دانیال (علیہ السلام) کو اپنے حضور طلب کر لیا۔

"اے بیلطشضر (دانیال علیہ السلام) ساحروں کے سردار۔ میں جانتا ہوں کہ مقدس الٰہون کی روح تجھ میں ہے اور کوئی راز کی بات تیرے لیے مشکل نہیں۔ اس لیے جو خواب میں نے دیکھا ہے اور جتنا حصہ بھی یاد رہ گیا ہے اس کی کیفیت اور تعبیر بیان کر۔" بادشاہ نے کہا اور اپنا خواب انہیں سنا دیا۔ خواب سن کر حضرت دانیال علیہ السلام کچھ پریشان نظر آنے لگے اور تعبیر بیان کرنے میں کچھ تامل ہوا۔ تب بادشاہ نے انہیں حوصلہ دیا اور ان سے کہا کہ تعبیر کچھ بھی ہو وہ بیان کرنے میں پریشان نہ ہو۔ اگر تعبیر بادشاہ کے حق میں نہ ہوئی تو بھی اس کا عتاب دانیال علیہ السلام پر نہیں ہوگا۔

"اے بادشاہ ....!" دانیال (علیہ السلام) نے تعبیر بتاتے ہوئے کہا "یہ خواب تجھ سے کینہ رکھنے والوں کے لیے اور اس کی تعبیر تیرے دشمنوں کے لیے ہو۔ وہ درخت جو تو نے دیکھا کہ بڑھا اور مضبوط ہوا جس کی چوٹی آسمان تک پہنچی اور زمین کی انتہا تک دکھائی دیتا تھا۔ جس کے پتے خوش نما تھے اور میوہ فراواں تھے۔ جس میں سب کے لیے خوراک تھی۔ جس کے سائے میں میدان کے چرند اور شاخوں پر ہوا کے پرندے بسیرا کرتے تھے۔ اے بادشاہ، وہ تو ہی ہے جو بڑا اور مضبوط ہوا کیونکہ تیری بزرگی بڑھی اور آسمان تک پہنچی اور تیری سلطنت زمین کی انتہا تک۔ اور جو تو نے دیکھا کہ ایک نگہبان، ہاں ایک قدسی آسمان سے اُترا اور کہنے لگا کہ درخت کو کاٹ ڈالو اور اسے برباد کر دو لیکن اس کی جڑوں کا کندہ زمین میں باقی رہنے دو کہ اسے لوہے اور تانبے کے بندھن سے بندھا ہوا میدان کی ہری گھاس میں رہنے دو کہ وہ آسمان کی شبنم سے تر ہو اور جب تک اس پر سات دور نہ گزر جائیں، اس کا بخرہ زمین کے حیوانوں کے ساتھ ہو۔

اے بادشاہ! اس کی تعبیر اور حق تعالیٰ کا وہ حکم جو بادشاہ .... کے حق میں ہوا ہے یہی ہے کہ تجھے آدمیوں میں سے ہانک کر نکال دیں گے اور تو میدان کے حیوانوں کے ساتھ رہے گا اور تو بیل کی طرح گھاس کھائے گا اور آسمان کی شبنم سے تر ہوگا اور تجھ پر سات دور گزر جائیں گے۔ تب تجھ کو معلوم ہوگا کہ حق تعالیٰ انسان کی مملکت میں حکمرانی کرتا ہے اور اسے جس کو چاہتا ہے، دیتا ہے اور یہ جو انہوں نے حکم کیا کہ درخت کی جڑوں کے کندے کو باقی رہنے دو، اس کا مطلب یہ ہے کہ جب تو معلوم کر چکے گا کہ بادشاہی کا اقتدار آسمان کی طرف سے ہے تو تو اپنی سلطنت پر پھر قائم ہو جائے گا۔ اس لیے اے بادشاہ، تیرے حضور میری صلاح قبول ہو اور تو اپنی خطاؤں کو صداقت سے اور اپنی بدکرداری کو مسکینوں پر رحم کرنے سے دور کر۔ ممکن ہے کہ اس سے تیرا اطمینان زیادہ ہو۔"

اس خواب کو ایک سال گزر رہا تھا۔ وہ بابل کے شاہی محل میں ٹہل رہا تھا اور اپنے کارناموں پر فخر کر رہا تھا۔ "میں نے ایک چھوٹے سے گاؤں کو ایسا پُرشکوہ اور شاندار دارالسلطنت بنا دیا کہ اس کی مثال کہیں نہیں ملتی۔ شہر کے گرد بڑی بڑی مضبوط فصیلیں، نہریں اور خندقیں شہر کے اندر دیوتاؤں اور دیویوں کے مندر۔ شاندار باغات جنہیں عجائبات میں شمار کیا جاتا ہے۔ یہ سب میری بدولت ہوئے ہیں۔ دیوی دیوتاؤں تک کو میرا مرہونِ منت ہونا چاہیے کہ میں نے ان کی مورتیاں بنوا کر شہر کے چوراہوں میں نصب کرائیں۔"

وہ ابھی بڑے بڑے بول، بول رہا تھا کہ آسمان سے آواز آئی۔ منادی کرنے والے نے منادی کر کے پکارا "اے بادشاہ! تیرے حق میں یہ فتویٰ ہے کہ سلطنت تجھ سے جاتی رہے اور تجھے آدمیوں میں سے ہانک کر نکال دیں گے اور تو میدان کے حیوانوں کے ساتھ رہے گا اور بیل کی طرح گھاس کھائے گا اور سات دور تجھ پر گزریں گے جب تجھ کو معلوم ہوگا کہ حق تعالیٰ آدمیوں کی مملکت میں حکمرانی کرتا ہے اور اسے جس کو چاہتا ہے، دیتا ہے۔"

تاریخ میں ہے کہ اس آواز کے ختم ہوتے ہی وہ ایک مرض "گرگ خولیا" کا شکار ہو گیا۔ اس مرض کا مریض خود کو بھیڑیا سمجھنے لگتا ہے۔

وہ محل کی چھت سے اُترا تو بالکل بھیڑیا بن چکا تھا۔ اس نے اپنے کپڑے پھاڑ ڈالے۔ ہر طرف کہتا پھرتا تھا کہ میں تم سب کا رب ہوں۔ وہ اتنا خوف ناک ہو چکا تھا کہ شاہی خاندان کے افراد اس کے قریب جانے سے ڈر رہے تھے۔ پہلے تو اس کے سپاہیوں نے یہ سوچا کہ اسے گرفتار کر لیا جائے لیکن پھر یہ سوچا کہ اس طرح عوام کو یہ تاثر ملے گا کہ بغاوت ہو گئی ہے اور بادشاہ کو قید کر دیا گیا ہے۔ اس کا پاگل پن لوگ خود دیکھ لیں تو لوگوں کو یقین آ جائے گا کہ اب وہ حکومت کرنے کے قابل نہیں رہا۔

بادشاہ سب کو گالیاں بکتا ہوا ننگ دھڑنگ محل سے باہر نکل گیا۔ پہرے داروں نے اسے بہ آسانی جانے دیا۔ وہ بازار میں نکلا تو پہلے تو لوگوں کو یقین ہی نہیں آیا کہ یہ بخت نصر ہو سکتا ہے۔ رعب وجلال والا بادشاہ۔ اس کے جسم پر شاہی لباس تو کیا، عام لباس بھی نہیں۔

یہ سب اس کے تکبر کی سزا تھی جو اسے مل رہی تھی۔ دانیال علیہ السلام نے اس کے خواب کی تعبیر بتاتے ہوئے مشورہ دیا تھا کہ وہ مسکینوں پر رحم کھائے لیکن خواب کی تعبیر کو بھی تو پورا ہونا تھا۔ اس نے اس تنبیہ کو نظر انداز کیا اور تکبر کے ایسے الفاظ ادا کیے کہ خدا کے جلال کا سزاوار بن گیا۔

وہ بازار میں ایک جگہ رکا ہوا تھا اور چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا "مجھے بتاؤ کہ بلند آسمانوں میں کس کی حکومت ہے اگر میں اس سے واقف ہوں تو اسے قتل کر کے وہاں اپنی حکومت قائم کر لوں گا کیونکہ زمین والوں سے تو میں فارغ ہو چکا ہوں۔"

اس کے اس دعوے پر افسوس کرنے کے سوا لوگ اور کیا کر سکتے تھے۔ بڑی عمر کے لوگ تو اس کی حالت کو عبرت کی نگاہ سے دیکھ رہے تھے لیکن بچوں کے ہاتھ تماشا لگ گیا تھا۔ وہ جس طرف جاتا، بچوں کی ٹولی اس کے پیچھے ہوتی۔ وہ بخت نصر جس کے سامنے دنیا کے نامور بادشاہ آنکھ اٹھانے کی جرأت نہیں کر سکتے تھے، بچے اس کی ہنسی اڑاتے پھرتے تھے۔ بادشاہ ان بچوں کی طرف دیکھ کر لپکتا تو وہ بچے ہوا ہو جاتے اور اِدھر اُدھر سے آ کر پھر جمع ہو جاتے۔ پھر بچوں نے ایک نیا شغل ڈھونڈ نکالا۔ چھوٹی چھوٹی کنکریاں مٹھیوں میں بھر لیں۔ اسے دیکھتے ہی اس کا نشانہ لیتے۔ وہ دور سے چلاتا اور بچے قہقہے لگاتے۔

"بے وقوفو! میں تمہارا رب ہوں اور تم مجھے پتھر مارتے ہو۔ میں آسمان پر حکومت کرنے جا رہا ہوں اور تم مجھ سے ڈرتے تک نہیں۔" وہ ان کی طرف دوڑتا اور بچے دور بھاگ جاتے۔

یہ بات مشہور ہو گئی تھی کہ بادشاہ نے یروشلم کو اُجاڑا ہے اور انبیازادوں کو قتل کیا ہے۔ معصوم بچوں کے خون سے ہاتھ رنگے ہیں۔ یہ سب اسی کی سزا ہے۔ یروشلم سے قید کر کے لائے ہوئے لوگوں کے لیے یہ خوشی کا موقع تھا کہ ان کا دشمن اس حال کو پہنچ گیا ہے۔ یہ اسیر اب بوڑھے ہو چکے تھے لیکن اسے ستانے میں بچوں کے ساتھ بچے بنے نظر آتے تھے۔

شاہی محل میں افراتفری مچی ہوئی تھی۔ اس کے وزراء چاہتے تھے کہ کسی کو اس کی جگہ بادشاہ بنا دیا جائے۔ اب عوام کی طرف سے مخالفت بھی متوقع نہیں تھی لیکن دانیال علیہ السلام پیش گوئی کر چکے تھے کہ سات سال کے بعد بادشاہ کی عقل واپس آ جائے گی اس لیے اس کے تخت پر بیٹھتا ہوا ہر کوئی ڈرتا تھا کہ اگر بخت نصر کی عقل واپس آ گئی تو وہ تخت پر بیٹھنے والے سے سخت انتقام لے گا۔ پھر یہی طے ہوا کہ کوئی تخت پر نہ بیٹھے بلکہ سب مل کر امورِ مملکت چلاتے رہیں اور بادشاہ بخت نصر کی صحت یابی کا انتظار کریں۔

شاہی محل میں یہ مشورے ہو رہے تھے اُدھر بادشاہ کے خواب کی تعبیر کے الفاظ پورے ہو رہے تھے۔ دانیال علیہ السلام نے تعبیر بتاتے ہوئے کہا تھا "اے بادشاہ! تجھے آدمیوں میں سے ہانک کر نکال دیں گے اور تو میدان کے حیوانوں کے ساتھ رہے گا اور بیل کی طرح گھاس کھائے گا۔"

اس بات کو بابل کے بچے پورا کر رہے تھے۔ انہوں نے پتھر مار مار کر بادشاہ کو اتنا تنگ کیا کہ وہ شہر سے نکل کر جنگل میں کہیں غائب ہو گیا۔ جب کئی دن گزر گئے اور وہ باہر نہ آیا تو لوگ اس کا حال دیکھنے کے لیے جنگل میں گئے اور یہ دیکھ کر

www.Paksociety.com

حیرت زدہ رہ گئے کہ اس کے جسم پر بڑے بڑے بال نمودار ہوگئے ہیں۔ اس کے ناخن اتنے بڑھ گئے ہیں کہ کسی وحشی درندے کے پنجے معلوم ہوتے ہیں۔ وہ چاروں ہاتھ پاؤں سے جانوروں کی طرح کھڑا ہوا ہے اور گھاس چر رہا ہے۔ جنگل کے دوسرے جانور بھی اس کے اردگرد گھوم پھر رہے ہیں۔ گویا وہ جانور اسے بھی اپنی طرح کا جانور سمجھ رہے ہیں۔

یہ عبرت ناک حالت دیکھ کر لوگ دور ہی سے لوٹ آئے۔

اس کی یہ حالت بابل میں اتنی مشہور ہوئی کہ لوگ جوق در جوق اسے دیکھنے کے لیے جنگل میں جانے لگے اور ہر مرتبہ اس کی حالت خراب سے خراب تر ہی دیکھی۔ وہ انسان نہیں کوئی جنگلی جانور نظر آتا تھا جس کا پورا بدن بالوں سے چھپ گیا تھا۔

عرصہ دراز تک لوگ اس کا تماشا دیکھنے جنگل میں جاتے رہے۔ پھر آہستہ آہستہ اس تعداد میں کمی آنے لگی۔ بہت سوں کو تو یاد بھی نہیں رہا کہ بخت نصر بھی ان کا بادشاہ تھا۔

لوگ اسے بھولنے لگے تھے لیکن دانیال علیہ السلام کو اپنی بتائی ہوئی تعبیر پر پورا یقین تھا۔ وہ انتظار میں تھے کہ کب سات سال پورے ہوں اور اللہ کے وعدے کے مطابق بخت نصر کی عقل واپس آئے۔

☆☆☆

اس دن دھڑاکے کی بارش ہو رہی تھی۔ جنگل جل تھل ہوگیا تھا۔ جنگل کے جانور بھیگتے بھیگتے تھک چکے تھے۔ اب وہ بارش سے بچنے کے لیے گھنے درخت ڈھونڈ رہے تھے لیکن بارش اتنی موسلا دھار تھی کہ ہر درخت چھلنی بنا ہوا تھا۔ بخت نصر بھی جانوروں کے ساتھ جانور بنا اِدھر اُدھر بھاگتا پھر رہا تھا بالآخر تھک کر ایک درخت کے نیچے بیٹھ گیا۔ دن میں اندھیرا ہوگیا تھا۔ وقفے وقفے سے بجلی کڑکتی تھی تو روشنی کا جھپاکا ہوجاتا تھا۔ بادل گرجتے تھے تو تمام جانور بے اختیار آسمان کی طرف منہ اُٹھاتے تھے۔ بخت نصر بھی ان کی پیروی کر رہا تھا۔ بار بار آسمان کی طرف نظر اُٹھا کر دیکھ لیتا تھا۔ ایک مرتبہ جو نظر اُٹھائی تو نظریں جم کر رہ گئیں۔ خدا کی ہیبت ایسی دل پر طاری ہوئی کہ بے اختیار کہہ اُٹھا ”وہی ہے جو ہمیشہ رہنے والا ہے۔ اس کی سلطنت ابدی ہے۔ اسی کی مملکت پشت در پشت ہے۔ زمین کے تمام باشندے ناچیز گنے جاتے ہیں اور وہ آسمانی لشکر اور اہلِ زمین کے ساتھ جو کچھ چاہتا ہے، کرتا ہے اور کوئی نہیں جو اس کا ہاتھ روک سکے یا اس سے کہے کہ تو کیا کرتا ہے۔“

ان خیالات کے ساتھ ہی اس کی کھوئی ہوئی عقل واپس آگئی۔ عقل کی واپسی کے ساتھ ہی اس نے اپنی حالت پر غور کیا تو شرمندگی نے اس کا سر جھکا دیا۔ اسے یاد آیا کہ وہ بخت نصر ہے، بابل کا بادشاہ۔ اور اب ننگا بیٹھا ہے۔ جانوروں پر نظر پڑی تو خوف کی ایک لہر بدن میں دوڑ گئی۔ ان جانوروں کے درمیان سات سال گزار دیے تھے۔ عقل آتے ہی جان کا خوف دامن گیر ہوا۔ جس پیڑ کے نیچے بیٹھا تھا، گھبرا کر اسی پیڑ پر چڑھ گیا۔ حواس درست ہوئے تو اسے سب کچھ یاد آ گیا۔ دانیال علیہ السلام کا نام یاد آیا۔ ان کی کہی ہوئی باتیں یاد آئیں۔ انہوں نے کہا تھا، تجھ پر سات دور گزر جائیں گے۔ تب تجھ کو معلوم ہوگا کہ حق تعالیٰ انسان کی مملکت میں حکمرانی کرتا ہے اور جس کو چاہتا ہے، دیتا ہے۔ جب تو معلوم کر چکے گا کہ بادشاہی کا اقتدار آسمان کی طرف سے ہے تو تو اپنی سلطنت پر پھر قائم ہوجائے گا۔ تو کیا سات دور گزر گئے؟ شاید ایسا ہی ہے۔ میں تسلیم کرتا ہوں کہ آسمان پر رہنے والا خدا ہی اصل بادشاہ ہے۔ وہ بڑی دیر تک اپنی حالت پر افسوس کرتا رہا اور حق تعالیٰ سے معافی مانگتا رہا۔

اب اسے یہ فکر تھی کہ اس حالت میں کس طرح جنگل سے نکل کر شہر میں داخل ہو۔ اتنے عرصے میں نہ جانے کون تخت پر بیٹھ چکا ہو۔ کاش! دانیال کو یاد آ جائے کہ سات دور گزر چکے ہیں۔ کاش! کوئی آئے اور مجھے یہاں سے لے جائے۔

جیسے جیسے دن ڈھلتا جا رہا تھا اس کی پریشانی میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ میں اس بھیانک جنگل میں رات کیسے کاٹوں گا؟ وہی جنگل جو سات سال سے اس کا مسکن بنا ہوا تھا۔ اب اسے کاٹ کھانے کو دوڑ رہا تھا۔

بارش تھم چکی تھی لیکن اندھیرا بڑھ گیا تھا۔ کچھ بادلوں کا اندھیرا، کچھ رات کی سیاہی۔ بھیانک جانوروں کی آوازوں نے جنگل سر پر اُٹھایا ہوا تھا اور وہ درخت پر بیٹھا تھا کہ دن گزرے تو شاید خدا کی قدرت کا ظہور ہو۔ کوئی اس کی مدد کو پہنچے۔

دانیال علیہ السلام انگلیوں پر حساب گن رہے تھے۔ وہ بابل کے لوگوں کو بتانا چاہتے تھے کہ ان کا خدا جو وعدہ کرتا ہے اسے پورا ضرور کرتا ہے چنانچہ جیسے ہی سات سال پورے ہوئے، انہوں نے بادشاہ کے وزیروں اور مشیروں کو مجبور کیا کہ وہ جنگل میں جائیں اور بخت نصر کو تلاش کریں۔

تمام وزیر، مشیر اور شاہی خاندان کے افراد لشکر کے چند سرداروں کے ہمراہ تلواروں اور تیروں سے مسلح ہو کر جنگل میں داخل ہوئے۔ بابل کے شہری جنگل کے آس پاس جمع ہوگئے تھے کہ دیکھیں بادشاہ کس حال میں واپس آتا ہے۔ آتا بھی ہے یا مر کھپ چکا؟

بادشاہ کو تلاش کرنے والے جنگل میں اِدھر اُدھر پھیل گئے۔ کچھ معلوم نہیں تھا کہ بادشاہ ہے کہاں؟ ڈھونڈتے ڈھونڈتے دوپہر ہوگئی تو سرداروں کو حضرت دانیال علیہ السلام پر غصہ آنے لگا کہ انہوں نے خواہ مخواہ ہمیں مشقت میں ڈالا۔ اتنا عرصہ گزر گیا۔ اب تک تو بادشاہ خونخوار جانوروں کی غذا بن چکا ہوگا۔ اب وہ کہاں جو ہم اسے ڈھونڈ رہے ہیں۔ یہ سب ایک جگہ جمع ہوگئے اور مایوس ہو کر واپس ہونے کا ارادہ کر ہی رہے تھے کہ اچانک ایک درخت سے آواز آئی۔

”اریوک!“ بادشاہ اپنے ایک سردار کو نام لے کر پکار رہا تھا ”میں یہاں ہوں۔ اس درخت کے نیچے جہاں تم کھڑے ہو لیکن میں برہنہ ہوں۔ میرے پاس کپڑے نہیں ہیں۔“

”ہمیں معلوم تھا کہ اگر پوشاک تمہارے بدن پر ہوئی بھی تو بہت میلی ہو چکی ہوگی۔ ہم اپنے ساتھ کپڑے لے کر آئے ہیں۔“

”اس پوشاک کو درخت کے نیچے رکھ دو اور خود کچھ دیر کے لیے اِدھر اُدھر ہو جاؤ۔ میں نیچے آ کر کپڑے پہن لوں گا۔“

اریوک نے کپڑے درخت کے نیچے رکھ دیے اور سب لوگوں کو لے کر درخت سے دور چلا گیا۔ بادشاہ نیچے اُترا اور کپڑے پہن لیے۔ پھر اس نے اریوک کو آواز دی کہ اب وہ لوگ آ سکتے ہیں۔

کپڑوں نے صرف اتنا کیا تھا کہ اس کی برہنگی ختم ہوگئی تھی ورنہ حلیے سے وہ اب بھی انسان نہیں لگ رہا تھا۔ اس کے بال اس کے کاندھوں سے نیچے لٹک رہے تھے۔ ناخن بڑھے ہوئے تھے۔ چہرے پر جا بہ جا میل کی تہ چڑھی ہوئی تھیں۔ وہ اب بھی اس قابل نہیں تھا کہ دنیا کو اپنا چہرہ دکھا سکے۔ اس کے وزیروں نے ایک بڑا کپڑا اس پر ڈال دیا اور گھوڑے پر بٹھا کر جنگل سے باہر لے آئے۔ ہزاروں افراد کا مجمع جنگل کے باہر کھڑا تھا۔ لوگوں نے بس اتنا دیکھا کہ کوئی گھوڑے پر بیٹھا ہے جس پر ایک بڑی سی چادر پڑی ہوئی ہے۔

بادشاہ کے وزرا اسے محل میں لے کر آئے، اطبا اور حکیم جمع تھے۔

بادشاہ کے بال تراشے گئے۔ بڑھے ہوئے ناخن کاٹے گئے۔ حکیموں نے علاج شروع کر دیا۔ کئی مہینے صاحب فراش رہنے کے بعد اس نے تخت سنبھالا۔ تخت سنبھالتے ہی اس نے سرکاری اعلامیہ جاری کیا۔

”میں تسلیم کرتا ہوں کہ آسمانی لشکر اور زمین کے باشندوں میں حق تعالیٰ ہی قادر مطلق ہے۔ میں اس کی تعظیم و تکریم اور ستائش کرتا ہوں اور اقرار کرتا ہوں کہ آسمان کا بادشاہ اپنے سب کاموں میں راست اور اپنی سب راہوں میں عادل ہے اور مغروروں کو ذلیل کر سکتا ہے۔“

اب اسے خدا کی حقانیت کا یقین آ گیا تھا۔ یہ دانیال علیہ السلام کی بڑی فتح تھی کہ بخت نصر ایک خدا کا پرستار بن گیا تھا۔ اسرائیلی غلاموں کی بھی یہ بڑی کامیابی تھی کہ ان کو فتح کرنے والا خود ان کا مفتوح بن گیا۔

بادشاہ ان کے مذہب کا حلقہ بگوش ہوا تو بابل کے لوگوں میں بھی اسرائیلیوں کی قدر و منزلت بڑھ گئی۔ بخت نصر کا یہ آخری دور اسرائیلیوں کے لیے سنہرا دور تھا۔

☆☆☆

بخت نصر کی حکومت کا 43 سالہ عالی شان دور (563 ق م) میں اس کی موت کے ساتھ ختم ہوگیا۔ پھر یہ سلطنت مختلف ہاتھوں سے ہوتی ہوئی بعل شعر کے ہاتھ میں آئی۔ یہ بخت نصر کا بیٹا تھا۔ بعض محققین نے اسے بخت نصر کا نواسہ لکھا ہے۔ بعض کا خیال ہے وہ بادشاہ نہیں بلکہ نبو لی دس نامی بادشاہ کا نائب تھا۔ توریت نے اسے بادشاہ ہی لکھا ہے۔

بعل شعر تک آتے آتے بخت نصر کی خدا پرستی کے احکام ذہنوں سے فراموش ہو چکے تھے۔ بت پرستی زوروں پر تھی اور یروشلم کے اسرائیلیوں کے خدا کو کھلے عام بُرا کہا جا رہا تھا اور اسرائیلیوں کی تذلیل کی جا رہی تھی۔ حضرت دانیال علیہ السلام اور ان کے ساتھیوں کے مراتب میں بھی فرق آ گیا تھا۔ بابل کی شان و شوکت بھی اب پہلے جیسی نہیں رہی تھی۔ فارس کی طرف سے اُبھرنے والی قوتیں بابل کو ہڑپ کرنے کی فکر میں تھیں۔ ان سب حالات کو دیکھتے ہوئے حضرت دانیال علیہ السلام نے دربار جانا موقوف کر دیا تھا۔ اب ان کا زیادہ تر وقت عبادت الٰہی میں گزر رہا تھا۔

بعل شعر کی حکومت کا پہلا سال تھا کہ حضرت دانیال

علیہ السلام نے ایک خواب دیکھا۔ خواب اتنا بامعنی تھا کہ وہ اپنے ساتھیوں کو سنائے بغیر نہ رہ سکے۔

''کیا دیکھتا ہوں کہ آسمان کی چاروں ہوائیں سمندر پر زور سے چلیں اور سمندر سے چار بڑے حیوان جو ایک دوسرے سے مختلف تھے، نکلے۔ پہلا شیر ببر کی مانند تھا اور عقاب کے سے بازو رکھتا تھا اور میں دیکھتا رہا جب تک اس کے پر اکھاڑے گئے اور وہ زمین سے اُٹھایا گیا اور آدمی کی طرح پاؤں پر کھڑا کیا گیا اور انسان کا دل اُسے دیا گیا۔

اور کیا دیکھتا ہوں کہ دوسرا حیوان ریچھ کی مانند ہے اور وہ ایک طرف سیدھا کھڑا ہوا ہے، اس کے منہ میں اس کے دانتوں کے درمیان تین پسلیاں تھیں۔ اس سے کہا کہ اُٹھ اور کثرت سے گوشت کھا۔

پھر میں نے نظر کی اور کیا دیکھتا ہوں کہ ایک اور حیوان تیندوے کے مانند اُٹھا جس کی پیٹھ پر پرندے کے سے چار بازو تھے اور اس حیوان کے چار سر تھے اور سلطنت اسے دی گئی۔

پھر میں نے مشاہدہ کیا کہ چوتھا حیوان نہایت ہیبت ناک ہے اور اس کے دانت لوہے کے تھے۔ وہ نگل جاتا اور ٹکڑے ٹکڑے کرتا تھا اور جو کچھ باقی بچتا، اس کو پاؤں سے لتاڑتا تھا۔

میرے دیکھتے دیکھتے تخت لگائے گئے اور ایک پُراسرار ہستی اس پر آ کر بیٹھ گئی۔ اس کا لباس برف سا سفید تھا اور اس کے سر کے بال خالص اون کے مانند تھے۔ عدالت لگی اور اس چوتھے حیوان کو ہلاک کر کے آگ میں ڈالا گیا۔ باقی حیوانوں کی سلطنت بھی ان سے لے لی گئی۔ پھر ایک شخص آدم زاد کے مانند آسمان کے بادلوں کے ساتھ آیا اور سلطنت اسے دی گئی۔

''دانیال، یہ خواب تو نہایت پیچیدہ اور دلچسپ ہے۔'' حضرت دانیال علیہ السلام کے ساتھیوں نے کہا'' کیا تم نے غور کیا، اس کی تعبیر کیا نکلتی ہے؟''

''مجھے غور کرنے کی ضرورت ہی پیش نہیں آئی۔ خواب ہی میں مجھے اس کا مطلب بھی سمجھا دیا گیا۔ میں نے خواب ہی میں دیکھا کہ ایک شخص میرے قریب کھڑا ہے۔ میں اس کے نزدیک گیا اور اس سے ان سب باتوں کی حقیقت دریافت کی۔ اس نے مجھے بتایا کہ یہ چار بڑے حیوان چار بادشاہ ہیں جو زمین پر برپا ہوں گے لیکن حق تعالیٰ کے مقدس لوگ سلطنت لے لیں گے اور ابد تک اس سلطنت کے مالک رہیں گے۔ میں نے چاہا کہ چوتھے حیوان کی حقیقت سمجھوں جو ان سب سے مختلف اور نہایت ہولناک تھا۔

اس شخص نے مجھے مطلب سمجھایا کہ چوتھا حیوان دنیا کی چوتھی سلطنت ہے جو تمام سلطنتوں سے مختلف ہے اور تمام زمین کو نگل جائے گی اور اسے لتاڑ کر ٹکڑے ٹکڑے کر دے گی اور اس کے سر کے دس سینگ دس بادشاہ ہیں جو اس سلطنت میں برپا ہوں گے اور ان کے بعد ایک اور برپا ہوگا اور وہ پہلوں سے مختلف ہوگا اور تین بادشاہوں کو زیر کرے گا اور وہ حق تعالیٰ کے مقدسوں کو تنگ کرے گا اور شریعت کو بدلنے کی کوشش کرے گا۔ پھر عدالت لگے گی اور اس کی سلطنت اس سے لے لیں گے اور حق تعالیٰ کے مقدس لوگوں کو بخش دی جائے گی۔

حضرت دانیال علیہ السلام اور آپ کے ساتھی اس خواب کی تعبیر سے بہت پریشان تھے۔ خواب نے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ بابل میں کیا ہونے والا ہے لیکن انہوں نے کسی سے اس کا تذکرہ نہیں کیا۔ وہ یوں بھی سلطنت کے کاموں سے دور تھے۔ کہتے تو کس سے کہتے۔

بعل شعزر بادشاہ کی سلطنت کے تیسرے سال میں حضرت دانیال علیہ السلام کو ایک اور خواب دکھایا گیا۔ حضرت دانیال علیہ السلام نے دیکھا کہ وہ ایک دریا کے کنارے کھڑے ہیں۔ دریا کے پاس ہی ایک مینڈھا کھڑا ہے۔ اس کے دو سینگ ہیں اور ایک دوسرے سے بڑا ہے اور بڑا دوسرے کے بعد نکلا تھا۔ یہ مینڈھا چاروں سمتوں میں اپنے سینگ گھما رہا ہے۔ ایک بکرا مغرب کی طرف سے نمایاں ہوا۔ اس بکرے کی دونوں آنکھوں کے درمیان ایک عجیب سینگ تھا۔ یہ بکرا اس مینڈھے پر حملہ آور ہوا اور اس کے دونوں سینگ توڑ ڈالے۔ مینڈھے میں اس سے مقابلے کی تاب نہ تھی اور کوئی نہ تھا کہ مینڈھے کو اس سے چھڑا سکے۔ پھر بکرے کا بڑا سینگ ٹوٹ گیا اور اس کی جگہ چار عجیب سینگ آسمان کی چاروں ہواؤں کی طرف نکلے اور ان میں سے ایک چھوٹا سینگ نکلا اور وہ بڑھ کر اجرام فلک تک جا پہنچا۔ پھر انہوں نے دو فرشتوں کی گفتگو سنی۔ ایک نے پوچھا مقدس اجرام کب تک پائمال ہوتے رہیں گے؟ دوسرے نے کہا، 2300 دنوں تک۔

حضرت دانیال علیہ السلام اس خواب کو دیکھنے کے بعد اس کی تعبیر جاننے کی فکر میں غلطاں تھے کہ حضرت جبریل علیہ السلام انسانی صورت میں ان کے سامنے آئے اور خواب کی

تشریح کرنے لگے۔

''اے آدم زاد! یہ رویا آخری ایام کے لیے ہے۔ دو سینگوں والا مینڈھا مادی اور فارس کے بادشاہ ہیں (مادی، شمال مغربی ایران کا قدیم نام۔ یہ علاقہ موجودہ آذربائی جان کے صوبے اور فارسی کردستان کے کچھ حصے پر مشتمل تھا، یہاں کے باشندے ''مادی'' کہلاتے تھے۔ خورس یہاں حکومت کرتا تھا)

اور جو تو نے بکرا دیکھا وہ یونان کا بادشاہ ہے اور اس کی آنکھوں کے درمیان کا بڑا سینگ پہلا بادشاہ ہے اور اس کے ٹوٹ جانے کے بعد جو چار اور نکلے وہ چار سلطنتیں ہیں جو اس کی قوم میں قائم ہوں گی لیکن ان کا اقتدار اس کا سا نہ ہوگا اور ان کی سلطنت کے آخری ایام میں جب خطا کار لوگ حد تک پہنچ جائیں گے تو ایک بادشاہ برپا ہوگا جس کا چہرہ بت تراش ہوگا۔ وہ مقدس لوگوں کو ہلاک کرنے کے لیے بڑی طاقت استعمال کرے گا اور لشکروں کے بادشاہ کے خلاف اُٹھ کھڑا ہوگا لیکن بغیر انسانی ہاتھ لگائے اچانک کاٹ ڈالا جائے گا۔

یہ خواب ہی ایسا تھا کہ بابل کا انجام صاف نظر آ رہا تھا۔ مادی اور فارس کے بادشاہ اس مملکت پر قابض ہونے کے لیے تیار ہو رہے تھے۔ آپ اتنے پریشان ہوئے کہ بیمار پڑ گئے۔ ذرا طبیعت بحال ہوئی تو پھر انہی خیالات سے پریشان رہنے لگے۔ وہ اپنے اندیشوں سے دوسروں کو آگاہ کرتے رہے۔ ارکانِ سلطنت کے ذریعے بعل شعزر تک پیغام پہنچاتے رہے کہ وہ اپنے معاملات درست کر لے۔ انتظام مکمل کر لے۔ جو مصیبت آنے والی ہے اس کے لیے تیاری کر لے۔ دیوتاؤں کی پرستش سے توبہ کر کے خدا کی طرف راغب ہو جائے۔ خدا کا پرستار بن جائے کیونکہ یہ مصیبت خدا کی طرف سے ہے، وہی اس کو ٹال سکتا ہے۔

بعل شعزر تک یہ پیغامات برابر پہنچ رہے تھے لیکن وہ فکرمند ہونے کی بجائے قہقہے لگا رہا تھا۔ اس کا ایک ہی نعرہ تھا ''بابل ناقابلِ تسخیر ہے۔''

وہ یہ بھی کہتا نظر آتا تھا'' دانیال سے کہنا، جب وہ قیدی بنا کر یروشلم سے یہاں لایا جا رہا تھا تو اس کے خدا نے اس کی مدد کیوں نہیں کی اور اس کا خدا اسے یروشلم واپس لے جانے سے اب تک کیوں غافل ہے؟''

وقت گزرتا رہا اور پھر اس نے ناقابلِ تسخیر بابل کا جشن منانے کے لیے ایک ہزار امرا اور ان کی بیگمات کی ضیافت کی۔ شاہی محل کا وسیع و عریض باغ پرستان کا منظر پیش کر رہا تھا۔ نازنینان پری جمال کے جھرمٹ، اداؤں کے پھول نچھاور کر رہے تھے۔ رقص ہو رہے تھے، تماشائی ایک ایک ادا پر چین کھو رہے تھے۔ موسیقی کی مدھر تانیں کانوں میں رس گھول رہی تھیں۔ خرافات کے دَور کھلے تھے، ساغر چھلک رہے تھے، قدم بہک رہے تھے۔

محفل اپنے عروج پر تھی کہ بعل شعزر کو ایک انوکھی بات سوجھی۔ اس نے خدام کو حکم دیا کہ وہ تمام ظروف جو بخت نصر ہیکل سلیمانی سے نکال لایا تھا اور مال خانے میں پڑے تھے، ان ظروف کو وہاں سے نکال کر محفل میں لایا جائے۔

''ان ظروف کو نہ جانے کس دن کے لیے رکھا گیا ہے؟ ان کا بہترین مصرف تو یہ ہے کہ ان میں شراب پی جائے۔ بخت نصر کی روح کتنی خوش ہوگی، یہ جشن فتح میں بدل جائے گا۔''

کسی نے یاد بھی دلایا کہ وہ مقدس ظروف ہیں۔ ہیکل سلیمانی سے لائے گئے ہیں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ ان ظروف میں شراب پینے سے دیوتا اور آسمان پر رہنے والا خدا ناراض ہو جائے لیکن بعل شعزر نشے کی ترنگ میں کب کسی کی سننے والا تھا۔ برتن حاضر کر دیے گئے۔

بادشاہ اور اس کے امرا نے ان سونے چاندی کے ظروف میں شراب پی۔ یہ نشہ ہی کچھ اور تھا۔ سب ایسے بدمست ہوئے کہ بے ہودگی کی ہر حد پار کر گئے۔ یہ پاک برتن ناپاک لبوں کی گرفت میں تھے۔

''دیکھو، خدا کے پرستار آج کتنے ذلیل ہوئے ہیں۔ جو کام میرا باپ نہ کر سکا، میں کر رہا ہوں۔ ہمارے دیوتا سربلند رہیں کہ ان کی مہربانی سے یروشلم کی تباہی کی یاد آج پھر تازہ ہو گئی۔ ہے کوئی جو ان مقدس برتنوں میں شراب پینے سے مجھے روک سکے؟''

وہ نشے کی ترنگ میں اُٹھ کر ناچنے لگا تھا۔ پھر وہ تھک کر اپنی مسند پر ڈھیر ہو گیا۔ اسی وقت اس نے دیکھا کہ ایک غیبی ہاتھ نمودار ہوا۔ یہ ہاتھ شمع دان کے مقابل محل کی دیوار کو توڑ کر اندر آیا تھا۔ بعل شعزر دل ہی دل میں ہنسنے لگا۔ شراب کتنی تیز ہے، اس نے سوچا۔ بھلا کوئی انسانی ہاتھ کس طرح دیوار کو پھاڑ سکتا ہے؟ اس نے اپنی دونوں ہتھیلیوں سے اپنی دونوں آنکھوں کو رگڑا۔ اس ہاتھ کی انگلیاں دیوار پر کچھ لکھنے میں مشغول تھیں۔ ان انگلیوں نے صرف چار لفظ لکھے اور ہاتھ غائب ہو گیا۔ دیوار پھر اپنی جگہ آ گئی۔ بعل شعزر آہستہ آہستہ چلتا ہوا دیوار کے قریب گیا اور اس عبارت کو پڑھنے کی کوشش

www.Paksociety.com

کرنے لگا جو اس ہاتھ نے تحریر کی تھی۔ دیوار پر جو الفاظ لکھے تھے وہ یہ تھے "منے منے تقیل وفرسین۔"

ان الفاظ میں نہ جانے کیا تھا کہ اس کی کمر کے جوڑ ڈھیلے ہوگئے۔ ٹانگیں اس طرح کانپنے لگیں کہ گھٹنے ایک دوسرے سے ٹکرا رہے تھے۔ جامِ شراب اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر دور جا پڑا اور وہ زمین پر بیٹھتا چلا گیا۔ اس کے ایک وزیر نے اسے بیٹھتے ہوئے دیکھ لیا تھا یا اس کی یہ حالت اس کنیز نے دیکھی تھی جو اس کے ساغر میں شراب انڈیلنے کے لیے اس کے قریب آ گئی تھی۔ اس کا وزیر یہی سمجھا کہ بادشاہ کو نشہ ہوگیا ہے۔ اس نے آگے بڑھ کر اسے سہارا دیا۔ اس کے پاؤں قابو میں نہیں تھے اور آنکھیں دیوار پر جمی ہوئی تھیں۔ غالباً ابھی تک کسی کو اصل واقعے کا علم نہیں تھا۔ کسی نے دیوار سے ہاتھ کو نکلتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔

بعل شعضر نے ہاتھ کے اشارے سے سب کی توجہ دیوار کی طرف مبذول کرائی۔ پھر سب نے اس عبارت کی طرف دیکھا لیکن کوئی بھی اس عبارت کا مفہوم نہ سمجھ سکا البتہ حیرت سب کو ہورہی تھی کہ یہ عبارت دیوار پر کیسے آ گئی؟

بادشاہ نے چیخ کر کہا "نجومیوں اور فال گیروں کو بلاؤ۔"

زبان ہلنے کی دیر تھی کہ مطلوبہ افراد حاضر ہوگئے۔ محفل کا رنگ پھیکا پڑ گیا تھا۔ ظروف شراب اوندھے منہ پڑے تھے۔ جو جہاں تھا وہاں بیٹھا رہ گیا تھا۔ بادشاہ کی حالت ایسی نہیں تھی کہ ضیافت سے لطف اندوز ہوا جاتا۔

بادشاہ نے تمام صورتِ حال ان نجومیوں کو بتائی اور اعلان کیا "جو کوئی اس نوشتۂ دیوار کو پڑھے اور اس کا مطلب مجھ سے بیان کرے، ارغوانی خلعت پائے گا اور اس کی گردن میں زریں طوق پہنایا جائے گا اور وہ مملکت میں تیسرے درجے کا حاکم ہوگا۔"

ان نجومیوں نے باری باری اس عبارت کو پڑھا اور سر جھٹک کر رہ گئے۔ کوئی بھی اس کے مطلب کو نہ پہنچ سکا۔ ایک نجومی نے یہ دعویٰ کیا کہ وہ دنیا کی ستر زبانیں جانتا ہے لیکن یہ الفاظ کسی زبان کے نہیں ہیں۔ جب میں نہیں پڑھ سکا تو دنیا کا کوئی انسان اسے نہیں پڑھ سکتا۔

بادشاہ نے مایوس ہو کر جشن کے خاتمے کا اعلان کر دیا اور خود اپنی خواب گاہ میں چلا گیا۔

شاہی محل میں ایک مرتبہ پھر سوگواری کی وہی فضا قائم ہوگئی جو اس وقت دیکھی گئی تھی جب بخت نصر پر جنون طاری ہوا تھا اور وہ محل چھوڑ کر جنگل میں چلا گیا تھا۔

ایک دن اور ایک رات اسی عالم میں گزر گئے تھے کہ بادشاہ کی والدہ، اس کی خواب گاہ کے دروازے پر پہنچ گئی۔ وہاں موجود پہرے داروں کو حکم تھا کہ کوئی بھی ہو اسے باہر ہی روک لیا جائے۔

"بعل شعضر سے کہنا تمہاری والدہ آئی ہیں اور ایک ایسے شخص کا پتا بتانے آئی ہیں جو تمہاری مشکل کو آسان کر سکتا ہے۔"

پہرے داروں نے اجازت طلب کی اور بعل شعضر کی والدہ کو خواب گاہ میں جانے کی اجازت مل گئی۔ بادشاہ آنکھوں پر ہاتھ رکھے بستر پر لیٹا ہوا تھا۔ مایوسی کا دکھ اس کے چہرے سے ظاہر تھا۔ اس نے ماں کی طرف دیکھا اور اُٹھ کر بیٹھ گیا۔

"میں تمہاری ماں ہو کر ایسی اجنبی ہوگئی کہ پہرے دار مجھے دروازے پر روکتے ہیں۔"

"ہاں، اگر تم یہ نہ کہتیں کہ تم مجھے کسی کا پتا بتانے آئی ہو تو میں اب بھی تمہیں اندر نہ آنے دیتا۔ اب میری زندگی کا کوئی مقصد نہیں رہ گیا ہے۔ بجز اس کے کہ میں "نوشتۂ دیوار" کا مفہوم جان سکوں۔ مجھے کسی سے کوئی دلچسپی نہیں۔"

"وہی بتانے تو آئی ہوں۔ بستر پر لیٹے لیٹے کیا عبارت پڑھ لی جائے گی؟"

"بابل کے ہر حکیم کو میں نے طلب کیا۔ ان میں سے کوئی بھی اس عبارت کو پڑھنے میں کامیاب نہ ہو سکا۔ اور میں کیا کر سکتا تھا۔ میں عظیم بابل کا عظیم بادشاہ اور اتنا بے بس کہ چار لفظوں کا مطلب کوئی مجھے نہیں سمجھا سکا۔"

"تم نے سب کو آزما کر دیکھ لیا مگر دانیال کو بھول گئے جس کے لیے تمہارا باپ کہا کرتا تھا کہ اس کے اندر مقدس الہواں کی روح ہے۔ جسے تمہارے باپ نے تمام منجموں کا سردار بنایا تھا۔ اسے بلاؤ، وہ اس عبارت کو ضرور پڑھ لے گا۔ اس کے لیے تو مشہور ہے کہ وہ قدسیوں کی زبان جانتا ہے۔"

"وہ دانیال۔ اسرائیلی غلام جو ہمارے دیوتاؤں کو بُرا کہتا ہے اور کچھ دنوں سے یہ دھمکیاں دیتا پھرتا ہے کہ بابل کی عظمت کا چراغ بجھنے والا ہے۔ فارس کے رہنے والے اجڈ گنوار، بابل پر قبضہ کرنے بڑھے چلے آ رہے ہیں۔ میں اس دانیال کو بلاؤں جسے میں خود سے دور کر چکا۔"

"پھر کیا یونہی کمرے میں بند رہو گے۔ امورِ سلطنت کیسے چلیں گے؟ دشمن منہ کھولے کھڑے ہیں۔ کیا تم یہ چاہتے ہو کہ سلطنت برباد ہو جائے؟"

"کس کی مجال ہے جو بابل کی طرف آنکھ اُٹھا کر دیکھے۔ پھر بھی تمہارے کہنے سے دانیال کو اپنے پاس بلاتا ہوں۔"

بادشاہ کے آدمی حضرت دانیال علیہ السلام کی تلاش میں نکلے اور انہیں لے کر بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہوگئے۔

"دانیال، کیا تو نے نہیں سنا تھا کہ میں نے تمام نجومیوں کو اپنے پاس طلب کیا ہے۔ پھر تو دربار میں کیوں حاضر نہ ہوا؟"

"میں بابل کے مضافات میں تھا۔ آج ہی یہاں آیا ہوں ورنہ شاید آج بھی یہاں نہ ہوتا۔"

"میرا باپ کہا کرتا تھا کہ مقدس الہون کی روح تجھ میں ہے اور تو قدسیوں کی زبان بھی جانتا ہے۔"

"یہ سب میرے خدا کی رحمت ہے جو مجھ پر ہے۔"

"میں نے ایک غیبی ہاتھ کو محل کی دیوار پر کچھ لکھتے ہوئے دیکھا ہے۔ اگر تو اس نوشتۂ دیوار کو پڑھے اور اس کا مطلب مجھ سے بیان کرے تو ارغوانی خلعت پائے گا اور تیری گردن میں زریں طوق پہنایا جائے گا اور تو مملکت میں تیسرے درجے کا حاکم ہوگا۔"

"مجھے اس انعام سے کوئی غرض نہیں۔ تو مجھے اس دیوار کے پاس لے چل جہاں وہ عبارت لکھی ہوئی ہے۔ میرے خدا نے چاہا تو میں اس کو ضرور پڑھوں گا اور اس کا مطلب بیان کروں گا۔"

بادشاہ انہیں اس دیوار کے پاس لے گیا۔ آپ نے اس عبارت کی طرف دیکھا اور بادشاہ سے مخاطب ہوئے۔

"اے بادشاہ! تیرے باپ بخت نصر کو خدا تعالیٰ نے سلطنت اور شان و شوکت بخشی۔ اس نے جس کو چاہا ہلاک کیا اور جس کو چاہا زندہ رکھا۔ جس کو چاہا سرفراز کیا اور جس کو چاہا ذلیل کیا لیکن جب اس کی طبیعت میں گھمنڈ سمایا اور اس کا دل سخت ہوگیا تو وہ سلطنت سے اُتار دیا گیا اور اس کی حشمت جاتی رہی اور اسے بنی آدم سے ہانک کر نکال دیا گیا۔ وہ اس وقت تک بیلوں کی طرح گھاس کھاتا رہا جب تک اس نے معلوم نہیں کر لیا کہ خدا تعالیٰ انسانی مملکت میں حکمرانی کرتا ہے اور جس کو چاہتا ہے اس پر قائم کرتا ہے۔"

"گزری ہوئی باتیں اس وقت مجھے کیوں سنا رہا ہے؟" بعل شعضر نے کہا۔

"اس لیے کہ تو ان سب باتوں سے واقف تھا پھر بھی تو نے اپنے دل سے عاجزی نہ کی بلکہ آسمان کے خداوند کے حضور اپنے آپ کو بلند کیا اور اس کی ہیکل کے ظروف میں مے نوشی کی اور پتھر کے بتوں کی حمد کی جو نہ دیکھتے، نہ سنتے، نہ جانتے ہیں۔ پس اس خدا کی طرف سے یہ ہاتھ بھیجا گیا اور یہ نوشتہ لکھ گیا۔ نوشتے میں یہ لکھا گیا ہے "منے منے تقیل وفرسین" یعنی خدا نے تیری مملکت کا حساب کیا اور اسے تمام کر ڈالا۔ تقیل یعنی تو ترازو میں تولا گیا اور کم نکلا۔ فرسین یعنی تیری مملکت تقسیم ہوئی اور مادیوں اور فارسیوں کو دی گئی۔

بادشاہ اس عبارت کے اس مفہوم کو جھٹلا بھی سکتا تھا لیکن جانتا تھا کہ حضرت دانیال علیہ السلام نے اس سے پہلے بھی جو پیش گوئیاں کیں وہ سچ نکلیں اس لیے خوف سے اس کا بُرا حال تھا۔ سمجھ گیا تھا کہ سلطنت اس کے ہاتھ سے گئی۔ اس کے باوجود امید دلاسا دے رہی تھی کہ شاید یہ مفہوم غلط ہو۔ وعدے کے مطابق حضرت دانیال کو ارغوانی خلعت عطا کیا گیا، ان کے گلے میں زریں طوق ڈالا گیا اور مملکت میں تیسرے درجے کا حاکم بنایا گیا۔

جس وقت دانیال علیہ السلام عبارت کا مطلب سمجھا رہے تھے، اس عبارت کا مفہوم پورا ہونے کا وقت آ گیا تھا۔ ایران کا فاتح خورس اعظم اپنی فوجیں لے کر بابل کی حدود میں پہنچ چکا تھا چنانچہ دانیال علیہ السلام جونہی شاہی محل سے نکلے اور اپنے مکان تک پہنچے خود اس کی طرف سے متعین کردہ ایک سردار دارا مادی بغیر کسی خون خرابے کے اپنی فوجوں کے ساتھ شاہی محل میں گھس آیا۔ بعل شعضر کو قتل کر دیا گیا اور بابل کی سلطنت پر عبارت کے مفہوم کے مطابق مادوں اور فارسیوں کا قبضہ ہوگیا۔

خورس خود فتح کے جلوس کے ساتھ شہر میں داخل ہوا اور نئے سال کا تہوار منانے تک یہیں مقیم رہا۔ اس کے بعد اس نے دارا کو یہاں کا حاکم بنایا اور خود واپس لوٹ گیا۔ کلدانیوں کی شان و شوکت کا خاتمہ ہوگیا اور دارا مادی نے حکومت کا نظم و نسق سنبھال لیا۔ دارا مادی قوم سے تھا لیکن فارس کے خورس کے تحت کام کرتا تھا، لہٰذا اس نے مادی اور فارسی قوانین کے تحت کام کرنے کا آغاز کیا۔

دارا نے جب تمام انتظامات سنبھال لیے تو مملکت چلانے کے لیے پورے ملک میں ناظم مقرر کیے اور ان کی نگرانی کے لیے تین وزیر مقرر کیے۔ ان میں ایک دانیال بھی تھے۔

حضرت دانیال علیہ السلام عقل و دانش میں ایسے پختہ

تھے کہ بہت جلد باقی وزیروں پر سبقت لے گئے۔ دارا ان سے ایسا خوش ہوا کہ انہیں تمام ملک پر مختار ٹھہرانے کا ارادہ کرلیا۔ باقی دو وزیران کی قدر افزائی پر ہاتھ مل رہے تھے اور چاہتے تھے کہ کسی طرح دارا کو ان کی طرف سے بدظن کردیا جائے لیکن موقع نہ ملتا تھا۔ ان کے حریف ان کے سرکاری امور اور کاموں میں کوئی بے قاعدگی یا خامی تلاش کرنے میں ناکام رہے تو انہوں نے ایک سازش کے تانے بانے بنے۔ ایک ایسا منصوبہ بنایا جس کے ذریعے حضرت دانیال علیہ السلام کو قصوروار ثابت کیا جائے۔ ان وزیروں نے تمام ناظموں کو بھی اپنے ساتھ ملالیا تھا۔ یہ تمام لوگ بادشاہ کے حضور جمع ہوئے اور اسے باتوں کے شیشے میں اتارنے کی کوشش کی۔

''اے بادشاہ، تو ابد تک جیتا رہ۔ ہم نے تیری ہیبت اور رعب قائم کرنے کے لیے ایک منصوبہ تیار کیا ہے اور اس میں تیری مملکت کے تمام ناظم، وزیر اور مشیر شامل ہیں۔ بس تیری اجازت کی ضرورت ہے۔''

''کیا تم لوگ سمجھتے ہو، میرے رعب میں کوئی کمی ہے۔''

''یہاں ایسے لوگ موجود ہیں جو تیرے احکامات کو دل سے نہیں مانتے۔ تو یہ بھی دیکھ لے گا کہ کون تیرے ساتھ دل سے ہے کون نہیں۔ انہیں بھی یہ معلوم ہوجائے گا کہ تو ان کی طرف سے غافل نہیں۔''

''میں نے امورِ مملکت تم لوگوں کے ہاتھوں میں دے دیے ہیں جس طرح چاہو چلاؤ۔''

''آپ کی اجازت کے بغیر ہم ناکارہ لوگ کیا کہہ سکتے ہیں۔''

''تم مجھے بتاؤ کیا منصوبہ تیار کیا ہے؟''

''اے بادشاہ! مملکت کے تمام وزیروں اور حاکموں اور ناظموں اور مشیروں اور سرداروں نے باہم مشورت کی ہے کہ ایک خسروانہ آئین مقرر کریں اور ایک امتناعی فرمان جاری کریں جس کے مطابق تیس روز تک جو کوئی تیرے سوا کسی معبود یا آدمی سے درخواست کرے، اسے شیروں کے آگے ڈالا جائے گا۔''

ان لوگوں نے ان احکامات کو تحریر کیا اور بادشاہ سے درخواست کی کہ اس فرمان کو قائم کرے اور اس پر دستخط کردے تاکہ اس میں تبدیلی کا امکان نہ رہے۔ بادشاہ نے اس نوشتہ پر دستخط کردیے۔

حضرت دانیال علیہ السلام کے حریف جانتے تھے کہ یہی ایک ایسی بات ہے جس پر دانیال علیہ السلام عمل نہیں کریں گے اسی لیے انہوں نے یہ منصوبہ پیش کیا تھا۔

جب فرمان پر دستخط ہوچکے اور منادی کرادی گئی تو دارا کے جاسوس اِدھر اُدھر پھیل گئے کہ دیکھیں کون اس پر عمل نہیں کررہا ہے۔ دانیال علیہ السلام کے حریفوں نے جاسوسوں کو خاص طور پر ہدایت کی تھی کہ وہ دانیال علیہ السلام کی نگرانی میں لگے رہیں۔ ان جاسوسوں نے دانیال علیہ السلام کے مکان کے چکر کاٹنے شروع کردیے۔ انہوں نے دیکھا کہ ان کی کوٹھری کا دریچہ یروشلم کی طرف کھلا ہوا ہے۔ وہ اس دریچے کی طرف منہ کرکے گھٹنوں کے بَل جھک گئے اور خدا کے حضور دعا اور اس کی شکرگزاری کرنے لگے۔ ان جاسوسوں نے دیکھا کہ وہ دن میں تین مرتبہ ایسا ہی کرتے ہیں۔ انہوں نے کئی دن تک انہیں عبادت کرتے دیکھا اور پھر ان کی شکایت لے کر دارا کے پاس پہنچ گئے۔

''اے بادشاہ! کیا تو نے اس فرمان پر دستخط نہیں کیے کہ تیس روز تک جو کوئی تیرے سوا کسی معبود یا آدمی سے کوئی درخواست کرے شیروں کی ماند میں ڈال دیا جائے گا؟''

''مادیوں اور فارسیوں کے آئین کبھی تبدیل نہیں ہوتے، یہ بات بالکل سچ ہے۔''

''تو پھر سن، بابل میں کم از کم ایک شخص ایسا ضرور ہے جو نہ تیری پروا کرتا ہے نہ تیرے حکم کی۔ دن میں تین بار اُن دیکھے معبود کے سامنے گھٹنے ٹیکتا ہے اور دعا کرتا ہے۔''

''کون ہے وہ سرکش؟''

''وہی جسے تو بہت عزیز رکھتا ہے۔ یہوداہ کے امیروں میں سے ایک شخص دانیال!''

''کیا وہ میرے سامنے آکر اقرار کرسکتا ہے؟''

''وہ اقرار نہ بھی کرے تو بھی ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ چکے ہیں۔''

''تم اس کی دشمنی میں اس پر الزام بھی لگا سکتے ہو۔ وہ جب تک خود اقرار نہ کرلے قصور ثابت نہیں ہوگا۔''

دارا دل سے چاہتا تھا کہ دانیال علیہ السلام سزا سے بچے رہیں اسی لیے اس نے یہ شرط رکھی۔ اسے یقین تھا کہ دانیال علیہ السلام کبھی اقرار نہیں کریں گے۔

دانیال علیہ السلام بادشاہ کے سامنے پیش ہوئے اور ان سے پوچھا گیا تو انہوں نے جان کے خوف سے انکار نہیں کیا بلکہ اقرار کیا کہ وہ خدا کی عبادت کرتے ہیں۔

انہوں نے نہایت بے خوفی سے کہا ''تمام انسانوں پر

خدا کی حکمرانی ہے۔ وہی قادرِ مطلق ہے، جس کو چاہتا ہے، بادشاہ بناتا ہے جس کو چاہتا ہے تخت سے نیچے اُتار دیتا ہے۔ اس لیے لازم ہے کہ ہم اس کی شکرگزاری کرتے رہیں۔''

''کیا تو نے میرا حکم نہیں سنا تھا؟''

''اے بادشاہ! میں نے آج تک تیرا حکم نہیں ٹالا لیکن کوئی حکم مجھے اپنے معبود کی عبادت سے نہیں روک سکتا۔ ہاں تیرے حکم کی اتنی پاسداری کرسکتا ہوں کہ چھپ کر عبادت کرتا رہوں۔''

''اب چونکہ میرے جاسوسوں نے تجھے عبادت کرتے دیکھ لیا ہے اس لیے تجھے بھوکے شیروں کی ماند میں تو ڈالنا پڑے گا۔''

''اے بادشاہ! تو اپنا کام کر۔ جس معبود کی میں عبادت کرتا ہوں، وہ میری حفاظت کرے گا۔''

''کاش! ایسا ہی ہو۔'' بادشاہ نے کہا ''میں تیری ہلاکت نہیں چاہتا مگر کیا کروں۔ آئین کی پاسداری تو کرنی ہے۔''

بادشاہ اب بھی نہیں چاہتا تھا کہ دانیال علیہ السلام کو سزا ملے۔ اس نے حیلے بہانوں سے پورا دن گزار دیا لیکن سورج غروب ہونے کو تھا کہ اس کے وزیر پھر اس کے پاس آئے اور اسے اس کا وعدہ یاد دلایا۔

''اے بادشاہ! تو سمجھ لے کہ مادیوں اور فارسیوں کا آئین یوں ہے کہ جو فرمان اور قانون بادشاہ مقرر کرے کبھی نہیں بدلتا۔ اب تو اپنا وعدہ پورا کر۔''

بادشاہ اب کوئی بہانہ نہیں کرسکتا تھا۔ اس کے حکم کے مطابق حضرت دانیال علیہ السلام کو اس اندھے کنویں کے پاس لے جایا گیا جس میں دو بھوکے شیر پہلے سے موجود تھے۔ دانیال علیہ السلام کو اس کنویں میں پھینک کر اوپر سے پتھر رکھ دیا گیا۔ بادشاہ کی مہر اس پتھر پر ثبت کردی گئی تاکہ کوئی اس پتھر کو ہٹا کر دانیال علیہ السلام کو بچا نہ لے۔

کئی بوڑھے لوگوں کو وہ زمانہ یاد آگیا ہوگا جب بخت نصر کے زمانے میں حضرت دانیال علیہ السلام کے ساتھیوں کو جلتی ہوئی آگ میں ڈالا گیا تھا اور قدرتِ خداوندی سے وہ زندہ سلامت نکل آئے تھے۔ بعض لوگ اب بھی یہی کہہ رہے تھے کہ دانیال علیہ السلام کا معبود انہیں زندہ نکال لے گا لیکن بیشتر یہ بھی کہہ رہے تھے کہ اتفاقات روز روز نہیں ہوتے۔ شیر کسی انسان کا دوست نہیں ہوتا۔ رات بھر میں دانیال علیہ السلام کی ہڈیاں بھی باقی نہیں بچیں گی۔

بادشاہ اپنے محل میں واپس آیا تو سخت رنجیدہ تھا۔ وہ کہہ تو چکا تھا کہ دانیال علیہ السلام کو اس کا معبود بچالے گا لیکن دل پر صدمہ ایسا تھا کہ بھوک پیاس جاتی رہی۔ کنیزوں نے دسترخوان سجایا تو دارا نے معذرت کرلی۔ وہ رات کو سونے سے پہلے موسیقی سننے کا عادی تھا۔ اس رات سازندے حاضر ہوئے تو اس نے انہیں بھی واپس کردیا۔ اسے رہ رہ کر دانیال علیہ السلام کا خیال آرہا تھا۔ شیروں نے اب تک تو اس کی ہڈیاں بھی چبالی ہوں گی۔ اسے افسوس ہورہا تھا کہ اس نے دانیال علیہ السلام جیسے نیک اور دانش مند کو شیروں کے سامنے کیوں ڈال دیا؟

دارا نے یہ رات کرب و اذیت میں گزاری اور صبح ہوتے ہی اس کنویں کے پاس پہنچا اور کنویں کے اوپر رکھے پتھر کو ہٹا کر اندر جھانکا۔ اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب اس نے دیکھا کہ دونوں شیر آپ کے قریب بیٹھے ہیں اور آپ کے تلوے چاٹ رہے ہیں۔

''اے خداوند خدا کے بندے! کیا تیرا خدا جس کی تو ہمیشہ عبادت کرتا ہے، قادر ہوا کہ تجھے شیروں سے چھڑائے؟'' بادشاہ نے آواز دے کر پوچھا۔

حضرت دانیال علیہ السلام نے جواب دیا ''اے بادشاہ، ابد تک جیتا رہ۔ میرے خدا نے اپنے فرشتے کو بھیجا اور شیروں کے منہ بند کردیے اور انہوں نے مجھے ضرر نہیں پہنچایا کیونکہ میں اس کے حضور بے گناہ ثابت ہوا اور تیرے حضور بھی۔ اے بادشاہ، میں نے خطا نہیں کی۔''

انہیں زندہ دیکھ کر بادشاہ کی خوشی کا ٹھکانا نہیں تھا۔ اس نے فوری حکم دیا کہ دانیال علیہ السلام کو ماند سے نکالیں۔ بادشاہ کے ساتھ آئے ہوئے آدمیوں نے حیرت سے یہ حکم سنا اور سوچا کہ بادشاہ کس دانیال علیہ السلام کو نکالنے کی بات کررہا ہے۔ اب تک وہ زندہ ہی کہاں بچا ہوگا؟ انہوں نے کنویں میں جھانک کر دیکھا تو وہ بھی وہی منظر دیکھ رہے تھے جو بادشاہ دیکھ چکا تھا لیکن اب سوال یہ تھا کہ شیروں کی موجودگی میں حضرت دانیال علیہ السلام کو نکالا کیسے جائے؟ پھر بڑی ہمت کرکے کنویں میں سیڑھیاں لگائی گئیں۔ ان سیڑھیوں کے ذریعے دانیال علیہ السلام کنویں سے باہر آگئے۔

دیکھنے والوں نے دیکھا کہ دانیال علیہ السلام کو شیروں نے ذرا بھی نقصان نہیں پہنچایا تھا کیونکہ انہوں نے اپنے خدا پر توکل کیا تھا۔

www.Paksociety.com

بادشاہ نے ایک اور حکم جاری کیا جس کے تحت ان شخصوں کو جنہوں نے دانیال علیہ السلام کی شکایت کی تھی لائے اور ان کے بچوں اور بیویوں سمیت ان کو شیروں کی ماند میں ڈال دیا اور شیر ان پر غالب آئے اور اس سے پیشتر کہ ماند کی تہ تک پہنچیں شیروں نے ان کی سب ہڈیاں توڑ ڈالیں۔

بادشاہ نے اس واقعے سے متاثر ہوکر قوم کے نام یہ پیغام جاری کیا۔

''تمہاری سلامتی افزوں ہو۔ میں یہ فرمان جاری کرتا ہوں کہ میری مملکت کے ہر ایک صوبے کے لوگ دانیال علیہ السلام کے خدا کے حضور ترساں و لرزاں ہوں کیونکہ وہی زندہ خدا ہے اور ہمیشہ قائم ہے اور اس کی سلطنت لازوال اور اس کی مملکت ابد تک رہے گی۔ وہی چھڑاتا اور بچاتا ہے اور آسمان اور زمین میں وہی نشان اور عجائب دکھاتا ہے۔ اسی نے دانیال کو شیروں کے پنجوں سے چھڑایا ہے۔''

ایک راوی ابن ابی الدنیاؒ نے عبداللہ بن ابی ہذیل سے منقول کیا ہے کہ یہ واقعہ بخت کے دور میں پیش آیا۔ بخت نصر کے ہاتھوں دو شیر لگے تو بخت نصر نے دونوں کو ایک اندھے کنویں میں پھنکوادیا پھر حضرت دانیال علیہ السلام کو بھی ان کے ساتھ ڈال دیا لیکن شیروں نے آپ کے ساتھ کوئی بُرا رویہ اختیار نہیں کیا۔ پھر جب تک اللہ نے چاہا آپ اس کنویں میں رہے اور جو انسانوں کو بھوک پیاس لگتی ہے، آپ کو بھی لگی تو اس کا بندوبست اللہ نے یوں کیا کہ یہاں سے کوسوں دور بیت المقدس میں حضرت ارمیاہ علیہ السلام کو وحی فرمائی کہ کھانا وغیرہ تیار کرو تاکہ حضرت دانیال علیہ السلام کو کھلایا جائے۔ حضرت ارمیاہ علیہ السلام نے عرض کیا، اے پروردگار میں یہاں ارضِ مقدسہ میں ہوں اور کہاں وہ ارضِ بابل سرزمینِ عراق میں۔ فرمایا جو ہم نے تم کو حکم دیا ہے وہ کرو۔ ہم تمہارے لیے سواری کا بندوبست کریں گے لہٰذا آپ نے کھانا تیار کرلیا اور اللہ نے سواری بھی مہیا فرمادی حتیٰ کہ آپ نے دیکھا کہ آپ اس کنویں کے کنارے کھڑے ہیں جہاں حضرت دانیال علیہ السلام شیروں کے ساتھ تھے۔

حضرت دانیال علیہ السلام نے آواز دے کر پوچھا کون ہے؟ فرمایا، میں ارمیاہ ہوں۔ پوچھا، کیا چیز آپ کو یہاں لائی؟ فرمایا مجھے آپ کے رب نے آپ کے پاس بھیجا ہے۔ حضرت دانیال علیہ السلام نے فرمایا، کیا میرے رب نے مجھے یاد فرمایا ہے؟ فرمایا، ہاں تو حضرت دانیال علیہ السلام نے فرمایا، تمام تعریفیں اللہ ہی کے لیے ہیں جو اپنے یاد کرنے والے کو کبھی نہیں بھولتا۔ تمام تعریفیں اللہ ہی کے لیے ہیں جو اپنے امیدوار کو اس کی بات کا جواب دیتا ہے۔

یہ روایت اپنی جگہ لیکن لگتا یہی ہے کہ یہ واقعہ دارا کے زمانے میں پیش آیا اور اسی نے پہلی مرتبہ آپ کو زندہ سلامت دیکھا اور کنویں سے باہر نکالا، یہی توریت (عہد قدیم) میں بیان کیا گیا ہے۔

دارا کا جھکاؤ اچانک خدا کی طرف ہوا اور اس نے فرمان جاری کیا کہ تمام لوگ خدا سے ڈریں۔ اس خدا سے جس نے دانیال علیہ السلام کو شیروں کے سامنے زندہ رہنے دیا تو حضرت دانیال علیہ السلام یہ سوچنے پر مجبور ہو گئے کہ ان واقعات کی میرے لوگوں کے لیے کیا اہمیت ہے؟ یرمیاہ علیہ السلام کی نبوتیں پڑھتے ہوئے انہیں یاد آیا کہ ستر سالہ اسیری کی پیش گوئی کی گئی تھی۔ انہیں یہ بھی یاد آیا کہ یسعیاہ نبی نے کہا تھا، خورس وہ چرواہا ہے جسے خداوند اپنی قوم کو چھڑانے اور یروشلم کو واپس لانے کے لیے استعمال کرے گا۔ کیا یہ ممکن ہوگا کہ اب یہودیوں کو وطن واپس جانے کی اجازت مل جائے گی؟

حساب لگایا تو ستر سال پورے ہونے کو تھے۔ اب خدا سے مناجات اور گریہ وزاری کا وقت تھا۔ حضرت دانیال علیہ السلام نے روزہ رکھا اور ٹاٹ اوڑھ کر خدا سے دعا کی اور اقرار کیا۔

''اے خداوند عظیم تو اپنے فرماں بردار محبت رکھنے والوں کے لیے اپنے عہد و رحم کو قائم رکھتا ہے۔ ہم نے گناہ کیا۔ ہم برگشتہ ہوئے۔ ہم نے شرارت کی۔ ہم نے بغاوت کی بلکہ ہم نے تیرے احکام و آئین کو ترک کیا اور ہم تیرے خدمت گزار نبیوں کے طرف دار نہیں ہوئے جنہوں نے تیرا نام لے کر ہمارے بادشاہوں اور امرا سے اور ہمارے باپ دادا اور ملک کے سب لوگوں سے کلام کیا۔ اے خداوند! صداقت تیرے لیے ہے اور رسوائی ہمارے لیے جیسے اب یہوداہ کے لوگوں اور یروشلم کے باشندوں اور دور و نزدیک کے تمام بنی اسرائیل کے لیے ہے جن کو تو نے تمام ممالک میں ہانک دیا کیونکہ انہوں نے تیرے خلاف گناہ کیا۔

خداوند خدا تو رحیم و غفور ہے اگرچہ ہم نے اس سے بغاوت کی اس لیے وہ لعنت اور قسم جو خدا کے خادم موسیٰ کی توریت میں مرقوم ہے ہم پر پوری ہوئی کیونکہ ہم اس کے گنہ گار ہوئے اور اس نے جو کچھ ہمارے اور ہمارے قاضیوں کے خلاف جو ہماری عدالت کرتے تھے، فرمایا تھا ہم پر بلائے عظیم لاکر ثابت کر دکھایا کیونکہ جو کچھ یروشلم سے کیا گیا وہ تمام جہان میں کہیں نہیں ہوا۔

اے خداوند، میں تیری منت کرتا ہوں کہ تو اپنی تمام صداقت کے مطابق اپنے قہر و غضب کو اپنے شہر یروشلم یعنی اپنے کوہ مقدس سے موقوف کر کیونکہ ہمارے گناہوں اور ہمارے باپ دادا کی بدکرداری کے سبب سے یروشلم اور تیرے لوگ اپنے سب آس پاس والوں کے نزدیک ملامت کے لائق ہوئے۔ پس اب اے ہمارے خدا، اپنے خادم کی دعا اور التماس سن اور اپنے ارض چہرے کو اپنی ہی خاطر اپنے مقدس پر جو ویران ہے، جلوہ گر فرما۔

اے خداوند سن، اے خدا اپنے نام کی خاطر دیر نہ کر کیونکہ تیرا شہر اور تیرے لوگ تیرے ہی نام سے کہلاتے ہیں۔

حضرت دانیال علیہ السلام ابھی مناجات سے فارغ نہیں ہوئے تھے کہ شام کی قربانی گزارنے کا وقت آگیا اور اسی وقت حضرت جبرائیل حاضر ہو گئے۔ انہوں نے خوش خبری دی۔

''تیری دعا قبول ہوئی۔ تیرے لوگوں اور تیرے مقدس شہر کے لیے ستر ہفتے مقرر کیے گئے کہ خطا کاری اور گناہ کا خاتمہ ہو جائے۔ بدکرداری کا کفارہ دیا جائے۔ پس تو سمجھ لے کہ یروشلم کی بحالی اور تعمیر کا حکم صادر ہونے سے ممسوح (جسے مسح کیا گیا، پاک کیا گیا، مراد خورس بادشاہ) فرمانروا تک سات ہفتے اور باسٹھ ہفتے ہوں گے۔ تب پھر بازار تعمیر کیے جائیں گے اور فصیل بنائی جائے گی مگر مصیبت کے ایام میں اور باسٹھ ہفتوں کے بعد وہ ممسوح قتل کیا جائے گا اور اس کا کچھ نہ رہے گا اور ایک بادشاہ آئے گا جس کے لوگ شہر اور مقدس کو مسمار کریں گے اور اس کا انجام گویا طوفان کے ساتھ ہوگا اور آخر تک لڑائی رہے گی۔ اور وہ ایک ہفتے کے لیے بہتوں سے عہد قائم کرے گا اور نصف ہفتے میں ذبیحہ اور ہدیہ موقوف کرے گا اور فصیلوں پر اُجاڑنے والی مکروہات رکھی جائیں گی یہاں تک کہ بربادی کمال کو پہنچ جائے گی۔

انہی دنوں حضرت دانیال علیہ السلام دجلہ کے کنارے ... تھے کہ ایک شخص کو دیکھا جو کتانی پیراہن پہنے اور خالص ... کا پٹکا کمر پر باندھے کھڑا تھا۔ اس کا بدن زبرجد کے ... اور اس کا چہرہ بجلی سا تھا اور اس کی آنکھیں چراغوں کے ... تھیں۔ اس کے بازو اور پاؤں چمکتے ہوئے پیتل سے تھے اور اس کی آواز انبوہ کے شور کے مانند تھی۔

یہ ایسا پُراسرار منظر تھا کہ دانیال علیہ السلام پر غشی طاری ہوگئی اور آپ زمین پر اوندھے منہ گر پڑے۔ پھر ایک ہاتھ نے آپ کو اٹھایا۔

''اے دانیال عزیز مرد، جو باتیں میں تجھ سے کہتا ہوں سمجھ لے اور سیدھا کھڑا ہو جا کیونکہ اب میں تیرے پاس بھیجا گیا ہوں۔''

اس آواز پر دانیال علیہ السلام کھڑے ہو گئے۔ تب اس نے آپ سے کہا ''اے دانیال، خوف نہ کر کیونکہ جس روز سے تو نے دل لگایا...... اور اپنے خدا کے حضور عاجزی کی... تیری باتیں سنی گئیں اور تیری باتوں کے سبب سے میں آیا ہوں پر فارس کی مملکت کے موکل نے اکیس دن تک میرا مقابلہ کیا۔ پھر میکائل جو مقرب فرشتوں میں سے ہے میری مدد کو پہنچا اور میں شاہانِ فارس کے پاس رکا رہا۔ پر اب میں اس لیے آیا ہوں کہ جو کچھ تیرے لوگوں پر آخری ایام میں آنے کو ہے تجھے اس کی خبر دوں۔''

وہ یہ باتیں کر رہا تھا اور حضرت دانیال علیہ السلام سر جھکائے خاموش کھڑے تھے۔ کھڑے کیا تھے بولنے کی طاقت ہی نہیں تھی۔ بار بار کوشش کرتے تھے لیکن آواز منہ سے نہیں نکلتی تھی۔ اسی وقت ایک اور شخص نے جو آدم زاد کے مانند تھا، ان کے ہونٹوں کو چھوا اور آپ بولنے کے لائق ہوئے۔

''اے خداوند اس رویا کے سبب سے مجھ پر غم کا ہجوم ہے اور میں ناتواں ہو گیا ہوں۔ پس یہ خادم اپنے خداوند سے کیوں کر ہم کلام ہو سکتا ہے؟''

تب آنے والے نے کلام کیا ''کیا تو جانتا ہے کہ میں تیرے پاس کس لیے آیا ہوں؟ اب میں فارس کے موکل سے لڑنے کے لیے واپس جاتا ہوں اور میرے جاتے ہی یونان کا موکل آئے گا لیکن جو کچھ سچائی کی کتاب میں لکھا ہے، تجھے بتاتا ہوں اور تمہارے موکل میکائل کے سوا اس میں میرا کوئی مددگار نہیں۔''

اس کے بعد اس شخص نے دانیال علیہ السلام کو اس شخص نے کتاب صداقت کی باتیں بتائیں۔

''فارس میں ابھی تین بادشاہ اور برپا ہوں گے اور چوتھا ان سب سے زیادہ دولت مند ہوگا اور جب وہ اپنی دولت سے تقویت پائے گا تو سب کو یونان کی سلطنت کے خلاف اُبھارے گا۔ لیکن ایک زبردست بادشاہ برپا ہوگا۔ وہ جو

چاہے گا کرے گا مگر اچانک کاٹ ڈالا جائے گا اور اس کی سلطنت چار حصوں میں تقسیم ہو جائے گی۔ اس کا کوئی حصہ بھی اس کی نسل کو نہیں ملے گا بلکہ یہ غیروں کے لیے ہوگی۔

اس کے بعد شاہ جنوب زور پکڑے گا اور اس کے امرا میں سے ایک اس سے زیادہ اقتدار حاصل کرے گا اور اس کی سلطنت بہت بڑی ہوگی اور چند سال کے بعد وہ آپس میں میل کریں گے کیونکہ شاہ جنوب کی بیٹی شاہ شمال کے پاس آئے گی تاکہ اتحاد قائم ہو لیکن اس میں قوت بازو قائم نہ رہے گی اور نہ وہ بادشاہ قائم رہے گا۔ ایک شخص اس کی جگہ برپا ہوگا۔ وہ سپہ سالار ہو کر شاہ شمال کے قلعے میں داخل ہوگا اور ان پر حملہ کرے گا اور غالب آئے گا۔ اس کے بعد شاہ شمال اور جنوب کے بادشاہ کے درمیان زبردست جنگ ہوتی رہے گی۔

اس کے بعد ایک بدطینت اور کینہ پرور شخص برپا ہوگا جو سلطنت کی عزت کا حق دار نہ ہوگا لیکن وہ ناگہاں آئے گا اور چاپلوسی کر کے مملکت پر قابض ہو جائے گا اور وہ سیلاب افواج کو اپنے سامنے رگیدے گا اور شکست دے گا اور امیر عہد کو بھی نہ چھوڑے گا اور جب اس کے ساتھ عہد و پیمان ہو جائے گا تو دغابازی کرے گا کیونکہ وہ بڑھے گا اور ایک قلیل جماعت کی مدد سے اقتدار حاصل کرے گا اور ایامِ امن میں ملک کے زرخیز مقامات میں داخل ہوگا اور جو کچھ اس کے باپ دادا سے نہ ہوا تھا، کر دکھائے گا۔ بڑی فوج کے ساتھ شاہ جنوب پر حملہ کرے گا۔ شاہ جنوب بڑا لشکر لے کر نکلے گا لیکن اس کے مقابل نہ ٹھہرے گا۔ اس کی فوج پراگندہ ہوگی۔ تب وہ مال غنیمت لے کر اپنے ملک کو واپس جائے گا اور اس کا دل عہد مقدس کے خلاف ہوگا۔

مقررہ وقت پر وہ پھر جنوب کی طرف خروج کرے گا اور عہد مقدس پر اس کا غضب بھڑکے گا اور وہ اس کے مطابق عمل کرے گا۔ وہ اپنے باپ دادا کے معبودوں کی پروا نہ کرے گا اور نہ کسی اور معبود کو مانے گا بلکہ اپنے آپ ہی کو سب سے بالا جانے گا۔ وہ بیگانہ معبود کی مدد سے محکم قلعوں پر حملہ کرے گا۔ جو اس کو قبول کریں گے ان کو بڑی عزت بخشے گا اور بہتوں پر حاکم بنائے گا اور رشوت میں ملک تقسیم کرے گا۔ کچھ عرصے تک اس کا تسلط حبشہ اور لیبیا تک پھیل جائے گا لیکن پھر شاہ جنوب اس پر حملہ آور ہوگا اور شاہ شمال رتھ اور سوار اور بہت سے جہاز لے کر گردباد کے مانند اس پر چڑھ آئے گا اور ممالک میں داخل ہو کر سیلاب کے مانند گزرے گا لیکن ادوم، موآب اور بنی عمون کے خاص لوگ اس کے ہاتھ سے چھڑا لیے جائیں گے۔

وہ دیگر ممالک پر بھی ہاتھ چلائے گا اور ملک مصر بھی بچ نہ سکے گا۔ وہ سونے چاندی کے خزانوں اور مصر کی تمام نفیس چیزوں پر قابض ہوگا لیکن مشرقی اور شمالی اطراف سے افواہیں اسے پریشان کریں گی اور وہ بڑے غضب سے نکلے گا کہ بہتوں کو نیست و نابود کرے اور وہ شاندار مقدس پہاڑ اور سمندر کے درمیان شاہی خیمے لگائے گا لیکن اس کا خاتمہ ہو جائے گا اور کوئی اس کا مددگار نہ ہوگا۔

دانیال علیہ السلام کے لوگوں کا کیا ہوگا؟

اور اس وقت میکائل مقرب فرشتہ جو تیری قوم کے فرزندوں کی حمایت کے لیے کھڑا ہے، اُٹھے گا اور وہ ایسی تکلیف کا وقت ہوگا کہ ابتدائی اقوام سے اس وقت تک کبھی نہ ہوا ہوگا اور اس وقت تیرے لوگوں میں سے ہر ایک جس کا نام کتاب میں لکھا ہوگا رہائی پائے گا اور جو خاک میں سو رہے ہیں ان میں سے بہتیرے جاگ اٹھیں گے۔ بعض حیات ابدی کے لیے اور بعض رسوائی اور ذلت ابدی کے لیے۔ اور اہلِ دانش نورِ فلک کے مانند چمکیں گے۔

اب دانیال علیہ السلام کو یقین دلایا جاتا ہے کہ جو لوگ دانا اور فہیم ہیں اور راست بازی کی طرف رجوع ہوتے ہیں وہ خدا سے برکتیں پائیں گے۔ اس کے ساتھ ہی دانیال علیہ السلام کو ہدایت کی جاتی ہے کہ وہ اس رویا کو بند کر کے رکھ لیں۔ آخری زمانے میں بہت سے لوگ اس رویا کو پڑھیں گے اور ان کی دانش میں افزائش ہوگی۔

"لیکن تو اے دانیالؑ ان باتوں کو بند رکھ اور کتاب پر آخری زمانے تک مہر لگا دے۔ بہتیرے اس کی تفتیش و تحقیق کریں گے اور دانش افزوں ہوگی۔"

(توریت)

حضرت دانیال علیہ السلام کو اس موقع پر دو شخص اور کھڑے دکھائی دیتے ہیں۔ ایک دریا کے اس کنارے پر دوسرا دوسرے کنارے پر۔ ایک نے دوسرے سے پوچھا کہ ان عجائب کے انجام تک کتنی مدت ہے؟ حضرت دانیال علیہ السلام نے جواب دینے والے کی آواز سنی۔

"حی القیوم کی قسم!" جواب دینے والا دونوں ہاتھ آسمان کی طرف بلند کر کے کہہ رہا تھا "یہ عجائب ساڑھے تین دور کے بعد پورے ہوں گے اور اس کے ساتھ ہی مقدس لوگوں کا اقتدار بھی ختم ہو جائے گا۔"

حضرت دانیال علیہ السلام سن ضرور رہے تھے لیکن سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ وہ پوچھتے ہیں، میرے خداوند، ان کا انجام کیا ہوگا تب اس شخص نے حضرت دانیال علیہ السلام کو چپ رہنے کی ہدایت کی۔

"اے دانیال، تو اپنی راہ لے کیونکہ یہ باتیں آخری وقت تک کے لیے سربہ مہر کر دی گئی ہیں اور ریں گی اور بہت سے لوگ پاک کیے جائیں گے اور صاف و براق ہوں گے لیکن شریر شرارت کرتے رہیں گے اور شریروں میں سے کوئی نہ سمجھے گا پر دانش ور سمجھیں گے اور جس وقت سے دائمی قربانی موقوف کی جائے گی اور وہ اُجاڑنے والی مکروہ چیز نصب کی جائے گی، ایک ہزار دو سو نوے دن ہوں گے۔ مبارک ہے وہ جو ایک ہزار تین سو پینتیس روز تک انتظار کرے۔ اب تو اپنی راہ لے۔ جب تک کہ مدت پوری نہ ہو کیونکہ تو آرام کرے گا اور ایام کے اختتام پر اپنی میراث میں اُٹھ کھڑا ہوگا۔"

حضرت دانیال علیہ السلام کو اس تخصی امید دہانی اور اس یقین دہانی کے بعد کہ تیرے لوگ آخر کار فتح مند ہوں گے، ہدایت کی جاتی ہے کہ کتاب کو سربہ مہر کر دے۔

☆☆☆

بابل میں خورس کو بہت پذیرائی حاصل ہوئی تھی۔ اس کی فوجوں نے بابل پر قبضہ کیا تھا لیکن لوگ اس کے خلاف نہیں تھے بلکہ اسے نجات دہندہ سمجھتے تھے۔ خورس نے یہاں کے دیوتا مردوک کو اپنا دیوتا مان کر اہلِ بابل کے دل جیت لیے۔ وہ کہا کرتا تھا کہ اسی دیوتا نے مجھے بابل کے تخت پر بٹھایا ہے اور اس نے نئے سال کا تہوار منانے کی خاطر کئی ماہ تک بابل میں ہی قیام کیا۔ اس میں ایک سیاسی مصلحت بھی تھی کہ اس طرح اسے عام لوگوں کی حمایت کی امید تھی کیونکہ اب اسے بابل کی نہایت وسیع سلطنت کا انتظام و انصرام کرنا تھا جو ارام سے لے کر فلسطین تک اور مصر کی سرحدوں تک پھیلی ہوئی تھی۔

اسور اور بابل اس بات کے لیے مشہور تھے کہ وہ مفتوح لوگوں کو دوسرے ملکوں میں لے جاتے تھے۔ خورس نے اس کے برخلاف عمل کیا بلکہ جو لوگ بابل میں جلاوطنی کے دن گزار رہے تھے، ان کی حوصلہ افزائی کی کہ وہ اپنے وطن کو لوٹ جائیں، ان جلاوطنوں میں یروشلم کے یہودی بھی تھے۔

خورس نے اعلان کیا "خدا نے مجھے فاتح بنایا اور طاقت دی اور ہدایت کی کہ میں یروشلم میں اس کے لیے مسکن بناؤں۔ پس بابل میں جو کوئی یروشلم سے تعلق نہیں رکھتا ہو وہ وطن واپس جائے اور وہاں اسرائیل کے خدا کا گھر بنائے۔"

یہودیوں کو بابل میں رہتے ہوئے ستر سال ہو گئے تھے۔ ایک نسل تو ختم ہو ہی چکی تھی جو یہاں پیدا ہوئے تھے انہیں یروشلم میں کوئی دلچسپی نہیں تھی، لہٰذا وہ جانے پر تیار نہیں تھے۔ خورس نے ان لوگوں کو یہ کہہ کر اُبھارا کہ یروشلم میں ہیکل کی دوبارہ تعمیر کے لیے سونا، چاندی اور دیگر چیزوں کے نذرانے دیں۔ حضرت دانیال علیہ السلام کو رویا میں جو کچھ دکھایا گیا تھا، وہ پورا ہو رہا تھا۔

خورس کے فرمان کے جواب میں ہزاروں جلاوطن اپنے ملک میں واپس جانے کو تیار ہو گئے۔ خورس نے اپنے خزانچی کو حکم دیا کہ بخت نصر جو ظروف یروشلم سے لایا تھا، وہ واپس کیے جائیں۔

ساری قوموں کے درمیان یہودی اس بات میں یکتا تھے کہ ان کے خدا کا کوئی بت نہیں تھا جسے واپس یا بحال کیا جاتا حالانکہ خورس کے فرمان میں اس کا بندوبست بھی موجود تھا بلکہ وہ تو اسی بات پر فخر کرتا تھا کہ میں نے غیر قوموں کے دیوتاؤں کو ان کی عبادت گاہوں میں بحال کیا۔

جلاوطن یہودی یروشلم کے طویل اور پُرخطر سفر پر روانہ ہوئے اور اس عزم کے ساتھ روانہ ہوئے کہ ہیکل کو دوبارہ تعمیر کریں گے۔ اگرچہ اس واپسی کی صحیح تاریخ نہیں دی گئی مگر قرین قیاس ہے کہ یہ واپسی 538 ق م میں عمل میں آئی ہوگی۔

کہا جاتا ہے واپس آنے والوں کی تعداد پچاس ہزار تھی اور ان کے گیارہ لیڈر تھے۔ زیاربل اور یشوع نام کے لیڈر زیادہ سرگرم تھے۔ انہوں نے لوگوں کی ہدایت اور رہنمائی کی اور ان کی افراتفری ختم کر کے ترتیب اور نظم و ضبط قائم کیا۔

واپسی کے سال کے ساتویں مہینے تک لوگ یروشلم کے گرد و نواح میں کافی بس گئے تھے۔ یہاں تک کہ وہ سب جماعتی طور پر اکٹھے ہوئے۔ انہوں نے اسرائیل کے خدا کی قربان گاہ بنائی اور موسیٰ علیہ السلام کی بتائی ہوئی سوختنی قربانیاں چڑھانے کا سلسلہ دوبارہ شروع کیا۔ اسی مہینے کی پندرہ تاریخ کو انہوں نے لکھے ہوئے شرعی احکام کے مطابق عیدِ خیام بھی منائی۔ ان پُرتاثیر تقریبات کے ساتھ یروشلم میں خدا کی عبادت کا سلسلہ دوبارہ شروع ہو گیا۔

خورس کا انتقال ہو گیا۔ ادھر سامریہ کے بغض و حسد نے رکاوٹیں ڈالیں اور یروشلم کی تعمیر کا کام رک گیا۔ ان کا کہنا تھا کہ جب سے ہم فلسطین میں آباد ہوئے ہیں، ہم بھی اسی خدا کی پرستش اور عبادت کرتے آ رہے ہیں۔ اس بنیاد پر انہوں

نے زربابل اور دوسرے لیڈروں سے درخواست کی کہ تعمیر کے کام میں ہمیں بھی شامل کیا جائے۔ ان کی درخواست رَد کردی گئی تو وہ اعلانیہ مخالفت اور دشمنی پر اُتر آئے۔ وہ خورس کے جانشینوں کے دور میں ہیکل کی تعمیر رکوانے میں کامیاب ہوگئے۔

حضرت دانیال علیہ السلام ابھی زندہ تھے اور ہیکل کی تعمیر دوبارہ شروع کرانے کے لیے کوشاں تھے۔ انہوں نے سرکاری محافظ خانوں میں اس فرمان کی تلاش شروع کردی جو خورس کی طرف سے جاری ہوا تھا تاکہ اس دعوے کو سچ ثابت کیا جائے کہ خورس نے یہوداہ کو ہیکل تعمیر کرنے کی اجازت دی تھی۔ بالآخر حضرت دانیال علیہ السلام اس فرمان کو حاصل کرنے میں کامیاب ہوگئے جس پر خورس کا فرمان ارامی زبان میں درج تھا۔ اس میں لکھا تھا "ہیکل سلیمانی کے کام میں دست اندازی نہ کرو بلکہ شاہی مال سے تعمیر کرنے والوں کو بلاتوقف خرچ دیا جائے۔"

دارا نے نہ صرف اس فرمان کی تصدیق کی بلکہ شام کے باج گزار حاکم کو سخت احکام بھیجے کہ یہودیوں کے کام میں کسی طرح کی مداخلت نہ کریں۔ اس کے علاوہ حکم دیا کہ شام (ارام) کے صوبے کے خراج کی آمدنی سے یہودیوں کو تعمیراتی پروگرام کے لیے وافر خرچ مہیا کیا جائے۔ یہ ہدایات بھی جاری کیں کہ یروشلم کے کاہنوں کو روزانہ قربانیوں کے لیے کافی تعداد میں جانور مہیا کریں تاکہ وہ شاہ فارس کی فلاح و بہبود کے لیے خدا سے مناجات کریں۔

ان ہدایات کے بعد یہودیوں کو نہ صرف دارا سے سیاسی حمایت حاصل ہوئی بلکہ ساتھ کے صوبے کے حاکموں سے اپنے منصوبے کے لیے مادی امداد بھی ملنے لگی۔

کام زور شور سے شروع ہوگیا اور ہیکل کی عمارت پانچ سال میں مکمل ہوگئی۔ اگرچہ یہ ہیکل بھی پہلی جگہ تعمیر کی گئی مگر خوبصورتی اور کاریگری میں سلیمان علیہ السلام کی ہیکل کے پاسنگ بھی نہیں تھی لیکن جن لوگوں نے پہلے کی ہیکل نہیں دیکھی تھی، ان کے لیے یہ خوبصورتی کا شاہکار تھی۔

☆☆☆

اشعث الاحمری سے مروی ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ حضرت دانیال علیہ السلام نے اپنے پروردگار عزوجل سے دعا کی تھی کہ ان کو امت محمدیہ میں دفنایا جائے۔

ابوالعالیہ کہتے ہیں کہ جب ہم نے تستر شہر (جو بصرہ کے قریب ہے) فتح کیا تو ہم نے ہرمزان بادشاہ کے بیت المال میں ایک تخت پایا جس پر ایک شخص کی میت رکھی ہوئی تھی اور اس کے سر کے ساتھ ایک مصحف (کتاب اللہ) تھا۔ ہم نے مصحف اُٹھا کر حضرت عمرؓ کی خدمت میں پہنچایا۔ آپ نے حضرت کعبؓ کو طلب فرمایا۔ انہوں نے اس مصحف کو عربی زبان میں منتقل کیا۔

ابی خالد بن دینار راوی کہتے ہیں، پھر میں نے پوچھا آپ لوگوں نے اس میت کا کیا، کیا؟ فرمایا، ہم نے دن کے وقت تیرہ قبریں متفرق جگہوں پر کھودیں پھر رات کو اس شخص کو ایک قبر میں دفن کیا اور تمام قبروں کو اسی طرح قبر بنا دیا تاکہ لوگوں کو اس کا پتا نہ چلے اور اس کو نہ کھودے۔

ابی خالد نے پوچھا "آپ اس شخص کے متعلق کیا خیال رکھتے ہیں کہ وہ کون تھا؟ فرمایا، اس کو دانیال کہا جاتا تھا۔

اشعث الاحمری نے اس روایت کو اس طرح بیان کیا ہے۔

حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ نے تستر علاقہ فتح کرلیا تو حضرت دانیال علیہ السلام کو ایک تابوت میں پایا جن کی رگیں اور مسام اپنی حالت پر صحیح برقرار تھے اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جو دانیال علیہ السلام کا پتا بتائے گا تو تم اس کو جنت کی خوش خبری دے دینا لہٰذا جس شخص نے ان کے متعلق اطلاع دی اس کا نام حرقوص تھا، تو حضرت ابوموسیٰ اشعری نے حضرت عمرؓ کو پیغام بھیجا تو آپ نے جواب بھیجا کہ حضرت دانیال علیہ السلام کو دفن کردو اور حرقوص کو میرے پاس بھیج دو۔

حضرت ابوموسیٰ اشعری سے مروی ہے کہ آپ نے چار قیدیوں کو حکم فرمایا تو انہوں نے ایک نہر کے پانی کو روکا اور کوئی بند لگا کر نہر کے بیچ قبر کھودی اور حضرت ابوموسیٰ اشعری نے وہاں حضرت دانیال علیہ السلام کو دفن کردیا۔ جب یہ چاروں قیدی واپس آئے تو ان کی گردن اُڑادی۔ (یہ چاروں کافروں سے جنگ کے نتیجے میں قید ہوئے تھے اس لیے ان کا قتل کرنا صحیح تھا) اس طرح یہ عظیم راز صرف اور صرف حضرت ابوموسیٰ کے سینے میں دفن ہوگیا۔

آج کوئی نہیں جانتا کہ حضرت دانیال علیہ السلام کہاں دفن ہیں؟

ماخذات: توریت، قصص الانبیاء، عہد عتیق کا تاریخی سفر۔

استنبول کا عاشق

ابنِ کبیر

وہ یگانہ روزگار تھا۔ شہرتِ آفاقی کا حامل تھا۔ اس کی خیال آفرینی کا سکہ کئی ممالک میں جاری وساری تھا۔ اس نے قوتِ قلم سے خزانۂ ادبِ ترک کو مالاً مال کردیا تھا پھر بھی اس پر انگلیاں اُٹھانے والے کم نہ تھے جویک زبان ہوکر اس پر سرقہ کا الزام عائد کرتے تھے مگر یورپ والے اس کلکِ گہربار کے مجنون تھے۔ ایک کے بعد ایک پذیرائی کا سلسلہ دراز تھا۔

ایک نابغہ روزگار ادیب کے سسکتے چہکتے شب و روز کا احوال

جون 1957ء، استنبول:

"پوری دنیا میں اِس کے نام کا ڈنکا بجے گا۔ جو اس سے پہلے گزرے ہیں، وہ بھلا دیے جائیں گے اور جو اس کے بعد آئیں گے، وہ اپنا سر احتراماً جھکا دیں گے۔ یہ متنازعہ ٹھہرایا جائے گا، لیکن چاہا بھی بہت جائے گا۔ غیر اسے سر پر بٹھائیں گے۔ تمہارا پوتا، تمہارا اِس ملک کا نام روشن کرے گا۔"

سایہ دار درخت تلے، پانسہ پھینک کر مستقبل کی پیشگوئی کرنے والے نجومی کی زمانہ شناس آنکھیں چمک رہی تھیں۔

اُس کے تجربے کار، ضعیف ہاتھوں میں ایک معصوم بچے کا ہاتھ تھا جس کے پہلو میں ایک بوڑھا شخص کھڑا تھا جس کی آنکھوں میں مسرت اور تجسس دونوں ہی کیفیات سمٹ آئی تھیں۔

بوڑھے کی بیوی بھی وہاں موجود تھی۔ وہ خاموشی سے مٹھی میں بند اُن سکوں کو دھیرے دھیرے ہلا رہی تھی جو نجومی کو بطور معاوضہ ادا کیے جانے تھے۔

یہ استنبول کے ایک سرسبز پارک کا منظر تھا جہاں بوڑھا روز اپنی بیوی کے ساتھ چہل قدمی کے لیے آتا تھا۔ اس پارک میں ایک گھنے درخت کے نیچے بوڑھا نجومی بیٹھتا تھا جو قرب و جوار میں اپنی پیشگوئی کے لیے خاصا مشہور تھا۔

آج بوڑھا اپنے پوتے کو بھی ساتھ لے آیا۔ نہ جانے کیا سوچ کر نجومی کے سامنے جا کھڑا ہوا اور اب نجومی بڑے ہی دلکش پیرائے میں اس کے پوتے کے درخشاں مستقبل کی پیشگوئی کر رہا تھا جس نے بوڑھے کو خوشی سے بھر دیا تھا۔

نجومی کے چپ ہونے پر اُس نے کھنکھار کر گلا صاف کیا ''تو کیا یہ ترکی کا سب سے بڑا تاجر بنے گا؟''

''تاجر؟'' نجومی مسکرایا۔ اس کی نظریں اب بھی بچے کی ہتھیلیوں پر ٹکی تھیں۔ ''ہاں تاجر، لیکن اشیائے ضرور یہ کا تاجر نہیں... یہ تو لفظوں کی تجارت کرے گا۔ الفاظ کا فسوں گر کہلائے گا!''

بوڑھے کی آنکھوں میں دمکتی مسرت کی روشنی ماند پڑنے لگی۔ ان میں حقارت سمٹ آئی۔ اس نے اپنے پوتا کا ہاتھ نجومی کے تجربے کار ہاتھوں کی نرم گرفت سے آزاد کرواتے ہوئے ترش لہجے میں کہا ''اس کا دادا شہر کا سب سے بڑا تاجر، اس کا باپ تاجر اور تم کہہ رہے ہو کہ یہ مستقبل میں ایک نکما، کام چور شخص ثابت ہوگا؟ ادیب بنے گا ہنہ!''

اس نے تیزی سے بچے کو گود میں اُٹھایا اور چل دیا۔ اُس کی بیوی نے ناگواری سے سکے نجومی کے سامنے پھینکتے ہوئے ایک ناپسندیدہ نگاہ اُس کے جثے پر ڈالی اور اپنے شوہر کے پیچھے چل دی۔

نجومی خاموش رہا اور اُنہیں اُس گھنے درخت سے دور جاتے دیکھتا رہا، جہاں وہ بیٹھتا تھا۔ دفعتاً معصوم بچے نے مڑ کر نجومی کی طرف دیکھا۔ دونوں کی آنکھیں چار ہوئیں۔ دونوں مسکرائے۔

''یہ لکھا جا چکا ہے... یہی اس کی قسمت ہے... ایسا ہی ہوگا!'' نجومی خودکلامی کے عمل سے گزر رہا تھا۔

☆☆☆

7 دسمبر 2006ء، سویڈن:

''اسٹوک ہاؤن'' کی مشہور زمانہ سویڈش اکیڈمی کا ہال حاضرین سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ روشنی اور رنگوں کے درمیان کئی نادرروزگار شخصیات موجود تھیں۔ حاضرین بھی بے حد مسرور تھے، اِس تاریخی تقریب کا حصہ بننا وہ اپنے لیے اعزاز سمجھتے تھے۔

جن چنیدہ افراد کو آج اپنے خیالات کا اظہار کرنا تھا، وہ اگلی صفوں پر براجمان تھے جن میں سے ایک جو دراز قد تھا اور عینک لگاتا تھا، خاص و عام کی توجہ کا مرکز بنا ہوا تھا۔

بالآخر تالیوں کی گونج میں اُس کا نام پکارا گیا۔ حاضرین کی آنکھوں میں اشتیاق سمٹ آیا۔ وہ ہمہ تن گوش ہو گئے۔

وہ کھڑا ہوا۔ کوٹ درست کیا۔ عادتاً بالوں میں ہاتھ پھیرا اور اسٹیج کی جانب بڑھنے لگا۔

تالیوں کی گونج میں وہ چھوٹے چھوٹے قدم اُٹھاتا ہوا زینہ عبور کر رہا تھا۔ ہاتھ میں ''ابا کا سوٹ کیس'' کے عنوان سے تحریر کردہ مضمون تھا، جسے وہ آج کی شام پڑھنے کا ارادہ رکھتا تھا۔ اسے اندازہ تھا کہ تالیوں کا سلسلہ اس وقت تک نہیں تھمے گا جب تک وہ مائک پر نہیں پہنچ جاتا۔

''بے شک یہ ایک قیمتی لمحہ ہے، جو ہر ایک کا نصیب نہیں بنتا!'' اُس نے خود سے کہا تاہم زبان سے ادا ہونے والے الفاظ ذہن کو یکسو نہیں کر پائے، جو ماضی میں بھٹک رہا تھا۔ اور یہ قابلِ فہم ہے، کیونکہ دنیائے ادب کے مستند ترین اعزاز کے لیے منتخب کیے جانے کے بعد کئی اوٹ پٹانگ خیالات ذہن پر یلغار کر سکتے تھے۔

اور پھر اُس کے پاس تو سوچنے کے لیے کئی موضوعات تھے۔ وہ ان نام نہاد خیر خواہوں کی بابت سوچ سکتا تھا جنہوں نے اُسے متعدد بار ملک چھوڑنے کا مشورہ دیا... شدید ترین تنقید اور ٹیلی فون پر ملنے والی دھمکیوں سے جڑے خیالات بھی اُسے گھیر سکتے تھے جن کا وہ گزشتہ چند برس سے شکار تھا... مگر اُس خاص لمحے اُس کے ذہن میں فقط وہ تلخ اور مشکل ترین چار برس تھے، جب اُسے اپنے پہلے ناول کی اشاعت کے لیے سینکڑوں پبلشروں کے دروازے کھٹکھٹانے پڑے، بھاگ دوڑ کرنا پڑی، ناکامیوں کا منہ دیکھنا پڑا!

وہ مائک تک پہنچ گیا۔ کاغذات کا پلندہ سامنے رکھا۔ ایک نظر حاضرین پر ڈالی۔ کھنکھار کر گلا صاف کیا۔ اب ہال میں ترکی سے تعلق رکھنے والے فرید اورخان پامک کی آواز گونج رہی تھی جس کے جنون کو تسلیم کرتے ہوئے اُسے 2006ء کے نوبل انعام برائے ادب سے نوازا گیا تھا۔ وہ نوبل پرائز کی سوسالہ تاریخ میں مسلم دنیا سے تعلق رکھنے والا دوسرا ادیب تھا، جو اِس ایوارڈ کا حق دار ٹھہرا!

☆☆☆

جس برس کمال اتاترک کے ترکی نے ''نیٹو'' میں شمولیت اختیار کی اُسی برس اورخان نے استنبول کے ایک امیر کبیر گھرانے میں آنکھ کھولی۔

اُس زمانے کا استنبول آج کے استنبول سے یکسر مختلف تھا۔ سڑکیں دھول مٹی سے اُٹی تھیں۔ بلند و بالا عمارتیں خال خال ہی نظر آتی تھیں۔ کہیں کہیں کھنڈر بھی ملتے تھے۔ ٹریفک بھی خاصا کم تھا۔ ہاں، ایک شے ایسی ضرور تھی جو آج کے استنبول میں بھی پورے جاہ و جلال کے ساتھ موجود ہے۔ اور وہ تھے چوراہوں پر نصب کمال اتاترک کے مجسمے!

ایسے ہی ایک چوراہے سے چند فرلانگ کے فاصلے پر شہر کا متمول ترین علاقہ تھا، جہاں امراء کی کوٹھیاں تھیں۔ وہیں اورخان کے دادا نے بڑی امیدوں کے ساتھ اپنے سپنوں کا محل تعمیر کیا تھا جو چند برسوں بعد وقت کے طوفانوں کی نذر ہونے والا تھا۔

اُس کا دادا ظفر پامک اپنے زمانے کا مشہور سول انجینئر اور کامیاب کاروباری شخصیت تھا۔ اس کا استنبول میں کافی اثر و رسوخ تھا۔

جب دائی نے اُس بوڑھے لیکن زندگی سے بھرپور شخص کو اطلاع دی کہ خدا نے اُسے ایک اور پوتے سے نوازا ہے، وہ سوٹ میں ملبوس اپنے کمرے کی کھڑکی کے پاس بیٹھا سگریٹ پی رہا تھا۔

''ٹھیک ہے، تم جاؤ!'' اس نے دائی کی جانب دیکھے بغیر اپنی کھردری آواز میں کہا۔

چند ساعت وہ خاموش بیٹھا رہا۔ دراصل وہ اپنے بیٹوں کے بارے میں سوچ رہا تھا، جنہوں نے اس کے نقشِ پا کا تعاقب کرتے ہوئے کاروباری دنیا میں قدم ضرور رکھا لیکن پیسے بنانے کے بجائے پیسے گنواتے رہے۔

''یہ وقت اس طرح کے خیالات کے لیے مناسب نہیں۔'' بالآخر اس نے سر جھٹکتے ہوئے خود سے کہا۔ اگرچہ وہ دیگر ترکوں کے مانند خود کو مغربی اور سیکولر سوچ کا حامل ظاہر کرتا تھا لیکن اندر سے وہ ایک مذہبی شخص تھا سو اس نے چند ساعت آنکھیں بند کر کے خدا کو یاد کرنے کا ارادہ باندھا لیکن عملاً ایسا کر نہیں سکا کیونکہ فوراً ہی اُس کا بیٹا سامنے آن کھڑا ہوا جس کی گود میں نومولود تھا۔

''بابا، آپ کا پوتا!''

بوڑھا آگے بڑھا۔ نومولود کو گود میں لیا جس کے معصوم چہرے میں اسے اپنی شباہت نظر آئی۔ پوتے کا ماتھا چومتے ہوئے اُسے محسوس ہوا کہ وہ جذبات کی شدت سے لرز رہا ہے۔

''آپ ٹھیک تو ہیں بابا؟'' بیٹے نے اُس کے کاندھے پر ہاتھ رکھا۔

''ہاں!'' اُس نے دھیرے سے کہا۔ ''جشن کا انتظام کرو!''

☆☆☆

کوٹھی کی راہداریوں میں دن بھر ریڈیو کی آواز گونجتی تھی۔ ریڈیو سیٹ بوڑھے کے کمرے میں رکھا تھا جس کی نشریات گھر کے تمام افراد یکساں دلچسپی سے سنا کرتے تھے۔

بوڑھا صبح بیدار ہوتے ہی سگریٹ سلگا لیتا، ریڈیو آن کر دیتا اور اُس وقت تک بند نہیں کرتا جب تک نشریات تمام نہیں ہو جاتیں۔

ننھا اورخان بھی اپنے بڑے بھائی سوکید کا ہاتھ پکڑے ''دے دے، دے دے'' (دادا) پکارتا بوڑھے کے کمرے میں چلا جاتا جہاں کبھی کبھار چند میٹھی گولیاں اُس کے ہاتھ لگ جاتیں۔

بڑے ہونے کے بعد اورخان نے اکثر خود سے یہ سوال

کیا" دے دے اتنی دلچسپی سے ریڈیو کیوں سُنتے تھے۔ وہ تو پوری طرح حکومت کے کنٹرول میں تھا۔ یکطرفہ خبریں، ایک جیسے ڈرامے، حکومت کی شان میں قصیدہ گوئی، بس!"

خیر یہ سوال تو باشعور ہونے کے بعد اس کے ذہن میں کوندا۔ بچپن میں تو وہ بھی گھر کے دیگر بچّوں کی طرح ریڈیو کی نشریات بڑے شوق سے سنا کرتا تھا۔ ہر شام آدھے گھنٹے کے اشتہارات نشر ہوتے۔ آٹھ بجے مغربی موسیقی کا پروگرام شروع ہوتا جسے استنبول میں بہت دلچسپی سے سنا جاتا۔ اس پروگرام میں عوام کی فرمائشوں پر گانے چلائے جاتے تھے۔

ایک دن نہ جانے کیا سوچ کر ننھے اورخان نے پروگرام کے میزبان کی جانب سے بتایا جانے والا نمبر ڈائل کر دیا اور اپنی فرمائش نوٹ کروادی۔ اگلے مہینے جب بل میں یہ کال لگ کر آئی بوڑھا آگ بگولا ہوگیا۔

"یہ کس کی حرکت ہے؟" لہجے میں غصہ تھا۔ سب چپ رہے۔ "چادر دیکھ کر پاؤں پھیلاؤ۔ میں یہ برداشت نہیں کروں گا۔"

رات میں اُس نے ڈرتے ڈرتے سوکید کو مطلع کیا کہ یہ حرکت اس کی تھی۔

"کیوں کھری کھری سننا چاہتے ہو؟" اس کے چہرے پر تفکرات تھے۔ "مصیبت پوچھ کر نہیں آتی۔ ہوش کے ناخن لو، آئندہ یہ حرکت نہیں کرنا۔"

اس نے نصیحت گرہ سے باندھ لی اور پھر یہ غلطی نہیں کی۔

ریڈیو سے رات نو بجے خبرنامہ نشر ہوتا تھا جو بوریت سے بھرپور ہوتا۔ فقط فوج کا موقف پیش کیا جاتا جس کے اعلیٰ افسران ہر رات عوام کو یہ پیغام دیتے کہ وہی اتاترک کی ریاست کی اصل محافظ ہیں۔ اکثر خبرنامہ سن کر بوڑھے کے ذہن میں چیونٹیاں سی رینگنے لگتی "قدرت کی لاٹھی بے آواز ہے!" وہ بڑبڑاتا۔

☆☆☆

بھرا پُرا گھرانہ، بنیادی سہولیات سے آراستہ گھر، جہاں اُس کے چچا، تایا کے علاوہ دیگر رشتے دار بھی مقیم تھے۔ اور گھر کا سربراہ اس کا دے دے، جو پہلی ہی نظر میں ایک سخت مزاج آدمی معلوم ہوتا تھا۔

اُس کا حکم تھا "سب ساتھ بیٹھ کر کھانا کھائیں گے!" اور ایسا ہی ہوتا۔ سب وقت مقررہ پر میز کے گرد جمع ہو جاتے۔

تہوار منانے کے طریقے بھی وہی وضع کرتا "اس بار یوم آزادی پر سبز جھنڈیوں سے گھر سجے گا... اس سال اتاترک کی سالگرہ پر کوئی دعوت نہیں ہوگی... اس بار عید کے روز ہم سب پکنک پر جائیں گے!"

اور گھر کے چھوٹے بڑے بے چوں وچرا اس کے احکامات قبول کر لیتے۔

ننھے، شرمیلے اورخان کو اپنے گھر سے بہت محبت تھی۔ اسے لوگوں میں رہنا، خاموشی سے ان کی گفتگو سننا بہت پسند تھا۔ رات جب وہ بستر پر دراز ہوتا تو اپنی خوش قسمتی پر رشک کرتا کہ اُسے ایک اچھا، پڑھا لکھا خاندان میسر ہے۔ اُسے قطعی اندازہ نہیں تھا کہ گردشِ ایام ایک روز سب کچھ بدل دے گی!

☆☆☆

"ننھا اورخان ہر معاملے میں سوکید کی تقلید کرتا ہے!" ایک روز یاسر پامک نے اپنی خوبرو بیوی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"سوکید بھی اپنے چھوٹے بھائی سے بہت پیار کرتا ہے۔" ہوئی کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔ "وہ قدم قدم پر اس کی رہنمائی کرتا ہے، اس کی غلطیاں اپنے سر لے لیتا ہے، اسے مفید مشورے دیتا ہے۔"

سوکید ہی کی دیکھا دیکھی اورخان کے سر میں پتنگ بازی کا سودا سمایا لیکن جلد ہی اس سے اکتا گیا۔ پھر کبوتر بازی کا شوق چرایا لیکن یہاں بھی بات نہیں بنی۔ پھر ایک روز اُس نے دیکھا، سوکید رنگ رنگ کی پنسلیں لیے بڑے سے سفید کاغذ پر مختلف اشکال بنا رہا ہے۔ اس عمل سے وہ مبہوت رہ گیا۔

اسی روز اُس کی رنگوں سے دوستی ہوگئی۔ اب وہ بھی اکثر سفید ورق پر رنگین پنسلیں گھستا نظر آتا۔

"میرا بیٹا بڑا ہو کر مصور بنے گا۔" اس کی شفیق ماں اکثر کہا کرتی تھی۔ اور اگر کبھی یہ جملہ اُس کی دادی سن لیتی تو فوراً اپنی بہو کو ڈانٹ دیتی۔ "کوا چلا ہنس کی چال اپنی بھی بھول گیا۔ اس کا دادا تاجر، باپ تاجر، یہ بھی تاجر ہی بنے گا، سمجھیں!"

"جی!" بہو چپ ہو جاتی۔

مصوری کی جانب وہ سوکید کی وجہ سے آیا لیکن جلد ہی بڑا بھائی اس فن سے الگ ہو گیا البتہ ننھا اورخان رنگوں سے کھیلتا رہا۔

رشتے کی بہن حمیرا سے بھی اُس کی گہری دوستی تھی۔ اس رشتے میں اورخان سوکید کا کردار ادا کرتا اور حمیرا اورخان بن جاتی۔ یعنی وہ اورخان کی تقلید کرنے کی کوشش کرتی اور اورخان اس کی رہنمائی کرتا۔

☆☆☆

1960ء ترکی کی تاریخ کا اہم ترین سال تھا تاہم اورخان کو اُس وقت تک اِس کا ادراک نہیں ہوا جب تک وہ خود آزادی کے ساتھ تاریخ کا مطالعہ کرنے کے قابل نہیں ہوگیا۔ ہاں، اُس کے فہم کے مطابق اس برس ایک اہم واقعہ ضرور رونما ہوا تھا!

قصہ کچھ یوں ہے کہ ایک سرد صبح ساتھی طالب علم نے اُس کے کان میں سرگوشی کی "کیا تمہارے بابا آج تمہیں ہالی ووڈ کی فلم دکھانے لے جائیں گے؟"

"ہالی ووڈ فلم؟" اس کی آنکھوں میں حیرت تھی۔ اُس وقت وہ آبی رنگوں کو کاغذ پر بکھرتے ہوئے ایک تصویر بنا رہا تھا۔

"ہاں، تمہیں یہ بھی نہیں پتا؟ اب سنیما میں انگریزی فلمیں بھی چلائی جائیں گی۔"

شام میں کھانے کی میز پر اُس نے اپنے بابا سے پوچھا "آپ مجھے ہالی ووڈ فلم کب دکھائیں گے؟"

"ہالی ووڈ فلم؟" باپ کے لہجے میں حیرت تھی۔

"ہاں، ہمیں بھی فلم دیکھنی ہے!" میز پر موجود دیگر بچّوں نے ضد شروع کر دی جن میں سوکید اور حمیرا پیش پیش تھے۔ ان کی آنکھوں میں تجسس دمک رہا تھا۔

"دکھائیں گے بھئی ضرور دکھائیں!" یاسر پامک مسکرا دیا اگرچہ اندر سے وہ خوفزدہ تھا جس کی وجہ ملک کے بگڑتے ہوئے سیاسی حالات تھے جنہوں نے استنبول کو اندیشوں میں مبتلا کر دیا تھا۔

دراصل 1922ء میں اتحادی فوج کو مصطفیٰ کمال کی قیادت میں پسپا کرنے کے بعد جب ترک فوج نے جدید ترکی کی بنیاد رکھی تو مذہب کو سیاست سے علیحدہ کرتے ہوئے سیکولرازم کے انعقاد کے لیے کئی بدنام زمانہ اصلاحات کی گئیں۔ عربی رسم الخط کو متروک قرار دیے جیسے آمرانہ فیصلے ہوئے، جنہوں نے عوام کو خدشات میں مبتلا کر دیا، وہ سڑکوں پر نکل آئے۔ خاصا خون خرابہ ہوا لیکن فوج نے بزور طاقت مسائل پر قابو پایا۔ آنے والے دنوں میں مصطفیٰ کمال نے اتاترک (ترکوں کا باپ) کا خطاب حاصل کر لیا۔ 1938ء میں اُس کے انتقال کے بعد عصمت انونو ملک کا صدر بنا جس نے فوج کی بھرپور پشت پناہی کے ساتھ اتاترک کی اصلاحات جاری رکھیں۔

جن برسوں میں اورخان شعور کی منازل طے کر رہا تھا، عدنان مینڈریس کرسی صدارت پر براجمان تھا جسے بوڑھا اکثر اپنی گفتگو میں "نیک روح" قرار دیا کرتا تھا۔

ماہنامہ جاسوسی ڈائجسٹ

رنگ و سنگ

پردۂ سیمیں پر تھرکتی، گاتی اور رنگ بکھیرتی پتلیوں کے پیچھے کارفرما خوف و دہشت میں رچی سما شاہد کی لہو رنگ داستان

مغرب کے نرالے انداز

مغربی دنیا کی تہذیب اور ماحول کی عکاسی اور محبت کی پُر درد ناقابل فراموش کہانیاں

گرداب

پیچ در پیچ حادثات سے نکل کے ایک نئی منزل کی جانب گامزن انیسا قلندری کی سلسلے وار کہانی

للکار

طاہر جاوید مغل کے جادو اثر قلم کی ایک اور جھلک۔ زندہ دلانِ لاہور کے سنگ

سرورق کی کہانیاں

جذبات و احساسات میں ہلچل مچا دینے والی سرورق کی سنسنی خیز کہانیاں جو تا دیر آپ کو حصار میں رکھیں گی

آپ کے تبصرے...
مشورے... محبتیں... شکایتیں...
اور نئی نئی دلچسپ باتیں ... کتھائیں

چینی نکتہ چینی

www.Paksociety.com

تھے "مگر ہمیں خوشی ہے کہ بیلی کو اگر کوئی گرل فرینڈ مل رہی ہے تو وہ تم ہو۔۔۔"

ان خطوط سے اندازہ لگانا مشکل نہیں ہے کہ سارہ کا یہ کردار جنیفر کے لیے اور اس کے کیریئر کے لیے کس قدر اہمیت کا حامل ہے۔ اس سیریز کی اہم بات یہ بھی ہے کہ جنیفر کا یہ کردار آگے چل کر ایسا رُخ اختیار کرلیتا ہے کہ وہ کم عمری میں حاملہ ہو جاتی ہے۔ لیکن پھر بھی اس کا کیریئر آگے کی ہی طرف بڑھ رہا تھا۔ پارٹی آف فائیو میں جنیفر کا پہلا سیزن اس کے لیے بہت بڑی کامیابی تھا۔ اس کے کردار کی مقبولیت اور جنیفر کی اداکاری کو پسند کیے جانے کے باعث یہ کردار مسلسل اور مستقل کردیا گیا۔ اب نوجوان ناظرین اس سیریز کے بجائے جنیفر کے سحر میں گرفتار ہونا شروع ہو گئے تھے۔ لوگ اس کے چہرے، نام اور کام سے واقف بھی ہو رہے تھے اور متاثر بھی ہونے لگے تھے۔ یہ بات اس کے لیے کسی اعزاز سے کم نہیں تھی۔ اس کی محنت رنگ لا رہی تھی۔ اس سیریز سے اس کی تمام امیدیں پوری ہو رہی تھیں اور اب بہ طور اداکارہ اس کا نوٹس لیا جانے لگا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ جو خواب دیکھتی آئی ہے ان کی تعبیر ملنے کا وقت آگیا تھا۔

O*O

گزشتہ چند ہفتوں میں جینفر لو نے اپنی استعداد سے زیادہ کام کیا تھا۔ وہ بُری طرح تھک چکی تھی مگر پھر بھی آرام کرنے کے موڈ میں نہیں تھی۔ گرمیوں کے ابتدائی دنوں کے لیے "پارٹی آف فائیو" معطل کردیا گیا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ ریکارڈنگ کی جانب سے فراغت تھی مگر لو سکون سے گھر بیٹھنے والی نہیں تھی۔ اب تو وقت آیا تھا کہ وہ زیادہ سے زیادہ کام کرتی اور اپنی مقبولیت کو برقرار رکھنے کی کوشش کرتی۔ وہ ایک بہترین گلوکارہ تھی۔ باکمال رقاصہ تھی اور اتنی اچھی اور کامیاب اداکارہ بھی ثابت ہو رہی تھی۔ پارٹی آف فائیو کی ریکارڈنگ منسوخ ہوئیں تو اس کی ماں نے کہا "اب کیا کرنے کا پروگرام ہے لو!"

لو نے چونک کر کہا "اب میں ایک نیا البم تیار کروں گی؟"

"البم! کیا پچھلے البم سے سبق نہیں سیکھا؟" بیٹ ہیوٹ نے تشویش زدہ ہو کر کہا۔

"اوہ! مام! وہ میری غلطی تھوڑی تھی۔ سب کا یہی کہنا ہے کہ میری کارکردگی بہت عمدہ تھی، مگر البم کو پبلسٹی کی ضرورت تھی۔ اب میں خاصی مشہور ہوں۔ مجھے یقین ہے میرا البم ہاٹ کیک کی طرح فروخت ہوگا۔"

اگلے ہی دن سے لو نے نئے البم کی تیاری شروع کردی اور پھر تین چار دن بعد ہی اچانک اسے دو فلمیں مل گئیں۔ پہلی کا نام ہاؤس اریسٹ (HOUSE ARREST) تھا۔ اس فلم میں جیمی لی کرٹس مرکزی کردار کر رہی تھی۔ ہالی وڈ کی فلموں سے دلچسپی رکھنے والے جیمی لی کرٹس کو بھولے نہیں ہوں گے۔ جیمی لی کرٹس وہی اداکارہ ہے جس نے ایکشن کامیڈی فلم "ٹرولائز" میں آرنلڈ شیوارزنیگر کی بیوی کا کردار ادا کر کے بے پناہ شہرت حاصل کی تھی۔

اِدھر لو کا البم زور و شور سے تیار ہو رہا تھا اور اُدھر ہاؤس اریسٹ کا کام شروع ہوگیا۔ البم کو سال کے آخر میں ایک سادہ سے عنوان "جینفر لو ہیوٹ" کے تحت ریلیز کیا جانا تھا۔ اب وہ بے پناہ مصروف ہوگئی تھی۔ اس کے پاس سونے کے لیے بھی وقت نہیں بچا تھا۔ اس کا شیڈول بے حد تھکا دینے والا تھا۔ وہ ہاؤس اریسٹ کے سیٹ پر کام ختم کرکے بجائے گھر جانے کے ریکارڈنگ اسٹوڈیو چلی جاتی، جہاں البم کی تیاریاں زور و شور سے جاری تھیں۔ راستے میں آنکھیں بند کرکے گاڑی میں لیٹ جاتی اور اس طرح اپنی نیند پوری کرلیتی۔

ہاؤس اریسٹ اس کے لیے بہت اہم تھی۔ وہ جیمی لی کرٹس کے ساتھ کام کر رہی تھی۔ جس کو وہ بہت زیادہ پسند کرتی تھی۔ پہلے دن سیٹ پر جب اس نے جیمی لی کرٹس کو دیکھا تو بے اختیار اس کے حلق سے چیخ نکل گئی، وہ اپنی ماں کا ہاتھ چھڑا کر دوڑتی ہوئی گئی اور جیمی لی کرٹس کے گلے سے جھول گئی۔

جیمی اس کی یہ دیوانگی اور وارفتگی دیکھ کر بوکھلا گئی، لو نے اپنی بے ترتیب سانسوں پر قابو پاتے ہوئے کہا "اوہ! گاڈ، مجھے تو یقین ہی نہیں آ رہا کہ میں آپ کے سامنے کھڑی ہوں۔ مم۔ میرا مطلب ہے آپ میرے سامنے کھڑی ہیں؟"

جیمی لی کرٹس خاموشی سے کھڑی بچوں جیسی حرکت کرنے والی اس بھرپور لڑکی کو دیکھ رہی تھی۔ وہ اس کا پارٹی آف فائیو دیکھتی رہی تھی، پھر اس نے کہا "تم تو خود اتنی مقبول اسٹار ہو کہ لوگ تمہیں دیکھنے کے لیے مچلتے رہتے ہیں۔"

لو نے کہا "مچلتے ہوں گے، مگر میں آپ کو پسند کرتی ہوں۔ میں اب تک بے شمار لوگوں سے مل چکی ہوں مگر آپ جیسی پیاری اور بہترین خاتون کوئی اور نہیں۔"

جیمی لی کرٹس مسکرانے لگی، اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولی "تم بھی تو بہت پیاری اور اپنی عمر کی لڑکیوں میں بہترین ہو،

تم جینیفر لو ہیوٹ ہی ہو نا؟"

لو پُرجوش انداز میں سر ہلانے لگی، یہ اس کے لیے اعزاز کی بات تھی کہ جیمی لی کرٹس جیسی عورت اس سے واقف تھی۔ اسے اس کا نام تک یاد تھا۔ اس وقت لو کو جو خوشی محسوس ہوئی تھی، اس کا تاثر ابھی تک لو کے ذہن پر تازہ ہے۔ وہ کہتی ہے "جب میں سیٹس پر شوٹنگ سے فارغ ہو کر پڑھنے بیٹھتی تھی تو وہ میرے پاس آتی تھیں، ہمیں پیار کرتیں اور ٹافیاں دیتی تھیں۔ وہ بہت سچی اور بہادر خاتون ہیں۔ میرے ساتھ تو ان کا رویہ بہت اچھا تھا۔

ہاؤس اریسٹ کا کردار جینیفر لو کو آسانی سے نہیں مل گیا تھا۔ جب اس کردار کے لیے اس کا نام زیرِ غور آیا تو اسی وقت یہ بحث چھڑ گئی تھی کہ کہیں اس کا انتخاب غلط تو نہیں ہو رہا۔ پروڈیوسر نے تو جینیفر سے پہلی ملاقات پر ہی صاف صاف کہہ دیا تھا کہ تم اچھی اداکارہ ہو مگر اس فلم میں تمہارا انتخاب ناممکن بھی ہو سکتا ہے۔"

جینیفر نے چونک کر کہا "یہ آپ کیسی بات کر رہے ہیں، میں نے آڈیشن دیا ہے اور میں اس میں کامیاب ہوئی ہوں۔"

"مگر تم عمر میں بڑی محسوس ہوتی ہو، تمہارا جسم ایسا ہوگیا ہے کہ کوئی بھی اس بات کو تسلیم نہیں کرے گا کہ تم تیرہ برس کی ہو۔ جبکہ فلم میں جس کردار کے لیے تم زیرِ غور ہو، وہ تیرہ برس کی نوعمر لڑکی ہے۔ تم اب نوعمر نہیں نوخیز ہو گئی ہو۔ نوخیز کا مطلب سمجھتی ہو نا۔"

جینیفر نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ اس پر مایوسی طاری ہو گئی تھی۔ پروڈیوسر کا خیال درست تھا، وہ گھر واپس آئی۔ آئینے میں مختلف زاویوں سے اپنے آپ کو دیکھ کر خود بھی حیران رہ گئی، وہ ایسی بھری بھری اور پھل دار ہو گئی تھی اور اسے احساس بھی نہیں ہو سکا تھا۔

مگر وہ ہمت ہارنے والی تھی۔ اگلے دن وہ ایک بار پھر پہنچ گئی، اب اس نے اپنے حلیے میں تھوڑی تبدیلی کرلی تھی۔ میک اپ کے بغیر۔ اور بالوں کو گھونگھریالا کرلینے کے بعد وہ اپنی عمر سے کم دکھائی دے رہی تھی۔ کپڑے بھی عام سے پہن رکھے تھے۔ اس کی دوسری کوشش ناکام نہیں ہوئی اور اسے فائنل کرلیا گیا۔ اب وہ ہاؤس اریسٹ کی کاسٹ میں شامل تھی، جیمی لی کرٹس کے ساتھ کام کرنے جا رہی تھی۔ کرٹس کے ساتھ کسی فلم میں کام کرنا اس کے لیے بہت اہم بات تھی۔ وہ بہت پُرجوش اور خوش نظر آنے لگی تھی۔ اس کا جوش دیکھ کر کرٹس بھی پُرجوش ہو رہی تھی۔ جب فلم کی عکس بندی مکمل ہو گئی تو کئی دنوں بعد کرٹس نے کرسمس کے موقع پر اسے فون کیا اور کرسمس کی مبارک باد دیتے ہوئے اپنی نیک خواہشات کا اظہار بھی کیا۔ لو تو پھولے نہیں سمائی۔ وہ اس کی زندگی کا یادگار کرسمس بن گیا۔ جس کا تذکرہ وہ کئی مہینوں تک کرتی رہی۔ اس فلم میں اس کے ساتھ جیمی لی کرٹس ہی نہیں بلکہ جینیفر ٹیلی بھی کام کر رہی تھی۔ جینیفر لو اس کی بیٹی کا کردار کر رہی تھی۔ اس کو صرف ایک ہی پریشانی تھی کہ اس فلم میں اسے اپنی فلمی ماں (جینیفر ٹیلی) کی وجہ سے خاصی شرمندگی کا سامنا کرنا تھا لیکن جینیفر لو کے پیشِ نظر صرف ایک ہی بات تھی کہ اس کی فلمی ماں آسکر ایوارڈ کے لیے نامزد ہوئی ہے۔

یہ ایک دلچسپ فلم تھی، اس کی کہانی کئی اعتبار سے منفرد اور انوکھی تھی۔ چودہ سال کی عمر کے گروور بین ڈورف (اداکار کائل ہاورڈ) اس کی چھوٹی بہن اسٹیسی اور ان کے والدین (جیمی لی کرٹس اور کیون پولاک) کے گرد گھومتی ہے۔ دونوں بچوں کے والدین میں اختلافات جنم لیتے ہیں اور شادی کی اٹھارویں سالگرہ پر دونوں فیصلہ کرلیتے ہیں کہ انہیں علیحدہ ہو جانا چاہیے۔ وہ یہ بات اپنے نوعمر بچوں کو بتا دیتے ہیں، بچے عجیب پریشانی میں مبتلا ہو کر اپنے دوستوں سے مشورہ کرتے ہیں۔ گروور کا دوست میٹ انہیں مشورہ دیتا ہے کہ کیوں نہ تم اپنے ماں باپ کو کسی الماری میں بند کردو، وہ ساتھ رہیں گے اور مجبور ہوں گے تو طلاق کا فیصلہ تبدیل کرلیں گے۔ گروور کو یہ تجویز بہت پسند آئی، مگر اس نے اس سے بھی ایک قدم آگے کا فیصلہ کیا، انہوں نے اپنے والدین کی اٹھارویں سالگرہ کے انتظامات گھر کے تہ خانے میں کیے اور پھر سالگرہ کے بعد انہیں تہ خانے میں بند کردیا۔ اس سے پہلے دونوں بچوں نے تہ خانے کی ساری کھڑکیاں بند کرکے ان کے فرار کی تمام راہیں مسدود کردی تھیں۔

دوسرے دن جب یہ دونوں بچے اسکول گئے تو انہوں نے اپنے دوستوں کو اس کارنامے کے بارے میں بتایا۔ اسکول میں ایک بدمعاش لڑکا "ٹی جے" بھی تھا۔ اس نے گروور کی زندگی عذاب کردی تھی۔ اس نے یہ ساری باتیں سن لیں۔ وہ اس کارروائی سے بے حد متاثر ہوا۔ اس نے اس تہ خانے پر نیا دروازہ بھی لگوا دیا اور پھر وہ میٹ کے والدین کو بھی اغوا کرکے اسی تہ خانے میں پہنچانے میں کامیاب ہو جاتا ہے، اس کے والدین کی ازدواجی زندگی بھی تباہی کے دہانے پر تھی اور ان میں بھی علیحدگی ہونے والی تھی۔

گروور نے تو اپنے والدین کے ساتھ یہ حرکت محض اس لیے کی تھی کہ شاید اس طرح اس کی ازدواجی زندگی بربادی سے بچ جائے اور وہ علیحدہ ہونے کا خیال دل سے نکال دیں۔ اس مقصد کے لیے وہ تحقیق بھی کرتا ہے۔ یہ کردار جینیفر لو ہیوٹ کر رہی تھی۔ وہ اپنی ماں کی وجہ سے پریشان تھی' جو اپنے آپ کو عمر رسیدہ سمجھنے کے بجائے اپنی بیٹی جیسی حرکتیں کرتی اور اس جیسی نظر آنے کی کوشش کرتی تھی' اصل میں وہ اس بات کو تسلیم کرنے پر ہی تیار نہیں تھی کہ وہ ایک جوان لڑکی کی ماں ہے۔ اسے بھی اسی تہ خانے میں پہنچادیا جاتا ہے۔

اس کے بعد سارے بچے ایک وڈیو کیمرے کے ذریعے اپنے والدین پر نظر رکھنا شروع کردیتے ہیں۔ مائیکروفون کے ذریعے ان سے بات کرتے ہیں۔ بچوں نے وہ کام ہاتھ میں لے لیے تھے جو دراصل بڑوں کے کرنے کے تھے۔ شروع میں تو بچوں کو بہت مشکل پیش آئی' مگر پھر رفتہ رفتہ مزہ آنے لگا لیکن معاملات بڑوں کی برداشت سے باہر ہوگئے تھے۔ انہوں نے لانڈری کی کھڑکی سے فرار ہونے کا منصوبہ بنایا۔ کرٹس اس کھڑکی کے ذریعے باہر نکلنے کی کوشش کرتی ہے' مگر سامنے بچے ہوتے ہیں۔ وہ واپس تہ خانے میں لڑھک جاتی ہے۔ علیحدگی پر آمادہ میاں بیوی جب تہ خانے میں بند ہو کر ایک ساتھ زندگی گزارنے پر مجبور ہوئے تو وہ ایک دوسرے کے قریب ہوتے چلے گئے' جلد ہی انہیں اندازہ ہوگیا کہ ان کا علیحدگی کا فیصلہ مناسب نہیں تھا۔ ابھی انہوں نے اس موضوع پر کھل کر بات بھی نہیں کی تھی کہ سرزمین ڈورف کا وکیل طلاق کا نوٹس لے کر آگیا۔ یہ نوٹس بیوی کی جانب سے شوہر کے لیے تھا۔ تب بچوں کو یہ بات پتا چلی کہ ان کا باپ اپنی بیوی یعنی ان کی ماں کو طلاق دینا نہیں چاہتا تھا بلکہ ان کی ماں اپنے شوہر سے طلاق لینے کی ضد پر اڑی ہوئی تھی۔ ادھر علیحدگی پر آمادہ میاں بیوی میں محبت اور چاہت کی تجدید نو ہورہی تھی تو دوسری طرف ان کا بیٹا گروور اور اس کی دوست بروک (جینیفر لو ہیوٹ) ایک دوسرے کی محبت میں مبتلا ہورہے تھے۔ بروک نہ صرف اسے پسند کرنے لگی بلکہ اس کا احترام بھی کرنے لگی تھی۔

تہ خانے میں موجود دونوں مرد اب بھی اس قید سے فرار کی راہیں تلاش کررہے تھے۔ دونوں مرد بے پناہ کوششوں کے بعد ایک کھڑکی کے سامنے لگی اینٹیں اکھیڑنے میں کامیاب ہوگئے۔ میٹ کا باپ اس کھڑکی سے باہر نکلنے کی کوشش میں آدھا باہر اور آدھا اندر تھا کہ بچوں نے دیکھ لیا۔ وہ اسے واپس اندر کی طرف دھکیلنے میں جت گئے' جبکہ تہ خانے میں موجود دونوں عورتیں اور ایک مرد اسے باہر دھکیل رہے تھے۔

یہ تمام کارروائی گلی کے اس حصے میں ہورہی تھی جہاں ایک پولیس اہلکار رہتا تھا۔ اس نے یہ سارا منظر پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھا اور پولیس اسٹیشن کو اس واقعے کی رپورٹ کردی۔ کچھ ہی دیر میں پولیس پہنچ گئی۔ اب ان بچوں کے پاس ہتھیار ڈالنے کے سوا کوئی راستہ نہیں تھا۔ اس طرح ان کے علیحدگی پسند والدین نے تہ خانے سے آزادی حاصل کرلی۔ تاہم قید میں رہنے سے ان کے ذہنوں پر خاصا مثبت اثر پڑا۔ میٹ کا باپ اور اس کی ماں طلاق کے فیصلے سے تائب ہو کر ایک دوسرے کے ساتھ رہنے پر پر آمادہ ہوگئے پھر وہ ایک نئے بچے کے بھی والدین بن جاتے ہیں۔ بروک کی ماں کے دل سے جوانی کا نشہ اتر گیا۔ وہ اپنی بیٹی کو جوان اور خود کو عمر رسیدہ سمجھنے پر آمادہ ہوگئی۔ گروور کے والدین کے معاملات بھی درست ہوگئے۔ اس واقعے سے سارے بچے اسکول میں شہرت حاصل کرگئے۔ گروور کو اپنی پسند کی لڑکی بروک (جینیفر لو ہیوٹ) مل گئی' اور پھر سب ہنسی خوشی رہنے لگے۔

O*O

ہاؤس اریسٹ نوجوانوں کے لیے ایک بھرپور تفریحی فلم ثابت ہوئی۔ ایک ایسی مزے دار فلم جس میں بچوں کو بڑوں سے زیادہ ہوشیار' چالاک اور سمجھ دار دکھایا گیا تھا۔ ایک مشکل موضوع پر بننے والی ہلکی پھلکی فلم کو توقعات سے زیادہ پسندیدگی حاصل ہوئی۔ کہانی میں دکھایا گیا تھا کہ والدین کے درمیان ہونے والی علیحدگی کے باعث بچے خود کو بے دست و پا ہوتا محسوس کررہے تھے۔ لہٰذا بچوں نے معاملات کو اپنے ہاتھ میں لے کر بڑوں کے فیصلوں کو تبدیل کردیا۔ اس تبدیلی کو سب نے ہی بہت پسند کیا۔ بنیادی طور پر یہ ایک کامیڈی فلم تھی اور شائقین فلم کو ہنسنے ہنسانے کے لیے تیار کی گئی تھی' مگر اس فلم میں لوگوں کے لیے بہت عمدہ پیغام بھی جگہ جگہ موجود تھا۔ فلم کی کہانی لوگوں کو سوچنے پر مجبور کرتی ہے فلم کے ایک منظر میں جب تمام بچے رات کے کھانے کے لیے بیٹھتے ہیں تو پہلی مرتبہ بڑوں کی طرح شیمپین پینے کی بھی کوشش کرتے ہیں' مگر اس کا ذائقہ انہیں پسند نہیں آتا اور وہ شیمپین منہ سے اگل دیتے ہیں۔ فلم کا بنیادی پیغام یہی تھا کہ بعض اوقات اپنے ذاتی اختلافات کی بنیاد پر نہایت آسانی سے بغیر کچھ سوچے سمجھے علیحدہ ہوجاتے ہیں۔ وہ اپنے

تنازعات' شکوے' شکایات کو دور کرنے کے بجائے آسان راستہ اختیار کرتے ہوئے مسائل سے فرار حاصل کرلیتے ہیں' مگر اس طرح ان کے حساس بچوں پر قیامت گزر جاتی ہے۔

اس فلم میں لو کا کردار بہت اہم تھا۔ وہ ایک طرف تمام بچوں کے لیے گویا ماں بنی ہوئی تھی تو دوسری طرف اپنی زندگی کے پہلے عشق کی دھیمی آنچ سے بھی پگھل رہی تھی۔ اس کا کردار مرکزی تو نہیں تھا' البتہ معاون ضرور کہا جاسکتا ہے اور جینیفر اس عمر میں مرکزی کردار کرنا بھی نہیں چاہتی تھی۔

اس فلم کو سائن کرتے وقت اس کی ماں بیٹ ہیوٹ نے اعتراض کیا تھا کہ "تمہیں خود کو سپورٹنگ کرداروں میں ضائع نہیں کرنا چاہیے۔"

جینیفر نے کم سن دانشوروں کی طرح جواب دیا تھا "میں ابھی ایسے ہی کردار کرنا چاہتی ہوں۔"

"لیکن لو اگر تم ثانوی کردار کروگی تو مرکزی کردار کب کروگی؟"

"جب میں اٹھارہ برس کی ہوجاؤں گی۔ مرکزی کردار بہت بڑی ذمے داری ہوتی ہے۔ پوری فلم کا دباؤ مرکزی کرداروں پر ہوتا ہے' ابھی میں ایسے ہی کردار کرنا چاہتی ہوں' تاکہ اداکاری کو ہر زاویے سے دیکھ سکوں۔ مرکزی کردار ابھی میرے بس کی بات نہیں ہے' فلم کی پوری کہانی مرکزی کردار کے گرد گھومتی ہے اور میں اتنی جلدی اتنا دباؤ برداشت نہیں کرسکتی۔"

اس کی ماں چپ ہوگئی' لو کم عمری میں بھی بڑوں کی طرح باتیں کرنے اور بڑوں کی طرح فیصلے کرنے لگی تھی۔ ہاؤس اریسٹ کے ساتھ ساتھ اس کے نئے البم "جینیفر لو ہیوٹ" کی تیاریاں بھی زور و شور سے جاری تھیں' یہ نیا البم وہ اٹلانٹک والوں کے لیے تیار کررہی تھی۔ اس البم کو گزشتہ البم سے ذرا مختلف انداز میں تیار کیا جارہا تھا نئے البم کے منیجر کو آرڈی نیٹر نے فیصلہ کرلیا تھا کہ وہ اس البم میں جینیفر لو کی بھرائی ہوئی اور قدرے روکھی آواز کی مناسبت سے سُر اور تال والے ہلکے پھلکے گیت شامل کرے گا۔

لو اس البم کے حوالے سے بہت پُرجوش تھی۔ اس میں نہ تو ہنگ جیسا کوئی گیت تھا اور نہ ہی بلند آہنگ موسیقی اور شور شرابا۔ ہاؤس اریسٹ اور یہ البم ایک ہی وقت میں شروع ہوئے تھے۔ جینیفر کا ایک گیت جو اس نے ہاؤس اریسٹ میں گایا تھا۔ اس البم میں بونس کے طور پر شامل کرلیا گیا تھا۔ البم میں اس گیت کو سب سے آخر میں رکھا گیا تھا۔ "اٹس گڈ ٹو نو آئی ایم لائیو (IT IS GOOD TO KNOW I AM A LIVE)" البم میں شامل بقیہ گیارہ گیتوں سے بالکل مختلف تھا۔ خود جینیفر کا کہنا ہے کہ البم گیارہ گیت رات کی پُرسکون خاموشی میں اور تنہائی میں سنے جانے کے قابل ہیں اور یہ آخری گیت ایسا ہے جو دل میں گدگدیاں پیدا کردیتا ہے؟ میں سمجھتی ہوں کہ یہ گیت آخر میں رکھے جانے کا فیصلہ انتہائی دانش مندانہ تھا۔"

اس البم کی تیاری کے دوران لو نے کئی پروڈیوسروں کے ساتھ کام کیا۔ وہ نہ صرف پروڈیوسر تھے بلکہ ان میں سے کئی تو اس البم کے گیت نگار بھی تھے۔ البتہ ویلری ڈیوس البم کے تمام گیتوں اور وڈیوز کی مستقل رکن تھی۔ لو کے تمام گیتوں کے پس منظر میں اس کی آواز سب سے نمایاں تھیں۔ البم کی تیاری کے دوران ہی وہ جینیفر لو کی بہترین دوست بن گئی۔ "جینیفر لو ہیوٹ" نامی اس البم میں نئے گیتوں کے علاوہ کچھ پُرانے گیت بھی تھے جنہیں جینیفر نے از سرِ نو گایا تھا۔ مثلاً "آئی وانٹ اے لو آئی کین سی" ساٹھ کی دہائی میں مقبولِ عام کی سند حاصل کرنے والا وہ شاہکار گیت تھا جو اسموکی رابن سن نے مراکلز (MIRACALS) نامی ایک میوزک بینڈ کے ساتھ اشتراک کے بعد گایا تھا۔ اس طرح اسی (80) کی دہائی میں منظرِ عام پر آنے والی کیٹلاگ سے "آئی ورز آکویز یور گرل" بھی جینیفر نے دوبارہ گایا۔ اسی کیٹلاگ کا ایک گیت "اور لو ڈونٹ تھرو اٹ آل اوے" جو ستر کی دہائی کا ایک مقبول ترین گیت تھا اور جس کو پہلی مرتبہ مشہور گلوکار آنجہانی اینڈی گب نے گایا تھا۔ اس کو بھی جینیفر نے اس البم میں پیش کیا۔

جینیفر کی سب سے بڑی مشکل یہ تھی کہ وہ گلوکاری اور اداکاری کے درمیان سینڈوچ بنتی چلی جارہی تھی۔ اداکاری کی بڑھتی ہوئی مسلسل مصروفیات کے باعث وہ گلوکاری پر بھرپور توجہ نہیں دے پارہی تھی لیکن اس کے باوجود اسے گلوکاری سے عشق تھا۔ وہ اپنے عشق کو مناسب وقت نہ دینے کے باعث ذہنی طور پر اُلجھتی جارہی تھی۔ ان باتوں کا اثر اس کے البم پر بھی پڑا۔ اس البم میں وہ اپنے اندر کی گلوکارہ کو ٹھیک طور پر سامنے لانے میں ناکام رہی۔ البم کا پہلا گیت "کول ودھ یو" ایک ہیجان خیز اور کسی حد تک... بلکہ بہت حد تک بے باک تھا۔ بے باک اور ہیجان انگیز تو خیر پورا البم ہی تھا مگر یہ گیت کچھ زیادہ ہی جذباتی کردینے والا تھا۔ نیم کلاسیکی موسیقی کے حامل اس گیت میں جینیفر کی آواز...

www.Paksociety.com

بے حد پُرکشش اور نکھری نکھری محسوس ہوتی ہے۔ سننے والا اس کی آواز کے رچاؤ اور زیر و بم میں کھو کر رہ جاتا ہے۔ اس گیت کے بارے میں یو ایس ٹوڈے میگزین نے لکھا تھا کہ جینیفر اس گیت میں ماریا کیری سے زیادہ ٹونی بریکسٹن محسوس ہوتی ہے۔ اس گیت کو سننے والے واضح طور پر اندازہ لگا رہے تھے کہ "لیٹس گو بینگ" جیسا گیت گانے والی لڑکی اب مکمل اور بھرپور عورت بن چکی ہے۔ یہ خاصا رومانوی گیت تھا۔

البم کا دوسرا گیت بھی رومان کی چاشنی سے لبریز تھا۔ دھیمی موسیقی اور دل کو چھو لینے والے سُروں میں یہ گیت کسی حد تک پورے البم کا نچوڑ تھا۔ لو اگر اس گیت پر ذرا مزید توجہ دیتی تو شاید یہ بے پناہ مقبول ہوتا۔ صرف اس گیت کی وجہ سے ایک اخبار میں جینیفر کا انٹرویو شائع ہوا اس انٹرویو میں جینیفر نے صاف صاف کہہ دیا کہ "ہاں! یہ گیت میں نے بہت جلدی میں گایا تھا' اس گیت میں کسی قسم کا اضافہ کرنے کا میرے پاس وقت نہیں تھا' میری بدقسمتی ہے کہ یہ گیت ضائع ہوگیا۔"

اب وہ ٹیلی ویژن اور فلم کی وجہ سے خاصی مقبولیت حاصل کرچکی تھی' اس کا نتیجہ حسب منشا نکلا' اور نیا البم' گزشتہ البم کے مقابلے میں زیادہ فروخت ہوا لیکن جینیفر کو اس پر بھی مایوسی ہوئی' اسے اس البم سے بہت زیادہ توقعات تھیں۔ محض جزوی کامیابی نے اس کی ساری امیدیں خاک میں ملادیں اٹلانٹک والوں نے بھی وہی حماقت کی جو گزشتہ البم کے وقت ہوئی تھی۔ اس البم کی مارکیٹنگ درست انداز میں نہیں کی گئی ٹی وی پر تشہیری پروگرام نہیں دکھائے گئے۔ تشہیری پروگرام تیار تو ہوا مگر کسی بھی چینل پر پیش نہیں کیا گیا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ "جینیفر لو ہیوٹ" نامی یہ البم "لیٹس گو بینگ" سے زیادہ تعداد میں تو فروخت ہوا' مگر ریکارڈ ساز کامیابی حاصل نہ کرسکا۔

یہ البم زیادہ تر انہی لوگوں نے خریدا جنہیں اپنے دوستوں کے ذریعے یا پارٹی آف فائیو کی ویب سائٹ یا پھر جینیفر لو ہیوٹ سے متعلق ویب سائٹس سے اس کی اطلاع ملی تھی۔ جینیفر لو ہیوٹ سے متعلق بہت سی ویب سائٹس "پارٹی آف فائیو" میں اس کے پہلے سیزن کے بعد سے ہی ظاہر ہونا شروع ہوگئی تھیں۔ ان میں جینیفر کی ذاتی' آفیشل ویب سائٹ ایک بھی نہیں تھی۔ تاہم "پارٹی آف فائیو" کے پہلے سیزن میں اس کی آمد کے ساتھ ہی انٹرنیٹ پر اس کی ویب سائٹ بننے کی لہر شروع ہوگئی تھی اور پھر اگلے دو برسوں میں اس کے نام سے اتنی تعداد میں ویب سائٹس بن چکی تھیں کہ وہ انٹرنیٹ پر دنیا کی پانچویں مقبول ترین اداکارہ بن گئی۔

پارٹی آف فائیو کے ذریعے اس نے ہزاروں' لاکھوں نوجوانوں کو اپنا دیوانہ بنالیا تھا' انہی دیوانوں نے اس کا البم بھی خریدا۔ تاہم اس البم کی جزوی کامیابی یا جزوی ناکامی کے بعد اس نے ایک پریس کانفرنس میں صاف صاف کہہ دیا کہ میں نے فی الحال میوزک کو ایک طرف رکھ دینے کا فیصلہ کیا ہے۔ میں اس وقت اپنی پوری توجہ صرف اور صرف اداکاری کو دے رہی ہوں اور اس شعبے میں سو فیصد نتائج حاصل کرنا چاہتی ہوں۔

فلم اور پھر البم کے مسلسل کام نے جینیفر کو بُری طرح تھکا دیا تھا۔ اس کے فوراً بعد اسے ایک اور فلم کی آفر ہوگئی۔ اس فلم کا اسکرپٹ بہترین تھا۔ فلم نوجوانوں کے لیے بنائی جارہی تھی۔ فلم کا نام ٹروجن وار تھا' مگر یہ "ریسکیوی" کے نام سے زیادہ مشہور ہوئی۔

O☆O

ٹروجن وار نامی یہ فلم جینیفر کے لیے اس لیے بھی بہت اہم تھی کہ اس میں وہ نوجوان ہیرو کا کردار ادا کررہا تھا جو اس کے دل میں پھانس کی طرح چبھ کر رہ گیا تھا اور اب تک مسلسل ادھوری محبت کی کسک کے طور پر اس کے دل و دماغ میں زندہ تھا۔ وہی نوجوان ول فریڈل! جس کے ساتھ جینیفر نے پہلی مرتبہ خلوت میں کچھ وقت گزارا تھا اور پھر جینیفر نے کئی مرتبہ اس سے رابطہ کرنے کی کوشش کی مگر اس نے دوبارہ کبھی اس سے نہ تو رابطہ کیا اور نہ کوئی بات کی تھی۔ وہ جینیفر کی پہلی محبت تھا۔ بعد میں جینیفر نے جوائے لارنس کے ساتھ بھی کچھ وقت گزارا' مگر ول فریڈل اس کی زندگی میں آنے والا پہلا مرد تھا۔ اسے بھلانا اس کے لیے ناممکن تھا۔ یہ علیحدہ بات تھی کہ ول فریڈل نے اس کے ساتھ کچھ خاص لمحے گزارنے کے بعد گھاس بھی نہیں ڈالی تھی۔ اب جینیفر کی زندگی میں جوائے لارنس آگیا تھا مگر محبت کی یہ کہانی زیادہ آگے بڑھنے میں ناکام رہی تھی' دونوں کی محبت کے چرچے تو عام تھے۔ اخبارات اور رسائل میں ان کی مشترکہ تصویریں اور کھٹی میٹھی خبریں بھی چھپ رہی تھیں مگر جینیفر جانتی تھی کہ ان کے درمیان اب پہلے جیسی بات رہی نہیں ہے۔ ان کے تعلقات کا خاتمہ ہونے والا تھا' دونوں ہی ایک دوسرے سے بیزار ہوتے دکھائی دے رہے تھے۔ حالانکہ جینیفر نے جوائے کی محبت میں وہ تمام تقاضے پورے

کیے تھے جو مغربی نوجوانوں کی محبت کے لیے بے حد ضروری ہوتے ہیں۔ وہ اسے جہاں بلانا چاہتا' صرف ایک فون کردیتا اور وہ دوڑی دوڑی چلی جاتی۔ اس دوران اس نے جوائے کے کئی روپ دیکھے تھے' اور جوائے اسے ہر حالت میں دیکھ چکا تھا۔ وہ جوائے کی بانہوں میں انجوائے کررہی تھی' بہت اچھا وقت گزار رہی تھی' مگر دل یہ گواہی دیتا تھا کہ یہ محض تعلق ہے ایک جذباتی تعلق۔ اس تعلق کو وہ کسی بھی طرح محبت کا نام دینے پر آمادہ نہیں تھی۔ دل فریڈل کے لیے اس کے دل میں اب بھی محبت کی چنگاریاں موجود تھیں' جینیفر سے علیحدہ ہو کر اس نے بھی اداکاری میں طبع آزمائی کی تھی اور نہایت تیزی سے اپنا مقام بنارہا تھا۔ جلد ہی وہ "بوائے میٹس ورلڈ" نامی سیریز میں کام کرکے پورے امریکا میں مقبولیت حاصل کرچکا تھا اور ایک اسٹار کے طور پر ہر جگہ پہچانا جاتا تھا۔ اس وقت اس کی عمر بیس برس تھی اور جینیفر لو عمر میں اس سے تین برس چھوٹی تھی۔ اس نے میٹرک کے بعد نیویارک میں رہائش اختیار کرلی تھی' ایک اچھا فیجرل جاننے کے باعث وہ جلد ہی مشہور ہوگیا' اور بڑے بڑے کام کرنے لگا تھا۔

ٹروجن وار کی کہانی جینیفر لو اور ول فریڈل کی ذاتی لو اسٹوری میں خاصی مماثلت تھی۔ ایک جریدے نے تو یہ تک لکھ دیا تھا کہ "ٹروجن وار" دراصل جینیفر لو اور ول فریڈل کی حقیقی داستانِ محبت پر تیار کی گئی ہے۔

ٹروجن وار میں ول فریڈل نے بریڈ نامی ایک ایسے نوجوان طالب علم کا کردار کیا جو سینئر گریڈ میں پڑھتا تھا۔ ایک ہفتے بعد وہ گریجویشن کرنے والا تھا۔ یعنی اس کی تعلیم کے آخری دن چل رہے تھے' اسی اسکول میں پڑھنے والی خوب صورت ترین' سنہرے بالوں اور نیلی آنکھوں والی لڑکی بروک پر وہ مرمٹا تھا' لیکن اس قدر کم ہمت تھا کہ باوجود کوشش کے اس لڑکی کے سامنے اپنے دل کی بات کہنے میں ناکام ہوجاتا تھا۔ بروک نامی وہ خوب صورت لڑکی اسکول کی فٹ بال ٹیم کی دیوانی تھی' وہ چیئرلیڈر بن گئی۔ جب وہ دونوں اسکول میں بائیولوجی کا سال مکمل کرلیتے ہیں تو آخری دن لیبارٹری میں اسکول کا ایک استاد ایک جار میں قصداً ایک کنڈوم چھوڑ جاتا ہے۔ استاد جانتا ہے کہ کسی طالب علم کو اگر اس کی ضرورت ہو تو وہ اسے نکالے۔ بریڈ (ول فریڈل) کو کنڈوم جار میں ڈالنے کا موقع ملتا ہے' مگر اس نے اسے نکالنے کی کوشش بھی کی۔ اس کا خیال تھا کہ اسے اس کے استعمال کا موقع بھی ملے گا۔ بریڈ کو اس فلم میں ایسا بے وقوف اور چغد دکھایا گیا تھا کہ جو پیش قدمی کی کوشش نہیں کرتا تھا' حالانکہ مغربی معاشرے کے مطابق لڑکی کی طرف سے کسی قسم کے انکار کا امکان بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ وہ بے وقوف اپنا سارا وقت اپنے فضول دوستوں کے ساتھ گپ شپ کرکے گزار رہا تھا۔ اس کے دوستوں میں ٹام بوائے ٹائپ کی ایک لڑکی لیہ (جینیفر لو ہیوٹ) بھی شامل تھی۔ وہ لڑکوں کی طرح حلیہ بناکر رہتی تھی' اس کے دل میں بریڈ کے لیے محبت کے جذبات تھے (بالکل ان کی حقیقی زندگی کی طرح) مگر وہ یہ نہیں جانتی تھی کہ بروک کسی لڑکی میں کیسی خصوصیات دیکھنا پسند کرتا ہے۔

بریڈ اپنی دوست لیہ کی طرف جھکنے کے بجائے اپنے خوابوں کی شہزادی بروک کے سپنوں میں کھویا رہتا تھا' مگر اپنے جذبات اس تک پہنچانے کی ہمت اس میں نہیں تھی' پھر بروک نے اسے ایک دن فرمائش کی کہ وہ اس کے گھر پر آکر اسے بائیولوجی پڑھادیا کرے۔

بریڈ کو اپنے خواب سچ ہوتے دکھائی دیے۔ اب اسے اپنی شہزادی کے ساتھ پوری شام ایک کمرے میں تنہا گزارنے کا موقع مل رہا تھا۔ اس کے دوست اس پر رشک کرتے ہیں' مگر لیہ کو اس کی دیوانگی پر رحم آتا ہے' پھر ایک روز اس نے لیہ سے فرمائش کی کہ وہ بریڈ سے کچھ جذباتی باتیں کرنا چاہتا ہے۔ کیا تم ان مکالموں کی مشق میں میرے ساتھ تعاون کروگی؟"

یہ درخواست لیہ کے لیے ناقابلِ برداشت تھی۔ اس کا دل دکھی ہوگیا مگر اس نے بریڈ کی تیاری کروادی' جمعہ کی شام وہ بروک کو پڑھانے جارہا تھا۔ یہ شام اس کے لیے اچانک خوشگوار ہوگئی جب اس کے والد نے اسے اجازت دے دی کہ وہ جاتے وقت 1972 ماڈل کی جیگوار XKE لے جاسکتا ہے۔ وہ اس شان دار گاڑی میں بیٹھ کر بروک کے گھر پہنچ گیا۔ وہاں پہنچتے ہی اس کے خوابوں کا شیش محل چکنا چور ہوگیا' کیونکہ بروک اپنی خواب گاہ میں اپنے بوائے فرینڈ کائل کے ساتھ موجود تھی۔ بروک کے پہنچنے پر اس نے کائل کو روانہ کردیا اور بریڈ کو لے کر اپنی خواب گاہ میں پہنچ گئی۔ خواب گاہ میں داخل ہونے کے کچھ دیر بعد بریڈ پر انکشاف ہوا کہ وہ بائیولوجی پڑھنا نہیں چاہتی بلکہ بائیولوجی کے اسباق کا عملی تجربہ کرنے کی خواہش مند ہے مگر مشکل یہ تھی کہ بریڈ کے پاس کنڈوم نہیں تھا۔ اس نے باہر کی طرف دوڑتے ہوئے بروک سے وعدہ کیا کہ میں پانچ منٹ میں آتا ہوں۔"

وہ اس کے گھر سے باہر نکل گیا' مگر باہر جاتے ہی سب گڑبڑ ہوگئی۔ معاملات اس کے ہاتھ سے نکلتے چلے گئے۔ وہ پہلے گروسری اسٹور پہنچا' وہاں سے کچھ کینڈی' پھول' کھانے پینے کی دیگر چیزیں اور کنڈوم خرید کر پارکنگ کی طرف دوڑتے ہوئے آیا تو یہ دیکھ کر اس کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی کہ اس کے والد کی قیمتی ترین گاڑی اپنی جگہ سے غائب تھی' کوئی اس کی گاڑی چُرا کر لے گیا تھا۔ وہ کسی نہ کسی طرح شہر پہنچا۔ پولیس اسٹیشن میں جاکر گاڑی کی چوری کی رپورٹ درج کرائی۔ بروک نے اس کی ہتھیلی پر اپنا ٹیلی فون نمبر لکھ کر دیا تھا اور اس نے نمبر مٹ جانے کے خوف سے چار دن تک ہاتھ نہیں دھوئے تھے' پولیس اسٹیشن سے باہر آکر اس نے بروک کو فون کرنا چاہا تو پتا چلا کہ اس کی ہتھیلی پر سے ٹیلی فون نمبر مٹ چکا ہے۔ آخر مجبوراً اس نے اپنی دوست لیہ (جینیفر لو ہیوٹ) کو فون کیا کہ وہ اپنی گاڑی میں آکر اسے ایک اسٹاپ سے اُٹھالے اور بروک کے گھر چھوڑ دے۔ اب اس اسٹاپ تک پہنچنے کے لیے اسے بس میں سوار ہونا تھا۔ وہ ایک بس میں سوار ہوگیا' مگر بدقسمتیوں کا آغاز ہوگیا تھا۔ اس کے پاس رقم بالکل ختم ہوچکی تھی۔ بس کا ٹکٹ لینے کے لیے پیسے نہیں بچے تھے۔ (یہ وہی بس تھی جو مشہور عالم فلم "اسپیڈ" میں بھی استعمال ہوئی تھی) بس کا ڈرائیور ایک پاگل اور جنونی شخص تھا۔ ٹکٹ کے پیسے نہ ہونے پر اس نے بریڈ کو ویران سڑک پر اُتار دیا۔ بے چارے بریڈ نے پیدل ہی چلنا شروع کردیا۔ کچھ دیر بعد ایک بار نظر آیا۔ وہ فون کی تلاش میں اس بار میں داخل ہوا تو ایک اور مصیبت کھڑی تھی۔ کم عمری کے باعث اسے بار میں داخل ہونے کی اجازت نہیں دی جارہی تھی مگر اس نے چرب زبانی سے کام لے کر بار میں موجود لوگوں کو یہ کہہ کر احمق بنانے میں کامیابی حاصل کرلی کہ وہ مشہور ٹی وی سیریز "بے واچ" کا ہیرو ڈیوڈ ہیزل ہوف ہے۔ اس بار میں چٹنی کھانے کے ایک مقابلے میں اس نے سو ڈالر جیت لیے اور پھر باتھ روم کی کھڑکی سے فرار ہونے میں کامیاب ہوگیا۔ اب ایک بار پھر وہ سڑک پر پیدل چل رہا تھا۔ دور دور تک کوئی گاڑی نظر نہیں آرہی تھی۔ کچھ دیر بعد ایک گاڑی اپنی طرف آتی دکھائی دی تو وہ بُری طرح چونک گیا' وہ اسی کی گاڑی تھی جو گروسری اسٹور کے پارکنگ سے چوری ہوگئی تھی۔ کار کی حالت خستہ ہوگئی تھی اور اس میں تین بدمعاش سوار تھے۔ یہ وہی بدمعاش تھے جنہوں نے ایک ہفتہ قبل اس کے اسکول کی دیوار پر اپنے گروہ کا علامتی نشان بنایا تھا۔ انہیں جب بریڈ کے ذریعے یہ بات پتا چلی کہ اُن کا نشان بریڈ نے ہی اسکول کی دیوار سے مٹایا تھا تو انہوں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ' بریڈ کو گھسیٹتے ہوئے اس کے اسکول تک لے کر گئے اور اسے اپنا نشان پینٹ کرنے کا حکم دیا۔ جب مجبوراً بریڈ نے یہ کام کردیا تو انہوں نے بے چارے بریڈ کو تو وہیں چھوڑ دیا اور ایک بار پھر اس کے والد کی گاڑی میں بیٹھ کر فرار ہوگئے۔ اس کے پاس موجود سارا سامان بھی ضائع ہوگیا تھا مگر اسے صرف کنڈوم کی ضرورت تھی اور اسے یاد تھا کہ وہ اسکول میں ہی بائیولوجی کی کلاس کے ایک جار میں رکھا ہوا ہے' وہ اسکول میں داخل ہوا اور کنڈوم حاصل کرلیا مگر بدقسمتی سے اس کی مڈبھیڑ اسکول کے تندخو اور اکھڑ مزاج چوکیدار سے ہوگئی۔ اس نے اس کی ٹھیک ٹھاک مرمت کر ڈالی اور اسکول کی سیڑھیوں سے نیچے لڑھکا دیا۔ وہ وہاں سے بمشکل فرار ہوا تو وہ شخص اس کے پیچھے لگ گیا جسے اس نے چٹنی کھانے کے مقابلے میں شکست دی تھی۔ اتفاقاً اسے رستے میں اپنی دوست لیہ (جینیفر لو ہیوٹ) مل گئی۔ وہ جذبات میں اندھی ہورہی تھی اور بریڈ کو اپنا دل کھول کر دکھا دینا چاہتی تھی' مگر اظہارِ محبت میں ناکام ہوگئی اور اسے اپنی کار میں بٹھا کر بروک کے گھر کے پاس اُتار دیا۔

مگر ابھی بریڈ کی مشکلات ختم نہیں ہوئی تھیں۔ وہ بُری طرح بھیگ چکا تھا' اس نے بروک کے گھر کی اطلاعی گھنٹی بجائی مگر کوئی جواب نہ ملا۔ اس نے کھڑکی کے ذریعے گھر میں گھسنے کی کوشش کی تو کنڈوم کہیں کھو گیا۔ گھر میں داخل ہونے کے بعد اسے بروک کے ہاتھ سے لکھا ہوا ایک پرچہ ملا کہ میں بہت دیر تک انتظار کرنے کے بعد ایک پارٹی میں شرکت کرنے جارہی ہوں۔ بریڈ پر مایوسی طاری ہوگئی' عین اسی وقت پولیس نے اس گھر کو گھیرے میں لے لیا مگر بریڈ کسی نہ کسی طرح اس گھر سے فرار ہونے میں کامیاب ہوگیا۔ تاہم پولیس اس کے تعاقب میں تھی۔ اس نے پولیس کو جل دے دیا' مگر ایک کتا اس کے پیچھے لگ گیا۔ وہ ایک کنٹری کلب میں گھس گیا' وہاں اس کے والدین رقص کرنے میں مصروف تھے' کتا بدستور اس کے پیچھے تھا اس نے ایک گولف کارٹ چرائی اور وہاں سے نکل کر سڑک پر ایک راہ گیر سے کپڑے تبدیل کرلیے' اب اسے ایک کنڈوم کی تلاش تھی۔ اپنی جیب میں بچی کچھی رقم سے اس نے کنڈوم کا ایک پیکٹ خریدا مگر انہیں استعمال کرنے کی نوبت نہیں آسکی۔ وہ ابھی اسٹور میں ہی تھا کہ وہی بدمعاش جنہوں نے اس کی کار چرائی تھی' اس اسٹور میں گھس آئے اور انہوں نے اسٹور لوٹ لیا۔ اسی اثنا میں اسٹور کے باہر پولیس پہنچ گئی' بدمعاشوں نے بریڈ کو یرغمال بنالیا اور اس کے والد کی گاڑی میں ہی فرار ہوگئے' پولیس ان کے تعاقب میں تھی۔ آخرکار وہ گرفتار ہوگئے ان کے ساتھ بریڈ بھی پولیس اسٹیشن پہنچ گیا۔ اس کے حالات جان کر اور ساری کہانی سن کر ایک پولیس اہلکار کو اس پر ترس آگیا۔ اس نے بریڈ کو ایک کنڈوم دے دیا۔ بریڈ نے خوشی خوشی اپنی دوست لیہ (جینیفر لو ہیوٹ) کو فون کیا مگر اب لیہ ایک نئے انداز سے اس کے سامنے آئی۔ وہ مردانہ کپڑوں اور لڑکوں جیسے انداز سے نجات حاصل کرچکی تھی۔ اس نے نہایت جاذبِ نظر لباس پہن رکھا تھا' اس کا پُرکشش بدن اور نسوانی خدوخال نمایاں تھے۔ وہ اس وقت اسی تقریب میں شریک تھی جہاں بریڈ کی محبوبہ بروک بھی آئی ہوئی تھی۔ لیہ نے بریڈ کو پارٹی میں چھوڑا اور واپس جانے لگی تو اس کی گاڑی پارکنگ میں پھنس گئی۔ وہ وہیں رکنے پر مجبور ہوگئی۔

دوسری طرف بریڈ اپنی محبوبہ بروک کے پاس پہنچ گیا' وہ اسے لے کر عمارت کے اوپری کمروں کی طرف بڑھی اب اسے اپنے خوابوں کی تعبیر ملنے والی تھی۔ مگر عین وقت پر بریڈ کا دماغ تبدیل ہوگیا۔ اسے احساس ہوگیا کہ جنس بغیر محبت کے بیکار ہے۔ وہ کسی ایسی لڑکی کے ساتھ بستر پر نہیں جاسکتا جس سے اسے حقیقی محبت نہیں ہے۔ وہ بروک کو کمرے میں ہی چھوڑ کر باہر آگیا۔ اب اسے ایک ایسی لڑکی کی تلاش تھی جو اس کے لیے بے حد اہم ہو۔ اور بلاشبہ وہ لڑکی لیہ کے علاوہ کوئی اور نہیں ہوسکتی تھی۔ وہ پارکنگ میں لیہ کے پاس پہنچا' پہلے تو وہ یقین نہیں کرپائی' مگر بریڈ (ول فرینڈل) کے طویل اور پُرجوش بوسے نے اسے یقین کرنے پر مجبور کردیا پھر سب ٹھیک ہوتا چلا گیا۔

O*O

یہ جینیفر لو کی زندگی کا وہ بوسہ تھا جس نے اسے یقین دلا دیا کہ ول فرینڈل کو اس نے اپنے خوابوں کا شہزادہ بنا کر غلطی نہیں کی ہے۔ جب اس بوسے کا منظر عکس بند کیا جارہا تھا تو جینیفر کی ٹانگیں بُری طرح کانپ رہی تھیں۔ اس کے ساتھ ایسا پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔ اس سے پہلے بھی وہ بوسوں کی سوغات تقسیم کرچکی تھی' مگر اس بوسے نے اس کے نظریات اور خیالات تک کو تبدیل کردیا۔ جس محبوب سے ملنے کے لیے وہ تڑپتی رہی تھی۔ وہ اسے بانہوں میں سمیٹ کر اس کے لبوں کا سارا شہد حاصل کرچکا تھا۔

اس روز جینیفر کی حالت عجیب ہوگئی تھی' شوٹنگ ختم ہوئی تو ول فرینڈل کے سامنے جاکھڑی ہوئی۔ اس نے چونک کر جینیفر لو کی طرف دیکھا' اس سے پہلے کہ وہ کچھ بولتا' لو اپنے دل کی بات زبان پر لے آئی اور بولی "ول! کیا تم مجھے اپنے ساتھ ذرا باہر لے جاؤ گے' میں کب سے اس وقت کا انتظار کررہی تھی' اب مجھ سے برداشت نہیں ہوتا۔"

ول فرینڈل نے کندھے اُچکائے اور فوراً آمادہ ہوگیا۔ آگ دوسری طرف بھی دہک چکی تھی۔ دونوں ایک ہوٹل کے پُرسکون گوشے میں جاکر بیٹھ گئے' کافی پینے تک ساتھ جینے مرنے کے تمام عہد و پیماں بھی ہوگئے اور محبت کی گاڑی پٹری پر آگئی۔

محض ایک بوسے کی وجہ سے یہ فلم جینیفر لو کے لیے بہت اہم ہوگئی تھی۔ اس فلم میں بھی اور فلم سے باہر بھی اسے اپنے خوابوں کا شہزادہ مل گیا تھا اور وہ اپنے محبوب کو یہ سمجھانے میں کامیاب ہوگئی تھی اس کے لیے دل سے بہتر کوئی اور ہو ہی نہیں سکتا تھا۔

ٹروجن وار ایک عمدہ اور خاصی دلچسپ فلم تھی۔ اس فلم میں یہ پیغام دیا گیا تھا کہ جنس سے زیادہ محبت کی اہمیت ہوتی ہے۔ شائقین کو بھی لو اور دل کے درمیان پروان چڑھنے والی محبت اور ان کی ناآسودہ داستانِ محبت کا علم رسائل و جرائد سے ہوتا رہا تھا۔ لہٰذا اسکرین پر ان دونوں کے درمیان پَل پَل بدلنے والی کیمسٹری کا نظارہ ان کے لیے دلچسپی کا باعث ثابت ہوا۔ اگرچہ یہ دل کی فلم تھی' مگر جینیفر نے ہر وہ منظر چُرا لیا جس میں وہ اسکرین پر نمودار ہوئی۔ اس نے ہر منظر میں اپنی موجودگی کا بھرپور احساس دلایا اور دل کے بعد فلم کی سب سے بہترین اداکارہ اسے ہی قرار دیا گیا۔

اس فلم کے لیے اس نے پوری گرمیوں میں شوٹنگ کرائی تھی' مگر اب بھی بے حد مصروف تھی۔ پارٹی آف فائیو میں اب سارہ کا کردار بے پناہ مقبولیت حاصل کرتا جارہا تھا۔ ٹی وی میگزین کے ہر شمارے میں اب جینیفر لو ہیوٹ کی تازہ ترین تصویریں' انٹرویوز اور چٹ پٹی خبریں شائع ہونے لگی تھیں۔ وہ ایسی لڑکی بن گئی تھی جو امریکی معاشرے کی نوجوان لڑکیوں کے لیے رول ماڈل ہوتی ہے۔

جینیفر کے کردار اور اس کی شخصیت کی مقبولیت سے فائدہ اُٹھانے کے لیے سیئرز (SEARS) اور سیونٹین میگزین نے اس سے درخواست کی کہ وہ ان دونوں جرائد کی نمائندگی کرے اور ملک کے چھ مختلف شہروں میں واقع شاپنگ سینٹروں کا دورہ کرے' لوگوں سے گفتگو کرے۔ لوگوں کے سوالوں کے جواب دے۔

جینیفر نے فوراً ہامی بھرلی۔ وہ اپنی مقبولیت سے جی بھر کر

انجوائے کرنا چاہتی تھی‘ اس کی رضامندی حاصل ہوتے ہی فوراً سارا پروگرام ترتیب دیا جانے لگا۔ اس دورے کے دوران طے کیا گیا تھا کہ وہ ان شاپنگ سینٹروں پر نہ صرف لوگوں سے باتیں کرے گی بلکہ اسے اور بھی بہت سے کام کرنا ہوں گے۔ مثلاً وہ اپنے نئے البم میں سے چند گانے بھی گائے گی۔ لوگوں کو نصیحتیں کرے گی‘ انہیں فوری ٹوٹکے بتائے گی اور چند آٹوگراف بھی دے گی۔

یہ چند آٹوگراف والا معاملہ بہت طول پکڑ گیا۔ اس سے آٹوگراف لینے والوں کی لائن لگ گئی۔ دستخط کرتے کرتے اس کے ہاتھوں میں درد ہونے لگا مگر وہ خوشی خوشی یہ سارے کام کررہی تھی وہ بچپن سے ایسی ہی زندگی کی تمنا کرتی آئی تھی۔ اسی دوران دونوں رسائل نے ”سالانہ پیک پرفارمنس“ مقابلوں کا بھی اعلان کردیا۔ ان مقابلوں کی ترجمان بھی جینیفر لوہیوٹ کو ہی منتخب کیا گیا۔ اس مقابلے میں جیتنے والوں کو تعلیمی اسکالرشپ دینے کا فیصلہ کیا گیا تھا۔ مقابلے میں صرف تیرہ برس سے اکیس برس کی لڑکیاں حصہ لے سکتی تھیں۔

اس مقابلے کی ترجمان کے لیے اس سے درخواست کی گئی تو وہ بھونچکی رہ گئی۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ اسے اس قدر اہمیت دی جائے گی‘ چند لمحوں تک تو اس کے منہ سے کوئی لفظ نہ نکلا‘ درخواست لانے والی خاتون نے کہا ”اگر آپ کو مقابلے کی ترجمان بننا قبول نہیں تو ہم کچھ اور سوچیں گے۔ بہرطور ہم آپ کو اپنے اس پورے سیشن میں شامل رکھنا چاہتے ہیں۔“

جینیفر لو نے مسرت بھرے لہجے میں کہا ”نن۔۔۔ نہیں‘ میرا یہ مطلب نہیں۔ میں تو اس قدر عزت ملنے پر گنگ ہوکر رہ گئی ہوں‘ اوہ خدا۔۔۔ یہ تو میرے لیے بڑے اعزاز کی بات ہے۔“

”لیکن مادام! اس پروگرام کا شیڈول بہت سخت ہے‘ آپ اچھی طرح غور کرلیں‘ آپ کو اس سے بہت فائدہ ہوگا۔ آپ کا پروگرام پارٹی آف فائیو پورے ملک میں۔۔۔ بلکہ کئی ملکوں میں دیکھا جاتا ہے‘ آپ کو لاس اینجلس سے باہر نکل کر لڑکیوں سے ملنے کا موقع ملے گا۔ آپ کو یہ جاننے کا موقع ملے گا کہ لوگ آپ کے بارے میں کیا رائے رکھتے ہیں۔“

جینیفر نے فوری طور پر معاہدے پر دستخط کردیے۔ وہ اس قدر عمدہ موقع گنوانا نہیں چاہتی تھی اور پھر شاپنگ سینٹروں میں جاکر پرفارمنس دینا فنکاروں کے لیے کوئی نئی بات نہیں تھی۔

اسی کی دہائی میں مشہور گلوکارہ ٹیفنی نے اپنا کیریئر شاپنگ سینٹروں میں گیت گاکر ہی شروع کیا تھا۔ شاپنگ سینٹروں میں گا گا کر وہ جلد ہی بہت بڑی اسٹار بن گئی تھی۔ اس کے علاوہ ”بیک اسٹریٹ بوائز“ نے بھی اپنے ابتدائی دنوں میں شاپنگ مال‘ ہائی اسکول اور جہاں جہاں انہیں مدعو کیا جاتا‘ وہاں جاکر اپنے فن کا مظاہرہ کیا تھا۔ ہاں البتہ فرق یہ تھا کہ اس سے قبل کسی مقبول اسٹار نے ایسا نہیں کیا تھا۔ جینیفر لوہیوٹ بہت مقبول اسٹار بن چکی تھی۔ لہٰذا وہ پہلی مقبول اسٹار تھی جو شاپنگ سینٹر میں اپنے فن کا مظاہرہ کرنے جارہی تھی۔

اس سے قبل وہ تقریباً ساری دنیا گھوم چکی تھی‘ مگر یہ پہلا موقع تھا کہ وہ اپنے وطن کا دورہ کرنے والی تھی۔ پہلے پروگرام کی تاریخ 3 نومبر مقرر ہوئی اور طے پایا کہ وہ پہلی پرفارمنس لاس اینجلس کے سن سیٹ بینے وارڈ میں ہاؤس اور بلیو میں دے گی۔ وہ آرام کے وقفے کے بغیر ہی اس ٹور کی تیاریوں میں مصروف ہوگئی۔ یہ اس کی زندگی کا یادگار موقع تھا۔ یہ دیکھ کر اسے خوش گوار حیرت ہوئی کہ پارٹی آف فائیو کے توسط سے اس کے پرستار پورے امریکا میں پھیلے ہوئے ہیں۔ اس کے چاہنے والوں کی تعداد بے تحاشا تھی۔ لوگوں کے جتھے کے جتھے اس سے آکر مل رہے تھے۔ ہر جگہ اس کا استقبال انتہائی گرم جوشی سے کیا گیا اور وہ اپنی خوش قسمتی پر ناز کرتی رہی۔

O*O

پارٹی آف فائیو کی مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ اس کو تیسرے سیزن میں بھی مسلسل جاری رکھا گیا۔ جینیفر اس کے تیسرے سیزن میں بھی شامل تھی۔ تیسرے سیزن کی اقساط میں جینیفر لوہیوٹ کا کردار خاصی اہمیت اختیار کرگیا۔ تیسرے سیزن کی پہلی قسط ٹی وی پر اگست 1996ء میں آن ایر گئی۔ (ان دنوں نئے سیزن کی ابتدا روایتی طور پر ستمبر یا اکتوبر میں ہوا کرتی تھی) اس تبدیلی کی وجہ یہ تھی کہ اس دوران دیگر چینلز پر پرانے پروگرام چل رہے ہوتے اور یوں تیسرے سیزن کے دوران ناظرین کی تعداد میں مزید اضافہ ہوسکتا تھا۔ اب پارٹی آف فائیو ٹیلی ویژن دیکھنے والے لاکھوں اور کروڑوں ناظرین میں اپنی جگہ بناچکا تھا‘ اس کے ناظرین میں اٹھارہ سے چونتیس سال کی عمر کے لوگ بھی شامل ہوگئے تھے۔ اس موقع پر فوکس ٹی وی والوں نے سوچا کہ اس پروگرام کی بنیادیں وسیع کرنے کی ضرورت ہے‘ چنانچہ

1997ء میں ڈاکٹر پیپر اور ایکسپریس کلا تھنگ اسٹورز کے ساتھ پندرہ ملین ڈالر کی تشہیری مہم کا معاہدہ کیا گیا۔ یہ اس نیٹ ورک کا اب تک کا سب سے بڑا معاہدہ تھا۔ جو اس پروگرام کے ذریعے طے پایا تھا جسے ابتدا میں بے دلی سے شروع کیا گیا تھا‘ مگر سارہ (جینیفر لوہیوٹ) کے کردار کی مقبولیت نے مرتے ہوئے پروگرام کو راتوں رات شہرت کی بلندیوں پر پہنچا دیا تھا۔ اس تشہیری مہم کے تحت رسالوں‘ اخبارات‘ ٹیلی ویژن ہر جگہ اشتہارات چلائے گئے‘ پارٹی آف فائیو کے نام سے انعامی پروگرام بھی منعقد کیے گئے۔ اس پروگرام کے نام پارٹی آف فائیو کی مقبولیت سے فائدہ اُٹھا کر انڈیا کے سونی چینل نے بھی ”ہم پانچ“ نامی مقبول ترین پروگرام پیش کیا تھا۔

تشہیری مہم کا نتیجہ خاطر خواہ نکلا۔ اگلے ایک برس کے دوران پہلے سے کہیں زیادہ لوگوں نے اس پروگرام کو دیکھا۔ لوگ اس کے کرداروں اور خاص طور پر سارہ (جینیفر لوہیوٹ) کے دیوانے ہوتے چلے گئے۔ ہر ہفتے بے چینی سے ”پارٹی آف فائیو“ کا انتظار کیا جانے لگا اور سیزن کے اختتام تک نیلسن درجہ بندی میں پارٹی آف کا نمبر تراسی واں ہوگیا۔ یہ بہت بڑی کامیابی تھی جس نے فوکس ٹی وی والوں کو مزید پُرجوش کردیا اور انہوں نے فنکاروں کے معاوضے میں دگنا اضافہ کردیا۔ یہ پروگرام فوکس ٹی وی کی جانب سے مقبول ترین پروگرام ثابت ہورہا تھا‘ یہ معمولی کامیابی نہیں تھی‘ خاص طور پر ایسے پروگرام کے لیے جسے چند برس قبل قطعی طور پر منسوخ کردینے کا فیصلہ کرلیا گیا تھا۔

پارٹی آف فائیو کی مقبولیت میں اداکاروں کی پرفارمنس‘ بہترین اسکرپٹ‘ نہایت مضبوط اور حقیقت سے قریب کہانی کا بڑا دخل تھا۔ چند اداکاروں کے باعث بھی پروگرام کو ملنے والی تشہیر میں خاطر خواہ اضافہ ہوا‘ مثلاً نیوی کیمپبل۔ اس کی وجہ سے بھی پارٹی آف فائیو کو بہت مقبولیت ملی۔ اس نے دوسرے اور تیسرے سیزن کے دوران ”اسکریم“ (SCREEM) نامی معرکتہ الآرا خوفناک فلم میں کام کیا تھا۔ یہ فلم قلم کار کیون ولیم کے زورِ قلم کا نتیجہ تھی‘ جس نے بعد میں ٹیلی ویژن کے لیے ایک مقبول ترین سیریز ”ڈاسن کریک“ کے علاوہ سنیما کی تاریخ کی مقبول ترین خوفناک فلم ”آئی نو واٹ یوڈوُ لاسٹ سمر (I KNOW WHAT YOU DID LAST SUMMER) بھی لکھی تھیں۔

اسکریم نامی خوفناک فلم چھوٹے بجٹ سے تیار کی گئی تھی اور کسی کو بھی اس کی کامیابی کی امید نہیں تھی‘ مگر ریلیز کے بعد یہ فلم نوجوانوں میں بہت مقبول ہوئی اور باکس آفس ہٹ قرار پائی۔ اس کے ساتھ ساتھ سال میں سب سے زیادہ بزنس کرنے کا بھی اعزاز حاصل کرلیا۔ اس فلم میں کام کرنے سے نیوی کیمپبل مکمل طور پر اسٹار بن گئی۔ اس کے بعد اس نے ”سنٹرڈے نائٹ لائیو“ نامی ٹی وی پروگرام کی میزبانی بھی کی اور یوں اس کا فلمی کیریئر کامیابی سے شروع ہوگیا۔ جب لوگوں کو پتا چلا کہ یہ مقبول اسٹار نیوی کیمپبل بھی ”پارٹی آف فائیو“ میں کام کررہی ہے تو یہ پروگرام ایک دم ان لوگوں کی دلچسپی کا بھی مرکز بن گیا۔ جنہوں نے ”پارٹی آف فائیو“ کو کبھی نہیں دیکھا تھا۔

اس دوران جینیفر لوہیوٹ نے بھی ٹیلی ویژن پر اپنے پَر پھیلانا شروع کردیے تھے۔ پارٹی آف فائیو میں سارہ کے کردار کی مقبولیت کو دیکھتے ہوئے ایم ٹی وی والوں نے اسے پیشکش کی کہ وہ ”ٹرو ٹیلز آف ٹین ٹراما“ کی میزبانی قبول کرلے۔ ایم ٹی وی والے جانتے تھے کہ جینیفر خود بھی جوان ہے‘ پُرکشش اور سیکسی ہے‘ لہٰذا نوجوانوں کی توجہ اپنی جانب تیزی سے مبذول کراسکتی ہے۔ جینیفر نے یہ پروگرام نہایت کامیابی سے پیش کیا۔ اس کے بعد اسے فوکس ٹیلی ویژن کے ان چند بڑے فنکاروں میں بھی شامل کرلیا گیا جو ”ہالووِن اسپیشل“ کے پروگراموں کی میزبانی کرتے ہیں‘ مگر اس پروگرام سے اس کی ایک تلخ یاد وابستہ ہے جسے بھلانا جینیفر کے لیے ممکن نہیں۔

وہ فلوریڈا میں فوکس کے ہالووِن اسپیشل پروگرام میں اپنی پرفارمنس پیش کررہی تھی۔ اچانک اسے احساس ہوا کہ اس نے جو پتلون پہن رکھی ہے۔ اس کے پچھلے حصے میں دانستہ طور پر ایسے سوراخ چھوڑے گئے ہیں‘ جن سے اس کا بدن چھلک رہا تھا۔ وہ اس واقعے سے بے خبر رہی تھی۔ لوگ یہ بات دیکھ رہے تھے اور ہنس رہے تھے۔ کسی نے اس کی نشان دہی نہیں کی اور جب جینیفر لو کو خود اچانک پتلون کی اس خامی کا احساس ہوا تو وہ بُری طرح کھول کر رہ گئی۔ اسے اپنی بے عزتی کا شدت سے احساس ہورہا تھا مگر وہ کچھ کر نہیں سکتی تھی۔ ہالووِن پر اس قسم کے مذاق عام طور پر کیے جاتے ہیں۔

نئے سیزن میں پارٹی آف فائیو کی کہانی نقطۂ عروج پر پہنچ گئی۔ سارہ (جینیفر لوہیوٹ) جس لڑکے (بیلی) سے محبت کرتی ہے وہ کسی اور کے بستر میں پناہ ڈھونڈلیتا ہے اور پھر احساسِ جرم کے زیرِ اثر آکر شراب نوشی کرنے لگتا ہے۔ پروگرام کی ہر قسط کے ساتھ سارہ اور دیگر کرداروں پر جرائد

میں اس طرح بحث چھڑ جاتی تھی' جیسے وہ ڈرامے کے کردار نہ ہوں' حقیقی زندگی کے کردار ہوں اور یہی بات اس پروگرام کی بے پناہ مقبولیت کا بین ثبوت ہے۔ اس سیزن کے دوران بیلی اور سارہ کے تعلقات کو جس انداز سے ٹریٹمنٹ دیا گیا تھا' جینیفر اس سے بہت خوش تھی۔ اس کا خیال تھا کہ بیلی اور سارہ کے درمیان دکھائے گئے تعلقات حقیقت سے قریب تر ہیں۔

ڈرامے کی مسلسل کہانی نے جینیفر لو کو بھی زندگی اور محبت کے بارے میں بہت کچھ سوچنے کا مواد فراہم کردیا تھا۔ پارٹی آف فائیو کے سیزن کا اختتام کئی اعتبار سے جینیفر لو کے لیے اہم ثابت ہوا۔ فروری 1997ء میں وہ اٹھارہ برس کی ہوگئی تھی اور سرکاری طور پر بالغ قرار دی جاچکی تھی۔ اٹھارہ برس کی عمر تک پہنچنے سے پہلے تک وہ قانونی پابندیوں کا شکار تھی اور قانون کے مطابق دن بھر میں ساڑھے دس گھنٹوں سے زیادہ کام نہیں کرسکتی تھی۔ جب شام کو اسے بتایا جاتا کہ اس کے ساڑھے دس گھنٹے پورے ہوگئے ہیں تو وہ یک لخت مایوسی کا شکار ہوجاتی تھی کیونکہ ابھی اس کو تھکن بھی نہیں ہوتی تھی اور گھر جانے کو دل بھی نہیں چاہ رہا ہوتا تھا لیکن قانون کی پاسداری ضروری تھی اسے وقت مقررہ کے بعد سیٹ پر رکنے کی اجازت نہیں دی جاتی تھی۔ اٹھارہ سال کی ہوجانے کے بعد اب وہ بھی چودہ یا سولہ گھنٹے سیٹ پر گزارنے کے لیے آزاد تھی۔ اب کسی بھی قسم کی کوئی پابندی نہیں رہی تھی۔

اسی دوران اس نے ہائی اسکول سے گریجویٹ بھی کرلیا۔ اگرچہ وہ کیلی فورنیا میں اپنی فلموں اور ڈراموں کے سیٹس پر پڑھتی تھی' مگر اس کا ہوم ورک ایک اسکول میں جانچا جاتا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ ہائی اسکول کی اس جماعت کی غیر حاضر طالبہ تھی۔ جس نے اس سال گریجویشن کرلیا تھا مگر وہ اپنے اسکول کے کسی بھی طالب علم سے واقف نہیں تھی۔ جب گریجویشن کی اسناد تقسیم کرنے کی تقریب کا انعقاد ہوا تو پیپل (PEOPEL) میگزین نے اس تقریب کی خاص طور پر کوریج کی۔ یہ اس ہائی اسکول کے لیے بھی اعزاز کی بات تھی۔ پیپل میگزین نے اس سے قبل کسی ہائی اسکول کی تقریب کو ایسی اہمیت نہیں دی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ اس قدر شہرت یافتہ ہوچکی تھی کہ پیپل میگزین نے اس تقریب کو بھی اہمیت دی' جس میں وہ اپنی ڈگری لینے کے لیے شریک تھی۔

جینیفر لو کے گریجویشن نے اسے اپنے پسندیدہ اسٹار جانی ڈیپ سے متعارف ہونے کا موقع فراہم کیا۔ وہ اسٹار اداکار جانی ڈیپ کی دیوانی تھی۔ جب اس نے جانی ڈیپ کی فلم "ڈون جو آن ڈی مارکو" دیکھی تھی تو اسے جانی کی اداکاری اس قدر پسند آئی کہ یہ فلم اس کی پسندیدہ ترین فلم بن گئی۔ حتیٰ کہ اس نے اپنی ایک بلی کا نام بھی ڈون جو آن رکھ دیا۔ اس نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ اس کے پسندیدہ اداکار سے اس کا تعارف ہوجائے گا مگر جو ہونا ہوتا ہے وہ ہو کر رہتا ہے۔ یہ اتفاق بھی ہونا تھا' لہٰذا ہوگیا۔

لو نے ایک ڈرائیور ملازم رکھا ہوا تھا جو اسے گھر سے پارٹی آف فائیو کے سیٹ پر لے جاتا تھا اور پھر وہاں سے واپس گھر لاتا تھا۔ ایک روز جب ڈرائیور نے اسے بتایا کہ وہ جانی ڈیپ کو لینے ائرپورٹ جارہا ہے تو جینیفر بُری طرح چونک گئی اور پُرجوش لہجے میں بولی "کیا واقعی تم جانی کو لینے جارہے ہو۔"

"جی ہاں!" ڈرائیور نے اثبات میں سرہلایا۔

"ٹھیک ہے' تم جانی کو میری طرف سے ہیلو کہہ دینا۔"

ڈرائیور نے جینیفر کا ہیلو' جانی تک پہنچا دیا اور یہ بھی بتا دیا کہ وہ اب گریجویشن کرچکی ہے اور آج ڈگری حاصل کرنے کے لیے تقریب میں شرکت کے لیے جانے والی ہے۔

جینیفر گھر آئی تو ٹیلی فون ریکارڈ کرنے والی مشین پر کسی لڑکی کا پیغام ریکارڈ تھا۔ جینیفر نے مشین آن کی تو آواز ابھری "میرا بھائی تمہیں پھول بھیجنا چاہتا ہے۔ فون کرکے اپنا پتا نوٹ کرادو۔"

جینیفر چونک گئی' یہ پھول بھیجنے والا کون ہوسکتا ہے؟ اس نے مشین میں ریکارڈ شدہ نمبر پر فون کیا' دوسری طرف وہی لڑکی تھی۔ جینیفر لو نے پوچھا "تمہارا بھائی کون ہے اور مجھے پھول کیوں بھیجنا چاہتا ہے؟"

دوسری طرف سے جواب آیا "جانی ڈیپ! وہ تمہاری گریجویشن پر پھول بھیجنا چاہتا ہے۔"

جینیفر یہ جواب سن کر ششدر رہ گئی۔ اس نے کبھی خواب میں بھی نہیں سوچا تھا کہ اس کا پسندیدہ اداکار اسے پھول بھی بھیج سکتا ہے۔ اس نے جلدی جلدی اپنا پتا نوٹ کرادیا۔

اسی روز وعدے کے مطابق جانی ڈیپ نے اس کو گریجویشن کی مبارک باد دیتے ہوئے اسے پھولوں کی ٹوکری بھجوادی۔ جانی ڈیپ کی دیوانی' پھولوں کے ساتھ منسلک کارڈ دیکھ کر بے ہوش ہوتے ہوتے بچی' کارڈ پر لکھا تھا۔

"میں تمہاری جدوجہد سے واقف ہوں۔ تم نے

زندگی میں جو کچھ حاصل کیا ہے۔ وہ بہت مشکل کام ہے۔ تمہاری کامیابیوں پر میری طرف سے مبارک باد! مجھے تم پر ناز ہے۔ میرا پیار۔ جانی۔"

یہی واقعہ بعد میں جانی ڈیپ سے اس کی ملاقات کا سبب بن گیا۔ پارٹی آف فائیو کا ایک لائٹ مین جانی کا واقف کار تھا۔ اسے معلوم ہوگیا کہ لو جانی کی دیوانی ہے۔ اس نے جانی سے لو کی ملاقات کا بندوبست کردیا۔ یہ لو کے لیے ایک بہت سرپرائز تھا۔ وہ اس شخص سے اچانک مل رہی تھی جس کی بے حد دیوانی تھی' اور جس نے اسے پھولوں کا تحفہ بھی بھیجا تھا۔

یہ ان دنوں کی بات ہے جب جینیفر لو عام سے کپڑوں میں سیٹ پر آتی تھی۔ اس کے چہرے پر میک اپ بھی نہیں ہوتا تھا۔ زیادہ تر لوگوں کا یہی خیال تھا کہ اسے میک اپ کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ وہ بغیر میک اپ کے خود کو آئینے میں دیکھتی تھی تو صاف کہہ دیتی تھی کہ وہ بہت خوفناک دکھائی دے رہی ہے۔ اس وقت میک اپ کرنے والی لڑکی جاچکی تھی' اور جینیفر ٹرالر میں اکیلی تھی۔ لائٹ مین نے اندر داخل ہوکر کہا "لو تم جانتی ہو جس شخص کی تم دیوانی ہو' اور جس نے تمہیں پھول بھیجے تھے وہ اس وقت کہاں ہے؟"

جینیفر لو اُچھل پڑی "جانی ڈیپ! کک۔ کہاں ہے؟"

"وہ اس وقت ٹرالر کے باہر کھڑا ہے۔ تم سے ملنے آیا ہے اور تمہارا انتظار کررہا ہے۔"

جینیفر کی سانس سینے میں اٹکنے لگی۔ اسے لائٹ مین کی بات پر یقین نہیں آیا۔ وہ ہڑبڑا کر اُٹھی اور ٹرالر میں سے جھانک کر دیکھا۔ واقعی جانی ڈیپ باہر کھڑا تھا۔ جینیفر لو اضطرابی انداز میں چیخنے لگی "اوہ خدا! اس حالت میں۔ نہیں۔ نہیں' میں اس سے نہیں مل سکتی۔ میں اس سے نہیں مل سکتی۔" یہ کہہ کر وہ چیختی چلاتی ہوئی ٹرالر میں سے نکلی اور دوڑتے ہوئے جانی ڈیپ کے قریب سے گزر کر اس ٹرالر میں گھس گئی جہاں میک اپ کرنے والی لڑکی موجود تھی۔

یہ جینیفر اور جانی ڈیپ کی پہلی ملاقات تھی۔ دوسرے ٹرالر میں پناہ لینے کے بعد وہ کافی دیر تک خود کو پُرسکون رکھنے کی کوشش کرتی رہی۔ اس اثنا میں جانی ڈیپ چلا گیا۔ تب وہ خود کو بدقسمت محسوس کرنے لگی۔ اس نے اپنے محبوب اسٹار سے ملنے کا اتنا اچھا موقع گنوا دیا تھا۔ جس شخص سے ملنے کی تمنا بچپن سے اس کے دل میں رہی تھی' وہ شخص اس سے۔ خاص طور سے اسی سے ملنے آیا تھا اور اس نے بچوں جیسی حرکت کرکے اسے ناراض کردیا تھا۔ ممکن تھا کہ یہ جانی ڈیپ سے اس کی آخری ملاقات ہوتی' مگر قدرت نے اسے تجدید ملاقات کا ایک اور موقع دیا۔

جانی ڈیپ کی نئی فلم "ڈانی براسکو" کا پریس شو تھا۔ اس کے ٹکٹ جینیفر کو بھی بھیجے گئے وہ تھیٹر گئی مگر فلم دیکھنے نہیں بلکہ صرف اور صرف جانی ڈیپ کو قریب سے دیکھنے اور اس سے ملنے کی کوشش کرنے کے لیے گئی تھی۔ وہ اس کو دیکھنے کے اشتیاق میں دیر تک تھیٹر کے باہر کھڑی رہی اور کافی دیر تک اس کا انتظار کیا۔ اس دوران میں تھیٹر بھر گیا' اس کی مخصوص نشست بھی خالی رہنے کی وجہ سے کسی کو دے دی گئی مگر جینیفر لو کو ان چیزوں کی پروا نہیں تھی۔ وہ تو اپنے محبوب اسٹار کو دیکھنے کے لیے دیوانی ہورہی تھی اور پھر جب جانی ڈیپ آیا تو لو نے چلا کر اسے مخاطب کیا' اس نے چونک کر لو کی طرف دیکھا اور پہچان کر ہاتھ ہلایا' وہ اس پر نہال ہوگئی۔

اب اس نے سوچ لیا تھا کہ وہ جانی سے ملاقات کرکے ہی جائے گی۔ جب فلم ختم ہوگئی تو وہ تھیٹر کے اس حصے میں پہنچ گئی' جہاں فلم کے اختتام پر پُرتمیر پارٹی منعقد کی گئی تھی مگر سیکیورٹی گارڈ اسے اندر نہیں جانے دے رہا تھا۔ اس کے پاس صرف فلم کا ٹکٹ تھا۔ تقریب کا کارڈ نہیں تھا پھر سیکیورٹی گارڈ اسے پہچانتا بھی نہیں تھا' نہ وہ ٹی وی دیکھتا تھا اور نہ ہی اس نے پارٹی آف فائیو دیکھا تھا مگر لو نے اس سے چکنی چپڑی باتیں شروع کردیں اور آخرکار اسے شیشے میں اُتار کر اندر داخل ہونے میں کامیاب ہو ہی گئی۔

جانی ڈیپ خود بھی اس سے ملنے کا خواہاں تھا۔ وہ اپنے ہیرو سے ملنے میں کامیاب ہوگئی' ایک بھرپور بوسے کے بعد جانی ڈیپ نے اس کے کان میں سرگوشی کی "تم بہت اچھی لڑکی ہو' بہت عمدہ اداکارہ ہو۔ تم نے میرے بارے میں جو پیاری پیاری باتیں کی ہیں۔ اس کا بہت شکریہ' تمہارے اس بوسے کا ذائقہ تادیر میرے ہونٹوں پر رہے گا۔"

جینیفر کے لیے یہ واقعہ ایسا تھا کہ وہ اسے ساری زندگی یاد رکھ سکتی تھی۔ چند ہی دنوں بعد پارٹی آف فائیو کے سیٹ پر جانی ڈیپ نے اسے فون کیا' اس کی خیریت دریافت کی اور اگلی بار نیویارک آنے پر اسے اپنے ساتھ کافی پینے کی دعوت بھی دی۔

جینیفر ان واقعات کے بعد ہواؤں میں اُڑنے لگی تھی۔ اب پارٹی آف فائیو کا سیزن بھی ختم ہوچکا تھا۔ جینیفر کو چھٹیاں گزارنے اور آرام کرنے کا اچھا موقع مل گیا تھا مگر وہ آرام کرنے کے لیے پیدا ہی نہیں ہوئی تھی۔ ایک برس

قبل نیوی کیمپبل نے خوفناک فلم "اسکریم" میں کام کیا تھا جو بے حد کامیاب رہی تھی۔ اب نیوی کیمپبل کے نقش قدم پر چلتے ہوئے اس نے بھی ایک ہارر فلم میں کام کرنے کی ہای بھرلی تھی۔ اب وہ اٹھارہ برس سے زائد ہوچکی تھی اور جسمانی طور پر ایسی بھرپور ہوگئی تھی کہ کسی بھی فلم میں مرکزی کردار بھی کرسکتی تھی۔ اس نے کیون ولیم کی تحریر کردہ ایک فلم "آئی نو واٹ یوڈڈ لاسٹ سمر" (I KNOW WHAT YOU DID LAST SUMMER) سائن کرلی تھی۔ کیون ولیم نے اس سے پہلے "اسکریم" لکھی تھی جو بے حد کامیاب ثابت ہوئی تھی اور اب ایک بار پھر وہ کامیابی کے دروازے پر دستک دے چکا تھا۔ پہلے اس نے اپنی فلم سے نیوی کیمپبل کو اسٹار بنایا تھا۔ اب اس کی نئی فلم ٹی وی کی بڑی اسٹار جینیفر لو ہیوٹ کو سینما کی بڑی اسٹار بنانے والی تھی۔

O*O

جینیفر لو کو ہارر (خوفناک) فلمیں پسند نہیں تھیں۔ وہ صرف کامیڈی (طربیہ) یا پھر رومانس کی چاشنی سے لبریز فلمیں شوق سے دیکھتی تھی۔ اس کے لیے آئی نو واٹ یوڈڈ لاسٹ سمر کا معاہدہ اس کی ماں نے کیا تھا۔ جب لو کو یہ بات پتا چلی تو وہ تنک کر بولی "ہارر مووی! اوہ مما! کیا میں ہارر مووی میں اچھی لگوں گی۔ میں تو ہارر مووی دیکھنا بھی پسند نہیں کرتی ہوں۔"

اس کی ماں نے جواب دیا "ایک اداکارہ کو ہر قسم کی فلموں میں کام کرنا چاہیے' فنکار کسی خاص موڈ کی فلموں کے لیے مخصوص نہیں ہوتا۔ یہ ایک اچھی فلم ہوگی' تمہارے منیجر نے مجھے اس کی کہانی سنائی ہے اور پھر یہ بھی تو دیکھو پارٹی فائیو میں تمہارے ساتھ کام کرنے والی نیوی کیمپبل ایک ہارر مووی سے ہی اسٹار بنی ہے۔"

"ضروری تو نہیں کہ اگر نیوی ہارر مووی سے اسٹار بن گئی تو میرے لیے بھی یہی راہ سود مند ثابت ہوگی۔ مجھے ہارر فلموں میں دلچسپی پیدا کرنا ہوگی اور یہ مشکل کام ہے۔"

"کوئی مشکل کام نہیں ہوتا۔ تم دو چار ہارر مووی دیکھ لو' مجھے یقین ہے تمہیں بہت مزہ آئے گا پھر آئی نو واٹ یوڈڈ لاسٹ سمر کی کہانی بہت عمدہ ہے' اسے اسکریم کے ہی رائٹر نے لکھا ہے۔ مجھے یقین ہے یہ فلم تمہیں بڑی اسکرین پر بھی اسٹار بنادے گی۔"

جینیفر کے پاس اپنی مما کی بات تسلیم کرنے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ دوسرے دن سے اس نے تیاری شروع کردی۔ اس نے لگاتار چار پانچ خوفناک فلمیں دیکھ ڈالیں۔ ان میں ایک خوفناک فلم "شائننگ" بھی شامل تھی۔ یہ ساری فلمیں بہت زیادہ دہشت زدہ کردینے والی تھیں۔ انہیں دیکھ کر جینیفر لو سچ مچ خوف زدہ ہوگئی۔ اس کی نیند اُڑ گئی' ڈر کے مارے وہ کئی راتوں تک سو بھی نہیں سکی لیکن اب اسے خوفناک فلم میں کام کرنا تھا' لہٰذا خود کو ان چیزوں کا عادی بنانا اشد ضروری تھا۔ کیونکہ وہ سیٹ پر اب ایسی ہی خوفناک چیزیں دیکھنے والی تھی۔ وہ ویڈیو سینٹر گئی اور وہاں سے خوفناک فلموں کی سرتاج فلم "اے نائٹ میئر آن ایلم اسٹریٹ" لے آئی۔ اس فلم کو لانے کی ایک خاص وجہ یہ بھی تھی کہ اس میں اس کے محبوب اداکار جانی ڈیپ نے بھی کام کیا تھا۔ اس کے بعد تمام خوفناک فلمیں' مثلاً اومین' اسکریم اور ان دی ماؤتھ آف میڈنس جیسی ہارر فلمیں ویڈیو پر لاکر دیکھتی رہی' وہ اپنے اندر کے فطری خوف کو دور کردینا چاہتی تھی۔ ان فلموں کو دیکھ کر اس کی حالت خراب ہوجاتی تھی' مگر وہ جانتی تھی کہ انہیں دیکھے بغیر وہ "آئی نو واٹ یوڈڈ لاسٹ سمر" کی جولی جیمس کے کردار کو بہتر طور پر نہیں ادا کرسکے گی۔

اسی دوران ایک انٹرویو میں اس سے پوچھا گیا کہ وہ خوفناک فلمیں دیکھ دیکھ کر خود کو کیوں ڈرا رہی ہے؟

جینیفر نے جواب دیا "یہ فلمیں دیکھ کر میں خود کو ان خوفناک مناظر کا حصہ سمجھ کر اپنے خوف پر قابو پانے کی کوشش کررہی ہوں۔"

اس سلسلے میں نیوی کیمپبل نے بھی اس کی خاصی مدد کی۔ اسے خوفناک فلم میں کام کرنے کا تجربہ تھا۔ اس روز وہ دونوں "پارٹی آف فائیو" کے سیٹ پر بیٹھی اسکرپٹ پڑھ رہی تھیں' نیوی کیمپبل کے ہاتھ میں 'پارٹی آف فائیو کا اسکرپٹ تھا۔ جبکہ جینیفر لو' آئی نو وانٹ یوڈڈ لاسٹ سمر کا اسکرپٹ پڑھ رہی تھی۔ نیوی کیمپبل اپنا اسکرپٹ پڑھتے چونک گئی' جینیفر کو مخاطب کرکے بولی "اوہ! لو! یہ تم کیا پڑھ رہی ہو۔ یہ پارٹی آف فائیو کا اسکرپٹ تو نہیں ہے۔"

"میں دوسرا اسکرپٹ پڑھ رہی ہوں' مما نے ایک فلم کے لیے معاہدہ کرلیا ہے۔ اسی کا اسکرپٹ ہے' کیون ولیم نے لکھا ہے اسے!"

"کیون ولیم نے! اوہ گاڈ۔ یہ تو بہت سنسنی خیز مصنف ہے۔"

لو نے حیرت سے پوچھا "کیا تم اسے جانتی ہو؟"

نیوی کیمپبل نے دلچسپی لیتے ہوئے کہا "ہاں! میں اس سے واقف ہوں' اکثر اس کے بارے میں سوچتی رہتی ہوں۔ کیا یہ کسی ہارر مووی کا اسکرپٹ ہے؟"

"ہاں! مگر تمہیں کیسے اندازہ ہوا؟" لو نے اسکرپٹ سمیٹ کر حیرت سے پوچھا۔

"ایسے کہ کیون ولیم باکمال ہارر رائٹر ہے' میری فلم "اسکریم" اسی نے لکھی تھی۔ اگر تمہیں کسی ہارر فلم میں کام کرنے کا موقع مل رہا ہے تو اسے ہاتھ سے مت گنوانا۔ ہارر فلمیں پوری دنیا میں شوق سے دیکھی جاتی ہیں۔ میں دعوے سے کہتی ہوں' ساری زندگی فلموں میں کام کرکے تمہیں اتنا مزہ نہیں آئے گا جتنا مزہ ایک ہارر فلم میں کام کرکے آتا ہے۔ ہارر فلم میں کام کرنے کا ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ اس کی شوٹنگ کے دوران زیادہ تھکن بھی نہیں ہوتی اور بوریت کا بھی احساس نہیں ہوتا۔"

نیوی کیمپبل کی یہ بات لو کے ذہن سے چپک کر رہ گئی' پھر جلد ہی اسے اندازہ ہوگیا کہ وہ بالکل ٹھیک کہہ رہی تھی۔ اس فلم کی شوٹنگ کے دوران لو کو واقعی بہت مزہ آیا' وہ دن اس کی زندگی کے یادگار ترین دن ثابت ہوئے۔ آئی نو واٹ یوڈڈ لاسٹ سمر میں لو کے ساتھ ایک نیا اداکار فریڈی پرنز جونیئر کام کررہا تھا۔ وہ مشہور اداکار آنجہانی فریڈی پرنز کا بیٹا تھا۔ اس کے علاوہ کاسٹ میں سارہ مشیل جیلر بھی شامل تھی۔ یہ وہی اداکارہ تھی جو ٹی وی کی مشہور سیریز "بفی دی ویمپائر" میں کام کرکے پورے ملک میں بفی کے نام سے شہرت حاصل کرچکی تھی۔ جس ہفتے بفی دی ویمپائر کا پریمیئر ٹی وی پر پیش ہوا تھا' لو کو یہ فلم اسی ہفتے ملی تھی۔ اس کی عکس بندی نارتھ کیرولینا میں ہورہی تھی' گویا لو کو بھی عکس بندی کے لیے وہیں جانا تھا۔ وہاں کے ایک چھوٹے سے قصبے میں شوٹنگ شیڈول ترتیب دیا گیا تھا۔

آئی نو واٹ یوڈڈ لاسٹ سمر کی کہانی لوئس ڈنکن کے ناول سے ماخوذ تھی' ناول کا بھی یہی نام تھا۔ یہ کہانی ہر سال چار جولائی کو پیش آنے والے واقعات پر مشتمل تھی۔ جولی جیمس (جینیفر لو ہیوٹ) اور ہیلن شیورز (سارہ مشیل گیلر) دو بہترین سہیلیاں تھیں۔ دونوں نے شمالی کیرولینا میں واقع ماہی گیروں کے ایک قصبے "ساؤتھ پورٹ" سے ایک ساتھ گریجویشن کیا تھا۔ جولی کافی ذہین تھی' اس نے بوسٹن کے ایک کالج میں تعلیم جاری رکھنے کے لیے اسکالرشپ حاصل کرلی تھی اور اب بوسٹن جانے کی تیاری کررہی تھی۔ اس کے مقابلے میں ہیلن کافی خوب صورت تھی۔ وہ مقابلۂ حسن بھی جیت چکی تھی اور اس نے فیصلہ کیا تھا کہ وہ نیویارک جاکر اداکارہ بن جائے گی۔ مقابلۂ حسن کے اختتام پر دونوں لڑکیاں اپنے نوجوان دوست لڑکوں (جنہیں محبوب کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا) کے ساتھ ساحل پر کچھ خوشگوار اور ذاتی سا وقت گزارنے چلی گئیں' ہیلن کے ساتھ ایک دل پھینک قسم کا امیرزادہ تھا' جبکہ جولی (جینیفر لو) ایک حساس لڑکے رے برونسن (فریڈی پرنز جونیئر) کے ساتھ تھی۔ انہوں نے ساحل پر بہت اچھا وقت گزارا۔ واپسی میں بیری کوکس (ریان فلپس) اتنی شراب پی چکا تھا کہ اس سے گاڑی بھی ٹھیک طرح سے نہیں چل رہی تھی۔ اس اثنا میں اس کی چمچماتی بی ایم ڈبلیو سے کوئی راہ گیر کچل گیا' جو اصل میں خودکشی کی نیت سے پہاڑی پر سے گرا تھا اور اس کی گاڑی سے آ ٹکرایا تھا۔ سب کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ رے نے جھنجلا کر اس سے گاڑی کی چابی چھین لی' اس نے فیصلہ کیا کہ اب وہ گاڑی چلائے گا۔ انہیں جلد ہی اندازہ ہوگیا کہ ان کی گاڑی سے ٹکرانے والا ماہی گیر ہلاک ہوگیا ہے۔ بیری ماہی گیر کے بجائے اپنی گاڑی کے نقصان پر پریشان تھا۔ دیگر تینوں ساتھیوں کا اصرار تھا کہ انہیں فوراً پولیس کے پاس جاکر اس واقعے کی اطلاع دینی چاہیے لیکن بیری نے سختی سے انکار کردیا پھر اس کے کہنے پر ان چاروں نے ماہی گیر کی لاش اُٹھائی' کار کی ڈکی میں ڈالی اور جیٹی پر لے جاکر پانی میں پھینک دی۔ جس وقت وہ لاش پانی میں پھینک رہے تھے' اسی وقت لاش میں ایسی حرکت ہوئی جیسے وہ زندہ ہے۔ اس کے جسم میں زندگی کی رمق باقی تھی لیکن اب تو وہ اسے سمندر میں پھینک چکے تھے۔ گویا وہ چاروں قتل کے مجرم بن گئے تھے۔ اس وقت چاروں قسم کھاتے ہیں کہ اس واقعے کا ذکر زندگی میں کسی سے بھی نہیں کریں گے۔

اس واقعے کے ٹھیک ایک سال بعد جولی (جینیفر لو ہیوٹ) ساؤتھ پورٹ واپس آگئی' اس نے فیصلہ کیا تھا کہ وہ اپنے گریڈ میں اضافے کے لیے سمر اسکول میں داخلہ لے کر مزید پڑھائی کرے گی۔ ساؤتھ پورٹ میں ایک نوٹ (رقعہ) اس کا منتظر تھا۔ اس پر نہ تو ڈاک خانے کی مہر تھی' نہ ٹکٹ اور نہ واپسی کا پتا' اس رقعے پر صرف ایک جملہ تحریر تھا "مجھے علم ہے تم نے گزشتہ گرمیوں میں کیا کیا تھا؟ (I KNOW WHAT YOU DID LAST SUMMER)

رقعہ دیکھتے ہی جولی کی حالت خراب ہوگئی۔ اس نے فیصلہ کیا کہ وہ اس واقعے کی اطلاع اپنے دیگر دوستوں کو دے گی۔ وہ سیدھی شیورز ڈیپارٹمنٹل اسٹور گئی اور ہیلن کی بہن

www.paksociety.com

www.Paksociety.com

ایلیا سے ہیلن کا نیویارک کا ٹیلی فون نمبر طلب کیا' مگر اس کی ضرورت نہیں پڑی۔ ہیلن اسی اسٹور پر موجود تھی۔ نیویارک جانے کا اس کا خواب اُدھورا رہ گیا تھا۔ جولی یہ بات نہیں جانتی تھی کیونکہ گزشتہ موسم گرما کے بعد سے وہ کسی سے بھی رابطہ نہیں رکھ سکی تھی۔ جولی اور ہیلن' بیری سے ملنے جاتے ہیں' وہ ابھی تک ویسے کا ویسا' دل پھینک' شرابی اور عاشق مزاج ہے۔ اس میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی' وہ بھی قصبہ رے سے باہر نہیں جاسکا تھا اور وہیں ایک فشنگ بوٹ پر کام کرتا تھا۔ وہ سب فکرمند ہوگئے اور پھر جب بیری کی وہی بی ایم ڈبلیو' جس سے حادثہ ہوا تھا' کسی نے چوری کرلی تو ان کے خدشات نے حقیقت کا روپ دھار لیا پھر اسی کار کے ذریعے رے کو کچلنے کی کوشش کی گئی' مگر وہ بچ نکلا۔ البتہ وہ کار کے ڈرائیور کی جھلک دیکھنے میں کامیاب ہوگیا' اس نے ماہی گیروں جیسا لباس پہن رکھا تھا اور اس کے ہاتھ میں ایک آہنی ہک بھی تھا۔

جولی کو شدت کے ساتھ احساس جرم ہونے لگا۔ انہوں نے ذرا سی تگ و دو کے بعد معلوم کرلیا کہ ان کی کار سے جو شخص ہلاک ہوا تھا اس کا نام "ڈیوڈ ایگن" تھا اور اس کی منگیتر اس کی موت سے ایک سال قبل مرگئی تھی۔ جولی کو یقین ہوگیا کہ ڈیوڈ کا کوئی دوست جو سارے واقعے سے واقف ہے انہیں خوف زدہ کررہا ہے۔ جولی اور ہیلن ڈیوڈ کا گھر تلاش کرتے ہوئے اس کی بہن مسی (این ہیچ) کے پاس پہنچ گئیں۔

ان چاروں کو علم تھا کہ ان پر حملے کرنے والا شخص وہیں کہیں ہے' مگر یہ بات کسی کو بھی نہیں معلوم تھی کہ وہ کون ہے پھر چار جولائی کی صبح ہیلن نے جولی کو فون کیا۔ وہ بہت خوف زدہ تھی' کیونکہ گزشتہ رات کوئی اس کے گھر میں گھس گیا تھا اور اس کے حسین بال کاٹ کر چلا گیا تھا۔ جبکہ آج اسے مقابلۂ حسن میں بطور سابقہ ملکہ حسن کے شرکت کرنی تھی۔

جولی فون سنتے ہی ہیلن کے گھر کی طرف چل دی' مگر راستے میں اسے محسوس ہوا کہ اس کی گاڑی میں سے عجیب و غریب آوازیں آرہی ہیں۔ اس نے گاڑی سے اُتر کر ڈکی کھولی تو اس میں میکس کی لاش تھی۔ میکس ان کا دوست تھا اور انہوں نے گزشتہ سال چار جولائی کو حادثے کے بعد اپنی گاڑی میں میکس کو اس کے گھر تک لفٹ دی تھی۔

جولی کی چیخیں نکل گئیں' وہ دوڑتی ہوئی ہیلن کے گھر میں گئی اور جب جولی' ہیلن اور ہیری دوڑتے ہوئے کار کے پاس واپس آئے تو ڈکی میں سے میکس کی لاش غائب تھی اور یہیں سے حالات نے عجیب و غریب رُخ اختیار کرنا شروع کردیا۔ ہیلن خوف زدہ تھی مگر پھر بھی اسے مقابلۂ حسن کی پریڈ میں حصہ لینا تھا۔ وہ پریڈ میں موجود تھی کہ اسے وہاں ماہی گیر کے مخصوص لباس میں وہ پُراسرار شخص نظر آیا۔ وہ اسٹیج سے شہزادے ہیری کو تلاش کرنے لگی۔ مگر وہ کسی اور پری کے پیچھے چلا گیا۔ پھر مقابلۂ حسن کے دوران میں ہیری اس کی حفاظت کے پیش نظر بالکونی میں کھڑا ہوگیا اور ہیلن نے اسٹیج سے دیکھا کہ اسی مشکوک ماہی گیر نے بالکونی میں ہیری کو گلے سے دبوچ لیا ہے۔ اسے دیکھ کر وہ حلق پھاڑ کر چیختی ہوئی اسٹیج سے دوڑی مگر جب وہ ایک پولیس اہل کار کے ساتھ بالکونی میں پہنچی تو یہ دیکھ کر ششدر رہ گئی کہ نہ وہاں ہیری تھا اور نہ ہی مشکوک ماہی گیر۔

معاملہ اُلجھ گیا تھا۔ ان دونوں کا کچھ پتا نہیں تھا' پولیس اہلکار ہیلن کو اس کے گھر چھوڑنے چلا تو راستے میں ایک جگہ کار کا حادثہ دیکھ کر انہیں رکنا پڑا۔ وہاں قاتل مچھیرا موجود تھا۔ اس نے پولیس اہلکار کو آہنی ہک کے ذریعے ہلاک کردیا اور پھر ہیلن کو قابو کرنے کے لیے اس کے پیچھے لپکا۔ ہیلن بے تحاشا دوڑی' قاتل اس کے تعاقب میں اس کے ڈپارٹمنٹل اسٹور تک پہنچ گیا۔ وہاں ہیلن کی بہن ایلیسا دن بھر کی آمدنی کا حساب کتاب کررہی تھی۔ قاتل مچھیرے نے اسے بے دردی سے قتل کردیا اور پھر مقابلۂ حسن کی پریڈ کے مقام سے محض چند گز دور گلی میں وہ ہیلن پر بھی قابو پانے میں کامیاب ہوگیا۔

اسی دوران میں جولی (جینیفر لو ہیوٹ) معلومات جمع کرتی پھر رہی تھی۔ انہوں نے ممکنہ قاتل کے ہاتھ پر ایک لفظ "سوزی" کھدا ہوا دیکھ لیا تھا۔ سوزی' ڈیوڈ کی مرحومہ منگیتر کا نام تھا مگر ڈیوڈ کی بہن مسی نے انہیں بتایا کہ ڈیوڈ کے ہاتھ پر کوئی ٹیٹو (کھدا ہوا نام یا نشان) نہیں تھا۔ مسی سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اس کے مرحوم بھائی ڈیوڈ کا دوست "بلی بلیو" قصبے میں آیا ہوا ہے۔ مگر کوشش کے باوجود جولی اس نام کے کسی شخص کے بارے میں معلومات حاصل کرنے میں کامیاب نہیں ہوئی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ قاتل مچھیرا' کہیں سوزی کا باپ بنجامن ویلس تو نہیں ہے؟ اسی دوران میں اسے کھاڑی میں رے دکھائی دیا۔ مگر وہ اس کی کشتی کا نام پڑھ کر خوف زدہ ہوگئی اور چلاتی ہوئی واپس بھاگی' کشتی کا نام "بلی بلیو" تھا' رے کی نظر بھی جولی پر پڑگئی۔ وہ دوڑتے ہوئے اس کے پیچھے گیا مگر اسی اثنا میں ایک شخص نے اس پر حملہ کردیا۔

وہ شخص جولی کی حفاظت کی خاطر اسے کشتی میں لے آیا۔ جولی اس کے جھانسے میں آگئی اور خود کو مطمئن محسوس کرنے لگی۔ مگر کشتی پر پہنچنے کے بعد جولی کو اندازہ ہوا کہ وہ اس وقت اسی جنونی قاتل مچھیرے کے سامنے ہے۔ اب فرار کا کوئی راستہ نہیں تھا۔ تمام راہیں مسدود ہوچکی تھیں اور وہ چڑیا کی طرح قاتل کے شکنجے میں آگئی تھی۔ اسی دوران میں رے ہوش میں آگیا۔ جولی اپنی جان بچاکر فشنگ بوٹ کے آئس روم کی طرف بھاگی۔ مچھیرا اس کے تعاقب میں تھا۔ آئس روم (برف خانے) میں جولی کا سامنا ہیلن اور ہیری کی سرد لاشوں سے ہوا تو وہ دہشت زدہ ہوگئی۔ قاتل مچھیرے کا نام ویلس تھا' اس نے ایک بار پھر رے پر حملہ کردیا۔ مگر رے نے اس کا حملہ روک کر اس پر جوابی وار کیا۔ اب بہ ظاہر رے اور جولی محفوظ ہوگئے تھے مگر ابھی ان کی کم بختی دور نہیں ہوئی تھی' قاتل مچھیرا ہوش میں آگیا تھا۔ وہ ایک بار پھر حملے کے ارادے سے ان کی طرف دوڑا مگر اس کا آہنی ہک کشتی میں موجود مچھلیاں پکڑنے والے جال میں پھنس گیا۔ رے نے موقع غنیمت جان کر فوراً لیور گھمادیا۔ قاتل مچھیرا ایک جھٹکے سے فضا میں بلند ہوا اور اس کا وہ ہاتھ جس میں ہک تھا' اس کے تن سے جدا ہوگیا۔ اور باقی جسم بے جان ہوکر سمندر میں گرگیا۔ اب انہیں خطرناک اور جنونی قاتل سے نجات مل گئی تھی۔

گرمیوں کے موسم میں جولی اسکول گئی اور ڈین کے بہترین طلبا کی فہرست میں اپنا نام شامل کرانے میں کامیاب ہوگئی۔ وہاں سے غسل کی نیت سے وہ اپنے گھر چلی گئی اور پھر ـ پھر ایک بار پھر.... بغیر کسی پتے کے ایک رقعہ اس کے سامنے تھا۔ اس کی سٹی گم ہوگئی۔ مگر وہ کسی تقریب کا دعوت نامہ تھا۔ جولی کی جان میں جان آئی۔ وہ غسل خانے میں گئی تو اُچھل پڑی۔ غسل خانے کے شیشے کے دروازے پر باہر کی جانب لپ اسٹک سے ایک جملہ لکھا تھا "آئی اسٹل نو' واٹ یو ڈڈ لاسٹ سمر" (میں اب بھی جانتا ہوں کہ گزشتہ موسم سرما میں تم نے کیا کیا؟) اس کے ساتھ ہی شیشہ چکنا چور ہوگیا۔

یہ فلم کا آخری منظر تھا اور اس بات کا اعلان بھی کہ اس فلم کا دوسرا حصہ بھی بنایا جائے گا۔

O☆O

فلم کی کہانی بہت عمدہ' پر تجسس اور تھرل سے بھرپور تھی۔ عکس بندی کے لیے فلم کی کاسٹ اور تمام ٹیکنیکل عملے نے نارتھ کیرولینا میں ساؤتھ پورٹ پر پڑاؤ ڈال دیا۔ (یہ لوکیشن بعد میں ٹی وی کی مشہور ترین سیریز "ڈاوسنز کریک" کے لیے بھی منتخب کی گئی تھی۔ اتفاق سے اس سیریز کا مصنف بھی کیون ولیم ہی تھا۔ اس سیریز کی عکس بندی بھی اس دوران میں شروع ہوگئی تھی جب "آئی نو واٹ یو ڈڈ لاسٹ سمر" کی عکس بندی ہورہی تھی)

ساؤتھ پورٹ کا یہ علاقہ' لاس اینجلس کے پُرشور ماحول سے دور ایک بے حد پُرسکون اور خوب صورت مقام تھا۔ مگر مقامی لوگ ان سب کی توقعات کے برخلاف قطعی طور پر مہمان نواز ثابت نہیں ہوئے۔ وہ فلم والوں کی وجہ سے سخت پریشان تھے۔ ان کا خیال تھا کہ ہالی وڈ کے یہ لوگ محض اپنی اور فلم بینوں کی تفریح کے لیے ان کے علاقے کا حسن اور سکون برباد کرنے آگئے ہیں۔

پہلے دن جینیفر کو یہ دیکھ کر شدید ذہنی جھٹکا پہنچا کہ انہیں دیکھ کر لوگ اپنے ہوٹل اور ریستوران تک بند کرلیتے تھے۔ مگر وہ پھر بھی خوش تھی۔ ہدایت کار جم گلیسپی کے ساتھ کام کرنے کا تجربہ اس کے لیے بے حد یادگار ثابت ہورہا تھا۔ اس فلم کی عکس بندی کے بعد جینیفر نے ایک جریدے کو انٹرویو دیتے ہوئے کہا تھا "میں نے اب تک جتنے بھی ہدایت کاروں کے ساتھ کام کیا ہے' ان میں جم گلیسپی سب سے بہترین اور سب سے عمدہ ہدایت کار ہے۔ اس کا رویہ پورے عملے کے ساتھ نہایت حیرت انگیز تھا۔ ہم دن میں سترہ گھنٹے مسلسل کام کرتے تھے۔ مگر وہ کسی بھی لمحے نہ تو پریشان ہوتا تھا اور نہ ہی عملے پر چیختا چلاتا تھا۔ بلکہ تھوڑی تھوڑی دیر بعد ہمارے کام کی تعریف کرتا رہتا تھا۔"

فلم کی عکس بندی شروع ہوئی تو ہر گزرتے دن کے ساتھ جینیفر لو کی خوشیاں بڑھتی چلی گئیں۔ ایک روز جم گلیسپی اس کے سامنے آکر بیٹھ گیا اور بولا "میں اس فلم میں تمہارے کردار پر تم سے مشورہ کرنا چاہتا ہوں۔"

"مگر میں کیا مشورہ دے سکتی ہوں؟"

"تمہارے علاوہ کون مشورہ دے سکتا ہے۔ یہ کردار تم کررہی ہو' تم زیادہ احساس کرسکتی ہو کہ کون سا مکالمہ کس طرح ادا ہونا چاہیے؟ بعض جملے بھی تمہاری مرضی سے تبدیل کرنا چاہتا ہوں۔"

جینیفر کے لیے یہ اعزاز کی بات تھی۔ خوش ہوکر بولی "کون سے مکالمے؟"

وہ اسے تفصیل سے بتانے لگا۔ اس کے بعد جینیفر نے جو جملے ترتیب دیے وہ یہ تھے۔

"میں بعد میں رولوں گی... ابھی نہیں رونا... بعد میں... مجھے مضبوط بننا ہے اور میری حسیات مجھے اس صورتِ حال

سے نکلنے میں مدد دیں گی اور اگر یہ شخص میرے نزدیک بھی آیا تو میں اس لعنتی کا سر پھاڑ کر اس کا مغز باہر نکال دوں گی۔"

اس قسم کے اور بھی کئی مکالمے تھے جو جینیفر کے مشورے سے تبدیل کیے گئے۔ وہ بہت مسرور تھی اور اچھی طرح جانتی تھی کہ وہ اس فلم میں روایتی طور پر کمزور لڑکی کا کردار نہیں کررہی تھی' اسے معلوم تھا کہ اس کا کردار بہت عمدہ ہے۔ وہ خود بتاتی ہے کہ میں اس فلم میں ایسی لڑکی نہیں تھی جو کسی سے خوف زدہ ہوکر بیٹھ جاتی اور محض عورت ہونے کی بنا پر خوف کے باعث سمٹ سمٹا کر ایک کونے میں بیٹھی تھر تھر کانپتی رہتی اور روتی رہتی کہ کوئی مرد آئے جو معاملات سدھارے۔"

اس فلم میں ہدایت کار جم گلیسپی ' جینیفر کو ایک بہادر اور نڈر لڑکی کے روپ میں پیش کرنا چاہتا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ وہ اپنے مدِمقابل کی پشت پر ٹھوکر مار کے اسے خود سے دور کردے۔ ایسے حالات میں جبکہ کوئی مرد اس کے قریب موجود ہو یا نہ ہو' وہ کسی بھی طرح کمزوری کا مظاہرہ نہ کرے۔

اس فلم میں جینیفر کو سب سے زیادہ یہی بات پسند آئی کہ اس نے خطروں کا مقابلہ بھی کیا اور ان پر فتح بھی پائی۔ جینیفر کو اس بات پر شدید حیرت تھی کہ ہارر (خوفناک) فلم کا سیٹ ہونے کے باوجود وہاں دور دور تک خوف کا نام و نشان بھی نہ تھا۔ بالکل اسی طرح جیسے پارٹی آف فائیو کے سیٹ پر ہوتا تھا' کیمرے کے سامنے انہیں اسکرپٹ کے مطابق جذباتی اداکاری کرنا ہوتی تھی مگر اس تناؤ سے چھٹکارا پانے کے لیے ہر اداکار مسخرہ بن کر گھومتا' ہنستا اور ہنساتا تھا۔

آئی نو واٹ یو ڈڈ لاسٹ سمر کے سیٹ پر بھی یہی کچھ ہورہا تھا۔ کیمرا اسٹارٹ ہوتا' لائٹس آن ہوتیں' ہدایت کار ایکشن کہتا اور جینیفر لاش دیکھ کر چیخیں مارنا شروع کردیتی۔ پورے سیٹ پر خوف کی لہر دوڑ جاتی مگر جونہی ہدایت کار "کٹ" کہتا' جینیفر مسکراتی ہوئی لاش کے قریب جاتی اور اس کے گالوں پر پیار کرکے کہتی "تم بہت خوب صورت ہو۔"

کئی مرتبہ ایسا ہوتا کہ وہ رات گئے تک عکس بندی میں حصہ لینے کے بعد کشتی پر ہی ناچتا اور "راک وی بوٹ بے بی" گانا شروع کردیتے۔ اور پھر صبح چار بجے تک ان کے گانے اور بے ہنگم شور کی آوازیں گونجتی رہتیں۔ وہ قطعاً بھول جاتے کہ اس وقت ایک ہارر فلم کے سیٹ پر موجود ہیں۔

یہ نہیں کہ خوف ناک فلم کی عکس بندی کا ان پر ذرا بھی اثر نہیں ہوتا تھا۔ کئی ایسے واقعات پیش آئے جن سے جینیفر بُری طرح خوف زدہ ہوگئی تھی۔ جینیفر کو ایسا محسوس ہوتا تھا کہ فلم میں کام کرنے والا پاگل ماہی گیر اندھیرے میں اس کے ارد گرد چکراتا پھرتا ہے۔

ایک رات جینیفر لو' عکس بندی کے بعد سیٹ سے اس مقام پر واپس جارہی تھی جہاں وہ مقیم تھی' راستے میں اچانک اس کی چیخیں نکل گئیں۔ سڑک کے ایک طرف ویسے ہی لباس میں ایک ماہی گیر کھڑا تھا جیسا کہ فلم میں دکھایا جارہا تھا۔ جینیفر کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ وہ دل ہی دل میں یسوع مسیح کو یاد کرتے اور خدا سے دعائیں مانگتے ہوئے انتہائی تیز رفتاری سے مقررہ مقام پر پہنچی۔ اس رات اسے ایک لمحے کو بھی نیند نہیں آئی۔ وہ ساری رات خوف زدہ حالت میں آنکھیں بند کیے بستر پر لیٹی رہی۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد ماہی گیر کا ہیولا اسے اپنی آنکھوں کے سامنے لہراتا ہوا محسوس ہوتا۔

دوسرے دن جب وہ عکس بندی کے مقام پر جارہی تھی تو یہ دیکھ کر حیران رہ گئی کہ وہ ماہی گیر اب بھی اسی مقام پر کھڑا ہے۔ وہ ڈرتے ڈرتے قریب پہنچی اور یہ دیکھ کر اس کی ہنسی نکل گئی کہ وہ گتے کا بنا ہوا ایک نقلی پتلا تھا۔ جو وہاں استادہ کردیا گیا تھا۔ وہ اصل میں مچھلی کے کسی ریستوران کا تشہیری بورڈ تھا۔

جینیفر بتاتی ہے' ان دنوں میری حالت پاگلوں کے جیسی ہوگئی تھی۔ اس فلم نے میری نفسیات پر گہرا اثر چھوڑا تھا۔ اگر میں نے عکس بندی سے پہلے کچھ خوف ناک فلمیں دیکھ کر اپنا دل مضبوط نہ کرلیا ہوتا تو شاید میں اس فلم کی عکس بندی کے بعد سچ مچ پاگل ہوچکی ہوتی۔

ایک روز ہدایت کار نے جینیفر کو بتایا کہ اسے آج چیخ کے دو مناظر عکس بند کرانے ہیں۔ مگر یہ چیخ بناوٹی نہیں ہونی چاہیے۔ تمہیں اپنے چہرے پر بے پناہ خوف اور وحشت کا تاثر لاکر پوری شدت کے ساتھ چیخنا ہوگا۔"

جینیفر نے بات سمجھ کر اثبات میں سر ہلا دیا۔ وہ جانتی تھی کہ ایسے مناظر میں بناوٹی چیخ سے کام نہیں چلے گا۔ وہ بولی "آپ بے فکر رہیں۔ میں آپ کی توقعات پر پوری اتروں گی۔"

"یہ بات ذہن میں رکھنا کہ تمہیں پوری قوت کے ساتھ چیخنا ہے اور حلق بھی درست رکھنا ہے' کہیں ایسا نہ ہو' تمہارا گلا بیٹھ جائے۔ اگر ایسا ہوا تو بڑی گڑبڑ ہوجائے گی۔

ہمیں اس وقت تک انتظار کرنا ہوگا جب تک کہ تمہارا گلا ٹھیک نہیں ہوجائے گا۔"

جینیفر کی سمجھ میں اس وقت یہ بات نہیں آرہی تھی۔ منظر عکس بند کیا جانے لگا۔ وہ پوری قوت اور شدت کے ساتھ چیخی۔ اس کے علاوہ چلّانے کے بھی دو مناظر تھے۔ دونوں منظر بہ خوبی عکس بند کرلیے گئے مگر جب اگلے روز وہ سیٹ پر پہنچی تو اس کا گلا بیٹھا ہوا تھا۔ ہدایت کار نے سر پکڑ لیا اور سوچ میں ڈوب گیا۔ آخر اس کی سمجھ میں ایک ترکیب آئی' اس نے پس منظر میں ایکسٹرا اداکاروں کی تعداد بڑھادی اور پھر اگلا منظر' جس میں جینیفر کو چیخنا تھا' اس طرح فلمایا گیا کہ باقی لوگ چیخ رہے تھے اور وہ صرف چیخنے کی اداکاری کررہی تھی۔

اس فلم میں سب سے اہم اور خاص بات جینیفر لوہیوٹ کا بھرپور اور نوخیز سینہ تھا۔ اس وقت تک اس کا سینہ بے حد گداز اور ضرورت سے زیادہ نمایاں ہوچکا تھا۔ ہدایت کار نے بھی شاید یہ بات محسوس کرلی تھی لہٰذا فلم میں اس کے گداز سینے سے بہت کام لیا گیا۔ پوری فلم میں اسے ایسے لباس پہننے کو دیے گئے تھے جن میں اس کے سینے کی گولائیاں اور ابھار ضرورت سے زیادہ نمایاں ہورہے تھے۔ جب پہلی مرتبہ وہ یہ لباس پہن کر ڈریسنگ روم سے باہر آئی تو خود کو بہت معیوب خیال کررہی تھی۔ ہدایت کار جم نے اس کے چہرے پر ناگواری محسوس کرلی۔ وہ اس کے قریب پہنچا اور بولا "لگتا ہے تم بے اطمینانی محسوس کررہی ہو؟"

"ہاں! یہ لباس۔۔ مجھے مناسب محسوس نہیں ہورہا' اس میں میرے جسم کے بعض حصے غیر ضروری طور پر نمایاں ہورہے ہیں اور۔۔۔"

جم گلیسپی نے کہا "بچوں جیسی باتیں مت کرو لو! تم شوبزنس میں ہو' شوبزنس کا مطلب ہے' دکھانے کا کاروبار۔۔ اگر تم کچھ دکھاؤ گی نہیں تو تمہیں کون دیکھنے آئے گا؟"

"مگر کیا یہ سب بہت ضروری ہے؟"

"ہاں! بہت ضروری۔۔ ہم یہ فلم نوجوانوں کے لیے بنارہے ہیں۔ نوجوان لڑکے صرف ایسی لڑکیوں کو پسند کرتے ہیں' جن میں کچھ نہ کچھ گلیمر ہو' ایسی اداکاراؤں کی فلمیں دیکھنے آتے ہیں' جو بے باکی سے اپنے "اثاثوں" کی نمائش کرتی ہیں۔"

اس قسم کی باتیں لو اور صرف جم گلیسپی کے درمیان ہوتی تھیں' جب وہ کسی بات پر اُلجھتی تو جم اسے سمجھانے آجاتا اور اس انداز میں سمجھاتا کہ اس کے پاس کوئی جواب نہ رہتا۔ فلم کی ریلیز کے بعد میگزین کے حوالے سے ایک انٹرویو میں لو نے کہا "میں بہت جلد اس حقیقت کو سمجھ گئی تھی کہ انٹرٹینمنٹ انڈسٹری میں ایسی بہت سی چیزیں دکھانی پڑتی ہیں جنہیں عام طور پر عام زندگی میں چھپادیا جاتا ہے۔ یہاں کا انداز مختلف ہے۔ ایسی لڑکی کی فلم کوئی دیکھنا پسند نہیں کرے گا جس میں گلیمر نہ ہو۔ اور جسے بغیر میک اپ کے اسکرین پر پیش کیا جائے۔ جس کے چہرے پر دانے یا مہاسے ہوں۔ بال چڑے ہوئے ہوں اور وہ پسینے میں شرابور ہو۔ دیکھنے والی آنکھیں مسالا اور رنگینی دیکھنے آتی ہیں۔ ایسے مناظر' جس میں کچھ دکھایا جانا ضروری نہ ہو' اس میں بھی کچھ نہ کچھ لوازمات رکھنا ہوتے ہیں تاکہ لوگ غور سے ان مناظر کو دیکھیں اور کمرشل فلم میں تو ایسے مناظر کی لازمی ضرورت ہوتی ہے جو فلم بینوں کو تھیٹر تک لانے پر مجبور کرسکیں۔ اگر آئی نو واٹ یو ڈڈ لاسٹ سمر میں میرے لباس کی وجہ سے نوجوان تھیٹر تک آنے پر مجبور ہوئے تو میرے نزدیک یہ بہت اچھی بات ہے۔ میں لڑکوں کی آنکھوں کی چاشنی اور من کی طلب بننے میں کوئی قباحت محسوس نہیں کرتی۔ میں خود کو آئینے میں اس زاویے سے کبھی نہیں دیکھتی' لیکن اگر لوگ سمجھتے ہیں کہ میں دیکھنے کی چیز ہوں تو ایسے مناظر فلمانے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ بلکہ ہمارے پروفیشن کے مطابق یہ بہت اچھی بات ہے۔ ایسے پُرکشش مناظر عکس بند کرانے میں مجھے کوئی اعتراض نہیں' البتہ میں یہ بات طے کرچکی ہوں کہ کسی منظر میں مکمل برہنہ نظر نہیں آؤں گی اور بے لباس مناظر عکس بند کرانے پر کبھی آمادہ نہیں ہوں گی۔ ایسے مناظر غیر ضروری اور بہت حد تک مضحکہ خیز ہوتے ہیں۔ البتہ منظر اور کردار کی ضرورت کے مطابق ایسے لباس پہننے پر مجھے کوئی اعتراض نہیں جن سے نوجوان لڑکوں کے جذبات برانگیختہ ہوتے ہوں۔"

اس فلم میں دونوں لڑکیوں کے گداز اور اچھلتے کودتے سینے نے بننے کا خاصا سامان مہیا کردیا تھا۔ شوٹنگ کے دوران میں سیٹ پر ایک لطیفہ گردش کرنے لگا تھا کہ اس فلم کا نام تبدیل کرکے "آئی نو واٹ یور بریسٹ ڈڈ لاسٹ سمر" رکھ دینا چاہیے۔ کیونکہ اس فلم کے ہر منظر میں زنانہ چھاتیوں کا ایک جوڑا اچھل کود کرتا نظر آتا تھا۔ یہ جوڑا یا تو جینیفر کا ہوتا تھا یا پھر سارہ کا۔ فلم کی تکمیل کے بعد جب جینیفر نے تھیٹر میں یہ فلم دیکھی تو اپنے آپ کو دیکھ کر اور اپنے بے قابو سینے کو دیکھ کر حیران ہوتی رہی۔ فلم ختم ہوتے ہی وہ سیدھی گھر گئی اور آئینے کے سامنے کھڑی ہوکر اچھی طرح اپنے اوپری بدن

کا معائنہ کیا تو بقول جینیفر خود مجھے بھی شرم آگئی۔

حیرانی کی بات تو یہ تھی کہ نہ تو عکس بندی کے دوران میں اور نہ ہی اب.... جینیفر نے اپنے آپ کو کبھی مکمل طور پر "بیب" سمجھا۔ بیب فلمی اصطلاح میں ایسی اداکارہ کو کہتے ہیں جس کی اداکاری سے زیادہ اس کا سینہ نمایاں ہوتا ہے۔ آسانی کے لیے یوں سمجھ لیں کہ مشہور ٹی وی سیریز بے واچ کی سابقہ ہیروئن پامیلا اینڈرسن کو سب سے نمایاں "بیب" کہا جاتا ہے۔ اس سے زیادہ نمایاں اور گداز سینے والی کوئی اداکارہ اب تک اتنی مقبولیت حاصل نہیں کرپائی ہے۔

جینیفر خود کو ایک عام سی لڑکی تصور کرتی تھی۔ اس کا خیال ہے کہ وہ کبھی کبھی جاذبِ نظر اور خوبصورت نظر آتی ہے۔ تاہم اس کا کہنا ہے کہ وہ خوب صورتی اور دلکشی کے معاملے میں اوسط درجے کی لڑکی ہے۔ یہ ناممکن ہے کہ کوئی اداکارہ اپنے جسم کی جاذبیت اور کشش کو بڑھانے پر توجہ نہ دے تاہم جینیفر اس معاملے میں بہت زیادہ حساس نہیں تھی۔ وہ خود پر اور اپنے بدن پر کم ہی دھیان دیتی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ اگر تمام ہی لڑکیاں مکمل، خوبصورت اور صاف وشفاف جلد کی مالک دکھائی دینے لگیں گی تو یہ بات ناظرین کے لیے بوریت اور بے زاریت کا باعث بھی بن سکتی ہے۔

اس کے باوجود وہ ایک ذاتی ٹرینر کے ساتھ باقاعدگی سے ورزش کرتی تھی۔ نہ صرف اپنے جسم کو قابو میں رکھنے کے لیے بلکہ اس توانائی کے حصول کے لیے بھی جس کی اسے اداکاری کے وقت ضرورت پیش آتی تھی۔

آئی نو واٹ یو ڈڈ لاسٹ سمر کی عکس بندی دس ہفتوں تک مسلسل جاری رہی تھی۔ اس دوران میں وہ ایک سیریز (پارٹی آف فائیو) میں بھی کام کرتی رہی جو ہر ہفتے ٹی وی پر دکھائی جارہی تھی۔ لہٰذا فلم کے لیے صحت برقرار رکھنا اور مکمل طور پر جسم کو فٹ رکھنا اس کی ضرورت تھی۔ پھر اس نے یہ بھی فیصلہ کیا تھا کہ خود پر فلمائے جانے والے خطرناک مناظر اور اسٹنٹ (STUNT) وہ خود کرے گی، اسٹنٹ وومن کو اس سلسلے میں زحمت نہیں دے گی اور نہ ہی ڈپلی کیٹ کا سہارا لے گی۔ یہ فیصلہ اگرچہ ٹھیک تو تھا مگر یہ صورت خود اس کے لیے بھی بہت زیادہ تکلیف دہ ثابت ہوئی، شوٹنگ کے دوران میں وہ متعدد بار زخمی ہوئی اور اپنے جسم پر لگنے والی خراشوں اور زخموں کے علاج کے لیے اسے سیٹ پر موجود نرس کے پاس بار بار جانا پڑا۔ اس فلم کی پوری شوٹنگ کے دوران میں اس کے نازک بدن پر مجموعی طور پر اڑتیس خراشیں آئیں اور اس کی آنکھ کی پتلی بھی ایک بار پھٹ گئی۔ شوٹنگ کے دوران میں وہ ایک زنگ آلود لوہے کے ٹکڑے پر منہ کے بل گر گئی تھی۔ اس کے علاوہ مزید کوئی خطرناک واقعہ تو پیش نہیں آیا۔ تاہم فلم بندی کے دوران میں زخموں اور خراشوں کے باعث اسے کافی تکلیفیں سہنا پڑیں۔

پھر اس کی سب سے بڑی پریشانی کی وجہ یہ بھی تھی کہ اس فلم کی عکس بندی کے دوران میں وہ اپنے محبوب ول فریڈل سے دور تھی۔ عکس بندی ایسٹ کوسٹ پر ہو رہی تھی۔ اور وہ دوسری جگہ اپنی عکس بندی میں مصروف تھا۔ ان کے تعلقات میں پختگی آچکی تھی مگر دونوں اپنی مصروفیات کے باعث ایک دوسرے کے ساتھ جی بھر کر وقت نہیں گزار پا رہے تھے۔ تاہم انہیں جب بھی موقع ملتا، وہ اس موقع کو خاص بنالینے میں کوئی کسر نہیں چھوڑتے۔ انہیں تنہائی کی ضرورت محسوس ہوتی تو اس کے لیے ول فریڈل کا ذاتی اپارٹمنٹ موجود تھا۔ جو لو کے گھر سے ذرا فاصلے پر ہی تھا۔ ول وہاں تنہا رہتا تھا۔ جینیفر لو اس کی تنہائی دور کرتے اکثر وہاں پہنچ جاتی اور پھر کچھ سنگین وقت رنگین کرنے کے بعد دونوں میکڈونلڈ ضرور جاتے۔ الا بلا کھانا دونوں کو ہی بے حد مرغوب تھا۔ جینیفر لو بتاتی ہے کہ وہ ہمیشہ میکڈانلڈ کی نمبر دو ویلیو کی چیزیں منگواتے۔ جس میں ہم دونوں کو ایک ایک چیز برگر ملتا۔ کوک میں ہم دونوں حصے داری کرتے اور اس دوران میں تلے ہوئے سارے آلو بھی کھا جاتی تھی۔

آئی نو واٹ یو ڈڈ لاسٹ سمر بے پناہ کامیاب ہوئی، اسکریم۔ اور پھر اسکریم ٹو کی طرح کیون ولیم سن نے اس فلم کے لیے ایسا اسکرپٹ تحریر کیا تھا جس میں حالات وواقعات انتہائی تیزی سے تبدیل ہوتے تھے۔ دیگر ہارر فلموں کے برخلاف اس فلم کے کردار حقیقت سے بہت حد تک قریب تر تھے۔ اس کے علاوہ اس فلم میں دونوں جوان لڑکیوں کو کمزور اور بے بس دکھانے کے بجائے خاصی بہادر اور باہمت دکھایا گیا تھا۔ مثلاً جولی (جینیفر لوہیوٹ) اپنا کمپیوٹر اور دماغ استعمال کرکے جلد ہی پتا لگالیتی ہے کہ قاتل مچھیرا اصل میں کون ہے؟ ہیلن بھی خاصا مقابلہ کرتی ہے۔ پھر ولیم سن نے لطیفوں کے ذریعے فلم میں بہت حد تک مزاح بھی پیدا کردیا تھا۔ خود جینیفر بھی یہ سمجھتی ہے کہ فلم میں بہت سی چیزیں بلاجواز تھیں۔ مگر ناظرین کی نظریں سینما کی اسکرین پر مسلسل جمائے رکھنے کے لیے ان چیزوں کی ضرورت محسوس کی گئی۔ جینیفر اور سارہ مشیل کے سینے نے یہ کام بھرپور انداز میں کیا۔

وجہ کچھ بھی رہی ہو، فلم بے حد کامیاب رہی۔ ریلیز

ہوتے ہی اسکریم کی طرح اس فلم کے بھی چرچے ہونے لگے۔ یہ بات بھی دلچسپی سے خالی نہیں ہے کہ خود اسکریم کی کامیابی نے بہت سوں کو حیرت میں مبتلا کردیا تھا۔ لوگوں اور ناقدین کا خیال تھا کہ اب نوجوانوں کی ہارر فلموں کا دور ختم ہوگیا ہے۔ مگر ذہانت سے تیار ہونے والی ہارر فلم "اسکریم" ایک اچھا تجربہ ثابت ہوئی تھی۔ پھر اس کے بعد "آئی نو واٹ یو ڈڈ لاسٹ سمر" نے بھی باکس آفس پر اکتر ملین ڈالر سے زیادہ بزنس کرکے یہ بات ثابت کردی تھی کہ اچھی کہانی پر مشتمل فلمیں خواہ وہ نوجوان اداکاروں پر ہی مشتمل کیوں نہ ہوں، ضرور کامیاب ہوتی ہیں۔

اس فلم کے حوالے سے پیپل میگزین نے اپنے تبصرے میں لکھا "یہ ایک اچھی فلم ہے مگر اتنی خوف ناک نہیں کہ ہارر فلمیں ناپسند کرنے والوں کو اپنی طرف متوجہ کرسکے۔ البتہ ٹی وی کی "بیب" جینیفر لوہیوٹ اور سارہ مشیل گیلر نے ان مناظر میں لاجواب اداکاری کی جب آہنی ہک ان کے تعاقب میں ہوتا اور وہ دیوانہ وار بھاگ رہی ہوتی تھیں۔"

ورائٹی میگزین نے بھی اس بات سے اتفاق کیا کہ "کہانی کے مرکزی کرداروں نے اپنی حرکات وسکنات سے ایسے افراد کی بھرپور ترجمانی کی جنہیں غیر محفوظ ہونے کے احساس کے ساتھ ساتھ احساسِ جرم پر بھی پریشانی ہے۔ خاص طور پر جینیفر لوہیوٹ اور پرنز کی تعریف نہ کرنا زیادتی ہوگی۔"

میگزین نے یہ رائے بھی دی کہ یہ فلم عام ڈگر سے ہٹ کر ہے۔ اداکاروں نے عمدہ کارکردگی کا مظاہرہ کیا اور فلم میں جابجا تکنیکی مہارت بھی واضح طور پر نظر آتی ہے۔

سب سے اہم بات یہ تھی کہ اس فلم نے جینیفر لوہیوٹ کو راتوں رات فلم انڈسٹری کی سپر اسٹار بنادیا تھا۔ اس سے قبل تک وہ اپنی منزل کی جانب کچھوے کی رفتار سے چل رہی تھی۔ اس کے دامن میں کامیابیوں سے زیادہ ناکامیاں اور تکلیف دہ مایوسیاں نظر آتی تھیں۔ اس فلم سے پہلے تک وہ عرفِ عام میں پارٹی آف فائیو کے حوالے سے بیلی کی محبوبہ سارہ کے نام سے جانی جاتی تھی۔ مگر اس فلم کے بعد اسے ایک بالکل نیا مقام اور نام مل گیا۔ لے کین کے ساتھ ساتھ پوری فلم انڈسٹری نے واضح طور پر اس کی صلاحیتوں کا اعتراف کرلیا تھا۔ لوگوں کو اس کی صلاحیتوں کا واضح طور پر ادراک ہوگیا تھا۔ اس کے بعد تو ہالی وڈ انڈسٹری میں ایک لہر سی اٹھی اور کئی نوجوان اسٹار سامنے آنے لگے۔ گویا جینیفر ٹرینڈ ساز اداکارہ بن گئی تھی۔ اب شائقین فلم نے جانے پہچانے بڑے ناموں کے بجائے نوجوان چہروں اور نئے ناموں کو بھی عزت دینی شروع کردی تھی۔

لو نے ایک ٹی وی انٹرویو میں کہا "میری وجہ سے فلم انڈسٹری میں نوجوان اداکاروں کو متعارف کرانے کی ایک نئی رسم کا آغاز ہوا۔ اس سے پہلے اسّی کی دہائی میں جان ہگز کی ہی ایسی فلمیں آتی تھیں جو نوجوانوں سے متعلق ہوتی تھیں۔ یہ فلمیں مجھے بے حد پسند تھیں۔ ان فلموں میں زیادہ تر مرکزی کردار مولی رنگ والڈ ادا کرتی تھی مگر اب کلیئر ڈینز، لیونارڈو ڈی کیپریو جیسے فنکار راتوں رات اسٹار بننے لگے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ اس طرح ہالی وڈ انڈسٹری میں نیا خون شامل ہو رہا ہے۔ اور ان میں سے ہی ہمیں مستقبل کے ہیرسن فورڈ مل جائیں، ممکن ہے میں مستقبل کی جوڈی فوسٹر ثابت ہوجاؤں۔"

بلاشبہ ان تمام نوجوان فنکاروں میں جینیفر لوہیوٹ سب سے آگے اور سب سے نمایاں تھی۔ وہ جوڈی فوسٹر تو نہیں ہے۔ مگر اس کی اپنی علیحدہ پہچان ضرور بن گئی تھی۔ 1997ء میں ہالی وڈ رپورٹرز نے اسے "پارٹی آف فائیو" میں عمدہ ترین کارکردگی کے باعث بہترین نوجوان اسٹار کا خطاب دیا۔ اس کے فوراً بعد 1998ء میں اس نے نئی اداکارہ کے طور پر بلاک بسٹر انٹرٹینمنٹ ایوارڈ حاصل کرلیا۔ اس کے بعد جی کیو (G.Q) میگزین نے اسے "سلمن بیب" (BABE SLAMIN'S) کا خطاب دیا۔ جب اپنے متعلق یہ رائے جینیفر نے پڑھی تو وہ دیوانی ہوگئی اور پورے گھر میں اِدھر سے اُدھر دوڑتے ہوئے چلّانے لگی تھی۔

اب اس میں کوئی شک نہیں رہا تھا کہ جینیفر لوہیوٹ نے نئی منزلیں سر کرنے کا آغاز کردیا تھا۔ جس مقام کو حاصل کرنے کے لیے وہ اپنی ناکامیوں اور مایوسیوں سے لڑتی آئی تھی، وہ مقام حاصل کرلیا تھا۔

O☆O

خوف ودہشت سے بھرپور موسم گرما اور ایک زبردست سپرہٹ فلم کے بعد جینیفر لوہیوٹ ایک بار پھر پارٹی آف فائیو کے اگلے سیزن کے لیے تیار تھی۔ یہ سیزن بھی حسبِ معمول بے انتہا کامیاب رہا۔ گزشتہ برس کے مقابلے میں اس کی درجہ بندی میں تیئیس فیصد کا اضافہ ہوگیا۔ ابتدائی برسوں کے نشیب وفراز سے گزرنے کے بعد اس سیریز کے فنکار اور دیگر ٹیکنیکل عملہ اب سیریز کی کامیابی پر بہت زیادہ مطمئن ہوگیا تھا۔ انہوں نے کئی سالوں سے اس سیریز کے

www.Paksociety.com

لیے اپنی ساری کشتیاں جلا رکھی تھیں، اپنا سب کچھ اس سیریز میں جھونک رکھا تھا۔ تاہم سیریز کے وفادار شائقین بھی اب سوچنے لگے تھے کہ سیریز کے چوتھے سیزن میں جذباتی ڈراما حد سے بہت زیادہ ہوگیا ہے۔ یہ بات ٹھیک بھی تھی، سیریز کا تقریباً ہر کردار کسی نہ کسی جذباتی بحران کا سامنا کررہا تھا۔ لہٰذا اس سیزن کی آخری قسط کو ذرا مختلف دکھانے کا فیصلہ کیا گیا۔

اصولی طور پر یہ بھی فیصلہ کیا گیا کہ اس سیزن میں سارہ ریوز (جینیفر لو ہیوٹ) کو اسکرین پر زیادہ سے زیادہ مناظر میں پیش کیا جائے گا۔ پہلے جینیفر اس سیریز میں اپنے کردار کی وجہ سے باہر شہرت سمیٹ رہی تھی اور فلموں میں کام حاصل کرنے کے لیے اس سیریز کے کردار کو ترپ کے طور پر استعمال کررہی تھی۔ اب یہی سیریز، فلموں میں اس کی زبردست کامیابی سے فائدہ اُٹھانے کی کوشش میں مگن تھی۔

یہ ایک عجیب اتفاق تھا۔ اور پھر اس دوران میں جینیفر کو دو نئی فلمیں مزید مل گئیں۔ اسے "پارٹی آف فائیو" کے ساتھ ساتھ اب ان فلموں کی عکس بندی بھی کرانا تھی۔ اس کے لیے مشکل ہورہا تھا کہ وہ پارٹی آف فائیو کو پورا وقت دے، مگر اس سیریز سے اس کی وابستگی ایسی تھی کہ وہ فلم کی عکس بندی کے فوراً بعد نیند پوری کیے بغیر ہی سیدھی پارٹی آف فائیو کے سیٹ پر پہنچ جاتی تھی۔ اب وہ اپنے آپ پر جبر کررہی تھی اور آرام کے بغیر کام میں جتی ہوئی تھی۔ اس کی نئی فلم "کانٹ ہارڈلی ویٹ" کی عکس بندی کا کام شروع ہوچکا تھا۔

ابتدا میں اس فلم کا نام "دی پارٹی" تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ ایک دوسری فلم "ٹیلنگ یو" کی عکس بندی بھی شروع ہوگئی۔ یہ وہی فلم تھی جس کی کہانی سے متاثر ہوکر پڑوسی ملک بھارت میں اداکارہ پریتی زنٹا اور سیف علی خان کو لے کر بے مثال فلم "تم سے کہنا تھا" تیار کی گئی۔ اس فلم میں پریتی زنٹا کی اداکاری نے بڑے بڑے ناقدین کو حیرت زدہ کردیا تھا۔

دونوں فلموں کی شوٹنگز اور پھر پارٹی آف فائیو کی مسلسل ریکارڈنگ نے جینیفر کو بُری طرح تھکادیا۔ آخر کار وہ زچ آگئی اور موقع ملتے ہی دو ہفتے کی چھٹیوں پر جزیرہ ہوائی میں آرام کرنے چلی گئی۔ وہاں پہنچ کر وہ یہ بھی بھول گئی کہ وہ کوئی اداکارہ ہے اور اپنے کام سے فرار ہوکر یہاں آئی ہے۔ اس تفریحی دورے پر اس کا محبوب بھی چپکے سے اس کے پاس پہنچ گیا۔

اس تفریحی دورے کے بعد جینیفر لو واپس پلٹی تو اے بی سی ٹیلی وژن نیٹ ورک کا نمائندہ اس کے گھر پر موجود تھا۔

"میڈم، ہم چاہتے ہیں کہ آپ اے بی سی ٹی وی کے ایک خصوصی پروگرام "دی سینٹر بردم" کی میزبانی کریں۔"

جینیفر کے پاس ہامی بھرنے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ پیش کش اتنی عمدہ اور پُرکشش تھی کہ وہ انکار نہ کرسکی۔ اب اس میں کوئی شبہ نہیں رہا تھا کہ وہ نوجوانوں کے دل کی دھڑکن اور ایک زبردست شخصیت بن چکی ہے۔

"دی سینٹر بردم" کے ساتھ ہی "پارٹی آف فائیو" کا اگلا سیزن شروع ہوگیا۔ گزشتہ سیزن اس کے لیے بے حد تھکا دینے والا ثابت ہوا تھا۔ اس کا شیڈول اس قدر سخت تھا کہ اس کے دوران میں مزید کسی مصروفیت کی گنجائش نکل ہی نہیں سکتی تھی۔ اس سیزن کے دوران میں اسے بہت زیادہ جذباتی اداکاری کرنا پڑی تھی۔ جس میں ظاہر ہے زیادہ توانائیوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ جب بارہ اور چودہ گھنٹوں تک مسلسل کام کرنے والے اس سیزن کا اختتام ہوا تو جینیفر لو نے سکون کا سانس لیا۔ فوکس نیٹ ورک کے اس پروگرام کی درجہ بندی میں ہر ہفتے ہی اضافہ ہورہا تھا۔ اس بات سے سب کے ہی حوصلے بلند ہورہے تھے۔ انہیں اپنی محنت کا صلہ ملنے لگا تھا۔ مگر اس کے ناظرین میں اب رفتہ رفتہ ہر عمر کے لوگ شامل ہوتے جارہے تھے۔ اب وہ لوگ بھی "پارٹی آف فائیو" کے نام سے واقف ہوچکے تھے جنہیں یہ پروگرام دیکھنے کا وقت ہی نہیں ملتا تھا۔ اس کا مطلب تھا، پروگرام کی تمام کاسٹ (فنکاروں) نے بھی اپنی شناخت بنالی تھی۔

اب ایسی مشکلات کا آغاز ہوگیا تھا جو صرف اور صرف شہرت کی وجہ سے ہی نصیب میں آتی ہیں۔ اس کے لیے باہر نکلنا، شاپنگ مال اور میکڈانلڈ تک جانا بھی ناممکن ہوگیا تھا۔ لوگ اسے پہچان کر روک لیتے تھے۔ آٹوگراف لینے کے لیے اس کے پیچھے دوڑتے تھے۔ مگر جینیفر لو ان کی کسی بات کا بُرا نہیں مانتی تھی۔ اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ اپنے چاہنے والوں اور شائقین کے بغیر وہ کچھ بھی نہیں ہے۔ انہیں وقت دینا، آٹوگراف دینا اور ان کے ساتھ دوستی کرنا اس پر قرض ہے۔

شہرت کی قیمت بھی چکانا پڑتی ہے۔ اب وہ جس کسی کے ساتھ بھی کھڑی نظر آجاتی، اس کے اگلے دن اس کے ساتھ اس کے خفیہ تعلقات یا محبت کی خبریں شائع ہونا شروع ہوجاتیں۔ ایک اخبار نے اس کی ایک ایسی تصویر شائع کی جس میں وہ منی اسکرٹ پہنے ہوئے تھی۔ تصویر کے نیچے لکھا تھا "جینیفر لو کو یہ اسکرٹ بہت عزیز ہے۔ مگر کسی اچھے کردار کے حصول کے لیے اس اسکرٹ کی اہمیت بے معنی

ہوجاتی ہے۔"

یہ تبصرہ پڑھ کر وہ گھنٹوں روتی رہی۔ اس کی ماں بیٹ ہیوٹ اسے تسلیاں دیتی اور سمجھاتی رہی "رونے کی کوئی بات نہیں ہے لو! یہ فلم انڈسٹری ہے۔ یہاں اس قسم کے واقعات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔"

"مگر میں نے ایسا کیا کیا ہے کہ ایسی گھٹیا باتیں مجھ سے منسوب کی جارہی ہیں؟"

"تم نے ایسا کچھ نہیں کیا۔ مگر جب تم اپنی فلم کے لیے اپنے شائقین کے لیے بہت سی چیزوں پر سمجھوتا کرتی ہو، ان کو خوش کرنے کے لیے ہر دفعہ کچھ نیا پیش کرنے کی کوشش کرتی ہو تو تمہارے لیے یہ جاننا بہت آسان ہوگا کہ اخبارات اور رسائل بھی اپنے پڑھنے والوں کے لیے نیا مسالا پیش کرتے ہیں۔ وہ اسی طرح اپنا کام چلاتے ہیں۔ اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ ایسی باتیں معمولی ہستیوں کے بارے میں کبھی نہیں لکھی جاتیں۔"

جینیفر لو نے آنکھیں جھپکاتے ہوئے کہا "اس کا مطلب ہے میں معمولی ہستی نہیں ہوں؟"

"ہاں!" اس کی ماں نے پیار سے اس کے بالوں میں ہاتھ پھیرا "غیر معمولی اور بڑے لوگ ہی خبروں کا موضوع بنتے ہیں۔ اب تم بڑی اسٹار بن گئی ہو، ایسی چھوٹی باتیں تمہیں نظرانداز کرنا ہوں گی۔"

بات جینیفر لو کی سمجھ میں آگئی، اس دن کے بعد سے اس نے پریس کے ریمارکس اور چٹ پٹی خبروں پر رونا اور پریشان ہونا چھوڑدیا۔ اخبارات بھی خاموش ہونا شروع ہوگئے۔ اس کی زندگی میں کوئی دھماکا خیز اسکینڈل نہیں تھا۔ وہ ایک وقت میں ایک محبت کی قائل تھی۔ اس کی محبت اور جنون صرف اور صرف ول فریڈل تھا۔ اور یہ بات کسی سے بھی ڈھکی چھپی نہیں رہی تھی۔ وہ لاس اینجلس کی سڑکوں پر اور کونوں کھدروں میں بھی کسی دکھائی نہیں دیتی تھی۔ کسی نے اسے بار میں شراب پی کر مدہوش ہوتے اور سب کے سامنے کپڑے اُتارتے ہوئے بھی نہیں دیکھا تھا۔ وہ دیگر مردوں سے بھی حتی الامکان طور پر دور رہنے کی کوشش کرتی تھی۔ اس کی زندگی اس کے کام، گھر اور ول فریڈل کے گرد گھوم رہی تھی۔ وہ جتنا کام کرتی، اتنا ہی کام اسے مزید مل جاتا۔ اور کام اس کے لیے نشے کی حیثیت رکھتا تھا۔ اسے اپنے کام سے عشق تھا اور۔۔۔ نیند۔ اب اس کی ضرورت نہیں رہی تھی محض شوق بن گئی تھی۔ وہ اپنا یہ شوق آسانی سے پورا کرلیتی تھی۔ کبھی اپنے گھر میں اور کبھی ول فریڈل کے اپارٹمنٹ میں۔

○☆○

پارٹی آف فائیو کے اگلے سیزن کی ریکارڈنگ شروع ہوئی تو اس کی اگلی فلم "کانٹ ہارڈلی ویٹ" (CAN'T HARDLY WAIT) کی شوٹنگز بھی شروع ہوگئیں۔ اب اس کے پاس ایک سیکنڈ کا بھی وقت نہیں بچا تھا۔ ایک بار اس کا وہی معمول شروع ہوگیا۔ پارٹی آف فائیو کے سیٹ سے کانٹ ہارڈلی ویٹ کے سیٹ تک وہ کار میں ہی اپنی نیند پوری کرنے لگی۔ وہ سردست کسی نئی فلم میں کام نہیں کرنا چاہتی تھی مگر کانٹ ہارڈلی ویٹ میں اس کو دیا جانے والا امانڈا کا کردار ایسا جاندار تھا کہ وہ انکار نہ کرسکی۔ اس فلم میں وہ مکمل طور پر ایک چیئر لیڈر (CHEAR LEADER) تھی۔ یہ فلم بنیادی طور پر جان ہگس کی فلموں سے متاثر ہوکر بنائی جارہی تھی۔ جینیفر کو تو جان ہگس کی فلمیں شروع سے ہی پسند تھیں، لہٰذا اس نے فوراً۔۔۔ ہامی بھرلی اس کا کہنا ہے کہ اس دور میں رومانوی فلموں کی تعداد کم ہونے لگی تھی اور اس فلم میں پیش کی جانے والی محبت اس قدر مسحور کن اور تاثر انگیز تھی کہ مجھے کہانی فوراً پسند آگئی۔"

بے پناہ مصروفیت کے باعث اسے متعدد پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑا۔ مگر یہ فلم اس کے لیے بہترین تجربہ ثابت ہوئی۔ وہ ایک ایسی لڑکی کا کردار کررہی تھی جو خود اس کے خوابوں میں بسنے والی شہزادی تھی۔ بے عیب میک اپ، بہترین لباس، وہ کوئی عام سی لڑکی نہیں تھی اور جینیفر کوئی ایسا کردار ہمیشہ سے کرنے کی خواہش مند تھی جس میں وہ عام سی امریکن لڑکی سے ذرا مختلف نظر آئے۔

پہلے اس فلم کا نام "دی پارٹی" تھا۔ اس کی کہانی ڈیبورا کپلان اور ہیری ایل فونسٹ نے لکھی تھی۔ اور ہدایت کار بھی وہی تھے۔ اس سے پہلے وہ دونوں ایک فلم "اے ویری بریڈی سیکوئل" لکھ چکے تھے۔ اس فلم کا مرکزی خیال بھی اسی کی دہائی فلموں سے لیا گیا تھا۔

اس فلم کے ذریعے جینیفر نے وہ تجربہ بھی حاصل کیا جس سے وہ محروم تھی۔ یعنی ہائی اسکول کی پارٹیوں میں شرکت کا تجربہ، وہ اپنی مصروفیات کے سبب اپنے اسکول کی کسی تقریب میں شرکت نہیں کرسکی تھی۔ مگر وہ جانتی تھی کہ یہ تقریبات دراصل تعلیم کا حصہ ہوتی ہیں۔ ان کے ذریعے ہائی اسکول کے طلبا و طالبات کو سماجی تربیت دی جاتی ہے۔

"کانٹ ہارڈلی ویٹ" کی کہانی میں ایک انوکھا پن تھا۔

کہانی کچھ یوں شروع ہوتی ہے کہ ہیمنگٹن ہائی اسکول کی کلاس نے جونہی گریجویشن کیا۔ ہر شخص چند اہم کاموں میں مصروف ہوگیا۔ سب کے لیے وہ تقریب بہت اہم تھی جو چار سالہ تعلیم کے بعد رات کو منعقد کی جارہی تھی۔ امانڈا بیکٹ (جینیفر لوہیوٹ) کے لیے اس تقریب میں مزے داری اور لطف کی کوئی بات نہ تھی کیونکہ گریجویشن کے فوراً بعد اس کے محبوب مائیک نے اس سے قطع تعلق کرلیا تھا۔ اس واقعہ نے اسکول کے ہر لڑکے اور لڑکی کو حیرت زدہ کردیا۔ کچھ لوگوں کو اس علیحدگی سے خوشی بھی ہوئی' اس کا محبوب مائیک دراصل صرف ایک عورت کی محبت سے آزاد ہوکر کالج کی ہر لڑکی سے عشق کرنا چاہتا تھا اور پھر امانڈا کے کزن رون نے مائیک کو سمجھایا کہ حقیقت اس کے تصور سے مختلف ہے اور کالج کی لڑکیاں اسے گھاس بھی نہیں ڈالیں گی۔

اسی اسکول میں پریسٹن نامی ایک شرمیلا سا لڑکا بھی پڑھتا تھا۔ وہ ایک لکھاری بھی تھا اور شروع دن سے امانڈا کی محبت میں گرفتار تھا۔ مگر اس کی یہ محبت قطعی طور پر یک طرفہ تھی۔ اس میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ وہ اپنی محبوبہ کے سامنے اپنے دل کا حال بیان کرسکتا۔ تقریب کے بعد وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اپنی محبوبہ سے جدا ہونے والا تھا۔ آج رات آخری موقع تھا۔ وہ اس موقع سے فائدہ اُٹھاکر اپنی محبوبہ کے سامنے دل کھول کر رکھ دینے کا فیصلہ کرچکا تھا۔ آخر بہت سوچ بچار کے بعد اس نے امانڈا کے نام ایک خط لکھا اور وہ امانڈا کے ہاتھ میں دے دیا۔ مگر مشکل یہ تھی کہ اس وقت امانڈا ایک شدید جذباتی بحران سے گزر رہی تھی۔ وہ دنیا میں صرف اور صرف مائیک سے ہی محبت کرتی تھی۔ مگر اب وہ اس سے علیحدہ ہوکر لوگوں کے درمیان تنہا کھڑی تھی۔

امانڈا اور شرمیلا پریسٹن ایک دوسرے کی ضد تھے۔ وہ ایک شرمیلا لڑکا تھا۔ جبکہ امانڈا شمع محفل اور نوجوان لڑکیوں کی ملکہ' ان دونوں کا ملاپ مشکل تھا مگر کہانی کار نے ان دونوں کو ہی کہانی کا مرکز بنایا تھا۔ امانڈا کسی اور سے محبت کرتی تھی' وہ سچی محبت کی طلب گار تھی جبکہ پریسٹن اس پر دل وجان سے فدا تھا۔ کسی کو بھی ان کی جوڑی مناسب محسوس نہیں ہوتی۔ مگر فلم کی کہانی آگے بڑھنے کے ساتھ ساتھ وہ دونوں ایک دوسرے کے نزدیک آتے چلے گئے۔ اور جلد ہی امانڈا کو بھی ادراک ہوگیا کہ سراب کے پیچھے بھاگنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ سائے کبھی ہاتھ نہیں آتے۔"

کانٹ ہارڈلی ویٹ شائقین فلم کو زیادہ پسند نہیں آئی۔ جوان لڑکے' لڑکیوں کے لیے اس فلم میں پیش کیے واقعات نئے نہیں تھے۔ کہانی ضرور انوکھی تھی مگر واقعات پرانے لہٰذا فلم جزوی طور پر کامیاب کہلائی۔ البتہ جینیفر لوہیوٹ کو سب نے ہی پسند کیا۔ اس فلم میں وہ ہمیشہ سے زیادہ خوبصورت اور پُرکشش دکھائی دی اور یہی جینیفر چاہتی تھی۔ اپنے پہلے ہی ہفتے میں کانٹ ہارڈلی ویٹ نے باکس آفس پر آٹھ ملین ڈالر کمائے جبکہ فلم پر مجموعی طور پر دس ملین ڈالر لاگت آئی تھی۔ دو ماہ کے دوران میں اس فلم نے مجموعی طور پر چوبیس ملین ڈالر کمائے۔

O*O

ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ "پارٹی آف فائیو" کی ریکارڈنگ کے دوران میں ہی ایک فلم مکمل کرالینے کے بعد جینیفر لوہیوٹ تھوڑا وقفہ لیتی اور خود کو کچھ آرام کرنے پر آمادہ کرلیتی۔ مگر اب یہ نہ اس کی قسمت میں تھا اور نہ کوئی اسے ایسا موقع دینے پر تیار تھا۔ اب وہ شہرت کی بلندیوں پر تھی' اس کی ڈیمانڈ میں بہت زیادہ اضافہ ہوچکا تھا اور اس پر اس انداز میں آفرز کی بھرمار ہورہی تھی جیسے شدید بارش میں پانی کے قطرے تواتر سے زمین پر گرتے ہیں۔

اس کی اگلی فلم "ٹیلنگ یو" کی عکس بندی شروع ہوگئی۔ ساتھ ساتھ پارٹی آف فائیو کی ریکارڈنگ جاری تھی' فلم کی عکس بندی مکمل ہوئی تو کرسمس کے موقع پر اسے چند دنوں کا وقفہ ملا۔ موقع غنیمت جان کر وہ چھٹیاں گزارنے جزیرہ ہوائی چلی گئی اور جیسے ہی چھٹیاں گزار کر واپس آئی' ایک بار پھر "پارٹی آف فائیو" اور ایک نئی فلم کے گھن چکر میں گھومنے لگی۔ ٹیلنگ یو 1998ء کے موسم گرما میں نمائش کے لیے پیش ہونا تھی۔

کام کا ایسا شدید دباؤ اچھے اچھوں کی سٹی گم کردیتا ہے۔ جسمانی طور پر توڑ پھوڑ کر رکھ دیتا ہے' مگر لو یہ سب کچھ برداشت کررہی تھی۔ اسی دن کے لیے تو وہ ایسی زبردست جدوجہد کرتی آئی تھی۔ اب ایک اور چیز اس کے ذہن میں کلبلانے لگی تھی۔ وہ اپنے پیسے سے ایک فلم پروڈیوس کرنے کا سوچ رہی تھی۔ اس کے ذہن میں ایک زبردست کہانی گردش کرنے لگی تھی۔ اس نے اس فلم کا نام بھی رکھ لیا تھا۔ "کیوپڈز لو" اس فلم کی کہانی اس کے ایک خواب پر مشتمل تھی۔

ایک صبح وہ پُرسکون نیند کے بعد بیدار ہوئی تو وہ ایک حسین سپنا دیکھ چکی تھی۔ چند لمحوں تک تو اسے خواب یاد نہ آیا مگر جب تھوڑی دیر میں رفتہ رفتہ خواب کے خدوخال

واضح ہونے لگے تو وہ اُچھل پڑی اور چلاّ کر بولی "اوہ! میرے خدا۔۔ یہ تو مکمل کہانی ہے۔ اس پر تو شاندار فلم بن سکتی ہے۔"

اس روز وہ جہاز میں سفر کے دوران میں اس خواب پر مشتمل کہانی کو حتمی شکل دے رہی تھی۔ جہاز میں سفر کے دوران میں ہی اس نے فلم کا نام "کیوپڈز لو" (CUPID'S LOVE) طے کرلیا۔

یہ ایک جوان عورت کی کہانی تھی جو شادیاں کرانے کا کام کرتی تھی۔ اس نے ایک نوجوان کی شادی طے کرائی تو خود ہی اس کی محبت میں بھی مبتلا ہوگئی۔

دوسرے دن گھر پہنچتے ہی وہ اپنی ماں کے گلے لگ گئی۔ اس کا بھائی ٹوڈ ہیوٹ بھی اپنی تعلیم مکمل کرکے ان کے پاس آچکا تھا۔ جینیفر نے اپنی کہانی انہیں سناڈالی۔ دونوں بہت خوش ہوئے اور فیصلہ کیا گیا کہ اس کہانی پر فلم ضرور بنائیں گے۔

اگلے ہی دن جینیفر نے اپنی کہانی کا آئیڈیا اور عنوان' رائٹرز گلڈ میں رجسٹر کرالیا تاکہ کوئی اسے چُرا نہ سکے۔ چند دنوں بعد لو کی ملاقات اپنے چند ایسے دوستوں سے ہوئی جن کا تعلق بھی شوبزنس سے تھا۔ وہ ایک فلم بنانے کا سوچ رہے تھے اور کسی اچھے موقع کی تلاش میں تھے۔ جینیفر لو نے ان سے پُرجوش لہجے میں کہا "کیسی شاندار بات ہے کہ میرے ذہن میں ایک بالکل نئی کہانی آئی ہے۔ کیا آپ لوگ پسند کریں گے کہ میں یہ کہانی آپ کو سناؤں؟"

وہ ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے "کیا واقعی؟"

"ہاں! اگرچہ مجھے کہانی لکھنے یا فلم بنانے کی ضرورت تو نہیں ہے۔ میں اس کام میں ابھی اناڑی ہوں' اس بات سے بھی ناواقف ہوں کہ اچھی کہانی کیا ہوتی ہے؟ اور آیا کہ میری کہانی پر فلم بن بھی سکتی ہے یا نہیں مگر میں چاہتی ہوں کہ آپ لوگ میری کہانی سن لیں اور مجھے بتائیں کہ یہ آپ کو پسند آئی ہے یا نہیں؟"

وہ بولے "ٹھیک ہے' اس میں کوئی مضائقہ نہیں۔ تم ہمیں کہانی سناؤ' ممکن ہے ہم تمہیں کوئی بہتر مشورہ دینے میں کامیاب ہوجائیں۔"

جینیفر نے گلا کھنکارا اور اپنی کہانی سنانا شروع کردی۔ وہ سب خاموشی سے اس کی طرف دیکھتے رہے اور حیرت سے اس کی کہانی سنتے رہے۔ جب جینیفر خاموش ہوئی تو وہ بے ساختہ بولے "بہت خوب۔۔ یہ تو بہت عمدہ کہانی ہے' ہم اس پر فلم بنانے کی کوشش ضرور کریں گے۔"

اس طرح "کیوپڈز لو" کے منصوبے کی داغ بیل ڈال دی گئی۔ مگر زیادہ تر ذمے داریاں جینیفر لو کے ہی ذمے تھیں۔ اسٹوڈیوز وغیرہ سے بھی اسے ہی بات کرنا تھی کیونکہ وہ اس فلم کی نہ صرف مصنفہ تھی بلکہ فلم ساز بھی تھی اور یقینی طور پر مرکزی اداکارہ بھی اسی کو ہونا تھا۔

فلم سازی کا خیال ذہن میں آتے ہی اس کا انداز تبدیل ہوگیا۔ اس نے فلم ساز کا روپ دھارنے کا فیصلہ کیا تو بہترین تراش خراش کا سوٹ زیب تن کیا اور آنکھوں پر ایسی عینک بھی لگالی جس سے وہ کسی حد تک سنجیدہ نظر آسکتی تھی حالانکہ اس کام کے لیے عینک کی قطعاً ضرورت نہیں تھی۔

ایک جریدے کی صحافی نے عینک لگانے اور وضع قطع تبدیل کرنے کے بارے میں پوچھا تو جینیفر لو نے مسکراتے ہوئے جواب دیا "میں ایک اداکارہ ہوں اور یہ بات اچھی طرح جانتی ہوں کہ کس کردار میں کس قسم کا گیٹ اپ ہونا چاہیے اور کس قسم کا رویہ اپنانا چاہیے۔ میں چاہتی ہوں کہ اسٹوڈیوز کے لوگ مجھے سنجیدگی سے لیں اور اس لیے میں سنجیدہ دکھائی دینا چاہتی ہوں۔"

جینیفر نے اپنے نئے کام کے لیے بے پناہ محنت کی' اس کام میں اس کا خاصا وقت صرف ہوا' اس کے اعصاب جھنجھنا اُٹھے۔ مگر اس کی جدوجہد رنگ لائی۔ وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہوگئی۔ اس نے کافی رقم حاصل کرلی۔ نیولائن سنیما کے ادارے نے فلم کی ٹریٹمنٹ کے لیے اسے پانچ لاکھ ڈالر ادا کردیے۔ اس فلم میں اداکاری کرنے کا معاوضہ اسے علیحدہ ملنا تھا۔ فیصلہ ہوا کہ 1998ء کے موسم گرما میں اس فلم کی شوٹنگ شروع ہوگی اور فلم کے کریڈٹ پر بہ طور پروڈیوسر اس کا نام بھی جائے گا۔

فلم سازی کی طرف توجہ مبذول ہونے کے باعث جرائد ورسائل میں اس طرح کی باتیں شائع ہونے لگیں کہ جینیفر اب اداکاری سے تھک کر بےزار ہوگئی ہے۔ جبکہ حقیقت یہ نہیں تھی دراصل وہ اپنے آپ کو اپنی ذات کو کھوج رہی تھی۔ اس طرح وہ ساتھ ساتھ نئی منزلیں بھی سر کرتی جارہی تھی۔ جب پارٹی آف فائیو کا نیا سیزن ختم ہوا تو اس کے ہاتھ میں ایک اور سپرہٹ فلم آگئی' وہ گزشتہ ہٹ فلم "آئی نو واٹ یو ڈڈ لاسٹ سمر" کا دوسرا حصہ تھی اور اس کا نام یقینی طور پر "آئی اسٹل نو واٹ یو ڈڈ لاسٹ سمر" رکھا گیا تھا۔ باکس آفس پر ایک اور بڑی ہٹ فلم' جس کے بعد اس امر میں کوئی شبہ نہیں رہا کہ وہ ایک بڑی اسٹار کے طور پر اپنا آپ منوا چکی ہے۔

www.Paksociety.com

"آئی اسٹل نو واٹ یو ڈو لاسٹ سمر" کی عکس بندی کا کام 20 اپریل 1998ء میں شروع ہوا۔ جینیفر لو اس فلم میں پہلی فلم کی طرح جولی کا ہی کردار ادا کررہی تھی۔ جبکہ اس کے علاوہ گزشتہ فلم کے اداکاروں میں سے صرف ایک اور اداکار فریڈی پرنز جونئر کو لیا گیا تھا۔ اسے رے کا کردار ادا کرنا تھا۔ اس کے علاوہ ٹی وی کے ہٹ پروگرام "موئشا" کے اداکار برانڈی کو بھی نئی فلم میں شامل کیا گیا تھا۔ البتہ اس فلم کا مصنف اب کیون ولیم سن نہ تھا۔ کیون ولیم سن اب معروف ترین کہانی نویس بن گیا تھا۔ وہ بہ یک وقت چالیس دوسری فلمیں لکھ رہا تھا۔ تاہم دوسرے حصے کا بھی مرکزی خیال اس نے ہی لکھا تھا۔ جب پہلا حصہ مکمل ہوا تھا تو اسی وقت کیون ولیم سن نے دوسرے حصے کی ٹریٹمنٹ لکھ ڈالی تھی۔

آئی اسٹل نو واٹ یو ڈو لاسٹ سمر کے زیادہ تر واقعات کا تعلق جزائر بہاماز سے تھا۔ مگر اخراجات میں بچت کی خاطر فیصلہ کیا گیا تھا کہ تمام تر عکس بندی بہاماز کے بجائے میکسیکو میں ہی کی جائے گی۔ جینیفر کو یہ فلم پہلے حصے سے یکسر مختلف محسوس ہوئی۔ یہ بے حد خوف زدہ کردینے والی فلم تھی۔ اس کا اسکرپٹ بھی پہلے سے کہیں زیادہ بھیانک تھا۔ جب جینیفر لو نے اسکرپٹ پڑھا تو وہ اتنی دہشت زدہ ہوئی کہ اس رات اپنی ماں بیٹ ہیوٹ کے ساتھ اس کے بستر پر سوئی۔

جینیفر لو نہیں چاہتی تھی کہ وہ اس فلم میں پہلی کی جیسی دکھائی نہ دے۔ اب اس کے کردار کی عمر بھی نسبتاً زیادہ ہوچکی تھی۔ اس فلم کا آغاز وہیں سے ہوا تھا جہاں پہلی فلم ختم ہوئی تھی۔ فلم کی شوٹنگ بھی پہلے حصے کی طرح ثابت ہوئی۔ جینیفر لو جب گھر واپس آتی تو اکثر و بیشتر اس کے جسم پر خراشیں اور ناخنوں میں نقلی خون بھرا ہوتا تھا۔

آئی اسٹل نو واٹ یو ڈو لاسٹ سمر بھی خاصی ہٹ فلم ثابت ہوگئی۔ باکس آفس پر اس فلم نے تہلکہ مچادیا اور اس کے ساتھ ہی ہالی وڈ میں خوف ناک فلمیں مسلسل بننے کا ایسا سلسلہ شروع ہوا کہ اب بھی یہ بھیڑ چال رکنے کا نام نہیں لے رہی ہے۔

جینیفر لو ہیوٹ نے اس کے بعد پیچھے مڑکر نہیں دیکھا۔ اگرچہ اس کی کئی فلمیں ناکام ہوگئیں مگر وہ اب اسٹارز میں شامل ہوگئی تھی اور دو چار فلموں کی ناکامی سے کسی اسٹار پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔

حال ہی میں جینیفر لو ہیوٹ کی بالکل نئی فلم "ٹکسیڈو" (TUXEDO) منظرِ عام پر آئی ہے۔ اس فلم میں وہ کنگ فو کنگ اور ایکشن کامیڈی کے بادشاہ جیکی چن کے ساتھ کراٹے لڑتی اور ایکشن بکھیرتی نظر آرہی ہے۔ اس فلم کی ابتدائی رپورٹ بہت اچھی ہے۔ ٹکسیڈو کی خاص بات یہ ہے کہ اس فلم میں جیکی چن نے پہلی مرتبہ کسی فلم میں باقاعدہ طور پر رقص بھی کیا ہے اور یہ رقص اسے جینیفر لو ہیوٹ نے ہی سکھایا ہے۔ وہ بہت عمدہ اور باکمال رقاصہ ہے۔ اس کے بدلے میں جیکی چن نے اسے ایکشن کی تربیت دی ہے۔ کراٹے اور مارشل آرٹس کے ابتدائی ایکشن سکھائے ہیں۔

جب جینیفر لو ہیوٹ کو یہ معلوم ہوا کہ وہ اپنی نئی فلم "ٹکسیڈو" میں ایکشن کنگ جیکی چن کے ساتھ مارشل آرٹس کے مظاہرے کرتی اور لڑتی بھڑتی نظر آئے گی تو اس نے فوری طور پر کراٹے کی تربیت لینے کے لیے ماہرین سے رجوع کرلیا اور جلد ہی ابتدائی مشقوں کے بعد وہ اس قابل ہوگئی کہ ایکشن مناظر آسانی سے عکس بند کراسکتی تھی۔ کراٹے کی ابتدائی مشقیں سیکھ لینا اس کے لیے آسان یوں بھی ثابت ہوا کہ وہ باکمال رقاصہ ہے اور اس کے جسم میں موجود لچک کراٹے سیکھنے میں اس کے بہت کام آئی۔

جینیفر بتاتی ہے "ٹکسیڈو میری حیرت انگیز فلم ہے۔ اس فلم میں، میں نے جیکی چن کے ساتھ جتنے بھی ایکشن مناظر عکس بند کرائے ہیں، اس کی باقاعدہ عملی مشق کرتی تھی اور اس مشق میں جیکی چن میری بہت مدد کرتا تھا۔ اگر جیکی چن میری اتنی مدد نہ کرتا تو شاید میں مار دھاڑ کے تکنیکی مناظر اتنی آسانی سے مکمل نہ کرواپاتی۔ میرے لیے یہ سب کچھ بہت انوکھا اور پُرجوش کردینے والا تھا۔ میں نے کبھی خواب میں بھی نہیں سوچا تھا کہ میں کسی دن جیکی چن کے ساتھ بھی کام کروں گی اور اداکاری کے بجائے ٹانگیں چلاتی نظر آؤں گی۔ جیکی چن ہمیشہ سے ہی میرا پسندیدہ ہیرو رہا ہے۔ بروس لی کے بعد جیکی چن سے بڑا مارشل آرٹ ہیرو فلمی دنیا کو نصیب نہیں ہوا۔ میں بروس لی اور جیکی چن کی فلمیں دیکھتے ہوئے بڑی ہوئی ہوں اور ایکشن کے لحاظ سے جیکی چن میرا پسندیدہ ترین ہیرو ہے۔"

"جیکی چن کے ساتھ کسی فلم میں کام کرنا میرے لیے ایسا ہی تجربہ ثابت ہوا جیسے کسی چار سالہ بچی کو یہ موقع مل جائے کہ وہ اپنے سپر ہیرو کے ساتھ کچھ دن ہنستے کھیلتے بھاگتے دوڑتے گزارے۔ یہ میری پہلی فلم ہے جس میں مجھے جیکی چن کی طرح پہلی مرتبہ لڑنے بھڑنے اور بھاگنے دوڑنے کا موقع ملا ہے۔ میں بہت زیادہ پُرجوش ہونے کے ساتھ ساتھ خوف زدہ بھی تھی اور خود کو خوش قسمت سمجھ رہی تھی کہ

مجھے جیکی کے ساتھ کام کرنے کا موقع ملا۔

ٹکسیڈو میں جیکی چن ایک ڈرائیور کے کردار میں سامنے آرہا ہے۔ جمی ٹونگ نام کا ڈرائیور جو ایک پلے بوائے قسم کے کروڑپتی کے پاس ملازم ہوجاتا ہے۔ کروڑپتی پلے بوائے کلارک ڈیولن (جیسن آئزک) ایک ایسی ٹکسیڈو (جیکٹ) کا مالک ہے جس کو پہنتے ہی اس کو عجیب و غریب قسم کی پُراسرار قوتیں حاصل ہوجاتی ہیں۔ ایک دن ڈیولن پر حملہ ہوگیا اور اس سے پہلے کہ وہ ہلاک ہوجاتا، عین اسی موقع پر ٹونگ (جیکی چن) میدان عمل میں آگیا۔ وہ ایک ایسی خوف ناک دنیا میں گھر گیا تھا جہاں ہاتھیوں کی لڑائی ہورہی تھی۔ ایسے میں اس کی ملاقات ایک بے حد حسین و جمیل اور جاذب نظر لڑکی ڈیلی بلینی (جینیفر لو ہیوٹ) سے ہوگئی۔ وہ ایک قسم کی جاسوس تھی اور ٹونگ (جیکی چن) کے مقابلے میں ہر طرح سے بہت زیادہ ناتجربہ کار اور اس کے بعد پوری فلم میں جیکی چن کی مخصوص فلموں کی طرح مار دھاڑ اور ہنگامے شروع ہوگئے۔

جینیفر لو ہیوٹ کے لیے یہ فلم انوکھا تجربہ ثابت ہوئی۔ شوٹنگ کے دوران میں وہ اس طرح کی حرکتیں کرتے تھے گویا پکنک پر آئے ہوئے ہوں، قہقہے، شرارتیں، نغمے، ٹھٹھے۔ سب ہی کچھ تو تھا سیٹ پر۔ جیکی چن اس کے ایکشن مناظر میں اس کی مدد کررہا تھا تو وہ رقص کے مناظر میں جیکی چن کو بہت کچھ سکھا رہی تھی۔ ایکشن مناظر کی عکس بندی کے دوران میں جینیفر لو کئی مرتبہ پھسل گئی، متعدد بار بلندی سے نیچے گرگئی لیکن اس کی پیشگی تربیت نے اس کے نازک بدن کو خطرناک زخموں اور ٹوٹ پھوٹ سے بچالیا۔

ایک روز جیکی چن اور جینیفر کے درمیان لڑائی کا منظر عکس بند ہورہا تھا۔ جینیفر بہت عمدہ کارکردگی کا مظاہرہ کررہی تھی اور پھر ایکشن اشارے اندازے کی ذرا سی غلطی ہوئی تو جینیفر کی تیز رفتار راؤنڈ کک جیکی چن کی ناک پر لگ گئی۔ جیکی کی ناک سے خون بہہ نکلا، جینیفر بری طرح گھبراگئی۔ مگر جیکی کے لیے یہ عام سی بات تھی۔ وہ اپنی فلموں کی شوٹنگز کے دوران میں متعدد بار سنگین حادثات سے دوچار ہوتا رہا تھا۔ جینیفر کی کک سے اس کا کیا بگڑنے والا تھا۔ اس فلم کی عکس بندی کے دوران میں بھی اس نے اپنے زخم زخم بدن پر کئی نئے گھاؤ لگالیے تھے۔

ایکشن فلموں میں زخمی ہوجانا معمول کا حصہ گردانا جاتا ہے۔ جینیفر لو خوف ناک فلموں میں بھی زخمی ہوتی چلی آئی تھی۔ یہ کیسے ممکن تھا کہ وہ جیکی چن کے ساتھ ایکشن فلم میں کام کررہی ہو اور اس کا خوب صورت جسم زخموں سے بچ جائے۔ وہ کئی زخموں کا شکار ہوئی، ایک منظر کی عکس بندی کے دوران میں حملہ آوروں سے لڑتے ہوئے وہ دیوانی ہوگئی تھی اور بڑھ چڑھ کر حملہ آوروں پر وار کررہی تھی۔ پھر ایک حملہ آور نے جوابی وار کیا۔ جینیفر نے اس کا وار ہاتھ پر روکا، حملہ آور نے لکڑی ماری، جینیفر نے بوکھلا کر دوسرا ہاتھ آگے کردیا۔ لکڑی اس کی انگلی پر لگی، ہلکی سی آواز پیدا ہوئی اور جینیفر کے حلق سے چیخ نکل گئی۔ اس کی درمیانی انگلی ٹوٹ گئی تھی مگر اس نے برداشت کرلینے میں عافیت جانی۔ شرمندگی کے مارے اس نے یہ بات کسی کو نہیں بتائی اور خود پر جبر کرتی رہی، انگلی میں درد کی ٹیسیں اٹھ رہی تھیں، وہ برداشت کرتی رہی۔ مگر کب تک ــــ برداشت کی ایک حد ہوتی ہے، درد اس کی برداشت سے باہر ہوتا چلا جارہا تھا۔ وہ بہرطور لڑکی تھی، لہٰذا اس نے یکلخت نازک اندام لڑکیوں کی طرح چلانا اور رونا شروع کردیا۔ تب اس کی انگلی پر پٹی باندھی گئی۔ ایکسرے کرایا گیا اور ایک ہفتے تک مسلسل علاج ہوتا رہا۔

جب وہ واپس آئی تو اس واقعے کو بھول چکی تھی مگر بدقسمتی اسے بھولنے پر آمادہ نہیں تھی، اس روز شوٹنگ کے دوران میں ایک فائٹر نے غلطی سے اس کے چہرے پر زبردست ضرب لگادی۔ اس کی کھوپڑی گھوم کر رہ گئی۔ شکر ہے چوٹ زیادہ نہیں لگی تھی۔

یہ سنسنی خیز اور ایکشن سے بھرپور فلم ان دنوں دنیا بھر میں سینماؤں پر دکھائی جارہی ہے اور کئی مقامات پر شان دار بزنس بھی کررہی ہے۔

آئی اسٹل نو واٹ یو ڈو لاسٹ سمر اور ٹکسیڈو کے درمیان جینیفر نے اتنا زیادہ کام کیا کہ دوسری اداکارائیں دس سال میں بھی اتنا کام حاصل کرنے میں ناکام ہوجاتی ہیں۔ جب بھی اس کی کوئی فلم ریلیز ہوتی ہے، ہالی وڈ میں سٹوں کے اڈوں پر بڑی بڑی شرطیں لگ جاتی ہیں۔ اکثر کا خیال یہی ہوتا ہے کہ جینیفر کی یہ فلم زبردست کامیابی سے ہم کنار ہوگی۔

قارئین توجہ دیں

قرآنِ حکیم کی مقدس آیات و احادیث نبوی آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور تبلیغ کے لیے شائع کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے۔ لہٰذا جن صفحات پر آیات اور احادیث درج ہوں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بے حرمتی سے محفوظ رکھیں۔

1999ء میں اس نوجوان اور خوبرو اداکارہ نے اپنی ذاتی فلم اینڈ ٹی وی پروڈکشن کمپنی قائم کرلی۔ یہ واحد موضوع ہے جس کے بارے میں وہ کہیں بات کرتی نظر نہیں آتی۔ اس کی پروڈکشن کمپنی کے زیرِ تحت بننے والی پہلی سیریز "ٹائم آف یور لائف" بہت زیادہ کامیابی سے ہم کنار نہیں ہوسکی۔ حالانکہ فلمی پنڈتوں کا خیال تھا کہ یہ سیریز "پارٹی آف فائیو" کی طرح یادگار ترین ثابت ہوگی مگر ایسا نہ ہوسکا۔

ٹائم آف یور لائف کامیاب تو ثابت ہوئی مگر ایسی نہیں جیسی کی توقعات تھیں۔

اس کے بعد جینیفر نے اپنی پروڈکشن کے تحت "دی آڈرے ہیپ برن اسٹوری" میں کام کیا اور اس فلم نے ثابت کردیا کہ وہ باکمال بن گئی ہے۔ یہ فلم نہ صرف سنیما پر سپرہٹ ثابت ہوئی بلکہ جہاں جہاں بھی مقابلوں میں بھیجی گئی، وہاں سے تعریفی اسناد لے کر واپس آئی۔

2001ء میں جینیفر لوہیوٹ نے ایک بار پھر باکس آفس پر اپنا جادو جگایا۔ اور ماں بیٹی کے تعلقات، مسائل اور جذباتی وابستگی پر مشتمل فلم "ہرٹ بریکر" کے ذریعے تہلکہ مچادیا۔ اس فلم میں وہ ہالی ووڈ کی باکمال اداکارہ سیگورنی ویورز جین ہاکمین کے سامنے جم کر لازوال اداکاری پیش کرنے میں کامیاب رہی۔

اس کے بعد ہدایت کار ایلیس بالڈون (ALIC BALOWIN) کی فلم "ڈیول اینڈ ڈینئل ویلسٹر" میں اسے شیطان کے کردار میں کاسٹ کیا گیا تو تب بھی آسکر ایوارڈ یافتہ اداکار انتھونی ہاپکنز کے سامنے اس نے ایسی بے ساختہ اداکاری کا مظاہرہ کیا کہ سر انتھونی ہاپکنز نے بے اختیار اسے گلے سے لگالیا اور باصلاحیت بچی کہہ کر پکارنا شروع کردیا۔ جینیفر کہتی ہے کہ سر انتھونی ہاپکنز کے منہ سے ادا ہونے والے یہ الفاظ میرے لیے اعزاز ہیں۔

O☆O

اب وہ بے حد معروف، اور باصلاحیت ہوچکی ہے۔ اس کے پاس اتنا کام ہے کہ وہ اب اپنے آپ کو بھی وقت نہیں دے سکتی۔ اگر فرصت مل جائے تو اتنا ہی کام اور مل سکتا ہے۔ حتیٰ کہ دوستوں کے ساتھ گزارنے کے لیے ایک شام تو کجا اس کے پاس آرام اور اپنے محبوب کے لیے بھی وقت نہیں ہے۔ اسی وقت کے لیے وہ گزشتہ بیس برسوں سے رات دن محنت کرتی آئی ہے۔ اس کی کامیابی یہ ہے کہ اس کی ڈیمانڈ بڑھتی چلی جارہی ہے۔ وہ ہر کام کرنا چاہتی ہے۔

آج وہ جس مقام پر ہے، اس مقام تک اسے پارٹی آف فائیو کی سارہ ریوز کھینچ کر لائی ہے۔ اور اس کی سب سے بڑی خوبی ایک میگزین کے مطابق یہ ہے کہ وہ بوس و کنار کے مناظر میں آج تک منظرِ عام پر آنے والی تمام جوان لڑکیوں سے بہتر پرفارمر ہے۔ نوجوان یہی تو دیکھنا چاہتے ہیں۔

کئی لڑکیوں نے اسے یہ بتایا کہ اس کے کردار سارہ ریوز کی وجہ سے انہوں نے اپنے پیدائشی سرٹیفکیٹس پر اپنے نام تبدیل کرواکر سارہ ریوز لکھوادیے۔ یوں کہا جاسکتا ہے کہ وہ اسکرین پر اور اسکرین سے باہر نوجوان امریکی لڑکیوں کے لیے ایک مثال بن چکی ہے۔ اس بنا پر وہ اس قدر حساس ہوچکی ہے کہ اس نے آج تک اسکرین پر ایک بھی ایسا کردار قبول نہیں کیا جس میں وہ نشے کی عادی لڑکی یا شرافت سے عاری نظر آئی ہو۔ اسے معلوم ہے کہ فلمی کردار عام انسانوں کی زندگی پر بہت بُری طرح اثرانداز ہوتے ہیں۔

فلمی زندگی سے باہر وہ بالکل عام لڑکیوں کی طرح زندگی گزار رہی ہے۔ عام امریکی لڑکی کی طرح ویڈیو اسٹور پر جاکر ویڈیو کیسٹس کرائے پر حاصل کرتی ہے۔ عام سے لباس میں میکڈانلڈ پر جاکر برگر کھاتی ہے۔ اپنی عمر کی دوسری عام لڑکیوں کی طرح ۔۔۔ محبت کرکے خوش ہوتی ہے۔ بے پناہ کامیابیوں اور بے مثال مقبولیت کے باوجود اس کی گردن میں سختی نہیں آئی، مزاج میں رعونت پیدا نہیں ہوئی۔ اس کی نظریں بے شک آسمان پر مگر پیر زمین پر ہی ہیں۔ وہ ایک سیدھی سادی اور پیاری سی لڑکی ہے۔ دوسروں کے ساتھ وہی سلوک روا رکھتی ہے جس کی توقع دوسروں سے اپنے لیے کرتی ہے۔ کیا ایسے فرد کے حصے میں کامیابیاں نہیں آتی ہیں؟

اس نے بچپن سے لے کر اب تک جو زبردست جدوجہد کی ہے، جس طرح ناکامیوں ۔۔۔ اور مسلسل ناکامیوں کے باوجود ہمت نہیں ہاری، وہ ایک نہ بھلادینے والی کہانی ہے۔ عزم و ہمت اور جدوجہد مسلسل کی ایسی کہانیاں تاریخ میں اپنا مقام بنالیتی ہیں اور لکھے ہوئے صفحات میں محفوظ ہوجاتی ہیں۔

جینیفر لوہیوٹ کا سفر ابھی جاری ہے۔ اسے بہت سے آسمان سر کرنے ہیں، وہ جولیا رابرٹس، شیرون اسٹون یا پامیلا اینڈرسن بننے کے خواب نہیں دیکھتی بلکہ ایسی اداکارہ بننا چاہتی ہے کہ کل آنے والی نو آموز اداکارائیں جینیفر لوہیوٹ بننے کے خواب دیکھیں۔ ☆

خطرناک مہم

ڈاکٹر عبدالرب بھٹی

انسان کبھی کبھی جوشِ جنوں میں کچھ ایسا کرجاتا ہے جو ناقابلِ یقین سا لگتا ہے۔ اس نے بھی ایسا ہی کارنامہ انجام دیا تھا۔ یورپ کی تاریخ میں اسے ایک افسانوی کردار جیسی حیثیت حاصل ہے۔ اس کے لاتعداد کارناموں میں سے ایک کارنامہ۔

دورانِ جنگ اس نے ہاری ہوئی بازی الٹ دی تھی

میں نے گھڑسوار دستے میں جونیئر کپتان کی حیثیت سے ملازمت کرلی تھی۔ اس وقت میری عمر پچیس برس تھی۔

جرمنی کی جنگ ختم ہوچکی تھی مگر اسپین میں معرکہ آرائی جاری تھی۔ شہنشاہ نپولین اعظم نے اسپین کی فوج کو مدد دینے کے لیے میرا تبادلہ سینئر کپتان کی حیثیت سے لڑاکا فوج میں کردیا جو اس وقت مارشل لینز کے زیرِ قیادت تھی۔ برلن سے اسپین تک یہ بڑا لمبا سفر تھا۔ میری یہ نئی رجمنٹ بھی اس بڑی فوج کا ایک حصہ بنی ہوئی تھی جس نے مارشل لینیز اسپین کے ایک بڑے شہر سارا گوسا کا محاصرہ کیے ہوئے تھا۔ ایک ہفتہ یا اس سے کچھ زیادہ مجھے فرانسیسی ہیڈ کوارٹر میں ٹھہرنا پڑا۔ اس کے بعد ہی مجھے کیمپ کی طرف جانے کا حکم ملا جہاں ہماری فوج ہسارس آف کنفلانس موجود تھی۔

مجھے یقین ہے آپ نے سارا گوسا کے مشہور و معروف محاصرے کے حالات پڑھے ہوں گے۔ ایسی مشکل مہم شاید ہی کسی جرنیل کو پیش آئی ہوگی جیسی مارشل لینیز کو پیش آئی تھی لیکن ان مصائب کا تذکرہ کرنے سے پہلے میں اس شہر کا احوال سنادوں۔ یہ عظیم شہر اسپین کے باشندوں پر مشتمل تھا۔ ان میں سپاہی بھی تھے، کسان بھی اور مذہبی ٹھیکیدار بھی، گویا ہر قسم کے لوگ موجود تھے اور سب کے دلوں میں ہم فرانسیسیوں کے لیے نفرت و حقارت، بغض و عناد کی آگ

www.Paksociety.com

تھی۔ معلوم ہوتا تھا، بچے اور بوڑھے سب نے سوچ رکھا تھا کہ کٹ کر فنا ہو جانا، مغلوب ہونے سے بہتر ہے۔ شہر میں اسّی (80) ہزار آدمی تھے اور محاصرین کل تیس ہزار تھے مگر ہمارے پاس توپ خانہ تھا اور ہوشیار انجینئر تھے۔ عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ جہاں قلعہ بندی ٹوٹی شہر مطیع ہو گیا۔ مگر یہاں معاملہ ہی دوسرا تھا۔ قلعہ بندی ٹوٹنے کے بعد اصل جنگ شروع ہوئی تھی، ہر مکان قلعہ تھا۔ ہر سڑک میدان کارزار بنی ہوئی تھی۔ ہم ہر روز بہ مشکل تھوڑا تھوڑا انہیں پیچھے دھکیلتے، بارودی سرنگیں بچھا کر مکانات گراتے جاتے اور فوجی ٹھکانے برباد کرتے جاتے۔ اسی طرح آدھے سے زیادہ شہر برباد ہو چکا تھا مگر ابھی آدھا باقی تھا اور یہ پہلے سے زیادہ دلیری اور ثابت قدمی کے ساتھ مقابلے کے لیے تیار کھڑا تھا۔ گرجا اور خانقاہیں باقی رہ گئی تھیں۔ ان کی دیواریں ہمارے راستے میں حائل تھیں جو سنگ و آہن کا مرکب تھیں اور انہیں ہٹانا آسان کام نہ تھا۔ میں ان حالات میں وہاں داخل ہوا۔ میں آپ کی یہ بات مانتا ہوں کہ رسالہ محاصرے میں زیادہ کارآمد نہیں ہوتا مگر میں نے یہ خیال باطل کر دکھایا۔ ہماری فوج کا کیمپ شہر کے جنوب میں تھا، اس کی ڈیوٹی یہ تھی کہ وہ آگے کی طرف رہنے والے گشتی سپاہیوں کو اور آگے بھیج کر یہ معلوم کرائے کہ کوئی اور اسپینی سپاہ تو کسی طرف سے ان پر چڑھائی نہیں کر رہی ہے؟ رجمنٹ کا کرنل سپاہیانہ ذوق کا آدمی نہ تھا اس لیے رجمنٹ کی پوزیشن اس وقت کچھ بہتر نہ تھی مگر بعد میں اس نے خوب نام پایا۔ اس روز شام کو میں نے وہاں کے جو حالات دیکھے۔ ان سے بڑا افسوس ہوا کیونکہ کچھ بھی ہو فکر وخیال کے اعتبار سے میں ان سب سے اعلیٰ شخص تھا۔ کیمپ کی بے ترتیبی، لاغر، میلے اور سست رفتار گھوڑے دیکھ کر مجھے بڑا دکھ ہوا۔ اس رات میں نے چھبیس ہم سر نوجوانوں کے ساتھ کھانا کھایا اور یہ خیال کر کے دل میں پچھتا رہا تھا کہ کیوں میں نے جوش میں آ کر ان سے صاف صاف کہہ دیا کہ جرمنی کے محاذ پر تو ہم نے بہت بہتر انتظام کیا تھا مگر یہاں کا انتظام بہت ناقص ہے۔ میرے اس اعتراض کے بعد میس میں خاموشی طاری ہو گئی تھی۔ ان کی ترچھی نظروں سے میں نے محسوس کر لیا کہ یہ میری عاقبت نااندیشی کا نتیجہ ہے، خاص طور پر کرنل نے اس بات کو محسوس کیا۔ ایک بڑا میجر جس کا نام اولیویئر تھا اور جو رجمنٹ میں آگ بگولا مشہور تھا۔ وہ میرے مقابل بیٹھا ہوا اپنی بڑی بڑی مونچھوں کو بل دے رہا تھا اور میری طرف ایسے گھور رہا تھا گویا وہ مجھے کھائے بغیر نہ چھوڑے گا مگر میں نے اس کا یہ رویّہ زیادہ محسوس نہ کیا کیونکہ میں اپنی بے وقوفی پر خود نادم تھا اور یہ خیال کر رہا تھا کہ اگر کسی افسر سے آج پہلے ہی دن کی شام کو جھگڑا ہو گیا تو بہت برا ہوگا اور اس کا اثر صرف میری ذات پر پڑے گا۔

آخر کار ہر پہلو پر غور کرنے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا کہ غلطی سراسر میری ہی تھی کہ جو بات نہ کہنے کی تھی وہ کیوں کہہ دی۔ جب کھانا کھا چکے تو کرنل صاحب اور دیگر افسران کمرے سے باہر چلے گئے۔ اس میس کی جگہ پہلے کسی زمیندار کا فارم ہوگا۔ اب کمرے میں ایک درجن سے کم آدمی رہ گئے تھے۔ اسپینی شراب سے بھری ہوئی ایک مشک کمرے میں لائی گئی، اسے دیکھ کر ہم لوگ بہت خوش ہوئے، خوب مست ہوئے، اسی اثنا میں میجر اولیویئر نے مجھ سے جرمنی کی فوج کے متعلق کچھ سوالات کیے اور میں نے اس معرکے میں جو غیر معمولی خدمات انجام دی تھیں ان کے متعلق دریافت کیا۔ جب شراب کا نشہ ذرا رنگ لایا تو میں نے بھی قصے میں قصہ جوڑنا شروع کر دیا۔ عزیز من! یہ کوئی غیر فطری چیز نہ تھی۔ میں اپنے سن وسال کے اعتبار سے فوج میں ہر ایک افسر کے لیے نمونہ تھا۔ میں بہترین شمشیر زن تھا، شہسوار تھا تقریباً ایک سو معرکوں کا ہیرو تھا۔ یہاں پہنچ کر میں نے اپنے آپ کو غیر معروف ہی نہیں بلکہ نالائق محسوس کیا۔ کیا یہ غیر فطری چیز نہ تھی۔

انہیں یہ بتا دینا ضروری تھا کہ ان کے درمیان کسی لیاقت اور قابلیت کا آدمی آیا ہوا ہے؟ میں ان کی ہر مسرت اور خوشی پر واہ واہ کہتا اور ان کے ہر نعرۂ تحسین کی داد دے رہا تھا۔ یہی میرے لیے مناسب تھا۔ ان پر یہ ثابت کرنے کے لیے کہ آج کی شب جو شخص ان میں شامل ہوا ہے وہ ایک اونچے مزاج کا آدمی ہے جس کا نام جیرارڈ ہے، لاسین کا ہیرو، جینا کا فاتح، یہی وہ شخص ہے جس نے آسٹر لینیز کا چودھ توڑا تھا۔ یہ سب تو وہاں دُہرانا فضول تھا مگر میں نے کم از کم وہ مشہور واقعات بیان کر دینے ضروری سمجھے جن کے ذریعے میں نامور شخص سمجھا جا سکتا تھا چنانچہ میں نے ایسا ہی کیا، میں کہتا رہا۔ وہ خاموشی سے سنتے رہے۔ میں نے دریائے ڈینیوب میں اپنی فوج کو ایک خاص ترکیب سے دریا کے پار اُتارنے میں اس کی رہبری کی تھی۔ میں یہ واقعہ ابھی سنا ہی رہا تھا کہ اچانک ان سب نے مل کر ایک زوردار قہقہہ لگایا۔ میں اُچھل پڑا، حیران ہو گیا۔ میں شرم اور غصے سے مرجھا کر اپنے پیروں کی طرف دیکھنے لگا۔ گویا میں ان کی نظروں میں محض ایک شیخی خور اور جھوٹا آدمی تھا۔

کچھ توقف کے بعد میجر نے کپتان پلیٹن سے دریافت کیا "کیوں...... کپتان، کیا آپ کو معلوم ہے مارشل لینیز ابھی تک فوج میں موجود ہیں؟"

"ہاں جناب! وہ ابھی موجود ہیں۔"

دوسرے نے کہا "میرے خیال میں کپتان جیرارڈ کے آ جانے کے بعد ان کی موجودگی چنداں ضروری نہیں۔"

پھر ایک فرمائشی قہقہہ لگا۔ میں ان کے چہروں کی طرف دیکھ رہا تھا۔ ہنستے ہوئے کسی کی آنکھیں میچی جا رہی تھیں اور کسی کا منہ ٹیڑھا ہوا جا رہا تھا۔ اولیویئر کی مونچھوں کے بال سور کی گردن کے بالوں کی طرح کھڑے تھے۔ پلیٹن کا پتلا حقیر چہرہ ہنسی کے مارے سکڑ کر کچھا ہوا جا رہا تھا۔ یا خدا، کیسی بے آبروئی ہوئی۔ بہ ظاہر میں برف کی طرح ٹھنڈا اور ساکت تھا مگر بہ باطن آگ بگولا تھا۔ میں نے فضا بدلنے کے لیے میجر سے دریافت کیا۔

"کیوں میجر صاحب! رجمنٹ میں پریڈ کے اوقات کیا ہیں؟"

"کپتان جیرارڈ، مجھے یقین ہے آپ ہمارے اوقات میں تبدیلی نہ فرمائیں گے۔" میجر نے جواب دیا۔ پھر ایک بے ساختہ قہقہہ پڑا، میں خاموش سا ہر ایک کو معنی خیز نظروں سے دیکھتا رہا جب ذرا سکون ہوا تو میں نے تیز لہجے میں کپتان پلیٹن سے دریافت کیا "مجلس مشاورت کس وقت ہوتی ہے؟"

ابھی اس کی زبان سے کوئی مضحکہ خیز جملہ نکلنے ہی والا تھا کہ میری کڑوی نظروں نے اسے روک دیا۔ اس نے جواب دیا "چھ بجے!"

میں نے کہا "آپ کا شکریہ!" اس کے بعد میں نے اس کمپنی کا جائزہ لیا۔ چودہ افسران تھے جن سے مجھے نمٹنا تھا۔ ان میں دو لڑکے بھی شامل تھے جو کم سن تھے اور حال ہی میں سینٹ سائر سے آئے تھے۔ میں نے ان کی حماقت نظر انداز کر دی۔ اب رہ گئے دو میجر، چار کپتان اور سات لیفٹیننٹ، میں نے ہر ایک کو غور سے دیکھا اور پھر کہا۔

"معززین، میں اپنے آپ کو اس نیک نام رجمنٹ کا اہل نہیں پاتا اور نہ میں آپ لوگوں سے اس گستاخانہ برتاؤ کی صفائی یا معذرت کا خواہاں ہوں جو میرے ساتھ کیا گیا ہے۔ بس آپ اس کے ذمے دار ہیں، میں آپ سب کو سبق دیے بغیر نہ رہوں گا اور آپ کا کوئی حیلہ بہانہ چلنے نہیں دوں گا۔ ازراہِ کرم آپ تیار ہو جائیے۔"

حاضر جوابی

حضرت خواجہ حسن بصریؒ (21 تا 110ء)

فرماتے ہیں کہ ایک شام ڈھلے میں نے ایک بچے کو دیکھا کہ شمع روشن کیے جا رہا ہے۔ میں نے اس کو روک کر پوچھا "بیٹے! تم بتا سکتے ہو کہ یہ روشنی کہاں سے آ رہی ہے؟"

میرا سوال سنتے ہی بچے نے ایک لمحے توقف کیا پھر فوراً ہی پھونک مار کر شمع گل کر دی اور مجھ سے کہنے لگا۔

"آپ مجھے بتائیے کہ روشنی کہاں چلی گئی؟ تو میں آپ کو بتا دوں گا کہ روشنی کہاں سے آ رہی تھی۔"

آپؒ فرماتے ہیں کہ یہ جواب سن کر میں لاجواب ہو گیا۔

انتخاب: اطہر جمیل صدیقی، کراچی

"آپ کو اس کام میں ذرا بھی دقت نہ ہوگی، میں تیار ہوں۔ میں اپنی فوج نمبر 5 کے نام پر پرچم ہلاتا ہوں اور اعلان کرتا ہوں کہ آپ کے لیے تو میں اکیلا ہی کافی ہوں، میں آپ کی ہر طرح تسلی کر دوں گا۔" میجر نے کہا۔

"آپ کا شکریہ! مگر میرا چیلنج ان تمام حاضرین کے لیے ہے جو میرے اظہارِ خیال پر ہنسے تھے۔" میں نے طنزیہ انداز میں کہا۔

"پھر آپ کس سے لڑیں گے؟" کپتان پلیٹن نے دریافت کیا۔

"آپ سب سے۔" میں نے جواب دیا۔

انہوں نے تعجب سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ پھر وہ سب اُٹھے اور پیچھے کی طرف جا کر کھڑے ہو گئے۔ میں ان کی بڑبڑاہٹ اور کھسر پھسر سنتا رہا۔ وہ ہنس رہے تھے اور اس وقت تک مجھے محض شیخی خور سمجھ کر میرا مضحکہ اُڑا رہے تھے۔ پھر وہ کمرے میں واپس آ گئے۔

"اگرچہ آپ کی خواہش غیر واجب ہے مگر منظور کر لی جائے گی۔ آپ یہ ڈوئیل کس طرح لڑنا چاہتے ہیں؟ شرائط بھی آپ خود ہی تجویز کر دیں۔" میجر اولیویئر نے کہا۔

"تلوار سے، اور آپ میں سے جو لوگ بڑے عہدے دار ہیں ان سے پہلے لڑوں گا۔ ابتدا میجر اولیویئر سے ہوگی، صبح ساڑھے پانچ بجے یعنی اسمبلی بگل بجنے سے پہلے ہر ایک

کے لیے پانچ منٹ کافی ہوں گے۔ چونکہ میں نووارد ہوں اور مناسب مقامات سے ناواقف ہوں اس لیے جگہ کا انتخاب آپ خود کرلیجیے۔"

میری یہ سردمہری اور عمل طرزِ عمل دیکھ کر وہ بہت سٹپٹائے، مسکراہٹ تو پہلے ہی ان کے چہروں سے دور ہوگئی تھی۔ اب اولیویئر کا چہرہ غیظ سے سیدھا ہوگیا تھا بلکہ اس پر متانت اور سنجیدگی مستزاد تھی، اس نے کہا "گھوڑوں کی لائن کے پیچھے ایک چھوٹا سا میدان ہے۔ ہم لوگ اس قسم کے کام وہیں انجام دیا کرتے ہیں۔ میرے خیال میں وہ جگہ مناسب رہے گی۔ کپتان جیرارڈ آپ جس وقت فرمائیں، ہم لوگ وہاں پہنچ جائیں گے۔"

میں اس طرح کی منظوری کے اعلان کے لیے کھڑا ہوکر جھکنے ہی والا تھا کہ کمرے کا دروازہ کھلا اور ایک کرنل جلدی جلدی قدم اٹھاتا ہوا اندر آیا، اس نے کہا "صاحبو! مجھ سے کہا گیا ہے کہ میں آپ لوگوں میں سے ایک رضاکار کا انتخاب کرکے لے جاؤں۔ اسے ایک نہایت خطرناک کام انجام دینا ہوگا۔ وہ کام میں آپ سے مخفی رکھوں گا۔ انتہائی مشکل کام ہے، مارشل لینیز رسالے کے افسران میں سے ایک آدمی چاہتا ہے، کیونکہ رسالہ کسی توپ خانے، پلٹن اور انجینئرنگ کے لوگوں سے بہتر سمجھا جاتا ہے۔ غیر شادی شدہ کو ترجیح دی جائے گی یا وہ شخص جو خود اپنے آپ کو اس خدمت کے لیے پیش کردے۔"

کرنل اس وقت کچھ بھونچکاں سا ہو رہا تھا اور میں اس کی پریشانی کی وجہ سمجھتا تھا۔ اس وقت اس سے بہتر آدمی اور کون ہوسکتا تھا۔

"جناب!" میں نے کہا "اگر اجازت ہو تو میں کچھ عرض کروں۔"

اس نے مجھے کڑوی نظروں سے دیکھا کیونکہ میں نے شام کے کھانے پر جو باتیں کی تھیں وہ انہیں بھولا نہیں تھا۔ اس نے کہا "کہیے۔"

"جناب میں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ یہ خطرناک مشن ہر طرح میرے شایانِ شان ہے، میرے سوا کوئی دوسرا شخص اسے سرانجام دینے کا اہل نہیں۔ حق کے اعتبار سے بھی اور فراغت کے اعتبار سے بھی۔"

"کیوں یہ کس طرح کپتان جیرارڈ؟"

"حق کے لحاظ سے اس لیے کہ میں سینئر ہوں اور فراغت کے اعتبار سے رجمنٹ کا ہر آدمی مجھ سے اچھی طرح واقف ہے، یعنی مجرد ہوں۔"

یہ سن کر کرنل کا چہرہ ڈھلک گیا "کپتان جیرارڈ! تم نے جو کہا ہے وہ ٹھیک ہے۔ میرے خیال میں تمہی اس مہم کے لیے موزوں ترین آدمی ہوسکتے ہو، تم اس وقت میرے ساتھ چلو۔ میں تمہیں کچھ ہدایات دوں گا۔"

میں نے چلتے وقت اپنے ساتھیوں سے شب بخیر کہا اور پھر وہ بات دہرائی کہ کل صبح ساڑھے پانچ بجے وقت کی پوری پابندی سے میں آپ کو ملوں گا۔ انہوں نے خاموشی سے سرِ تسلیم خم کیے۔ ان کے چہرے دیکھ کر میں نے اندازہ لگایا کہ ان کی رائے پہلے کی بہ نسبت اب میرے متعلق کچھ درست معلوم ہوتی تھی۔

میرا خیال تھا کرنل جلد ہی مجھے اس کام سے آگاہ کردے گا جس کے لیے میرا انتخاب کیا گیا ہے مگر ایسا نہیں ہوا، وہ خاموشی سے آگے چلتا رہا اور اس کے پیچھے پیچھے میں۔ کیمپ سے گزر کر ہم خندقوں پر آگئے جہاں اینٹ، پتھروں اور مسالے کے اونچے اونچے ڈھیر، ملبے اور مٹی کے انبار لگے ہوئے تھے، یہ برباد شدہ پرانی دیواروں کا ملبہ تھا۔ وہ بڑے بڑے پختہ مکانات ڈھیر تھے۔ انہیں ہمارے انجینئروں نے بارودی سرنگوں کے ذریعے اڑایا تھا۔ انہی میں راستے اور گلیاں بنی ہوئی تھیں۔ ہر موڑ اور مورچے پر لالٹینیں لگی ہوئی تھیں تاکہ راہ گیر راستہ نہ بھٹک جائیں۔ ہم ملبے کے ڈھیروں پر چڑھتے اترتے ہوئے چل رہے تھے، کرنل لمبے لمبے قدموں سے بڑھا چلا جا رہا تھا۔ آخر ہمیں سیدھا راستہ مل گیا۔ یہ شہر پناہ کی دیوار کے نیچے دور تک چلا گیا تھا۔ ہمارے راستے کی دوسری جانب کچی مورچہ بندی تھی جس کے اندر خندقوں میں ایڈوانس گارڈ سو رہے تھے۔ کرنل مجھے ایک بغیر چھت کے مکان میں لے گیا۔ وہاں دو جرنیل نظر آئے جن کے سامنے ایک ڈرم پر نقشہ پھیلا ہوا تھا اور وہ دونوں گھٹنے ٹیکے لالٹین کی روشنی میں بڑے غور سے نقشہ دیکھ رہے تھے۔ ان میں ایک داڑھی مونچھ منڈا اکڑی گردن کا مارشل لینیز تھا اور دوسرا جنرل رازوٹ، انجینئروں کا اعلیٰ افسر تھا۔

"جناب! یہ کپتان جیرارڈ اپنی مرضی سے جانے کے لیے تیار ہے۔" کرنل نے فوجی انداز میں اٹینشن ہوکر کہا۔

مارشل لینیز گھٹنوں کے بل سیدھا کھڑا ہوا اور مجھ سے ہاتھ ملا کر بولا "آپ ایک بہادر آدمی ہیں، میں آپ کو ایک تحفہ دینا چاہتا ہوں۔" یہ کہہ کر اس نے شیشے کا ایک چھوٹا سا ٹیوب میرے ہاتھ میں دے دیا اور کہا۔

"یہ چیز ڈاکٹر فاروئٹ کی تیار کردہ ہے، اسے انتہائی خطرناک موقع پر اپنے ہونٹوں میں رکھ لینا۔ آن واحد میں

کام تمام کردے گی۔"

دوستو! یہ خوشگوار تمہید سن کر میری کمر میں جاڑے کی سی پھریری آئی اور جسم کا رواں رواں کھڑا ہوگیا۔ میں نے سرِ تسلیم خم کیا اور کہا "جناب عالی! معاف فرمائیے گا، میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ وہ پُرخطر خدمت کیا ہے جس کے لیے میں نے خود کو رضاکارانہ طور پر پیش کیا ہے، اس کی تفصیل مجھے اب تک نہیں بتائی گئی ہے؟"

مارشل لینیز نے کرنل پیرن سے سختی سے کہا "یہ بُری بات ہے، اس بہادر افسر کو رضاکار بنانے سے پہلے ان تمام خطرات سے آگاہ کردینا ضروری ہے جو اسے پیش آنے والے ہیں تاکہ یہ ابھی ان کا سدِباب سوچ لے۔"

"میں پہلے ہی تیار ہوکر آیا تھا جناب!" میں نے کہا "ہر خطرے کے بعد شادمانی ملتی ہے، آدمی جتنا زیادہ خطرناک کام انجام دیتا ہے، اس کی اتنی ہی زیادہ قدرومنزلت بڑھتی ہے۔ اگر مجھے پہلے یہ بتادیا جاتا کہ اس کام میں کوئی خطرہ نہیں ہے تو شاید میں پچھتاتا۔"

میری یہ تقریر شاندار تھی اور میری ظاہری وجاہت نے الفاظ کو زوردار بنادیا تھا۔ اس وقت میں ایک بہادر شخص کی طرح تن کر کھڑا تھا۔ لینیز کی آنکھیں مجھ پر جمی ہوئی زبان حال سے یہ کہہ رہی تھیں کہ فرانس کی فوج سے انتخاب کرکے اس مہم پر بھیجنے کے لیے اس نے جو کارکن چنا ہے وہ واقعی شاندار ہے۔ میں نے سوچا اگر میں رات کو مارا گیا تو لوگ بہت جلد میرا نام بھول جائیں گے البتہ میرے وہ نئے اور پرانے ساتھی مجھے ہمیشہ یاد رکھیں گے جن سے میرا رابطہ اتحاد کسی نہ کسی عنوان سے رہ چکا ہے۔

"جنرل رازوٹ! تم مختصر طور پر صورتِ حال بتادو۔" مارشل لینیز نے بڑی متانت سے کہا۔

انجینئر افسر ہاتھ میں پرکار لیے ہوئے اٹھا اور مجھے دروازے کی طرف لے گیا اور اس خاکی رنگ کی بڑی دیوار کی طرف اشارہ کیا جو ٹوٹے ہوئے مکانات کے بڑے بڑے شگافوں میں سے نظر آرہی تھی، اس نے کہا "یہ...... یہ دشمن کی دفاعی حدِفاصل اور یہی ٹمونا کی بڑی خانقاہ کی دیوار ہے، اگر یہ ہمارے قبضے میں آجائے تو گویا شہر پر قبضہ ہوگیا۔ انہوں نے اس میں جابجا بارودی سرنگیں بچھا رکھی ہیں۔ دیوار اس قدر زیادہ موٹی ہے کہ ہمارے توپ خانے اسے توڑنے میں ناکام ہیں اور اس میں بہت زیادہ خرچ بھی ہے، ہمیں یہ بھی علم ہوا ہے کہ دشمن کے پاس بارود کا کافی ذخیرہ موجود ہے جو اس دیوار کے زیریں کمروں میں جمع ہے، کسی

مئی 2012ء...... بدلتے موسم کی سوغات

خوبصورت کہانیوں کا مجموعہ
سسپنس ڈائجسٹ

آخری صفحات پر ابیہا اقبال کا دل کو چھو لینے والا انداز "اچھوتی محبت"
چاہت کی خواہشوں میں بے سمت اڑان بھرنے والے پنچھی کا انجام... جس نے
جیون کی دھوپ چھاؤں کا کھیل سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کی۔

دوراہا...... قارئین کے اصرار پر طاہر جاوید مغل کے سحرانگیز قلم سے...
سلگتے جذبوں اور بکھرتے خیالات کا قصہ...... دلوں میں چٹکی لیتی ایک یادگار تحریر

ایک دریا کے دو کنارے...... چچا بھتیجے کی محبت اور اقتدار کی جنگ......
"فصل اجڑ گئی" تاریخ کے جھروکوں سے یادگار اوراق......
ڈاکٹر ساجدا مجد کی بزم آرائی

کشکول
سحر، سیاست، رنگین، تعاقب، ...
پراسرار چالوں کا حل انوار صدیقی
کا سلسلہ وار شاہکار

مسافر...... خوابوں کی طلسماتی گلیوں میں بھٹکتے مسافر کا فسانۂ حیات...... جسے امبر کو
چھونے کی خواہش تو تھی مگر اپنی مٹی سے بغاوت بھی منظور نہ تھی۔ ناصر ملک کے
قلم سے زمین و زماں میں ہونے والی خونچکاں اور دل گداز داستان کی تیسری قسط

مزید
مقبول آزاد، سلیم انور، عائشہ فاطمہ
اور ڈاکٹر عبدالرب بھٹی کی دلچسپ تحاریر

ان کے علاوہ
محفلِ شعر و سخن اور آپ کے خطوط

طرح اس ذخیرے میں آگ لگادی جائے تو ہمارے لیے راستہ صاف ہے۔"

"میں وہاں کس طرح پہنچ سکتا ہوں؟" میں نے دریافت کیا۔

"میں آپ کو ابھی بتاتا ہوں۔ اس شہر میں ہمارا ایک فرانسیسی ایجنٹ ہے، اس کا نام ہوبرٹ ہے، یہ بہادر شخص ہمیں اندر کی خبریں بھیجتا رہتا ہے۔ اس نے ہم سے وعدہ کیا تھا کہ وہ صبح سویرے میگزین اُڑادے گا مگر آج دو دن گزر گئے، دو ہزار بہادر سپاہیوں کا طوفانی دستہ دو دن سے منتظر کھڑا ہے کہ کب دیوار میں شگاف ہو اور کب وہ شہر پر ٹوٹ پڑیں۔ مگر اب سوال یہ ہے کہ آخر اسے ہوا کیا؟ دو دن سے نہ کوئی دھماکا ہوا نہ اس نے کوئی پیغام بھیجا ہے۔"

"آپ کا مطلب یہ ہے کہ میں وہاں جا کر اس سے ملوں۔"

"بالکل، پتا کرنا ضروری ہے کہ وہ بیمار ہے، زخمی ہے یا بدقسمتی سے مارا گیا ہے۔ یہ جاننا بہت ضروری ہے کہ ہم اس کے منتظر رہیں یا دوسری جگہ سے حملہ کریں، جب تک ہمیں اس کی طرف سے کوئی خبر نہ ملے، ہم دوسرا قدم نہیں اُٹھا سکتے۔"

وہ کچھ دیر دیر کے لیے رکا پھر سانس لے کر بولا "دیکھو جیرارڈ! یہ شہر کا نقشہ ہے۔ تمھیں اس میں یہ عبادت خانے اور خانقاہوں کا حلقہ دکھائی دیتا ہے نا، اس کے ساتھ ہی یہ بہت سی سڑکیں ہیں۔ یہ اس بڑی سڑک کی شاخیں ہیں جو مرکزی اسکوائر سے گرجا گھر کو جاتی ہے۔ تم جب اس چوک پر پہنچ جاؤ گے تو اس سڑک کے ایک کونے میں گرجا ملے گا۔ اسی کونے پر نیٹ ٹولیڈو اسٹریٹ ہے، اس سڑک پر گرجا سے جاتے ہی داہنے ہاتھ پر ایک موچی کی اور دوسری شراب کی دکان ہے۔ ان کے بیچ میں ایک چھوٹا سا مکان ہے جس میں ہوبرٹ رہتا ہے۔ میں نے یہ جو کچھ کہا تم سمجھ گئے ناں؟"

"بالکل جناب! آپ کی باتیں خاصی دلچسپ ہیں۔"

"تمھیں اس مکان پر پہنچ کر ہوبرٹ سے ملنا ہے اور یہ معلوم کرنا ہے کہ آیا اس کی تجویز ابھی قابلِ عمل ہے یا ہم اسے متروک سمجھیں؟"

پھر اس نے مجھے ایک پلندا دیا جو ایک میلے کچیلے فلالین کے کپڑے میں لپٹا ہوا تھا۔ اس نے کہا "لو یہ فرانسیسی درویش کی گدڑی ہے، یہ نہایت کارآمد بھی ثابت ہوگی۔"

میں نے گدڑی لینے سے پرہیز کیا اور کہا "اسے پہن کر تو میں جاسوس معلوم ہونے لگوں گا۔ میں اپنی وردی میں جاؤں گا۔"

"ناممکن ہے یہ، بھلا شہر کی سڑکوں سے تم کس طرح گزر سکو گے؟ یاد رکھو اسپین والے دشمن کو قیدی بنا کر نہیں رکھتے، تم جس لباس میں پکڑے جاؤ گے اس کے مطابق تمہارا حشر ہوگا۔"

یہ بات اس نے ٹھیک کہی تھی۔ میں کافی عرصے اسپین کے نواح میں رہ چکا ہوں، مجھے خود معلوم تھا کہ وہاں قیدی کا انجام موت سے زیادہ دردناک ہوتا ہے، میں سرحد تک ان کے مظالم کی داستانیں سنتا چلا آیا تھا۔ میں نے فرانسیسی سادھو کا لباس پہن لیا اور کہا "اب میں تیار ہوں۔"

"تمہارے پاس کوئی ہتھیار ہے؟" اس نے پوچھا۔

"میرے پاس تلوار ہے۔" میں نے جواب دیا۔

"کیا وہ لوگ اس کی کھڑکھڑاہٹ سن کر چونکے گے نہیں؟ یہ چاقو اور تلوار یہیں چھوڑ دو۔ ہوبرٹ سے کہنا کل علی الصباح چار بجے ہمارا طوفانی دستہ تیار رہے گا۔" وہ پھر کچھ دیر کے لیے رکا۔ اِدھر اُدھر نظریں گھما کر بولا۔ "یہاں سے باہر جاتے ہی تمھیں ایک سارجنٹ ملے گا جو تمھیں شہر میں داخل ہونے کا طریقہ بتائے گا، اچھا خدا حافظ!"

کمرے سے باہر نکلتے وقت میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ دونوں جرنیل سر جوڑ کر نقشے پر جھکے ہوئے تھے اور ان کی ٹوپیوں کے پھندنے مل مل کر آپس میں گلے مل رہے تھے۔ میں نے سوچا یہ اچھی فال ہے۔ میں دروازے پر آیا، دیکھا ماتحت انجینئر افسر میرا منتظر کھڑا تھا۔ میں نے اپنے خرقے کا کمربند باندھا۔ فوجی ٹوپی اُتار کر قلندرانہ کفن سر سے لپیٹ لیا۔ سواری کے بوٹوں سے کانٹے علیحدہ کیے اور خاموشی سے اپنے رہبر کے ساتھ ہولیا۔

دیواروں پر اسپینی سنتریوں کی لائن لگی ہوئی تھی، وہ ہماری اگلی چوکیوں پر متواتر فائرنگ کر رہے تھے۔ ہم دونوں ان سے بچتے ہوئے برباد شدہ دیوار کے ملبے پر چڑھتے اُترتے ایک بڑے اخروٹ کے درخت کے نیچے آ کر ٹھہرے۔ سارجنٹ رک گیا اور اس نے کہا۔

"اوپر چڑھنے کے لیے یہ درخت بہت اچھا ہے، ڈنڈوں کی سیڑھی بھی اس کے مقابلے میں کمتر ہوگی۔ بس چڑھ جاؤ، اوپر جا کے تم چھوٹی والی ڈال پکڑ کر آسانی سے مکان کی چھت پر اُتر سکتے ہو۔ اس کے بعد تمہارا محافظ فرشتہ تمہاری رہبری کرے گا۔ اس سے زیادہ میں کوئی مدد نہیں کر سکتا، خدا حافظ۔"

میں بھاری خاکی گون کمر میں اڑس کر سارجنٹ کی ہدایت کے مطابق آہستہ آہستہ ایک شاخ سے دوسری پر

اُچھلتا ہوا اوپر چڑھتا گیا۔ یہاں تک کہ چوٹی کے قریب جا پہنچا۔ چھت کی کالی منڈیر سامنے نظر آرہی تھی، اوپر تاروں بھرا آسمان تھا۔ اب مجھے ایک مضبوط ٹہنی کی تلاش تھی جس کے ذریعے میں دیوار پر پہنچ سکتا مگر یکایک کسی کے قدموں کی آواز آئی۔ میں ساکت ہو کر تنے سے چمٹ گیا۔ ایک آدمی چھت پر جھکا جھکا میری طرف آرہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں لمبی نال والی بندوق تھی۔ اس کا انداز مشکوک اور خطرناک تھا۔ وہ ایک جگہ رکا اور پھر چلا، یہاں تک کہ وہ میرے قریب صرف چند گز کے فاصلے پر آگیا اور فصیل کے کنارے پر گھٹنا ٹیک کر بیٹھ گیا پھر اس نے گولی چلادی۔

میری کہنی میں سخت کھرونچ آئی تھی اور میں درخت سے نیچے گرتے گرتے بچا تھا۔ معاً مجھے خیال آیا کہ ممکن ہے اس نے یہ فائر مجھ پر نہ کیا ہو بلکہ کسی دوسرے کو نشانہ بنایا ہو، اس وقت درخت کے نیچے سے کراہنے کی آواز آئی۔ میں نے نیچے کی طرف دیکھا کہ فائر کا کیا نتیجہ نکلا۔ اس نے سارجنٹ کو تاڑ لیا تھا جو درخت کے نیچے کھڑا ہوا مجھے دیکھ رہا تھا۔ اسپینی نے اس غریب کو نشانہ بنایا تھا۔ آپ خیال کریں گے کہ اس نے اندھیرے کے باوجود ٹھیک نشانہ لگایا اس لیے کوئی اچھا نشانچی ہوگا۔ نہیں، یہ لوگ قرابین استعمال کرتے ہیں جس میں گولی کی بجائے چھوٹے چھوٹے دھات کے ٹکڑے اور چھرے وغیرہ بھرے جاتے ہیں۔ اس لیے وہ ایسی ہی آسانی سے مار سکتے ہیں جس طرح میں درخت کی ٹہنی پر بیٹھے ہوئے تیتر کو گولی مار سکتا ہوں۔

اسپینی اب تک جھکا ہوا اندھیرے میں نیچے جھانک رہا تھا کہ یکبارگی نیچے سے ایک ایسی آواز آئی جیسے کوئی مرتے وقت کراہتا ہے، اسپینی نے اِدھر اُدھر دیکھا، کوئی کھٹکا نہ تھا ہر طرف سناٹا چھایا ہوا تھا۔ شاید اس نے سوچا ہوگا کہ نیچے جا کر جلدی سے اس بدقسمت فرانسیسی کا کام تمام کردے یا اس کی جامہ تلاشی لینی مقصود ہوگی کہ شاید کوئی مطلب کی چیز اس کی جیب سے برآمد ہوسکے غرض جو بھی اس کی منشا ہو۔ اس نے اپنی بندوق وہیں چھت پر ڈالی اور خود جھکا جھکا آگے بڑھا اور ایک ٹہنی پکڑ کر درخت پر جھول گیا۔ میں نے فوراً اپنا چاقو اس کے جسم میں پیوست کردیا۔ وہ درخت کی شاخوں میں جھڑ جھڑاتا ہوا دھم سے زمین پر جا گرا۔ زخمی سارجنٹ نے بھی اپنا بدلہ لینے میں دیر نہ کی کیونکہ میں نے کشتم کشتا ہونے اور فرانسیسی زبان میں ایک دو قسمیں کھانے کی آوازیں سنیں۔

میں نے چند منٹ تک تو ہلنے کی جرأت نہ کی، اس خیال سے کہ اس آواز پر ضرور کوئی آئے گا مگر ہر طرف خاموشی تھی۔

میں ٹہنیوں سے رینگتا ہوا چھت پر پہنچا۔ اسپینی کی بندوق وہاں پڑی تھی مگر وہ بیکار تھی اس لیے کہ بارود کی کپی اس کی پیٹی میں تھی۔ میں نے بندوق اُٹھا کر نیچے پھینک دی، اس خیال سے کہ اگر دشمن کا کوئی آدمی اسے یہاں پڑے ہوئے دیکھے گا تو ضرور خیال کرے گا کہ یہاں کوئی واقعہ ہوا ہے۔ پھر میں نے چھت سے نیچے اُتر کر شہر میں داخل ہونے کی ترکیب سوچی اور اِدھر اُدھر راستہ تلاش کیا۔ مجھے یقین تھا کہ جس راستے سے سنتری چڑھ کر اوپر آیا تھا۔ اس راستے سے میں نیچے اُتر کر شہر میں پہنچ سکتا ہوں، بس وہی راستہ مناسب ہوگا۔

اچانک "مینولو...... مینولو" پکارنے کی آواز ابھری پھر ایک سایہ سا دکھائی دیا جیسے کوئی جھکا جھکا چور دروازے سے نکل کر چاندنی میں چھت پر آرہا ہو۔ میں نے غور سے دیکھا تو ایک داڑھی والا نظر آیا۔ جب وہ بیچ چھت پر چاندنی میں آگیا تو تین اور زرہ پوش سپاہی اس کے ساتھ آکر مل گئے۔

میں نے بندوق چھت سے نیچے پھینک دی تھی ورنہ ضرور راز فاش ہوجاتا۔ جب انہیں سنتری کا کوئی پتا نہ چلا تو انہوں نے خیال کیا وہ ضرور چھت سے نیچے کی طرف چلا گیا ہے۔ وہ سب واپس ہوئے اور بڑھتے چلے گئے پھر کچھ ٹھہر کر میں چور دروازے کی طرف بڑھا، کواڑ کھلا ہوا تھا۔ میں زینے سے اُتر کر اندر پہنچا۔ مکان قطعی خالی تھا، میں اس کے درمیان سے گزر کر سامنے کے کھلے ہوئے دروازے سے سڑک پر آگیا۔

یہ ایک تنگ گلی کی ٹوٹی پھوٹی سڑک تھی جو آگے جا کر چوڑی سڑک سے مل گئی تھی۔ جگہ جگہ آگ کی ڈھیریاں اور جلنے کے نشانات تھے، سپاہی اور دہقان پڑے سو رہے تھے، شہر میں اس درجے تعفن پھیلا ہوا تھا کہ انسان کا زندہ رہنا محال تھا۔ محاصرے کو ایک ماہ سے زیادہ گزر چکا تھا۔ غلاظتوں کے انبار لگے ہوئے تھے۔ جابجا لاشیں پڑی سڑ رہی تھیں۔ لوگوں کو صفائی اور تدفین کی مہلت ہی نہ تھی۔ یہاں بہت سے لوگ اِدھر سے اُدھر آگ تاپتے پھر رہے تھے، ان میں سے بعض لوگ قلندر یا فقیر قسم کے بھی نظر آئے۔ انہیں بے روک ٹوک چلتے پھرتے دیکھ کر میرے دل کو ڈھارس ہوئی اور میں جلدی سے بڑے چوک کی طرف چل دیا۔ وہاں کچھ لوگ بیٹھے ہوئے آگ تاپ رہے تھے۔ اتفاقاً ایک شخص نے اُٹھ کر میری آستین پکڑلی اور مجھے روک لیا پھر ایک عورت کی طرف اشارہ کیا جو بے حس و حرکت سڑک پر پڑی ہوئی تھی۔ میں سمجھ گیا کہ وہ مر رہی ہے اور یہ شخص مجھ سے عیسائی مذہب کے دستور کے مطابق دعا و حلف کے لیے کہہ رہا ہے۔ میں نے عورت کے حق میں چند دعائیہ کلمات استعمال کیے اور دستار

www.Paksociety.com

www.Paksociety.com

قلندری اس کے سینے تک جھکا دی۔ اس کے بعد میں نے اپنا ہاتھ اوپر کی طرف اُٹھایا اور آگے کی طرف اشارہ کیا۔ اس شخص نے میری آستین چھوڑ دی اور پیچھے ہٹ کر بیٹھ گیا۔ میں متقیانہ انداز سے اپنے راستے پر روانہ ہوگیا۔ مجھے اندازہ تھا کہ یہ سڑک سیدھی شہر کے اندر جائے گی جہاں فوجی دستے ہوں گے۔ شہر مشعلوں اور روشنیوں سے جگمگا رہا ہوگا۔ میں تیزی سے سڑک پر بڑھتا چلا گیا۔ راستے میں ایک دو آدمیوں نے ہتک آمیز کلمات کہہ کر مجھے مخاطب کرنا چاہا مگر میں ان کی طرف متوجہ ہوئے بغیر گرجا والی سڑک سے تیزی کے ساتھ گزرتا ہوا چلا گیا۔ اب میں شہر کی اس سمت میں تھا جو ہمارے حملے سے کافی فاصلے پر تھی، وہاں کوئی فوجی کیمپ نہیں تھا۔ ایک کھڑکی سے اتفاقیہ کچھ روشنی نظر آ رہی تھی۔

جس مکان کا مجھے پتا دیا گیا تھا، اسے تلاش کرنا مشکل نہ تھا۔ وہ مکان وہیں موچی کی دکان اور شراب خانے کے درمیان واقع تھا۔ اس میں کوئی روشنی نظر نہیں آ رہی تھی، دروازہ بند تھا۔ تاہم میں نے چٹخنی کھولنی چاہی تو وہ کھل گئی، میں نہیں سمجھتا تھا کہ مکان میں کوئی ہوگا۔ اندر داخل ہوکر دروازہ بند کیا تو گھپ اندھیرا چھا گیا۔ میں نے چاروں طرف ٹٹولنا شروع کیا۔ میرا ہاتھ ایک میز کے کنارے سے لگا، میں خاموش کھڑا رہا کہ اب کیا کروں؟ ہوبرٹ کو کس سے اور کس طرح معلوم کروں؟

اس وقت میں جس مکان میں تھا وہاں ذرا سی غلطی سے جان جانے کا خطرہ اور مشن کے ناکام ہو جانے کا اندیشہ تھا۔ میں نے سوچا ممکن ہے وہ تنہا نہ رہتا ہو، کسی اسپینی خاندان کے ساتھ شراکت میں رہتا ہو۔ ایسا نہ ہو کہ میری اور اس کی ملاقات سے ہم دونوں ہی کی جان خطرے میں پڑ جائے، میں مسلسل سوچے جا رہا تھا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے؟ کبھی ایسا پریشان نہیں ہوا تھا۔ اس وقت میرے کان میں کھسر پھسر کی سی آواز آئی، مجھے ایسا محسوس ہوا گویا میری رگوں کا خون سرد ہوکر جم گیا ہو۔

''مان ڈیو...... مان ڈیو......'' یہ آواز ایسی تھی جیسے کوئی جاں کنی کے وقت کسی کو پکارتا ہے پھر اس اندھیرے میں کسی نے سسکی بھری پھر وہی خاموشی طاری ہوگئی۔ اس خوفناک سی آواز نے مجھے لرزا دیا تھا مگر یہ لرزش کچھ امید دلا رہی تھی کہ بولنے والا فرانسیسی تھا۔

''تم کون ہو؟'' ہمت کرکے میں نے پوچھا مگر کنگنانے کے سوا کوئی بات سمجھ میں نہ آئی۔

''موسیو ہوبرٹ، کیا تم ہو؟'' میں نے اس سے دریافت کیا۔

''ہوں۔'' ایک آہ ابھری۔

آواز اس قدر دھیمی اور آہستہ تھی کہ میں اس سناٹے میں مشکل سے سن سکا۔

''پانی...... خدارا...... پانی!''

جس طرف سے یہ آواز آئی تھی، میں اس طرف بڑھا اور دیوار کے سہارے کھڑا ہوگیا۔ پھر میں نے کراہنے کی آواز سنی۔ میں نے اندازہ لگایا کہ ہو نہ ہو یہ آواز میرے سر کے اوپر سے آ رہی ہے۔ میں نے اپنے دونوں ہاتھ پاؤں پھیلا کر اوپر ٹٹولا مگر خالی ہوا کے سوا کچھ محسوس نہ ہوا۔

''تم کہاں ہو؟'' میں نے بہ آواز بلند پوچھا۔

''یہاں......'' نہایت کپکپاتی ہوئی آواز میں جواب ملا۔

میں نے اپنے دونوں ہاتھ دیوار پر پھیرنے شروع کیے، یکبارگی میرے ہاتھ کسی برہنہ شخص کے پیروں سے جا لگے جو میرے سر سے اونچے تھے اور کسی چیز پر ٹکے ہوئے بھی نہ تھے۔ میں یکدم گھبرا کر پیچھے ہٹ گیا اور چقماق کی ڈبیا جیب سے نکال کر روشن کی، پہلے ہی شعلے میں ایک آدمی ہوا میں تیرتا ہوا دکھائی دیا، گھبراہٹ کی وجہ سے ڈبیا میرے ہاتھ سے چھوٹ کر گر گئی، میں نے مشکل سے کانپتی ہوئی انگلیوں سے ڈبیا اُٹھائی اور پھر چقری اسٹیل پر ماری۔ اس دفعہ میں نے موم بتی جلالی تھی۔ اسے اوپر اُٹھا کر جو دیکھا تو خوف و ہراس کی کوئی انتہا نہ رہی، ایک آدمی کو میخیں ٹھونک کر دیوار پر لٹکا دیا گیا تھا۔ جیسے کھلیان کے دروازے پر نیولے کو کیلوں سے جڑ دیتے ہیں۔ اس کے ہاتھوں اور پیروں میں موٹی موٹی کیلیں جڑی ہوئی تھیں۔ وہ بے چارہ، بدقسمت، اس وقت نزع کے عالم میں تھا۔ اس کا سر کاندھے پر ڈھلکا ہوا تھا اور کالی خشک زبان ہونٹوں سے باہر نکلی ہوئی تھی۔ اس کے لیے پیاس کی شدت زخموں کی تکلیف سے کم نہ تھی جو اس کی موت کے باعث ہوسکتی تھی۔ ان درندہ صفت انسانوں نے سونے پر سہاگا یہ کیا تھا کہ اس کے سامنے میز پر شراب کا بھرا ہوا ہیکر رکھ دیا جو اس کی تکلیف میں ایک اور اضافہ تھا۔ میں نے میز کھینچی اور اس پر کھڑا ہوگیا پھر بیکر اُٹھا کر اس کے ہونٹوں سے لگا دیا۔ اس میں نگلنے کی طاقت ابھی باقی تھی۔ اس کی دھندلی آنکھوں میں روشنی آگئی اور آہستہ سے کنگنا کر کہا۔

''کیا تم فرانسیسی ہو؟''

''ہاں، مجھے ان لوگوں نے تمہارا حال دریافت کرنے کے لیے بھیجا ہے۔''

''میرا راز فاش ہوگیا تھا، اس لیے انہوں نے میرے

ساتھ یہ سلوک کیا۔ میں اب نہیں بچوں گا۔ مرنے سے پہلے میں وہ باتیں تمہیں بتا دینا چاہتا ہوں جو مجھے معلوم ہیں۔ جلدی سے ذرا سی شراب اور دو مہربانی، جلدی کرو، میرا دم نکلا جا رہا ہے۔ آہ......'' وہ کراہا ''م...... میری تمام طاقتیں اب جواب دے چکی ہیں، میں جو کہتا ہوں وہ سنو، بڑی ماں کے کمرے میں بارود کا ذخیرہ ہے، گرجا کے سامنے چھوٹی ماں سسٹر اینجلس کی کوٹھری ہے، وہاں دیوار کے ایک سوراخ میں فلیتے کا سرا ہے جس کا سلسلہ بارود تک ہے، دو دن گزر گئے، یہ کام تیار ہو چکا تھا لیکن انہوں نے ایک خط پکڑ لیا جس کی وجہ سے مجھے سولی دے دی گئی۔''

''یا خدا! تم دو دن سے یہاں لٹکے ہوئے ہو؟''

''میرے رفیق! معلوم ہوتا ہے، دو سال گزر گئے، کیا میں نے اپنے وطن فرانس کے لیے یہ خدمت انجام نہیں دی؟ بس اب ایک خدمت تم میری کردو، میرے دل پر خنجر مار دو تاکہ میری تکلیف جلد ختم ہوجائے۔ میں تم سے التجا کرتا ہوں اس کی۔ میں تمہاری خوشامد کرتا ہوں۔''

درحقیقت وہ علاج و معالجے جیسی شے سے مایوس ہوگیا تھا۔ اس کے ساتھ اس وقت سب سے بڑی ہمدردی کا عمل وہی ہوسکتا تھا جو اس کی التجا تھی مگر اس قسم کے سرد خون سے چاقو آلودہ کرنا میرے لیے ممکن نہ تھا۔ میں نے سوچا اگر اس حال میں اس کی جگہ میں ہوتا اور اس طرح کے رحم کی درخواست کرتا تو......؟

فوراً خیال آیا کہ میری جیب میں ایک ایسی چیز ہے جس سے فی الفور موت واقع ہوسکتی ہے۔ یہ چیز میں نے اپنے نازک وقت کے لیے رکھ چھوڑی تھی۔ اس وقت مجھ سے زیادہ اس کا مستحق یہ لاچار ہے، جس نے درحقیقت ملک اور قوم کی ایک اعلیٰ خدمت انجام دی ہے، میں نے جیب سے چھوٹی سی شیشی نکالی اور وہ چند قطرے جو اس میں تھے، شراب کے پیالے میں جھاڑ دیے اور اوپر اُٹھا کر اسے دینا چاہا تھا کہ دروازے پر ہتھیاروں کی جھنجھناہٹ سنائی دی۔

میں نے روشنی گل کردی اور کھڑکی کے پردے کے پیچھے چھپ گیا۔ اس کے بعد دروازہ کھلا اور دو اسپینی کمرے میں داخل ہوئے، ان کے چہرے خوفناک اور کالے تھے، وہ شہری لباس پہنے کاندھوں پر بندوقیں رکھے ہوئے سامنے آ گئے۔ ان میں سے ایک کے ہاتھ میں لالٹین تھی، میں پردے کی جھریوں سے ان کی ہر حرکت دیکھ رہا تھا اور یہ خیال کرکے ڈر بھی رہا تھا کہ کہیں میرا سراغ نہ مل گیا ہو مگر پھر یقین ہوگیا کہ وہ محض میرے بدقسمت ہم وطن کا آخری نظارہ کرنے آئے ہیں، جس شخص کے ہاتھ میں لالٹین تھی، اس نے ہاتھ اونچا اُٹھا کر لالٹین مرتے ہوئے آدمی کے سامنے کی، پھر دونوں نے ایک ساتھ قہقہہ لگایا۔

لالٹین کی روشنی میں قریب ہی رکھے ہوئے پیالے پر ان کی نظر پڑ گئی۔ ایک شخص نے پیالہ ہاتھ میں اُٹھا کر مجبور اور لاچار ہوبرٹ کے ہونٹوں کے قریب کیا۔ ہوبرٹ نے پینے کے لیے گردن آگے بڑھائی تو اس نے پیالہ پیچھے ہٹا لیا اور خود ایک لمبا گھونٹ لے کر پیٹ میں اُتار لیا مگر فوراً ہی اس نے ایک چیخ ماری۔ دونوں ہاتھوں سے گلا پکڑ لیا اور مٹی کے ڈھیلے کی طرح زمین پر گر پڑا۔ دوسرے شخص نے جب اپنے ساتھی کی یہ حالت دیکھی تو گھبرا اُٹھا اور خوف زدہ ہوکر دیوانوں کی طرح کمرے سے باہر نکل گیا۔ میں اس کے سڑک پر دوڑتے قدموں کی آوازیں سنتا رہا، کچھ فاصلے پر جاکر آواز آنا موقوف ہوگئی۔

پردے کے پیچھے سے نکل کر میں نے دیکھا کہ وہ لالٹین میز پر رکھی ہوئی جل رہی تھی جو اسپینی چھوڑ گیا تھا۔ میں نے اس کی روشنی میں دیکھا کہ ہوبرٹ کا سر کاندھے سے ڈھلک کر اس کے سینے پر آ گیا تھا گویا اس کا دم نکل چکا تھا۔ شراب کے پیالے تک ہونٹ بڑھانے کی یہ اس کی آخری کوشش تھی۔

کمرے میں گھڑی کی ٹک ٹک کے علاوہ قطعی خاموشی تھی۔ دیوار پر میرے فرانسیسی دوست کی خمیدہ ڈراؤنی شکل لٹک رہی تھی اور فرش پر میرے اسپینی دشمن کی بے حس و حرکت لاش پڑی تھی۔ دو رُخی لالٹین کی دھندلی روشنی میں یہ منظر اس قدر ہیبت ناک اور لرزہ خیز تھا کہ میں نے اپنی تمام عمر میں نہ دیکھا تھا۔ دس ہزار مقتولوں کا میدان میں نے دیکھا تھا جہاں لاشوں کے انبار لگے ہوئے تھے مگر کبھی ایسا پریشان نہیں ہوا تھا جیسا اس وقت اس دھندلی روشنی میں تھا۔ میں کمرے میں دو شکلیں دیکھ دیکھ کر گھبرا رہا تھا۔ میرے ایسا مضبوط اعصاب کا آدمی بھی حواس باختہ ہوگیا تھا۔ پھر میں بھی جھپٹ کر کمرے سے باہر نکل گیا جیسے وہ اسپینی اس اندوہناک مکان سے نکل کر بھاگا تھا۔ جب تک گرجا سامنے دکھائی دیتا رہا، میں برابر دوڑتا رہا...... یہاں تک کہ میں نے گرجا کی دیوار کے نیچے جاکر دم لیا۔ میں دونوں ہاتھوں سے اپنی کمر پکڑے وہاں کھڑا ہوا سانس درست کرتا رہا۔ جب میں وہاں کھڑا ہوا سانس ٹھیک کر رہا تھا تو میرے سر کے اوپر کی جانب گرجا کے گھنٹوں نے پُرشور صدا کے ساتھ دو بجائے۔ میں نے سوچا، چار بجے طوفانی لشکر کو اس جگہ حملہ کر دینا ہے۔ اس لیے مجھے کل دو گھنٹے میں پورا کام انجام دینا تھا۔

www.Paksociety.com

گرجا اندر سے منور نظر آرہا تھا۔ بہت سے آدمی اندر باہر آجارہے تھے، اپنی تجویز بروئے کار لانے کا یہ اچھا موقع مجھے معلوم ہوا کہ یہاں مجھے کون پہچان سکتا تھا۔ میں بھی بے نیازی سے اندر داخل ہوگیا۔ ہر آدمی پہلی نظر میں سمجھ سکتا تھا کہ یہ جگہ پناہ گاہ، اسپتال اور ذخیرہ گاہ کے طور پر استعمال کی جارہی ہے۔

گرجا کے بغلی گوشے میں سامان رسد بھرا ہوا تھا۔ دوسرے حصے میں بیماروں اور زخمیوں کے لیے گھاس وغیرہ کے بستر بچھے ہوئے تھے۔ صحن کے وسط میں سیکڑوں مجبور، اپاہج اور بے کس لوگ کیچڑ اور گارے میں کھانا پکا رہے تھے۔ کچھ لوگ اندر کی طرف عبادت میں مشغول تھے۔ میں بھی ایک تھم کی آڑ میں جاکر دوزانو بیٹھ گیا اور تہ دل سے اپنی خوش قسمتی پر شکر ادا کیا کہ اس مصیبت سے زندہ سلامت نکل آیا۔ میں نے دعا مانگی۔ ''یاخدا! آج کی رات میرے ہاتھوں وہ کام انجام پائے، جس سے میرا نام جرمنی کی طرح اسپین میں بھی روشن ہوجائے۔ اے خدا! اپنے جیرارڈ کو شادکام کردے۔''

☆☆☆

تین بج رہے تھے، میں گرجا سے نکل کر میڈونا کی خانقاہ کی طرف چلا جہاں حملہ ہونے والا تھا۔ آپ نے غور فرمایا، میں ایسا آدمی نہیں ہوں جو یوں ہی کاہلوں کی طرح فرانسیسی کیمپ واپس چلا جاتا اور یہ رپورٹ کردیتا کہ افسوس ہے، ہمارا ایجنٹ مارا گیا۔ اس لیے شہر میں داخل ہونے کے لیے دوسرے ذرائع اختیار کیے جائیں، یہ اپنے وطن سے غداری اور بدنیتی کے مترادف ہوتا۔ میں نے تہیہ کرلیا کہ خواہ کچھ ہو، کسی نہ کسی طرح ہوبرٹ کا ناممکن کام پایۂ تکمیل تک پہنچا کر رہوں گا ورنہ فوج میں ایک لائق اور دلیر سینئر کپتان کی جگہ خالی ہوجائے گی۔

میں بے روک ٹوک اس کھلے صحن یا چوڑی سڑک سے گزر گیا جس کا میں پہلے بھی ذکر کرچکا ہوں۔ یہاں تک کہ میں اس عظیم الشان سنگین خانقاہ میں آگیا جو شہر کے بچاؤ کے لیے پشت پناہ بنی ہوئی تھی۔ یہ مربع شکل کی عمارت تھی جس کے بیچوں بیچ ایک باغیچہ تھا۔ باغیچے میں سیکڑوں مسلح اشخاص کیل کانٹے سے لیس بیٹھے تھے، انہیں معلوم ہوچکا تھا کہ فرانسیسی اس جگہ حملہ کرنے والے ہیں۔

اب تک جتنی لڑائیاں ہم نے لڑی تھیں ان میں سپاہ کا مقابلہ سپاہ سے ہوا تھا مگر اسپین میں پہنچ کر ہمیں پتا چلا کہ عوام سے لڑنا مشکل کام ہے، ذرا غور کیجیے اگر آپ نے مقابلے میں ڈٹے ہوئے تیلی تنبولیوں کا ہجوم یا سوداگروں یا مذہبی دیوانوں کا مشتعل ہجوم زیر کرلیا تو کیا بہادری ہوئی؟ یہ کس قسم کی فتح کہلائے گی؟ دوسرے اس مقابلے میں خطرے کی بات یہ ہوتی ہے کہ عوام کسی اصول کے پابند نہیں ہوتے، غم اور غصے کے جذبے سے مجبور ہوکر بانس، بلی، گنڈاسے، پتھر گرز لے کر پل پڑتے ہیں اور خوامخواہ مجروح کرڈالتے ہیں۔ جب میں نے یہ بوقلمونی مشتعل فوج خانقاہ کے باغیچے میں دیکھی تو غور کیا کہ ہمارا کام کس قدر مشکل اور عجیب تر ہے۔ میں آخر اس نتیجے پر پہنچا کہ ہم سپاہیوں کا کام یہ نہیں ہے کہ سیاست میں زیادہ غوروفکر کریں اور اپنا دماغ پریشان کریں۔ اسپین کی جنگ تو شروع ہی سے عجیب ہے اور جیرارڈ عجیب وغریب قسم کے کاموں کو سرانجام دینے کے لیے فرانس میں پیدا ہوا ہے۔

بھلا اس قسم کے غوروفکر کا مجھے وقت کہاں تھا۔ باغیچے کی طرح خانقاہ میں بے روک ٹوک داخل ہونا ناممکن تھا۔ پہلے میں نے باغیچے کا ایک چکر لگایا، اس سے مجھے یہ فائدہ ہوا کہ ایک طرف ایک بڑی کھڑکی نظر آئی جس کے کواڑوں کے شیشے دھندلے تھے اور وہ گرجا سے ملحق تھی۔ اسے دیکھتے ہی مجھے ہوبرٹ کا کہنا یاد آگیا کہ بڑی ماں کا کمرا اس جگہ کے قریب ہے جہاں بارود کا ذخیرہ ہے۔ میں نے سوچا کہ اس کا فلیتہ بھی قریب ہی کے کسی کمرے میں ہوگا۔ مجھے کسی نہ کسی خانقاہ میں داخل ہونا چاہیے۔ دروازے پر گارڈ تعینات تھا، میں روک ٹوک کے بغیر اندر نہیں جاسکتا تھا مگر ایک فوری تجویز الہام کی طرح میرے دماغ میں آگئی اور میں سمجھ گیا کہ کام اسی طرح بن سکتا ہے، باغیچے میں ایک کنواں تھا، اس کنویں پر بہت سے خالی ڈول رکھے ہوئے تھے، ان میں سے دو ڈول میں نے پانی سے بھر لیے اور دونوں ڈول لے کر دروازے پر پہنچا۔ کسی شخص کے دونوں ہاتھوں میں پانی سے بھرے ہوئے دو ڈول ہوں اور وہ انہیں لے کر اندر جارہا ہو تو دیکھنے والا یہی سمجھ سکتا ہے کہ اسی خدمت پر مامور ہوگا۔ سوال وجواب کی کیا ضرورت ہے۔ دربان نے دروازہ کھول دیا اور میں اندر داخل ہوگیا۔ اب میں اس راستے پر تھا جو سلیٹ کے پتھروں کی چوڑی چوڑی سلوں سے پٹا ہوا تھا اور اس میں دائیں اور بائیں راہباؤں یعنی تارک الدنیا عورتوں کی کوٹھریاں بنی ہوئی تھیں۔ میں بے پس وپیش بڑھتا چلا گیا کیونکہ میں نے پہلے ہی باغیچے میں سوچ لیا تھا کہ گرجا کی طرف چلنا ہے۔

کچھ اسپینی سپاہی راستے پر کھڑے ہوئے تمباکو پی رہے

تھے اور خوش گپیاں کررہے تھے۔ جب میں ان کے قریب پہنچا تو انہوں نے مجھے مخاطب کرنا چاہا۔ میں سمجھ گیا کہ یہ بھی مجھ سے دعا کے طالب ہوں گے، میں نے وہی دعائیہ کلمے جو مجھے یاد تھے۔ پڑھے اور ان پر دم کردیا۔ وہ مطمئن ہوگئے۔ اس مقام سے گرجا قریب تھا۔ میں نے غور کیا اور سمجھ لیا کہ پہلی کوٹھری کے بعد دوسری کوٹھری میں بارود ہے، دروازے کے آگے زمین کچھ دور تک کالی ہورہی تھی اور دروازے میں بڑا سا تالا لگا ہوا تھا۔

دو سنتری ایک دوسرے کے مقابل بندوقیں لیے کھڑے تھے، ان میں سے ایک کی پیٹی میں کنجی اڑسی ہوئی تھی، میں نے سوچا اگر یہ دوسرا سنتری نہ ہوتا تو زیادہ دیر نہ لگتی اور کنجی میرے ہاتھ میں ہوتی۔ مگر دو آدمیوں کی موجودگی میں ایسا ہونا مشکل تھا۔ بارود کی کوٹھری سے دوسری کوٹھری گرجا سے متصل تھی۔ یہ ضرور سسٹر اینجلس یعنی چھوٹی ماں کی ہونی چاہیے، اس کا ایک کواڑ کھلا ہوا تھا۔ میں نے دل مضبوط کرکے پانی کے ڈول راستے میں رکھ دیے اور اجازت کے بغیر کمرے میں داخل ہوگیا۔

میرا خیال تھا کہ کم ازکم نصب درجن بیباک قسم کے اسپینی اندر دکھائی دیں گے مگر امید کے خلاف میری آنکھوں نے کچھ اور ہی دیکھا۔ وہ کمرا قطعی طور پر ان تارک الدنیا عورتوں کے لیے چھوڑ دیا گیا تھا جنہوں نے چند وجوہ کی بنا پر اپنا مسکن چھوڑنے سے انکار کردیا تھا۔ وہاں میں نے تین عورتیں ایک طرف بیٹھی ہوئی دیکھیں۔ ان میں ایک پکے چہرے کی معمر عورت تھی جو غالباً بڑی ماں ہوگی، اس کے علاوہ دو جوان اور خوبصورت عورتیں تھیں۔ میں داخل ہوا تو وہ سب کھڑی ہوگئیں، ان کے چہروں پر پریشانی اور گھبراہٹ تھی۔ میرا دماغ حاضر تھا۔ میں معاملے کی اصلیت تاڑ گیا۔ چونکہ خانقاہ پر حملہ ہونے والا تھا۔ اس لیے اصولاً انہیں دوسری جگہ نقل کردینا ضروری تھا، کچھ عجب نہیں کہ وہ کسی ایسے حکم کی منتظر ہی بیٹھی ہوں، اس لیے میرا ان کے پاس آنا توقع کے خلاف نہیں ہوسکتا تھا۔ وہ ایک عہد کے تحت ان دیواروں کے سائے میں رہتی چلی آرہی تھیں اس لیے وہ اپنے مذہبی پیشوا کے حکم کے بغیر کوٹھریاں نہیں چھوڑ سکتی تھیں۔ میں نے تصور ہی تصور میں عمل شروع کیا۔ دروازے پر نظر گئی تو دیکھا کہ کنجی تالے میں پھنسی ہے۔ میں نے ان راہب عورتوں کو اپنے پیچھے چلنے کا اشارہ کیا۔ اس نے ذرا تامل کیا تو میں نے تحکمانہ انداز سے اپنا پیر زور سے زمین پر مارا اور انہیں فوراً باہر نکل جانے کا اشارہ کیا اور اشاروں ہی سے بتایا کہ وہ یہاں کی نسبت گرجا میں زیادہ محفوظ رہیں گی۔ غرض وہ میرے پیچھے ہولیں اور میں نے انہیں گرجا میں قربان گاہ تک پہنچادیا۔ یہ جگہ بارود سے کافی فاصلے پر تھی۔ جب یہ تینوں تارک الدنیا عورتیں گرجا کی قربان گاہ تک پہنچ گئیں تو مجھے بڑی خوشی ہوئی کیونکہ ایک بڑا خطرہ راستے سے دور ہوگیا تھا۔

میں اکثر نازک موقعوں پر پیش آنے والے خطرات پہلے سے تاڑ جاتا ہوں۔ میں نے آخری نظر بڑی ماں کے چہرے پر ڈالی۔ اس کی بڑی بڑی کالی چمک دار آنکھیں میرے داہنے ہاتھ پر لگی ہوئی تھیں۔ اس کے ہونٹوں سے تعجب کا اظہار ہورہا تھا اور چہرے سے شک کی کیفیت نمایاں تھی۔ اس کی دو وجوہ تھیں، پہلی یہ کہ میرا داہنا ہاتھ اس سنتری کے خون سے سرخ ہورہا تھا جسے میں نے درخت پر چاقو مار کر ہلاک کیا تھا۔ خیر یہ بات تو نبھ سکتی تھی کیونکہ چاقو وغیرہ مارنا سارا گوسا میں اس وقت عام تھا اور وہاں کے پادریوں کی بہادری بھی مشہور تھی مگر میں اپنی بیچ کی انگلی میں ایک سونے کی انگشتری پہنے ہوئے تھا۔ یہ ایک جرمن نواب زادی کا تحفہ تھا جس کا نام میں یہاں ظاہر کرنا نہیں چاہتا۔ انگوٹھی اس وقت قربان گاہ کے لیمپ کی روشنی میں تیزی سے چمک رہی تھی۔ ایک درویش کے ہاتھ میں انگوٹھی کا ہونا ناممکنات میں سے تھا کیونکہ درویش لوگ انتہائی غربت کی زندگی بسر کرنے کی قسم کھا چکے ہوتے ہیں۔ میں یکدم پیچھے پلٹا اور تیزی سے گرجا کے دروازے کی طرف چلا مگر فتنہ بیدار ہوچکا تھا۔ پیچھے مڑ کر دیکھا تو بڑی ماں پیچھے لپکی چلی آرہی تھی۔ میں دوڑ کر گرجا کے دروازے سے باہر نکل گیا اور خانقاہ کی غلام گردش پر ہولیا۔ مگر وہ چیخ کر کھڑے ہوئے سنتریوں کو مخاطب کررہی تھی اور کہہ رہی تھی ''اسے پکڑو۔'' خوش قسمتی سے اس وقت میرا دماغ حاضر تھا۔ میں نے بھی دوڑتے ہوئے سامنے کی طرف اشارہ کرکے چلانا شروع کردیا۔ گویا ہم دونوں ایک ہی مقصد کے لیے آگے پیچھے دوڑ رہے تھے۔ میں دوسرے ہی لمحے میں کوٹھری کے دروازے پر پہنچ گیا اور اندر سے بھاری دروازہ بند کرکے اوپر کی چٹخنی لگادی اور بھاری موسل کواڑوں کے بیچ میں اڑا دیا۔

اگر وہ ذہین ہوتے تو مجھے تباہ کرنے کے لیے بارود کی نلی دروازے کے پیچھے رکھ کر دروازہ اُڑا سکتے تھے مگر خوش قسمتی سے یہ ترکیب انہیں سوجھی ہی نہیں۔ یہ آخری موقع تھا کیونکہ میں اب اپنی اس ''خطرناک مہم'' کی انتہائی اور آخری منزل پر پہنچ چکا تھا۔ اس قدر مصائب اور آلام کے بعد اب میں سارا گوسا کے بارود کے فلیتے کی تلاش میں کبھی اِدھر تھا کبھی اُدھر

تھا۔ دشمن بھیڑیوں کی طرح غرا غرا کر دروازے پر بندوقوں سے ٹھوکے مار رہے تھے مگر میں ان کی طرف متوجہ نہ ہوا۔ میں ہوبرٹ کے کہنے کے مطابق بارود کا فلیتہ چاروں کونوں میں ڈھونڈتا پھر رہا تھا۔ میں نے سوچا کہ فلیتہ ضرور بارود کے سامنے کی دیوار کے کسی سوراخ میں ہوگا۔ میں نے گھٹنوں کے بل رینگ کر ہاتھوں سے ٹٹولا، ناخنوں سے دیوار کی درزیں کریدیں مگر کوئی سراغ نہ مل سکا۔ اچانک دو گولیاں دروازے کے پار ہو کر دیوار پر آ کر لگیں۔ اب دھڑ دھڑ اور چھڑ چھڑ کی آوازیں آ رہی تھیں۔ ایک کونے میں مٹی کی ڈھیری سی نظر آئی۔ میں خوشی سے اس کی طرف بڑھا لیکن وہ محض راکھ کا ڈھیر نکلا۔ میں لاچار پیچھے ہٹ کر ایسی جگہ بیٹھ گیا جہاں گولی لگنے کا امکان نہیں تھا۔ دشمن دروازے پر امنڈ امنڈ کر آ رہے تھے اور انہوں نے بے حد شور مچا رکھا تھا۔ میں حتی الامکان دماغی توازن صحیح رکھنے کی کوشش کر رہا تھا تاکہ ان کے شور و شر کی طرف میرا دھیان نہ جائے اور میں فلیتے کی تلاش میں ہمہ تن متوجہ اور معروف رہوں۔ میں نے یک سو ہو کر پھر ایک بار غور کیا کہ ہوبرٹ نے ضرور فلیتہ کسی ایسی جگہ چھپایا ہوگا کہ وہ ان گوشہ نشین عورتوں کی نظروں سے اوجھل رہے، میں نے سوچا کہ اگر میں اس کی جگہ ہوتا تو کس جگہ چھپاتا؟ یہ سوچتے ہی میری نظر ایک مجسمے پر پڑی جو ایک کونے میں کھڑا تھا۔ اس کے قدموں پر پھولوں کے ہار پڑے تھے، درمیان میں ایک چراغ روشن تھا۔ بڑی عجلت سے میں نے پھولوں کی پتیاں سمیٹ کر ایک طرف کیں، غور سے دیکھا تو ایک باریک سیاہ ڈوری نظر آئی جو دیوار کے ایک سوراخ میں جا کر غائب ہوگئی تھی۔ میں نے اس کا سرا ابھار کر چراغ کی لو سے ملا دیا اور خود زمین سے چمٹ گیا۔ دوسرے ہی لمحے بجلی گرنے کی سی کڑک اور بھاری گرج کی صدا بلند ہوئی اور دیواریں لہرا گئیں۔ چھت چرچرا اٹھی۔ خوف زدہ اسپینیوں کی چیخ پکار اور بھاگنے کی آوازیں آئیں اور طوفانی لشکر کے سپاہیوں کے نعرے ابھرے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ میں کوئی دل خوش کرنے والا خواب دیکھ رہا ہوں، اس کے بعد مجھ پر بے ہوشی طاری ہوگئی۔

جب ہوش آیا تو دیکھا کہ دو فرانسیسی سپاہی مجھے پیروں پر کھڑا کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ میرا سر دیگچی کی طرح سن سن پک رہا تھا۔ میں پیروں پر کھڑا ہونے کی کوشش کر رہا تھا مگر قدم ڈگمگائے جا رہے تھے۔ میں نے گھبرا کر چاروں طرف دیکھا، کمرے میں دیواروں اور چھت کے پلاسٹر کے ڈھیر لگے ہوئے تھے۔ فرنیچر منتشر پڑا تھا۔ دیواروں کی اینٹوں میں لمبی لمبی دراڑیں پڑ گئی تھیں مگر کوئی بڑا شگاف نہ تھا۔ دراصل خانقاہ کی دیواریں اس قدر مستحکم اور مضبوط بنی ہوئی تھیں کہ بارود کا دھماکا انہیں تباہ نہیں کر سکا تھا البتہ اس حادثے نے کھڑکیاں کھول دی تھیں جس کے ذریعے ہمارا طوفانی لشکر چڑھا چلا آیا۔

مدافعین میں ایسا خوف و ہراس پھیلا کہ انہوں نے مقابلہ کیے بغیر دروازے کھول دیے۔ میں دوڑ کر کمرے سے باہر غلام گردش کی طرف آیا۔ تمام راستہ میرے ہم وطن فرانسیسی سپاہیوں سے بھرا ہوا تھا۔ میں مارشل لینیز سے ملا جو اپنے اسٹاف کے ساتھ داخل ہو چکا تھا۔ اس نے مجھے روک لیا اور نہایت شوق سے میرا قصہ سنا۔

”شاباش..... شاباش..... کپتان جیرارڈ!“ اس نے کہا ”تم نے عظیم الشان کارنامہ سرانجام دیا ہے۔ اس کی اطلاع ملک معظم شہنشاہ نپولین کو دی جائے گی۔“

”جناب عالی!“ میں نے کہا ”یہ سب کچھ بے چارے ہوبرٹ کا کیا دھرا ہے۔ میں نے تو صرف اس کی تجویز پایۂ تکمیل تک پہنچا دی جس کے لیے اس نے اپنی جان تک دے دی اور دوسرے جناب عالی! اگر آپ مجھے کہنے کی اجازت دیں تو کہوں، خوش قسمتی سے اس اہم کام کے لیے جیرارڈ جیسا مناسب آدمی بھی آپ کے ہاتھ لگ گیا۔“

”بلاشبہ تمہاری اور ہوبرٹ کی خدمات کبھی فراموش نہیں کی جائیں گی۔“ مارشل لینیز نے کہا ”کپتان جیرارڈ، اس وقت ساڑھے چار بجے ہیں، تمام رات کی مشقت نے تمہیں بھوکا مار دیا ہوگا۔ میں اور میرا اسٹاف شہر میں جا کر ناشتا کریں گے۔ مجھے یقین ہے کہ تم ہمارے معزز مہمان ہوگے۔“

”دوستو! اس کے بعد تو آپ سمجھ ہی گئے ہوں گے کہ مجھ پر طعنہ زنی کرنے، پھبتیاں کسنے اور طنزیہ قہقہے لگانے والے اور مجھے شیخی خور سمجھنے والوں نے مجھے بارہ تلواروں کی سر جھکا کے سلامی دی تھی۔ تب میں نے نہایت جذبات میں ایک پُراثر تقریر کی۔

”میرے رفیقو! ایک کمزور آدمی خطرے کے مقابلے میں خود کو فولاد بنا سکتا ہے مگر کسی شخص کے ضمیر یا جذبات بدل ڈالنا اور اس پر قابو پا لینا بڑا مشکل کام ہے۔ میرے رفیقو.....!“

اس کے بعد جانے کیوں میری آواز گھٹ گئی۔

میرے بارہ کے بارہ رفیقوں نے میرے سامنے اپنے سر تسلیم خم کر دیے تھے۔

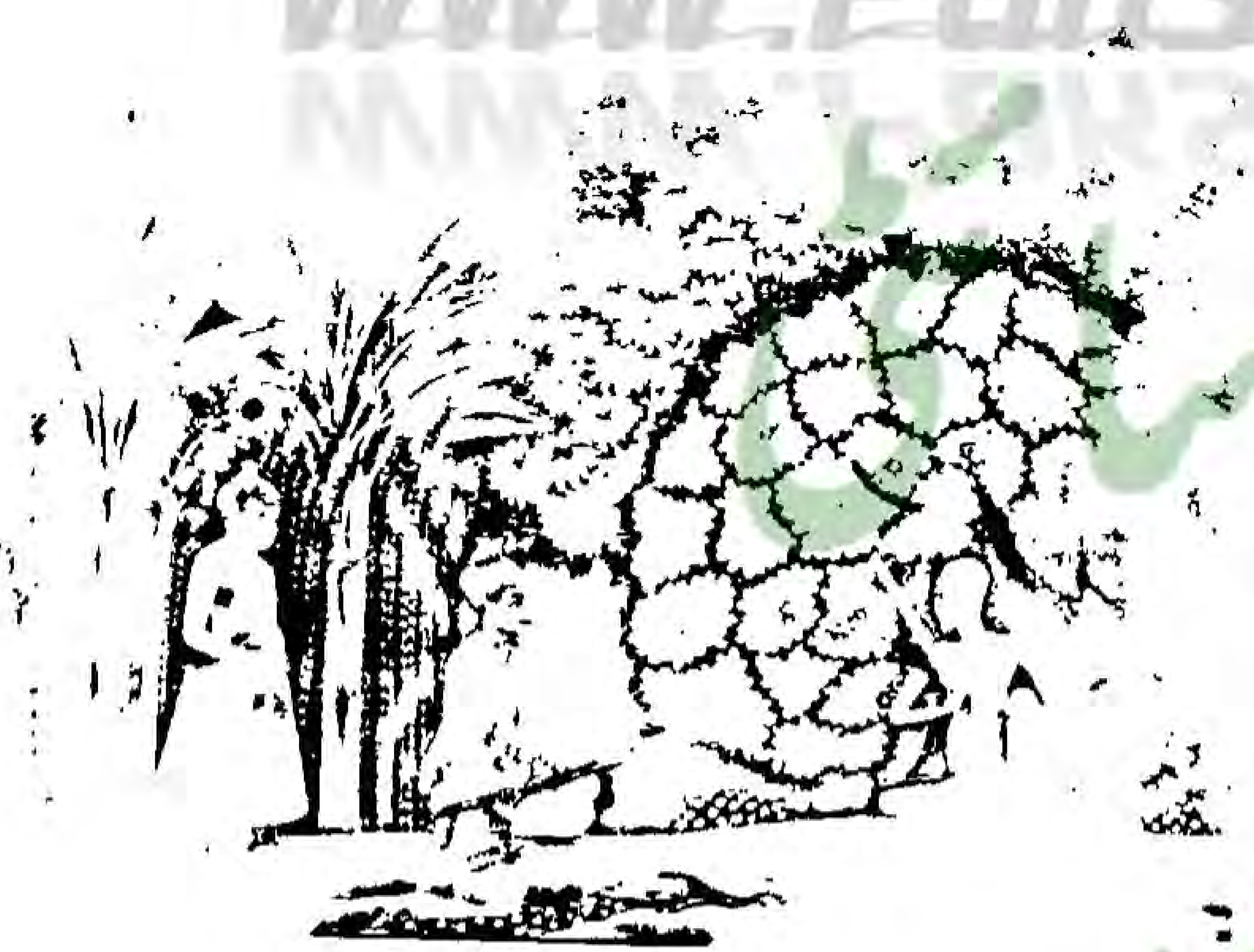

راگ کی آگ

یعقوب جمیل

جب تاریخ دانوں کا قلم عصبیت کی روشنائی سے چلنے لگے تو یہی کچھ ہوتا ہے، اسی طرح تاریخ مسخ ہونے لگتی ہے۔ تانی کا کردار زبردستی گھڑا گیا۔ اسے تان سین سے بڑا ثابت کرنے کے لیے ایک فرضی کہانی بھی گھڑ لی گئی۔ اس کہانی پر ایک نہیں متعدد کتابیں لکھی گئیں۔ بالی وڈ میں کئی فلمیں بھی ہیں جن میں ”تانی“ اور ”بیجو باورا“ سرِفہرست ہیں۔ سچ کہی جانے والی اس فرضی کہانی کو صرف معلومات میں اضافے کی خاطر شائع کیا جا رہا ہے۔

اس نے بدلہ لینے کی خاطر تان سین کو موسیقی میں شکست دے دی

وہ ایک حسین ترین چاندنی رات تھی اس رات چاند اپنے مکمل وجود اور بھرپور شباب کے ساتھ آسمان پر جگمگاتے ہوئے بے شمار ستاروں کا مہمان تھا، ہاتھوں میں کرنوں کی پچکاریاں لیے وہ آسمان کے آنگن کو دودھیا رنگ میں شرابور کر رہا تھا۔ اس دودھیا رنگ کے چھینٹے زمین پر بھی پڑ رہے تھے۔

ان چھینٹوں میں تربہ تر ہو کر آگرہ کے محلات، برج اور مینارے کسی خوبصورت جادو نگری کا تصور پیش کر رہے تھے۔ شہر پہ آدھی رات کا سناٹا چھایا ہوا تھا لیکن دور جمنا ندی کی چمکیلی سطح پر ایک شاہی بجرا پانی کی جوان لہروں سے ٹکراتا ہوا بڑی مستی سے تیر رہا تھا۔

www.Paksociety.com

آسمانی رنگت میں ڈھکی ہوئی بجرے کی چھت پر اس وقت اکبری دربار کے بڑے بڑے امیر امراء' سپہ سالار اور وزیر مشیر' آفتابِ موسیقی تان سین کے سُر سنگیت میں ڈوبے ہوئے تھے۔ ان سارے قدر دانوں کے درمیان بیٹھا ہوا تان سین اپنی ادھ کھلی آنکھیں لیے' اپنا ایک ہاتھ سامنے کی طرف پھیلا کر آدھی رات کا راگ الاپ رہا تھا' مستی میں ڈوبے ہوئے اس کے سُروں کو بیچ بیچ میں پیالوں کی کھنک اور مدہوش درباریوں کی ' واہ واہ' تار تار کر دیتا۔

سنگیت اور سُروں کا جادوگر میاں تان سین آج پورے جوش وجنوں کے ساتھ اپنی آواز کی لہروں کو جمنا کے کنارے کھڑے محلوں کے پتھروں سے ٹکرائے دے رہا تھا' جس کی وجہ سے وہ سب بے جان پتھر بھی اس کے گلے سے نکلے ہوئے بولوں کو دُہرانے پر مجبور تھے۔ سچ مچ تان سین کے جادو کا آج کوئی جواب نہیں تھا۔ واہ واہ کی صدائیں بلند ہورہی تھیں اور تان سین کی الاپ اپنے مخصوص انداز میں جاری تھی۔

تمام درباری پوری طرح ساز وسنگیت کے جادو میں ڈوبے ہوئے تھے کہ ایسے میں اچانک ہی جمنا ندی کے کچے گھاٹ سے بینا کے سُروں میں لپٹی ہوئی ایک بے حد نرم اور ملائم آواز ٹھنڈی ٹھنڈی ہواؤں کے دوش پر لہراتی ہوئی تان سین کے شاہی بجرے سے ٹکرانے لگی۔

اونچی آواز میں وہ کوئی گویا ہی تھا۔ جو بینا پر آدھی رات کا خاص راگ ہی الاپ رہا تھا' اس گویے کی الاپ میں کچھ ایسا نشہ تھا کہ اس میں ڈوب کر گھاٹ کے پتھروں نے تان سین کی دہائی دینا بند کر دی۔

اُبھرتی ڈوبتی اور لہروں کی طرح مچلتی ہوئی' سُروں کے اس جوار بھاٹا نے دھیرے دھیرے آگے بڑھ کر جمنا کی لہروں پر تیرتے شاہی بجرے کو چھونا شروع کر دیا۔ جیسے کوئی کسی بند دروازے پر ہلکے ہلکے دستک دے کر اپنی آمد کی اطلاع دے رہا ہو۔ تان سین کے کانوں میں بھی وہ آواز پڑی تو وہ بُری طرح سے چونک پڑا لیکن وہ درباری گویا تھا۔ اس لیے اس نے بڑی ہوشیاری اور بڑی مہارت سے اس اجنبی گویے کی الاپ کو اپنی الاپ کے ذریعے روک کر اپنا رنگ جمائے رکھنے کی کوشش شروع کر دی۔

لیکن اجنبی گویے کی الاپ تو سر چڑھ کر بولنے والا جادو ساتھ لے کر آئی تھی جس نے تھوڑی ہی دیر میں بجرے میں بیٹھے ہوئے سارے ہی درباریوں کو اپنے سحر میں جکڑ لیا' فضا بالکل اچانک ہی بدل گئی تھی اور پھر ذرا دیر بعد ہی جب چند گنے چنے خوشامدی لوگ جو تان سین کی آواز کے اُتار چڑھاؤ پر سر ہلانے اور تال ملانے کے عادی تھے' وہ بھی اپنا سر ہلانا اور جھومنا بند کر کے چپ چاپ بیٹھ گئے تھے۔ تان سین نے جب دور کنارے سے آتی ہوئی راگ ''بیہوگ'' کی الاپ کو اپنے اردگرد کے لوگوں پر اثر انداز ہوتے محسوس کیا تو اس کے ہاتھوں میں بھی کپکپاہٹ کی لہر دوڑنے لگی لیکن اس نے فوراً ہی اپنے آپ کو سنبھالنے کی کوشش کی اور اچانک ہی اپنے تان پورے کے چاروں تار پر ایک ساتھ اپنی انگلی پھیر کر چپ ہوگیا۔

زندگی میں شاید پہلی بار تان سین کی تان اور اس کے فن نے ایسی گھٹن اور تڑپ محسوس کی تھی۔ اجنبی آواز کے طوفان نے شاہی بجرے میں آگے بڑھ کر جمنا ندی کے دوسرے کنارے پر کھڑے ریت کے ٹیلوں اور پیڑوں کے جھرمٹ میں سوئی قبروں پر بھی دستک دینا شروع کر دی تھی اور جلد ہی اس دوسرے کنارے میں بھی اجنبی گویے کی بازگشت گونجنے لگی۔ اس طرح دوسرے کنارے سے بھی اس انجان گویے کی جیت کا اعلان دُہرایا جانے لگا۔

''یہ کس کی آواز ہے' کون گا رہا ہے؟'' راجا مان سنگھ نے اس اجنبی آواز کو دھیان سے سنتے ہوئے ہمدردانہ لہجے میں تان سین سے سوال کیا۔

''نہ جانے کون پاگل ہے۔'' تان سین ایک پھیکی مسکراہٹ کے ساتھ سر جھٹک کر رہ گیا۔

''آپ رک کیوں گئے آفتابِ موسیقی؟'' فیضی نے پُرتجسس لہجے میں پوچھا اور آگے کہا ''ساز آپ کے انتظار میں ہیں۔''

''یہ ساز اس انجان پردیسی گویے کی مہمان نوازی کے لیے چپ ہوگئے ہیں ورنہ......'' شراب کے نشے میں چور تان سین کی آواز جھوٹ نہ بول سکی۔

''واقعی اس گویے کی الاپ نے تو اس چاندنی رات کا رنگ دونا کر دیا ہے۔'' ایک گویے درباری نے تان سین کی طرف آنکھ مار کر فقرہ کسا۔ یہ سن کر راجا بھگوان داس سے رہا نہیں گیا اور وہ بولے ''رنگ دونا کر دیا؟ یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ؟ ارے جنت کی حوریں بھی راگنی چھیڑنا بھول گئی ہیں کچھ ایسا ہی زہر بھرا ہے اس گلے میں۔''

''مہیو بجو نایک۔'' اچانک تان سین کے ایک سازندے نے ہانک لگائی ''تم نے مرکزِ سنگیت کے سینے پر رکھا ہوا بھاری پتھر ہٹا دیا ہے۔ ابھی تو آگرے پر سے گانے پر لگی پابندی کو ہٹے ہوئے چند ہی دن ہوئے ہیں۔ پھر بھی

ایسے ایسے کلاکار سامنے آنے لگے...... یہ الاپ اور یہ آواز تو دور سے ہی دلوں میں اُترتی جا رہی ہے۔ آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا؟''

''یہ گویا جا ہے جو کوئی بھی ہو اسے تو شہنشاہ اکبر کی خدمت میں پیش کرنا چاہیے۔'' راجا ڈائرل نے اپنے اردگرد بیٹھے ہوئے درباریوں کی طرف دیکھ کر کہا ''کیونکہ شہنشاہ سے بڑھ کر اس انجان کلاکار کے فن کی قدر اور کوئی نہیں کر سکتا۔''

''وہ تو ٹھیک ہے لیکن جہاں تک میرا خیال ہے مہابلی اکبر اعظم کو آفتابِ موسیقی میاں تان سین کے علاوہ کسی اور کو سننے کی ضرورت ہی نہیں ہے۔'' راجا مان سنگھ نے پھر تان سین پر اپنی ہمدردی اور مہربانی کا مینہ برسایا۔

لیکن وہاں ہونے والی ان تمام باتوں سے دور چلے جانے والے تان سین نے ان باتوں پر دھیان ہی نہیں دیا۔ اس وقت اس کی ادھ کھلی آنکھوں میں ایک عجیب سا خوف سمایا ہوا تھا' اچانک وہ شراب کی صراحی کو اپنے ایک ہاتھ میں تھام کر دھیرے سے اپنی جگہ سے اُٹھا اور درباریوں کے شور شرابے اور فقرے بازیوں کی آندھی کو نظر انداز کرتا ہوا شاہی بجرے کے ساتھ بندھی ہوئی چھوٹی سی کشتی پر بیٹھ گیا اور رسّی کے بندھن کو کھول کر خود ہی چپو چلاتا ہوا کشتی کو گھاٹ کی جانب لے جانے لگا۔

گھاٹ کی جانب سے آنے والی انجان گویے کی آواز اب کچھ صاف اور تیز سنائی دینے لگی تھی اور تان سین کی چھوٹی سی کشتی تیزی سے آگے بڑھتی چلی آ رہی تھی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے اجنبی گویے کی آواز تان سین کو اپنی طرف کھینچ رہی تھی اور ایک طرح سے یہ اس انجان گویے کی جیت ہی تھی۔

☆☆☆

کشتی کو گھاٹ پر لگا کر تان سین ہاتھ میں صراحی لیے اوپر آ گیا جہاں چاندنی رات میں ایک درخت کے قریب ایک نوجوان خوبصورت شخص اپنے دونوں ہاتھوں میں بینا تھامے بیٹھا تھا۔ تان سین دھیرے دھیرے چلتا ہوا اس کے قریب آ کر رک گیا' نوجوان گویے نے سر اُٹھا کر اس کی طرف دیکھا تو تان سین نے مسکراتے ہوئے کہا ''بہت اچھا گاتے ہو تم...... تمہاری آواز میں نے اپنے بجرے پر سنی تو مجھ سے رہا نہیں گیا اور تمہیں دیکھنے چلا آیا۔''

''تشریف رکھیے۔'' نوجوان نے تان سین کے قیمتی لباس کو دیکھتے ہوئے ہی سمجھ لیا تھا کہ آنے والے شخص کا تعلق یقیناً شاہی دربار سے ہی ہوگا۔

''آدھی رات کا یہ خوبصورت راگ تم نے کہاں سے سیکھا؟'' تان سین نے اس کے قریب بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

''یہ راگ بیہوگ میں نے اپنے بابا سے سیکھا ہے۔'' نوجوان گویے نے کہا ''اور میری بینا سے بھی انہی کے سُر نکلتے ہیں۔''

''مجھے تم سے مل کر بہت خوشی ہوئی ہے۔'' کہہ کر تان سین نے شراب کا ایک پیالہ بھر کر اس کی طرف بڑھاتے ہوئے آگے کہا ''لو میرے دوست' ہماری ملاقات کی خوشی میں ایک دوسرے کی سلامتی کے نام پر۔''

''نہیں شکریہ' میں برہمن ہوں' شراب کو ہاتھ نہیں لگاتا۔'' گویے کے انکار میں فخر کی جھلک تھی۔

''مگر یہ شراب نہیں ہے دوست۔'' تان سین مسکرا کر بولا ''یہ تو آبِ حیات ہے' یہ وہ عمل ہے جس کے رنگ میں ڈوب کر سنگیت میں چار چاند لگ جاتے ہیں۔''

''لیکن بابا کہتے ہیں کہ سات سُروں کی ست رنگی کے علاوہ گویے کو کوئی اور عمل نہیں کرنا چاہیے۔''

نوجوان گویے نے کسی ہونہار طالب علم کی طرح اپنا سبق دُہرایا تو تان سین اس کی معصومیت پر مسکرائے بغیر نہیں رہ سکا۔ اور مسکراتے ہوئے ہی بولا ''لگتا ہے بہت پیار کرتے ہیں تمہارے بابا...... تب ہی تو تم ان کے پڑھائے ہوئے سبق کو اپنی پگڑی میں باندھے پھرتے ہو۔''

''بے شک...... ہمارے بابا انسان نہیں پیار کے دیوتا ہیں۔'' نوجوان گویے نے سینہ تان کر فخریہ لہجے میں کہا ''بابا اکثر کہتے ہیں کہ بیٹا ملہار تو میرے سنگیت کلا کی زندہ تصویر ہے۔ کوئی مٹی کے بت بنا کر خوش ہو لیتا ہے لیکن میں نے تو اپنی کلا کے ذریعے وہ جان دار بت بنایا ہے جو ہندوستان کے کونے کونے میں میری کلا کی فتح کا جھنڈا لہرائے گا۔ تیرا باپ اگر بھری جوانی میں نہ اُٹھ گیا ہوتا تو میں کب کا اپنی منزل پر پہنچ کر رام نام ہری بھجن میں لگ گیا ہوتا۔ یہ سب کہتے کہتے بابا کی آنکھیں بھر آتی ہیں۔'' بولتے بولتے نوجوان گویے کی بڑی بڑی آنکھوں میں بھی نمی نظر آنے لگی لیکن وہ اسی جوش سے بولتا گیا ''بابا اکثر ہم دونوں کو گود میں بٹھا کر پیار کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اصل سے سود زیادہ پیارا ہوتا ہے۔''

اس کی یہ بات سن کر تان سین بُری طرح سے چونک پڑا۔ اسے تو ابھی تک اپنے سامنے بیٹھے ہوئے اس ایک گویے سے ہی خطرہ محسوس ہو رہا تھا۔ لیکن کسی دوسرے کا نام سن کر اس کے تو کان ہی کھڑے ہوگئے لیکن اس نے فوراً ہی خود کو سنبھال لیا اور مسکرانے کی کوشش کرتا ہوا پوچھ بیٹھا۔ ''میں تمہارا مطلب نہیں سمجھا۔ یہ تم کس دوسرے کی بات کر رہے ہو؟''

www.Paksociety.com

''ارے، میں تو بتانا ہی بھول گیا۔'' نوجوان گویا جلدی سے بولا ''دوسری ہے راگنی، میری بہن! ہم دونوں جڑواں پیدا ہوئے تھے، دونوں کو ساتھ ساتھ ہی ریاض کرایا ہے بابا نے، میں گاتا ہوں تو وہ سنگت کرتی ہے، بابا کہتے ہیں کہ تم دونوں ہی میرے لیے سُر اور تال کے جوڑے کی طرح ہو۔''

''ہوں۔'' تان سین نے بڑی بے چینی سے شراب کا پیالہ اُٹھا کر اپنے حلق میں انڈیل لیا اور پھر مسکراتے ہوئے بولا ''تم تو پنجاب کے رہنے والے ہو اور جہاں تک میں سمجھ رہا ہوں کہ تمہیں کسی سے عشق ہو گیا ہے اور اسی کی کشش تمہیں یہاں کھینچ لائی ہے۔''

جواب میں نوجوان گویا صرف مسکرا کر رہ گیا۔ جب اس نے تان سین کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا تو تان سین نے پھر بے چینی سے پوچھا ''کیا میں جان سکتا ہوں، وہ حسینہ کون ہے جس کی کشش تمہیں آگرہ تک کھینچ لائی ہے؟''

''وہ سچ مچ بہت حسین ہے میرے محترم دوست۔'' نوجوان گویے نے بڑے ہی گمبھیر لہجے میں کہا ''وہ مجھ جیسے بے شمار گانے والوں میں موجود ہے لیکن اس ماں کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں ڈال دی گئی ہیں اور میں اس کے ہاتھوں کی ہتھکڑیاں توڑنے کے لیے ہی آگرہ آیا ہوں۔''

''کیا نام ہے اس ماں کا؟'' تان سین نے پوچھا ''اور کس نے اسے ہتھکڑیوں میں جکڑ رکھا ہے؟''

''وہ ماں بینا بجانے والی سرسوتی دیوی کے نام سے مشہور ہے اور ساز اور آواز کے سارے ہی سُر اس کی کوکھ سے پھوٹتے ہیں۔ اس لیے دنیا میں جتنے بھی گویے ہیں سب اسی سرسوتی دیوی کے بیٹے ہیں۔'' نوجوان گویے ملہار نے تفصیل بتاتے ہوئے کہا۔

''یہ بات تو میں نے سنی ہے۔'' تان سین بولا ''لیکن تم تو ابھی کہہ رہے تھے کہ اس ماں کو کسی نے ہتھکڑیاں پہنا کر قید کر رکھا ہے...... وہ ظالم کون ہے؟''

''اس کا گھمنڈی بیٹا، جس کا نام تان سین ہے۔'' نوجوان ملہار نے نفرت بھرے لہجے میں کہا ''اس نے شہنشاہ اکبر کے شاہی دربار میں صرف اپنا سکہ جمائے رکھنے کے لیے اور خود کو آفتابِ موسیقی کہلوانے کے لیے سُر سنگیت کی دیوی سرسوتی ماں کو دوسرے اَن گنت بیٹوں کی آواز کو شاہی دربار تک کبھی پہنچنے نہیں دیا، وہ ایک کینہ پرور اور حاسد شخص ہے جس نے کبھی کسی اور گویے کی فن کارانہ صلاحیتوں کو تسلیم ہی نہیں کیا۔ اسے ہر لمحہ اس بات کا ڈر لگا رہتا ہے کہ اگر کوئی اور گویا شاہی دربار میں آ گیا اور شہنشاہ اکبر نے اسے پسندیدگی کی سند دے کر کسی خطاب سے نواز دیا تو اسے درباری گویے کی حیثیت سے وہ پذیرائی حاصل نہیں ہو گی جس کا وہ اب تک تنہا ہی مالک ہے۔ بس اسی لیے اس نے سُر سنگیت کی ہر آواز کو شاہی محلات سے دور رکھا اور اس طرح اس نے نہ صرف بے شمار گویوں کو ان کے حق سے محروم کیا ہے بلکہ ان گویوں کو پیدا کرنے والی ماں کو بھی بانجھ بنا کر اپنی دیواروں کے اندر قید کر رکھا ہے تاکہ اس کے سروں کی آواز شہنشاہ اکبر کے دربار تک نہ پہنچے۔''

نوجوان گویے ملہار کی باتیں سن کر تان سین کے جسم میں خوف کی ایک لہر سی دوڑ گئی اور اس کی آدھ کھلی آنکھیں پوری کی پوری کھل گئیں اور وہ بڑی عجیب سی نظروں سے نوجوان ملہار کی طرف دیکھنے لگا۔ ملہار کی باتیں سن کر وہ اندر ہی اندر سوچ رہا تھا کہ اپنی اصلیت اس نے ملہار پر ظاہر نہ کر کے بہت اچھا کیا ہے۔ ورنہ شاید یہ نوجوان گویا اس جگہ اس ویرانے میں اس کی گردن دبوچ لیتا۔

''لیکن تمہیں دیر ہو گئی ہے میرے بھائی!'' تان سین نے خود کو سنبھالا اور نرم لہجے میں کہا ''پنجاب سے آگرہ بہت دور ہے اس لیے تم تک یہ خبر نہیں پہنچی ہو گی کہ سرسوتی دیوی کو اسی کے ایک اور لاڈلے بیٹے بیجو باورا نے اس کے سارے بندھن توڑ کر اسے آزاد کر دیا تھا۔ اس لیے تمہارا یہاں آنا بے کار ہو گیا ہے۔''

''بے کار کیوں؟'' نوجوان ملہار نے ایک جھٹکے سے تان سین کی طرف دیکھ کر کہا ''مجھے تو یہاں آنا ہی تھا۔ بابا کہتے ہیں کہ ملہار بیٹے تو، تو ایک انمول رتن ہے اور رتن کی قدر تو بادشاہ کے دربار میں ہی ہوتی ہے۔ وہ مجھے بادشاہ سلامت کی خدمت میں پیش کرنا چاہتے ہیں۔''

''درست فرماتے ہیں تمہارے بابا، تم سچ مچ ہی انمول رتن ہی ہو لیکن اس طرح تم شہنشاہ کے دربار میں نہیں پہنچ سکو گے۔ سنسان راہیں اور یہ اجنبی شہر۔ دربار تک جانے کے لیے تمہیں کسی مضبوط سہارے کی ضرورت ہو گی۔ ایسے سہارے کی جو تمہیں سیدھے دربار تک لے جائے۔'' تان سین نے کہا۔

''میں جانتا ہوں۔'' ملہار بولا ''اور مجھے یقین ہے کہ کسی نہ کسی طرح راستہ مجھے مل ہی جائے گا۔''

''تو پھر ایسا کرو تم میرے ساتھ میرے غریب خانے پر چلو۔'' تان سین بولا ''میں تمہاری مدد کروں گا اور پوری کوشش کروں گا کہ تمہاری آواز شہنشاہ کے دربار میں گونجنے لگے۔''

''کیا آپ اس سلسلے میں کچھ کر سکیں گے؟'' نوجوان

ملہار نے پُر امید لہجے میں پوچھا۔

''کوشش ضرور کروں گا۔'' تان سین اُٹھتے ہوئے بولا ''چلو آؤ میرے ساتھ۔''

☆☆☆

اپنے میزبان کے شاندار محل میں پہنچ کر نوجوان ملہار نے دیکھا کہ وہ کس ایرے غیرے کے گھر میں مہمان بن کر نہیں آیا ہے بلکہ یہ تو سنگیت کے جادوگر آفتابِ موسیقی تان سین کا محل ہے اور اس کا نیا دوست خود تان سین ہے۔ ملہار کو یاد آیا کہ اس نے تان سین کے منہ پر ہی اس کی بُرائی کی تھی لیکن اس کے باوجود بھی تان سین کے ماتھے پر شکن تک نہیں آئی تھی اور اب وہ اسے اپنے ساتھ اپنے محل میں لے آیا تھا تاکہ وہ اس کے شاہی دربار میں رسائی کے سلسلے میں اس کی مدد کر سکے۔ نوجوان ملہار اپنے دل میں سوچ رہا تھا کہ تان سین تو ایک اچھا، سچا اور نیک آدمی ہے اور ایسا سچا فن کار اپنے جیسے کسی فن کار کی حق تلفی کیسے کر سکتا ہے؟

ملہار تان سین کے محل میں رہ کر اس کی دوستی، مہمان نوازی اور مہربانیوں کے رنگ میں ڈوب گیا اور آخر ایک دن اس نے اپنی بہن راگنی کو خط لکھ دیا کہ جلد ہی اس کی رسائی شاہی دربار میں ہو جائے گی۔ اس کے لیے خود آفتابِ موسیقی تان سین اس کی مدد کر رہا ہے۔ تان سین ہی اسے اپنے ساتھ اپنے محل میں لے آیا ہے اور آج کل وہ اس کا مہمان ہے۔

☆☆☆

کئی دن گزر گئے جب نوجوان ملہار کی بہن راگنی کو اپنے بھائی کی کوئی خبر نہیں ملی تو وہ پریشان ہو گئی۔ اس نے اپنے جاننے والوں کے ذریعے آگرہ میں موجود اپنے بھائی کی خیر خیریت معلوم کرنے کی کوشش کی لیکن وہاں سے راگنی کو اطلاع ملی کہ اس نام کا کوئی گویا نہ تو کبھی آگرہ میں آیا ہے اور نہ ہی کسی نے یہاں کبھی اس کی آواز ہی سنی ہے۔ اس خبر نے راگنی کو اور بھی بے چین کر دیا پھر وہ خود آگرہ پہنچی تاکہ تان سین سے مل کر وہ اپنے بھائی کے بارے میں پوچھ سکے۔ لیکن کئی دنوں کی کوشش کے باوجود وہ تان سین سے ملنے میں ناکام رہی، ہر بار اسے تان سین کے محل کے دروازے سے یہ کہہ کر ٹرخا دیا گیا کہ تان سین ہر ایرے غیرے سے نہیں ملا کرتے۔

تان سین کے محل کے پہرے داروں کے اس سلوک نے راگنی کو شک میں مبتلا کر دیا کہ اس کے بھائی نے اسے خود خط میں لکھا تھا کہ وہ تان سین کے محل میں ہی اس کا مہمان ہے اور تان سین نے اسے شاہی دربار تک پہنچانے کا وعدہ کیا ہے۔ لیکن اب اپنے بھائی کے نہ ملنے پر وہ یہ سوچنے پر مجبور ہو گئی تھی کہ کہیں یہ تان سین کی ہی کوئی سازش نہ ہو کیونکہ وہ کینہ پرور گویا کسی اور کو اپنے مقابل دیکھنا ہی نہیں چاہتا۔ بھلا اس جیسا حاسد آدمی یہ کیوں چاہے گا کہ شاہی دربار میں شاہی گویے کی گدی اس کے ہاتھ سے نکل جائے اور دربارِ اکبری میں اسے جو توقیر حاصل ہے وہ کوئی اور لے جائے۔

سوچتے سوچتے راگنی کو یقین ہو گیا کہ حسد اور رقابت کی آگ میں جل کر تان سین نے ہی اس کے بھائی کو کہیں کسی اندھیری کوٹھری میں قید کر دیا ہے یا اسے کہیں گم کر دیا ہے۔ آخر تھک ہار کر وہ اپنے بھائی کی گمشدگی کی فریاد لے کر شہنشاہ اکبر کے دربار میں پہنچ گئی۔

دربارِ اکبری میں سارے منصب دار اور درباری موجود تھے جن میں تان سین بھی موجود تھا۔ راگنی نے شہنشاہ اکبر کو اپنے بھائی کی گمشدگی کی بات بتائی اور یہ بھی بتایا کہ وہ ایک گمنام گویا ہے جسے خدا نے اس فن میں پوری طرح نواز رکھا ہے۔ وہ چاہتا تھا کہ کسی طرح شہنشاہ اکبر کے دربار میں حاضر ہو کر ان کے سامنے اپنے فن کا مظاہرہ کرے تاکہ شہنشاہ اکبر کی داد پا کر وہ گم نامی کے اندھیروں سے باہر نکل سکے اور اسے اس بات کا بھی یقین تھا کہ وہ دربارِ اکبری کے شاہی گویے آفتابِ موسیقی میاں تان سین سے بہت بہتر گویا ہے۔ جسے سننے کے بعد شہنشاہ اکبر تان سین کی جادوگری کو بھول جائیں گے۔

راگنی کی یہ ساری باتیں سن کر اکبر نے کہا ''ہم یقیناً فن کاروں کی قدر کرتے ہیں اور انہیں نوازتے بھی ہیں لیکن بہ قول تمہارے تمہارا بھائی آگرہ آیا ہوا ہے اور وہ آگرے میں ہے، تو ابھی تک دربار میں کیوں نہیں آیا ہے؟''

''وہ اس لیے نہیں پہنچ سکا جہاں پناہ کہ اس کے ہاتھ پاؤں باندھ کر کہیں قید کر دیا گیا ہے۔'' راگنی نے کہا ''یا پھر اس کی آواز کو دبانے کے لیے اسے قتل کر دیا گیا ہے۔''

''لیکن ہماری ریاست میں ایسا کون ہے جس نے ایک غریب فن کار کے ساتھ بے وجہ ایسا ظالمانہ سلوک کیا ہے؟'' شہنشاہ اکبر نے رعب دار آواز میں پوچھا۔

''جہاں پناہ، دنیا میں حاسدوں کی کمی نہیں ہے۔'' کہہ کر راگنی نے ایک نظر تان سین پر ڈالی اور مزید کہا ''ایک فن کار ہی دوسرے فن کار کا دشمن بن گیا ہے۔ جو نہیں چاہتا کہ جہاں پناہ کے دربار میں جو منصب اسے حاصل ہے، وہ اس سے چھن جائے اس لیے اس حاسد نے میرے بھائی کو غائب کر دیا ہے تاکہ اس کی آواز آپ تک نہ پہنچ سکے اور وہ بدستور آپ کی

آنکھوں کا تارا بنا رہے۔"

"یہ تو حق دار کی حق تلفی کی گئی ہے۔" شہنشاہ اکبر نے کہا "تم صاف صاف بتاؤ' کون ہے وہ' کیا نام ہے اس کا؟"

"مجھے ڈر ہے جہاں پناہ کہ اس شخص کا نام اگر میرے منہ سے نکلا تو شاید اکبری انصاف عتاب میں بدل جائے۔"

"لڑکی ہوش کی بات کرو۔" شہنشاہ اکبر نے غصے میں چیخ کر کہا "تم اس وقت انصاف کے دربار میں کھڑی ہو اور ہم تمہیں یقین دلاتے ہیں کہ تمہارے ساتھ انصاف ہوگا۔ تم بے خوف ہو کر ہمیں اس کا نام بتاؤ جس نے تمہارے بھائی کے ساتھ یہ ظلم کیا ہے؟"

"اس ظالم اور حاسد شخص کا نام ہے میاں تان سین' جسے شہنشاہ اکبر نے آفتاب موسیقی کا خطاب دے رکھا ہے۔" راگنی نے یہ کہہ کر جیسے اکبر اعظم کے سینے پر گھونسا مارا ہو۔ شہنشاہ اکبر' تان سین کا نام سنتے ہی اُچھل پڑا' اس کی آنکھیں غصے میں سرخ ہوتی چلی گئیں اور پھر وہ پورے رعب و دبدبے سے چیخ پڑا "لڑکی' تم اکبری دربار کے ایک چمکتے ہیرے پر یہ فضول الزام لگا رہی ہو۔ تمہیں اس کا ثبوت دینا ہوگا اور اگر تمہارا الزام سچ ثابت نہیں ہوا تو ہم تمہاری گردن اُڑا دیں گے۔"

"جہاں پناہ! میں جو الزام لگا رہی ہوں' وہ پورے ہوش و حواس میں رہ کر ہی لگا رہی ہوں۔" راگنی نے بڑے ہی پُراعتماد لہجے میں کہا اور پھر اپنے آنچل میں بندھا ہوا ایک کاغذ نکال کر پیش کار کی جانب بڑھا دیا۔ پیش کار نے اس کے ہاتھ سے کاغذ لے کر اسے شہنشاہ کی خدمت میں پیش کر دیا۔

"کیا ہے اس کاغذ میں؟" شہنشاہ اکبر نے پوچھا۔

"جہاں پناہ' یہ میرے بھائی کا وہ خط ہے جو اس نے آگرے سے لکھا تھا کہ وہ یہاں میاں تان سین کے محل میں اس کا مہمان ہے اور تان سین نے اس سے وعدہ کر رکھا ہے کہ وہ بہت جلد اسے شاہی دربار میں لے جائے گا۔ بس جہاں پناہ' اس کے بعد سے ہی میرے بھائی ملہار کا کوئی پتا نہیں ہے۔ اس خط سے یہ صاف ظاہر ہے کہ وہ میاں تان سین کے محل میں ہی رہ رہا ہے لیکن جب میں اس سے ملنے یہاں آئی تو تان سین کے محل کے پہرے داروں نے مجھے تان سین سے ملنے ہی نہیں دیا۔" یہاں تک کہہ کر راگنی نے مڑ کر تان سین کی طرف دیکھ کر پوچھا "کیا میاں تان سین کو انکار ہے کہ میرا بھائی ان کا مہمان نہیں تھا؟"

شہنشاہ اکبر نے حیران نگاہوں سے تان سین کی طرف دیکھا' تان سین کے چہرے پر گھبراہٹ کے آثار تھے' وہ ذرا دیر تک تو راگنی کے سوال کا جواب ہی نہیں دے سکا۔ سارے دربار میں ایک گمبھیر اور منحوس سا سناٹا چھایا ہوا تھا۔ مغل سلطنت کی تاریخ میں شاید یہ پہلا ہی موقع تھا جب رعایا کی ایک غریب لڑکی نے اکبری دربار کے نورتنوں کے سرتاج آفتاب موسیقی میاں تان سین پر اپنے بھائی کو گم کر دینے یا اس کو قتل کرنے کا الزام عائد کیا تھا۔

تان سین ابھی اپنی گھبراہٹ پر قابو بھی نہیں پا سکا تھا کہ شہنشاہ اکبر کی آواز گونجی "آپ بولتے کیوں نہیں میاں تان سین' جواب دیجیے۔ یہ لڑکی کیا پوچھ رہی ہے؟"

"یہ درست ہے جہاں پناہ!" تان سین نے اپنی جگہ سے کھڑے ہو کر کہا "وہ پردیسی گویا چند دنوں تک میرا مہمان ضرور رہا تھا لیکن ایک دن وہ مجھے بتائے بغیر ہی کہیں چلا گیا۔"

"یہ جھوٹ ہے جہاں پناہ!" راگنی گرج کر بولی "میزبان اور مہمان کو جب ایک دوسرے سے کوئی شکایت نہیں تھی تو مہمان اپنے میزبان کو بتائے بغیر کیوں چلا گیا؟ اور وہ کہاں چلا گیا؟"

"مگر یہ سچ ہے کہ مجھے نہیں معلوم' وہ کہاں چلا گیا؟" تان سین نے کہا۔

"آپ جہاں پناہ کے سامنے بھی جھوٹ بول رہے ہیں۔" راگنی نے اسی کرخت لہجے میں کہا "لیکن میں آپ کو بتانا چاہتی ہوں کہ اب ساری دنیا یہ بات جان جائے گی کہ آپ نہ صرف جھوٹے ہیں بلکہ فنِ موسیقی کے دشمن اور اس کے قاتل بھی ہیں۔" یہ کہہ کر راگنی نے شہنشاہ اکبر کی طرف دیکھا اور التجا آمیز لہجے میں بولی "جہاں پناہ! میری یہ چھوٹی سی درخواست ہے کہ مجھے میاں تان سین کے محل میں گانے کا موقع دیا جائے۔"

"مگر اس سے کیا ہوگا؟" شہنشاہ اکبر نے حیرت سے پوچھا۔ "کیا تمہارے گانے کی آواز سن کر تمہارا بھائی لوٹ آئے گا؟"

"ہاں جہاں پناہ!" راگنی نے گمبھیر لہجے میں کہا "اگر میری آواز میں کشش اور میرے فن میں سچائی کی طاقت ہوگی تو میاں تان سین کے محل کی ایک ایک اینٹ ان کے گناہ اور ان کے جرم کے خلاف آواز بلند کرے گی۔ جہاں پناہ' میں نہ تو کوئی درباری گائیک ہوں اور نہ ہی درباری "واہ واہ" کے سہارے میری تان گونجتی ہے۔ میں تو وہ غریب فن کار ہوں جو فنِ موسیقی کو عبادت سمجھتی ہے اور مجھے اپنی عبادت پر پورا بھروسا ہے۔"

راگنی کی باتیں سن کر شہنشاہ اکبر کے ہونٹوں پر ایک عجیب سی مسکراہٹ دوڑ گئی۔ اس نے ایک طائرانہ نظر

درباریوں پر ڈالی اور مسکرا کر کہا "ہمارے لیے یہ ایک انوکھا تجربہ ہوگا' ہم نے دیپک راگ اور راگ ملہار کے کرشمے تو دیکھے ہیں' لیکن موسیقی کی طاقت کا یہ انوکھا تماشا ہم پہلی بار ہی دیکھیں گے۔" راگنی نے جھک کر شہنشاہ اکبر کا شکریہ ادا کیا۔ اسے تان سین کے محل میں گانے کی اجازت مل چکی تھی۔

☆☆☆

تان سین کے محل کا باغ درباریوں اور شہر کے دیگر متمول لوگوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ سامنے کے ایک تخت پر خود شہنشاہ اکبر براجمان تھا۔ محل کے آس پاس کے مکانات کی چھتوں اور اونچے اونچے پیڑوں پر بھی تماش بین چڑھ کر بیٹھ گئے تھے۔

راگنی اپنے بوڑھے بابا کے ساتھ شہنشاہ اکبر کے تخت کے قریب سبز گھاس کے قالین پر بچھی سفید چاندنی پر بیٹھی تھی۔ تمام لوگوں کی بے قرار آنکھیں اس پر جمی ہوئی تھیں۔ پھر شہنشاہ اکبر کا اشارہ پا کر راگنی نے بینا کے تاروں پر اپنی انگلیاں رکھ دیں۔ اس وقت اس کی آنکھوں میں ایک عجیب سی چمک تھی اور چہرے سے روشنی کی کرنیں پھوٹ رہی تھیں۔ دھیرے دھیرے اس کی انگلیوں نے بینا کے تاروں سے کھیلنا شروع کر دیا۔ پھر اس کے گلے سے اداسی میں ڈوبی ہوئی ایک تان نکلی اور پھر وہ تان دل میں اُتر جانے والے بولوں میں تبدیل ہوتی چلی گئی۔ وقت گزرتا رہا اور آس پاس بیٹھے ہوئے ہر شخص پر نشے کی سی کیفیت طاری ہونے لگی "جاگو رے جاگو...... راگھو ناتھ کنور" راگنی کی درد بھری آواز اپنے پیارے بھائی کو پکار رہی تھی۔ ذرا ذرا دیر بعد اس کی آواز کا بہاؤ تیز ہوتا جا رہا تھا پھر یہ آواز دگنی سے تگنی اور چوگنی ہوگئی پھر اچانک اس کے بول ہی بدل گئے۔ اب راگنی کے الاپ سے بھیروی راگ کی کپکپا دینے والی ایک جھنکار سی نکل رہی تھی۔ اس کی آواز کی لہروں میں یوں لگ رہا تھا جیسے جمنا ندی کی لہریں بھی نشے میں بدمست ہو کر شہر کے اونچے اونچے برج اور میناروں کو چاٹ جانا چاہتی ہوں' ایسا لگ رہا تھا جیسے بھیروی راگ کی تیز لہر تان سین کے محل میں ہی نہیں بلکہ سارے شہر میں گونج رہی ہو۔

باغ کے کھلے میدان میں بیٹھے ہوئے سامعین کی بے کلی لمحہ بہ لمحہ بڑھتی جا رہی تھی اور شہنشاہ اکبر کو تو یہ محسوس ہو رہا تھا کہ اگر اور تھوڑی دیر تک یہی حالت رہی تو راگنی کے گلے سے نکلتی ہوئی آواز کے بارود سے آگرے کا قلعہ بھی زمین بوس ہو جائے گا۔ سارے محل ترچھے ہو جائیں گے اور حویلیاں ہوا میں اُڑنے لگیں گی۔

راگنی کی انگلیاں بینا کے تاروں پر سے کبھی کی ہٹ چکی

صحت مند زندگی کی 20 علامات:

☆ بھرپور نیند ☆ صبح جاگنے پر پھرتی اور امنگ ظاہر ہونا ☆ پاخانہ باقاعدہ اور صاف و بندھا ہوا آنا ☆ بھوک کی نوعیت نارمل رہنا ☆ تمام دن کے افعال و مشاغل میں دلچسپی کا برقرار رہنا ☆ پیٹ ، چھاتی سے کم ہونا ☆ نشیلی اور متحرک اشیا کی خواہش کا پیدا نہ ہونا ☆ دلی طور پر خوشی محسوس ہونا اور روحانی طور پر مطمئن رہنا ☆ بغیر تھکاوٹ کے کئی گھنٹوں تک کام کرنے کی صلاحیت کا ہونا ☆ بڑھ چڑھ کر تعمیری کاموں میں حصہ لینا ☆ خوش مزاج ہونا، چڑچڑانہ ہونا ☆ چہرے پر رونق اور طبیعت کا ہشاش بشاش ہونا ☆ آنکھوں میں چمک اور بے خوفی کا نمایاں ہونا ☆ چہرے پر مسکراہٹ رہنا ☆ جسم میں ہمیشہ جواں ہمتی اور قوت کا احساس رہنا ☆ ہر حال میں تعمیری نظریات رکھنا ☆ تمام جسمانی افعال بہ آسانی انجام دینا ☆ جسم صاف ستھرا اور بے داغ ہونا ☆ بال و جلد صحت مندی کی طرف مائل رہنا ☆ تحمل مزاج ہونا۔

بیمار جسم کی 20 علامات:

ذیل میں بیس ایسی علامات بیان کی جارہی ہیں جو بیمار جسم کی غماز ہیں ☆ کسی بھی جسمانی فعل کا غیر فطری ہونا ☆ گہری و پرسکون نیند کا نہ آنا ☆ پاخانہ پتلا یا گانٹھ دار آنا ☆ بھوک کا نہ لگنا ☆ افعال و مشاغل سے بوریت ہونا ☆ پیٹ بڑھا ہوا ہونا یا موٹاپا ہونا ☆ نشیلی اشیا کی شدید خواہش رکھنا ☆ انسان افسردہ اور مردہ دل رہنا ☆ تھوڑا سا کام کرنے سے تھکاوٹ ہو جانا ☆ تعمیری کاموں میں دلچسپی نہ ہونا ☆ چڑچڑاپن غالب رہنا ☆ چہرہ بے رونق رہنا اور سر درد رہنا ☆ آنکھوں میں مردنی چھائے رہنا ☆ چہرے سے افسردگی نمایاں ہونا ☆ جسم میں ہمیشہ نقاہت و تھکاوٹ کا رہنا ☆ مختلف وجوہ کی بنا پر تخریبی خیالات غالب رہنا ☆ جسمانی افعال کو کرنے سے نفرت ہونا ☆ جسم سے بدبو آنا اور چہرے پر داغ دھبے نمایاں ہونا ☆ بال گرنا اور جلد عموماً خشک رہنا ☆ بہت جلد غصہ آنا۔

تھیں لیکن بینا کے تاروں کی جھنکار بدستور گونج رہی تھی۔ راگنی کے گردن کی نسیں پھولی ہوئی تھیں جن سے نکلنے والی آواز اب برداشت سے باہر ہوتی جارہی تھی۔ شہنشاہ اکبر نے گھبرا کر چاروں طرف دیکھا اور پھر اپنی انگلیاں کانوں میں ٹھونس لیں اور کئی کمزور دل لوگ تو خوف کے مارے چیخ پڑے۔ ان چیخوں کی بھیانک آوازوں سے راگنی کا دھیان بٹ گیا۔ اس نے چونک کر دیکھا تو سامنے بیٹھے ہوئے لوگ خوف سے تھر تھر کانپ رہے ہیں۔ یہ حالت دیکھ کر اس نے فوراً اپنے سروں کا رُخ موڑلیا' ٹھنڈی ٹھنڈی پُرسکون لہروں کی طرف' دھیرے دھیرے وہ لوٹنے لگی اور پھر اس کے گلے سے وہی میٹھے بول نکلنے لگے" جا گورے جا گور گھوناتھ کنور......"

اس بار ایک عجیب سی مسکراہٹ تھی اس کے چہرے پر اس مسکراہٹ میں اس کے دل کے درد کا عکس صاف نظر آرہا تھا۔ خود شہنشاہ اکبر اس کے درباریوں اور سامنے بیٹھے ہوئے تمام لوگوں نے راگنی کے ہونٹوں پر درد بھری مسکراہٹ کو دیکھا' ان میں سے کئی لوگ تو اپنے جذبات پر قابو ہی نہ رکھ پائے اور ان کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ سارا ماحول ہی درد اور اُداسی کے رنگ میں ڈوب گیا تھا اور آخرکار راگنی کے راگ کی پکار رنگ لے آئی' گڑگڑاہٹ کی ایک آواز نے یکایک ہی سب کی توجہ اپنی جانب مبذول کرلی اور لوگوں نے اس طرف دیکھا تو انہیں شیشم کے ایک درخت کے نیچے کی زمین اس طرح ہلتی ہوئی نظر آئی جیسے وہاں زلزلہ آگیا ہو اور شیشم کا درخت جڑ سے اُکھڑ کر گر جانے والا ہو۔

شہنشاہ اکبر اور دیگر تمام لوگ پھٹی پھٹی آنکھوں سے اس منظر کو دیکھ ہی رہے تھے کہ اچانک ایک اور گڑگڑاہٹ ہوئی اور شیشم کے درخت کے نیچے کی مٹی دو حصوں میں پھٹ گئی اور اس میں سے نوجوان ملہار کی لاش نکل کر ایک لمحے کے لیے اوپر اُٹھ کر ہوا میں معلق ہوگئی۔ اس کی گردن آدھی کٹی ہوئی تھی اور اس کے خون آلود کپڑوں میں مٹی چپکی ہوئی تھی۔ راگنی اور اس کے بوڑھے بابا کے منہ سے ایک ساتھ ہی چیخ نکلی اور دوسرے ہی لمحے وہ لاش اس گڑھے میں جا کر غائب ہوگئی اور زمین پھر ہموار ہوگئی۔

لوگوں کی آنکھیں اب بھی اس جگہ جمی ہوئی تھیں لیکن اب وہاں کچھ بھی نہیں تھا۔ نوجوان گویے ملہار کی لاش اپنے قتل کا ثبوت پیش کرکے جا چکی تھی۔ راگنی سسک سسک کر رو رہی تھی اور اس کا بوڑھا بابا زمین پر سر پٹک رہا تھا" ثبوت مل گیا ہے میاں تان سین......!" اچانک شہنشاہ اکبر کی گرج دار آواز نے ماحول کے بھیانک سناٹے کو توڑ دیا۔" ہمارے ساتھ یہاں موجود ہزاروں آنکھوں نے بھی وہ منظر دیکھا ہے' ہمیں نہیں معلوم تھا کہ ہم جسے موسیقی کا دیوتا سمجھتے تھے' وہ ایک کینہ پرور حاسد اور قاتل شخص ہے۔ اس کے ہاتھ ایک معصوم بے گناہ کے خون سے رنگے ہوئے ہیں۔" یہ کہہ کر شہنشاہ اکبر نے ایک گہرا لمبا سانس لے کر تان سین کی طرف گھور کر دیکھا لیکن اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتا' راگنی کی آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی" جہاں پناہ' سچائی آپ کے سامنے آگئی ہے۔ بھگوان نے میری اور میرے سُروں کی لاج رکھ لی ہے اور اب انصاف آپ کے ہاتھ میں ہے۔ انصاف کیجئے جہاں پناہ!"

"قتل کی سزا تو موت ہی ہوسکتی ہے ظلِ الٰہی......" درباریوں میں سے ایک شخص نے اُٹھ کر جذباتی لہجے میں کہا" اس بے گناہ نوجوان کی لاش خود آپ کے انصاف کو پکار رہی ہے۔"

"انصاف ضرور ہوگا۔" شہنشاہ اکبر نے اپنی گرج دار آواز میں کہا اور پھر سپاہیوں کو حکم دیتے ہوئے کہا" تان سین کو بیڑیاں پہنا کر اس محل میں نظر بند کردیا جائے اور کل اسے شاہی دربار میں پیش کیا جائے جہاں اس کی قسمت کا فیصلہ ہوگا۔" یہ کہہ کر شہنشاہ اکبر اپنی جگہ سے اُٹھ گیا۔

☆☆☆

دوسرے روز شاہی دربار تمام درباریوں اور شہر کے دیگر عمائدین سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ راگنی اپنے بابا کے ساتھ دربار میں موجود تھی۔ تھوڑی دیر بعد شہنشاہ اکبر کی آمد کا اعلان ہوا تو تمام درباری اپنی اپنی جگہ پر مؤدب کھڑے ہوگئے" کارروائی شروع کی جائے اور ملزم تان سین کو دربار میں پیش کیا جائے۔" شہنشاہ اکبر کے تخت پر بیٹھتے ہی پیش کار نے اعلان کیا تو زنجیروں میں جکڑے ہوئے تان سین کو دربار میں لاکر کھڑا کردیا گیا۔

"میاں تان سین!" دربار میں شہنشاہ اکبر کی بھاری بھرکم آواز گونجی" چونکہ تمہارے اس گھناؤنے جرم کا کوئی چشم دید گواہ نہیں ہے۔ اس لیے ہم چاہتے ہیں کہ تم خود ہی ہمیں سچ سچ بتادو حالانکہ تمہارے محل کے باغ کی مٹی نے ہمیں اس نوجوان گویے کی لاش دکھادی ہے لیکن اس کے باوجود ہم تمہارے منہ سے سننا چاہتے ہیں۔"

"جہاں پناہ' میں اپنے اس فعل پر شرمندہ ہوں اور ظلِ الٰہی سے معافی کا خواستگار ہوں۔" تان سین نے سر جھکا کر دھیمے لہجے میں کہا" لیکن اپنی صفائی میں میں اتنا ضرور کہوں گا کہ یہ جرم میں نے جان بوجھ کر نہیں کیا ہے' مجھے خود حیرت ہے کہ یہ شیطانی فعل مجھ سے نادانستگی میں سرزد ہوگیا ہے۔

نشے کی حالت میں مجھے اس بات کا ہوش ہی نہیں رہا تھا کہ میں کیا کررہا ہوں......"

"آدمی کو نشہ اتنا ہی کرنا چاہیے جتنا وہ برداشت کرسکے۔" شہنشاہ اکبر نے کہا" زیادتی کی حالت میں شیطان غالب آہی جاتا ہے۔"

"لیکن جہاں پناہ' میاں تان سین جھوٹ بول رہے ہیں۔" راگنی نے کھڑے ہوکر کہا" یہ کوئی شیطانی فعل نہیں ہے بلکہ یہ ایک سوچا سمجھا منصوبہ تھا اور اس منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کا فیصلہ میاں تان سین نے اسی وقت کرلیا تھا جب میرے بھائی ملہار کے گانے کی آواز سن کر وہ اکیلے ہی گھاٹ پر جا کر اس سے ملے تھے اور اسے اپنے ساتھ اپنے محل میں لے آئے تھے اور پھر ایک رات انہوں نے وہی کیا جو انہوں نے پہلے سے سوچ لیا تھا۔"

"بالکل ایسا ہی ہوا ہے۔" شہنشاہ اکبر نے کہا" ہمیں تمہاری بات سے اتفاق ہے اور یہ ثابت ہوچکا ہے کہ اس نے نوجوان ملہار کو قتل کیا ہے اور اس کی لاش اپنے محل کے باغ میں ایک درخت کے نیچے دفن کی ہے جسے وہاں سے کھود کر نکالا جاسکتا ہے۔ اس لیے انصاف کا تقاضا ہے کہ قتل کی سزا موت ہی ہوسکتی ہے اور ہم اسے سزائے موت دیتے ہیں۔"

"نہیں......نہیں عالم پناہ!......رحم' رحم۔" دربار میں موجود تان سین کے مداح چیخ پڑے لیکن شاہی حکم صادر ہوچکا تھا پھر جب تان سین کو سپاہی باہر لے جانے لگے تو اچانک ہی راگنی کا بوڑھا بابا اپنے دونوں ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہوگیا اور التجا آمیز لہجے میں بولا" نہیں جہاں پناہ...... ذرا ٹھہریے' میں مرنے والے جوان بیٹے ملہار کا باپ ہوں......اور ہاتھ جوڑ کر ظلِ الٰہی سے درخواست کررہا ہوں کہ میرے بیٹے کے قاتل کو کوئی سزا نہ دی جائے' اسے معاف کردیا جائے جہاں پناہ!"

"یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟" شہنشاہ اکبر نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ بوڑھے بابا کی بات سن کر دربار میں موجود تمام لوگ بھی حیرت بھری نظروں سے بوڑھے بابا کو ہی دیکھ رہے تھے اور ان کی سماعت سے شہنشاہ کی آواز ٹکرا رہی تھی" قتل جیسے بھیانک جرم کے لیے معافی کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ تان سین کو اپنے کیے کی سزا بھگتنی ہی ہوگی۔"

"میں خود بھی یہی چاہتا ہوں ظلِ الٰہی کہ مجرم اپنے جرم کی سزا ضرور بھگتے۔ مگر یہ سزا ایسی نہ ہو جو ایک جھٹکے میں ہی پوری ہوجائے اور مجرم کو اپنے کیے پر پچھتانے کا وقت ہی نہ ملے۔"

"ہم تمہارا مطلب نہیں سمجھے۔" شہنشاہ اکبر نے کہا" آخر تم کہنا کیا چاہتے ہو؟"

کون کہتا ہے کہ؟

اولاد نہیں ہوسکتی

آج بھی لاکھوں گھرانے اولاد کی نعمت سے محروم سخت پریشان ہیں۔ مایوسی گناہ ہے۔ اِنشاءاللہ اولاد ہوگی۔ خاتون میں کوئی اندرونی پرابلم ہو یا مردانہ جراثیم کا مسئلہ۔ ہم نے دیسی طبی یونانی قدرتی جڑی بوٹیوں سے ایک خاص قسم کا بے اولادی کورس تیار کیا ہے۔ جو آپ کے آنگن میں بھی خوشیوں کے پھول کھلا سکتا ہے۔ آپکے گھر میں بھی خوبصورت بیٹا پیدا ہوسکتا ہے۔ آج ہی گھر بیٹھے فون پر تمام حالات سے آگاہ کرکے بذریعہ ڈاک وی پی VP بے اولادی کورس منگوائیں۔

المُسلم دارالحکمت رجسٹرڈ (دواخانہ)
ضلع وشہر حافظ آباد۔ پاکستان
0300-6526061
0547-521787

فون اوقات
صبح 9 بجے سے رات 11 بجے تک

آپ ہمیں صرف فون کریں
دوائی آپ تک ہم پہنچائیں گے

”جہاں پناہ‘ میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اس شخص کے لیے سزائے موت ناکافی ہے۔“ بوڑھے بابا نے کہا ”میری اور میری بیٹی کی بھی یہی خواہش ہے کہ اسے زندہ رہنے دیا جائے‘ اس کی بیڑیاں کھول دی جائیں کیونکہ اس کی موت سے اکبری انصاف کا دل تو بھر جائے گا لیکن سزا کا مقصد پورا نہیں ہوگا۔ یہ زندہ رہے گا تو زندگی بھر اس گناہ کا ہتھوڑا اس کے سینے پر برستا رہے گا اور اس کے جرم کی بجلی اسی کے سر پر گرا گرا کے بے موت مارتی رہے گی۔ جہاں پناہ‘ یہ میرے معصوم بیٹے کی شاندار جیت کا زندہ ثبوت ہے۔ یہ جب تک زندہ رہے گا جہاں پناہ‘ لوگوں کے دلوں میں میرے بیٹے اور میری بیٹی راگنی کے بھائی کی جیت کی کہانی اپنے آپ گونجتی رہے گی۔“

”بہت خوب‘ بہت خوب!“ بوڑھے بابا کے چپ ہوتے ہی شہنشاہ اکبر نے کہا ”تم نے اپنے بیٹے کے قاتل کی جاں بخشی کر کے اس پر ایک احسان عظیم کیا ہے۔ لیکن ہم اسے کسی صورت معاف نہیں کریں گے۔ آج سے میاں تان سین کا نام ہمارے نورتنوں سے نکال دیا جائے گا۔ اب یہ آفتابِ موسیقی بھی نہیں رہا۔ ہم اس کو حاصل تمام خطابات اور تمام مراعات سے محروم کرتے ہیں‘ اب یہ محل کے عیش و آرام کے بجائے کہیں کسی جھونپڑے میں گمنامی کی زندگی بسر کرے گا‘ اسے نہ کہیں گانے کی اجازت ہوگی اور نہ ہی ساز بجانے کی۔“ اتنا کہہ کر شہنشاہ اکبر نے صوبے دار کی طرف دیکھ کر حکم دیا ”اس کی بیڑیاں کھول کر اسے جمنا کے پار کہیں گوشۂ گمنامی میں دھکیل دیا جائے تاکہ یہ جب تک زندہ رہے دھیرے دھیرے موت کی طرف بڑھتا رہے۔“

شاہی حکم سنتے ہی سپاہیوں نے تان سین کی بیڑیاں کھولنا شروع کر دیں اور ٹھیک اسی وقت راگنی نے اپنی جگہ سے اٹھ کر کہا ”جہاں پناہ‘ میری بھی ایک گزارش ہے۔ اگر اجازت ہو تو عرض کروں۔“

”اجازت ہے بیٹی کہو کیا کہنا چاہتی ہو تم؟“ شہنشاہ اکبر نے کہا۔

”جہاں پناہ‘ تان سین کا یہ دعویٰ ہے کہ ہندوستان بھر میں صرف وہی ایسا گائیک ہے جو دیپک راگ کے ذریعے بجھی ہوئی شمع کو روشن کر سکتا ہے اور اس کی اسی خوبی کی وجہ سے شہنشاہ اکبر نے اسے آفتابِ موسیقی کا خطاب دے کر شاہی دربار کا خاص گائیک بنایا ہے۔“

”تو اس میں غلط کیا ہے لڑکی؟“ شہنشاہ اکبر نے پوچھا۔

”غلط یہ ہے جہاں پناہ کہ تان سین نے آپ سے جھوٹ بولا تھا کہ ہندوستان میں اس کے سوا کوئی گویا دیپک راگ نہیں گا سکتا......“ راگنی نے کہا ”دراصل اس حاسد اور کینہ پرور شخص نے اپنی درباری طاقت کے زور پر کسی گویے کی آواز کو آپ تک پہنچنے ہی نہیں دیا حالانکہ اسے معلوم ہے کہ فن کسی کی میراث نہیں ہے۔ دیپک راگ گانے والے اتنے بڑے ہندوستان میں اور بھی کئی ہوں گے لیکن فی الحال میں چاہوں گی کہ ظلِ الٰہی میرے بابا کو بھی سن لیں اور میاں تان سین کو بھی سننے کو موقع دیں تاکہ اس کے جھوٹ کا پردہ سب کی آنکھوں کے سامنے مزید چاک ہو جائے۔“

”راگنی بیٹی‘ تم ہمیں تماشے پر تماشا دکھانا چاہتی ہو؟‘ شہنشاہ اکبر نے ہنس کر کہا ”بھلا تان سین کے علاوہ ایسا کون سا فن کار ہے جو دیپک راگ گا کر ساری بجھی شمعوں کو جلا سکے؟“

”اگر آپ اجازت دیں تو میرے بابا دیپک راگ گا کر یہ ثابت کر دیں گے کہ یہ راگ صرف تان سین ہی نہیں گا سکتا۔“ راگنی نے پُراعتماد لہجے میں کہا ”جہاں پناہ‘ اس سے یہ بات بھی ثابت ہو جائے گی کہ دیپک راگ کا وارث صرف تان سین ہی نہیں ہے۔“

”ٹھیک ہے...... ہم تمہارے بابا کو اجازت دیتے ہیں۔“ شہنشاہ اکبر نے کہا ”اور تھوڑی دیر کے لیے تان سین کو بھی اپنے سامنے بیٹھنے کی اجازت دیتے ہیں۔“

”بہت بہت شکریہ عالم پناہ‘ میں آج اس شاہی دربار میں دیپک راگ پیش کروں گا جس کے بغیر سُر سنگیت شاندار محل اندھیروں میں ڈوبا نظر آتا ہے۔“ بوڑھے پنجابی بابا نے اپنی پگڑی کو شان سے سر پر جماتے ہوئے کہا ”جہاں پناہ‘ ان تمام شمع دانوں کو اس وقت چپ رہنے کا حکم دیجیے جب تک میرے راگ کا جادو انہیں بولنے پر مجبور نہ کر دے‘ سارا دربار بوڑھے گویے کا سنگیت سننے کے لیے بے تاب تھا۔ ایک طرف تان سین بیٹھا بڑی حیرت سے بوڑھے گویے کی طرف دیکھ رہا تھا۔ شہنشاہ کے اشارے پر دربار کی تمام شمع دانوں کو بجھا دیا گیا‘ پھر شاہی حکم پر بوڑھے گویے نے بینا اٹھا کر اس کے تاروں کو چھیڑا اور اپنی الاپ شروع کر دی۔

پہلے تو اس کی الاپ میں بہت دھیما پن تھا پھر دھیرے دھیرے وہ الاپ دو گنی اور پھر چوگنی ہو کر دربار میں گونجنے لگی۔ تان سین کے سوا دربار میں موجود سارے ہی لوگ اس بوڑھے کے دیپک راگ میں مست ہو چکے تھے‘ بوڑھا گویا اپنی الاپ کے درمیان میں کبھی کبھی دھیمی آواز میں کسی کو پکارتا جاتا تھا ”نائیکی...... نائیکی...... آجا نائیکی...... دیرے تال کے سنگ آ...... نائیکی میرے راگ کو سب سے اونچا

مولی پر پہنچانے کے لیے آ......“ وہ دھیمی دھیمی آواز میں اپنے سنگیت کی دیوی کو پکارتے پکارتے بڑبڑانے لگتا تھا ”روشن کر دے تھوڑی دیر کے لیے محل کے سارے شمع دانوں کو...... روشن کر دے نائیکی ......روشن کر دے۔“ اس بڑبڑاہٹ کے بعد اس کی الاپ اور تیز ہو گئی...... پھر ذرا دیر بعد ہی یکایک محل کے سارے شمع دان ہنس پڑے اور اندھیرے دربار میں اُجالا پھیل گیا۔

سارے درباری گردن اُٹھائے روشن شمع دانوں کی طرف دیکھ رہے تھے۔ خود شہنشاہ اکبر بھی حیرت بھری نظروں سے یہ منظر دیکھ رہا تھا پھر اچانک دربار میں اس کی آواز گونج اٹھی ”اپنے دیپک راگ سے ان بجھے شمع دانوں کو روشن کر کے تم نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ اس راگ کا ایک اکیلا وارث صرف تان سین ہی نہیں ہے بلکہ......“

”ٹھہریے جہاں پناہ، یہ دیپک راگ نہیں تھا۔“ اچانک تان سین نے اپنی جگہ سے اُٹھ کر شہنشاہ اکبر کی بات کاٹ دی اور آگے بولا ”یہ بوڑھا آپ کو فریب دے رہا ہے جہاں پناہ!“

”کیسا فریب؟“ شہنشاہ اکبر نے گرج کر کہا ”بجھی ہوئی شمعوں کو ہم نے اور سارے دربار نے اپنی آنکھوں سے جلتے دیکھا ہے اور تم یہ کہہ رہے ہو یہ فریب ہے؟“

”جی ہاں عالم پناہ! یہ کن بڑا جادو ہے۔“ تان سین نے جواب دیتے ہوئے کہا ”اور اس جادوئی راگ کو اس فریبی نے دیپک راگ کہہ کر پیش کیا ہے۔ یہ نظر بندی ہے جہاں پناہ‘ آنکھوں کا دھوکا ہے۔“

”اپنی بکواس بند کرو میاں تان سین!“ بوڑھا گویا بھی اپنی جگہ پر کھڑا ہو گیا اور بولا ”تم کیا جانو دیپک راگ کسے کہتے ہیں؟ دوسروں کے فن سے حسد کرنا اور جلنا تو تمہاری فطرت میں شامل ہے اور اسی حسد میں تم نے میرے جوان بیٹے کو موت کے گھاٹ اُتار دیا تاکہ وہ تمہاری گدی نہ چھین لے۔“

”اس جرم کی سزا تو مجھے مل چکی ہے عالم پناہ!“ تان سین نے بوڑھے گویے کی جانب دیکھنے کے بجائے شہنشاہ اکبر سے کہا ”لیکن پھر بھی میں یہ ضرور کہوں گا کہ اس کی یہ جعل سازی ایک حقیقی گویے کے سامنے نہیں چل سکتی‘ میں اب بھی اپنی بات پر قائم ہوں کہ یہ دیپک راگ نہیں تھا۔“

”تم کیسے کہہ سکتے ہو کہ یہ دیپک راگ نہیں تھا؟“

”اس لیے جہاں پناہ میں دیپک راگ کے ایک ایک سُر ایک ایک تان اور ایک ایک راگ سے واقف ہوں۔“ تان سین نے کہا ”اس لیے کہہ رہا ہوں کہ یہ دیپک راگ نہیں تھا۔“

”تو پھر شمع دان کیسے روشن ہو گئے؟“

”میں نہیں کہہ سکتا جہاں پناہ!“ تان سین نے کہا ”یہ جادو‘ فریب‘ اندر جال‘ نظر بندی کچھ بھی ہو سکتا ہے لیکن دیپک راگ ہرگز نہیں ہو سکتا۔“

”کیا ثبوت ہے میاں تان سین کہ تمہاری بات سچ ہے؟“ شہنشاہ اکبر نے پوچھا۔

”اپنی بات کی سچائی کے لیے میں اجمیر کے خواجہ کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ یہ دیپک راگ نہیں تھا۔“ تان سین نے کہا۔

”فن کو فن سے نہ جیت پانے پر تم کچھ بھی کہہ سکتے ہو۔“ شہنشاہ اکبر نے نفرت بھری نگاہوں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا ”تم جھوٹے ہو‘ پہلے بھی جھوٹ بولتے رہے ہو‘ تمہاری بات پر کیسے یقین کیا جائے؟ اجمیر کے خواجہ کیا تم گوسوامی ہری داس کی قسم بھی کھا سکتے ہو......تم......“

”بس‘ بس...... جہاں پناہ!“ تان سین نے ایک ہاتھ سے اپنا سینہ مسلتے ہوئے کہا ”میری بھول کی آپ نے مجھے سزا دے دی ہے لیکن میرے معزز استاد کو کچھ نہ کہیے۔ دیپک راگ ان کی سب سے بڑی وراثت ہے میرے پاس جس کا حق دار دنیا میں صرف اکیلا میں ہی ہوں۔“

”تو تم دیپک راگ گا کر اپنے دعوئے پر مہر لگا دو میاں تان سین!“ راگنی نے اُٹھ کر کہا ”جہاں پناہ تمہیں شاہی دربار میں آخری بار گانے کا موقع دے سکتے ہیں۔“

”تجویز بُری نہیں ہے میاں تان سین!“ شہنشاہ نے کہا ”ہم تمہیں دربار میں گانے کا ایک آخری موقع دے سکتے ہیں۔ اس کے بعد تمہیں اپنے جرم کی سزا بھگتنے کے لیے بن باس جانا ہی ہوگا۔ کہو‘ کیا کہنا ہے تمہیں؟“

”کاش‘ میں گا سکتا جہاں پناہ!“ تان سین نے اس بار اپنے دونوں ہاتھوں سے اپنا سینہ مسلا اور بڑے درد بھرے لہجے میں بولا ”اس راگ کو گانے کے لیے اپنے کلیجے میں جو آگ میں لگاؤں گا‘ اسے میگھ ملہار گانے والے کے سوا کوئی اور ٹھنڈا نہیں کر سکے گا اور میگھ ملہار میری بیٹی ہی گا سکتی ہے جو یہاں سے دور گوالیار میں ہے۔“

”یہ سب جھوٹ ہے جہاں پناہ!“ بوڑھے گویے نے اُٹھ کر کہا ”یہ اپنی خامیوں کو چھپانے کا بہانہ ہے۔ آخر میں نے بھی تو آپ کے سامنے یہی راگ گایا ہے۔“

”چپ رہو فریبی بڈھے۔“ تان سین نے غصے میں اسے ڈانٹ کر کہا ”تو نے بھرے دربار میں ہم سب کو بے وقوف بنایا ہے۔ ہماری نظر بندی کر کے تو نے یہ شمعیں جلائی ہیں۔ تو جادوگر ہے‘ جادوگر۔ لیکن اب میں گاؤں گا اپنے استاد کی

آبرو رکھنے کے لیے مجھے گانا ہی ہوگا۔" اتنا کہہ کر اس نے شہنشاہ اکبر کی طرف دیکھا اور پھر ادب سے جھک کر بولا "جہاں پناہ! آپ نے تو میری زندگی بخش دی ہے۔ مجھے موت کی سزا نہیں دی ہے لیکن اب میں سنگیت کی زندگی بچانے کے لیے اپنے آپ کو موت کے منہ میں ڈال رہا ہوں اور میرے یہ دشمن بھی یہی چاہتے ہیں لیکن آپ سے میری یہ آخری درخواست ہے کہ اگر دیپک راگ گانے کے بعد میرا کلیجا جلنے لگے تو میری بیٹی کو گوالیار سے فوراً بلا دیجیے گا۔ تاکہ وہ میگھ ملہار گا کر میری آگ کو ٹھنڈا کر دے۔"

اس کے بعد شہنشاہ اکبر کے اشارے پر شمع دانوں کو پھر سے بجھا دیا گیا اور پھر تان سین نے آگے بڑھ کر زمین کو چوم کر اپنے استاد ہری داس کو دل ہی دل میں یاد کیا اور دربار کے بیچوں بیچ قالین پر اپنا تانپورہ لے کر بیٹھ گیا۔

تانپورے کے تاروں نے دیپک راگ کے سُر چھیڑے اور آفتابِ موسیقی نے اپنی موت کا ترانہ شروع کیا۔ اس کی الاپ نے دھیرے دھیرے مدھم کی زمین چھوڑی اور دو گنے کی چڑھائی پر چڑھنے لگی اور پھر تھوڑی ہی دیر میں دیپک راگ کے سُروں نے دربار میں موجود تمام لوگوں پر مدہوشی کی سی کیفیت طاری کر دی...... درباری' واہ' واہ' کر رہے تھے اور جھوم رہے تھے۔ شہنشاہ اکبر بھی جو اجنبی نوجوان گویے ملہار کے قتل سے ناراض ہو کر تان سین سے بات کرنا بھی گوارا نہیں کر رہا تھا' وہ بھی اس کی الاپ پر اپنا سر ہلانے لگا تھا۔

تان سین کی تان اب اپنے پورے عروج پر پہنچ چکی تھی' جو اندھیرے کا سینہ چیرتی ہوئی روشنی کو منانے کے لیے دھیرے دھیرے اس کی جانب بڑھتی جا رہی تھی' سُروں کی چال تھی کہ پَل پَل بڑھتی ہی چلی جا رہی تھی۔ سچ مچ ہی آج تان سین اپنے فن کی بلندیوں پر نظر آ رہا تھا اور اس کی درد بھری الاپ تمام حدوں کو پھلانگتی نظر آ رہی تھی۔

یکایک تمام شمع دانوں نے ہنس کر اپنی آنکھیں کھول دیں اور دربار کا کونا کونا جگمگا اُٹھا۔ دیپک راگ کی طاقت کامیاب ہوئی لیکن تان سین کو یہ فتح بہت مہنگی پڑی۔ اپنے کلیجے میں بھیانک جلن لیے تان سین درباریوں کی داد کا شکریہ ادا کرنے کے لیے بہ مشکل اپنی جگہ سے اُٹھا۔ اس کا ایک ہاتھ زور زور سے اپنے سینے کو مسل رہا تھا اور دوسرا ہاتھ سلام کے لیے پیشانی تک اُٹھا ہی تھا کہ اچانک تان سین اپنی ٹانگوں پر اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکا اور دھم سے بیٹھ گیا "ہا...... ہا...... ہا' چلو آفتابِ موسیقی...... اپنی آگ میں ہی جلو۔" اچانک بوڑھا گویا پاگلوں کی طرح چیخ پڑا "تم نے میرے معصوم ملہار کا خون کر کے میرے کلیجے میں آگ لگائی تھی اور میں نے اندر جال کا کرشمہ دکھا کر اس آگ کو تمہارے کلیجے میں لوٹا دیا۔ بے وقوف تم اتنا بھی نہیں سمجھ سکے کہ میرا دیپک راگ تو ایک جادوئی کھیل تھا۔ کیا تم نے دیکھا تھا کہ سارے شمع دان ایک لمحے کے لیے جل کر دوسرے ہی پل بجھ گئے تھے۔ یہ سب ہماری ایک چال تھی کہ تم غصے میں آ کر دیپک راگ گاؤ.... اور وہی ہوا اور اب جو یہ شمع دان روشن ہیں' یہ سچ مچ دیپک راگ سے جلائے گئے ہیں۔ تمہارے کلیجے کا سارا خون چوس کر یہ بہت دیر تک جلتی رہیں گی اور تم بھی جلتے رہو گے تڑپتے رہو گے اس وقت تک جب تک موت ملہار تمہارے جسم کو ٹھنڈا نہیں کر دیتی' ہا...... ہا...... ہا......"

بوڑھے گویے کے چپ ہوتے ہی دربار میں ایک گہرا سناٹا اور گہری اُداسی چھا گئی۔ سینے کی جلن سے تڑپتے ہوئے تان سین کی نبض پر ہاتھ رکھ کر شاہی حکیموں اور ویدوں نے بے بسی سے اپنا سر ہلا دیا تھا۔ شہنشاہ اکبر نے تان سین کی خواہش کے مطابق فوراً ہی تیز رفتار گھڑ سواروں کا دستہ تان سین کی بیٹی کو لانے کے لیے گوالیار بھجوا دیا تھا لیکن بیٹی کے آنے تک تان سین کے تپتے ہوئے جسم کو جمنا کے کنارے پانی میں لٹا دیا گیا۔ لیکن اس کے سینے کی جلن کم ہونے کے بجائے بڑھتی ہی رہی اور تان سین اس آگ میں پانی میں پڑا پڑا ہی جلتا رہا۔

آگرہ سے گوالیار اور گوالیار سے آگرہ ایک لمبا فاصلہ تھا' بیٹی کے آتے آتے سُر سنگیت کا سورج غروب ہو چکا تھا' تان سین کی بیٹی نے آ کر اس کی لاش کے پاس بیٹھ کر میگھ ملہار گایا جس کی وجہ سے سات دنوں تک دلی اور آگرے کی سڑکیں پانی میں ڈوبی رہیں۔ خوب بارش ہوئی' زمین پر بہتے پانی نے میگھ ملہار کی طاقت سے آگرہ کی اونچی اونچی حویلیوں پر اپنا سر دے مارا۔ سیلاب کی سی کیفیت سے آس پاس کے گاؤں میں تباہی کی سی حالت پیدا ہو گئی لیکن راگ میگھ ملہار سے بھی تان سین کے جلتے جسم کو زندگی نہیں ملی۔ تان سین نے اپنے سینے میں آگ بھر کر جو دیپک راگ گایا تھا' اس دیپک راگ کی آگ نے خود تان سین کے جسم کو ہی راکھ کے ڈھیر میں تبدیل کر دیا تھا۔

اور دیپک راگ کے سانپ کا ڈسا تان سین میگھ ملہار کے پانی سے بھی پھر زندہ نہ ہو سکا' تان سین کی یہ دردناک موت رائی اور اس کے بوڑھے بابا کی جیت تھی۔ انہوں نے اپنے بیٹے اور بھائی ملہار کے قتل کا بدلہ لے لیا تھا۔

علی سُفیان آفاقی کی یادداشتیں

فلمی الف لیلہ

قسط: 203

یہ اجنبی سی منزلیں اور رفتگاں کی یاد
تنہائیوں کا زہر ہے اور ہم ہیں دوستو!
آنکھوں میں اُڑ رہی ہے لُٹی محفلوں کی دھول
عبرت سرائے دہر ہے اور ہم ہیں دوستو!

ایسے در روزگار خال خال ہی نظر آتے ہیں جو نصف صدی سے علم و ادب، صحافت و فلم کے میدان میں سرگرمِ عمل ہوں اور اپنے روزِ اوّل کی طرح تازہ دَم بھی۔ اُن کے ذہنِ رسا کی پرواز میں کوئی کمی واقع ہو نہ اُن کا قلم کبھی تھکن کا شکار نظر آئے۔ آفاقی صاحب ہمارے ایسے ہی جواں فکر و بلند حوصلہ بزرگ ہیں۔ وہ جس شعبے سے بھی وابستہ رہے' اپنی نمایاں حیثیت کے نشان اُس کی پیشانی پر ثبت کر دیے۔ مختلف شعبہ ہائے زندگی سے وابستگی کے دوران میں اُنھیں اپنے عہد کی ہر قابلِ ذکر شخصیت سے ملنے اور اُس کے بارے میں آگاہی کا موقع بھی ملا۔ دید شنید اور میل ملاقات کا یہ سلسلہ خاصا طولانی اور بہت زیادہ قابلِ رشک ہے۔ آیئے ہم بھی اُن کے وسیلے سے اپنے زمانے کی نامور شخصیات سے ملاقات کریں، اور اس عہد کا نظارہ کریں جو آج خواب معلوم ہوتا ہے۔

ادب و صحافت سے فلمی دُنیا تک دراز ایک داستاں دردِ داستاں سرگزشت

بیماری میں انسان کو عموماً تین چیزیں یاد آتی ہیں۔

''اللہ تعالیٰ، اماں اور بیوی۔ بچہ جب بہت چھوٹا ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ کے بارے میں اس کو علم نہیں ہوتا۔ بھلا چھ ماہ یا ایک سال کا بچہ اللہ تعالیٰ کی قدرت اور مہربانی کے بارے میں کیا جان سکتا ہے؟ البتہ جب وہ بولنا شروع کرتا ہے تو اس کی زبان سے اماں، امی، ممی قسم کے الفاظ نکلتے ہیں۔ کیونکہ اس عمر میں وہ صرف اتنا جانتا ہے کہ سارے گھر میں صرف ایک ہستی ہے جو اس کے ہر درد کا مداوا کر سکتی ہے اور وہ ہے ماں!

عمر بڑھنے کے ساتھ ساتھ بچے کی معلومات میں بھی اضافہ ہو جاتا ہے اور اس کو اللہ تعالیٰ کے بارے میں معلوم ہوتا ہے تو وہ بہت حیران ہوتا ہے کہ ایک ایسی ہستی بھی ہے جو سب سے زیادہ طاقت ور اور با اختیار ہے۔ اس عمر میں بچوں کو اللہ تعالیٰ کے بارے میں زیادہ معلومات حاصل نہیں ہوتیں۔ ماں باپ، استاد اور گھر والوں کی گفتگو سن کر وہ اندازہ لگانے کی کوشش کرتا ہے کہ آخر اللہ تعالیٰ جو اتنے با اختیار اور ساری دنیا کے مالک ہیں۔ دیکھنے میں کیسے ہیں؟ کہاں رہتے ہیں، کیا کھاتے پیتے ہیں؟

اس عمر میں بچے آپس میں اس قسم کی باتیں کرتے سنائی دیتے ہیں۔

''پتا بھی ہے تم کو اللہ تعالیٰ کتنے بڑے ہیں؟''

''ہاں ہاں، معلوم ہے...... وہ بہت بڑے ہیں۔ ہم سے بہت بڑے۔''

''جب وہ اتنے بڑے ہیں تو رہتے کہاں ہیں؟''

''آسمان پر۔''

''مگر جب وہ ٹانگیں پھیلاتے ہیں تو کیا وہ زمین تک آجاتی ہیں۔''

''ارے بے وقوف! انہیں ٹانگیں پھیلانے کی کیا ضرورت ہے۔ وہ تو ہر وقت لیٹے رہتے ہیں۔''

اس قسم کی گفتگو آپ نے اکثر معصوم بچوں کی زبانی سنی ہوگی۔ بچوں کے نزدیک اللہ تعالیٰ سب کچھ کر سکتے ہیں۔

بہت چھوٹے معصوم بچے جب کسی چیز کی بڑائی بیان کرتے ہیں تو کہتے ہیں ''وہ بہت بڑے ہیں، اللہ تعالیٰ سے بھی بڑے۔''

''ارے بے وقوف، اللہ تعالیٰ سے بھی بڑا کون ہو سکتا ہے؟ وہ ساری دنیا کو اپنے اشارے سے چلاتے ہیں۔''

''میرا مطلب یہ تھا کہ وہ اللہ تعالیٰ سے تو چھوٹے ہیں مگر اور سب سے بڑے ہیں۔''

اس طرح جب اللہ تعالیٰ کے بارے میں بچوں کی معلومات میں اضافہ ہوتا ہے اور وہ اماں کی زبانی سنتے ہیں کہ اللہ سے دعا کرو۔ وہی بیماروں کو تندرستی دے سکتا ہے تو پھر بچے جب بیمار ہوتے ہیں تو تکلیف میں بھی پہلے اللہ تعالیٰ کو یاد کرتے ہیں، اس کے بعد اماں کو۔

یہی بچے جب اور بڑے ہو جاتے ہیں، شادی شدہ اور صاحب اولاد ہو جاتے ہیں تو انہیں علم ہوتا ہے کہ اماں (اگر زندہ ہیں) تو پہلے کی طرح تیمارداری نہیں کر سکتیں۔ اب فرائض بیوی کے سپرد ہو جاتے ہیں۔ یہ بھی بیوی کی خصلت، محبت اور خدمت پر منحصر ہوتا ہے کہ وہ شوہر کی کتنی اور کس طرح دیکھ بھال کرتی ہے۔ لہٰذا بیماری کی صورت میں اب انسان اللہ تعالیٰ اور بیوی کو ہی پکارتا ہے۔

اس تعارف کی ضرورت اس لیے پیش آئی کہ پچھلے دنوں جب ہم زیادہ بیمار ہوئے تو شدید بخار کے عالم میں اللہ تعالیٰ اور لبنیٰ کو پکارتے رہتے تھے۔ ایک روز ہمیں خیال آیا کہ ہم اماں کو تو بھول ہی گئے۔ انہیں ہماری لازماً بہت فکر ہوگی۔ اس روز ہم نے اماں کو بھی بہت پکارا اور یاد کیا۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ دوسرے دن ہماری طبیعت بہتر تھی۔ ماں کو جنت کی چھاؤں بلاوجہ ہی تو نہیں کہتے ہیں۔ خود اللہ تعالیٰ نے اس کا رتبہ مقرر کر دیا ہے۔

اب ہم آپ کو کیا بتائیں کہ ہم بذاتِ خود کوئی کام نہیں کر سکتے یا اگر کرتے ہیں تو درست نہیں کر سکتے۔ بچپن میں ہماری تمام ضرورتیں اماں پوری کرتی تھیں، اب یہ ذمے داری ہماری بیگم لبنیٰ نے سنبھال لی ہے۔ کھانے پینے، دوائیوں کے استعمال، مختلف ٹیسٹ، ڈاکٹروں کے پاس لانا لے جانا۔ کھانے پینے کا بندوبست کرنا۔ سردی کے موسم میں ہمیں گرم کپڑوں سے ڈھانپنا۔ راتوں کو اُٹھ کر یہ دیکھنا کہ ہم ہر طرف سے لحاف سے ڈھکے ہوئے ہیں یا نہیں؟ ہمیں سہارا دے کر غسل خانے لے جانا، جانگیہ پہنا کر غسل کرانا، جسم پر کریم ملنا، ہماری پسند کے کھانے بنوانا بلکہ خود بنانا۔ تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد کھانے یا پینے کی کوئی چیز مہیا کرنا۔ وقت پر دوائیاں پلانا اور کھلانا۔ اس کے علاوہ گھر کے دوسرے لوگوں اور معاملات کا بھی خیال رکھنا اور اس تمام بھاگ دوڑ کے باوجود ہر وقت ہنستے رہنا۔ یوں تو سبھی اپنی بیویوں کو بہترین سمجھتے ہیں مگر درحقیقت ایسی بیویاں اللہ کم ہی لوگوں کو دیتا ہے اور ان کم لوگوں میں سے بھی بہت کم لوگوں میں ہم اپنا شمار کرتے ہیں۔ ہم نے سوچا کہ بیوی کے کتنے فائدے ہیں۔ گھرداری کرنا، گھر والوں کی دیکھ بھال کرنا، بیماری میں ڈاکٹر اور نرس کے فرائض ادا کرنا اور بیمار کا خود اس سے بھی زیادہ خیال رکھنا، پریشانی اور دکھ میں تسلی دینا۔ نمازیں پڑھنا، دعائیں کرنا۔ اتنے بہت سے کام اور کون کر سکتا ہے سوائے بیوی کے بشرطیکہ وہ صحیح معنوں میں بیوی ہو۔ اور ہاں، یہ تو ہم بھول ہی گئے کہ جب ہم بیزاری کے عالم میں ہوتے تو وہ میگزینوں سے لطیفے سنا کر ہمیں ہنساتی تھیں۔ کبھی کبھی ہماری پسندیدہ کتابوں کے اقتباس پڑھ کر بھی سناتی تھیں۔ اس طرح بیمار تو ہم تھے مگر بیماری بیگم کاٹ رہی تھیں۔

یہ سطور لکھنے کا مقصد میاں بیوی میں جھگڑے کرانا نہیں ہے۔ مقصد یہ ہے کہ وہ شاید اس سے کچھ حاصل کر سکیں اور ایک مقصد ان سب لوگوں کے لیے شکریہ ادا کرنا بھی ہے جو ہمارے بس میں نہیں ہے۔

☆☆☆

بیماری اور شدید بخار میں نیند تو آتی نہیں ہے۔ نیم غنودگی یا غنودگی سی طاری رہتی ہے اس لیے ہمیں اللہ کو یاد کرنے اور دعائیں پڑھنے کے علاوہ کچھ اور بھی کرنا پڑتا تھا۔

سب سے پہلے تو ہمیں وہ ڈاکٹر یاد آئے جنہوں نے ہمارے حیرت انگیز علاج کیے۔ ان میں سے ہر ایک سے ہماری دوستی تھی۔ بے تکلفی تھی۔ یہ سب نہایت نفیس انسان اور اعلیٰ درجے کے لوگ تھے۔

ڈاکٹر فیض احمد جوئیا، وہ ہمارے لیے جو بھی دوائی بناتے اس کو سب سے پہلے خود استعمال کر کے اس کی تعریفیں بیان کرتے رہتے۔ انہیں ایک شوق پُرانی فلموں کے گانوں کا تھا۔ فرصت کے وقت وہ ہمیں پاس بٹھا لیتے اور کسی پُرانی فلم کے گانے کا ایک بول پڑھ کر کہتے ''اب اس کا دوسرا مصرع تو بتاؤ۔''

کبھی ہم بتا دیتے اور کبھی غلط جواب دیتے۔ وہ ہماری کم علمی پر بہت ہنستے تھے اور پھر دوسرا مصرع بتا کر پوچھتے۔ ''آفاقی صاحب، یہ بتائیے یہ کس فلم کا گانا ہے، کس نے گایا تھا؟ کس پر فلمایا گیا تھا؟''

سچ تو یہ ہے کہ یاد ہونے کے باوجود ہم ڈاکٹر صاحب کے اچانک اور پے در پے سوالوں سے بوکھلا جاتے تھے۔ ان کا ایک دستور یہ تھا کہ کوئی مریض آ کر سلام کر کے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھاتا تو وہ اسے نظر انداز کر دیتے۔ بعض مریض تو بے چارے شرمندہ ہو کر رہ جاتے تھے۔

ایک دن ہم نے پوچھا ''ڈاکٹر صاحب، آپ ان سے ہاتھ کیوں نہیں ملاتے؟''

کہنے لگے ''آپ بھی ایسے ہی نکلے۔ بھئی کوئی شخص خدا جانے کہاں سے آرہا ہے، ہاتھ میں کس قسم کے جراثیم لے کر آیا ہے۔ اب میں ہر بار مصافحہ کر کے صابن سے ہاتھ دھوتا رہوں تو سارا دن اسی کام میں گزر جائے۔''

پہلے وہ آئی سرجن تھے پھر ہومیو پیتھک ڈاکٹر بن گئے اور آنکھوں کے لیے دوائیں وہ خود جڑی بوٹیاں ڈھونڈ کر بناتے تھے۔

انہوں نے موتیا کے علاج کے لیے ازخود دوائی بنائی تھی جو واقعی بہت موثر تھی۔ ان کی دوائی سے ہمارا موتیا ایک بار تو بالکل صاف ہو گیا تھا مگر جب دوبارہ نمودار ہوا تو ہم نے پوچھا۔

''ڈاکٹر صاحب، آپ کی ایجاد تو فیل ہو گئی۔''

کہنے لگے ''ایجاد فیل نہیں ہوئی، آپ فیل ہو گئے۔ آپ کمزور بہت ہیں، پہلے اپنی کمزوری دور کریں۔''

''کیسے کریں، پہلوانی کریں؟''

''اچھی خوراک کھائیں اور یہ دوائی استعمال کریں۔'' یہ کہہ کر انہوں نے ایک دوائی کی شیشی اٹھائی، ہم سمجھے ہمیں پلائیں گے مگر وہ پہلے خود پی گئے۔

ڈاکٹر صاحب نے ہم سے کبھی دوائی کے پیسے نہیں لیے حالانکہ ان کے پاس دور دور سے مریض آتے تھے اور وہ فیس وصول کرنے کے معاملے میں خاصے فراخ دل تھے۔ اگر ہم کبھی کہتے بھی کہ ''ڈاکٹر صاحب، اچھا نہیں لگتا، ہم آپ سے کب تک مفت دوائیں لیں گے؟''

کہتے ''جب آپ تندرست ہو جائیں گے تو پائی پائی وصول کر لیں گے۔''

مگر ہوا یہ کہ ایک دن اچانک ان کا ہارٹ فیل ہو گیا۔

ڈاکٹر عبدالسلام شیخ کا دکھ تو تازہ ہے۔ ہر وقت ہنسنے ہنسانے والا، تندرست، آن تھک انسان، چند لمحوں میں دنیا سے چلا گیا۔ جاتے ہوئے بہو سے کہا ''ہم تو چلے۔'' اور چلے گئے۔

ان کے مریض بے شمار تھے مگر ان کے پاس لطیفے بھی بے شمار تھے۔ سارے دن مریضوں کو لطیفے سناتے رہتے تھے۔ خدا جانے وہ لطیفے یاد کرتے تھے یا لطیفے ان پر نازل ہوتے تھے۔ ہر مریض کے لیے حسبِ حال ان کے پاس نیا لطیفہ ہوتا تھا۔

ہمارے تو وہ بے حد قریب تھے بلکہ بے حد محبت اور عقیدت کرتے تھے۔ ہر اچھی چیز جو کوئی انہیں لا کر دیتا، وہ ہمیں دے دیا کرتے تھے۔ فلمی ماحول میں پل کر جوان ہوئے تھے اس لیے فلمی الف لیلیٰ پڑھنے کے لیے ضرور وقت نکال لیتے تھے۔ پڑھنے کے بعد اس کردار یا واقعے کے بارے میں اپنی ذاتی معلومات بھی بیان کرتے اور پُرانے وقتوں اور پُرانے لوگوں کو یاد کر کے ہم دونوں اُداس ہو جاتے۔ اب جو ہم بیمار ہوئے تو وہ بہت یاد آئے۔ کیونکہ ہم پر ڈپریشن کا حملہ ہوتا تو وہ

چکوری میں ندیم اور شبانہ

ہمارا حوصلہ بڑھاتے اور بتاتے کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں کیا نعمتیں دی ہیں جن سے کروڑوں لوگ محروم ہیں۔

ڈاکٹر زید ظفر کے انتقال کو کئی سال گزر چکے ہیں مگر یقین نہیں آتا کہ اب وہ دنیا میں نہیں ہیں۔ وہ خود بھی آخری سالوں میں دل کے مریض ہوگئے تھے۔ صبح شام گنتی کے مریض دیکھتے تھے۔ ان کا کلینک سب سے زیادہ صاف ستھرا، خوبصورت اور سجا ہوا تھا۔

ان کے چہرے پر ہر وقت ایک مدھم سی مسکراہٹ رہتی تھی۔ مریض کا حال سنتے تو بھی مسکراتے رہتے۔ اعلیٰ درجے کے ہومیو پیتھ تھے۔ انہوں نے ہمارے اور ہمارے جاننے والوں کے حیرت انگیز علاج کیے۔ جن لوگوں کو ہومیو پیتھی پر یقین ہی نہ تھا، وہ بھی قائل ہوگئے۔

ڈاکٹر صاحب کی سیکریٹری جو مریضوں کے لیے وقت اور دن مقرر کرتی تھی، اس کی دی ہوئی تاریخ اور وقت کی پابندی ضروری تھی، وقت پر نہ آنے پر دوسرے مریض کا نمبر آجاتا تھا۔ ڈاکٹر صاحب دیر سے آنے والے کو دیکھتے ضرور تھے مگر دوسرے مریضوں کے بعد۔ مریض کا احوال سن کر بھی مسکراتے رہتے مگر یہ مسکراہٹ تسلی آمیز ہوتی تھی۔ ڈاکٹر صاحب سے مل کر ہی نصف بیماری تو دور ہوجاتی تھی۔ ریٹائرڈ میجر تھے۔ ہومیو پیتھی کے لیے خود کو وقف کردیا۔ کلینک نہایت شاندار اور ائر کنڈیشنڈ تھا۔ کام کرنے والی پانچ لڑکیاں بھی صبح شام موجود ہوا کرتی تھیں۔ ڈاکٹر صاحب اس زمانے میں ایک ہفتے کی دوائی کے لیے بھی صرف پچاس روپے لیتے تھے۔

ایک دن ہم نے پوچھا ”ڈاکٹر صاحب، آپ کے اتنے اخراجات ہیں، آپ مریض بھی کم دیکھتے ہیں اور اتنی کم قیمت وصول کرتے ہیں۔“

بولے ”آفاقی صاحب، دراصل اللہ نے روزگار کا بندوبست کردیا ہے۔ یہ دواخانہ میں نے کمائی کے لیے نہیں بنایا ہے۔ اللہ کی مہربانی سے دال دلیہ چل رہا ہے۔“

ڈاکٹر صاحب کے تین بائی پاس ہوچکے تھے مگر چند روز بعد پھر کلینک میں بیٹھے نظر آئے۔ ہم ان کی کمزوری دور کرنے اور انہیں آرام کرنے کے مشورے دیتے رہتے تھے۔ ایک دن کہنے لگے ”آفاقی صاحب، کبھی کبھی تو یوں لگتا ہے جیسے مریض میں ہوں اور آپ ڈاکٹر!“

ایک بار ہم نے ایک صاحب کے بارے میں بتایا کہ وہ زائچہ بنا کر یہ بھی بتا دیتے ہیں کہ آپ کو کیا امراض ہیں۔

مسکرائے اور بولے ”آفاقی صاحب، انہیں لاکر سامنے والے کمرے میں بٹھا دیتے ہیں۔ ہمارا آدھا کام تو ہو ہی جائے گا۔ صرف دوائی دینے کا کام باقی رہ جائے گا۔“

ڈاکٹر صاحب پکے نمازی تھے۔ دست شناسی، زائچے، وغیرہ پر بالکل یقین نہیں رکھتے تھے۔ کہتے تھے کہ یہ سب لوگ خدائی کام کررہے ہیں۔ اگر اللہ کو مستقبل کا حال بتانا مقصود ہوتا تو ہر انسان کو خود ہی کیوں نہ بتا دیتا۔

ہم کہتے ”مگر ڈاکٹر صاحب، ستاروں اور چاند کا اثر تو دنیا اور دنیا والوں پر پڑتا ہی ہے۔“

”نعوذ باللہ۔ اسی لیے تو چاند، سورج اور ستاروں کی پوجا کی جاتی تھی۔“

ایک دن صبح فون آیا کہ ڈاکٹر صاحب بیٹھے بیٹھے چپ چاپ مرگئے۔

اللہ کے کاموں میں کس کو دخل ہے۔ اللہ مغفرت کرے، خوب انسان تھے۔

☆☆☆

ڈاکٹر عزیز اور ہمارا پچاس سال سے زیادہ ساتھ رہا۔ ماڈل ٹاؤن میں سڑک کے دوسری جانب ان کا کلینک تھا۔ اس کی اگلی گلی میں ان کا گھر تھا۔ ڈاکٹر صاحب سے مراسم بڑھے تو انہوں نے بوقتِ ضرورت ہمیں وقت بے وقت اپنے گھر آنے کی اجازت بھی دے دی۔ اکثر ہم ٹیلی فون پر اپنا مرض بتا کر ان سے دوائیوں کے نام پوچھ لیتے تھے۔ ہمارے گھر میں بھی ہومیو پیتھک دوائیوں کا ایک چھوٹا سا اسٹور ہے۔ ضرورت کی ہر دوائی یہاں موجود ہے۔ ہماری بیٹیاں

اور پھر نواسہ نواسی کی پرورش بھی ہومیو پیتھک دوائیوں پر ہی ہوئی ہے۔ انہیں تو بہت سی دوائیوں کے نام اور استعمال کا علم ہے۔ کھانسی ہو، گلا خراب ہو، پیٹ میں گڑبڑ ہو، وہ خود ہی مخصوص دوائی نکال کر کھا لیتے ہیں۔

ہومیو پیتھک دوائیاں میٹھی ہوتی ہیں۔ اس لیے بچے بہت شوق سے کھا لیتے ہیں۔ زیادہ چھوٹے بچے تو سویٹ سمجھ کر شیشیاں خالی کردیتے تھے۔ بہت مشکل سے ان سے چھپا کر دوائیاں رکھی جاتی تھیں۔

ڈاکٹر عزیز دراصل تحصیل دار تھے۔ ریٹائر ہونے کے بعد انہیں ہومیو پیتھی سے دلچسپی ہوگئی۔ ان کے پاس بہت نایاب کتابیں تھیں۔ ڈاکٹر صاحب سے جب پہلی بار ملاقات ہوئی تو وہ ریٹائر ہوچکے تھے۔ ان کی آنکھوں پر بہت موٹے موٹے شیشے لگے ہوئے تھے۔ اس کو آپ محدب شیشہ بھی کہہ سکتے ہیں۔ جب وہ کوئی کتاب دیکھتے تھے تو اس کی اپنی عینک کے بالکل نزدیک لے جاکر پڑھنے کی کوشش کرتے تھے۔ بھاری جسم تھا، ایک پیر میں معمولی سا لنگ بھی تھا۔ ڈاکٹر صاحب اس کے باوجود باقاعدگی سے نہ صرف کلینک میں بیٹھتے بلکہ اپنی جائداد کے مقدمات بھی لڑتے تھے۔ جس روز وہ بغل میں بہت سی فائلیں دبائے نظر آتے تو معلوم ہوجاتا کہ آج مقدمہ بازی کا دن ہے۔

ڈاکٹر صاحب مناسب موقعے پر ہی مسکراتے تھے۔ مذاق کرتے ہوئے ہم نے کبھی انہیں نہیں سنا۔ مگر نہایت خوش اخلاق اور سادا انسان تھے۔

ڈاکٹر عزیز نے ہمارے رشتے داروں اور خود ہمارے ایسے علاج کیے کہ سن کر دوسرے ڈاکٹرز بھی حیران رہ گئے۔ ہم چونکہ بیک وقت کئی ڈاکٹروں سے علاج کراتے تھے اور ان کے ساتھ ہومیو پیتھی کے بارے میں تبادلۂ خیالات کرتے رہتے تھے اور جس ڈاکٹر کے علاج سے فائدہ ہوتا تھا، فوراً دوسرے ڈاکٹر کو اس سے مطلع کرتے تھے۔

ایک بار ایک ایلوپیتھ ڈاکٹر دوست نے ہمیں بتایا کہ آفاقی صاحب، آپ کو تو ہرنیا ہوگیا ہے۔

ہم نے پوچھا ”اس کا علاج کیا ہے؟“

بولے ”فی الحال اس کا کوئی علاج نہیں ہے۔ آپ احتیاط کریں کہ تیز نہ چلیں۔ تیزی سے سیڑھیاں نہ چڑھیں۔ چھلانگیں لگانے سے پرہیز کریں۔“

”مگر آپ تو پرہیز بتا رہے ہیں، علاج کیا ہے؟“

بولے ”علاج وقت آنے پر ہوگا۔ جب یہ ذرا بڑھ جائے گا تو آپ کا آپریشن کریں گے۔“

سراج الدولہ کا ایک منظر

ہم وہاں سے سیدھے ڈاکٹر عزیز کے پاس پہنچے۔

”ڈاکٹر صاحب، کیا ہومیو پیتھی میں ہرنیا کا علاج ہے؟“

”کیوں نہیں جی۔“

ہم نے کہا ”ہمیں ہرنیا ہوگیا۔ ڈاکٹر کہتے ہیں کہ کچھ عرصہ بعد آپریشن کریں گے۔“

”ہرنیا بائیں جانب ہے یا دائیں جانب؟“

”دائیں جانب۔“

”کوئی بات نہیں ہے۔ آپ کے پاس بیلاڈونا 200 ہے؟“

”جی ہاں۔“

”تو دو سو کی ایک خوراک ہر روز صبح لیں اور آٹھ دن بعد مجھے بتائیں۔“

ہم نے فوراً یہ آسان علاج شروع کردیا۔ چند دن گزر گئے اور ہم بھول بھی گئے کہ ہمیں ہرنیا تھا۔ ہم نے اپنا پیٹ دبا دبا کر دیکھا۔ کوئی تکلیف تھی نہ ورم۔

ہم نے فوراً ڈاکٹر صاحب کو فون کیا ”ڈاکٹر صاحب، السلام علیکم!“

”ہاں جی، فرمائیے۔“

”ڈاکٹر صاحب، ہمارا ہرنیا تو ٹھیک ہوگیا ہے۔ اب کیا کریں؟“

”ہفتے میں دو خوراکیں لے کر دوائی چھوڑ دیں۔“

وحید مراد اور چترا فلم بھیا میں

اس کے بعد سے آج تک ہمیں ہرنیا کی شکایت نہیں ہوئی۔

ڈاکٹر عزیز بہت بااخلاق آدمی تھے اور وضع دار بھی۔ ہم نے انہیں ہر ہفتے ''فیملی میگزین'' کی ایک کاپی پیش کرنی شروع کردی۔ اگلی بار ہم دوائی لینے گئے تو ڈاکٹر صاحب بولے ''پیسے زیادہ نہیں ہیں، رہنے دیجیے۔''

''مگر ڈاکٹر صاحب......!''

''دیکھو نا جی، آپ مجھے ہر ہفتے اتنا مہنگا میگزین دیتے ہو۔ میری دوا کی قیمت اس سے کم ہے۔''

ہم نے کہا ''ڈاکٹر صاحب، آپ مروت میں غلطی کررہے ہیں۔''

''وہ کیسے جی؟''

''دیکھیے، ہمارا تو سارا خاندان ہفتے بھر آپ سے دوائی لیتا ہے، یہ سودا آپ کو مہنگا پڑے گا۔''

ڈاکٹر صاحب مسکرائے ''یہ تو ٹھیک ہے جی، اچھا آپ آدھی قیمت دے دیا کریں۔''

ہم ڈاکٹر صاحب کو عرصۂ دراز سے جس حال میں دیکھتے رہے تھے، ہمیں امید نہیں تھی کہ ڈاکٹر بھی وفات بھی پائیں گے۔

ایک دن صبح ان کے گھر سے خبر آئی کہ ڈاکٹر صاحب کا رات کو انتقال ہوگیا۔ ہم نے دیکھا کہ چاندنیاں بچھی ہوئی تھیں۔ کرسیاں بھی رکھی تھیں۔ قرآن شریف کے سیپارے رکھے گئے تھے۔ لوگ پڑھنے پڑھانے میں مصروف ہوگئے مگر ہم یہ سوچ کر حیران ہورہے تھے کہ کیا ڈاکٹر عزیز بھی مرسکتے ہیں؟

بہت خوبیوں والے انسان تھے۔ بے شمار مریضوں کو اللہ نے ان کے ذریعے شفا دی۔ مگر وہ شخص خود اپنا علاج نہیں کرسکا تھا۔

ڈاکٹر صاحب کی یاد ہر روز ہمیں آتی ہے۔ خصوصاً جب بیمار ہوتے ہیں، اللہ نے کیسے کیسے لوگ بنائے ہیں، اللہ جنت نصیب کرے، آمین۔

☆☆☆

ڈاکٹر اسد الرحمٰن ایلوپیتھک ڈاکٹر تھے۔ دراصل وہ جنرل پریکٹشنر تھے اور ان کی تشخیص غضب کی تھی۔ سب سے پہلے انہوں نے اماں کا علاج شروع کیا تھا۔ ماڈل ٹاؤن کے رہنے والے ایک ڈاکٹر کا اس زمانے میں بہت شہرہ تھا۔ گھریلو تعلقات بھی تھے۔ اماں ان سے اس لیے خوش تھیں کہ وہ ہر روز بیڈن روڈ کے کلینک جاتے ہوئے پابندی سے اماں کا طبّی معائنہ کرتے تھے۔ بہت شائستہ اور خوش اخلاق انسان تھے۔ ان کے تمام خاندان سے ہم لوگوں سے اچھے مراسم تھے۔

اب مشکل یہ تھی کہ یہ ڈاکٹر صاحب نسخے میں سات آٹھ دوائیوں سے زیادہ تجویز نہیں کرتے تھے۔ یہ ایک خوراک تھی۔ اماں بے چاری صبح کی گولیاں لے کر بیٹھیں تو دوپہر تک ایک ہی خوراک ختم نہیں ہوتی تھی اس لیے ناغہ ہوجاتا تھا۔ ہم نے اماں کو بہت سمجھایا کہ آپ کسی اور ڈاکٹر کا علاج کریں۔ ان کی تو ایک ہی خوراک سے آپ کا پیٹ بھر جاتا ہے۔ مگر ان کا کہنا تھا کہ بیٹا، یہ پُرانے معالج ہیں۔ میرے مزاج کو بھی جانتے ہیں۔ نیا ڈاکٹر تو میرا مزاج جاننے میں ہی ہفتوں لگادے گا۔

ہم نے کہا ''اماں، یہ حکیموں کے زمانے کی باتیں ہیں۔ آج کل کے ڈاکٹر مزاج اور نبض وغیرہ سے واقف نہیں ہوتے۔ بس مرض تشخیص کرکے اس کی دوا دے دیتے ہیں۔''

بڑی مشکل سے اماں ڈاکٹر اسد الرحمٰن سے علاج کرانے پر راضی ہوئیں۔ ڈاکٹر صاحب کو ہم کافی عرصے سے جانتے تھے۔ بہت ہی حلیم، آہستہ گو اور خوش مزاج انسان تھے۔

اماں کو آکر انہوں نے سلام کیا۔ پھر معائنہ کیا، اس کے بعد پہلے ڈاکٹر کے نسخے دیکھے اور بولے ''اماں جی، آپ اتنی بہت سی گولیاں کھاتی رہی ہیں؟''

''کیا کروں ڈاکٹر صاحب، ڈاکٹر کی بات تو ماننی پڑتی ہے۔''

ڈاکٹر اسد الرحمٰن نے ایک کاغذ پر ایک سیرپ لکھ دیا اور کہا کہ کھانے سے آدھے گھنٹے پہلے ایک بڑا چمچہ شربت پی لیا کریں۔''

''مگر ڈاکٹر صاحب، آپ نے گولیاں تو لکھی ہی نہیں؟''

''اماں جی، آپ کے لیے یہی کافی ہے۔''

اماں کو یقین تو نہیں آیا مگر جب ایک ہفتے بعد ہی نمایاں فائدہ نظر آیا تو اماں ڈاکٹر اسد الرحمٰن کی مرید ہوگئیں۔ معمولی سی تکلیف بھی ہوتی تو فون اُٹھا کر ان سے بات کرلیتیں اور وہ انہیں مطمئن کردیتے تھے۔ اس طرح ڈاکٹر صاحب سے تعلقات بڑھتے گئے۔ ہمیں معلوم تھا کہ جوں ہی ڈاکٹر اسد الرحمٰن آئیں گے، ہم ٹھیک ہوجائیں گے۔

ایک بار ڈاکٹر صاحب جو ایک سرکاری اسپتال میں ملازم تھے، چند روز کے لیے لاہور سے باہر چلے گئے۔ انہی دنوں ہمیں سخت بخار چڑھ گیا جو اُترنے کا نام ہی نہیں لیتا تھا۔ کئی ڈاکٹروں سے مشورہ کیا۔ انہوں نے ٹیسٹ بھی کرائے مگر بخار نے ہمارا پیچھا نہیں چھوڑا۔ ہم سخت چڑچڑے اور بدمزاج ہوگئے تھے۔ کسی قریبی دوست کا فون بھی آتا تو اسے بُرا بھلا کہتے۔

ان ہی دنوں پتا چلا کہ ڈاکٹر اسد الرحمٰن واپس آگئے ہیں۔ وہ فوراً پہنچ گئے۔ اس سے پہلے کہ ہم مرض کی تفصیل بیان کرتے، انہوں نے کہا ''آفاقی صاحب، آپ کو تو ٹائیفائیڈ ہوگیا ہے۔''

''ٹائیفائیڈ؟'' ہم ڈر گئے۔

بولے ''پریشانی کی کوئی بات نہیں ہے۔ چھ چھ گھنٹے کے وقفے سے یہ کیپسول کھائیں، پرسوں آپ کا بخار کم ہوجائے گا اور پھر اُتر جائے گا۔''

ڈاکٹر صاحب نے نہ کوئی ٹیسٹ کرایا نہ تفصیل جاننے کی کوشش کی۔ تیسرے دن ہمارا بخار کم ہوگیا۔ دو دن بعد اُتر گیا۔

ڈاکٹر صاحب ہمیشہ مریضوں کو سستی دوائیں تجویز کرتے تھے۔ ان خود غرض ڈاکٹروں سے وہ بہت ناراض تھے جو دوائی دس روپے میں مل سکتی ہے، یہ اپنے کمیشن کے لالچ میں دوسری کمپنی کی دوائی پچاس روپے قیمت کی لکھ دیتے ہیں۔ اب تو یہ پیشہ بھی خالص نہیں رہا۔

ڈاکٹر صاحب ایم بی بی ایس کی تعلیم حاصل کرنے کے لیے مشرقی پاکستان سے آئے تھے۔ پھر ایسا دل لگا کہ واپس ہی نہ گئے۔ لاہور کے ایک خاندان میں شادی کی۔ بہت مطمئن اور پُرسکون انسان تھے مگر ملک کی سیاسی صورتِ حال کی وجہ سے اکثر پریشان رہتے تھے۔

ان کا اکلوتا بیٹا بھی ڈاکٹر تھا جو امریکا چلا گیا تھا۔ ریٹائر ہونے کے بعد ڈاکٹر صاحب ایک دو مہینے کے لیے بیٹے کے پاس چلے جاتے تھے۔

زندگی معمول کے مطابق چل رہی تھی۔ ڈاکٹر صاحب کی صحت، شکل وصورت اور شخصیت میں ہم نے تو کبھی کوئی فرق محسوس نہیں کیا۔ ایسا لگتا تھا جیسے آبِ حیات پی کر آئے ہیں۔

ایک دن صبح سویرے ان کی بیگم کا فون آیا ''ڈاکٹر صاحب کا انتقال ہوگیا ہے۔''

ہم فوراً چھاؤنی میں ان کی کوٹھی پر پہنچے۔ یہ ڈاکٹر صاحب بھی آناً فاناً رخصت ہوگئے۔ ملازم نے بتایا کہ باہر سے کار میں آگئے۔ چند لمحے بعد بیگم صاحب نے ملازموں کو بلایا۔ ڈاکٹر صاحب کو ہارٹ اٹیک ہوگیا تھا۔ اسپتال پہنچنے سے پہلے ہی ڈاکٹر صاحب دنیا سے رخصت ہوگئے۔ خوب آدمی تھے۔ اچھے کھانے کے شوقین تھے۔ سودا سلف خود خرید کر لاتے تھے اور کھانوں میں تجربے کرتے رہتے تھے۔ جب ڈاکٹر صاحب کسی خاص کھانے کی بات کرتے تو لگتا تھا جیسے خود بھی لطف اندوز ہورہے ہیں۔ اللہ مغفرت کرے، بہت اچھے اور دیانت دار ڈاکٹر تھے۔ مریض کا حال سنتے ہوئے ان کی آنکھوں میں ہمدردی کا ایسا جذبہ جھلکتا تھا جیسے اس کی تکلیف خود بھی محسوس کررہے ہیں۔

☆☆☆

ڈاکٹر طارق محمد خاندانی حکیم اور ہومیو پیتھ تھے۔ ان کے دادا حکیم تھے۔ والد بھی حکیم اور ہومیو پیتھ تھے۔ وہ خود بھی ہومیو پیتھ تھے اور بہت اچھے۔ اللہ نے ان کے ہاتھ میں شِفا دی تھی۔ چالیس پینتالیس سال کی عمر میں ہی تصوف کی طرف رجحان ہوگیا تھا۔ فرصت کے وقت دین اور تصوف کی باتیں ہی کیا کرتے تھے۔ ان کے ایک مرشد بھی تھے جن کے پاس باقاعدگی سے حاضری دیتے تھے۔

ڈاکٹر صاحب کے کلینک کا پتا دریافت کرنا ہو تو مزنگ بازار میں کسی سے دریافت کرلیں کہ دوا آنے والے ڈاکٹر صاحب سے ملنا ہے۔ ہر کوئی ان کا پتا بتا دیتا تھا۔ وہ دو آنے

ظہیر ریحان ایک باصلاحیت ہدایت کار

والے اس لیے مشہور تھے کہ ان کے دادا اور والد ہمیشہ دوا نے کی دوائی دیا کرتے تھے۔

ڈاکٹر طارق محمود وضع دار انسان تھے۔ ایسا کبھی نہیں ہوا کہ عیدالفطر پر وہ مٹھائی اور عیدالاضحیٰ پر گوشت لے کر نہ آئے ہوں۔ ہمارے ساتھ کچھ خصوصی تعلق قائم ہوگیا تھا۔ بیماری کا سنتے تو خود ہی چلے آتے۔ ڈاکٹر صاحب کی تشخیص بہت اچھی تھی۔ بڑے بڑے سیریس مریضوں کو ان کے علاج سے تندرست ہوتے دیکھا۔

ڈاکٹر صاحب اچھے، صحت مند آدمی تھے مگر پھر اچانک گھلنا شروع ہوگئے۔ معلوم ہوا کہ بلڈ پریشر کے مریض ہیں۔

ہم نے کہا ''ڈاکٹر صاحب، آپ تو خود ڈاکٹر ہیں۔ اپنا علاج کیوں نہیں کرتے؟''

بولے ''میں دوسرے ڈاکٹروں کے مشورے سے دوائی استعمال کررہا ہوں۔''

ایک سال کے اندر ہی ڈاکٹر صاحب گھل کر آدھے بھی نہیں رہے۔ انہوں نے بذاتِ خود بے شمار لوگوں کے بلڈ پریشر کا علاج کیا تھا مگر اللہ کو منظور نہ تھا کہ وہ صحت مند ہوتے۔

ایک دن خبر ملی کہ ڈاکٹر طارق محمود کا انتقال ہوگیا ہے۔ مریضوں کا اتنا بڑا نقصان!

اب ان کا بیٹا عثمان ان کی جگہ بیٹھتا ہے۔ سارے انداز ویسے ہی ہیں۔ مگر ڈاکٹر صاحب کا یوں اچانک چلا جانا، بہت بڑا صدمہ ہوتا ہے۔

☆☆☆

داستانیں تو بہت ہیں، اب ایک حکیم صاحب کا عجیب وغریب قصہ بھی سن لیجیے۔

بہت اچھے طبیب اور نبّاض تھے۔ ان سے اگر فون پر بھی پوچھ لو کہ حکیم صاحب، فلاں شربت یا دوائی کہاں سے ملے گی؟ شام کو ان کا فرستادہ تین چار بوتلیں اور خمیرے کے چار چھ ڈبے لیے چلا آتا تھا۔

نام تو ان کا عبدالباقی چشتی تھا مگر ہم انہیں چشتی صاحب ہی کہتے تھے۔ صحت مند اور خوش خوراک انسان تھے۔ خود کھا کر اور دوسروں کو کھلا کر بہت خوش ہوتے تھے۔ ہم جب بھی فون کرتے، وہ کہتے ''آفاقی صاحب، کھانے کے لیے کبھی کچھ وقت نکالیے نا۔''

وقت بہت آرام سے گزر رہا تھا۔ ایک بار معلوم ہوا کہ حکیم صاحب بیمار ہیں اور کئی دن شفاخانے بھی نہیں آئے۔ گھر پر فون کیا تو بہت کمزور آواز میں بات کی۔ پوچھا، حکیم صاحب آپ کو تکلیف کیا ہے؟

جواب میں کہا ''پھر بتاؤں گا۔''

کچھ عرصے بعد جب وہ تندرست نہ ہوئے تو ہم نے پھر بیماری کے بارے میں پوچھا۔ کہنے لگے ''آفاقی صاحب، کسی بدبخت نے جادو کردیا ہے۔ نہ کھا سکتا ہوں، نہ پی سکتا ہوں۔ دن اور رات میں سو بھی نہیں سکتا۔''

کئی دن بعد ہم نے فون کیا تو کسی اور نے فون اُٹھایا۔

ہم نے پوچھا ''حکیم صاحب اب کیسے ہیں؟''

''آفاقی صاحب، کچھ نہ پوچھیے۔ سونے کے لیے لیٹتے ہیں تو گھبرا کر اُٹھ بیٹھتے ہیں۔ نیند سے تو جیسے دشمنی ہوگئی ہے۔''

''آپ نے کوئی اور علاج بھی کرایا؟''

''بہت علاج کرائے۔ عاملوں سے بھی مدد لی مگر ان کی حالت بگڑتی جارہی ہے۔ لیٹ کر یا بیٹھ کر سو نہیں سکتے اس لیے ساری رات صوفے کی پشت پر سر رکھ کر بیٹھے رہتے ہیں۔''

جادو ٹونے کا ہم نے بھی سنا تھا مگر اب خود دیکھ لیا۔

چند دن بعد حکیم صاحب انتقال کرگئے۔

یہ ہم نے ان چند معالجوں کا تذکرہ کیا ہے جو گزشتہ چند سالوں میں وفات پاگئے ہیں' ورنہ ڈاکٹروں، حکیموں اور ہومیو پیتھ ڈاکٹروں کی ایک بہت طویل فہرست ہے۔ بہت صاحبِ کمال، دیانت دار، ہمدرد اور نیک سیرت ہونے کے علاوہ بہت اچھے معالج بھی تھے۔

آپ سوچتے ہوں گے کہ عجب آدمی ہے جو اپنی بیماری اور ڈاکٹروں، حکیموں کا قصہ لے بیٹھا۔ ہمارا واسطہ ایسے ڈاکٹرز اور حکیموں سے بھی پڑا ہے جو یکتائے زمانہ تھے۔ آج کل بھی ایسے کئی بے غرض اور مخلص ڈاکٹر موجود ہیں۔ اخبارات میں جب آج کے ڈاکٹروں کی سنگدلی اور مریضوں کی تکالیف سے بے پروائی کے واقعات پڑھتے اور سنتے ہیں تو حیرت ہوتی ہے کہ دنیا کس قدر تبدیل ہوگئی۔ ورنہ ہم نے تو جو ڈاکٹر دیکھے وہ آج کل نایاب ہیں۔

جن دنوں ہم السر کے آپریشن کے بعد یو سی ایچ میں زیرِ علاج تھے تو وہاں قریباً تمام ڈاکٹرز امریکی تھے۔ وہ مطلب کی بات کے سوا کوئی دوسری بات نہیں کرتے تھے۔ انہی مصروفیات کی وجہ سے مگر ہم نے مختلف مسائل کے بارے میں بحث چھیڑ کر ان سے دوستی گانٹھ لی تھی۔

اس زمانے میں وہاں ایک ہڈیوں کے ڈاکٹر تھے۔ وہ جب بھی اپنے مریضوں کے لیے خون محفوظ کرتے کوئی اور ڈاکٹر ہنگامی حالات کے باعث لے جاکر وہ خون استعمال کرلیتا تھا۔ آخر انہوں نے ایک بار اپنا خون لیا اور اس پر لکھ

www.Paksociety.com
پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

www.Paksociety.com

دیا" کوئی ہاتھ نہ لگائے، ذاتی۔"

ایک دل کے مریض کو فوری ضرورت پڑی تو ڈاکٹر خون کی وہ بوتل بھی اُٹھا کر لے گیا۔ آخر انہوں یہ ترکیب نکالی کہ اپنی بیٹی کا خون ایک بوتل میں محفوظ کر کے اپنے گھر کے فریج میں رکھ دیا اور اگلے دن اپنے مریض کا آپریشن کر کے اطمینان کا سانس لیا۔ تو جناب، ہم نے ایسے ڈاکٹر بھی دیکھے ہیں جن کی مثالیں دی جائیں تو کوئی یقین نہیں کرے گا۔

ان ڈاکٹروں کا تذکرہ کرنے کا سبب یہ ہے کہ جب تین ہفتے تک تیز بخار میں مدہوش رہے تو بہت سے پُرانے ڈاکٹر اور حکیم یاد آ گئے۔ یہ وہ لوگ تھے جنہوں نے انسانیت کی بے لوث خدمت کی اور ساری زندگی مریضوں کو آسانیاں فراہم کرتے ہوئے گزار دی۔ کیسے لوگ تھے وہ بھی۔

شکریہ اے حسیں انسانو
راستے جگمگائے جاتے ہیں
اللہ تعالیٰ انہیں اجر عطا فرمائے، آمین۔

☆☆☆

اس بخار کے عالم میں ہم نے تین کہانیاں بھی سوچی تھیں۔ تین ہفتے تک فی ہفتہ ایک کہانی سوچتے اور اس میں تبدیلیاں کرتے رہے۔ یہ کہانیاں ہمیں آج بھی یاد ہیں لیکن فائدہ کیا؟ بس ذہنی ورزش کرتے اور بخار کو بہلاتے رہتے تھے۔

☆☆☆

بیماری کے دوران میں ہی ہم سوچتے رہے کہ اب تک کس کس کے بارے میں اور کیا کیا لکھ چکے ہیں۔ یاد آیا کہ پاکستان کے ایک بہت اچھے ہنر مند، ہدایت کار کو ہم نے اپنی فہرست میں تو شامل کر رکھا ہے مگر ان پر کبھی لکھا نہیں۔ ان کا نام حسن عسکری ہے۔ کم گو اور گوشہ نشینی میں عمر گزارنے والے۔ اپنے کام سے کام رکھتے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ انہوں نے اردو اور پنجابی فلموں میں نئی روایات قائم کی ہیں۔ انہوں نے بعض ایسے موضوعات بھی فلمائے جنہیں ہاتھ لگاتے ہوئے دوسرے ہدایت کار ڈرتے تھے مگر ان موضوعات کو انہوں نے شاہکار اور یادگار فلموں میں ڈھال دیا۔

وہ ایک تعلیم یافتہ اور تخیل سے بہرہ مند ہدایت کار ہیں۔ مثال کے طور پر ان فلموں کو دیکھا ہو تو یاد کیجیے اور نہ دیکھا ہو تو سی ڈی لا کر ضرور دیکھیے تو آپ کو اندازہ ہوگا کہ ہماری فلمی صنعت میں کیسے کیسے گوہرِ نایاب چھپے ہوئے ہیں۔ انہوں نے آج سے تیس پینتیس سال قبل ایسے موضوعات پر دلچسپ اور انوکھی فلمیں بنائیں جن کو انڈیا میں آج بھی نہیں فلمایا جاتا۔

چند فلموں کے نام سنیے۔

اور ہاں..... طوفان جو پنجابی فلموں میں ایک روایت ساز فلم تھی، دوریاں میں انہوں نے ایک گورنر کی کہانی فلما دی تھی۔ سلاخیں، ترے پیار میں، گزرا، آگ، وحشی جٹ، دل کسی کا دوست نہیں۔ انہوں نے مختلف موضوعات پر فلمیں بنائیں اور انہیں یادگار بنا دیا۔ وہ اداکاروں سے کام لینے کے ماہر ہیں۔ فلموں میں ایک چھوٹے چھوٹے ہدایت کارانہ ٹچ لگاتے ہیں کہ ایک ہی شاٹ پر دیکھنے والا داد دینے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

انہوں نے 1972ء میں ہدایت کاری کا آغاز کیا تھا۔ یہ ایک پنجابی فلم تھی۔ "خون اور پسینا" بہت کامیاب ہوئی اور نقادوں کو احساس ہوا کہ ایک حساس اور سمجھ دار ہدایت کار نمودار ہوا ہے۔ انہوں نے اب تک 55 کے لگ بھگ فلمیں بنائی ہیں۔ کم تعداد کی وجہ یہ ہے کہ وہ موضوع کو پسند کر کے ہدایت کاری کی ذمّے داری ادا کرتے ہیں اور پھر فلم ساز کو تخلیقی کاموں میں دخل نہیں دینے دیتے۔ چلو عشق لڑائیں ان کے مزاج کی فلم نہ تھی مگر انہوں نے اسے بھی کامیاب کر دکھایا۔

اس دور میں پنجابی فلموں کے سپر اسٹار لالہ سدھیر تھے۔ وہ ایکشن فلموں کے بادشاہ سمجھے جاتے تھے۔ فلم "خون اور پسینا" جاگیرداری نظام کے خلاف ایک باغیانہ فلم تھی۔ فلم ہر اعتبار سے بہت معیاری اور کامیاب تھی۔ ان کی فلموں کے موضوع اس تیزی سے تبدیل ہوتے تھے کہ فلم بین حیران رہ جاتے تھے اور یہ فلمیں کامیاب بھی ہوتی تھیں جن میں حسن عسکری کی تخلیقی صلاحیتوں کا بڑا ہاتھ رہا ہے۔ 1975ء میں انہوں نے اپنی ایک یادگار پنجابی فلم "وحشی جٹ" پیش کی۔ اس فلم نے نہ صرف بے حد کامیابی حاصل کی بلکہ پنجابی فلموں میں ایک نئے رواج کی داغ بیل ڈالی۔ یہ فلم احمد ندیم قاسمی کے افسانے "گنڈاسا" سے اخذ کی گئی تھی لیکن منظر نامے، اداکاری اور سب سے بڑھ کر ہدایت کاری نے اسے پنجابی فلموں میں ایک سنگِ میل کی حیثیت دے دی۔ یہ فلم جنگ وجدل سے بھرپور تھی جس کے خلاف اظہار رائے بھی کیا گیا لیکن ایک فلم کی حیثیت سے یہ حسن عسکری کا بہت بڑا کارنامہ تھا۔

سلطان راہی کو ایک ایکسٹرا سے پنجابی فلموں کا ہیرو بنانے کا اعزاز ہدایت کار ڈار نے بخشا تھا اور وہ بطور ہیرو کامیاب بھی رہے تھے لیکن انہیں پنجابی فلموں کا سپر اسٹار بنانے کا کریڈٹ حسن عسکری کو جاتا ہے۔ انہوں نے اس فلم کو بہت آرٹسٹک انداز میں بنایا تھا جس کی وجہ سے یہ دوسری

پنجابی فلموں سے بدرجہ بہتر تھی۔ اگر سلطان راہی کو ہیرو ڈار صاحب نے بنایا تھا تو حسن عسکری نے سلطان راہی کو پنجابی فلموں کی ضرورت بنا دیا جو حیثیت انہیں آخری دم تک حاصل رہی۔ سلطان راہی نے اس فلم میں گنڈاسے کا بہت انوکھے انداز میں استعمال کیا تھا۔ یہ ہر اعتبار سے ایک اعلیٰ معیار کی فلم تھی۔ اس فلم کی نمائش کے بعد معیاری پنجابی فلموں کا دور شروع ہو گیا تھا۔

"طوفان" ایک رنگین فلم تھی جو کہانی، اداکاری، کردار سازی، ہدایت کاری کے اعتبار سے ایک نیا اور کامیاب تجربہ تھا۔ سلطان راہی نے اس فلم میں مرکزی کردار ادا کیا تھا اور ان کی ایک ٹانگ میں چلتے ہوئے معمولی سالنگ پیدا کر کے ہدایت کار نے اس خامی کو کئی اہم مواقع پر بہت کامیابی اور خوبصورتی سے استعمال کیا تھا۔ یہ فلم حسن عسکری کی ہدایت کاری کے فن کا نمونہ تھی۔

1977ء میں حسن عسکری کی تین فلمیں ریلیز ہوئیں۔ آخری میدان، قانون اور سلاخیں۔ پہلی دو فلموں نے اوسط درجے کا بزنس کیا لیکن سلاخیں نے تہلکہ مچا دیا۔ کافی عرصے بعد حسن عسکری نے ایک خوبصورت اردو فلم پیش کی تھی جس نے اپنے موضوع اور ہدایت کاری کی وجہ سے ایک تہلکہ مچایا۔ اس فلم کے ذریعے انہوں نے یہ بھی ثابت کر دیا کہ وہ پنجابی اور اردو فلمیں بنانے پر یکساں عبور رکھتے ہیں۔ یہ بے حد کامیاب فلم تھی۔ محمد علی اور بابرہ شریف نے اس فلم میں پہلی بار ایک ساتھ کام کیا تھا اور اداکاری کا بہترین نمونہ پیش کیا تھا۔ ایسی فلمیں پاکستان میں بہت کم بنی ہیں جنہوں نے موضوع، کرداروں کی خوبصورتی اور ہدایت کاری کے اعتبار سے اعلیٰ معیار قائم کیا ہو۔ اس فلم کی موسیقی بھی بہت اچھی تھی۔ اس فلم کا تھیم سانگ گلی گلی گایا جاتا تھا۔ اس کے بول تھے۔

تیرے میرے پیار کا ایسا ناتا ہے
دیکھ کے تیری صورت دل کو چین آتا ہے

یہ فلم باپ بیٹی کے پیار کی انمول کہانی تھی۔

بابرہ شریف نے اس فلم میں ڈبل رول ادا کیا تھا۔ یہ گولڈن جوبلی فلم تھی جس نے ہدایت کاروں کی صف اوّل میں حسن عسکری کا نام لکھوا دیا تھا۔ اس کے بعد ان کی پنجابی فلم "میلہ اور اکبر خان" منظرِ عام پر آئیں۔ فلم میلہ میں انجمن نے ایک یادگار کردار ادا کر کے فلم ایوارڈ بھی حاصل کیا تھا۔ اس کے اگلے سال ان کی تین فلمیں فلاپ ہوئیں۔ فلم سونے کی تلاش ایک دلچسپ فلم تھی مگر حسبِ توقع کامیابی حاصل نہ کر سکی۔ اس فلم میں ٹی وی اداکار عابد علی نے سائنس دان کا کردار کیا تھا۔ یہ فلم متوقع تاثر پیدا نہ کر سکی حالانکہ ایک اچھی پیشکش تھی مگر فلم ساز وہ لوکیشنز اور اشیا فراہم نہ کر سکا جو ضروری تھیں۔

1988ء میں حسن عسکری کی تین فلمیں نمائش کے لیے پیش ہوئیں۔ مغرور، قاتل اور شیر خان۔ تینوں فلموں میں سلطان راہی مرکزی کردار تھے۔ مغرور میں سلطان راہی کی اداکاری قابلِ دید تھی لیکن یہ فلم زیادہ کامیابی حاصل نہ کر سکی۔ حسن عسکری کی اکثر فلموں میں مرکزی کردار سلطان راہی نے ہی ادا کیے تھے۔

فلم ساز شہزاد گل کی فلم "ترے پیار میں" حسن عسکری نے حقیقت کا رنگ بھرنے کے ساتھ ہی اسے ایک یادگار رومانی فلم بنا دیا تھا۔ یہ ایک بامقصد رومانی فلم تھی جس میں حسن عسکری اپنے عروج پر نظر آتے ہیں۔ اس فلم نے بے شمار ایوارڈ حاصل کیے تھے۔

حسن عسکری کے ساتھ ہمیں بھی ایک بار کام کرنے کا موقع ملا۔ پاکستان میں جن دنوں بھارتی فلم نکاح میں کام کرنے کے بعد سلمیٰ آغا کا بہت چرچا تھا اور ہر فلم ساز انہیں ان کی شرائط پر سائن کرنے کو تیار تھا، فلم ساز شمی ملک انہیں کاسٹ کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ سلمیٰ آغا بمبئی میں تھیں اور ان سے فون کے ذریعے معاملات طے ہو رہے تھے۔

انہوں نے پہلے تو دریافت کیا کہ مصنف کون ہوگا اور میں سائن کرنے سے پہلے کہانی پڑھوں گی جو دلچسپ رومانی اور انگلستان میں رہنے والی ایک دولت مند لڑکی کی کہانی ہونی چاہیے۔ اس فلم کا اسکرپٹ ایک مہینے میں مکمل ہونا چاہیے۔

یہ شرائط سن کر ہم نے تو صاف انکار کر دیا مگر شمی ملک سے ہماری گہری دوستی تھی۔ انہوں نے کہا کہ آفاقی صاحب، یہ کام آپ کے سوا کوئی نہیں کر سکتا۔ انہوں نے اتنے تقاضے کیے کہ عملاً سارا دن ہمارے گھر پر ہی گزارتے تھے۔ کبھی فون پر بات کرتے، کبھی بمبئی کے چکر لگاتے۔ دراصل وہ چاہتے تھے کہ پاکستان میں سلمیٰ آغا کی پہلی فلم کا اعزاز سب سے پہلے انہیں حاصل ہونا چاہیے۔

ہم نے کہا کہ بھائی، کہانی تو تب لکھی جائے گی جب ہدایت کار کا انتخاب ہوگا۔ اس کے مشورے سے ہی یہ عجیب وغریب قسم کی کہانی بن سکتی ہے۔ وہ دوسرے دن حسن عسکری صاحب کو لے کر ہمارے گھر آ گئے۔ ان سے ہماری پہلے بھی یاد اللہ تھی۔ وہ بہت انکسار اور خلوص سے ملتے تھے اور بہت احترام کرتے تھے۔

اب حسن عسکری صاحب کو ہم نے کچھ آئیڈیاز سنائے۔

www.Paksociety.com

ان میں سے ایک انہیں اور شمی ملک صاحب کو بہت پسند آ گیا۔

انہوں نے کہا ”آفاقی صاحب! بس دو دن میں اس کا آئیڈیا لکھ دیجیے، پرسوں سلمیٰ آغا کراچی آ رہی ہیں ایک دن کے لیے۔ یہ آئیڈیا انہیں جا کر سنانا ہوگا۔“

ہم نے کہا ”شمی صاحب، آپ آرٹسٹ کا دماغ اتنا خراب نہ کیجیے۔ وہ سلمیٰ آغا ہے، بالی وڈ کی کوئی بڑی اسٹار نہیں ہے اور ہالی وڈ کی اسٹارز بھی اتنے نخرے نہیں کرتیں۔“

ملک صاحب کا صرف ایک جواب ہوتا تھا۔ ”آفاقی صاحب، پلیز میری خاطر۔“

ان کی خاطر ہم نے کہانی کا آئیڈیا، اہم کردار اور اہم واقعات لکھ کر تیار کر دیے۔ وہ بہت خوش ہوئے۔ بولے ”میں نے کراچی کے لیے آپ کی اور حسن عسکری صاحب کی سیٹیں بک کرا دی ہیں، ہوٹل کا بندوبست بھی ہو گیا ہے۔“

ہم نے عرض کی کہ آپ جانتے ہیں، ہم خود کہانی نہیں سنا سکتے۔ آپ عسکری صاحب، ملک صاحب کے ساتھ چلے جائیے۔ عسکری صاحب بہت اچھی طرح کہانی سنائیں گے۔“

ملک صاحب نے بمبئی فون کیا تو سلمیٰ آغا نے کہا کہ کہانی تو میں صرف مصنف کی زبانی سنوں گی۔

ہم نے پھر صاف انکار کر دیا۔ انہوں نے ضد کی تو ہم نے کہا کہ وہ خود ہی کہانی پڑھ لیں۔ ہم تو نہیں سنائیں گے۔

اس کے بعد جب ان سے بے تکلفی ہوئی تو وہ اکثر مذاق اُڑاتی تھیں کہ آپ کیسے کہانی نویس ہیں کہ کہانی نہیں سنا سکتے۔

بہرحال، عسکری صاحب اور شمی ملک صاحب کراچی آ گئے۔ وہاں سے ان کا فون آیا کہ سلمیٰ آغا کو کہانی پسند آ گئی ہے۔ وہ ہیرو کے لیے ندیم کی فرمائش کر رہی ہیں۔

ندیم سے ٹیلی فون پر رابطہ کیا گیا تو ان دنوں وہ مصروف تھے۔ بعد میں فیصل رحمٰن کا نام زیرِ غور آیا۔ ہم فیصل کے گھر بذاتِ خود گئے، ان کے والد سے ہماری بہت گہری دوستی تھی۔ انہوں نے بہت پذیرائی کی لیکن ان دنوں ان کے پاس بھی وقت نہ تھا۔

کافی بحث کے بعد ہم نے جاوید شیخ کا نام پیش کیا جو مزاحیہ اور ڈرامائی دونوں کرداروں کے ساتھ انصاف کر سکتے تھے۔ سلمیٰ آغا سے جاوید شیخ کی ملاقات کرائی گئی۔ شکر ہے کہ انہوں نے جاوید شیخ کی منظوری دے دی۔

کون جانتا تھا کہ فلم کی تکمیل کے دوران میں ہی دونوں محبت میں مبتلا ہو جائیں گے۔ یہاں تک کہ جاوید شیخ اپنی پسند کی بیگم زینت منگھی اور دو بچوں کو چھوڑ کر سلمیٰ آغا سے شادی کر لیں گے۔ بہرحال یہ ایک علیحدہ داستان ہے جو پہلے بھی بیان کی جا چکی ہے۔

☆☆☆

لبنیٰ بچیوں کے امتحان کی وجہ سے ہمارے ساتھ نہیں جا سکتی تھیں۔ اس لیے پہلی بار ہم نے تنہا ہی سفر کرنے کا ارادہ کیا۔ حسن عسکری صاحب کے ساتھ ان کی بیگم تھیں جن سے ہماری پہلی ملاقات لاہور ائرپورٹ پر ہوئی۔ بیگم عسکری سے مل کر بے حد خوشی ہوئی۔ بہت باوقار، بااخلاق اور تعلیم یافتہ خاندان ہے۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ وہ دونوں اولاد سے محروم ہیں مگر آپس میں بہت خوش ہیں۔ یہ 92-1991ء کا ذکر ہے۔

بیگم عسکری نے آؤٹ ڈور شوٹنگ کے دوران میں ہمارا بہت خیال رکھا۔ انہیں معلوم تھا کہ ہمیں چائے تک بنانی نہیں آتی۔ اس لیے صبح کی چائے وہ کھڑکی پر دستک دے کر ہمیں پہنچا دیتی تھیں۔ شام کی چائے اور اکثر مرغن کھانا تنہا کی محبت اور مہربانی سے مل جاتا تھا۔ وہ اپنی بیگم کے ساتھ گئے تھے مگر شادی کا اعلان نہیں کیا تھا۔

سلمیٰ آغا نے لندن پہنچ کر بہت مہنگے ملبوسات اور جوتوں وغیرہ کی خریداری شروع کر دی۔ ہم نے ایک ہزار پونڈ کے ایک لباس کے بارے میں سنا تو بے ہوشی طاری ہو گئی۔ سلمیٰ آغا کو روک ٹوک کرنے والا بھی کوئی نہ تھا۔ شمی ملک لاہور میں تھے۔ انگلستان میں پروڈکشن کے انتظامات ان کے بھانجے جاوید ملک کے ذمے تھے۔ وہ نہایت شریف اور مہذب انسان تھے۔ شمی ملک صاحب کی ہدایت کے مطابق ہر ایک کا خیال رکھتے تھے اور تمام سہولتیں فراہم کرتے تھے۔ یوں بھی انہیں سلمیٰ آغا کے ہر حکم کی تکمیل کا حکم تھا۔

یوں تو وہاں بہت سے واقعات پیش آئے لیکن چند واقعات بہت دلچسپ ہیں۔ ہم یہ بتانا بھول گئے کہ فلم کا نام ”ہم اور تم“ تھا۔ یہ بہت دلچسپ رومانی کہانی تھی مگر سلمیٰ آغا کی مداخلت اور مشوروں کی وجہ سے اس کا تصور ہی بدل گیا۔ اس فلم میں تنہا، افضال بھی ہمراہ تھے۔ تنہا اداکارہ نازلی کو بھی اپنے ساتھ لے گئے تھے بہ قول ان کے انہیں لیلیٰ مجنوں کی طرح پیار تھا۔

سب سے پہلے لوکیشنز کی تلاش کا مسئلہ تھا۔ یہ ایک دولت مند رئیس زادی کی کہانی تھی اس لیے اس کی رہائش اور دوسری تقاریب کے لیے شاندار محل درکار تھے۔ ان دنوں موسلا دھار بارش تھی۔ سردی بہت زیادہ تھی مگر ہم، جاوید صاحب، حسن عسکری اور ان کی بیگم، سب لندن کے

گرد و نواح میں محلات تلاش کرتے پھر رہے تھے۔ کئی رئیسوں نے تو صاف انکار کر دیا۔ چند پُرانے انگریز رئیسوں کو جاوید صاحب نے رضامند کیا۔ موسلا دھار بارش اور کڑاکے کی سردی تھی۔

انگلستان کے مشہور زمانہ لیک ڈسٹرکٹ میں جھیل کے اندر ایک وسیع و عریض شاندار محل تھا جہاں صرف کشتی کے ذریعے رسائی تھی۔ پروگرام کے مطابق انگریز رئیس کا کشتی بان ہم سب کو لینے آیا۔ اس نے اس قدر تیزی سے کشتی چلائی کہ ہمیں تو ڈوبنے کا خطرہ پیدا ہو گیا۔

ہم نے اس سے کہا ”بھائی، ہم تیرنا نہیں جانتے۔“

وہ بولا ”فکر نہ کریں، میں پیشہ ور غوطہ خور ہوں۔“

یہ سن کر ہمارا خون مزید خشک ہو گیا۔

محل کے ساحل پر پہنچ کر کشتی بان نے ہمیں اُتارا اور کچھ کہے بغیر غائب ہو گیا۔ بارش کچھ دیر کے لیے رک گئی تھی مگر بے حد ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔

ہم لوگ محل کی طرف بڑھے تو سامنے ایک بورڈ نظر آیا ”خطرناک کتوں سے ہوشیار۔“

ہم سب ڈر گئے۔ دور دور تک نہ کوئی آدم نہ آدم زاد۔ کس سے پوچھیں کس سے معلومات حاصل کریں؟

بیگم عسکری بولیں ”کچھ لوگ خوفزدہ کرنے کے لیے بھی ایسے بورڈ لگا دیتے ہیں۔ ہو سکتا ہے یہاں کتا ہی نہ ہو۔“

اس مشورے کے سہارے ہم کچھ آگے بڑھے تو اچانک محل کی جانب سے ایک خرگوش کے سائز کا خوبصورت کتا نمودار ہوا۔ وہ ہم لوگوں کو دیکھ کر بہت ناراض تھا۔ وہ اپنی نازک سی ریشمی آواز میں ”بخ بخ“ کرتا رہا۔ اس کی آواز شاید دو فٹ کے فاصلے تک بھی نہیں جا رہی ہوگی مگر وہ جان لڑا کر بھونک رہا تھا اور بار بار ہم لوگوں پر حملہ آور ہو رہا تھا۔

بیگم عسکری کے سوا سب اس سے ڈر گئے۔ جب وہ ان کے نزدیک پہنچ کر ”بخ بخ“ کرنے لگا تو انہوں نے لات مارنے کے انداز میں پیر اس کی طرف اُٹھا کر ڈانٹا تو وہ ”بخ بخ“ کر کے ان سے دور بھاگ گیا مگر دوسروں پر بدستور حملہ آور ہوتا رہا۔

ہم چاروں طرف دیکھ رہے تھے کہ بھئی کس سے مدد طلب کریں۔ جب خرگوش نما کتا اس تمام کوششوں کے باوجود ہمیں ڈرانے میں ناکام رہا تو ”بخ بخ“ کرتا ہوا محل کی طرف واپس چلا گیا۔ ہم نے سوچا کہ چلو، جان بچی اور لاکھوں پائے۔ ابھی پوری طرح سوچنے بھی نہ پائے تھے کہ وہی خرگوش کے سائز کا کتا دوبارہ نمودار ہوا۔ اس بار اس کے ساتھ ایک گدھے کے سائز کا خوفناک صورت کا کتا بھی تھا۔ شاید وہ اس بڑے کتے کو اپنی مدد کے لیے لے کر آیا تھا۔

اس ویرانے میں اتنے بڑے سائز کے کتے کو دیکھ کر ہم سب سہم کر رہ گئے اور دفاعی طور پر اکٹھے بھی ہو گئے۔ ہمارے پاس تو کوئی چھوٹی سی لکڑی بھی نہ تھی کہ اس کو ڈرانے کی کوشش کرتے۔

یہ مددگار کتا (بہ قول جاوید صاحب کے غنڈہ) ہم سے کچھ دور آ کر رک گیا۔ پہلے تو اس نے چھوٹے کتے کی بخ بخ نما رپورٹ سنی اور پھر تمام واقعات سے واقف ہونے کے بعد ناراض ہو کر اپنے خوفناک دانت نکال کر غرّایا اور ہماری طرف بڑھا۔ ہم سب واقعی خوف زدہ ہو گئے۔ اس قسم کے خوفناک کتے صرف بھونکتے ہی نہیں کاٹ بھی لیتے ہیں۔ جب وہ دانت نکال کر غرّاتا ہوا ہماری طرف بڑھا تو ہم سب نے اس کو بہت زور سے ڈانٹا۔ یہ ڈانٹ نہیں دراصل ہماری خوف زدہ آوازیں تھیں۔ اتنی بہت سی آوازیں سن کر وہ کچھ پریشان ہو گیا۔ لان میں کوئی پتھر بھی نہیں پڑا تھا کہ ہم اسے پتھر سے ہی ڈراتے، کچھ دیر یہ سلسلہ جاری رہا کہ وہ غرّاتا ہوا ہماری طرف بڑھتا اور ہم سب کی آوازیں سن کر پیچھے ہٹ جاتا۔ اس دوران میں چھوٹا کتا بھی بخ بخ کر کے اچھل کود میں معروف تھا۔

یہ سلسلہ دو چار منٹ جاری رہا مگر ہمیں یوں لگا جیسے گھنٹوں بیت گئے، اتنی دیر میں محل کی طرف سے ایک کارندہ یا ملازم قسم کا آدمی نمودار ہوا۔ اس نے دونوں کتوں کو ڈانٹ کر چپ کرایا اور پھر ہماری طرف بڑھا۔

”آپ لوگ کون ہیں اور یہاں تک کیسے آ گئے؟“

ہم نے بتایا کہ ڈیوک نے ہمیں مدعو کیا ہے اور ہم کشتی کے ذریعے یہاں آئے ہیں۔ کشتی والا ہمیں چھوڑ کر چلا گیا اور ان کتوں سے واسطہ پڑ گیا۔

تیز چلتی ہوئی ہوا میں بیگم حسن عسکری کی شال پھڑپھڑا رہی تھی۔

وہ شخص بولا ”اگر آپ نے ایسا لباس نہ پہنا ہوتا تو کتے آپ پر اتنے ناراض نہ ہوتے۔“

ہم خاموش رہے۔

وہ بولا ”آئیے میرے ساتھ۔“

ہم نے کہا ”پہلے ان کتوں کو یہاں سے لے جائیے۔“

اس نے کہا ”آپ بالکل پریشان نہ ہوں۔ اس وقت میں آپ کے ساتھ ہوں۔“

یہ کہہ کر اس نے کتوں کو پچکارا۔ جواب میں بڑے کتے

نے اس کو پیار کرلیا۔ چھوٹا مجبور تھا اس لیے اُچھل اُچھل کر رہ گیا مگر اس کے پیروں سے چمٹ کر اظہارِ محبت کرتا رہا۔

محل کے سامنے دو طرفہ سیڑھیاں تھیں۔ اس کے بعد محل کی عمارت تھی۔

انگریز ملازم نے کہا ”آپ یہاں ٹھہریے۔ میں اندر خبر کرتا ہوں۔“

ہم نے کہا ”مگر ان کتوں کو بھی ساتھ لے جائیے۔“

وہ کتوں کے ساتھ چلا گیا۔ کچھ دیر بعد آیا اور بتایا کہ لارڈ صاحب آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔ ہم اتنی مصیبتوں سے گزر کر ان کے بلانے پر آئے اور لاٹ صاحب نے باہر نکل کر ہمارا استقبال بھی نہ کیا۔

محل بہت شاندار تھا۔ قدیم زمانے کے قالین، صوفے، پردے، روشنیاں اور آرائش کا دوسرا سامان قابلِ دید تھا۔ ہم ایک دو کمروں اور کئی گیلریوں سے گزر کر بڑے ہال میں پہنچے جہاں لارڈ صاحب اپنے چند دوستوں کے ساتھ مے نوشی اور گپ شپ میں مصروف تھے۔ انہوں نے اُٹھ کر ہم سب سے مصافحہ کیا اور زحمت پر معذرت کی۔

ہمارے میز پر بیٹھتے ہی ایک باوردی ویٹر ہم سے پوچھنے آیا کہ آپ کیا پسند کریں گے؟ وہسکی، رم یا برانڈی؟

ہم نے کہا ”اگر اچھی سی کافی مل جائے تو مہربانی ہوگی۔“

یہ سن کر ویٹر سمیت ہر شخص نے ہمیں یوں گھور کر دیکھا جیسے ہم نے کوئی بہت بُری بات کہہ دی ہے۔

بہرحال، کافی بہت گرم اور مزے دار تھی۔

ہم لوگ آپس میں مشورے کرتے رہے۔ یہ محل رہنے کے لیے تو اچھا تھا لیکن ہماری شوٹنگ کی ضروریات کے لیے مناسب نہ تھا۔

جاوید صاحب کچھ دیر بعد لارڈ صاحب کو اُٹھا کر اپنے ساتھ دوسرے کمرے میں لے گئے۔ یہ لارڈ اور ان کے ساتھ کے مرد اور خواتین اعلیٰ خاندانی لوگ تھے۔ لباس اور بول چال سے لارڈ ماؤنٹ بیٹن کے زمانے کے لگتے تھے۔ انہوں نے ہم سے ایک دو رسمی باتیں کرنے کے بعد توجہ ہی نہ دی اور آپس میں گفتگو کرنے میں مصروف ہوگئے۔

کچھ دیر بعد جاوید صاحب لارڈ کے ساتھ کمرے میں داخل ہوئے اور رخصت کی اجازت طلب کی۔ سب سے ہاتھ ملا کر ہم لوگ آگئے مگر ڈرتے ڈرتے باہر نکلے۔ ہم نے تمنا جی سے کہا کہ آپ اپنی شال سنبھال کر رکھیے۔

ملازم ہمیں جھیل کنارے تک لے گیا جہاں وہی کشتی بان ہمارا منتظر تھا۔ ہمیں اس پر بہت غصہ تھا مگر پھر سوچا کہ بلاوجہ پہلی اور آخری ملاقات میں غصہ کرنا مناسب نہیں ہے۔

جھیل سے باہر نکلے تو جاوید صاحب نے بتایا کہ لارڈ تین دن کی شوٹنگ کے لیے بیس ہزار پونڈ طلب کر رہے ہیں۔ ہم سب کو شوٹنگ کے لیے یہ محل پسند ہی نہیں تھا اس لیے فیصلہ کیا کہ مزید تلاش جاری رکھنی چاہیے۔

ہم نے چند اور محل بھی دیکھے۔ کافی فاصلے تھے۔ صبح سویرے ہوٹل سے نکلتے تو شام ڈھلے واپس آتے۔

ایک محل ہم سب کو بہت پسند آیا۔ اس کے آس پاس کا ماحول بہت اچھا تھا۔ نشیب و فراز میں سبزہ زار، بلند و بالا درخت، خوبصورت لان۔ محل کے اندر بھی شوٹنگ کی ضرورت کے مطابق ہر چیز مناسب تھی۔ یہ کئی سو سال پُرانا محل تھا مگر یوں لگتا تھا جیسے آج ہی بنا ہے۔ آرائش خالص انگریزی انداز کی تھی۔

مالک نے اپنا تعارف مسٹر اسٹرانگ کہہ کر کرایا مگر معلوم ہوا کہ بہت اعلیٰ خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ ساٹھ پینسٹھ سال کی عمر تھی مگر دیکھنے میں چالیس کے لگتے تھے۔ بول چال اور انداز خالص انگریزی۔ پُرانے انگریزوں کے لہجے میں انگریزی بولتے تھے اور کم ہی گفتگو کرتے تھے۔ جاوید صاحب نے چکنی چپڑی باتیں کرکے اور ان کی قدیم اور نادر اشیا کی تعریف کرکے ان سے کرائے میں بھی بہت رعایت کرالی تھی۔

اس گھر میں ایک تو لارڈ اسٹرانگ صاحب تھے اور دوسری ایک موٹی سی میڈ یعنی گھر کا خیال رکھنے والی ملازمہ۔ لیکن تمام اختیارات ان ہی کے پاس تھے۔ انہیں سب جینی کہتے تھے۔

گھر کا تیسرا فرد ایک کتا تھا۔ یہ بہت شریف اور بیمار کتا تھا۔ لارڈ نے اس کے پاس بیٹھ کر اسے بہت دیر تک پیار کیا۔ کتے نے بھی لارڈ کا منہ چوما۔ یہ کتا ایک مخصوص جگہ پر لیٹا رہتا تھا۔ بھونکنے کی صلاحیت سے شاید محروم ہوچکا تھا اس لیے کراہتا رہتا تھا۔ اس کی موجودگی کا احساس بھی ہمیں اس کے کراہنے سے ہی ہوا تھا۔ ہم سب نے حیرت ظاہر کی تو لارڈ نے بتایا کہ یہ ان کا پُرانا خاندانی کتا ہے بلکہ خاندان کا ہی ایک فرد ہے۔ اب بوڑھا اور بیمار ہوچکا ہے۔ اس کا باقاعدہ علاج ہورہا ہے۔ اس کی تمام ضروریات کا خیال رکھا جاتا ہے۔ عنقریب اس کی آنکھ کا آپریشن ہونے والا ہے کیونکہ اس کی نظر بے حد کمزور ہوگئی ہے۔ ”اب تو یہ مجھے بھی نہیں پہچانتا۔“ یہ کہہ کر وہ آب دیدہ ہوگئے۔

انگریزوں کی ایک خوبی یا بُرائی یہ ہے کہ انہیں اپنے بیوی بچوں اور رشتے داروں سے اتنی محبت نہیں ہوتی جتنی کہ اپنے کتے سے ہوتی ہے۔ کتا ان کی زندگی کا ایک لازمی حصہ ہے۔ وہ ساری دنیا کو چھوڑ سکتے ہیں مگر اپنے کتے سے جدائی برداشت نہیں کرتے۔ اس گھر میں بھی کتے کے لیے مخصوص اور آرام دہ رہائش گاہ بنائی گئی تھی۔ یوں تو اس کو سارے گھر میں گھومنے پھرنے کی آزادی تھی۔ مسٹر اسٹرانگ نے بھرائی ہوئی آواز میں بتایا کہ جب تندرست تھا تو کتا ان کے ساتھ کھانے کی میز پر بیٹھ کر کھانا کھاتا تھا۔ ان کی بیگم کا کافی عرصے پہلے انتقال ہوچکا تھا۔ ایک بیٹا تھا جو دو چار سال میں ان سے ملنے آجاتا تھا۔ گھر کی دیکھ بھال کی تمام ذمے داریاں جینی کے سپرد تھیں۔ وہ اکیلی عورت سارے گھر کو صاف شفاف رکھتی تھی۔

مسٹر اسٹرانگ تو جاوید ملک سے بات چیت طے کرکے رخصت ہوگئے۔ اس کے بعد جینی نے ہمیں نمبروار ہدایات دیں۔

1۔ شوٹنگ کے دوران میں کوئی چیز اپنی جگہ سے ہلائی نہیں جائے گی۔

2۔ گھر کی صفائی کا بہت خیال رکھا جائے گا۔

3۔ کھانا خوشبودار نہ لایئے گا جس سے گھر میں اس کی خوشبو بس جائے۔

4۔ اگر زیادہ خوشبودار کھانا ہو تو باہر لان میں بیٹھ کر کھا سکتے ہیں۔

5۔ سگریٹ نوشی گھر کے اندر بالکل منع ہے۔ اگر کسی جگہ سگریٹ کی راکھ پائی گئی تو معاہدہ ختم ہوجائے گا۔

6۔ چائے دن میں صرف دو مرتبہ فراہم کی جائے گی۔ ایک صبح گیارہ بجے اور دوسری شام کو چار بجے۔

7۔ شوٹنگ کے خاتمے پر اپنا تمام سامان سمیٹ کر اور گھر میں صفائی کرکے رخصت ہوں۔

یہ اہم شرائط تھیں اور بھی چھوٹی موٹی شرطیں تھیں کہ جھیل میں گندگی اور سگریٹ نہ پھینکے جائیں۔ پھولوں کا خاص خیال رکھا جائے۔ بلاضرورت لان میں نہ گھوما جائے۔ درختوں پر بیٹھے ہوئے پرندوں کو پریشان نہ کیا جائے، وغیرہ وغیرہ۔

فلم یونٹ کے سب لوگوں کو نہایت سختی سے ان ہدایات کی پابندی کرنے کی ہدایت کردی گئی پھر بھی فلم والے عموماً سگریٹ اور چائے کے عادی ہوتے ہیں۔ اس کو وہ ”پیٹرول“ کا نام دیتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ اگر پیٹرول نہ ہو تو گاڑی کیسے چلے گی؟

شوٹنگ شروع ہوئی تو اس احترام کے ساتھ جیسے ہم لوگ بکنگھم پیلس میں آگئے ہیں۔ سگریٹ کے شوقین تو باہر جاکر سگریٹ نوشی کرلیتے تھے مگر چائے کے عادی بہت پریشان تھے۔ دن میں صرف دو مرتبہ مقررہ اوقات پر چائے ان کے لیے ناکافی تھی۔ ایک ساؤنڈ ریکارڈسٹ نے ایک بار بڑی التجا بھری آواز میں جینی سے چائے کی فرمائش کردی تو مس جینی نے تاریخی گھڑیال کی طرف اشارہ کرکے انہیں بتایا کہ ابھی چائے کا وقت نہیں ہوا۔ ہم لوگ کھانے کے ساتھ چائے کا سامان بھی اپنے ساتھ لے جاسکتے تھے مگر مخصوص اوقات کے علاوہ باورچی خانہ بند رہتا تھا اس لیے مجبور تھے۔

ساؤنڈ ریکارڈسٹ نے یہ طریقہ اختیار کیا کہ جب جینی سامنے آتیں تو وہ بیماروں کی طرح کراہنے لگتے تھے۔ جینی نے اس بارے میں دریافت بھی کیا لیکن سب خاموش رہے۔ اگلے دن انہوں نے یہ ڈراما کیا کہ اچانک دل تھام کر قالین پر گر گئے۔ ہم سب پریشان ہوئے کہ انہیں اچانک کیا ہوگیا، جینی بھی یہ خبر سن کر بھاگی بھاگی آئی۔۔۔ ساؤنڈ ریکارڈسٹ نیم بے ہوشی کے عالم میں دل تھامے پڑے تھے۔

”انہیں فوراً اسپتال لے کر چلو۔“ انہوں نے پریشان ہوکر کہا۔

ساؤنڈ ریکارڈسٹ کے اسسٹنٹ نے کہا ”ان کا علاج اسپتال میں نہیں ہوسکتا۔“

”تو پھر کہاں ہوسکتا ہے؟“

”دیکھیے مس جینی! ہم نے آپ کو پہلے نہیں بتایا تھا مگر یہ سات سال کی عمر سے چائے نوشی کر رہے ہیں۔ چائے کا نشہ ان کی رگ رگ میں سما گیا ہے۔ اگر دن میں بارہ پیالی چائے نہ پئیں تو ان کا دل بیٹھنے لگتا ہے۔ دماغ میں آکسیجن کی کمی ہوجاتی ہے۔ ڈاکٹر کہتے ہیں کہ ہارٹ اٹیک بھی ہوسکتا ہے۔ مگر کیا کریں، مجبور ہیں۔“

یہ ڈرامائی داستان سن کر مس جینی کا دل پگھل گیا۔ انہوں نے کہا ”میں کسی انسان کی جان خطرے میں نہیں ڈال سکتی۔ انہیں کچن استعمال کرنے کی اجازت ہے مگر ان کے سوا کسی اور کو یہ اجازت نہیں ہے۔“

اس طرح انہوں نے ڈراما رچا کر اپنا کام نکال لیا۔

اب مسٹر اسٹرانگ کی سنیے۔ وہ نہایت خالص اور پکے انگریز تھے۔ صاحبِ جائداد تھے۔ دن کے وقت آفس جاتے تھے۔ شام کو آکر اپنے کمرے میں بند ہوکر بیٹھ جاتے تھے۔ ایک دن وہ ذرا جلدی آگئے۔ دوسرے لوگ تو شوٹنگ میں مصروف تھے۔ ہم باہر لان میں بیٹھے منظر سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ وہ کار سے اُتر کر سیدھے ہمارے پاس آگئے۔

www.Paksociety.com

’’ہیلو، گڈ ایوننگ سر!‘‘ انہوں نے خالص انگریزی لہجے میں کہا۔

ہم نے بھی ’’گڈ ایوننگ، مائی لارڈ!‘‘ کہہ کر جواب دیا۔

وہ بولے ’’آپ یہاں بیٹھے کیا کر رہے ہیں؟ آیئے اندر بیٹھتے ہیں۔‘‘ پھر گھڑی دیکھ کر بولے ’’اب تو چائے کا وقت بھی ہو گیا ہے۔ ایک پیالی چائے کے بارے میں کیا خیال ہے؟‘‘

ہم دونوں اندر ڈرائنگ روم میں جا کر بیٹھ گئے۔ سردی زیادہ نہیں تھی مگر انہوں نے شاندار قدیم آتش دان میں آگ روشن کی۔ آگ کو کنٹرول کرنے کے لیے ایک چمٹا قسم کی چیز اور اسے کریدنے کے لیے لوہے کا ایک خوبصورت راڈ بھی تھا۔

بولے ’’اس گھر میں ہر چیز انٹیک ہے۔ کئی سو سال پُرانی۔ ہمارے دادا پردادا نے جو سامان اکٹھا کیا تھا وہ بھی ہم نے سنبھال کر رکھا ہے اور اس کو جان سے زیادہ عزیز رکھتے ہیں۔‘‘

ہم نے کہا ’’واقعی، آپ کا محل تو ایک قیمتی میوزیم ہے۔ ہم تو ہر چیز کو دیکھ کر بہت لطف اندوز ہوتے ہیں۔‘‘

’’دراصل مشرقی روایات بھی بہت پُرانی ہیں۔ مگر یہ امریکن......‘‘ انہوں نے بُرا سا منہ بنایا ’’سمجھتے ہیں کہ پیسے سے سب کچھ خرید سکتے ہیں۔‘‘

’’آپ صحیح کہتے ہیں۔‘‘ ہم نے ہاں میں ہاں ملائی۔

’’یہ خاندانی لوگ تو ہیں نہیں، نہ ان کی پُرانی تاریخ اور روایات ہیں۔ نئے نئے دولت مند ہوئے ہیں۔ کہتے ہیں کہ دولت سے ہر چیز خرید سکتے ہیں۔ انہیں تو بات کرنے کی تمیز بھی نہیں ہے۔ اب دیکھیے، ایک امریکن میرے پاس آئے، وہ میرے گھر کی کئی چیزیں منہ مانگی قیمت پر خریدنا چاہتے تھے۔ میں نے معذرت کر لی۔ آخر بولے کہ یہ آتش دان ہی مجھے فروخت کر دیں۔‘‘ مجھے غصہ تو بہت آیا مگر ضبط کیا۔ پھر کہنے لگے ’’اچھا یہ چمٹا اور آگ کریدنے والا راڈ ہی دے دیجیے۔‘‘

میرا بس چلتا تو انہیں اُٹھا کر پھینک دیتا مگر خاموش رہا۔ وہ مایوس ہو کر چلے گئے۔‘‘

’’واقعی، یہ تو بدتہذیبی ہے۔‘‘ ہم نے کہا ’’کہ جس گھر میں جائیں وہاں کی چیزیں خریدنی شروع کر دیں۔‘‘

کہنے لگے ’’ایسا نہ کہیے۔ ہمارے ملک میں ایسے لوگ بھی ہیں جو دولت کے لالچ میں ہر چیز فروخت کر دیتے ہیں۔ ایک لالچی لارڈ نے تو اپنا پورا محل فروخت کر دیا، جانتے ہیں کس لیے؟‘‘

’’کس لیے؟‘‘

’’وہ امریکی اس گھر کو بالکل اسی صورت میں امریکا لے جا کر اس میں رہا کرے گا۔ لالچ کی بھی کوئی انتہا ہوتی ہے۔ اپنی روایت، اپنی اقدار، اپنی تہذیب کیا کوئی دولت کے عوض فروخت کر سکتا ہے؟‘‘

’’ہرگز نہیں۔‘‘ ہم نے ہاں میں ہاں ملائی۔

ہم نے مزید اضافہ کیا ’’ہمارے مشرقی ملکوں میں بھی خاندانی لوگ ایسی باتوں کو پسند کرتے ہیں۔ وضع داری اور خاندانی وقار کی بہت عزت کی جاتی ہے۔‘‘

’’آپ ٹھیک کہتے ہیں۔‘‘ وہ بولے ’’ان امریکیوں کی تو نہ کوئی تاریخ ہے نہ تہذیب۔ ساری دنیا کے بدمعاش، لفنگے اور جرائم پیشہ لوگ امریکا جا کر آباد ہو گئے۔ ان سب کی قومیت الگ ہے۔ تہذیب الگ ہے۔ طور طریقے الگ ہیں۔ امریکی ایک قوم نہیں، قوموں کا کاک ٹیل ہے۔ ان لوگوں کو تہذیب بھی باہر کے لوگوں نے آ کر سکھائی ہے۔ جو اچھے خاندانی اور تعلیم یافتہ لوگ وہاں جا کر آباد ہو گئے ہیں، ان ہی کی وجہ سے ان کا بھرم قائم ہے۔‘‘

مسٹر اسٹرانگ امریکیوں کے سخت دشمن تھے۔ امریکیوں کی صورت دیکھتے ہی ان کا موڈ خراب ہو جاتا تھا۔

بہرحال امریکیوں کی مخالفت کے باعث ہم دونوں کے تعلقات اور زیادہ اچھے ہو گئے۔ مسٹر اسٹرانگ کو سب سے زیادہ فکر اپنے کتّے کی تھی۔ اس کی صحت کی طرف سے وہ بہت پریشان رہتے تھے۔ وہ بے چارہ تو خاموش، آنکھیں بند کیے کراہتا رہتا تھا۔ مسٹر اسٹرانگ اس کا سر اپنی گود میں رکھ کر آنسو بہاتے رہتے تھے۔

ایک دن ہم نے پوچھا ’’مسٹر اسٹرانگ۔ جمی (کتّے) کی صحت کافی خراب ہے۔ عمر بھی کافی ہو چکی ہے۔ اس بڑھاپے میں آپ اس کی آنکھوں کا آپریشن کیوں کرا رہے ہیں؟ اس سے کیا فرق پڑے گا؟‘‘

وہ بولے ’’فرق یہ پڑے گا کہ وہ مجھے دیکھ سکے گا۔ یہ میرے لیے بہت خوشی کی بات ہو گی۔‘‘

تین دن تک بخیر و خوبی اس محل میں شوٹنگ ہوتی رہی اور بہت اچھے تعلقات کے ساتھ ہم نے مسٹر اسٹرانگ، جینی اور جمی کو الوداع کہا۔

اس شوٹنگ میں عسکری صاحب کی بیگم بھی آ جاتی تھیں۔ شوٹنگ دیکھنے سے انہیں کوئی دلچسپی نہیں تھی البتہ آس پاس کے ماحول سے بہت متاثر تھیں اور اکیلی بیٹھی دیر تک یہ مناظر دیکھتی رہتی تھیں۔ یا پھر کوئی کتاب لے کر پڑھنے بیٹھ جاتی تھیں۔

اکثر ہم بھی ان کے پاس جا کر بیٹھ جاتے اور مختلف موضوعات پر باتیں ہوتی رہتی تھیں۔ بیگم عسکری صرف تعلیم

یافتہ ہی نہیں، گہرا مطالعہ بھی رکھتی تھیں۔ اس لیے ان سے مختلف موضوعات پر بات کر کے بہت خوشی ہوتی تھی۔ انہیں فلموں سے زیادہ دلچسپی نہیں تھی۔ ادب، شعر و شاعری اور دوسرے موضوعات پر بات کرنا پسند تھا۔

ہم نے انہیں شاید ہی کبھی اداس یا غم زدہ دیکھا ہو۔ کبھی کبھی ہمیں حیرت بھی ہوتی تھی کہ ایک گھر میں صرف دو میاں بیوی رہتے ہیں۔ عسکری صاحب شوٹنگ پر چلے جاتے تو وہ بالکل تنہا ہو جاتی تھیں۔ فلموں کی شوٹنگ اور دوسری مصروفیات کا کوئی وقت مقرر نہیں ہوتا۔ عسکری صاحب کبھی جلدی گھر آ جاتے اور کبھی دیر سے آتے۔ ان کا اتنا طویل عرصہ بالکل تنہا گزارنا بہت مشکل ہے لیکن انہوں نے کتابوں سے دوستی کر لی تھی۔ کتابوں کے مطالعے کا شوق پیدا ہو جائے تو پھر کسی اور دوست کی ضرورت نہیں پڑتی بلکہ اگر آپ کوئی دلچسپ کتاب پڑھ رہے ہوں اور کوئی دوست آ جائے تو طبیعت پر بار گزرتا ہے۔

یہ ایک عجیب و غریب اور خوش مزاج جوڑا تھا۔ ہم نے انہیں ہر وقت خوش و خرم ہی دیکھا۔ ایسے لوگ دنیا میں کم ہی ہوتے ہیں۔

☆☆☆

کبھی مشرقی پاکستان بھی ہمارا ہی ایک حصہ تھا۔ دونوں طرف کے لوگ آزادی سے آتے جاتے تھے۔ محبت سے رہتے تھے۔ ایک دوسرے کی مدد کرتے تھے۔ ایک دوسرے کے کام آتے تھے۔ ہمارا مشرقی پاکستان کئی بار جانا ہوا۔ ان دنوں وہاں اردو بولنے والوں کی کمی نہ تھی اس لیے آپس میں بات چیت میں بھی آسانی تھی۔ بہت خلوص اور محبت کا رشتہ تھا دونوں میں۔ مشرقی پاکستان سے احتشام (جنہیں یہاں نہ جانے کیوں کیپٹن کہا جاتا تھا) کافی عرصے لاہور میں رہے۔ فلم سازی کی تربیت انہوں نے لاہور ہی میں لی تھی۔ یہاں تمام فلم والوں سے ان کی دوستی تھی اور ہنسی مذاق چلتا رہتا تھا۔ اردو بہت اچھی اور روانی سے بولتے تھے۔ بعد میں یہ مشرقی پاکستان جا کر بہت بڑے اور نامور فلم ساز اور ہدایت کار بنے۔ ان کے چھوٹے بھائی مستفیض نے بھی کئی فلموں کی ہدایت کاری کی تھی۔

مشرقی پاکستان میں یوں تو ہماری سب سے دوستی تھی لیکن عطاالرحمٰن سے تعلقات برادرانہ ہو گئے تھے۔ انہیں ڈھاکا میں خان عطا کہا جاتا تھا۔ بڑا رعب اور دبدبہ تھا ان کا۔ سرکاری افسروں سے لے کر فلم والوں تک سبھی ان کا احترام کرتے تھے اور ان سے ڈرتے تھے۔ وہ صاف گو آدمی تھے۔ ہر ایک کو کھری کھری سنا دیتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ سبھی ان سے مرعوب تھے۔ چند سال ہوئے ان کا انتقال ہو گیا۔

اس سے پہلے ہم ڈھاکا گئے تو انہوں نے ڈھاکا کلب میں ہمیں ٹھہرایا۔ آمد و رفت کے لیے اپنی کار اور ڈرائیور بھی دے دیا تھا۔ دفتر سے فارغ ہو کر وہ سیدھے ہمارے پاس آ جاتے تھے۔ بہت خوش مزاج اور ہنس مکھ آدمی تھے۔

ہم ڈھاکا ایک کو پروڈکشن کے لیے گئے تھے۔ ڈھاکا کے ایک فلم ساز اور تقسیم کار جن کا شباب کیرانوی سے کاروباری تعلق تھا۔ انہوں نے ہمارے ساتھ کو پروڈکشن بنانے کی خواہش کی۔ شباب صاحب نے بھی ان کے لین دین اور کاروباری دیانت کی تعریف کی، لاہور میں ایک کہانی طے ہو گئی۔ اب ہمیں ڈھاکا جا کر ان سے معاملات طے کرنے تھے۔

ڈھاکا گئے تو خان عطا ہمیں لینے کے لیے ائرپورٹ آئے۔ جب انہیں ہمارے آنے کا مقصد معلوم ہوا تو خاموش ہو گئے، پھر بولے ’’آفاقی، تم کو مجھ سے مشورہ تو کرنا تھا۔‘‘

ہم نے کہا ’’ہم خود بھی کئی سال سے انہیں جانتے ہیں۔ شباب صاحب سے ان کا کاروباری رشتہ ہے، اس لیے ہم نے بھروسا کر لیا۔‘‘

عطا صاحب چپ ہو گئے۔

ڈھاکا کلب کو اس زمانے میں وہاں جیم خانہ کلب کی حیثیت حاصل تھی۔ بہت اچھے تعلیم یافتہ لوگ وہاں آتے تھے، جن میں سرکاری افسر اور فلمی لوگ بھی شامل تھے۔ صرف اعلیٰ درجے کے لوگ ہی کلب میں آ جاتے تھے۔

ہم نے مصطفیٰ صاحب (فلم ساز) کو باخبر کر دیا تھا مگر وہ نہ ائرپورٹ آئے نہ ہی اس روز کلب آئے۔ شام کو آئے تو اِدھر اُدھر کی باتیں کر کے چلے گئے۔ ہم نے انہیں بتایا کہ ہم صرف تین دن کے لیے آئے ہیں۔ کل آپ معاملات طے کر کے معاہدہ کر لیں۔ وہ ’’ہاں ہاں‘‘ کہہ کر رخصت ہو گئے۔

عطاالرحمٰن شام کو آئے تو پوچھا ’’مصطفیٰ آیا تھا؟‘‘

ہم نے تمام واقعات بتا دیے۔ انہوں نے ایک بند لفافہ ہمیں دیا اور کہا کہ ہوائی جہاز میں بیٹھ کر ہی اسے کھولنا۔

مصطفیٰ صاحب نے دو دن ہمیں بہت تنگ کیا پھر بولے کہ میرا بیٹا کو پروڈکشن نہیں کرنا چاہتا۔ ہمیں بہت حیرت ہوئی۔ ہم نے کہا کہ بات چیت تو ہم دونوں میں ہوئی تھی، یہ بیٹا کہاں سے درمیان میں آ گیا؟

بولے ’’آفاقی صاحب، بچّے بڑے ہو جائیں تو ان کی بات ماننی ہی پڑتی ہے۔‘‘

www.Paksociety.com

یہ کہہ کر شام کو آنے کا وعدہ کر کے وہ چلے گئے۔

شام چار بجے کا وقت تھا مگر وہ سات بجے تک نہیں آئے۔ اسی دوران میں عطاالرحمٰن آ گئے تھے۔ ہم نے ساری بات انہیں بتائی تو ان کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ بولے "ایسے لوگ ہی فلم انڈسٹری کو بدنام کرتے ہیں۔"

شام سات بجے جب مصطفیٰ صاحب اپنے بیٹے کے ساتھ آئے تو خان عطا دو تین پیگ لگا چکے تھے۔

مصطفیٰ صاحب انہیں ہمارے ساتھ دیکھ کر کچھ گھبرا سے گئے۔ ہم لوگ بڑے لاؤنج میں بیٹھے تھے۔

عطاالرحمٰن نے کہا "مصطفیٰ! تم بہت ذلیل آدمی ہو۔ ایک شخص کو لاہور سے بلا کر بٹھا رکھا ہے۔ آج تمہیں چار بجے آنا تھا مگر تم سات بجے آئے ہو۔ تم تو مجھے انسان کے بچے نظر نہیں آتے۔"

ان کی بلند اور گونج دار آواز سن کر سب متوجہ ہو گئے۔

مصطفیٰ صاحب نے کچھ کہنے کی کوشش کی مگر عطاالرحمٰن سخت غصے میں تھے۔

انہوں نے کہا "تم جانتے ہو، تم نے جس شخص کو ڈھاکا بلا کر ذلیل کیا ہے، یہ کون ہے؟ سارا پاکستان اس کی عزت کرتا ہے۔ مگر تم کمینے اور سور کے بچے ہو۔" (سور کا بچہ غصے میں ان کی پسندیدہ گالی تھی)

مصطفیٰ صاحب بولے "اچھا، اس وقت میں جاتا ہوں۔ کل صبح آ کر آفاقی صاحب سے بات کروں گا۔"

ہماری بجائے عطا صاحب نے گرج کر جواب دیا "آنے کی ضرورت نہیں ہے۔ تم نے ایک شریف آدمی کو جتنا ذلیل کرنا تھا کر دیا۔ آج کے بعد اگر تم ڈھاکا کلب میں نظر آئے تو تمہاری ٹانگیں توڑ دوں گا۔ بس جاؤ اور اپنے اس فراڈ بیٹے کو بھی ساتھ لے جاؤ۔"

بھری مجلس میں یہ ذلت اُٹھا کر مصطفیٰ صاحب اپنے بیٹے کے ساتھ رخصت ہو گئے۔ عطاالرحمٰن نے کہا "معاف کرنا آفاقی! ایسے ذلیل لوگوں نے ہی فلم انڈسٹری کو برباد کیا ہے۔ تم جب تک ڈھاکے میں رہنا چاہو شوق سے رہو۔"

ہم نے کہا "ہمیں تو کل سری لنکا جانا ہے۔"

"میں تمہاری بکنگ کرا دیتا ہوں اور دیکھو، پھر کبھی مجھ سے مشورے کے بغیر کسی سے ڈیل کرنے کے لیے ڈھاکا نہ آنا۔ ادھر بہت سور کا بچہ رہتا ہے۔"

ہوائی جہاز میں بیٹھ کر ہم نے خان عطا کا بند لفافہ کھولا جس میں لکھا تھا "اپنا وقت ضائع نہ کیجیے۔"

یہ واقعہ تو برسبیل تذکرہ ہی نکل آیا۔ دراصل ہم یہ بتانا چاہتے تھے کہ بنگالی اردو سے کتنی محبت کرتے تھے۔ پاکستان سے جانے والی فلموں کو کلکتہ سے آنے والی فلموں سے زیادہ پسند کیا جاتا تھا۔ پاکستانی فن کاروں کے پرستار تھے۔

مشرقی پاکستان میں فلمی صنعت کا آغاز پہلے ہو چکا تھا جس کی تفصیل پہلے بیان کی جا چکی ہے۔ چھوٹی سی انڈسٹری تھی۔ سرمائے کی بھی کمی تھی لیکن گانوں کی ریکارڈنگ کے لیے وہ لاہور ہی آیا کرتے تھے۔

کچھ عرصے بعد انہیں خیال آیا کہ اردو فلمیں کیوں بنائیں۔ اردو فلموں کے لیے ان کا سرمایہ اور بھی کم تھا۔ پہلے وہ گلوکاروں اور صدابندی کے لیے لاہور آیا کرتے تھے مگر رفتہ رفتہ انہوں نے سارا کام وہیں شروع کر دیا یعنی خود کفیل ہو گئے۔ انہیں احساس تھا کہ .... مغربی پاکستان کی شہرت اور کشش تھی، وہ بہت زیادہ تھی۔ مغربی پاکستان کی فلموں میں سرمایہ بھی دل کھول کر لگایا جاتا تھا۔ لیکن انہوں نے اردو میں فلمیں بنانے کا آغاز کر دیا اور انہیں ایک نئی رعنائی بخشی۔ ان میں اردو فلمیں بنانے کا ایک جذبہ تھا انہوں نے بہت ذوق وشوق اور لگن کے ساتھ اردو فلموں کا آغاز کیا تھا۔ یہ ایک کامیاب تجربہ ثابت ہوا۔

مشرقی پاکستان میں پہلی اردو فلم "چندا" بنائی گئی تھی اس کے ہدایت کار احتشام تھے۔ شبنم اور رحمٰن نے مرکزی کردار ادا کیے تھے۔ ان دونوں اداکاروں سے اس وقت مغربی پاکستان میں کوئی واقف نہیں تھا۔ اس لیے یہاں اس فلم کی پذیرائی آغاز میں نہیں ہوئی لیکن مختلف نظارے، کئی اصلی لوکیشنز اور کہانی کی سادگی کے باعث اس میں روز بہ روز اضافہ ہوتا رہا اور یہ دونوں مغربی پاکستان میں بھی پہچانے جانے لگے۔ یہ فلم 1963ء میں ریلیز ہوئی تھی۔

اس کی کامیابی سے حوصلہ پا کر احتشام صاحب کے بھائی مستفیض نے اسی سال فلم "تلاش" بنائی۔ اس فلم میں بھی شبنم اور رحمٰن مرکزی کردار تھے۔ مغربی پاکستان کے بھیڑ چال والے ڈسٹری بیوٹر نے اس پر توجہ نہ دی یہاں تک کہ نگار کے ایڈیٹر الیاس رشیدی نے کہا کہ تم .... ایک لاکھ میں لے لو مگر کوئی اس پر راضی نہ تھا۔ خدا خدا کر کے یہ فلم ریلیز ہوئی اور دھماکا کر دیا۔ یہ چندا سے بھی زیادہ کامیاب ہوئی۔ اس طرح مشرقی پاکستان میں اردو فلمیں بنانے کا رواج ہو گیا۔ انہوں نے بشیر اور خواتین گلوکارائیں بھی تلاش کر لی تھیں۔ اب وہ مغربی پاکستان کے محتاج نہیں رہے تھے۔ اردو فلموں کو وہاں مقبول کرانے میں سرور بارہ بنکوی کا بہت بڑا ہاتھ ہے۔ وہ اعلیٰ درجے کے شاعر اور ادیب تھے

اسکرپٹ لکھنے کے بعد فن کاروں کا تلفظ بھی درست کراتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ وہاں کے فلم والے ہمیشہ ان کی عزت کرتے رہے اور انہیں استاد کا درجہ دیتے رہے۔

1967ء میں ہدایت کار احتشام نے ایک چونکا دینے والی فلم بنائی۔ فلم کے مکمل ہونے سے پہلے اس کے بارے میں لوگوں کی اچھی رائے نہ تھی کیونکہ احتشام نے اس فلم میں بالکل نیا تجربہ کیا تھا۔ مشرقی پاکستان کی معروف گلوکارہ فردوسی بیگم کراچی آئیں تو ان کی ملاقات ندیم بیگ (ندیم) سے بھی ہوئی جو ان دنوں گلوکار بننے کی دھن میں لگے ہوئے تھے۔

ندیم خوش شکل اور خوش آواز تھے۔ اردو بھی بہت اچھی بولتے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ فردوسی بیگم ان پر مہربان ہو گئیں اور ان سے کہا کہ کراچی میں تو امکان کم ہے لیکن ڈھاکا میں تمہیں گلوکاری کا موقع مل سکتا ہے جہاں گانے والوں کی بہت کمی ہے۔ ندیم کی سمجھ میں یہ بات آ گئی۔ فردوسی بیگم انہیں ڈھاکا لے گئیں اور احتشام سے ملاقات کرائی۔ احتشام صاحب کو ندیم کی آواز اور ان کی اکلوتی صاحب زادی فرزانہ کو ان کی صورت شکل پسند آ گئی۔ گلوکار کے طور پر ان کا انتخاب کر لیا گیا لیکن قسمت کو کچھ اور منظور تھا۔ فلم کے اصل ہیرو عظیم کسی وجہ سے شوٹنگ پر نہ آ سکے تو احتشام صاحب نے ندیم کو فلم کا ہیرو منتخب کر لیا۔ اس فلم کی ہیروئن بھی ایک موٹی موٹی آنکھوں والی خوش شکل اداکارہ شبانہ تھی۔

فلم شروع ہوئی تو ایک دوسرے کے لیے اجنبی تھے۔ فلم بین بھی ان کے بارے میں کچھ نہیں جانتے تھے۔ لیکن ڈھاکا میں نئے نئے چہرے متعارف کرانے کا رواج تھا اور احتشام صاحب سے لوگوں کو بہت زیادہ امیدیں وابستہ تھیں اس لیے فلم کے بارے میں لوگ پُرامید تھے۔

اس فلم کا نام "چکوری" تھا۔ فلم جب نمائش کے لیے پیش کی گئی تو تہلکہ مچ گیا۔ ندیم جیسا خوبصورت، پُرکشش ہیرو اس وقت وہاں کوئی نہ تھا۔ شبانہ کی یہ پہلی فلم تھی مگر ان کی سادگی ہی ان کی اداکاری کی تعریف بن گئی۔ اس فلم میں ندیم کا گایا ہوا گانا آج بھی گایا جاتا ہے، جس کے بول تھے۔

کہاں ہو تم کو ڈھونڈ رہی ہیں
یہ بہاریں، یہ سماں

اس فلم نے ڈھاکا سے لاہور تک دھوم مچا دی۔ اس کے گانے گلی گلی گائے جانے لگے۔ ندیم اور شبانہ اچانک سپر اسٹار بن گئے تھے۔ لاہور سے فلم ساز دونوں کو ایک ساتھ یا الگ الگ فلموں میں کاسٹ کرنے کے لیے ڈھاکا کے چکر لگا رہے تھے۔

1970ء میں ہدایت کار ظہیر ریحان نے ایک اور دھماکا کیا۔ انہوں نے پاکستان کی پہلی سنیما اسکوپ فلم بنائی جس کا نام "جلتے سورج کے نیچے" تھا۔ یہ ایک معیاری فلم تھی اور پاکستان کے لیے فخر کی بات یہ تھی کہ یہ پاکستان میں بنائی جانے والی پہلی سنیما اسکوپ فلم تھی جس کے ذریعے پاکستان کا نام ترقی یافتہ فلم ساز ملکوں میں شمار ہونے لگا۔ ڈھاکا کو یہ حیثیت حاصل تھی کہ وہاں پاکستان کی پہلی رنگین اور پہلی سنیما اسکوپ فلم بنائی گئی۔ دراصل بنیادی وجہ یہ تھی کہ مشرقی پاکستان میں زیادہ تر فلمی صنعت سے وابستہ لوگ تعلیم یافتہ، تخلیق کار اور سوچنے والے تھے جبکہ ہمارے ہاں بھیڑ چال تھی جس کا نتیجہ بالآخر ہم سب نے دیکھ لیا۔ ڈھاکا میں بہت اچھی، معلوماتی، ڈرامائی اور میوزیکل فلمیں بنائی گئیں جو کسی نہ کسی حوالے سے آج بھی یاد ہیں۔

ڈھاکا میں جو فلمیں بنائی گئیں، ان کی تفصیل ملاحظہ کیجیے۔ پہلی اردو فلم چندا جو 1963ء احتشام صاحب نے بنائی تھی اور پہلی ہی فلم بہت کامیاب تھی۔ اس فلم نے پاکستانی فلموں میں ایک سنیما رجحان پیدا کر دیا۔

اس کے بعد ڈھاکا میں اردو فلموں کا سیلاب آ گیا۔ بنگالیوں نے کلکتہ سے آنے والی فلموں کو چھوڑ کر مغربی پاکستان کی اردو فلموں میں زیادہ دلچسپی لینی شروع کر دی۔

ڈھاکا میں کم سرمائے اور کم وسائل کے باوجود فلم انڈسٹری درست بنیادوں پر استوار کی گئی۔ بیشتر لوگ تعلیم یافتہ تھے۔ بناوٹ اور نمود و نمائش کا کوئی تذکرہ ہی نہ تھا۔

ظہیر ریحان بے حد ذہین اور ہنر مند نوجوان ہدایت کار تھے۔ انہوں نے ڈھاکا کی پہلی اردو رنگین فلم "سنگم" بنا کر نیا تجربہ کیا۔ یہ فلم بھی 1963ء میں ریلیز ہوئی تھی اور بہت کامیاب رہی تھی۔ روزی ہارون اور خلیل اس میں اہم کردار تھے۔

سرور بارہ بنکوی نے آخری اسٹیشن بنا کر حقیقی فلموں کا بہت خوبصورت آغاز کیا۔ ہارون اور شبنم مرکزی کردار تھے۔ شبنم ہی کے گرد کہانی گھومتی تھی۔ شبنم نے بہترین اداکاری کا مظاہرہ کیا تھا۔ خان عطا نے نواب سراج الدولہ جیسی عظیم تاریخی فلم بنا کر اپنے قومی ہیروز سے فلم بینوں کو متعارف کرایا۔ سوئے ندیا، جاگے پانی، ان کی ایک اور تجربہ انگیز فلم تھی۔ سرور بارہ بنکوی نے "تم میرے ہو" جیسی رومانی فلم بنائی۔ مشرقی پاکستان کی فلموں کی موسیقی عموماً اچھی ہوتی تھی جو فلم کی کامیابی میں مددگار ثابت ہوتی تھی۔ اس فلم میں شبنم، ندیم اور مہناز اہم اداکار تھے۔

تلاش، ناچ گھر، پریت نہ جانے ریت، سنگم (رنگین)
شادی، یہ بھی ایک کہانی، پیسے، بندھن، ملن، کاجل، ساگر، بہانہ، کیسے کہوں، آخری اسٹیشن، سات رنگ، مالا، اُجالا، بیگانہ، پروانہ، پونم کی رات، چکوری، نواب سراج الدولہ، درشن، چھوٹے صاحب، انجمن، ہمدم، سوئے ندیا جاگے پانی، جگنو، تم میرے ہو، چاند اور چاندنی، گوری، جہاں باجے شہنائی، شہید تیتو میر، جینا بھی مشکل، داغ، پیاسا، کنگن، اناڑی، پائل، چلو مان گئے، جلتے سورج کے نیچے۔

مندرجہ ذیل فلمیں کو پروڈکشن میں بنائی گئیں۔

ہم سے ہے زمانہ، ہدایت کار جاوید فاضل۔ اداکار، ندیم، شیوا، مصطفیٰ۔

تلاش۔ ہدایت کار، حسن عسکری۔ اداکار، بیتا، ندیم، شفیع محمد۔

پامیلا۔ ہدایت کار، جمشید نقوی۔ کاسٹ، نیلی، جاوید شیخ۔

زمین آسمان۔ ہدایت کار، نذر الاسلام۔ اداکار، ندیم، شبانہ، سُشما شاہی (نیپالی اداکارہ)

مشرقی پاکستان کے اسٹوڈیوز میں ہم نے بڑی بڑی ہیروئنوں کو سفید یا سفید ساڑیاں پہن کر آتے دیکھا۔ اداکار بھی ایسے ہی سادہ تھے۔ نامور اداکارائیں بھی سائیکل رکشا میں سفر کرنا بُرائی یا احساس کمتری نہیں سمجھتی تھیں۔

سب سے بڑا فرق ماحول کا تھا۔ نظم و نسق بہت زیادہ تھا۔ ہدایت کار کی عزت اور احترام قابلِ دید تھا۔ بڑے بڑے اداکار، ہدایت کار کی مرضی کے تابع تھے۔ ایک بار ہیروئن کا بوری تاخیر سے شوٹنگ پر آئیں تو نفع نقصان کا خیال کیے بغیر انہیں فارغ کر دیا گیا۔ (جبکہ کابوری بنگلہ فلموں کی سپر اسٹار تھی)

پاکستانی فلمی صنعت کے لیے مشرقی پاکستان کی خدمات بہت زیادہ ہیں۔

☆☆☆

استنبول کے میئر کے حالیہ دورے کا تذکرہ آپ نے سنا اور پڑھا ہوگا۔ استنبول صحیح معنوں میں ایک عروس البلاد ہے۔ جدید شہر کو تو آپ کسی بھی مغربی ملک کے شہر سے موازنہ کر سکتے ہیں۔ کچھ تو قدرتی حسن اور پھر انسانی کوشش۔ لیکن قابلِ ذکر حصہ استنبول کا پُرانا شہر ہے۔ ترکی کے دوسرے حصوں میں بھی قدیم شہروں کو بہت صاف ستھرا اور بنا سنوار کر رکھا گیا۔ ترکی ہی کیا ہر مہذب ملک اپنے ماضی پر فخر کرتا ہے، وہ اپنے ماضی پر رشک کرتا ہے۔

استنبول کے پُرانے شہر میں جائیے تو وہی پُرانے مکان، گلیاں اور دکانیں لیکن صاف شفاف۔ برابر کے گھروں میں کھڑکی میں عورتوں کی آپس میں بات چیت ہے۔ دکانوں، قہوہ خانوں کا وہی انداز۔ یوں لگتا ہے جیسے قدرت نے انہیں منجمد کر دیا ہے۔ پُرانا شہر دیکھ کر نئے شہر کا حسن بھی ماند پڑ گیا۔ یوں لگتا ہے پُرانا دور پھر لوٹ آیا ہے۔

یہ تو دنیا کے دوسرے پُرانے شہروں کا ذکر ہے۔ ہمارے شہروں میں بھی پُرانی تہذیب اور تمدن کے نظارے موجود ہیں لیکن غلاظت، بے پروائی، غلط استعمال، اینٹیک عمارتوں کی ٹوٹ پھوٹ ...... گندگی کے ڈھیر دیکھ کر یوں لگتا ہے جیسے یہی ہمارا ماضی تھا حالانکہ ایک زمانے میں قدیم لاہور واقعی حسن و تہذیب کا گہوارہ تھا جس کی داستانیں آج بھی سنہری یادیں تازہ کر دیتی ہیں۔

لاہور کا پُرانا شہر اگر کسی اور ملک میں ہوتا تو دنیا بھر کے سیاحوں کا مرکز ہوتا۔ یہاں کی پیچ دار گلیاں، نشیب و فراز، پُرانے مکان جو اب مسمار ہو رہے ہیں۔ پُرانی عمارتوں کے آگے لکڑی کے منقش کام والی بالکونیاں، یہ شہر اگر پُرانی حالت میں سجا کر سنوار کر پُرانی تہذیب و تمدن اور پُرانے ماحول میں، درختوں کے سائے میں چائے خانے جہاں سارے محلّے کے لوگ گپ شپ لگا کر اپنے دل کی بھڑاس نکالا کرتے تھے۔ چھوٹی چھوٹی پیالیوں میں چائے کا دور۔ صاف ستھرے محلّے جہاں آس پاس کی عورتیں چغلیاں کھانے یا ایک دوسرے کی بُرائی کرنے میں یہ استنبول کی عورتوں سے کم نہیں ہیں، انداز جدا ہیں۔

پُرانا لاہور واقعی ایک حسین شہر تھا۔ نہریں، قد آور خوبصورت ایک قطار میں لگے ہوئے یوکلپٹس کے درخت، ہر گلی موتیا، چنبیلی کی خوشبو سے مہکتی ہوئی، لاہور ادبی اور ثقافتی مرکز بھی تھا۔ ادب، موسیقی، فنونِ لطیفہ کا ایسا گہوارہ تھا جہاں سارے ہندوستان سے صاحبِ کمال کھنچے آتے تھے اور پھر یہیں کے ہو کر رہ جاتے۔

لاہور کے تکیے سارے ہندوستان میں مشہور تھے۔ یہ دراصل ثقافتی اور موسیقاروں کے مرکز بھی تھے۔ یہ ایک طرح سے سرائے کا کام بھی کرتے تھے۔ ہندوستان کا کون سا بڑا فن کار تھا جس نے یہاں اپنے فن کا مظاہرہ نہ کیا ہو۔ استاد بڑے غلام علی خاں جیسے صاحبِ فن یہاں اپنے فن کا مظاہرہ کرتے تھے۔

فلم نگری کی یہ الف لیلہ ابھی جاری ہے اس داستانِ ہزار رنگ کے مزید واقعات کے لیے آئندہ ماہ کا شمارہ دیکھنا نہ بھولیں

مقدر کی بات

تنویر ریاض

وہ ایک بڑے شاعر کا بیٹا، ایک نامور شاعر کا بھانجا، ایک الفاظ کی فسوں ساز ماں کا دلارا تھا۔ ادب اس کی رگ رگ میں سمویا ہوا تھا مگر قسمت کی دیوی نہ اس کے باپ پر مہربان تھی نہ اس کا ساتھ دینے پر راضی تھی پھر بھی اسے اپنے قلم پر بھروسا تھا۔ اسے یقین کامل تھا کہ ایک دن اس کا قلم اس کی زندگی بدل دے گا اور یہی ہوا۔ اس نے بمبئی کی فلم نگری میں انوکھا تجربہ کیا جو سو فیصد کامیاب ٹھہرا اور اس نے زنجیر و شعلے جیسی معرکتہ الآرا فلمیں پیش کردیں۔

بالی وڈ کے ایک نامور کہانی کار و شاعر کی داستانِ حیات

جاوید اختر کی کہانی بہت عجیب ہے۔ جب سفر شروع ہوا تو منزل کا پتا نہ تھا، ایک بھٹکا مسافر راہ پکڑے اور ایک شاندار منزل اس کا مقام ٹھہرے تو کیا قسمت سے بڑھ کر کسی کو ذمے دار مانا جاسکتا ہے۔ جاوید اختر کے ٹیلنٹ پر شبہ نہیں کیا جاسکتا لیکن ان کی تقدیر واقعی بہت مہربان رہی ہے، یہ تقدیر ساتھ نہ دیتی تو شاید جاوید اختر ایک گمنام شخص ہی رہتے

www.Paksociety.com

لیکن تقدیر کو ہی ان کی کامیابی کی واحد وجہ قرار نہیں دیا جاسکتا۔ اس کے علاوہ بھی بہت سے عوامل ہیں جنہوں نے جاوید اختر کو اس منزل تک پہنچانے میں اہم کردار ادا کیا۔ جاوید اختر کو بچپن سے ہی ایسے حالات کا سامنا کرنا پڑا جن کی وجہ سے اس کے اندر ایک باغی شخص کی نشوونما ہونے لگی، جو حوصلہ منداور پُرعزم ہے، ناکامیوں سے دل برداشتہ ہونے کے بجائے ایک نئے جوش اور جذبے کے ساتھ آگے قدم بڑھاتا ہے۔

جاوید اختر کی زندگی جدوجہد سے عبارت ہے۔ ہوش سنبھالتے ہی محرومیوں سے واسطہ پڑگیا۔ آٹھ سال کے تھے کہ ماں کا انتقال ہوگیا۔ کسی وجہ سے باپ کا پیار بھی نہیں مل سکا۔ عملی زندگی کا آغاز دھکے کھاتے ہوئے کیا اور پھر زندگی کے یہ دکھ ہی انہیں خوشیوں کی طرف لے گئے۔ جاوید اختر نے ایک علمی وادبی گھرانے میں آنکھ کھولی۔ وہ 17 جنوری 1945ء کو گوالیار میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد جاں نثار اختر اردو کے قادر الکلام شاعر، فلمی نغمہ نگار اور انجمن ترقی پسند مصنفین کے سرگرم اراکین میں سے تھے۔ ان کی شادی 1943ء میں صفیہ اختر سے ہوئی جو اردو کے مشہور رومانوی انقلابی شاعر اسرار الحق مجاز کی بہن تھیں۔ جبکہ دادا مضطر حیدرآبادی بھی مشہور شاعر گزرے ہیں۔ ان کا سلسلہ نسب مولانا فضل حق خیرآبادی سے ملتا ہے جو ایک شاعر، فلاسفر اور مذہبی اسکالر ہونے کے علاوہ 1857ء کی جنگ آزادی میں حصہ لینے والے مجاہد کے طور پر بھی پہچانے جاتے ہیں۔ اس جرم کی پاداش میں انہیں آبائی شہر خیرآباد سے 30 جنوری 1858ء کو گرفتار کرکے کالا پانی بھیج دیا گیا۔ بعد میں ان کے بیٹے شمس الحق نے کسی نہ کسی طرح ان کی رہائی کا پروانہ حاصل کیا اور انہیں لینے کے لیے 13 فروری 1861ء کو پورٹ بلیئر پہنچے لیکن ان کی یہ کوشش رائگاں گئی کیونکہ صرف ایک روز قبل یعنی 12 فروری 1861ء کو مولانا کو پھانسی دی جاچکی تھی۔ مولانا فضل حق خیرآبادی کو یہ اعزاز بھی حاصل ہے کہ انہوں نے مرزا غالب کی فرمائش پر ان کے پہلے دیوان کی تدوین بھی کی تھی۔

جاں نثار اختر نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے ایم اے کیا۔ ان کا ارادہ پی ایچ ڈی کرنے کا تھا لیکن گھریلو حالات کی وجہ سے انہیں گوالیار واپس آنا پڑا جہاں وہ وکٹوریہ کالج سے بحیثیت اردو لیکچرار وابستہ ہوگئے۔ برصغیر کی تقسیم سے قبل فسادات کی وجہ سے وہ بھوپال منتقل ہوگئے اور حمیدیہ کالج میں شعبۂ اردو وفارسی کے سربراہ کے طور پر کام کرنے لگے۔ بعد میں صفیہ کو بھی اسی کالج میں ملازمت مل گئی۔ 1949ء میں انہوں نے کالج کی ملازمت سے استعفیٰ دے دیا اور فلموں میں نغمہ نگار کی حیثیت سے اپنا مستقبل بنانے کے لیے بمبئی چلے گئے۔ وہاں ان کی ملاقات دوسرے ترقی پسند ادیبوں مثلاً ملک راج آنند، کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی اور عصمت چغتائی وغیرہ سے ہوئی۔ بمبئی کا سلورفش ریسٹورنٹ ان کا مستقل ٹھکانا تھا۔ جاں نثار اختر کو بمبئی کی فلم نگری میں اپنی جگہ بنانے کے لیے کافی انتظار کرنا پڑا۔ اس دوران صفیہ ہی ان کی مالی معاونت کرتی رہیں جو ملازمت کی وجہ سے بھوپال میں ہی رک گئی تھیں۔ بہرحال 1955ء میں فلم "یاسمین" کے ذریعے جاں نثار اختر کو بحیثیت نغمہ نگار پہلی کامیابی ملی لیکن صفیہ اس خوشی میں شرکت کرنے کے لیے موجود نہ تھیں۔ وہ 17 جنوری 1953ء کو کینسر میں مبتلا ہوکر اس جہان فانی سے کوچ کرگئی تھیں۔ ان کے انتقال کے بعد جاں نثار اختر نے 17 ستمبر 1956ء کو خدیجہ طلعت نامی ایک خاتون سے دوسری شادی کرلی جن سے ان کی تین اولادیں شاہد اختر، منیرہ اختر اور البینا اختر ہیں۔ جاں نثار اختر کا انتقال 19 اگست 1976ء کو ہوا۔

جاں نثار اختر کی پہلی بیوی صفیہ نے اس دور میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے ایم اے کیا تھا جب مسلمان خواتین کے لیے اسکول جانا بھی ایک خواب کی مانند تھا۔ وہ ترقی پسند نظریات کی حامل تھیں اور انہوں نے اپنی زندگی کے فیصلے بھی خود ہی کیے۔ جب جاں نثار اختر نے بمبئی جانے کی ٹھانی تو صفیہ نے اس کی مخالفت نہیں کی لیکن وہ ایک باشعور اور حقیقت پسند خاتون تھیں اور جانتی تھیں کہ ایک اجنبی شہر میں قدم جمانے کے لیے جاں نثار اختر کو کیا مشکلات پیش آسکتی ہیں چنانچہ انہوں نے اپنے دونوں بچوں جاوید اور سلمان کے ساتھ بھوپال میں ہی رہنے کا فیصلہ کیا۔ بعد کے حالات نے ثابت کردیا کہ ان کا یہ فیصلہ کتنا برمحل تھا۔ ابتدائی چند برس جاں نثار اختر کے لیے بے حد کٹھن تھے۔ یہ صفیہ ہی تھیں جو کالج سے ملنے والی تنخواہ میں سے گزارے کے لیے انہیں پیسے بھیجتی تھیں۔ جاں نثار اختر سے انہیں بہت محبت تھی جس کا اظہار ان خطوط سے ہوتا ہے جو صفیہ نے 43ء اور 53ء کے درمیان انہیں لکھے۔ یہ خطوط ایک ایسی عورت کے جذبات کی عکاسی کرتے ہیں جو اپنے شوہر سے دور رہ کر بچوں کی پرورش کررہی ہے اور اسے مالی پریشانیوں کے علاوہ صحت کے مسائل کا سامنا ہے۔ جاں نثار اختر سے جدائی کا صدمہ اتنا گہرا تھا کہ ان کے بمبئی جانے کے ایک سال بعد ہی وہ بیمار

جاوید اختر کے صاحبزادے فرحان، ادھونا کے ہمراہ

پڑگئیں اور پھر زندگی کا بقیہ حصہ انہوں نے بیماری سے لڑتے ہوئے ہی گزارا۔ ممکن ہے کہ زبان وبیان کے اعتبار سے یہ خطوط کسی اعلیٰ ادبی شاہکار کے زمرے میں نہ آتے ہوں لیکن ان کی سطر سطر سے ایک ایسی عورت کا دکھ جھلکتا ہے جو اپنے محبوب شوہر کی جدائی سے نڈھال ہے اور زندگی کا بہترین حصہ ملازمت، بیماری اور بچوں کی دیکھ بھال میں گزاری ہے۔ ان خطوط کا مجموعہ پہلی بار 1955ء میں مکتبۂ جامعہ کے زیرِ اہتمام "حرفِ آشنا" اور "زیرِ لب" کے عنوان سے دو جلدوں میں شائع کیا گیا۔ بعد میں ان خطوط کو جامعہ ملیہ اسلامیہ کے شعبۂ ہندی کے سابق سربراہ پروفیسر اصغر وجاہت نے ہندی میں ترجمہ کیا۔ اس کتاب کی تقریب رونمائی میں اردو کے نامور ادیبوں کے علاوہ جاوید اختر کے چھوٹے بھائی سلمان اختر اور شبانہ اعظمی نے بھی شرکت کی۔ ان خطوط کے اقتباسات سناتے ہوئے شبانہ اعظمی جذباتی ہوگئیں۔ خاص طور پر صفیہ کا آخری خط انتہائی درد انگیز تھا جو انہوں نے اپنی وفات سے 19 روز قبل جاں نثار اختر کو لکھا جس کی ایک سطر سناتے ہوئے شبانہ کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے "اختر، آؤ...... مجھے مرنے نہ دو۔ میں مرنا نہیں چاہتی البتہ بہت تھک گئی ہوں ساتھی!"

جاوید اختر کو اپنی ماں کے مرنے کا دن اچھی طرح یاد ہے، جب ان کی روتی ہوئی خالہ حمیدہ، دونوں بھائیوں کا ہاتھ پکڑ کر اس بڑے کمرے میں لے گئیں جہاں فرش پر بہت سی عورتیں بیٹھی ہوئی تھیں اور ان کے درمیان تخت پر سفید کفن میں لپٹی صفیہ پُرسکون چہرہ لیے لیٹی ہوئی تھی۔ خالہ ان دونوں بچوں کو تخت کے پاس لے گئیں اور بولیں "اپنی ماں کو آخری بار دیکھ لو۔"

اس وقت جاوید کی عمر آٹھ سال تھی، وہ یہ تک جانتے نہ تھے کہ موت کیا ہوتی ہے؟ تھوڑی دیر بعد یہ چہرہ ہمیشہ کے لیے منوں مٹی تلے دب جائے گا۔ وہ اپنی ماں کے چہرے کو بہت غور سے دیکھتے ہیں۔ خالہ کی آواز ان کی سماعت سے ٹکراتی ہے "ان سے وعدہ کرو کہ تم زندگی میں کچھ بنوگے۔ کچھ کرکے دکھاؤ گے۔" جاوید کچھ نہیں کہہ پائے بس دیکھتے رہتے ہیں، پھر کوئی عورت اس بے جان چہرے کو ڈھک دیتی ہے۔

ماں کے انتقال کے بعد دونوں بھائی جاوید اور سلمان، نانا کے گھر میں ہی رہ گئے۔ جاوید کا داخلہ لکھنو کے مشہور اسکول کالون تعلقے دار کالج میں چھٹی کلاس میں کرادیا جاتا ہے۔ اس اسکول میں امیر گھرانوں کے بچے پڑھتے تھے۔ جاوید کو جیب خرچ کے طور پر ایک آنہ ملا کرتا تھا جبکہ اسکول کی کینٹین میں سب سے سستی چاکلیٹ بھی آٹھ آنے کی تھی۔ ایسے میں جاوید کو گھر کے سامنے فٹ پاتھ پر خوانچہ لگانے والی بھگوتی یاد آنے لگتی جہاں سے ایک آنے میں مزے دار چاٹ ملا کرتی تھی۔ اس اسکول میں پڑھنے والے

بچے بڑی بڑی باتیں کرتے تو جاوید کا چھوٹا سا ذہن چٹخنے لگتا۔

ایک دن اس کے کلاس فیلوز راکیش نے بتایا کہ ڈیڈی اسے پڑھنے کے لیے انگلینڈ بھیجیں گے۔ جاوید کو یاد آ گیا۔ کل ہی تو نانا کہہ رہے تھے "ارے کم بخت، میٹرک پاس کر لے تو کسی ڈاک خانے میں مہر لگانے کی نوکری تو مل ہی جائے گی۔"

راکیش کی بات سن کر جاوید نے بھی فیصلہ کر لیا کہ وہ بڑا ہو کر امیر آدمی بنے گا تاکہ اس کے بچے ڈاک خانے میں نوکری کرنے کے بجائے پڑھنے کے لیے انگلینڈ جا سکیں۔ یہ پہلا خواب تھا جو جاوید اختر نے آٹھ سال کی عمر میں جاگتی آنکھوں سے دیکھا۔

ماں کے مرنے کے بعد اس کے اثاثوں کی تقسیم لازمی تھی۔ صفیہ نے اپنے ترکے میں دو بیٹے جاوید اور سلمان چھوڑے تھے۔ چھوٹے بھائی کو نانا نے رکھ لیا اور جاوید کو خالہ کے حوالے کر دیا گیا جو علی گڑھ میں رہائش پذیر تھیں۔ جاوید نے سوچا، ٹھیک ہی تو ہے۔ دو یتیم بچوں کو کوئی ایک گھر میں تو نہیں رکھ سکتا۔ خالہ کے گھر کے سامنے ایک بڑا سا میدان تھا اور اسے پار کرنے کے بعد وہ اسکول آتا ہے جس کا نام منٹو سرکل ہے۔ خالہ نے اسکول میں داخلہ کراتے ہوئے ہیڈ ماسٹر سے کہا تھا "خیال رکھیے گا، ان کا دل پڑھائی میں کم، فلمی گانوں میں زیادہ لگتا ہے۔"

خالہ نے کچھ غلط نہیں کہا تھا۔ اس وقت تک جاوید اختر کو فلموں اور فلمی گانوں کا چسکا لگ چکا تھا۔ انہیں بہت سے فلمی گانے یاد تھے لیکن گھر میں یہ گانے گانا تو کیا سننا بھی منع تھا۔ اس لیے اسکول سے واپس آتے ہوئے زور زور سے گاتے تھے۔

جاوید اختر کا اسکول، علی گڑھ یونیورسٹی کے علاقے میں ہی تھا۔ چنانچہ ان کی دوستی اسکول کے دو چار لڑکوں کے علاوہ یونیورسٹی کے لڑکوں سے بھی ہو گئی۔ بڑے لڑکوں کی طرح انہیں بھی ہوٹلوں میں بیٹھنا اچھا لگتا تھا۔ اسکول کی کتابوں میں دل نہیں لگا تو ناول پڑھنا شروع کر دیے۔ کئی مشہور شاعروں کے اشعار زبانی یاد ہو گئے۔ یونیورسٹی میں جب بھی بیت بازی ہوتی، یہ اپنے اسکول کی طرف سے جاتے اور ہر بار انعام جیتتے۔ یونیورسٹی کے بہت سے لڑکے لڑکیاں انہیں پہچاننے لگے۔ پندرہ سال کی عمر میں ایک لڑکی کو خط لکھا۔ ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ خط میں کیا لکھا جائے۔ ان کے دوست ببلو نے مدد کی اور دوسرے دن انہوں نے ہمت کر کے وہ خط اس لڑکی کو پکڑا دیا۔ بقول جاوید، وہ ان کی زندگی کا پہلا اور آخری پریم پتر تھا۔ لڑکی وضع دار تھی، اس لیے کوئی ردعمل ظاہر نہیں کیا۔ اس کے بعد جاوید نے تہیہ کر لیا کہ وہ آئندہ کسی لڑکی کو خط نہیں لکھیں گے۔ جو کہنا ہوگا وہ منہ پر ہی کہہ دیں گے تاکہ فوری ردعمل سامنے آ جائے۔

میٹرک کے بعد علی گڑھ چھوڑنا پڑا۔ خالہ بہت رو رہی تھیں اور خالو انہیں چپ کرانے کے لیے کہہ رہے تھے "تم اس طرح رو رہی ہو جیسے یہ محاذ پر جا رہا ہو۔" اس وقت نہ خالو جانتے تھے اور نہ ہی جاوید کو اندازہ تھا کہ زندگی کی جنگ میں اسے کتنے محاذوں پر لڑنا ہوگا۔

علی گڑھ سے بمبئی جاتے ہوئے باپ نے انہیں آدھے راستے یعنی بھوپال میں چھوڑ دیا۔ کچھ دن سوتیلی ماں کے ساتھ رہے پھر وہ گھر بھی چھوٹ گیا۔ دوستوں کے سہارے زندگی گزرنے لگی۔ ان کا ایک دوست اعزاز ٹیوشن کر کے اپنا گزارہ کرتا تھا۔ کمرے کا کرایہ بھی وہی دیتا تھا۔ یہ تو بس ساتھ رہنے کے روادار تھے۔ جب دونوں میں جھگڑا ہوتا اور بات چیت بند ہو جاتی تو یہ اس سے پیسے نہیں مانگتے تھے بلکہ دیوار پر ٹنگی ہوئی اس کی پتلون میں سے نکال لیتے تھے یا وہ خود ہی ان کے سرہانے ایک یا دو روپے رکھ کر چلا جاتا تھا۔

سیکنڈ ایئر کے بعد اعزاز کسی دوسرے شہر چلا گیا اور انہیں کالج کے کمپاؤنڈ میں ایک خالی کمرا رہنے کے لیے مل گیا۔ جاوید نے تقریری مقابلوں میں حصہ لینا شروع کر دیا۔ تین برس تک بھوپال روٹری کلب کا مباحثہ جیتتے رہے۔ انٹر کالجیٹ ڈیبیٹ میں بھی کئی مرتبہ انعام جیتا۔ کالج یونین کے الیکشن میں حصہ لینے والی ہر پارٹی چاہتی کہ یہ اس کی طرف سے بولیں۔ جاوید اختر کو الیکشن سے نہیں صرف بولنے سے دلچسپی تھی چنانچہ جو پارٹی زیادہ پیسے دیتی تھی، یہ اس کی طرف سے تقریر کر دیتے۔

14 اکتوبر 1964ء کو جاوید اختر بمبئی چلے آئے۔ بمبئی آنے کے چھ دن بعد ہی باپ کا گھر چھوڑنا پڑ گیا۔ اس وقت ان کی جیب میں 27 نئے پیسے تھے اور وہ یہ سوچ کر خوش ہو رہے تھے کہ زندگی میں کبھی اٹھائیس نئے پیسے بھی جیب میں آ گئے تو وہ فائدے میں رہیں گے اور دنیا کماتے میں۔

بمبئی میں ابتدائی دو سال بہت کٹھن گزرے۔ یوں تو ایک چھوٹی سی فلم میں 100 روپے مہینا پر مکالمے لکھنے کا کام مل گیا تھا۔ کچھ فلموں میں اسسٹنٹ کے طور پر بھی کام کیا۔ پھر ایک فلم میں مکالمے لکھنے کا کام مل گیا۔ جاوید صاحب کچھ سین لکھ کر ڈائریکٹر کے پاس گئے۔ اس نے سین پڑھا اور سارے کاغذ جاوید کے منہ پر مارتے ہوئے بولا "تم زندگی میں کبھی رائٹر نہیں بن سکتے۔"

باندرہ میں وہ جس دوست کے ساتھ رہا کرتے تھے۔ وہ بھی ایک دن چلا جاتا ہے۔ اب اس کمرے کا کرایہ کون دے گا؟ ایک مشہور اور کامیاب رائٹر پیش کش کرتے ہیں کہ اگر

وہ ان کے ڈائیلاگز لکھ دیا کریں تو وہ انہیں چھ سو روپے مہینا دیں گے۔ جاوید کے لیے یہ چھ سو اس وقت چھ کروڑ کے برابر تھے۔ اس لیے وہ اس نوکری کے بارے میں سوچنے لگے پھر خیال آیا کہ نوکری کر لی تو کبھی چھوڑنے کی ہمت نہیں ہوگی۔ اسی کشمکش میں تین روز گزر گئے۔ پھر انہوں نے انکار کر دیا۔

بمبئی میں پانچ برس ہونے کو آئے۔ روٹی ان کے لیے چاند کی مانند تھی جو کبھی دکھائی دیتا ہے اور کبھی چھپ جاتا ہے۔ یہ پانچ برس ان پر بہت بھاری تھے لیکن سر نہیں جھکا سکے۔ وہ کبھی ناامید نہیں ہوئے، انہیں پورا یقین تھا، کچھ نہ کچھ ضرور ہوگا۔ وہ یونہی مر جانے کے لیے پیدا نہیں ہوئے۔ اور آخر نومبر 1969ء میں انہیں وہ کام مل گیا جسے فلم والوں کی زبان میں "بریک" کہا جاتا ہے۔

فلم "سرحدی لٹیرا" کے سیٹ پر جاوید اختر کی ملاقات سلیم خاں سے ہوئی۔ سلیم 24 نومبر 1935ء کو مدھیہ پردیش کے شہر اندور میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد پولیس افسر تھے جبکہ ماں جوانی میں ہی انتقال کر گئی تھیں۔ سلیم خاں کی پہلی شادی 1964ء میں سلمیٰ نامی ایک خاتون سے ہوئی جن سے ان کے چار بچے سلمان خاں، ارباز خاں، سہیل خاں اور الویرا خاں ہیں جبکہ دوسری شادی انہوں نے 1970ء میں مشہور رقاصہ اداکارہ ہیلن سے کی۔ ہدایت کار کے امرناتھ نے انہیں ایک شادی کی تقریب میں دیکھا اور ان کی مردانہ وجاہت اور خوبصورتی سے متاثر ہو کر انہیں بمبئی آنے کی دعوت دی۔ سلیم خاں اپنی آنکھوں میں سنہرے سپنے لیے بمبئی پہنچے تو کے امرناتھ نے انہیں چار سو روپے ماہوار پر اپنی کمپنی میں اداکار کی حیثیت سے ملازمت دے دی۔ سلیم خاں نے مختلف فلموں میں چھوٹے بڑے کردار ادا کیے لیکن لوگوں کی نظروں میں نہ آ سکے۔ سلیم خاں کی قابلِ ذکر فلموں میں "تیسری منزل" (1966ء) "سرحدی لٹیرا" (1966ء) اور "دیوانہ" (1967ء) شامل ہیں۔

جاوید اختر اور سلیم جلد ہی ایک دوسرے کے قریب آ گئے۔ یہاں تک کہ دونوں نے ایک ساتھ ہی رہائش اختیار کر لی۔ سلیم خاں کو لکھنے کا بھی شوق تھا۔ ان کے دماغ میں نت نئے آئیڈیاز جنم لیتے جنہیں وہ کاغذ پر منتقل کرتے رہتے۔ انہی دنوں ہدایت کار ایس ایم ساگر نے سلیم خاں کو ایک فلم کا اسکرپٹ لکھنے کے لیے کہا۔ اس وقت جاوید وہاں موجود تھے۔ انہوں نے بھی اس میں دلچسپی ظاہر کی تو سلیم خاں کو ایک انوکھا خیال سوجھا اور وہ بولے "یار! تم میرے پارٹنر کیوں نہیں بن جاتے؟"

"وہ تو میں اب بھی ہوں۔" جاوید نے مسکراتے ہوئے کہا "بھوک، بیماری، مفلسی، ان سب میں ہم برابر کے حصے دار ہیں۔"

ہنی ایرانی

"میں بھی یہی کہہ رہا ہوں۔ جب ہم دونوں میں اتنی ذہنی ہم آہنگی ہے۔ مزاج بھی ملتا جلتا ہے، دکھ سکھ سانجھے ہیں تو پھر کیوں نہ ہم مل کر کام کریں۔"

جاوید کو ہنسی آ گئی اور بولے "موسیقاروں کی جوڑی تو سنی ہے لیکن رائٹرز کی جوڑی، واقعی کمال کا آئیڈیا ہوگا۔"

"مجھے اس کی کامیابی میں کوئی شک نہیں۔ جب دو دل ملتے ہیں تو محبت کا پودا تناور درخت کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ دو ذہن مل گئے تو سوچو کیا ہوگا؟ ویسے بھی تم نے سنا ہوگا کہ ایک اور ایک گیارہ ہوتے ہیں۔"

جاوید نے سوچا، کوشش کرنے میں کیا ہرج ہے؟ اس کم از کم ایک فائدہ تو یقینی ہے کہ ناکامی کا دکھ دونوں کے حصے میں آدھا آدھا آئے گا۔ یہی وہ تاریخی لمحہ تھا جب سلیم جاوید کی جوڑی منظر عام پر آئی۔ ایس ایم ساگر نے جو کہانی دی تھی، اس کا اسکرپٹ سلیم خاں نے لکھا اور مکالمے جاوید کے حصے میں آئے۔ دونوں کو اس کام کا معاوضہ دس ہزار روپے ملا جو انہوں نے برابر برابر تقسیم کر لیا۔

اس کے بعد سلیم جاوید نے پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا۔ کامیابی نے ان کے گھر کا دروازہ دیکھ لیا تھا اور ان کی لکھی ہوئی فلمیں دھڑا دھڑ ہٹ ہو رہی تھیں۔ "ہاتھی میرے ساتھی، زنجیر، سیتا اور گیتا، شعلے، دیوار، ترشول، ڈون، کالا پتھر، دوستانہ، شکتی، مسٹر انڈیا"...... ان سبھی فلموں نے باکس آفس پر کامیابی کے ریکارڈز قائم کیے اور سلیم جاوید کا نام فلموں کی کامیابی کی ضمانت بن گیا۔ وہ سپر اسٹارز کی طرح قیمتی کاروں میں گھومتے اور منہ مانگا معاوضہ وصول کرتے۔ بڑے بڑے فلم سازان کے دروازے پر قطار باندھے کھڑے رہتے۔ ان کی بس ایک ہی کوشش ہوتی تھی کہ سلیم جاوید کسی بھی قیمت پر ان کے لیے اسکرپٹ لکھ دیں کیونکہ وہ جانتے تھے کہ یہ اسکرپٹ ان کی تقدیر بدل دے گا۔ فنانسرز اور فلم ڈسٹری بیوٹرز کی ایک ہی فرمائش

ہوتی تھی جو فلم سازوں سے کرتے تھے "سلیم جاوید ہے تو لے جاؤ، جتنا پیسا چاہیے، لے جاؤ۔" برصغیر کی فلمی تاریخ میں کبھی ایسا نہیں ہوا کہ کسی رائٹر کے نام پر فلم فروخت ہوتی ہو۔ یہ اعزاز سلیم جاوید ہی کے حصے میں آیا۔

سلیم جاوید کی جوڑی نے فلمی مصنفین کو انڈسٹری میں ایک باعزت مقام دیا۔ اس سے پہلے ان کی حیثیت منشی جیسی تھی اور نہ ہی فلم کی پبلسٹی میں ان کا نام دیا جاتا تھا۔ جاوید اختر کا کہنا ہے کہ ان کی کوششوں سے فلم کے پوسٹرز میں اسٹوری رائٹر کا نام شامل ہونے لگا۔ اس سلسلے میں ایک دلچسپ واقعہ سناتے ہوئے انہوں نے کہا "ہم دونوں کو اس بات کا شدت سے احساس تھا کہ فلم کے پوسٹرز میں نام شامل نہ کیے جانے کی وجہ سے ان کی حق تلفی ہو رہی ہے۔ جب پروڈیوسر، ڈائریکٹر، موسیقار اور اداکاروں کے نام فلمی پوسٹرز میں دیے جاسکتے ہیں تو فلمی مصنف کا نام کیوں نہیں دیا جاتا؟ اس سلسلے میں کئی پروڈیوسرز کی توجہ اس جانب مبذول کرائی گئی لیکن کسی کے کان پر جوں تک نہ رینگی۔ مجبور ہو کر ہم دونوں نے راست اقدام کرنے کا فیصلہ کیا اور طے پایا کہ وہ خود ہی شہر میں لگے ہوئے تمام پوسٹرز پر اپنا نام لکھ دیتے ہیں۔ ہم نے ایک رکشا کرائے پر لیا اور رنگ کی بالٹی اور برش لے کر اس میں سوار ہو گئے۔ یہ آپریشن رات بھر جاری رہا اور ہم نے شہر میں لگے ہوئے تمام پوسٹرز پر اپنا نام لکھ دیا۔ اس واقعے کے بعد پروڈیوسرز اور ڈائریکٹرز نے فلمی پوسٹرز پر ہمارا نام دینا شروع کردیا۔"

شعلے کی ریکارڈ توڑ کامیابی کے بعد سلیم اور جاوید کی سوچ کا انداز بھی بدل گیا۔ سب نے کہا سلیم جاوید نے کمال کردکھایا ہے۔ ان دونوں نے اس کمال میں اپنا حصہ زیادہ جانا اور یوں ساجھے داری جاتی رہی۔ دونوں باوقار انداز میں الگ ہو گئے۔ ایک دوسرے کے خلاف ایک لفظ نہیں کہا۔ گویا دونوں نے دائٹر ہونے کی لاج رکھ لی۔ یہ بتادیا کہ سوچنے سمجھنے والے لوگ ہیں جو ایک غلطی کرتے ہیں تو دوسری غلطی سے ضرور بچ جاتے ہیں۔

سلیم اور جاوید کی علیحدگی فلمی صنعت کے لیے حیرت، تعجب اور صدمہ کا باعث بنی۔ ہر کوئی اس کی وجہ جاننا چاہتا تھا لیکن ان دونوں نے اپنے لب سی رکھے تھے۔ جاوید صاحب آج بھی اس روش پر قائم ہیں اور سلیم جاوید کے تعلق کے حوالے سے خاموشی اختیار کیے ہوئے ہیں لیکن سلیم خاں نے 29 سال بعد چپ کا روزہ توڑ دیا۔ انہوں نے ای ٹی سی چینل کے میزبان کومل نہاتا کو انٹرویو دیتے ہوئے اس علیحدگی کی جو وجہ بیان کی وہ کچھ یوں تھی۔

"جاوید فلمی دنیا میں نغمہ نگار کی حیثیت سے بھی قسمت آزمائی کرنا چاہتے تھے لیکن میں اپنا نام کسی ایسے کام کے استعمال کرنا نہیں چاہتا تھا جس سے مجھے کوئی دلچسپی نہیں تھی نہ ہی اس کے بارے میں کچھ معلوم تھا۔ میں نے انہیں مشورہ دیا کہ ہمارا اشتراک اسکرپٹ لکھنے کی حد تک ہی ہے، وہ چاہیں تو اپنے نام سے نغمہ نگاری کرسکتے ہیں۔ یہ بات جاوید کی طبع نازک کو ناگوار گزری اور انہوں نے مجھ سے علیحدہ ہونے کا فیصلہ کرلیا۔"

سلیم خاں کے اس جواب سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اصل وجہ بتانے سے گریز کررہے ہیں۔ اگر جاوید صاحب فلموں کے لیے گانے لکھنا چاہتے تھے اور سلیم خاں کو اس پر کوئی اعتراض نہیں تھا اور وہ اس پر بھی راضی تھے کہ جاوید اپنے نام سے گانے لکھ سکتے ہیں تو پھر جھگڑا کس بات پر تھا؟ اس بارے میں انیتا پادمی نے اپنی سوانحی کتاب "یہی رنگ یہی روپ" میں کچھ اور ہی کہانی بیان کی ہے۔

"سلیم جاوید نے امیتابھ بچن کے ساتھ "زنجیر" اور "دیوار" جیسی ہٹ فلمیں کرنے کے بعد اسے "مسٹر انڈیا" میں کام کرنے کی پیشکش کی جسے اس نے کسی وجہ سے مسترد کردیا۔ یہ بات جاوید اختر کو ناگوار گزری اور انہوں نے سلیم خاں سے کہہ دیا کہ وہ آیندہ امیتابھ بچن کے ساتھ کام نہیں کریں گے۔ سلیم خاں نہیں چاہتے تھے کہ اس مرحلے انڈسٹری کے نمبر ون اداکار کے ساتھ کوئی تنازعہ مول لیا جائے لہٰذا انہوں نے جاوید صاحب کی تجویز سے اتفاق نہیں کیا۔ اس گفتگو کے چند روز بعد جاوید اختر نے امیتابھ کے گھر ہولی کی تقریب میں شرکت کی اور ترنگ میں آکر اسے بتادیا کہ سلیم خاں اس کے ساتھ کام کرنے کے لیے تیار نہیں۔ جب سلیم خاں کو یہ بات معلوم ہوئی تو وہ بہت ناراض ہوئے۔ اس واقعے کے تین چار ماہ بعد دونوں میں علیحدگی ہوگئی اور امیتابھ بچن نے اعلان کردیا کہ وہ جاوید اختر کے ساتھ کام کرتا رہے گا۔ اس کے بعد سلیم خاں اور امیتابھ میں فاصلہ بڑھتا گیا پھر جب سلیم کا بیٹا سلمان خاں 1988 میں پردۂ فلم پر جلوہ گر ہوا تو نفسیاتی اور فطری طور پر وہ امیتابھ بچن کو اپنے بیٹے کا حریف سمجھنے لگا۔

جاوید صاحب کو قریب سے جاننے والے اس کہانی پر یقین کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ ان کے خیال میں کتاب کی مصنفہ نے غلط بیانی سے کام لیا ہے۔ جاوید صاحب جیسا صاف گو اور راست باز شخص لگائی بجھائی نہیں کرسکتا۔ ممکن ہے جاوید صاحب نے امیتابھ بچن سے یہ بات کسی اور پیرائے میں کبھی ہو لیکن سلیم صاحب تک بات پہنچانے والے شخص نے اسے دوسرا رنگ دے دیا۔

کچھ لوگوں کے خیال میں اس علیحدگی میں شبانہ اعظمی کے کردار کو بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ یہ بات تو سبھی جانتے ہیں کہ سلیم جاوید کے کام میں جاوید صاحب کا حصہ زیادہ تھا۔ سلیم صاحب پلاٹ لکھتے تھے اور اسے اسکرین پلے و مکالموں کے ساتھ کاغذ پر منتقل کرنے کا فریضہ جاوید صاحب سرانجام دیتے تھے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ سلیم صاحب کا حلقۂ احباب بے حد وسیع تھا۔ وہ اپنے تعلقات کو استعمال کرنے کا ہنر جانتے تھے۔ انہوں نے ہمیشہ جاوید صاحب کو پس منظر میں رکھا اور خود پروڈیوسرز سے معاملات طے کرتے رہے۔ اب جاوید صاحب کی زندگی میں شبانہ آگئی تو اس نے جاوید صاحب کو یہ احساس دلانا شروع کردیا کہ اب انہیں سلیم خاں کی ضرورت نہیں رہی۔ وہ ان کے بغیر بھی اپنے کیریئر کو آگے بڑھا سکتے ہیں۔ اس نے بڑی خوبصورتی سے سلیم کو الگ کرنے کا منصوبہ بنایا اور ہدایت کار یش چوپڑا کو راضی کرلیا کہ وہ جاوید کی تحریر کردہ فلم "مشعل" کی ہدایات دیں جو اس نے سلیم خاں سے چھپ کر خود لکھی تھی۔ جب جاوید کو یقین ہوگیا کہ وہ اپنے طور پر بھی کام کرسکتے ہیں تو انہوں نے سلیم سے علیحدگی اختیار کرلی۔

سلیم اور جاوید کی علیحدگی کی اصل وجہ کچھ بھی ہو لیکن اس پر آج تک پردہ پڑا ہوا ہے۔ اس شاندار شراکت کا خاتمہ نہایت دردناک انداز میں ہوا۔ علیحدگی کے بعد سلیم خاں نے اپنے طور پر ایک فلم "انگارے" لکھی لیکن اس سے وہ کامیابیاں نہ نکل سکیں جن کی توقع سلیم خاں سے کی جارہی تھی۔ دوسری فلم "فلک" تھی جو نمائش کے پہلے روز ہی زمین بوس ہوگئی۔ تیسری فلم "نام" تھی جس کے پروڈیوسر راجندر کمار اور ہدایت کار مہیش بھٹ تھے۔ یہ فلم حیرت انگیز طور پر کامیاب رہی اور لوگوں کو یقین آگیا کہ سلیم خاں کے قلم میں ابھی جان باقی ہے لیکن بعد میں آنے والی فلموں "قبضہ، طوفان، پتھر کے پھول" اور "دل تیرا دیوانہ" میں وہ کوئی کمال نہ دکھا سکے اور آہستہ آہستہ گوشۂ گمنامی میں چلے گئے۔ ان دنوں وہ ایک پُرسکون زندگی گزار رہے ہیں۔ ان کا بیشتر وقت فارم ہاؤس پر گزرتا ہے۔ نہ جانے انہیں سلیم جاوید کا دور یاد آتا ہے یا نہیں؟

سلیم خاں سے علیحدہ ہونے کے بعد جاوید صاحب نے اپنے طور پر کچھ فلموں کے اسکرپٹ لکھے جن میں "بے تاب، مشعل، پریم، میری جنگ" اور "روپ کی رانی چوروں کا راجا" قابل ذکر ہیں۔ وہ چاہتے تو مزید کہانیاں لکھ سکتے تھے لیکن یش چوپڑا نے انہیں ایک نئی راہ دکھادی۔ اس کا احوال جاوید صاحب کی زبانی سنیے۔

"شاعری سے میرا رشتہ پیدائشی اور دلچسپی ہمیشہ سے ہے۔ لڑکپن سے جانتا ہوں کہ چاہوں تو شاعری کرسکتا ہوں مگر آج تک کی نہیں۔ 1979ء میں پہلی بار شعر کہا اور اس طرح اپنی وراثت اور اپنے باپ سے صلح کرلی۔ یش چوپڑا کا خیال تھا کہ میں فلمی نغمات لکھ سکتا ہوں۔ بار بار کے وعدے کے باوجود ہمت نہیں کرپاتا۔ "سلسلہ" بن رہی تھی۔ امیتابھ اور جیا بچن کے بیچ ریکھا کی اصل کہانی کو یش چوپڑا اسیلولائڈ پر منتقل کررہے تھے۔ "دیکھا ایک خواب تو یہ سلسلے ہوئے" یش جی نے ان بولوں کو اپنی فلم سے جوڑنے کا فیصلہ کرلیا۔ فلم ریلیز ہوئی تو "سلسلہ" کے گانوں کو خوب پذیرائی ملی اور یوں اسکرپٹ رائٹر جاوید اختر کی شناخت ایک مستند نغمہ نگار کے طور پر ہونے لگی۔"

اس کے بعد جاوید صاحب نے پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا۔ وہ پوری توانائی، جوش اور جذبے کے ساتھ فلموں کے لیے نغمات لکھنے لگے۔ اب جاوید صاحب دوبارہ اسٹار بن گئے تھے۔ ایک ایسی دنیا کے ستارے جو انہوں نے خود تخلیق کی تھی، جو لفظوں، جذبات اور احساسات سے سجی ہوئی ہے۔ وہ آج فلمی دنیا کے سب سے معروف اور چاہے جانے والے نغمہ نگار ہیں لیکن انہوں نے اپنے آپ کو محض فلمی نغمہ نگاری تک محدود نہیں کیا بلکہ تخلیقی شاعری پر بھی توجہ مرکوز رکھی۔ ان کی شاعری کا مجموعہ "ترکش" کے نام سے منظرِ عام پر آچکا ہے۔

جاوید صاحب کو کئی ایوارڈز اور اعزازات مل چکے ہیں۔ حکومت ہند کی جانب سے انہیں 1999ء میں پدم شری اور 2007ء میں پدم بھوشن کا اعزاز دیا گیا۔ سلیم خاں کے ساتھ مل کر انہوں نے جن فلموں کے اسکرپٹ لکھے، ان پر وہ سات مرتبہ فلم فیئر ایوارڈ حاصل کرچکے ہیں جبکہ بحیثیت نغمہ نگار بھی انہیں سات فلم فیئر ایوارڈز مل چکے ہیں۔ وہ پانچ مرتبہ بہترین نغمہ نگار کا نیشنل فلم ایوارڈ اور دو مرتبہ اسکرین ویڈیوکون ایوارڈ بھی حاصل کرچکے ہیں۔ اس کے علاوہ انہیں اپنے مشہور نغمے "سندیسے آتے ہیں" پر پہلا زی ایوارڈ ملنے کا اعزاز بھی حاصل ہوا۔

جاوید صاحب کی پہلی شادی ہنی ایرانی سے ہوئی۔ ان دنوں جاوید صاحب سیتا اور گیتا کا اسکرپٹ لکھ رہے تھے۔ ہنی بھی اس فلم میں کام کررہی تھی۔ قارئین کی دلچسپی کے لیے یہ

بتاتے چلیں کہ ہنی ایرانی اور اس کی بڑی بہن ڈیزی ایرانی نے ہندی فلموں میں چائلڈ آرٹسٹ کے طور پر بڑا نام کمایا۔ وہ ڈھائی سال کی تھی جب ستین بوس نے اسے اپنی فلم میں کاسٹ کیا۔ سولہ سال کی عمر میں اس نے سیتا اور گیتا اور کٹی پتنگ جیسی فلموں میں کام کیا اور اٹھارہ سال کی عمر میں اس کی شادی جاوید صاحب سے ہوگئی جن سے اس کے دو بچے فرحان اختر اور زویا اختر پیدا ہوئے۔ یہ دونوں فلمی صنعت سے وابستہ ہیں۔ فرحان اختر بیک وقت اسکرپٹ رائٹر، ایکٹر، پلے بیک سنگر، نغمہ نگار اور فلم پروڈیوسر کی حیثیت میں کام کر رہا ہے۔ اس نے 2001ء میں 27 سال کی عمر میں فلم ''دل چاہتا ہے'' سے ہدایت کاری کا آغاز کیا جبکہ 2008ء میں ریلیز ہونے والی فلم ''راک آن'' سے اس کا ایکٹنگ کیریئر شروع ہوا۔ زویا اختر نے 2009ء میں ریلیز ہونے والی فلم لک بائی چانس سے اپنے کیریئر کا آغاز کیا۔ وہ اس فلم کی پروڈیوسر، ڈائریکٹر اور رائٹر تھی۔ آنے والی فلموں میں زندگی نہ ملے گی دوبارہ اور زخمی شامل ہیں۔

ہنی ایرانی کو بھی لکھنے سے دلچسپی تھی۔ اس نے پہلی کہانی ''آئینہ'' کے نام سے لکھی تو جاوید اختر نے اس کی بہت حوصلہ افزائی کی اور کہا کہ وہ لکھنا جاری رکھے پھر اس نے ''لمحے'' کا اسکرپٹ لکھنا شروع کیا جو دس ماہ میں مکمل ہوا جبکہ فلم کی شوٹنگ صرف آٹھ مہینے میں مکمل ہوگئی۔ ہدایت کار کے طور پر اس کی پہلی فلم ''ارمان'' تھی۔ وہ 1991ء سے لے کر اب تک پندرہ فلموں کے اسکرپٹ لکھ چکی ہے۔

جاوید اختر اور ہنی ایرانی کا ساتھ زیادہ دیر نہ رہ سکا۔ ہنی بیمار رہنے لگی تھی۔ جاوید صاحب نے اس کے علاج اور تیمارداری میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی لیکن دونوں جانتے تھے کہ یہ شادی زیادہ عرصہ نہیں چل سکتی لہٰذا انہوں نے علیحدگی کا فیصلہ کرلیا۔ بہ ظاہر تو طلاق کی یہی وجہ بتائی گئی ہے لیکن اصل معاملہ کچھ اور ہے۔ ان کے تعلقات میں بگاڑ اس وقت آیا جب شبانہ اعظمی، جاوید صاحب کی زندگی میں آگئی۔

شبانہ اعظمی کا مختصر تعارف کچھ یوں ہے کہ وہ مشہور ترقی پسند شاعر کیفی اعظمی اور اسٹیج اداکارہ شوکت اعظمی کی بیٹی ہے۔ اس نے سینٹ زیورس کالج بمبئی سے سائیکالوجی میں ڈگری حاصل کرنے کے بعد پونا کے فلم انسٹی ٹیوٹ سے اداکاری کا کورس کیا اور 1974ء میں فلم ''انکور'' سے اداکاری شروع کی۔ اسے پہلی ہی فلم پر بہترین اداکارہ کا نیشنل فلم ایوارڈ ملا۔ وہ اب تک 120 فلموں میں کام کر چکی ہے۔ پانچ مرتبہ بہترین اداکارہ کا نیشنل فلم ایوارڈ اور چار مرتبہ فلم فیئر ایوارڈ اس کے حصے میں آئے ہیں۔

شبانہ اعظمی اور جاوید صاحب کی ملاقات کیفی اعظمی کے گھر پر ہوئی۔ کیفی صاحب کے دولت کدے پر ترقی پسند ادیبوں اور شاعروں کا جمگھٹا لگا رہتا تھا۔ کیفی اعظمی، کمیونسٹ پارٹی کے سرگرم رکن تھے اور جاوید اختر بھی اپنے ترقی پسند نظریات کے سبب ان سے خاص تعلق رکھتے تھے۔ پھر نہ جانے کب اور کیسے جاوید صاحب اور شبانہ کے بیچ مراسم بڑھنے لگے اور اب ان کی ملاقاتیں گھر کے علاوہ دوسرے مقامات پر ہونے لگیں۔ وہ محسوس کرنے لگے کہ ان کے درمیان حقیقی ساتھیوں جیسا مضبوط رشتہ پروان چڑھ رہا ہے جو ایک دوسرے کو سمجھتے اور جذبات کا احترام کرتے ہیں۔ جلد ہی انہیں احساس ہوگیا کہ وہ ایک دوسرے کے لیے بنے ہیں۔

جاوید اور شبانہ کے رومانس کی خبریں عام ہوئیں تو ہنی ایرانی کو فکر لاحق ہوگئی۔ اس نے خبر کی تصدیق کے لیے اپنے جاسوس دوڑائے۔ جاوید کے پڑوسیوں نے بھی ہنی ایرانی کو بتایا کہ وہ اکثر و بیشتر رات کو دیر سے گھر آتے ہیں جب ہنی ایرانی کو یقین ہوگیا کہ جاوید صاحب پوری طرح شبانہ کی محبت میں گرفتار ہو چکے ہیں تو اس نے ان کی زندگی سے نکلنے کا فیصلہ کرلیا۔ اس بارے میں جاوید صاحب کا کہنا ہے۔

''طلاق بھی ہماری دوستی کا کچھ نہیں بگاڑ سکی۔ اگر ماں باپ کے الگ ہونے سے بچوں میں کوئی کڑواہٹ نہیں تو اس میں میرا کمال بہت کم اور ہنی کی تعریف بہت زیادہ ہے۔ دنیا میں کم لوگوں کی اتنی عزت کرتا ہوں جتنی عزت میرے دل میں ہنی کے لیے ہے۔ کبھی کبھی سوچتا ہوں کہ ہنی نے علیحدگی اختیار کرنے میں کچھ جلدی کی ہے لیکن جلدی کچھ نہیں ہوتا، اس طرح کے فیصلے تو اوپر ہو چکے ہوتے ہیں، ہمیں بعد میں خبر ہوتی ہے۔''

شبانہ صرف ان کی بیوی ہی نہیں، محبوبہ بھی ہے۔ اس کے پاس ایک خوبصورت دل اور قیمتی ذہن بھی ہے، میں جس دنیا میں رہتا ہوں وہ اس دنیا کی عورت ہے اور شبانہ پر یہ مصرعہ پوری طرح فٹ بیٹھتا ہے۔ آج جاوید صاحب اور شبانہ ایک پُرسکون اور مطمئن زندگی گزار رہے ہیں۔ عمر کے اس حصے میں بھی جاوید صاحب کا ذہن پوری طرح جوان ہے، وہ پوری توانائی کے ساتھ سرگرم عمل ہیں۔ بہت کچھ پانے کے بعد بھی ان کی جستجو اور لگن میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی۔ ہماری دعا ہے وہ زندگی کی آخری سانس تک اسی جوش اور جذبے کے ساتھ کام کرتے رہیں۔

سینٹولوجی

محمد امجد

دنیا میں ہزاروں کی تعداد میں مذاہب پھیلے ہیں۔ سچے جھوٹے جیسے بھی ہوں، سب کے ماننے والے بڑی تعداد میں موجود ہیں اور تعداد میں اضافے کے لیے مسلسل تبلیغ کرتے رہتے ہیں مگر یہ ایک ایسا مذہب ہے جو خود کو خفیہ رکھتا ہے پھر بھی تیزی سے پھیل رہا ہے۔ اس کے ماننے والے بھی حد درجہ پُراسرار ہیں۔ اپنی تقاریب کو خفیہ رکھتے ہیں۔

ایک انتہائی خفیہ مذہب کا تذکرۂ خاص

فلوریڈا کا ایک علاقہ کلیر واٹر۔ بہت ہی چھوٹا سا علاقہ، گنتی کی چند دکانیں۔ اس قصبے کی نوعیت ایسی ہے کہ دونوں طرف کچھ دکانیں بنی ہوئی ہیں اور ان کے درمیان ایک سڑک بل کھاتی ہوئی آگے چلی گئی ہے۔

ان دکانوں میں ایک گروسری ہے جس میں روزمرہ ضروریات کی چیزیں ملتی ہیں۔ ایک پیٹرول پمپ ہے۔ ایک ہوٹل ہے اور اسی قسم کی اور دو تین دکانیں ہیں۔ لیکن یہ پورا علاقہ سویا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ ان دکانوں میں

کوئی خریدار کبھی نہیں آتا۔

دکانوں سے آگے چند ایک منزلہ مکانات بنے ہوئے ہیں جن کے باہر بھی کوئی دکھائی نہیں دیتا۔ کبھی کبھی کوئی بس جب یہاں سے گزرتی ہے یا آکر رکتی ہے تو اس کے شور سے اس قصبے کا سویا پن ذرا سی دیر کے لیے جاگ پڑتا ہے۔

رکنے والی بس سے دو تین مسافر اُترتے ہیں اور اپنے اپنے گھروں کی طرف چلے جاتے ہیں لیکن اس وقت جو بس رکتی ہے اس میں سے بہت سے افراد نیچے آتے ہیں۔

اس بس کے بعد ایک دوسری بس بھی اسی طرح آکر رکتی ہے اور اس میں سے بھی بہت سے لوگ نیچے اُترتے ہیں۔

ان میں مرد بھی ہیں اور عورتیں بھی۔ یہ ہر قسم کے اور ہر عمر کے لوگ ہیں۔ انہوں نے ایک خاص قسم کا لباس پہن رکھا ہے۔ ان کے لباس خاکی اور سیاہ رنگ کے ہیں۔

یہ آپس میں ایک دوسرے کو سر کہہ کر مخاطب کرتے ہیں۔ انتہا یہ ہے کہ یہ خواتین کو بھی سر کہتے ہیں۔ کلیر واٹر میں اس فرقے کی سب سے بڑی عبادت گاہ ہے۔

کہا جاتا ہے کہ گزشتہ تیس برسوں سے سائن ٹولوجسٹ نے اس شہر کو اپنا مرکز بنا رکھا ہے۔

سائن ٹولوجی کا مطلب ہے "سچائی کا مطالعہ۔"

کہا جاتا ہے کہ یہ اس وقت امریکا میں سب سے زیادہ تیزی سے پروان چڑھنے والا مذہب ہے۔

اس عقیدے کی ابتدا ران ہابرڈ سے ہوئی۔ ران ہابرڈ ایک ایسا قلمکار تھا جس نے بے شمار سائنس فکشن تخلیق کیے۔ اس کی لکھی ہوئی کہانیاں بہت شوق سے پڑھی جاتی تھیں، پھر اس نے 1953ء میں اس فرقے کی بنیاد رکھ دی۔

اپنے عقیدے کے پرچار کے لیے اس نے Dianetics نام کی ایک کتاب لکھی۔ یہ کتاب ہی اس فرقے کی بائبل سمجھی جاتی ہے۔

سائن ٹولوجسٹ اسی کتاب سے رہنمائی حاصل کرتے ہیں۔

اس فرقے کی تعلیمات کچھ تو سامنے ہیں اور کچھ خفیہ ہیں۔

خفیہ قسم کی تعلیمات ان لوگوں کو دی جاتی ہیں جن کو اس فرقے میں کوئی خاص مقام حاصل ہو جاتا ہے۔ ابتدا میں تو شاید بہت کم لوگ اس میں شامل ہوئے ہوں گے لیکن اب پوری دنیا میں اس فرقے کے ماننے والے نہ صرف موجود ہیں بلکہ دن بہ دن ان میں اضافہ بھی ہوتا جا رہا ہے۔

امریکا میں اس قسم کے اور بھی بہت فرقے سے ہیں۔ شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ امریکی قوم روحانی اعتبار سے ایک بھٹکی ہوئی کمزور قوم ہے۔ اسے سہارے کی تلاش ہے اسی لیے نئے اور اُلٹے سیدھے نظریات پر یقین کرکے اس کے پیچھے چل پڑتی ہے۔ امریکی معاشرے میں کوئی بھی شخص اُلٹی سیدھی باتیں کرکے پیغمبری کا دعویٰ کر بیٹھتا ہے اور لوگ اس پر یقین کرنے لگتے ہیں۔ اس کے ماننے والے پیدا ہو جاتے ہیں۔

اس کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ وہاں کسی قسم کی پابندی نہیں ہے اور نہ ہی قانون میں کوئی گرفت ہے۔ ہر شخص کو اپنی مرضی کی زندگی گزارنے کا حق حاصل ہے۔ اسی لیے اس قسم کے فرقے وہاں پروان چڑھنے لگتے ہیں۔ سائن ٹولوجی بھی ایک ایسا ہی فرقہ ہے۔ یہ لوگ معاشی طور پر بہت مستحکم ہوتے ہیں اور ایک دوسرے کی مدد کرتے ہیں۔ اس کی وجہ سے اس کا ہر ممبر خوش حال رہتا ہے۔

کہا جاتا ہے کہ اس وقت پوری دنیا میں ان کی کروڑوں ڈالرز کی پراپرٹیز ہیں۔ 150 ممالک میں ان کی عبادت گاہیں تعمیر ہو چکی ہیں۔

یہ فرقہ فلاحی کاموں میں بہت بڑھ چڑھ کر حصہ لیا کرتا ہے۔ نہ صرف امریکا میں بلکہ پوری دنیا میں۔ اس کے باوجود اسے امریکا کا سب سے متنازعہ مذہب سمجھا جاتا ہے۔

اگر اس کی تعلیمات کا جائزہ لیا جائے تو یہ بدھ ازم ہندو ازم اور عیسائیت کا ملغوبہ دکھائی دیتا ہے۔ ان کے عقیدے عجیب و غریب ہیں۔

یہ فرقہ بنیادی طور پر روحانی معاملات سے سروکار رکھتا ہے اور روحوں کے حوالے سے بات کرتا ہے۔ ان کا یہ کہنا ہے کہ انسانی جسم کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی وہ دکھاوے کی چیز ہے۔ اصل ہے روح، لہٰذا تربیت اور ریاضت کے ذریعے روح کو ایسا پاکیزہ کر دیا جائے کہ وہ خالق کائنات سے جا کر مل جائے۔

ان کا کہنا ہے کہ انسان کبھی نہ فنا ہونے والی مخلوق ہے جس کو انہوں نے TheTan کا نام دیا ہے۔ جس وقت کائنات تخلیق ہو رہی تھی، اس وقت تک ساری روحیں تخلیق پا چکی تھیں۔

پھر بگ بینگ کے وقت یہ روحیں بکھر کر پوری کائنات میں اِدھر اُدھر چلی گئیں اور پھر خود ہی مخلوق جسمانی وجود میں

آکر زمین پہ پھنس گئیں۔

ان کے نظریات کے مطابق ایک انسان جو زندگی گزار رہا ہے، وہ اس سے پہلے گزار چکا ہوتا ہے۔ یہاں پر یہ فرقہ ہندوؤں کے آواگون کو مانتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔

ان کے یہاں انسان جز ہے اور خالق کائنات کل۔ اسی لیے اپنے کل سے جز کی جدائی نہیں ہونی چاہیے۔ ان کا کہنا ہے کہ جس وقت انسانی روحیں کائنات یا زمین پر بکھیر دی گئیں، اس وقت قانونِ فطرت کے علاوہ کسی قانون کا وجود نہیں تھا۔

اور یہ قانونِ فطرت صرف جنس میں نمایاں ہوتا ہے اسی لیے اس کی تکمیل پر کسی قسم کی پابندی نہیں ہونی چاہیے۔ یہ ایسا ہی فعل ہے جیسے کھانا کھانا، پانی پینا یا سانس لینا۔ (یہاں یہ ہندو مذہب کے ایک مہا پنڈت بھگوان رجنیش سے بہت زیادہ قریب نظر آتے ہیں۔ وہ بھی ایسا ہی کہتا ہے)

ان کے نزدیک انسان کا سب سے اعلیٰ اور اہم مقصد اپنے آپ کو تلاش کرنا ہے۔ اپنے من میں ڈوب کر پا جا سراغ زندگی۔

ہم انسانی قوانین اس لیے وضع کرتے ہیں کہ ہم ان لوگوں کے درمیان رہتے ہیں جنہوں نے یہ قوانین بنائے اور ان کی دل آزاری نہ ہو کی خاطر ہم قوانین کی پاسداری کرتے ہیں۔

ان کا کہنا ہے کہ ان کی عبادات کے طریقے ایسے ہیں کہ انسان بہت جلد اعلیٰ ترین روحانی منازل طے کر لیتا ہے۔

یہاں پر وہ صوفیت کے قائل نظر آتے ہیں جہاں خاص تربیت اور ریاضت کے ذریعے سلوک کی منزلیں طے کرائی جاتی ہیں۔

ان کے یہاں روحانی تربیت کے دو بنیادی طریقے ہیں۔ ایک ہے Auditing اور دوسرا ہے Training اور جس راستے پر کامیابی سے چلتے ہوئے منزل مل جاتی ہے اسے The Bridge to Total Freedom کہا جاتا ہے۔ (یعنی مکتی)

ان کا کہنا ہے کہ یہ جو کچھ آپ کے ساتھ ہوتا ہے، یہ حادثے وغیرہ، یہ سب پہلے سے ہو چکے ہوتے ہیں، کوئی بھی حادثہ ناگہانی نہیں ہوتا یعنی "وقت کرتا ہے پرورش برسوں۔ حادثہ ایک دم نہیں ہوتا۔"

تربیت کا پہلا مرحلہ اوڈیٹنگ یعنی سننا ہوتا ہے۔ اس میں لیکچرز دیے جاتے ہیں۔ ایک مقرر تقریر کرتا ہے اور اس فرقے کے بنیادی عقائد بیان کرتا ہے۔ اسی دوران سوال و جواب بھی ہوتے ہیں۔

ہر قسم کی تنقید کی جا سکتی ہے اور ہر سوال کا جواب دیا جاتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ انسان آزاد پیدا ہوا ہے۔ اسے اپنے ذہن کو آزادی سے استعمال کرنے کا پورا حق حاصل ہے۔ چاہے وہ کسی بھی سمت میں ہو۔

جس طرح سوچنا انسان کا بنیادی حق ہے اور اس پر کوئی پابندی نہیں ہونی چاہیے، اسی لیے جنس بھی انسان کا بنیادی حق ہے اور اس پر بھی کوئی پابندی نہیں ہونی چاہیے۔

ان کے یہاں ایک مثلث کی بہت اہمیت ہے (ٹرائی اینگل)

اس مثلث کو ARC کہا جاتا ہے اور ان کی تعلیمات کا محور ہے۔ مثلث کا ایک کونہ A ہے دوسرا R اور تیسرا C۔

A علامت ہے Affection یعنی پیار کی۔ آپس میں محبت اور بھائی چارے کی۔ R علامت ہے

سرفراز نواز

پاکستانی کرکٹ ٹیم کے سابق فاسٹ بالر سرفراز نواز یکم دسمبر 1948ء کو لاہور میں پیدا ہوئے۔ اسی شہر سے انہوں نے اپنے کرکٹ کیریئر کا آغاز کیا۔ پاکستان کی جانب سے 55 ٹیسٹ میچوں میں انہوں نے 177 وکٹیں حاصل کیں، جبکہ 45 ون ڈے میچوں میں وہ 45 کھلاڑیوں کو اپنا شکار بنانے میں کامیاب رہے۔ ان کے والد مرحوم محمد نواز لاہور کے معروف کنٹریکٹر تھے...... تعمیراتی کام کے حوالے سے انہیں بہت زیادہ

شہرت حاصل تھی۔ ان کی والدہ حسن آرا بیگم گھریلو خاتون تھیں۔ سرفراز نواز کے دو بھائی ہیں۔ جاوید نواز، جو کہ ان سے بڑے ہیں اور شاہد نواز ان سے چھوٹے ہیں۔ بڑے بھائی لاہور میں اور شاہد انگلینڈ میں مقیم ہیں۔ چھوٹے بھائی نے انگلینڈ میں پروفیشنل لیگ کرکٹ کھیلی جبکہ پاکستان کے قومی سطح کے مقابلوں میں بھی حصہ لیا، تین بہنیں عظمت، فضیلت غفور اور عائشہ شادی شدہ ہیں اور اپنے اپنے گھروں میں خوش گوار زندگی بسر کر رہی ہیں۔

مرسلہ: ریحانہ ہمدانی، لاہور

www.Paksociety.com

Reality یعنی سچائی کی۔ اور C علامت ہے Communication یعنی ابلاغ کی۔

اس فرقے کا ان پر مکمل اعتقاد ہے اور وہ اسی کے مطابق عمل کرتے ہیں۔

یہ بھی اپنی علامت کے طور پر کراس استعمال کرتے ہیں لیکن ان کا یہ کراس آٹھ کونوں والا ہوتا ہے۔ جو ان کے بقول وجود کے آٹھ مظاہر ہیں۔

یہاں وہ بدھ ازم کے قریب ہو جاتے ہیں۔

فکشن رائٹر ہابرڈ ان کا پیغمبر ہے۔ وہ اس کا جنم دن اور برسی بھی مناتے ہیں۔ اس دن کام پر نہیں جاتے۔

اس فرقے نے اپنی جڑیں امریکا کے علاوہ یورپ میں بھی مضبوط کرلی ہیں۔ ان کی عبادت گاہوں کو بھی عام طور پر چرچ کہا جاتا ہے۔

ان کی عبادتوں میں ہر شخص شریک ہوسکتا ہے لیکن یہ عام عبادتیں ہوتی ہیں جو تبلیغ کے لیے ہوتی ہیں اور جب کوئی ان کی باتوں سے متاثر ہوکر اس فرقے کا رکن بن جاتا ہے تو اس کے بعد اسے اعلیٰ ترین مدارج طے کرائے جاتے ہیں۔

وہ مدارج کیا ہوتے ہیں اور وہ ریاضت کیسی ہوتی ہے، یہ باہر والوں کو معلوم نہیں ہو پاتا۔

اپنی طرف متوجہ کرنے کا طریقہ دوسروں سے مختلف ہے اور وہ طریقہ ایسا ہے کہ ہر شخص اسے اپنی بنیادی اور ابتدائی ضرورت سمجھ لیتا ہے۔

یہ براہ راست اپنے نظریات اور عقیدے کی بات نہیں کرتے بلکہ آنے والے کی شخصیت کو متاثر کن بنانے کی ٹریننگ دیتے ہیں۔ جسے آپ Selfgrooming کہہ سکتے ہیں۔

ان کا کہنا ہے کہ جس قدر آپ کی ظاہری شخصیت نکھری ہوئی ہوگی اسی قدر آپ کی روح بھی نکھرے گی، لہٰذا وہ شخصیت کی تعمیر پر بہت زور دیتے ہیں۔

اٹھنا بیٹھنا، چلنا پھرنا، تقریر کی خصوصیات، ڈریسنگ، کردار شناسی، مراقبہ وغیرہ۔ اور یہ ایسی باتیں جو تقریباً ہر شخص کی ضرورت ہیں۔

کون ایسا ہے جو آئیڈیل نہیں بننا چاہتا؟ اسی لیے لوگ ان کے ممبر بن جاتے ہیں اور آہستہ آہستہ ان کے عقیدے کے مطابق ڈھل جاتے ہیں۔

یہ لوگ اپنا کام مختلف N.G.O کے ذریعے انجام دیا کرتے ہیں اور یہ این جی اوز اس وقت پوری دنیا میں موجود ہیں۔

آپ کو یہ جان کر حیرت ہوگی کہ پچھلے دنوں کراچی میں ہی اس کے بانی ہابرڈ کا جنم دن منایا گیا اور اس میں شامل ہونے والے افراد برٹش یا امریکن نہیں تھے بلکہ پاکستانی تھے۔

انہیں یہ اندازہ نہیں تھا کہ وہ سیلف گرومنگ کے چکر میں آکر اس عقیدے میں شامل ہوتے جا رہے ہیں۔

کراچی میں ایک کتابچہ تقسیم کیا گیا جس کا نام Way to Happiness تھا۔

اس کتابچے میں وہی بنیادی عقائد ذرا مختلف انداز سے شامل کیے گئے تھے جو ان کی مذہبی کتاب Dianetics میں ہیں۔ یہ کتابچہ اردو میں بھی تقسیم ہوا تھا۔

سوال یہ ہے کہ آخر ایسا کیوں ہوتا ہے؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ ہم اپنے مرکز سے ہٹ کر ادھر اُدھر بھٹکنے لگے ہوں۔ جس طرح امریکی اور یورپی اقوام بھٹک رہی ہیں۔

اگر ایسا ہے تو یہ ہمارے لیے بہت بڑی بدقسمتی کی بات ہوگی۔

جب کراچی کی بات چل نکلی ہے تو اس حوالے سے کراچی کے ایک اور فرقے کا حال سن لیں۔

یہ فرقہ اپنے آپ کو جبریلیہ کہتا تھا۔ اس کے سب سے بڑے مبلغ اور رہنما ساجد نام کے ایک مصور تھے۔ جن کی رہائش کراچی کے علاقے لیاقت آباد میں تھی۔ اس فرقے کے عقائد بھی کچھ عجب تھے۔

ان کا ماننا تھا کہ قرآن شریف حضرت جبریل علیہ السلام پر نازل ہوا۔ ان کا کہنا تھا کہ جبریلؑ صرف پیغام لانے لے جانے والے نہیں تھے۔ کیونکہ پیغام تو آپؐ کے ذہن اور دل پر بھی القا ہوسکتا تھا۔ پھر اس کے لیے کسی پیغام بر کی کیا ضرورت پیش آگئی؟

ان کے یہاں عبادات میں ذکر اور مراقبے کو بہت اہمیت حاصل تھی۔ (ذکریوں کی طرح) ان کی اپنی الگ دنیا تھی۔ ان کے اجتماعات میں اوروں کو شریک ہونے کی اجازت نہیں تھی۔ صرف وہی آیا کرتے جو ان کے عقیدے کے پیروکار ہوتے۔

ایک دانش ور نے بہت پتے کی بات کی تھی۔ ان کا کہنا تھا کہ جن مذاہب کی رسومات خفیہ طور پر ادا کی جاتی ہوں، سمجھ لیں کہ ان میں کوئی نہ کوئی گڑبڑ ضرور ہے۔

شہید مرتے نہیں

زین مہدی

شہید کبھی مرتے نہیں، اللہ تعالیٰ سے رزق پاتے ہیں۔ اس بات پر ہمارا ایمان ہے۔ سعودی عرب کے اس شہر میں بھی ایسے ہی دو جسم قبر سے نکلے ہیں جن کے بارے میں ڈاکٹروں کا کہنا ہے کہ یہ جسم ڈیڑھ صدی قبل سانسیں لیتے تھے۔ گروہ مرچکے ہیں تو ان کا جسم مسخ کیوں نہیں ہوا، یہ ایک ایسا راز ہے جس تک پہنچنا میڈیکل سائنس کے لیے ناممکن ہے۔ عقل کی کسوٹی پر اسے پرکھا ہی نہیں جاسکتا کہ شہدا وصدیقین کا مقام بہت بلند ہے۔

ڈیڑھ سو سال بعد قبر سے برآمد اجسام کا احوال

سورج نصف النہار پر پہنچ چکا تھا، دھوپ کی شدت عروج پر تھی۔ مزدور پسینے سے شرابور تھے مگر کھدائی ابھی مکمل نہیں ہوئی تھی۔ اسی زور شور سے جاری تھی۔ کمپنی نے ایک ماہ کا وقت دیا تھا۔ اس ایک ماہ میں مزدوروں کو اسٹرکچر کھڑا کر دینا تھا مگر حالت یہاں یہ تھی کہ زمین اتنی سخت تھی کہ مشینی پھاوڑے کام کرنے سے انکاری تھے۔ بار بار بلیڈ ٹوٹ رہے تھے۔ جب تیسری بار بلیڈ چٹخا تو انجینئر کا پارہ چڑھ گیا۔ اس نے صاف لفظوں میں کہا "یہ سارے مزدور کام چور ہیں، دانستہ کام روک رہے ہیں، سب کو نکال باہر کرو۔"

"اتنے مزدوروں کو نکال دینا آسان نہیں ہے پھر یہ سب مصری ہیں۔ ذرا سی بات پر سب ایک ہو جاتے ہیں۔" سپروائزر نے دھیمی آواز میں جواب دیا۔

"میں کچھ نہیں جانتا، سب کو نکال باہر کرو، مجھے ہر حال میں کام چاہیے، کل میدان کھدا ہوا ہو ورنہ مجھ سے برا کوئی نہیں ہوگا۔" انجینئر نے چیختے ہوئے کہا اور کیبن کے دروازے کی جانب بڑھا۔

غصے سے تن تناتا ہوا وہ باہر نکلا تھا کہ اسے جھٹکا لگا اور وہ منہ کے بل گر پڑا۔ اس کا چہرہ پتھریلی زمین سے ٹکرایا تھا اور خون کا فوارہ سا ناک سے اُبل پڑا تھا۔

کیبن کے در پر وہ جس طرح ٹھوکر کھا کر گرا تھا، اسے دیکھ کر سب حیران رہ گئے تھے کیونکہ وہاں کوئی پتھر بھی نہیں تھا جس سے ٹھوکر لگتی۔ مزدوروں نے بھاگ کر اسے سہارا دیا تھا اور جیپ پر سوار کرا کر شہر پہنچایا گیا تھا۔ فرسٹ ایڈ کے بعد وہ اگلی صبح ہی سائٹ پر پہنچا تھا۔

سائٹ پر کام جاری تھا۔ بھاری مشنری کھدائی میں لگی ہوئی تھی مگر کام کی رفتار اب بھی دھیمی تھی۔ وہ چاہ کر بھی رفتار تیز نہیں کر پایا تھا۔ وہ غصے میں بھناتا ہوا سپروائزر کے پاس پہنچا۔ سپروائزر 42 سالہ مصری نژاد تھا۔ دھان پان، بے نام تھا، ہنس مکھ اور ملنسار ہونے کی وجہ سے مزدوروں میں بہت مقبول تھا۔ اس نے انجینئر کو دیکھتے ہی سلام کیا۔ اس نے بھانپ لیا تھا کہ انجینئر غصے میں ہے اس لیے اس نے پہلا جملہ ادا کیا۔

"ہم نے زمین نرم کرنے کے لیے پانی چھوڑا ہے۔ پانی کی وجہ سے زمین نرم ہوگئی ہے اور کھدائی تیز ہے، آپ فکر نہ کریں۔"

"فکر کیسے نہ کروں، مجھے بھی جواب دینا پڑتا ہے۔"

ابھی اس نے اتنا ہی کہا تھا کہ آتی ہوئی ٹرالر کے وہیل کے نیچے ایک چھوٹا سا پتھر آیا، پتھر ٹائر کے کناروں سے دبا تھا اس لیے پھسل کر اُچھلا اور غلیل سے پھینکے گئے گلّے کی طرح آ کر اس کے سر سے ٹکرایا۔ دیکھتے ہی دیکھتے سر سے خون کی دھار بہہ نکلی۔

وہ سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ ابھی ناک کا بانسہ پھٹا تھا، اب سر پھٹا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ یہ سب کیا ہورہا ہے؟ اس پر پے درپے مصیبتیں کیوں ٹوٹی پڑ رہی ہیں۔ وہ اس بارے میں سوچ رہا تھا اور فیلڈ میڈیکل اسٹاف اس کی مرہم پٹی کررہا تھا۔

وہ مرہم پٹی کرا کر فارغ ہوا ہی تھا کہ ایک مزدور نے آ کر اطلاع دی "سر بلڈوزر آپریٹر کو تیز بخار آگیا ہے۔"

"ابھی کچھ دیر پہلے تو وہ بھلا چنگا تھا۔" سپروائزر کے لہجے میں حیرت تھی۔

"جی ہاں، صبح صحیح تھا مگر کچھ دیر پہلے اسے قے ہوئی پھر دیکھتے ہی دیکھتے تیز بخار چڑھ گیا۔"

"ایسا کیسے ہوسکتا ہے، چلو میں دیکھتا ہوں۔" کہہ کر وہ بلڈوزر کے پاس آیا۔ بلڈوزر آپریٹر کو دو مزدور سہارا دے کر خیمے کی طرف لے جارہے تھے۔

سپروائزر نے اسسٹنٹ آپریٹر موشان کو آواز دی۔ موشان 26 سال کا ایک قدآور جوان تھا۔ وہ بھی مصری تھا مگر مذہبی طور پر عیسائی تھا۔ آرتھوڈوکس سیرین عیسائی۔ اس کے چہرے پر گھنی داڑھی تھی مگر مسلمانوں کی طرح وہ ٹوپی پہنتا تھا۔ دیکھنے والے اسے پہچان نہیں پاتے تھے کہ وہ عیسائی ہے، اکثر لوگ اسے مسلمان سمجھتے تھے۔ موشان کو سپروائزر نے کہا کہ وہ اپنے استاد کی جگہ سنبھال لے۔

سپروائزر کا حکم وہ رد نہیں کرسکتا تھا۔ اسے اتنا تجربہ تو تھا کہ بلڈوزر کو کیسے آپریٹ کرنا چاہیے۔ کس لیور کو دبانے سے بلیڈ اوپر اُٹھتا ہے اور کس کو دبانے سے وہ نیچے گر کر زمین میں پیوست ہوجاتا ہے۔ اس نے سیٹ سنبھالتے ہی آپریٹ لیور کو کھینچا۔ لیور کھینچتے ہی ایک محیرالعقول واقعہ رونما ہوا۔ شاید ہی کسی کو یقین آئے مگر اسے اوپر بنے پلیٹ فارم سے گرتے ہوئے سب نے دیکھ لیا تھا۔ وہ سات فٹ کی بلندی سے گرا تھا اور گرتے ہی بے ہوش ہوگیا تھا۔

کام ایک بار پھر بند ہوگیا تھا۔ سب اسے گھیر کر کھڑے ہوگئے تھے۔ میڈیکل اسٹاف اسے ٹریٹمنٹ دینے میں مصروف ہوگیا تھا۔

موشان ہوش میں آیا تو لوگوں نے گرنے کی وجہ جاننا چاہی۔ کچھ دیر تک وہ ذہن پر زور دیتا رہا، پھر اس نے بتایا کہ بلڈوزر میں کرنٹ آگیا تھا۔ اسی کے جھٹکے سے وہ گرا تھا۔ یہ بھی ایک ناممکن بات تھی۔ بلڈوزر کی بیٹری اتنی طاقتور نہیں ہوتی کہ وہ ایسا زبردست جھٹکا مارے جس سے انسان اُچھل کر دور جا گرے۔ اس کی بات سب نے ہنسی میں اڑا دی۔

شہر سے ایک دوسرے آپریٹر کو بلوایا گیا۔ منطقہ عسیر سے خمیس مشیط میں وہ ایک گھنٹے میں پہنچ گیا۔

شیخ باسط الخیاری نامی وہ آپریٹر بہت تجربے کار تھا۔ حافظ قرآن اور علاقے کی مسجد میں کبھی کبھی امامت بھی کرتا تھا، اس نے یہ کام شوقیہ سیکھا تھا۔ پھر کافی عرصہ تک اس نے اس کام کو کیا۔ اب بھی جب کہیں سے بلاوا آجاتا تھا تو وہ چلا جاتا تھا۔ بنیادی طور ترسیل علم اس کا خاندانی پیشہ تھا۔ اس کے والد بھی ایک مدرسہ میں تعلیم دیتے تھے اور وہ بھی اسی کام سے وابستہ تھا۔ اس دن بھی جب اسے بلایا گیا تو وہ مدرسہ سے آ کر بیٹھا تھا۔ اس کمپنی کے سپروائزر سے اس کی پرانی یاد اللہ تھی اسی لیے وہ بلانے پر چلا آیا تھا۔ یہاں پہنچ کر جب اسے تمام حالات کا علم ہوا تو اس نے یہی کہا کہ آپ لوگ اچھی طرح غور کر لیں۔ مجھے ایسا لگ رہا ہے کہ کوئی ایسی قوت ہے جو کام کو روکنا چاہتی ہے۔

"بھائی میرے یہاں میری نوکری کا سوال ہے۔ اگر روتھ صاحب نے تمہاری باتیں سن لیں تو سمجھو کہ میری نوکری کا خدا حافظ۔" سپروائیزر نے ہنس کر کہا۔

"رزق کا مالک اللہ تعالیٰ ہے۔ میرا دل نہیں ہے کہ میں کام کروں مگر میں تمہاری وجہ سے یہ کام کروں گا۔"

"باقی باتوں کو چھوڑو اور کام سنبھال لو۔ مجھے اپنی نوکری کی فکر ہوگئی ہے۔ روتھ صاحب بہت غصے میں ہیں۔" سپروائزر نے ہنس کر کہا۔

باسط الخیاری نے عادت کے مطابق پہلے کلام اللہ کا ورد کیا پھر لیور کو دبایا۔ بلڈوزر حرکت میں آگیا اور زمین کا سینہ شق ہونے لگا۔ دیکھتے ہی دیکھتے کافی ساری زمین شق ہوچکی تھی کہ اس نے کام روک دیا۔

انجن بند ہوتے ہی سپروائزر دوڑتا ہوا آیا "اب کیا ہوا؟"

"نیچے دیکھو۔" اس نے اوپر سے چیخ کر کہا تو سپروائزر نے گڑھے میں جھانکا اور سکتے میں آگیا۔ اس لیے کہ وہاں اسے کسی کا سر نظر آیا تھا۔ آدھا جسم مٹی میں دبا ہوا تھا۔ مگر جو حصہ باہر تھا وہ کسی لاش کا سر لگ رہا تھا۔ یہ ایک نئی اُلجھن تھی۔ اس لیے کہ اب پولیس کو بلانا ضروری ہوگیا تھا۔

گڑھے میں کسی کی لاش پڑی ہے، یہ خبر جنگل کی آگ کی طرح اس کونے سے اس کونے تک میں پھیل گئی تھی۔ مزدور دوڑ دوڑ کر آرہے تھے۔

دیکھتے ہی دیکھتے اس کھڈے کے گرد ایک جم غفیر جمع ہوگیا۔ مزدوروں میں خوف کی لہر دوڑ گئی تھی۔ کام پوری طرح

انڈیا، پاکستان اور بنگلہ دیش کے اخبارات میں خبریں

رک چکا تھا۔ ہر کوئی چہ میگوئیوں میں مصروف تھا۔ جتنے منہ تھے، اتنی باتیں تھیں۔ کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ کسی راہگیر کو قتل کرکے یہاں دبایا گیا ہے کیونکہ علاقے کے کسی شخص کا قتل ہوتا تو بات پھیل جاتی پھر یہ علاقہ بھی زیادہ بڑا نہ تھا۔ کسی گنجان شہر میں بھی ایک ساتھ دو آدمی غائب ہوجائیں تو ہر طرف باتیں شروع ہوجاتی ہیں۔ یہ تو معمولی سا قصبہ تھا۔ پھر جہاں کام ہورہا تھا وہ اس قصبے سے بھی باہر کا علاقہ تھا۔ دو شہروں کے درمیان یہ قصبہ ہے، پھر یہ قصبہ ایک ایسی گزرگاہ پر واقع ہے جو ہمہ وقت مصروف رہتی ہے۔ سیاحتی مرکز ہونے کی وجہ سے دن رات لوگوں کا آنا جانا لگا رہتا ہے۔ اس شاہراہ پر ایک دو نہیں پینتیس سے زائد فائیو اسٹار ہوٹلز بھی ہیں جن میں مسافر آرام کی غرض سے ٹھہرتے رہتے ہیں۔ کون کب آیا، اس کی خبر عام لوگوں کو نہیں ہوتی اسی وجہ سے لوگوں کا خیال تھا کہ کسی مسافر کو لوٹنے کے بعد کسی جرائم پیشہ نے قتل کرکے لاش یہاں لا کر دبا دی ہے۔

گڑھے کے گرد مزدوروں کی بھیڑ اس طرح جمع تھی کہ آگے بڑھنا دشوار تھا۔ انجینئر روتھ کو خبر دی جاچکی تھی۔ وہ بھی آگیا تھا اور اب وہ سپروائزر کے ساتھ اس طرف بڑھ رہا تھا۔ ساتھ ہی ساتھ اس کی زبان بھی چل رہی تھی۔ سپروائزر کو امریکی بالکل پسند نہ تھے۔ وہ اچھے اور برے دونوں حالات میں گالیاں بکتے تھے۔ سپروائزر کچھ کچھ مذہبی رجحان کا تھا اس لیے اسے یہ خرافات پسند نہ تھیں لیکن کیا کرتا کہ مجبوری تھی۔ وہ چاہ کر بھی انجینئر کو منع نہیں کرسکتا تھا۔ یوں بھی انجینئر اس وقت سخت غصے میں تھا۔ اسے جرائم پیشہ افراد پر غصہ آرہا تھا۔ وہ مسلسل بڑبڑا رہا تھا کہ اگر قتل کرنا ہی تھا تو انہوں نے لاش یہاں کیوں دبائی۔ کہیں اور جا کر اسے دباتے۔ اب خواہ مخواہ شرطے آ کر وقت برباد کریں گے۔ رپورٹ مرتب کرنے کے نام پر ایک دو دن برباد کردیں گے۔ یہاں وقت بالکل نہیں ہے اور یہ نیا مسئلہ پیدا ہوگیا ہے۔

بکتا جھکتا انجینئر اس کھڈے تک پہنچا۔ گڑھے کے نزدیک پہنچ کر اس نے نیچے جھانکا پھر آہستہ آہستہ وہ نیچے اُترا۔ اس کے ساتھ سپروائزر کو بھی نیچے اُترنا پڑا۔ وہاں ایک نہیں دو لاشیں تھیں۔ دونوں لاشوں کے درمیان چھ ہاتھ کا فاصلہ تھا۔ پہلے ایک لاش نظر آئی تھی۔ لاش دیکھتے ہی مشین روک دی گئی تھی اور بلڈوزر کے بجائے پھاؤڑے سے مٹی ہٹائی گئی تھی۔ اسی دوران ایک اور لاش نظر آگئی۔ ان دونوں لاشوں کا صرف آدھا آدھا حصہ باہر تھا۔ باقی کا حصہ اب تک مٹی میں دبا ہوا تھا۔

وہ دونوں لاش کے سرہانے کھڑے ہو کر معائنہ کررہے تھے۔ دونوں لاشوں کی شکل ایک جیسی تھی۔ بہت زیادہ مشابہت تھی۔ ایسا لگ رہا تھا دونوں بھائی ہیں۔ کھلتا ہوا رنگ، چوڑی بھنویں اور ایک جیسی چھوٹی داڑھی، عمر بھی تقریباً برابر لگ رہی تھیں۔ تیس پینتیس سال کی عمر ہوگی مگر چہرے پر غضب کی معصومیت تھی۔ ایسا لگ رہا تھا کہ ابھی ابھی سوئے ہیں۔

لاش کا معائنہ کرنے کے بعد انجینئر نے کہا "یہ تو قتل کی واردات نہیں لگتی اور نہ جلد بازی میں یہ لاش دبائی گئی ہے۔"

"مجھے بھی ایسا ہی لگ رہا ہے سر!" سپروائزر نے تائید کی۔

"اس لیے کہ دونوں لاشوں پر سفید کپڑا اڑھا دیا گیا۔"

"جی ہاں سر!"

"مگر سفید کپڑے کے نیچے انہوں نے اسے روایتی

ملبوسات پہنا رکھے ہیں۔ جب جسم پر کپڑے موجود ہیں تو پھر اوپر سے کپڑے سے ڈھکا کیوں گیا، باضابطہ کفن بھی پہنایا جاسکتا تھا۔" انجینئر کی آواز میں فکر کا عنصر در آیا تھا۔ وہ سوچ میں ڈوب گیا تھا۔

"لیکن سر، شاید آپ کو یاد نہیں ہے کہ ہم مسلمان اپنے مردوں کو اس کے کپڑوں میں بھی دفن کرتے ہیں۔ وہ لوگ جو دورانِ جنگ شہید ہوتے ہیں، ان کی لاش کو غسل و کفن کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اسی حالت میں بھی دفن کردیتے ہیں۔"

"مگر آج کل یہاں، اس علاقے میں کوئی جنگ بھی تو نہیں ہوئی ہے۔" انجینئر نے پرسوچ انداز میں کہا۔

"یہی تو حیرت کی بات ہے کیونکہ لاش کے چہرے سے ظاہر ہے جیسے یہ کوئی شہید ہے۔" سپروائزر کے جواب پر انجینئر نے اسے گھور کر دیکھا پھر وہ مٹی ہٹانے کے لیے بیٹھا۔ اس نے ہاتھ بڑھایا مگر جیسے ہی اس نے لاش کے قریب کی مٹی میں ہاتھ لگایا، وہ خود بہ خود پیچھے کی جانب اُلٹ گیا۔ اس کا سر گڑھے کی دیوار سے ٹکرایا تھا پھر وہ اوپر کی جانب چہرہ اُٹھا کر چلایا "جلدی...... جلدی مجھے باہر نکالو۔"

بلڈوزر کا آہنی بک نیچے لٹکا دیا گیا جسے پکڑ کر وہ اوپر چڑھتا چلا گیا۔ سپروائزر بھی اسی طرح باہر آگیا تھا۔ اوپر آکر اس نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ انجینئر نظر نہیں آرہا تھا۔

"صاحب جی کہاں ہیں؟" اس نے ترک زبان میں ایک مزدور سے پوچھا۔

"اپنے کیبن میں ہیں۔" مزدور نے جواب دیا "ان کی طبیعت خراب ہوگئی ہے۔ وہ آرام کررہے ہیں۔"

سپروائزر انجینئر کے کیبن کی طرف بڑھتا چلا گیا۔ اسے بھی فکر ہوگئی تھی کہ صبح سے ایک نہ ایک بات ہوتی جارہی ہے۔ ایسا لگنے لگا تھا کہ اب کام بند کرنا پڑے گا۔

سعودی عرب کے جنوب مغربی صوبہ عسیر کے علاقے خمیس مشیط میں ایک عالی شان ہوٹل کی تعمیر کے لیے ہورہی کھدائی کے موقع پر یہ باتیں رونما ہورہی تھیں۔ اب لاش کی برآمدگی نے مزید پریشانی کھڑی کردی تھی۔ پولیس کو خبر دینا ضروری تھا اور یہ کام صرف انجینئر کرسکتا تھا یا پھر اس کے حکم سے وہ خود۔ اسی بات کی اجازت لینے وہ اس کیبن میں آیا تھا۔ اندر آتے ہی اس نے دیکھا کہ انجینئر اپنے بستر پر اوندھے منہ لیٹا ہوا تھا۔ اس نے نزدیک پہنچ کر پوچھا "سر اب آپ کی طبیعت کیسی ہے؟"

آواز سنتے ہی وہ جھٹکے سے سیدھا ہوا تھا۔ کچھ دیر تک وہ خالی خالی نظروں سے اس کی طرف دیکھتا رہا پھر بولا "تم نے دیکھا تھا، میرے ساتھ کیا ہوا تھا؟"

"کیا ہوا تھا؟" سپروائزر نے سوالیہ انداز میں اسے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"مجھے ایسا لگا تھا جیسے کسی نے مجھے دھکا دیا تھا۔ ڈیڈ باڈی کو ہاتھ لگاتے ہی مجھے ایسا لگا تھا جیسے 440 وولٹ کا کرنٹ لگا ہو تبھی تو میں اُلٹ کر گرا تھا۔" انجینئر نے جواب دیا تھا۔ "یہ سب کیا ہورہا ہے میری سمجھ سے باہر کی بات ہے۔ تب سے میں مسلسل اسی بات پر غور کررہا ہوں۔ تم کچھ بتاسکتے ہو؟"

"سر میری بات پر یقین کریں گے؟"

"ہاں بولو؟"

"ہم مسلمان مُردوں کو بہت اہمیت دیتے ہیں۔ پاک مُردوں کو تو کچھ زیادہ ہی احترام دیتے ہیں۔"

"پاک اور ناپاک کیا؟ مُردے مُردے ہوتے ہیں۔"

"نہیں سر! وہ لوگ جو زندگی بھر پاک زندگی گزارتے ہیں وہ اللہ والے ہوتے ہیں۔ شہدا اور صدیقین میں ہوتے ہیں۔ ان کی لاشیں بھی پاک اور طاہر ہوتی ہیں۔ ان کو ہاتھ لگانے والا بھی طاہر ہونا ضروری ہے۔" ان کی باتیں جاری تھیں کہ باہر سے خبر آئی "سر شرطے آئے ہیں۔"

سپروائزر باہر آگیا۔ اب اسے ہی پولیس والوں سے نمٹنا تھا۔ وہ اس گڑھے کی طرف آیا۔ تبھی اس کی نظر علاقے کی مسجد کے امام پر پڑی۔ شیخ احمد بن محمد الحواشی کا شمار علاقے کے دیندار لوگوں میں ہوتا تھا۔ پورے قصبہ میں ان کو عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ انہوں نے بھی لاشوں کا معائنہ کیا تھا۔ ان کے بعد ہی پولیس والے گڑھے میں اُترے تھے اور لاشوں کا معائنہ کیا تھا۔

معائنہ کے بعد انہوں نے لاش پر پڑی مٹی بھی ہٹادی تھی۔ اب دونوں لاشیں باہر نکالی جارہی تھیں۔ سپروائزر کی نظران لاشوں کے جسم پر موجود کپڑوں پر جم کر رہ گئی تھی۔ ان دونوں کے ملبوسات؟ ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ دونوں کسی ڈراما کمپنی کے ہوں۔ اس لیے کہ ان کے لباس نہایت قدیم تراش کے تھے۔ آج کیا پچاس سال پیشتر بھی ایسی تراش کے کپڑے کوئی نہیں پہنتا ہوگا۔ کئی سو سال پہلے کے ملبوسات لگ رہے تھے۔

لاشوں کو ایمبولنس میں ڈال کر اسپتال بھیج دیا گیا۔

اگلے دن اسپتال سے جو خبر آئی اسے سن کر مزدوروں میں پھر سے ایک بار خوف کی لہر دوڑ گئی۔

اسپتال میں ڈاکٹروں کی ٹیم نے لاش کا معائنہ کیا تھا۔ کئی قسم کے تجربے بھی کیے تھے۔ وہ سب اس بات پر متفق ہوگئے تھے کہ یہ لاشیں آج کی نہیں ہیں۔ انہیں مرے ہوئے

ایک ڈیڑھ صدی سے زیادہ وقت گزر چکا ہے۔

اتنی پُرانی لاش اور صحیح سلامت اور یہ عالم کہ کل کی لگ رہی تھی۔ یہی بات سب کو حیران کررہی تھی۔ ہر ایک اس بات سے آگاہ تھا کہ لاش زیادہ دیر تک نہیں رہ سکتی۔ ایک ہفتے میں گلنا سڑنا شروع ہوجاتا ہے۔ سب سے پہلے لاش کا پیٹ پھٹتا ہے۔ آنتیں اور دیگر اعضا گل کر مٹی میں جذب ہوتے ہیں پھر باری آتی ہے نسوں، پٹھوں کی پھر ہڈیوں کی، بالوں کی اور دانتوں کی۔

لیکن یہاں تو سب کچھ سلامت تھا۔ جسم پر موجود کپڑے تک سلامت تھے۔ چہرے کی رونق تک ماند نہیں پڑی تھی۔ سب سے اہم بات یہ کہ ان کے ہونٹوں پر ملکوتی مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔

یہ خبر جب "الالکترونیہ" میں شائع ہوئی تو پورے صوبے سے لوگ امنڈ پڑے مگر حکومت نے لاشوں کو دیکھنے پر پابندی لگادی تھی۔ اس کی ایک وجہ وہاں کا قانون ہے۔ سعودی عرب میں کسی مُردے کو اہمیت دینا یا قبر پر جانا ممنوع ہے۔

خبر ملنے کے بعد اخباری نمایندے نے علاقے کا دورہ کیا اور اپنی تحقیق اپنے اپنے اخبارات میں لگائی۔ ان ہی خبروں سے جو کہانی اُبھر کر سامنے آئی ہے، وہ یہ ہے:

"اس علاقے میں سنا جاتا ہے کہ کبھی وہاں کوئی بہت پُرانا قبرستان تھا۔ لیکن یہ قبرستان کب تھا اس کا چشم دید گواہ کوئی بھی نہیں۔ جب کہ قصبے میں ایسے ... افراد بھی موجود ہیں جن کی عمر نوے سے بھی زائد ہے۔ ان طویل عمر کے لوگوں نے اخباری نمایندوں کو بتایا کہ ہم نے اپنے بچپن میں سنا تھا کہ یہاں کبھی قبرستان تھا اور اس میں ایک بڑی تعداد اسلام پھیلنے کے ابتدائی ایام کے شہدا کی تھی۔ وہاں ایک مقبرہ بھی تھا۔ لیکن وہ مقبرہ کس کا تھا اس بارے میں وہ بھی بتا نہیں سکے۔ ان لوگوں کا کہنا ہے کہ یہاں ایک چشمہ ہوا کرتا تھا۔ جس کا پانی شیریں اور ٹھنڈا تھا۔ یہ علاقہ یمن کی گزرگاہ ہے، مدینہ منورہ سے آنے والے قافلے اسی راہ سے یمن جاتے تھے۔ تھکے ہارے، آتے جاتے مسافر یہاں کسی گھنے پیڑ کے نیچے بیٹھ کر آرام کیا کرتے تھے۔ اپنی پیاس بجھاتے تھے۔ مگر جب علاقے کی آبادی بڑھی تو یہاں گندگی پھیلنے لگی۔ قصبے کا گندا نالا بھی یہیں گرتا تھا۔ شاید گندگی کی وجہ سے آہستہ آہستہ چشمہ سوکھتا رہا، اب تو یہ ایک بنجر میدان ہے۔ پھر یہاں ایک مذبحہ خانہ بھی بنایا گیا جس کی وجہ سے گندگی مزید بڑھ گئی اور چشمہ بالکل سوکھ گیا۔ قبرستان کا وجود بھی مٹ گیا۔

سرکاری فائلوں میں اس علاقے کے بارے میں ایک رپورٹ ملتی ہے۔ اس رپورٹ کے مطابق تقریباً پون صدی قبل اس علاقے کے ایک شخص محمد صالح الباقتی نے مفتی اعظم شیخ ابن باز سے فتویٰ طلب کیا تھا۔ اس نے مفتی اعظم کو لکھا تھا کہ یہاں ایک مصلہ ہے جو ایک مقبرے کے احاطہ میں واقع ہے، کیا میں اس مصلے پر نماز پڑھ سکتا ہوں۔ مفتی اعظم نے مصلے کا مقبرے میں ہونے کی وجہ سے نماز پڑھنے سے منع کردیا تھا۔ اس فتوے کی وجہ سے اس بات کا ثبوت مل جاتا ہے کہ اس علاقے میں کبھی کوئی مقبرہ تھا۔

علاقے کے لوگوں نے یہ بھی بتایا کہ اس میدان میں عرصہ قبل بہت پُرانی شکستہ، کہن سالہ قبریں تھیں جو حوادث زمانہ کی نذر ہوگئیں۔ کچھ لوگوں نے اخباری نمایندوں کو یہ بھی بتایا کہ اس علاقے میں دوپہر کے وقت طویل سائے دیکھے گئے ہیں۔ اس علاقے کے ایک معتبر شخص حسن عوضہ شہرانی نے اخباری نمایندے کو بتایا کہ دن کے وقت بھی یہاں ایسا لگتا ہے جیسے طویل القامت افراد آجا رہے ہیں، کپڑوں کی سرسراہٹ جیسی آوازیں بھی سنائی دیتی ہیں۔ کبھی کبھی گھوڑوں کی ہنہناہٹ بھی سنائی دے جاتی ہے۔

پہلے یہاں کافی سارے گھنے درخت تھے مگر جب گندگی پھیلنے لگی تو درخت سوکھنے لگے۔ روایت ہے کہ یہاں ایسی بہت ساری قبریں ہیں جو اسلام کے ابتدائی دور میں راہِ حق کے شہیدوں کی ہیں، یہ علاقہ سعودی علاقوں میں سب سے ٹھنڈا علاقہ ہے اور یہاں برفباری بھی کبھی کبھی ہوجاتی ہے۔ پہاڑی علاقہ ہونے کی وجہ سے لوگ گرمیاں گزارنے یہاں آتے رہتے تھے۔ یمن کی سرحد نزدیک ہونے کی وجہ سے یمن جانے والے قافلے یہاں ٹھہر کر ستانا ضروری سمجھتے تھے، اب جب آبادی میں اضافہ ہوا تو اس علاقے کی خوبصورتی کم ہوتی چلی گئی۔ یمن کی سرحد سے اس قصبے تک کل انتیس بڑے اور مشہور ہوٹل ہیں۔ اس میدان کی کھدائی بھی ایک ہوٹل کی تعمیر کے لیے جاری تھی کہ لاشیں نکل آئیں اور تمام کام بند ہوگیا۔ حکومت نے لاش کو نہایت خفیہ انداز میں کہیں دفن کرادیا ہے کیونکہ یہاں قانوناً جرم ہے کسی مزار پر جانا۔ اس علاقے کے میئر عبداللہ زہرانی نے اخباری نمایندوں کو بتایا ہے کہ انہیں اطلاعات ملی ہیں کہ اس علاقے میں شہدائے اسلام کی قبریں موجود ہیں۔ اس لیے ہم نے مذکورہ مقام کی حد بندی کا حکم دیا ہے۔ تاہم بلدیہ کی کمیٹی کی جانب سے اس معاملے میں اعلیٰ حکام، متعلقہ محکمہ جات، مفتی اعظم سے رجوع کیا گیا ہے۔ اب وہی سب اس بارے میں فیصلہ کریں گے۔

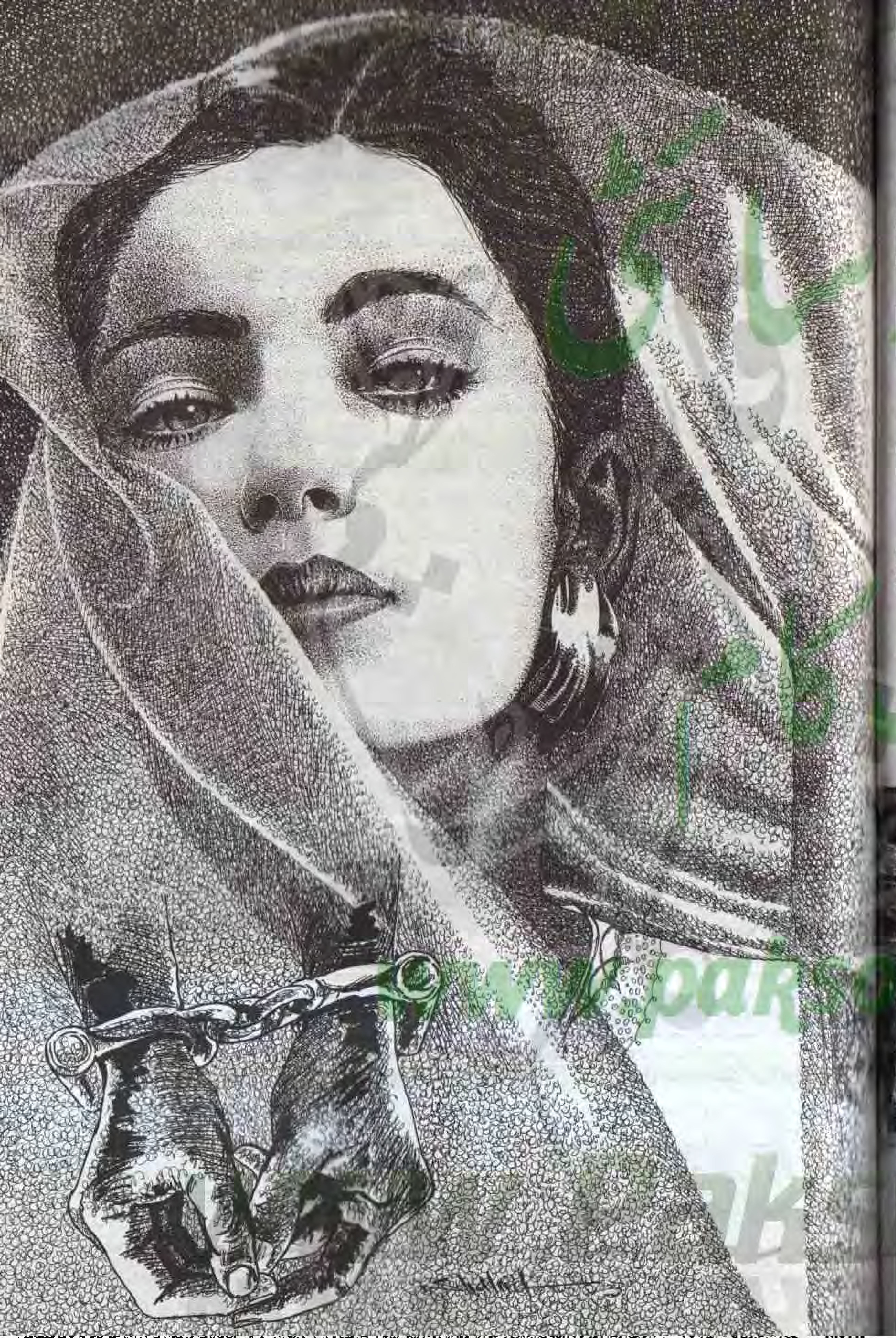

سراب

راوی : شهبازملک

تحریر: کاشف زبیر

81

وہ پیدائیشی مهم جو تھا۔ بلند وبالا پہاڑ، سنگلاخ چٹانیں، برف پوش چوٹیاں اور نگاہ کی حدوں سے آگے کی بلندیاں اسے پیاری تھیں۔ اسے ان میں ایك کشش اور ایك للکارسی ابھرتی محسوس ہوتی کہ آؤ ہمیں دیکھو مسخر کرو اور ہمارے سحر ے میں مسحور ہو کر اپنا آپ مٹا ڈالو۔ اسے یہ سب حقیقت لگتا مگر کیا واقعی یہ حقیقت تھا یا محض سراب ایسا سراب جو آنکھوں کے راستے ذہن ودل کو بھٹکاتا ہے، جذبوں کو مہمیز دیتا ہے مگر اسودگی اور اطمینان چھین لیتا ہے۔ سیرابی لمحوں کے فاصلے پر دکھائی دیتی ہے مگر وہ لمحہ حقیقت میں کبھی نہیں آتا۔ اس کی زندگی بھی سرابوں کے ایسے دائروں میں گزری اور گزرتی رہی۔ وقت کے گرداب میں ڈوبتے ہوئے نوجوان کی سنسنی خیز اور ولولہ انگیز داستان حیات۔

بلند حوصلوں اور بے مثال ولولوں سے گندھی ایک تہلکہ خیز کہانی

گزشتہ اقساط کا خلاصہ

بابا کا اصرار تھا کہ مجھے کیڈٹ کالج بھیج دیا جائے جبکہ میں آرمی میں نہیں جانا چاہتا تھا۔ اس دور میں میرے لیے واحد اچھی یاد سویرا ہے جو میرے دل کا حصہ تھی لیکن وہ میرے بھائی کا مقدر بنا دی گئی اور میں ہمیشہ کے لیے حویلی سے نکل آیا۔ یہاں سے

زندگی کا دوسرا دور شروع ہوا۔ تعلیم مکمل کر کے میں نے کاروبار شروع کیا۔ سفیر، موتا اور ندیم جیسے دوست ملے لیکن ایک روز مری سے واپس آتے ہوئے نادر علی کا ہم سے ٹکراؤ ہو گیا پھر یہ ٹکراؤ ذاتی انا میں بدل گیا۔ دشمنی اور دربدری کا ایک سلسلہ شروع ہوا جو دراز ہوتا چلا گیا۔ ایک طرف سرشد علی، فتح خان اور ڈیوڈ شا جیسے لوگ میرے دشمن ہو رہے تھے تو دوسری طرف سفیر، ندیم اور وسیم جیسے جاں نثار دوست بھی تھے۔ اس کے بعد ہنگاموں کا ایک طویل سلسلہ شروع ہو گیا جس کی کڑیاں سرحد پار تک چلی گئی تھیں۔ میں دوبارہ اپنے وطن لوٹا تو فتح خان سے ٹکراؤ ہو گیا۔ اس کے آدمیوں کو شکست دے کر میں اندرونِ ملک آ گیا۔ میری بھانجی تمی اپنے ددھیال جارہی تھی کہ اس کی کار پر فائرنگ ہوئی۔ فائرنگ سے اس کا منگیتر زخمی ہو گیا۔ میں زرین کو لے کر سیر کے لیے نکلا تھا کہ دشمنوں نے گھیر لیا۔ ان سے بچتے بچاتے ہم نکلے تو راستہ بھٹک کر ایک ایسے علاقے میں پہنچ گئے جو مری وغیرہ کی طرف جاتا تھا۔ ہماری گاڑی بھی خراب ہو گئی۔ ایک ڈاکٹر نے آبادی تک پہنچانے کا وعدہ کر لیا۔ ہم اس کے ساتھ اس کے بنگلے پر پہنچے تو احساس ہوا کہ ہم قید ہو چکے ہیں۔ زرین کی طبیعت بھی خراب ہو گئی تھی۔ بعد میں پتا چلا کہ ڈاکٹر نے ہم پر ایک خطرناک وائرس کا تجربہ کیا ہے۔ زرین جانبر نہ ہو سکی۔ تبھی ڈیوڈ شا آ گیا۔ وہ ڈاکٹر کا فنانسر تھا۔ اس نے مجھے رہا کرا لیا اور کہا کہ اگر تم مجھے پُراسرار وادی تک پہنچا دو تو میں مرشد سے بھی گلوخلاصی کرا دوں گا۔ اس کے بعد شا نے مجھے اپنے ایک آدمی مارشل کے ساتھ کر دیا کہ وہ مجھے شہر چھوڑ آئے مگر راستے میں ہی اس کی نیت بدل گئی۔ وہ دروازہ کھول کر نیچے کودا۔ وہ پستول سے فائر کرتا کہ ایک کتے نے مارشل کے پستول والے ہاتھ پر منہ مارا تھا۔ براؤن نامی وہ کتا موتا کا تھا۔ سفیر وغیرہ اس کی مدد سے مجھ تک پہنچے تھے۔ ان کے ساتھ میں شہر آ گیا۔ ہم اس بنگلے میں پہنچے جہاں وہ لوگ ٹھہرے ہوئے تھے، موتا و سادھنا کو عبداللہ والے بنگلے پر پہنچانے کا انتظام کیا پھر شہلا کی تلاش میں نکلے۔ شہلا کو راضی کیا کہ وہ مجھے بینک کے لاکر تک پہنچا دے تاکہ میں جائنیز بریف کیس حاصل کر لوں۔ وہ مجھے لے کر اپنے بنگلے پر پہنچی۔ ہم دیوار پھاند کر اندر پہنچے تھے کہ شہلا نے پستول نکال کر کہا کہ تمہارا کھیل ختم ہو گیا۔ میں نے اسے قابو کیا اور راضی کر لیا کہ وہ بینک کا لاکر کھلوانے میں ہماری مدد کرے گی مگر اس پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا تھا اس لیے اس کے پیروں میں نقلی بم باندھ کر کہا کہ یہ ریموٹ سے پھٹ سکتا ہے اگر تم نے غلط حرکت کی۔ تبھی اس نے عجیب حرکت کی اور اپنا پیر میرے پیروں میں پھنسا کر بولی "میرے ساتھ تم بھی مرو گے۔" بڑی مشکلوں سے اسے سمجھایا کہ یہ صرف احتیاطاً کیا ہے کیونکہ گزشتہ بار اس نے دھوکا کیا تھا۔ وہ اسی حالت میں بینک جانے کے لیے راضی ہو گئی۔ ہم بینک میں سیف سے بریف کیس نکال چکے تھے کہ باہر سے اطلاع آئی کہ کچھ لوگ ہمیں گھیر رہے ہیں۔ ہم باہر نکلتے کہ شہلا نے پستول سے وسیم کو نشانے پر لے لیا۔ تب پتا چلا کہ شہلا نے فتح خان کے آدمیوں کو بلا لیا ہے۔ وہ مجھے یرغمال بنا کر فتح خان کے گھر میں لے آئی۔ وہاں ایک خانہ بدوش عورت کو فتح خان کے آدمی پکڑ لائے تھے اور اس کی عزت سے کھیل رہے تھے کہ خانہ بدوش چڑھ دوڑے، انہوں نے لڑکی کو بھی برآمد کر لیا تھا۔ وہ عورت کی عزت لوٹنے والے کو قتل کر کے ہمیں سزا سنانے آئے تھے کہ ایک جیپ آندھی طوفان کی طرح داخل ہوئی۔ وہ فتح خان کی تھی۔ فتح خان نے خانہ بدوشوں کو بھگا دیا۔ تب میں نے دیکھا کہ اس کے ساتھ سویرا بھی ہے۔ وہ اسے اغوا کر لایا تھا۔ پھر اس نے مجھے مجبور کر دیا کہ سویرا کو حاصل کرنے کے لیے مجھے ڈیوڈ شا کے ہیرے تلاش کر کے دینے ہوں گے، میں ہیروں کی تلاش میں نکل پڑا۔ اس نے میری جیکٹ پر ایک چپ چپکا دی تھی۔ جو میرے بارے میں مطلع کر رہا تھا۔ میں نے اس عورت کو بدلا نے کے لیے فرار کرا دیا۔ تب فتح خان، برٹ شا کو لے آیا جو پاگل ہو چکا تھا۔ پھر اس نے میری طرف سے میل کر کے ایمن کو بلوا لیا۔ وہ دور رہ کر ہم پر نظر رکھے ہوئے تھا کہ فتح خان کے آدمیوں پر فائرنگ شروع ہو گئی۔ برٹ شا نے میرے پستول سے فتح خان کو نشانے پر لیا تھا کہ اس کے آدمی نے برٹ شا کو گولی ماردی۔ مرتے وقت برٹ شا بڑبڑایا "نارتھ...... بکسٹ کرنے لگا۔ (اب آگے پڑھیں)

دم توڑتے برٹ شا نے جو کہا تھا وہ اتنی ہلکی آواز میں تھا کہ مجھے بھی بہ مشکل سنائی دیا تھا۔ فتح خان خاصا دور تھا اس کے سننے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ ویسے بھی وہ اپنے ساتھی کو آنجہانی کرنے میں مصروف تھا۔ فتح خان کا آدمی تڑپ رہا تھا اور کچھ ہی دیر میں برٹ شا کے پیچھے روانہ ہونے والا تھا۔ اس دوران میں برٹ شا دم توڑ چکا تھا۔ اس کا منہ کھلا تھا اور اس سے رہ رہ کر خون رس رہا تھا۔ دل کی اوپری مرکزی شریان میں لگنے والی گولی نے چند لمحے میں اس کی جان لے لی تھی۔ فتح خان برسوں سے اس امید میں اسے برداشت کر رہا تھا کہ وہ بالآخر اسے ہیروں کا پتا بتا دے گا لیکن اس کے نادان ساتھی نے ایک سیکنڈ میں اس کی یہ امید ختم کر دی تھی۔ اب خود بھی ختم ہو گیا تھا۔ اس نے ایک آخری جھٹکا لیا اور اوندھے منہ ہو گیا۔

دیکھا جائے تو فتح خان خود اپنے بچھائے جال میں آ گیا

تھا اس نے ڈراما کر کے اپنے آدمیوں کی مدد سے ایک ناکارہ پستول مجھے دے دیا اور شاید یہ بات اپنے دوسرے ساتھیوں کو نہیں بتائی تھی۔ اس لیے فتح خان کا آدمی اسے سچ مچ کا پستول اور فتح خان کو خطرے میں دیکھ کر بوکھلا گیا اور اس نے برٹ شا پر گولی چلا دی۔ خود فتح خان کے وہم و گمان میں بھی ایسی سچویشن نہیں ہوگی۔ بلکہ مجھے بھی خیال نہیں آیا تھا کہ برٹ شا جس سے ہلا بھی نہیں جا رہا تھا اس وقت ایسی پھرتی اور چالاکی کا مظاہرہ کرے گا۔ مجھے اور فتح خان کو اُلجھا چھوڑ کر وہ خاموشی سے غار میں گیا اور پستول نکال لایا۔ میگزین وہ پہلے ہی میری جیکٹ سے کسی وقت نکال چکا تھا اور اپنے تئیں مسلح ہو کر اس نے فتح خان پر چڑھائی کی اور مارا گیا۔ اس کی پھرتی اور چالاکی خود اسے مہنگی پڑ گئی تھی۔

برٹ شا کی موت پر فتح خان کے چہرے پر نہایت خوف ناک تاثرات تھے۔ اس نے اپنے ساتھی کو بلا تامل شوٹ کر دیا تھا اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ برٹ شا کی موت اس کے لیے کتنا بڑا صدمہ ہے۔ میں نے اس سے کہا۔ "فتح خان اب کیا ہوگا ہیروں کے بارے میں صرف یہی جانتا تھا۔" میں نے برٹ شا کی طرف اشارہ کیا تو اس نے رائفل کا رُخ میری طرف کر دیا اور کاٹ کھانے والے انداز میں غرایا۔

"شہباز خان، اب ہیرے تم تلاش کرے گا۔"

"احمقانہ باتیں مت کرو اور پہلے یہ بتاؤ کہ تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ میں برٹ شا سے اگلوانے کی کوشش کر رہا تھا؟"

"بس میرے کو معلوم ہو گیا۔" اس نے مجھے گھورتے ہوئے کھوکھلے لہجے میں کہا۔ "شہباز خان تم نے اچھا نہیں کیا۔ تم سوچ بھی نہیں سکتا اس خنزیر نے مر کر میرا کتنا بڑا نقصان کیا ہے۔"

"نقصان اس نے نہیں تمہارے آدمی نے کیا ہے۔" میں نے تصحیح کی۔ "اس نے گولی مار کر برٹ شا کا خاتمہ کر دیا اور میں نے بھلا کیا کیا ہے؟"

وہ کچھ دیر مجھے گھورتا رہا اور پھر اس نے دوبارہ واکی ٹاکی پر اپنے ساتھیوں سے رابطہ کرنے کی کوشش کی لیکن دوسری طرف خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا کہ فتح خان کا کوئی آدمی جواب دینے کے لیے زندہ نہیں رہا تھا۔ اس نے غصے میں واکی ٹاکی زمین پر پٹخ دیا اور رائفل کا رُخ دوبارہ میری طرف کر دیا۔ "شہباز خان یہ تمہارا کوئی چال ہے۔ تم نے برٹ شا کو کپڑے اُتار کر میرے کو مجبور کیا کہ میں یہاں آؤں اور پیچھے سے کسی نے میری ساتھیوں پر حملہ کر دیا۔"

"بھلا میں نے تمہیں کیسے مجبور کر دیا؟"

"تم جانتا ہے کہ تمہارا جیکٹ کا کالر میں چپ لگا ہے اس سے میں تمہارا بات سنتا ہے۔ اس لیے تم نے یہ چکر کیا۔ اِدھر میں نکلا اُدھر پیچھے سے تمہارے آدمیوں نے میرے آدمیوں پر حملہ کر دیا۔ شاید اُدھر سب مارا گیا ہے۔"

میں نے بے بسی سے ہاتھ پھیلائے۔ "میں تمہارے قابو میں ہوں اپنے ساتھیوں سے کس طرح رابطہ کر سکتا تھا اور دوسرے تم جو چاہے مجھ پر الزام لگانے کے لیے آزاد ہو۔"

"یہ الزام نہیں ہے، میں بے وقوف تھا جو سمجھا کہ تم قابو میں ہے لیکن تم بہت ہوشیار آدمی ہے۔ اپنے آدمی بلانے کے لیے تم نے مہرو کو بھیجا اور اس کا چپ ضائع کر دیا۔ اس طرح میرے آدمی کو پتا نہیں چلا وہ کدھر گیا ہے۔ وہ گیا اور تمہارے ساتھی کو بلا لایا۔"

مجھے حیرت ہوئی اس نے تقریباً ٹھیک تجزیہ کیا تھا۔ صرف اتنا فرق تھا کہ میں نے مہرو کو راجا عمر دراز کی طرف بھیجا تھا اور اگر کسی نے سچ مچ فتح خان کے پڑاؤ پر حملہ کیا تھا تو وہ راجا عمر دراز کے آدمی ہو سکتے تھے۔ مگر میں نے ٹھوس لہجے میں تردید کی۔ "یہ تمہاری سوچ ہے فتح خان جو تمہیں مایوسی کے عالم میں ناکامی کی وجوہات بتا رہی ہے۔ ورنہ حقیقت یہ ہے مہرو یہاں سے چپکے سے فرار ہوئی ہے اور میں ان سات آٹھ دنوں میں مکمل طور پر تمہاری نگرانی میں رہا ہوں۔ میں نہ تو اپنے کسی ساتھی سے رابطہ کر سکتا ہوں اور نہ ہی اس قسم کا منصوبہ بنا سکتا ہوں کہ تمہیں یہاں بلاؤں اور پیچھے تمہارے ٹھکانے پر حملہ ہو جائے۔ تم سوچو اگر میرا اپنے آدمیوں سے رابطہ ہوتا تو کیا اس وقت میں نہتا تمہارے سامنے کھڑا ہوتا۔ میں آتے ہی تمہیں قابو کر لیتا اور اس کے بعد سویرا کا پتا بھی چلا لیتا لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ سب جتنا تمہارے لیے غیر متوقع ہے اتنا ہی میرے لیے بھی غیر متوقع ہے۔"

میرے مدلل جواب نے فتح خان کو سوچنے پر مجبور کر دیا تھا پھر اس نے سر جھٹکا۔ "شہباز خان ابھی میرا دماغ کام نہیں کر رہا ہے۔ ابھی میں تمہیں لے جائے گا اور اگر تمہارا ساتھی ہوا تو پہلے تمہیں گولی مارے گا۔ قتل نہیں کرے گا بلکہ تمہارا دونوں گھٹنا توڑ دے گا پھر تم کبھی اپنے پیروں پر نہیں چل سکے گا۔ پھر سویرا کو مرشد کے حوالے کرے گا۔"

میں نے سرد لہجے میں کہا۔ "فتح خان تم بلاوجہ میرے پیچھے پڑ گئے ہو۔ فرض کر لو کہ یہ میرے ساتھی ہیں تب بھی مجھے حق پہنچتا ہے کہ میں اپنے دفاع میں جو مناسب سمجھوں وہ کروں جیسے تم جو مناسب سمجھ رہے ہو وہ کر رہے ہو۔ اب تم

مجھے دھمکیاں مت دو جو تم نے کرنا ہے وہ کرلو اگر میرے مقدر میں بچنا لکھا ہے تو پھر میں تمہیں دیکھ لوں گا۔"
"تم دیکھے گا۔" فتح خان نے رائفل سے اشارہ کیا۔ "اب اُدھر چلو دیر مت کرو۔"
"فتح خان میری ایک بات سنو!" میں نے اپنی جگہ سے حرکت کیے بغیر کہا۔ "میری ایک بات سن لو!"
وہ رک گیا۔ "بولو پر جلدی کرو۔"
"فتح خان برٹ شا مارا گیا ہے اور اب ہیرے ملنے کا کوئی امکان باقی نہیں رہا ... برٹ شا کو تمہارے آدمی نے مارا اور تم نے اسے مار کر اپنا غصہ اُتار لیا۔ اب مجھے، سویرا اور ایمن کو آزاد کردو۔ ہمیں نقصان پہنچا کر بھی تمہیں کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ ہاں اگر تم مجھ سے معاہدہ کرلو۔ ہمارا مشترک دشمن مرشد ہے تو تمہیں اس کا فائدہ ہوسکتا ہے۔"
"اس پر میں بعد میں غور کرے گا پہلے تم یہاں سے چلو۔" اس نے قطعی لہجے میں کہا اور مجھے اس کے حکم کی تعمیل کرنی پڑی تھی۔ فتح خان نے مجھے آگے رکھا تھا اور خود میرے پیچھے چل رہا تھا۔ برٹ شا اور فتح خان کے آدمی کی لاش وہیں پڑی رہ گئی تھی۔ چند منٹ پہلے یہ دونوں جیتے جاگتے انسان تھے۔ میں برٹ شا کے آخری الفاظ پر غور کرنا چاہتا تھا لیکن فی الحال فتح خان کا مسئلہ زیادہ اہم تھا۔ وہ کہہ چکا تھا کہ اس کے ٹھکانے پر حملہ کرنے والوں کا مجھ سے کوئی تعلق ثابت ہوا تو وہ مجھے چھوڑے گا نہیں اور سویرا کے حوالے سے بھی اپنی دھمکی پر عمل کرے گا میں فتح خان کو غیر سنجیدگی سے نہیں لے سکتا تھا۔ میرے پاس چھوٹی ٹارچ تھی اور اس کی روشنی میں راستہ واضح دکھائی دے رہا تھا۔ فتح خان مجھے آگے رکھتے ہوئے وادی کے داخلی حصے کی طرف لے جارہا تھا۔ فائرنگ کی آواز بھی اسی حصے کی طرف سے آتی محسوس ہوئی تھی۔ وہ خود مجھ سے کوئی دس قدم دور تھا۔
"فتح خان کیا یہ حماقت نہیں ہے کہ تم مجھے اس طرف لے جارہے جہاں تمہارے ساتھیوں کے ساتھ ذرا دیر پہلے کچھ ہوچکا ہے۔ وہاں دشمن کی موجودگی عین ممکن ہے۔ کیا وہ تمہیں اور مجھے چھوڑ دیں گے؟"
"میں یہی تو دیکھنا چاہتا ہے۔" فتح خان نے عقب سے کہا۔ "اگر اس نے تم کو کچھ نہیں کہا تو اس کا مطلب ہے وہ تمہارا ساتھی ہے اس صورت میں ہم وہی کرے گا جو بولا ہے۔ برسٹ مار کر تمہارا دونوں گھٹنے توڑ دے گا۔"
میں رک گیا۔ "کیا مطلب؟"
"مطلب تم سمجھ رہا ہے۔"
میں بھنا گیا تھا۔ "فتح خان تم شاید پاگل ہوگئے ہو۔ یعنی اگر کوئی دوسرا مجھے گولی نہیں مارے گا تو تم ماردو گے۔ اس سے زیادہ احمقانہ بات میں نے آج تک نہیں سنی۔"
"اس سے پتا چلے گا کہ وہ تمہارا ساتھی ہے یا نہیں۔" فتح خان اپنی دھن میں کہہ رہا تھا۔
"تم شاید ہیروں کے غم میں عقل کھوچکے ہو۔ میں کسی صورت اب آگے نہیں جاؤں گا۔" میں نے کہا تو فتح خان چوکنا ہوگیا اور غرانے لگا۔
"شہباز خان میں سچ کہتا ہے گولی مار دے گا۔"
"ماردو لیکن میں اس طرح کسی اندھی موت کا سامنا نہیں کرسکتا اور مجھے مار کر تم بھی نہیں بچو گے۔ تم نے میرے ساتھ دشمنی کی انتہا کردی ہے۔" مجھے سچ مچ غصہ آگیا تھا۔ "تمہارے لیے میرے اور میرے ساتھیوں کے دل میں جو ذرا گنجائش تھی اسے ختم سمجھو اور اب تم نے جو کرنا ہے کرلو میں آگے نہیں جاؤں گا۔"
"میں گولی ماردوں گا۔" فتح خان غرّایا۔
"آگے بھی میرے لیے زندگی نہیں ہے۔" میں نیچے بیٹھ گیا۔ "میرا مشورہ ہے کہ تم بھی بیٹھو اور ذرا ٹھنڈے دل سے صورتِ حال پر غور کرو۔ برٹ شا کی موت نے تمہاری سوچنے سمجھنے کی صلاحیتوں پر اثر ڈالا ہے۔ اگر فرض کرلو آگے میرے ساتھی ہوئے تو وہ اتنے احمق نہیں بغیر دیکھے بھالے مجھے گولی ماردیں اور تمہیں بخش دیں۔ امکان یہی ہے کہ تم مارے جاؤ گے اور اتنا کچھ ہونے کے باوجود میری خواہش نہیں ہے کہ تم مارے جاؤ۔"
"کیوں؟" فتح خان نے مجھے گھورا۔
"کیونکہ مجھے سویرا کی فکر ہے اور وہ تمہارے قبضے میں ہے، اگر تم مارے گئے تو پتا نہیں اس کا کیا ہوگا؟"
اس بار فتح خان مسکرایا۔ "تم عقل مند ہے دور کا سوچتا ہے۔"
"شاید اسی لیے اب تک بچا ہوا ہوں۔ زندگی اور موت کے کھیل میں عقل فیصلہ کن کردار ادا کرتی ہے۔ جو لوگ عقل سے کام نہیں لیتے... وہ جلد مارے جاتے ہیں۔"
فتح خان سوچ میں پڑ گیا اور پھر مجھ سے ذرا دور ایک پتھر سے ٹک گیا، اس نے مجھ سے ٹارچ بجھانے کو کہا تھا اور رائفل کا رُخ میری طرف ہی رکھا تھا۔ ابھی ہم وادی کے داخلی حصے سے دور تھے۔ فتح خان نے اپنے ساتھیوں سمیت وہیں کہیں ٹھکانا بنا رکھا تھا۔ اس کے ساتھی نامعلوم افراد کے حملے میں مارے گئے تھے یا مغلوب ہوگئے تھے دونوں

صورتوں میں وہ فتح خان کے کسی کام کے نہیں رہے تھے۔ یہ بات فتح خان سمجھ رہا تھا بس اس کی سمجھ میں یہ نہیں آرہا تھا کہ حملہ آور کون ہوسکتے تھے اور وہ میرے ساتھ کیا کرے گا؟ اس نے حالات کا بالکل درست تجزیہ کرلیا تھا کہ میں نے کس طرح اسے اپنے پاس آنے پر مجبور کیا تھا۔ اس کے نتیجے میں برٹ شا مارا گیا لیکن پیچھے اس کے ٹھکانے پر کس نے حملہ کیا تھا اس کا مجھے بھی علم نہیں تھا۔ میں فتح خان کی نگرانی میں تھا اور میرے پاس کسی سے رابطے کے لیے کوئی چیز نہیں تھی۔
وہ صرف شک کرسکتا تھا یقین سے مجھ پر الزام نہیں لگا سکتا تھا، اسے شک ہی تھا ورنہ وہ اب تک مجھے بھی گولی مار چکا ہوتا۔ برٹ شا کی موت شاید اس کی زندگی کا سب سے بڑا سانحہ تھا۔ وہ اسے ہیروں کا پتا بتائے بغیر مرگیا تھا۔ فتح خان بے خبر تھا کہ برٹ شا نے مرنے سے پہلے دو الفاظ کہے تھے۔ "شمال... سب سے بڑا تنا" اردو میں اس کے یہی معنی بنتے ہیں۔ انگریزی کا لفظ ٹرنک کئی معنوں میں استعمال ہوتا ہے لیکن اس وادی میں یہ صرف درخت کے تنے کے لیے استعمال کیا جاسکتا تھا۔ وہ راز جو برٹ شا گزشتہ ایک عشرے سے بھی زیادہ وقت سے اپنے سینے میں چھپائے ہوئے تھا۔ موت کو سامنے پا کر اس نے ایک لمحے میں میرے سامنے اُگل دیا۔ اس توقع اور امید کے ساتھ کہ میں اس کا کوئی غلط فائدہ نہیں اُٹھاؤں گا۔ فتح خان کو ذرا سا بھی شک ہوجاتا کہ برٹ شا نے مرنے سے پہلے مجھے کچھ کہا ہے تو اس وقت اس کا رویہ بالکل مختلف ہوجاتا۔
فتح خان سوچ رہا تھا اور میں اسے دیکھ رہا تھا کہ اچانک ایک کھڑکھڑاہٹ ہوئی اور پھر کسی نے مقامی لہجے میں فتح خان کو پکارا۔ "فتح خان تم کہاں ہو؟ اپنے ہتھیار پھینک کر سامنے آجاؤ ورنہ صبح تمہیں کسی چوہے کی طرح گھیر لیا جائے گا۔"
بولنے والا میگا فون پر بول رہا تھا اور آواز وادی میں اس طرح گونج رہی تھی کہ اس کا اندازہ کرنا بھی دشوار تھا کہ وہ کہاں سے بول رہا ہے؟ میں اپنی جگہ ساکت رہا۔ جب اعلان دوسری بار ہوا تو میں نے مڑ کر فتح خان کی طرف دیکھنا چاہا اور دنگ رہ گیا وہ اپنی جگہ نہیں تھا بلکہ آس پاس جہاں تک نظر جاتی تھی فتح خان غائب تھا۔ اسے غائب دیکھتے ہی میں تیزی سے اس چٹان کی آڑ میں ہوگیا۔ فتح خان غائب ہوا تھا لیکن اس سے یہ امید نہیں تھی کہ وہ یہ اعلان سنتے ہی فرار ہوجائے گا۔ وہ کہیں روپوش ہوا تھا کیونکہ میرے ساتھ ہوتا تو نظروں میں آنے کا امکان زیادہ ہوجاتا۔ وہ اکیلے رہ کر اپنا بہتر تحفظ کرسکتا تھا اگر میرے ساتھ ایسی صورتِ حال درپیش

"زندہ ہر بشر کو موت [illegible] لازم ہے [illegible] فرار
سے فرار کا شیوہ [illegible] نہیں اپنانا [illegible] موت کو ہر دم یاد
رکھتے ہوئے اسے زندگی سے قریب اور قریب تر کرنے
کی سعی کرنی چاہیے تاکہ موت کی رفاقت بھی راست
زندگی کی طرح خوش گوار بن سکے۔ موت کو یاد کرنا اس لیے
سے بہتر ہے کیونکہ جب موت قلب و نظر کے ہمہ وقت
موجود ہوگی تو زندگی کی قدر و قیمت کا احساس دوچند
ہوجائے گا۔ زندگی کو یاد کرنے سے زیادہ ڈرنا چاہیے کہ
کہیں زندگی داغ نہ بن جائے۔ داغ دار زندگی آدمیت
کو ختم کردیتی ہے اور جب آدمیت ختم ہوجائے تو آدمی
زندہ رہتے ہوئے بھی مرجاتا ہے۔"
اقتباس: کیا ہم سچ بولتے ہیں از نوشاد عالم چشتی علیگ
مرسلہ: فرزانہ، لاڑکانہ

ہوتی تو میں بھی یہی کرتا۔
میں نے محسوس کیا کہ اسی جگہ پڑے رہنا ٹھیک نہیں ہے فتح خان جانتا ہے کہ میں کہاں ہوں اس لیے مجھے یہاں سے دور کسی محفوظ جگہ چلے جانا چاہیے۔ میں اُٹھے بغیر سرد ترین زمین پر رینگنے لگا۔ یہ مشکل کام تھا لیکن جان خطرے میں ڈالنے کی نسبت آسان ہی تھا۔ کچھ دیر بعد میں اس جگہ سے خاصا دور نکل گیا تھا۔ ایک جگہ کچھ جھاڑیاں دیکھ کر میں ان میں دبک گیا۔ یہاں سانپ بچھو کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اس موسم میں کیڑے مکوڑے بھی نہیں پائے جاتے ہیں۔ میگا فون پر اعلان کرنے والا وقفے وقفے سے اپنے الفاظ دُہرا رہا تھا۔ پہلے تو وہ فتح خان کو ہی مخاطب کرتا رہا تھا پھر اس نے ایک نئی بات کی۔
"فتح خان یا جو بھی سن رہا ہے ہاتھ اُٹھا کر سامنے آجائے اسے کچھ نہیں کہا جائے گا۔"
مجھے لگا جیسے یہ اعلان میرے لیے ہی کیا گیا ہے۔ کیا وہ جانتے تھے کہ فتح خان کے ساتھ کوئی اور بھی تھا۔ ہر چند منٹ بعد یہ اعلان دُہرایا جانے لگا۔ بولنے والا اسی علاقے کا تھا اگرچہ اس کی اردو صاف تھی لیکن لہجے میں مقامی رنگ جھلک رہا تھا۔ میں اس پر اعتماد کرنے کے لیے تیار نہیں تھا ممکن ہے میں ہاتھ اُٹھا کر سامنے آتا تو مجھے گولی ہی ماردی جاتی۔ اگر وہ سچ مچ ہمدرد ہوتے تو امکان تھا کہ کہیں سے فتح خان مجھے شوٹ کردیتا۔ اس کے پاس طویل فاصلے پر مار کرنے والی رائفل تھی۔ میری عافیت اسی میں تھی کہ خاموشی سے اسی جگہ دبکا رہوں۔ غار اور الاؤ سے دور ہونے کے بعد سردی مزاج پوچھ

رہی تھی لیکن ان گرم کپڑوں میں یہ قابلِ برداشت بھی تھی۔ میں جھاڑیوں میں مزید گھس گیا یہاں سردی کا اثر کم تھا۔

اعلان کرنے والے نے آخری بار دھمکی دی کہ اگر فتح خان ان کے سامنے نہیں آیا تو اسے صبح تلاش کر کے مار دیا جائے گا۔ لیکن فتح خان یقیناً اتنا احمق نہیں تھا کہ صبح کا انتظار کرتا وہ روشنی ہونے سے پہلے یہاں سے کہیں دور نکل جاتا۔ اچانک مجھے خیال آیا اور میں نے جیکٹ کے کالر میں لگی چپ انگلیوں سے دبا کر توڑ دی۔ اب یہ بیکار تھی۔ فتح خان نہ تو میری پوزیشن معلوم کر سکتا تھا اور نہ میری باتیں سن سکتا تھا۔ مشکل سے دو گھنٹے میں وادی میں حالات بالکل بدل گئے تھے۔ فتح خان کی کمانڈنگ پوزیشن ختم ہوگئی۔ اس کے ساتھی مارے گئے۔ برٹ شا مارا گیا تھا اور اس سارے فساد کی جڑ یعنی ہیرے بدستور غائب تھے۔ ایمن کا مجھے نہیں معلوم تھا ممکن ہے وہ بھی اس تند و تیز حملے میں ماری گئی ہو کیونکہ فائرنگ مشکل سے چند منٹ جاری رہی تھی اور حملہ آوروں نے یقیناً فیصلہ کن پوزیشن حاصل کرلی تھی۔ اب مجھے سویرا کی فکر تھی۔ فتح خان یہاں سے نکل ہی جاتا اور سویرا اسی کے قبضے میں تھی۔ گویا میرے صورتِ حال میں صرف اتنی تبدیلی آئی تھی کہ میں فتح خان کی جسمانی قید میں نہیں رہا تھا۔ مگر سویرا کے حوالے سے میں بدستور اس کا قیدی تھا۔

اعلان کرنے والا ایک گھنٹے کے بعد خاموش ہوگیا۔ چاند مغرب کی طرف جھک رہا تھا اور کچھ بادل بھی نمودار ہو رہے تھے جب وہ چاند کے سامنے آتے تو وادی تاریکی میں ڈوب جاتی تھی۔ میں اونگھ رہا تھا کہ مجھے اچانک ہی فتح خان کے مارے جانے والے ساتھی کی رائفل کا خیال آیا۔ وہ وہیں پڑی تھی اور امکان یہی تھا کہ اب بھی وہیں پڑی ہوگی۔ اس کا خیال آتے ہی میں جھاڑی سے نکلا اور درختوں، پتھروں اور چٹانوں کی آڑ لیتا اس طرف روانہ ہوگیا۔ تقریباً بیس منٹ بعد میں چٹانوں کے درمیان تھا لیکن میں نے اس طرف سے داخل ہونے کی کوشش نہیں کی تھی۔ بلکہ دوسری طرف سے اندر گیا۔ جب بادل آجاتے اور تاریکی چھا جاتی تب میں حرکت کرتا۔ چٹانوں کے اندر سے ہوتا ہوا میں اس جگہ آیا جہاں فتح خان کے ساتھی اور برٹ شا کی لاشیں پڑی تھیں۔

یہ دیکھ کر میرے منہ سے ناگفتنی نکل گئی کہ فتح خان کے ساتھی کی رائفل اور دوسرے ہتھیار غائب تھے اور یہ یقیناً فتح خان کا کام تھا۔ برٹ شا کی لاش ایسے ہی پڑی تھی اسے کپڑے پہننے کی مہلت بھی نہیں ملی تھی۔ مجھے اچھا نہیں لگا کہ اس کی لاش تقریباً برہنہ پڑی رہے۔ وہ ایک انسان تھا اور اس انجام کو پہنچنے میں میرا بھی کچھ ہاتھ تھا۔ میں نے اس کے کپڑے جمع کر کے اسے پہنائے البتہ اس کی جگہ تبدیل نہیں کی تھی۔ مجھے معلوم تھا کہ فتح خان کے ساتھی کے پاس کچھ بھی نہیں ہوگا پھر بھی میں نے اس کی تلاشی لی۔ فتح خان کام کی تمام چیزیں نکال کر لے گیا تھا۔ میں اندر غار میں آیا وہاں سے کھانے پینے کی چیزیں جمع کر کے بیگ میں رکھنے لگا۔

اسی لمحے مجھے محسوس ہوا کہ باہر کہیں آہٹ ہوئی ہے میں نے تیزی سے ٹارچ بجھا دی اور خود سینے کے بل لیٹ کر رینگتا ہوا غار سے باہر آگیا۔ چاندنی کا اثر یہاں کم تھا ویسے بھی چاند مغرب کے افق کی طرف جھک گیا تھا اور روشنی پہلے جیسی نہیں رہی تھی۔ سائے طویل ہو رہے تھے۔ میں رینگتے ہوئے ایک چٹان تک آیا اور پھر اس سے لگ کر ساکت کھڑا ہوگیا۔ میں نے حتیٰ الامکان کوشش کی تھی کہ کوئی آواز نہ ہو۔ میرے کان کسی آواز پر مرکوز تھے۔ اس پہلی آہٹ کے بعد کوئی آواز سنائی نہیں دی تھی۔ کچھ دیر بعد مجھے محسوس ہونے لگا وہ آہٹ میرا وہم تھی۔ میں جس جگہ دبکا بیٹھا تھا وہ چٹانوں کے اندر تھی اور یہاں چاروں طرف بلند چٹانیں تھیں۔ یہاں درجنوں افراد بھی آجاتے تو مجھ پر آسانی سے قابو نہیں پا سکتے تھے۔

لیکن اس موقع پر وہ ہوا جس کا میں نے سوچا ہی نہیں تھا۔ اچانک ہی چٹانوں کے اوپر سے کوئی چیز ٹن ٹن کرتی ہوئی نیچے آئی اور مجھ سے کچھ فاصلے پر گری تھی اس سے دھواں خارج ہو رہا تھا۔ میں بدک کر پیچھے ہٹا لیکن فوراً ہی ایسی کئی چیزیں آس پاس چٹانوں میں آکر گریں۔ یہ گیس بم تھے جو بغیر کسی آواز کے پھٹ گئے تھے۔ میں سانس روک کر وہاں سے بھاگا مگر عجلت میں میرا پاؤں نہ جانے کس چیز سے اٹکا تھا اور میں اوندھے منہ گرا۔ گرتے ہوئے بے اختیار میں نے سانس لی اور فوراً ہی میرا ذہن چکرانے لگا تھا۔ اُٹھنے کی کوشش کی پر گیس اتنی سریع الاثر تھی کہ اس نے مجھے لمحوں میں بے دست و پا کر دیا۔ وہ لوگ یقیناً وہاں گھات لگائے بیٹھے تھے اور جیسے ہی میں ان کے گھیرے میں آیا انہوں نے بے ہوش کرنے والی گیس کے بم پھینک دیے۔ یہ سوچتے ہوئے میں نہ چاہتے ہوئے بھی دوسرا سانس لینے پر مجبور ہوا اور فوراً ہی میرا ذہن تاریکی میں ڈوبتا چلا گیا تھا۔ آخری احساس یہ تھا کہ کچھ لوگ میرے آس پاس چل رہے ہیں۔ وہ دھیمی آواز میں بول رہے تھے اس کے بعد مجھے ہوش نہیں رہا۔

☆☆☆

مجھے ہوش آیا تو میں ناقابلِ یقین حد تک نرم و ملائم بستر اور نہایت پرتعیش انداز میں سجے کمرے میں تھا۔ جب میں

گیس کے اثر سے بے ہوش ہو رہا تھا تو مجھے اندازہ نہیں تھا کہ یہ کام کس کا ہے۔ کیا میں دوبارہ فتح خان کے ہتھے چڑھ گیا تھا یا پھر یہ وہ تھے جنہوں نے فتح خان کو شکست دی تھی۔ ہوش میں آنے کے بعد مجھے اندازہ ہوا کہ میں شاید مخالف پارٹی کے ہاتھ آیا تھا۔ ورنہ فتح خان دولت مند تھا لیکن اس کے پاس اس قسم کی کوئی پرتعیش جگہ نہیں تھی وہ خود نارمل جگہوں پر رہنے کا عادی تھا۔ اس کے نزدیک عیاشی صرف شراب اور عورت کا نام تھا اسے ٹھکانوں سے خاص دلچسپی نہیں تھی۔ میں نے اسے کچھ اچھی جگہوں پر بھی دیکھا تھا لیکن عام طور سے اس کے ٹھکانے بس سر چھپانے کی جگہ ہوتے تھے۔

میرے جسم پر دوسرا اور صاف ستھرا لباس تھا اور میرے ہاتھ پاؤں سے ایسا لگ رہا تھا جیسے انہیں باقاعدہ صاف کیا گیا ہو۔ لباس معمول کے مطابق تھا اس کے باوجود مجھے سردی نہیں لگ رہی تھی کیونکہ کمرے میں درجہ حرارت نارمل تھا۔ میں فوری طور پر اندازہ کرنے سے قاصر تھا کہ میں کہاں آگیا تھا؟ میں اسی وادی کے آس پاس تھا یا مجھے نیچے کسی شہری علاقے میں منتقل کر دیا گیا تھا۔ یہاں دن رات کا بھی پتا نہیں چل رہا تھا۔ کمرے میں کوئی گھڑی جو نہیں تھی اور میری کلائی پر موجود گھڑی بھی غائب تھی۔ بلکہ سوائے لباس کے اور کچھ نہیں تھا۔ شاہانہ بیڈ کے سرہانے شیشے کی میز پر ایک بلوریں جگ اور گلاس رکھا تھا۔ جس میں کوئی گلابی رنگ کا مشروب موجود تھا۔ میں نے اسے تھوڑا سا گلاس میں ڈالا، سونگھ کر دیکھا۔ اس میں بڑی مسحور کن مہک آرہی تھی۔ پینے سے پہلے احتیاطاً اسے چکھا۔ ذائقہ بھی بہترین تھا مجھے الکوحل کا شبہ تھا لیکن اس میں ایسی کوئی چیز نہیں تھی۔ پیاس شدت کی تھی اس لیے میں یکے بعد دیگرے دو گلاس پی گیا۔ اگر اس میں کوئی بے ہوشی کی دوا شامل تھی تب بھی میں مجبور تھا۔ مگر اس میں کوئی ایسی دوا شامل نہیں تھی بلکہ اسے پی کر مجھے اپنے اندر توانائی محسوس ہوئی تھی۔

بستر سے نیچے فر اور چمڑے کے خوب صورت، نرم و گرم سلیپر رکھے تھے۔ میں سلیپر پہن کر دروازے تک آیا۔ میرا خیال تھا کہ وہ بند ہوگا لیکن خلاف توقع وہ کھلا ہوا ملا۔ جیسے ہی میں نے دروازہ کھولا کہیں گھنٹی کی مترنم آواز آئی اور اس سے پہلے میں باہر جاتا۔ دروازے پر ایک لڑکی نمودار ہوئی۔ اس نے بہت خوب صورت کڑھائی کیا ہوا لباس پہن رکھا تھا اور اس کی ذاتی دلکشی کا کیا کہنا۔ یوں لگا جیسے کوئی پری زمین پر اُتر آئی۔ لیکن وہ بے چاری ایک معمولی خادمہ تھی۔ میں گہری سانس لے کر رہ گیا۔ وہ راجا عمر دراز کے محل کی ایک خادمہ تھی

جاسوسی ڈائجسٹ سسپنس ڈائجسٹ
ماہنامہ پاکیزہ ماہنامہ سرگزشت
ماہ حاصل کریں اپنے دروازے پر
ایک رسالے کے لیے 12 ماہ کا زرسالانہ
(بشمول رجسٹرڈ ڈاک خرچ)
لیے 600 روپے
امریکا، کینیڈا، آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کے لیے 7,000 روپے

آپ ایک وقت میں کئی سال کے لیے ایک سے زائد رسائل کے خریدار بن سکتے ہیں۔ رقم اسی حساب سے ارسال کریں ہم فوراً آپ کے دیے ہوئے پتے پر رجسٹرڈ ڈاک سے رسائل بھیجنا شروع کر دیں گے۔

رقم ڈیمانڈ ڈرافٹ، منی آرڈر یا ویسٹرن یونین کے ذریعے بھیجی جاسکتی ہے۔ مقامی حضرات دفتر میں نقد ادائیگی کر کے رسید حاصل کر سکتے ہیں

رابطہ: ثمر عباس (فون نمبر: 0301-2454188)

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز
63-C فیز II ایکسٹینشن ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی مین کورنگی روڈ، کراچی
فون: 35895313 فیکس: 35802551

جسے میں پہلے بھی دیکھ چکا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ میں راجا عمر دراز کے محل میں تھا۔ تعجب ہے یہ خیال مجھے کمرا دیکھتے ہی کیوں نہیں آیا تھا۔

"جی جناب۔" لڑکی نے احترام سے کہا۔

"مجھے بیگ صاحب سے ملنا ہے۔" میں نے سوال کرنے کے بجائے سیدھی بات کی۔

اس نے سر ہلایا۔ "میں ان کو بتاتی ہوں اس کے علاوہ آپ کو کسی چیز کی ضرورت ہے؟"

"نہیں۔" میں نے کہا اور واپس آ گیا۔ راجا عمر دراز کے محل میں ہونے کا مطلب تھا کہ مہرو نے وہی کیا جو میں نے اسے سمجھایا تھا اور وہ اپنے طور پر کہیں نہیں گئی تھی۔ اسے یہیں محل میں کہیں ہونا چاہیے تھا۔ میں ملازمہ سے اس کے بارے میں پوچھنا بھول گیا تھا۔ بہر حال کچھ دیر میں ساری صورتِ حال سامنے آ جاتی۔ یقیناً مہرو کو راجا عمر دراز کے محل تک پہنچنے میں کئی دن لگے تھے۔ اس کے بعد اس کے آدمیوں نے فوری کارروائی کی اور وادی میں پہنچ کر فتح خان کے آدمیوں کو ٹھکانے لگا دیا۔ یہ اتفاق ہی ہو سکتا تھا کہ وہ اس وقت وہاں پہنچے جب فتح خان برٹ شا کو بچانے کے لیے میرے پاس دوڑا آیا تھا۔ اس طرح وہ اپنے آدمیوں کے ساتھ مارے جانے یا پکڑے جانے سے بچ گیا تھا۔ دیکھا جائے تو اسے بچانے کا سہرا میرے سر جاتا تھا، نہ میں اسے بلانے کے لیے برٹ شا کے کپڑے اُتارتا اور نہ وہ وہاں آتا اور یقیناً راجا عمر دراز کے آدمیوں کے ہاتھوں مارا جاتا۔ لیکن وہ بد بخت میرا دشمن ہو رہا تھا۔ میں دوبارہ بستر پر دراز ہو گیا یہ بہت نرم اور گرم بستر تھا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ میں واٹر بیڈ پر لیٹا ہوں جس میں گرم پانی بھرا ہو۔ دس منٹ بعد دروازے پر دستک ہوئی۔ وہی خادمہ تھی اس نے ادب سے کہا۔ "بیگ صاحب آپ کو یاد فرما رہے ہیں۔"

خادمہ کے لہجے سے ظاہر تھا کہ اسے اردو بولنے کی خاصی پریکٹس کرائی گئی تھی اور وہ شاید وادی سے باہر سے آنے والے مہمانوں کی خدمت کے لیے مخصوص تھی۔ میں اس کے ساتھ باہر آیا۔ بیگ اسی چھوٹی نشست گاہ میں میرا منتظر تھا جہاں میں اس سے پہلے بھی ایک بار مل چکا تھا۔ وہ اپنے ڈھیلے چوغے میں ملفوف کسی موی مجسمے کی طرح ساکت بیٹھا تھا لیکن مجھے دیکھتے ہی اس مجسمے میں جان پڑ گئی تھی۔ اس نے اُٹھ کر گرم جوشی سے مجھ سے ہاتھ ملایا لیکن یہ ساری گرم جوشی اس کے ہاتھوں میں تھی اس کا چہرہ حسبِ معمول تاثرات سے عاری تھا۔ چہرے کی طرح اس کا لہجہ بھی سپاٹ تھا۔ "شہباز صاحب اب آپ کیسے ہیں؟"

"اللہ کا شکر ہے ویسے کیا میری طبیعت خراب تھی؟"

اس نے سر ہلایا۔ "جس گیس کے اثر سے آپ بے ہوش ہوئے تھے ہوش میں آنے کے بعد طبیعت بہت خراب ہوتی ہے اس لیے آپ کو بے ہوش رکھا گیا۔ گیس کا اثر زائل ہونے میں کم سے کم بارہ گھنٹے لگتے ہیں۔"

"گویا مجھے بارہ گھنٹے بعد ہوش آیا ہے۔"

"سولہ گھنٹے بعد۔" اس نے صحیح کی۔ "اس دوران میں آپ کو انجکشن سے خوراک اور ادویات دی جاتی رہی ہے۔"

"میں خود کو بالکل ٹھیک ٹھاک محسوس کر رہا ہوں اور اگر کوئی کمی تھی تو وہ اس شربت کو پینے سے دور ہو گئی جو میرے سرہانے رکھا تھا۔"

"وہ خاص جڑی بوٹیوں اور عرقیات سے تیار کردہ شربت ہے۔ حکیم قاؤس کی ایجاد ہے۔" بیگ نے یوں فخر سے کہا جیسے شربت کی تیاری میں اس کا بھی عمل دخل ہو۔

"راجا صاحب کی طبیعت کیسی ہے؟"

"حکیم قاؤس کے علاج سے بہت اچھا اثر پڑا ہے۔ آپ ان کو پہلے سے بہتر پائیں گے۔"

"بیگ صاحب فتح خان کے ٹھکانے پر حملہ کرنے والے راجا صاحب کے آدمی تھے؟"

اس نے سر ہلایا۔ "بالکل اور مجھے افسوس ہے فتح خان ایک بار پھر نکلنے میں کامیاب رہا۔"

"اس کی جگہ آپ مجھے پکڑ لائے۔"

"اس وقت وہ لوگ یہی سمجھے تھے کہ فتح خان وہاں چھپا ہوا ہے، وہ تو بعد میں پتا چلا کہ وہاں آپ تھے۔"

"بیگ صاحب فتح خان کے آدمیوں نے برٹ شا کی لڑکی ایمن شا کو پکڑ رکھا تھا۔"

"وہ اب یہاں ہے اور اس کی حیثیت ایک مہمان کی سی ہے لیکن فی الحال کسی کو اس کے بارے میں علم نہیں ہے۔" بیگ نے نپے تلے الفاظ میں کہا، اس کا مطلب یہی ہو سکتا تھا کہ ایمن شا کے بارے میں کسی ذمے دار آدمی کو علم نہیں تھا اور یقیناً اس کی یہاں سے واپسی مخصوص شرائط کے تحت ہوتی۔ میں نے سر ہلایا۔

"کیا اسے اپنے باپ کی موت کا علم ہو گیا ہے؟"

بیگ نے سر ہلایا۔ "راجا صاحب نے غیر سرکاری طور پر برٹ شا کی لاش مقامی حکام کے حوالے کر دی ہے۔"

"یعنی وہ یا ان کے آدمی خود سامنے نہیں آئے ہیں؟"

"یہی بات ہے، ورنہ اس کی وضاحت بھی کرنا پڑتی

کہ ایک دور دراز وادی میں موجود لاش کا علم ہمیں کس طرح ہوا۔ ویسے بھی راجا صاحب اس معاملے میں ملوث ہونا نہیں چاہتے۔"

"ایمن کا کیا حال ہے؟"

"کل تک بہت رو رہی تھی لیکن بعد میں سنبھل گئی۔ یہیں مہمان خانے میں موجود ہے، آپ چاہیں تو اس سے مل سکتے ہیں۔"

میں نے سر ہلایا۔ "وہ مضبوط اعصاب کی لڑکی ہے۔"

"ہاں.... لیکن شہباز صاحب یہ آپ نے کیا چیز بھیجی ہے۔"

میں چونکا۔ "کون.... وہ خانہ بدوش لڑکی مہرو۔"

بیگ نے بد مزگی سے کہا۔ "لڑکی تو نہیں تجربے کار عورت ہے اور اس نے پتا نہیں کیا چکر چلایا ہے کہ اس کا بیشتر وقت راجا صاحب کے ساتھ گزرتا ہے، ان کی دیکھ بھال بھی اسی نے سنبھال لی ہے۔ راجا صاحب کی نرس تو فارغ بیٹھی رہتی ہے۔"

"وہ بہت ہوشیار عورت ہے اور اس نے فتح خان کے آدمیوں کے ہاتھوں بہت ذلت بھی اُٹھائی ہے اور پھر ان آدمیوں کو اپنے ہاتھ سے قتل بھی کیا ہے۔ فتح خان نے مجھ پر نظر رکھنے کے لیے اسے میرے ساتھ کیا تھا۔ لیکن میں جان گیا کہ وہ کس طرح ہم پر نظر رکھے ہوئے ہے اور میں نے مہرو کو اس امید پر آپ کی طرف روانہ کیا تھا کہ وہ راجا صاحب تک پہنچ سکے گی اور ویسے مجھے یقین تھا کہ پھر وہ اپنی راہ لے لے گی۔"

"وہ پہاڑوں میں بھٹک گئی تھی۔ تین دن پہلے یہاں پہنچی تھی۔" بیگ بولا۔ "ویسے مس شا سے ملنے سے پہلے مناسب ہو گا آپ مجھے ذرا تفصیل سے بتا دیں کہ وہاں ہوا کیا تھا؟"

میرے اغوا والے واقعے سے وہ یقیناً واقف تھا کیونکہ عبداللہ اسے رپورٹ دے چکا ہو گا۔ میں نے اسے وادی میں آمد اور پھر یہاں برٹ شا اور فتح خان کی آمد سے لے کر بعد تک آنے والے واقعات اختصار سے سنائے لیکن تمام ضروری تفصیلات بھی بیان کیں۔ وہ غور سے سن رہا تھا میری بات ختم ہوئی تو اس نے سوال کیا۔ "برٹ شا نے مرنے سے پہلے آپ کو کچھ بتانے یا ہیروں کی نشان دہی کرنے کی کوشش کی تھی؟"

اس کی بات پر میں حیران ہوا تھا لیکن حیرت تاثرات تک نہیں آنے دی تھی۔ میں نے سوچ کر کہا۔ "یہ خیال آپ کو کیوں آیا؟"

"شہباز صاحب میری عمر راجا صاحب سے کچھ ہی کم ہے اور میں نے دنیا دیکھی ہے۔ برٹ شا جیسے لوگ انا کے مارے ہوتے ہیں اور اگر وقت اس کے ہاتھ سے نکل رہا تھا تو اس نے یقیناً آپ کو بتانے کی کوشش کی ہو گی کہ ہیرے کہاں ہیں؟ وہ اب بھی اس فکر میں ہو گا کہ ہیرے پارٹی تک پہنچ جائیں تاکہ اس کی ساکھ پر آنے والا دھبا مٹ سکے۔"

بیگ کی سمجھ بوجھ واقعی وزیروں والی تھی۔ میں نے جواب دیا۔ "برٹ شا نے کچھ کہا تو تھا لیکن فائرنگ کا شور وادی میں گونج رہا تھا اس لیے میں صحیح طور پر نہیں سن سکا کہ اس نے کیا کہا تھا۔ شاید اس نے شمال کا لفظ کہا تھا۔"

بیگ چونکا۔ "آپ کا مطلب ہے وادی کا شمال؟"

"مطلب تو برٹ شا جانے کہ اس کی مراد کس شمال سے تھی۔"

بیگ نے اپنے سوال کا خود جواب دیا۔ "یقیناً اس کی مراد وادی کے شمال سے ہو گی ورنہ صرف شمال کی سمت کہنے سے تو ہیروں کا سراغ نہیں ملتا اس کا مطلب ہے ہیرے وادی میں شمال کی طرف چھپائے گئے ہیں۔"

"اس کا پتا تو مجھے بھی ہے کہ اس نے ہیرے شمالی ڈھلان میں کہیں چھپائے تھے۔ لیکن یہ شمالی ڈھلان بھی بہت بڑی ہے اور ہیرے کہاں ہیں؟ یہ جاننا تقریباً ناممکن ہے۔ ویسے کیا آپ ہیرے تلاش کرنا چاہتے ہیں؟"

بیگ کھسیا گیا۔ "ارے نہیں شہباز صاحب ہم ان چکروں میں پڑنے والے لوگ نہیں ہیں۔"

"فتح خان کا ہاتھ سے نکلنا بُرا ہوا ہے۔" میں نے کہا۔ "آپ کے آدمیوں نے بہت اچھے انداز میں ان لوگوں کو ٹیک اوور کیا لیکن بد قسمتی سے فتح خان اس وقت وہاں نہیں تھا۔ اس کے قبضے میں میری ہونے والی بیوی ہے۔"

"میں جانتا ہوں۔" اس نے کہا۔ "عبداللہ کی طرف سے خبر یہ ہے کہ وہ اور آپ کے دوسرے ساتھی انہیں تلاش کرنے میں کچھ کامیابی حاصل کر چکے ہیں۔"

میرا دل دھڑکا تھا۔ "وہ کیسے....؟ اور آپ کو کیسے علم ہوا کہ سویرا فتح خان کے قبضے میں ہے؟"

"مہرو سے پتا چلا۔ میں نے فوری طور پر عبداللہ اور آپ کے ساتھیوں کو اس کی اطلاع دی تھی اور انہوں نے اسی وقت سے اپنا کام شروع کر دیا تھا۔"

"کیا میں ان سے بات کر سکتا ہوں؟"

"کچھ دیر بعد۔" بیگ نے اپنے ہاتھ پر بندھی گھڑی دیکھ کر کہا۔ "کسی وجہ سے سیٹلائٹ انٹرنیٹ کنکشن ٹوٹ گیا ہے اسے دوبارہ ملانے کی کوشش کی جا رہی ہے۔"

www.Paksociety.com

راجا عمر دراز کا محل دور دراز تھا اس لیے یہاں مواصلات کے لیے سیٹلائیٹ انٹرنیٹ کا سہارا لیا گیا تھا اس کے علاوہ یہاں سیٹلائیٹ فون بھی تھا۔ شاید دونوں ایک ہی کنکشن سے کام کرتے تھے۔ میں نے بیگ سے کہا کہ جب تک کنکشن درست کیا جا رہا ہے میں ایمن سے مل لوں۔ کچھ دیر بعد میں اسی دلکش خادمہ کی دلکش چال کا تعاقب کرتے ہوئے ایمن کے مخصوص کمرے تک پہنچا۔ دستک کے جواب میں اس نے بلند آواز سے کہا۔ ''یس کم ان۔''

میں اندر آیا تو ایمن مجھے دیکھتے ہی تیزی سے میری طرف آئی پھر اسے خادمہ کا خیال آیا اور اس نے اشارے سے اسے جانے کو کہا۔ خادمہ کے جاتے ہی وہ میرے سینے سے لگ کر رونے لگی تھی۔ اس نے بھی مقامی طرز کا ڈھیلا لباس پہن رکھا تھا اس کے باوجود وہ اس پر جچ رہا تھا۔ اس کے آنسو میری قمیص بھگونے لگے تھے۔ میں نے اسے نرمی سے شانے سے تھام کر الگ کیا اور بستر کے کنارے بٹھایا اور پھر خود کرسی کھینچ کر اس کے سامنے بیٹھ گیا۔

''ایمن مجھے افسوس ہے۔''

''پاپا۔'' وہ سسکی۔ ''انہوں نے مجھے پہنچانا بھی نہیں تھا۔''

میں اسے نہیں بتا سکتا تھا کہ اس کے باپ نے اسے پہنچان لیا تھا لیکن اس کی جان بچانے کے لیے وہ بدستور دیوانہ بنا رہا تھا اگر وہ اسے پہچان لیتا تو فتح خان کے ہاتھ ایک ترپ کا یقینی پتا آجاتا اور وہ اسے استعمال کرنے سے گریز نہیں کرتا۔ میں نے فیصلہ کیا کہ فی الوقت اسے کچھ نہیں بتاؤں گا ہاں بعد میں بھی موقع آیا تو میں اسے حقیقت سے آگاہ کر سکتا تھا۔ ''فتح خان کی مسلسل قید نے اس کا دماغی توازن بگاڑ دیا تھا۔''

''پاپا کو کس نے مارا؟''

''فتح خان کے ایک ساتھی اور فتح خان نے غصے میں اسے بھی وہیں گولی مار دی تھی۔ برٹ شا کی موت اس کی زندگی کا سب سے بڑا حادثہ ہے۔'' میں نے کہا اور اس بار بھی اسے پوری بات بتانے سے گریز کیا۔

ایمن کے چہرے پر غصہ آ گیا۔ ''لیکن پاپا کی موت کا ذمّے دار وہی ہے۔''

''اس میں کیا شک ہے۔'' میں نے کہا۔ ''لیکن بدقسمتی سے وہ نکل جانے میں کامیاب رہا۔''

''وہ کس طرح نکلا؟''

میں نے کسی کو بھی نہیں بتایا تھا کہ میں نے فتح خان کو بلوانے کے لیے برٹ شا کے ساتھ کیا سلوک کیا تھا۔ ایمن کو بتانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ جو ہوا تھا وہ میں جانتا تھا یا فتح خان جانتا تھا۔ میں نے ایمن کو یہ بھی نہیں بتایا کہ اس کا باپ ڈراما کر رہا تھا بے شک اس کا مقصد جو بھی ہو لیکن اسے یہ مقصد اپنی جان اور اپنی اولاد سے بڑھ کر تھا۔ ایمن برٹ شا کی باتیں کرتی رہی۔ میں سنتا رہا اور درمیان میں اسے تسلیاں بھی دیتا رہا۔ کچھ دیر بعد اس کی حالت سنبھل گئی اور میرے مسائل کی طرف توجہ دی۔

''سویرا کا پتا چلا؟''

''میرے ساتھی کوشش کر رہے ہیں کیونکہ وہ شہر میں کہیں ہے۔ مجھے اطلاع ملی ہے کہ انہیں کسی حد تک کامیابی بھی ملی ہے لیکن کسی وجہ سے یہاں مواصلاتی رابطہ ٹوٹ گیا ہے، اسے ٹھیک کرنے کی کوشش کی جاری ہے۔''

''پاپا نے ان ہیروں کے لیے جان دے دی۔'' اسے پھر باپ کی یاد ستانے لگی۔

''ہم نہیں کہہ سکتے کہ برٹ شا کے ذہن میں کیا تھا کیونکہ کوئی شخص دولت کی خاطر اتنی تکلیفیں اور اتنی طویل قید برداشت نہیں کر سکتا ہے۔ وہ اپنا ذہنی توازن کھو بیٹھا تھا۔''

''پاپا کی ڈیل تھی انہیں یہ ہیرے ہر صورت پارٹی تک پہنچانے تھے، یہ صرف ان کی نہیں ہمارے خاندان کی ساکھ اور عزت کا معاملہ بھی تھا۔ برطانیہ میں کہتے ہیں کہ شا خاندان بات کر کے پیچھے نہیں ہٹتا ہے۔ اگر ہیرے نہیں پہنچتے تو وہ کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہتے۔''

''ہیرے تو اب بھی نہیں پہنچے۔'' میں مسکرایا۔ ''دوسرے اسی خاندان کے ایک فرد ڈیوڈ شا نے بارہا اس اصول کی دھجیاں اُڑائی ہیں۔''

''وہ ایک الگ بات ہے وہ ہیرے کہیں مارکیٹ میں آئے نہیں ہیں کیونکہ ان کی ساخت اور صورت کا سب کو علم ہے اگر ان کی ساخت چھپانے کے لیے ان کو دوبارہ تراشا جاتا تو ان کی وہ قدر و قیمت باقی نہیں رہتی۔ یوں سمجھو کہ شکل بدلنے سے پچاس ملین ڈالرز کے ہیرے پانچ ملین ڈالرز کے بھی نہیں رہ جاتے۔ پھر پاپا بھی غائب تھے اس لیے بات ہماری عزت پر نہیں آئی۔ یہ فرض کر لیا گیا تھا کہ پاپا ہیروں سمیت کسی کے ہاتھ لگ گئے ہیں۔ وہ خود ہیروں سمیت کہیں روپوش نہیں ہو سکتے تھے۔''

میں نے سوچا اور ایمن سے پوچھا۔ ''اب کیا صورتِ حال ہو گی کیونکہ برٹ شا دنیا میں نہیں رہا ہے اور ہیرے بدستور غائب ہیں۔ اس بارے میں کیا کہتی ہو؟''

''پارٹی معاملات دیکھ رہی ہو گی۔ اس کا تعلق اٹلی سے ہے۔ اگر اسے محسوس ہوا کہ اس کے ساتھ کہیں دھوکا کیا جا رہا ہے تو وہ پاپا کے وارث کو پکڑے گی اور اس سے ہیروں کا مطالبہ کرے گی۔''

''یعنی تم سے؟''

ایمن پہلی بار مسکرائی۔ ''نہیں ڈیوڈ شا سے.... پاپا کی جاگیر اور خطاب اسی کے حصے میں آیا ہے۔ وہ ایسے لوگ ہیں ڈیوڈ شا انہیں انکار بھی نہیں کر سکتا ہے۔''

''مافیا؟''

''ہاں.... جہاں تک میں نے جانا ہے یہ مافیا والے ہیں کیونکہ اس پارٹی کا سب سے اہم آدمی سیسلو مندانی کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ اٹلی کا سب سے طاقتور مافیا چیف ہے۔ اس پر کئی بار مقدمہ بھی چلا ہے لیکن یہ عدالت سے بری ہو گیا۔ ویسے وہ اٹلی کی پارلیمنٹ کا ممبر اور معروف بزنس مین ہے۔''

''سن کر خوشی ہوئی کہ اٹلی جیسے مہذب یورپی ملک میں بھی مجرم اور قاتل پارلیمنٹ میں پہنچ جاتے ہیں۔'' میں ہنسا۔ ''یہ ہیرے کس ڈیل کا حصہ تھے؟''

''تم نہیں جانتے؟'' اس نے حیرت سے کہا۔ ''افغان وار کے دوران یہاں اسلحے کی سپلائی کے ادائیگی ان ہیروں سے کی جانی تھی۔ اسلحہ پہنچانے اور بعد میں ہیرے لے کر پارٹی تک لے جانے کی ذمّے داری پاپا کی تھی۔ وہ سرکاری طور پر اس ذمّے داری کے لیے چنے گئے تھے۔''

''شاید پہلے بھی اس کا ذکر ہوا تھا لیکن یہ بات میرے ذہن سے نکل گئی۔'' میں نے سر ہلایا۔ ''اگر پارٹی کو شبہ ہو جائے کہ ہیروں کے معاملے میں دھوکا ہوا ہے تو وہ ڈیوڈ شا سے باز پرس کرے گی اور پھر اسے مجبور کر سکتی ہے کہ وہ ان کا نقصان پورا کرے۔''

''بالکل یہی بات ہے۔'' ایمن بولی۔ ''مجھے لگ رہا ہے کہ ایسا ہو گا کیونکہ اس دوران میں جب پاپا غائب تھے تو ڈیوڈ شا متعدد بار پاکستان آیا جب کہ بہ ظاہر یہاں اس کا کوئی بزنس نہیں ہے۔''

''بزنس تو ہے، تم نہیں جانتیں کہ وہ ان لوگوں کا ایجنٹ بن کر آتا تھا جو مافیاؤں کی بھی مافیا ہیں۔ جن کے حکم سے سرتابی کی مجال کسی میں نہیں ہے۔ اس لیے میرا نہیں خیال.... کہ کوئی مافیا چاہے وہ کتنی طاقتور کیوں نہ ہو ڈیوڈ شا سے سوال جواب کرنے کی ہمت کرے گی۔''

ایمن نے نفی میں سر ہلایا۔ ''تم مافیا کے بارے میں نہیں جانتے ہو یہ بہت طاقتور ہیں۔ اٹلی کا شمار دنیا کی بڑی طاقتوں میں ہوتا ہے لیکن اندر سے یہ بھی مافیا کے سامنے کمزور پڑ جاتا ہے۔ خود امریکا میں مافیا طاقتور ہوتی جا رہی ہیں۔ ان کا طریقہ کار چھپا ہوا ہوتا ہے، یہ نہ کھل کر کسی کو چیلنج کرتی ہیں اور نہ کسی پر کھلا وار کرتی ہیں۔ یہ چھپ کر وار تنگ دیتی ہیں اور اگر مخالف پھر بھی نہ مانے تو یہ چھپ کر وار کر کے اس کا خاتمہ کر دیتی ہیں۔ صرف اٹلی میں ہر سال ایک ہزار سے زیادہ قتل مافیا کے اشارے پر ہوتے ہیں اور ان کے قاتل بہت کم پکڑے جاتے ہیں۔''

''پھر بھی فرض کر لیا جائے کہ مافیا والے کسی وجہ سے ڈیوڈ شا پر ہاتھ نہیں ڈال پاتے تو کیا اس صورت میں ان کا رُخ تمہاری طرف نہیں ہو گا؟''

''اصولی طور پر تو نہیں ہونا چاہیے کیونکہ اگر کسی مرنے والے سے قرض وصولنا ہو تو اس کے وارث سے رجوع کیا جاتا ہے۔ میں پاپا کی وارث نہیں ہوں۔''

''ڈیوڈ شا ایک نظام کے تحت اس کا وارث بنا ہے اس لیے ممکن ہے مافیا اسے عمومی معنوں میں وارث نہ لے۔''

میری بات سن کر ایمن سوچ میں پڑ گئی تھی۔ پھر اس نے میری طرف دیکھا۔ ''تم بلا وجہ بحث کرنے والے آدمی نہیں ہو کیا تمہارے ذہن کوئی خاص بات ہے؟''

''ہاں میرے ذہن میں ایک بات ہے لیکن میں راجا عمر دراز سے بات کر کے اسے واضح کروں گا۔''

''راجا۔'' ایمن نے گہری سانس لی۔ ''میں کل سے یہاں ہوں اور ابھی تک مجھے کسی سے رابطہ کرنے کا موقع نہیں دیا گیا ہے۔''

''مثلاً کس سے رابطہ؟''

''میں اپنی ایمبیسی سے رابطہ کرنا چاہتی تھی لیکن مجھے بتایا گیا کہ موسم کی خرابی کی وجہ سے فی الحال محل سے کہیں بھی رابطہ ممکن نہیں ہے۔ کیا میں یہاں نظر بند ہوں۔''

''تقریباً ایسا ہی سمجھو بلکہ یہ بات بھی ذہن میں رکھو کہ تم راجا عمر دراز کے پاس نہیں ہو۔ وہ اس معاملے میں کسی طرح سے ملوث نہیں ہونا چاہتا۔''

''حالانکہ یہ اسی کے آدمی تھے جنہوں نے فتح خان کے کیمپ پر حملہ کیا تھا۔ میرے خدا وہ اتنی تیزی سے آئے کہ فتح خان کے آدمیوں کو سنبھلنے کا موقع ہی نہیں ملا اور انہوں نے ایک منٹ میں سب کو شوٹ کر دیا تھا۔''

''کوئی نہیں بچا؟''

ایمن نے نفی میں سر ہلایا۔ ''انہوں نے شوٹ فور کل کیا

www.paksociety.com

تھا۔ فتح خان کے پانچ آدمیوں میں سے کسی ایک کو بھی اپنا ہتھیار استعمال کرنے کا موقع نہیں ملا تھا۔ حملہ آوروں کی قیادت ایک رشین کر رہا تھا۔“

”رشین۔“ میں نے تعجب سے کہا۔

”ہاں وہ رشین ہی تھا میں نے تصدیق کے لیے اسے رشین میں چند جملے کہے تو اس نے جواب بھی دیا تھا۔ مجھے تھوڑی بہت رشین آتی ہے۔“

میں نے اس سے پہلے راجا عمر دراز کے محل یا آدمیوں میں کوئی رشین نہیں دیکھا تھا۔ ممکن ہے اسے حال ہی میں ہائر کیا گیا ہو۔ جب سے ڈیوڈ شا والا چکر شروع ہوا تھا اور راجا عمر دراز کے محل سے تصویر اور پتھر چوری ہوئے تھے تب سے اس نے اپنی سیکورٹی بڑھانے پر توجہ دی تھی۔ شہر میں اس کے پاس عبداللہ جیسا آدمی تھا اور یہاں محل میں بھی مجھے نہایت تربیت یافتہ سیکورٹی گارڈز نظر آئے تھے۔ ”راجا عمر دراز کے آدمی تمہیں براہِ راست یہاں لے آئے تھے؟“

اس نے سر ہلایا۔ ”صرف چند گھنٹوں کے اندر، ان پہاڑوں پر بھی یہ بہت تیزی سے سفر کرتے ہیں۔“ اس نے کہتے ہوئے میرا ہاتھ تھام لیا۔ ”شہباز مجھے یہاں سے جانا ہے ابھی پاپا کی لاش لے کر واپس جانا ہے اور ان کی آخری رسومات ادا کرنی ہیں۔“

”میرا خیال ہے تم کل صبح ہوتے ہی جا سکو گی۔ اگر موسم بہتر ہوا تو ہیلی کاپٹر آ جائے گا۔ لیکن تمہیں وعدہ کرنا ہوگا کہ اس معاملے میں تم کہیں بھی راجا عمر دراز کا نام نہیں لو گی بلکہ تمہیں بتانے کی ضرورت ہی نہیں ہے کہ تم کہاں سے آ رہی ہو۔ اگر برٹ شا کی موت سے بھی بے خبری ظاہر کرو تو اچھا ہے یہ اطلاع یقیناً ایمبیسی کو دی جا چکی ہوگی اور تم وہاں سے رابطہ کرو گی تو تمہیں خود پتا چل جائے گا۔“

”تم نے ٹھیک مشورہ دیا ہے میں ایسا ہی کروں گی۔“

مجھے وقت کا اندازہ نہیں تھا۔ ایمن نے بتایا کہ شام کے ساڑھے سات بج رہے ہیں۔ پھر اس نے مہرو کے بارے میں پوچھا۔ ”یہ کون ہے اور تمہارے پاس کہاں سے آئی؟“

”پتا نہیں کیا مسئلہ ہے جہاں جاؤ کوئی نہ کوئی لڑکی کوئی مسئلہ لیے موجود ہوتی ہے۔“ میں نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا اور پھر اسے مہرو کی مختصر کہانی سنائی۔ ایمن کو فوراً اس سے ہمدردی ہوگئی تھی۔

”یہ بے چاری تو بہت مظلوم ہے۔“

”ہاں لیکن راجا کا سیکریٹری بیگ اس کے بارے میں فکر مند ہے، سنا ہے اس نے آتے ہی راجا عمر دراز کو متاثر کر لیا ہے اور اب اس کی تیمارداری وہی کر رہی ہے۔“

”میں نے محسوس کیا ہے کہ خود بیگ راجا کے بارے میں بہت حساس ہے اور اس کی کوشش ہوتی ہے کہ کوئی راجا سے ایک حد سے زیادہ قریب نہ ہونے پائے۔“

”تم نے بالکل ٹھیک محسوس کیا ہے اور میں نے بارہا دیکھا ہے۔ بہرحال یہ ان دونوں کا مسئلہ ہے۔ تمہارا مسئلہ یہ ہے کہ تم برٹ شا کی میت انگلینڈ لے جانا چاہتی ہو اور میں جلد از جلد اپنے ساتھیوں کے پاس پہنچنا چاہتا ہوں۔“

”تاکہ سویرا کو فتح خان سے چھڑا سکو۔“ ایمن کا لہجہ بدل گیا تھا۔

”ظاہر ہے، یہ میری عزت کا معاملہ ہے اور ہمارے ہاں ایسی باتوں پر قتل کرنا یا ہو جانا معمولی بات ہے۔“

ایمن کچھ دیر کے لیے چپ ہوگئی پھر اس نے دھیمے لہجے میں کہا۔ ”ایک بات پوچھوں سچ بتاؤ گے؟“

”مجھے اندازہ تھا کہ وہ کیا بات پوچھے گی۔“ ہاں تم پوچھ سکتی ہو۔“

”سویرا سے تمہارا کیا رشتہ ہے؟“

میں نے گہری سانس لی۔ ”ایمن تمہارے لیے یہ بات جاننا ضروری ہے؟“

”میں نے پوچھا ہے۔“ اس نے دوسری طرف منہ پھیر لیا۔ ”اگر تم جواب نہیں دینا چاہتے تو تمہاری مرضی.

”ایمن تم نے سچ کی شرط رکھی ہے اس لیے بتا رہا ہوں، سویرا میری محبت ہے اب سے نہیں بلکہ اس وقت سے جب میں محبت کا مفہوم بھی نہیں جانتا تھا۔ مگر تقدیر نے ہمارے ساتھ مذاق کیا اور سویرا میرے بھائی کا مقدر بن گئی۔ تمہیں علم ہوگا کہ مرشد نے سازش کر کے میرے بھائی کو قتل کرا دیا اور سویرا بیوہ ہوگئی۔ اب میرے والد نے اپنی غلطی کی تلافی کے لیے سویرا اور میری شادی کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔“

ایمن نے گہری سانس لی۔ ”تب تو تم خوش قسمت ہو جو اپنی محبت پا لو گے۔“

”ہاں اور تم اندازہ کر سکتی ہو کہ میں سویرا کے لیے کس قدر فکر مند ہو سکتا ہوں۔“

اس نے میری طرف دیکھا۔ ”مجھے اندازہ ہے اور مجھے اس بات پر بھی رشک آ رہا ہے کہ تم کسی بھی پریشانی کو خود پر حاوی نہیں ہونے دیتے۔“

”مجھے اس کی عادت ہوگئی ہے۔“ میں نے سر ہلایا۔

دروازے پر دستک ہوئی اور ایمن کی اجازت سے خادمہ اندر آئی۔ ”کچھ دیر میں کھانا لگنے والا ہے۔ آپ دونوں تشریف لے چلیے۔“

میں اور ایمن اس کے ساتھ محل کے چھوٹے ڈائننگ ہال میں آئے۔ وہاں راجا عمر دراز موجود تھا۔ اس نے گرم جوشی سے مجھے سینے سے لگایا۔ بیگ ٹھیک کہہ رہا تھا حکیم قاؤس کے علاج سے اس کی صحت پہلے سے بہتر لگ رہی تھی۔ میں نے یہ بات کہی۔ ”راجا صاحب اب آپ پہلے سے بہتر نظر آ رہے ہیں۔“

”ہاں لیکن بس یہ اوپر سے ہے میں جانتا ہوں اندر کینسر اپنے پاؤں پھیلا رہا ہے۔“ اس نے آہستہ سے کہا۔

ایمن کو پہلی بار پتا چلا تھا کہ راجا عمر دراز کو کینسر ہے اس نے رسمی انداز میں افسوس ظاہر کیا اور راجا نے رسمی انداز میں اس سے باپ کی موت کی تعزیت کی۔ ہم کھانے کی میز پر آ گئے۔ کھانا خاموشی سے کھایا گیا۔ راجا عمر دراز کے لیے مخصوص پرہیزی کھانا تھا۔ لیکن میرے اور ایمن کے لیے کئی بہترین اور لذیذ ڈشز تھیں۔ میں چوبیس گھنٹے بعد کھانا کھا رہا تھا اس لیے بھوک ذرا کھل گئی تھی۔ کھانے کے فوراً بعد راجا عمر دراز کھڑا ہو گیا۔ اس نے ایمن سے کہا۔ ”تم آرام کرو جلد تمہیں اسلام آباد پہنچا دیا جائے گا۔“

”شکریہ راجا صاحب۔“ ایمن نے کہا تو میں نے اس کے لہجے میں خفیف سا طنز محسوس کیا تھا۔ وہ خادمہ کے ساتھ اپنے کمرے کی طرف چلی گئی۔ اس کے جانے کے بعد راجا عمر دراز نے میری طرف دیکھا۔

”شہباز میرے ساتھ آؤ۔“

راجا عمر دراز مجھے اپنے کمرے میں لے آیا۔ پہلے یہ کمرا سوچ و بچار کے لیے مخصوص تھا اور یہاں سوائے ایک شاہانہ قسم کی آرام کرسی کے اور کچھ نہیں تھا۔ لیکن جب راجا عمر دراز کی طبیعت خراب ہوئی تو اس نے اپنا بیڈ روم اوپر سے یہاں منتقل کر لیا تھا۔ کیونکہ کھانے کے بعد حکیم قاؤس نے اسے آرام کرنے کی ہدایت کی تھی۔ وہ مجھ سے بات بھی کرنا چاہتا تھا اور یہ صرف بیڈ روم میں ممکن تھا۔ راجا بستر پر لیٹ گیا اور اس نے مجھے سامنے رکھی کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ میں نے کہا۔

”راجا صاحب سب سے پہلے تو میں بروقت مدد کا شکریہ ادا کروں گا۔“

”اس کی ضرورت نہیں ہے میں تم سے کہہ چکا ہوں میں تمہیں اپنے وجود کا ایک حصہ سمجھتا ہوں، تم میرے بیٹے کی طرح ہو اور بیٹے باپ کا یا باپ بیٹے کا شکریہ ادا نہیں کرتے۔“

”یہ آپ کی اعلیٰ ظرفی ہے۔“ میں نے کہا۔ ”لیکن ایک بُری بات یہ ہوئی کہ فتح خان نکل گیا اور سویرا اس کے قبضے میں ہے۔“

راجا عمر دراز نے سر ہلایا۔ ”میں جانتا ہوں شہر میں تمہارے ساتھی اسے تلاش کر رہے ہیں اور سنا ہے انہوں نے کچھ پیش رفت بھی کی ہے۔“

”میں ان سے بات کرنا چاہتا ہوں لیکن ابھی تک انٹرنیٹ کا رابطہ بحال نہیں ہوا ہے۔“

راجا عمر دراز نے ایک چھوٹا سا جدید موبائل ساخت کا واکی ٹاکی اُٹھایا اور بیگ سے رابطہ کیا۔ ”رابطہ بحال ہوا؟“

دوسری طرف سے کچھ سن کر راجا نے واکی ٹاکی رکھ دیا اور میری طرف دیکھا۔ ”رابطہ ابھی تک بحال نہیں ہوا ہے۔ یہاں سے کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ سروس سیٹلائیٹ کا مسئلہ ہے۔ اس کی طرف سے جواب موصول نہیں ہو رہا ہے۔“

میں ٹھنڈی سانس لے کر رہ گیا۔ ”اس صورت میں راجا صاحب میں فوری طور پر واپس اسلام آباد جانا چاہوں گا۔ ایمن شا بھی اپنے باپ کی میت لے کر جلد از جلد واپس جانا چاہتی ہے۔“

راجا عمر دراز نے سر ہلایا۔ ”میرا بھی یہی خیال ہے میں بیگ سے کہتا ہوں وہ کل صبح تمہاری روانگی کا بندوبست کر دے۔“

”میں آپ کا شکر گزار ہوں....“

”یہ بات دوبارہ مت کہنا ورنہ تھپڑ مار دوں گا۔“ اس نے شفقت بھرے لہجے میں کہا۔ ”میں چاہتا ہوں تمہارے لیے جو کر سکتا ہوں کروں اور تمہارے مسائل حل ہو جائیں۔“

میں سمجھ رہا تھا کہ راجا عمر دراز کیوں جلد از جلد میرے مسائل کا خاتمہ چاہتا ہے۔ میں اس کی نیت پر شک نہیں کر رہا تھا وہ پہلے بھی کئی بار بے لوث میرے کام آ چکا تھا اور سوائے ایک دفعہ کے اس نے صلہ بھی نہیں مانگا تھا۔ مگر اسے بھی مجھ سے غرض تو تھی۔ میں نے سنجیدگی سے کہا۔ ”راجا صاحب مجھ سے بھی آپ کے لیے جو ہوا میں ضرور کروں گا لیکن پہلے میں اپنے یہ کام نمٹا لوں۔ اگر فتح خان درمیان میں نہ آتا تو میں اور میرے ساتھی مرشد کے گرد شکنجہ کسنے والے تھے۔“

”یہ بریف کیس کا مسئلہ کیا ہے؟“

”جی ہاں میں نے آپ کو بتایا تھا کہ مجھے چین میں سفر کے دوران یہ بریف کیس ملا تھا بلکہ یوں سمجھ لیں کہ میری ذمے داری بن گیا تھا۔ اب مجھے کسی طرح بھی اسے واپس

خادمہ کچھ دیر میں گرین ٹی لے آئی۔ میں نے محسوس کیا کہ پُرانی ملازماؤں کی نسبت یہ خادمائیں رکھ رکھاؤ والی تھیں۔ یہ مہمانوں کی خدمت تو کر رہی تھی لیکن اس نے ابھی تک کسی ارزانی کا مظاہرہ نہیں کیا تھا گویا ملازمائیں رکھتے وقت اس چیز کا خیال بھی رکھا گیا تھا اور مجھے خوشی ہو رہی تھی کہ راجا کا ان کے بارے میں مخصوص طرزِ فکر بدل گیا تھا اور وہ انہیں غلط استعمال نہیں کر رہا تھا۔ وہ گرین ٹی دے کر چلی گئی۔ میں نے ایمن سے ایسے ہی کہا تھا کہ مجھے نیند آرہی ہے لیکن گرین ٹی پی کر مجھے سچ مچ نیند آنے لگی۔ میں نے بہتر یہی سمجھا کہ سو جاؤں۔ بہت عرصے بعد بستر کا آرام ملا تھا۔ ورنہ راتیں بھی بے آرام گزرتی تھیں۔ میرے پاس کوئی ایسی چیز نہیں تھی جسے میں الارم کے طور پر استعمال کرتا لیکن مجھے امید تھی کہ صبح مجھے وقت پر اُٹھا دیا جائے گا اور ایسا ہی ہوا۔

میری آنکھ دروازے پر بہت ہلکی لیکن مسلسل دستک سے کھلی۔ یہ خادمہ تھی۔ اس نے مجھے مطلع کیا کہ بیگ صاحب نشست گاہ میں میرا انتظار کر رہے ہیں۔ ساتھ ہی وہ میرے لیے گرم لباس، جیکٹ، جوتے اور دوسرا سامان لائی تھی جس میں ایک عدد گھڑی بھی تھی۔ میں تیار ہو کر بیگ کے پاس پہنچا۔ اس نے مجھے دیکھتے ہی کہا۔ ''شہباز صاحب آپ کی روانگی کا بندوبست کر دیا گیا ہے اور اب سے آدھے گھنٹے بعد آپ کو روانہ ہو جانا ہے۔''

صبح کے سات بج رہے تھے اور باہر ابھی روشنی بھی نہیں پھیلی تھی بس ہلکا سا دھندلکا تھا۔ ''طریقہ سفر کیا ہوگا؟''

''یہاں سے آپ خچر کے ذریعے وادی سے باہر جائیں گے اور وہاں سے ایک گاڑی آپ کو اسلام آباد لے جائے گی۔''

''میرے اور ایمن کے علاوہ بھی کوئی اور ہوگا؟''

''آپ کے ساتھ دو محافظ بھی ہوں گے وہ آپ کو اسلام آباد تک چھوڑ کر واپس آئیں گے ان میں سے ایک بہترین ڈرائیور ہے اور اس علاقے کی سڑکوں پر ہر موسم میں ڈرائیو کر سکتا ہے۔'' بیگ نے جواب دیا۔ ''آپ ناشتا کر لیں مس شا بھی آگئی ہوں گی۔''

میں بیگ کے ساتھ ڈائننگ ہال پہنچا تو ایمن وہاں آچکی تھی اور میری طرح وہ بھی سردی کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار تھی۔ راجا عمر دراز سو رہا تھا اس لیے اس کی نیابت بیگ نے کی اور ہم نے خاموشی سے ناشتا کیا۔ اس دوران میں راجا عمر دراز جاگ گیا تھا اور وہ منع کرنے کے باوجود ہمیں محل کے دروازے تک رخصت کرنے آیا تھا۔ اس نے مجھے سینے سے لگاتے ہوئے کہا۔ ''میرے بیٹے تم اپنا خیال رکھنا۔''

''جی راجا صاحب۔'' میں نے کہا۔ ''امید ہے! آپ سے ملاقات ہوگی تو آپ ٹھیک ہو چکے ہوں گے۔''

وہ مسکرایا۔ ''یا اس دنیا سے رخصت ہو چکا ہوں گا!''

میں نے سنجیدگی سے کہا۔ ''راجا صاحب میں آپ کے بارے میں ہمیشہ اچھی امید رکھتا ہوں اور جب تک کسی کا وقت نہیں آئے وہ مر نہیں سکتا..... زندگی موت کا علم صرف اللہ کو ہے۔''

''مجھے معلوم ہے۔'' اس نے سر ہلایا اور سامنے چبوترے کے نیچے موجود ایک باوردی شخص کو اوپر آنے کا اشارہ کیا۔ وہ سفید فام تھا اور اس کے چہرے پر مشرقی یورپ کی چھاپ تھی۔ وہ فوراً اوپر آیا اور راجا کے سامنے ادب سے اٹینشن کھڑا ہو گیا۔ ''شہباز اس سے ملو، سابق زرکوشیف اور اب عبدالرحمٰن۔ روسی فوج میں کرنل رہ چکا اور افغانستان سے واپس جانے والے آخری روسی دستے کا حصہ تھا۔''

اس نے مجھ سے ہاتھ ملایا اور صاف اردو میں بولا۔ ''اس وقت میں سپاہی تھا لیکن میں نے چند مہینوں میں جو سیکھا وہ پھر پندرہ سال کی سروس میں بھی نہیں سیکھ سکا۔ آپ سے مل کر خوشی ہوئی مسٹر شہباز راجا صاحب آپ کا ذکر بہت اچھے لفظوں میں کرتے ہیں۔''

''مجھے بھی خوشی ہوئی اور یہ راجا صاحب کی ذرہ نوازی ہے۔''

''میں وادی کے باہر تک آپ کے ساتھ جاؤں گا۔'' عبدالرحمٰن نے کہا۔ وہ تقریباً چالیس برس کا تنومند اور متوسط قد کا آدمی تھا۔ اس کے بال سفید تھے اور آنکھیں ہلکی نیلی۔ ہمارے ساتھ عبدالرحمٰن اور اس کا ایک آدمی جا رہا تھا۔ خچر تیار کھڑے تھے اور صبح کی روشنی ہو چکی تھی۔ راجا عمر دراز سے آخری بار مل کر ہم روانہ ہوئے۔ ایک خچر پر ایمن سوار تھی دوسرے پر میں بقیہ دو خچروں میں عبدالرحمٰن اور اس کا ساتھی تھا۔ وہ پوری طرح مسلح تھے۔ محل سے نکل کر ہم وادی سے گزرنے والے راستے پر آگئے۔ عبدالرحمٰن میرے ساتھ تھا۔ میں نے کہا۔

''تم نے بہت تیز اور پرفیکٹ ایکشن کیا تھا فتح خان کے آدمیوں کو سنبھلنے کا موقع نہیں ملا۔''

اس نے سر ہلایا۔ ''ہم نے کئی گھنٹے ان کی نگرانی کی اور اس کے بعد حملہ کیا تھا وہ مجھے خطرناک لڑاکے لگے تھے۔''

''وہ تھے۔'' میں نے تصدیق کی۔ ''اگر انہیں ذرا بھی پتا چل جاتا تو تمہیں شدید مزاحمت کا سامنا کرنا پڑتا اور تمہارے بھی کئی آدمی مارے جاتے۔''

''اس وجہ سے میرے کسی آدمی کو خراش تک نہیں آئی۔''

''اگر تمہارے آدمی کئی گھنٹے سے اس جگہ کی نگرانی کر رہے تھے تو فتح خان کے نکلنے کا انہیں پتا نہیں چلا؟''

''نہیں..... کیونکہ وہ کسی اور راستے سے نکل گیا تھا۔''

''انفرا ریڈ ویژن استعمال نہیں کر رہے تھے؟''

''روشنی اچھی تھی اس لیے ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔ ہم نے جانے والوں کا معائنہ کیا اور ان میں فتح خان کو نہ پا کر تب ہمیں پتا چلا کہ وہ نکل گیا ہے۔ دراصل وہ اپنے آدمیوں سے بھی الگ رہتا تھا اس لیے کب وہاں سے نکل گیا پتا نہیں چلا۔''

''پھر تم لوگوں نے وادی میں اس کی تلاش شروع کی؟''

''مس شا نے اس جگہ کی نشان دہی کی تھی جہاں آپ کو اور مس شا کو رکھا گیا تھا۔ بدقسمتی سے ایکشن کے شور میں ہم نہیں جان سکے کہ نیچے بھی فائرنگ ہوئی ہے۔ جب ہم ان کے درمیان پہنچے تو وہاں سوائے دو لاشوں کے اور کوئی نہ تھا پھر ہم نے وہیں گھات لگائی۔ مجھے امید تھی کہ فتح خان کسی وجہ سے پلٹے گا۔''

میں مسکرایا۔ ''وہ تو نہیں آیا میں تم لوگوں کے ٹریپ میں آگیا۔''

عبدالرحمٰن جھینپ گیا۔ ''مجھے اس غلطی پر ساری عمر ملال رہے گا۔''

''کوئی مسئلہ نہیں ہے۔'' میں نے اس کا شانہ تھپکا۔ ''غلطیاں سب سے ہو جاتی ہیں۔ تمہاری ذمے داری کیا ہے؟''

''میں یہاں محل کا سیکورٹی انچارج ہوں۔ اس کے علاوہ راجا صاحب کے تمام آدمیوں کو میں نے ہی تربیت دی ہے۔''

''تبھی مجھے حفاظتی انتظامات پہلے کے مقابلے میں کہیں بہتر نظر آئے ہیں۔'' میں نے اس کی طرف دیکھا۔ ''تم کب سے ہو یہاں؟''

''چھ مہینے ہو گئے ہیں۔''

''اس سے پہلے کہاں تھے؟''

''ایک افغان وار لارڈ کے ساتھ تھا لیکن وہ بہت ظالم تھا خاص طور سے عورتوں کے معاملے میں، تم سمجھ رہے ہونا؟''

''ہاں۔''

''ایک دن میں اسے قتل کر کے فرار ہو گیا اور پھر چھپتا چھپاتا یہاں آگیا۔ راجا صاحب نے مجھے پناہ اور ملازمت دے دی۔ اب مجھے یہاں کی شہریت بھی مل گئی ہے۔''

''شاید کچھ دن بعد بیوی بھی مل جائے گی۔''

وہ چونکا۔ ''آپ جانتے ہیں؟''

''ہاں مہرو میرے ساتھ تھی اور میں نے ہی اسے راجا صاحب کے پاس بھیجا تھا۔''

''مجھے معلوم ہے لیکن یہ نہیں معلوم تھا کہ آپ اس حد تک جان چکے ہیں۔''

''کل میری اس سے ملاقات ہوئی تھی۔ وہ یہاں بہت خوش ہے اور ظاہر ہے اس کی ایک وجہ تم بھی ہو۔''

اس نے سر ہلایا۔ ''ہاں اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے۔''

اس وقت وادی کے وسطی حصے سے گزر رہے تھے۔ یہاں بھی ہر طرف برف تھی۔ لوگ اس موسم میں اپنے گھروں میں بند ہو کر بیٹھتے ہیں.... صرف مجبوری کے عالم میں باہر نکلتے ہیں۔ کیونکہ سردی کی شدت ایسی ہوتی ہے کہ باہر نکلنے والا بیمار پڑ جائے۔ یہاں بیمار پڑنا کوئی افورڈ نہیں کر سکتا ہے کیونکہ نہ تو ڈاکٹر ہے اور نہ اسپتال ہے۔ راجا عمر دراز نے کوشش کی تھی اور یہاں سے کچھ ذہین نوجوانوں کو اپنے خرچ پر میڈیکل کالج میں تعلیم کے لیے بھیجا مگر وہ دغا دے گئے اور تعلیم مکمل کر کے واپس ہی نہیں آئے تھے۔ ورنہ اس کا ارادہ وادی میں ایک اسپتال بنانے کا بھی تھا۔ لیکن جب کوئی ڈاکٹر ہی آنے کو تیار نہیں ہے تو وہ بے چارہ اسپتال کہاں سے بناتا؟ آس پاس صرف سوات میں اسپتال..... تھا اور وہ یہاں سے بہت دور تھا اس موسم میں جانا تقریباً ناممکن تھا۔

ہم ویران راستوں سے گزرتے رہے۔ پھر سرمد کا گاؤں آیا جو کسی زمانے میں مجھے اتفاق سے راستے میں مل گیا تھا اور پھر اپنا مہمان بنا کر لے آیا تھا اور وہیں سے میرے مصائب کا دورِ اوّل شروع ہوا تھا۔ اس کی سوتیلی ماں شینا جو فتح خان کی داشتہ تھی۔ اس نے مجھ پر ڈورے ڈالنے کی کوشش کی اور نتیجے میں، میں لمبے چوڑے چکر میں آگیا۔ پہلے راجا عمر دراز کے عتاب کا شکار ہوا اور پھر فتح خان دشمن ہو گیا۔ مصائب کا یہ دور بڑی مشکل سے ختم ہوا تھا لیکن اس کا اثر فتح خان اور راجا عمر دراز کی شکل میں آج تک برقرار تھا۔ اگر فتح خان دشمن تھا تو راجا عمر دراز ہر مشکل وقت میں کام آنے والا دوست تھا۔ مجھے نہیں معلوم کہ سرمد اب بھی یہاں تھا

www.paksociety.com

یا کہیں اور چلا گیا تھا۔ وہ شہر میں پڑھ رہا تھا اور عین ممکن تھا کہ وہ وہیں کہیں سیٹ ہو گیا ہو ویسے بھی وہ مقامی رسم و رواج سے نالاں تھا خاص طور سے لڑکیوں کی خرید و فروخت سے جو شادی کے نام پر کی جاتی تھی۔ اس کا باپ اپنے لڑکیوں سے بھی کم عمر بیویاں رکھتا تھا۔ اس مقصد کے لیے روپیہ حاصل کرنے کے لیے وہ اپنی بیٹیاں فروخت کرتا تھا۔

سرمد کے گاؤں کے پاس سے گزر کر ہم اس درے کی طرف جانے لگے جو باہر سڑک تک پہنچاتا تھا۔ میں عبدالرحمٰن سے بات کرتا رہا۔ اسے فتح خان کے بارے میں علم نہیں تھا۔ اس کے بارے میں بتایا۔ اسے حیرت ہوئی کہ فتح خان اتنا خطرناک آدمی تھا جس سے راجا عمر دراز جیسا طاقتور شخص بھی پریشان تھا۔ میں نے کہا۔ ”اس سے صرف راجا صاحب ہی نہیں، میں اور میرا ایک دشمن مرشد بھی پریشان ہے۔ وہ کسی کی بھی پروا نہ کرنے والا شخص ہے۔“

”میں راجا صاحب کے آدمیوں کو جسمانی تربیت کے ساتھ ان کی ذہنی تربیت بھی کر رہا ہوں اور کچھ مقامی لوگوں کو اس طرح تربیت دے رہا ہوں کہ وہ آس پاس کے علاقے پر نظر رکھیں اور کوئی غیر معمولی بات ہو تو ہمیں فوری اطلاع مل جائے۔“

”یعنی تم جاسوسی کا نظام قائم کر رہے ہو؟“

”یہ بہت ضروری ہے، راجا صاحب جس حیثیت کے آدمی ہیں ان کو اپنے آس پاس سے لازمی باخبر رہنا چاہیے۔“

”بہت مناسب بات ہے۔“ میں نے سر ہلایا۔ خچر درے کی بلندی تک پہنچ گئے تھے یہاں سے نیچے سڑک دکھائی دے رہی تھی وہاں ایک بڑی لگژری جیپ کھڑی تھی۔ اس سفر کے دوران ایمن ذرا پیچھے اور بالکل خاموش رہی تھی۔ مشکل سے دس منٹ بعد ہم ڈھلان سے اتر کر جیپ تک پہنچ گئے تھے۔ اس کے ساتھ دونوں محافظ بھی موجود تھے۔ عبدالرحمٰن نے کہا۔ ”اس موسم میں گاڑیاں وادی میں نہیں آسکتی ہیں اس لیے انہیں سڑک کے پاس ہی ایک گیراج میں رکھا جاتا ہے۔“

”اگر راجا صاحب کو کہیں جانا ہو تو؟“

”وہ گھوڑے پر سفر کرتے ہیں۔ اس موسم میں کچے راستوں پر گاڑیاں چلانا ممکن نہیں ہوتا۔۔۔۔“ عبدالرحمٰن نے کہا اور میری طرف ہاتھ بڑھایا۔ ”اب آپ کو روانہ ہو جانا چاہیے۔ وقت بہت کم ہے کیونکہ آپ کو رات سے پہلے اسلام آباد پہنچنا ہے۔“

اس دوران میں اوپر پہاڑ پوری طرح روشنی میں آچکے تھے لیکن نیچے گھاٹیوں اور ڈھلانوں پر ابھی سایہ تھا۔ میں نے عبدالرحمٰن سے ہاتھ ملایا اور ایمن کے ساتھ جیپ کی نشست پر آگیا۔ وہ راجا عمر دراز سے الوداعی ملاقات اور سفر کے دوران خاموش رہی تھی۔ جیپ بہت کشادہ اور سہولتوں سے آراستہ بھی تھی۔ اس کا طاقتور ڈیزل انجن رہا تھا۔ عبدالرحمٰن نے اپنے آدمیوں کو ہدایت کی وہ ہما خیال رکھیں اور میرے ہر حکم کی تعمیل یہ سمجھ کر کریں کہ یہ را صاحب کا حکم ہے۔ یہ سن کر دونوں محافظ الرٹ ہو تھے۔ ہمارے بیٹھتے ہی جیپ آگے بڑھ گئی اور عبدالرحمٰن اس کا ساتھی خچر لے کر واپس روانہ ہو گئے۔ وہ بلاوجہ و ضائع کرنے والے لوگ نہیں تھے۔

ذرا سی دیر میں جیپ وادی سے آگے بل کھاتی برف آلود اور سیلی سڑک پر سوات کی طرف جا رہی تھی۔ اب اس علاقے میں متعدد نئی سڑکیں بن گئی تھیں اس سے آمد و رفت آسان ہو گئی تھی لیکن اس کے ساتھ موسم اور بے پناہ ہونے والی لینڈ سلائیڈنگ نے سفر کو دوسرے انداز میں دشوار بنا دیا تھا۔ جیپ میں خاص طور سے برف اور سیلے راستوں پر سفر کے قابل ٹائر لگے تھے۔ اس لیے یہ بہت آسانی سے چل رہی تھی ورنہ اس رفتار پر کوئی دوسری گاڑی اتنی آسانی سے سفر نہیں کر سکتی تھی۔ ایک محافظ ڈرائیونگ سیٹ پر تھا اور دوسرا اس کے برابر میں بیٹھا تھا۔ اس نے مڑ کر کہا۔

”جناب اگر آپ چاہیں تو ہمارے پاس تھرماس میں چائے اور کافی دونوں ہیں۔“

”یہ تو اچھی بات ہے، ایسا کرو کافی نکالو۔“ میں خوش ہو گیا۔

اس نے چلتی جیپ میں ہمارے لیے بہترین قسم کے مگوں میں کافی نکالی۔ میں نے صرف کافی لی تھی۔ ایمن نے اس کے ساتھ شوگر کیوب بھی لیے تھے۔ کریم ہم دونوں کو ہی پسند نہیں تھی۔ ایمن اب تک چپ تھی اس نے کافی کا پہلا گھونٹ لیا اور بولی۔

”شہباز تمہیں یقین ہے ہمیں راستے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئے گی؟“ اس کا انداز پُرفکر تھا۔

”میرا خیال ہے ایسا نہیں ہو گا۔“ میں نے کہا۔ ”ہماری روانگی خفیہ رکھی گئی ہے۔“

وہ مسکرائی۔ ”یہ لگژری جیپ دیکھنے والوں کو متوجہ کرتی ہے چھپاتی نہیں ہے اگر دشمن تاک میں ہوا تو اسے جاننے میں دشواری نہیں ہو گی کہ اس جیپ میں کون ہے؟“

”تم زیادہ ہی پریشان ہو رہی ہو۔“ میں نے اسے تسلی دی۔ ”ایسی جیپیں یہاں بہت سارے لوگوں کے پاس

شام تک ہم اسلام آباد پہنچ جائیں گے۔“

”شاید۔“ اس نے باہر دیکھتے ہوئے کہا۔ اس وقت ایک بڑے پہاڑ سے گزر رہے تھے نیچے بہت ہی گہری اور خوفناک گھاٹی تھی۔ میں نے ڈرائیور سے کہا۔

”گاڑی روکو اور میرے کچھ سوالوں کے جوابات دو۔“

ڈرائیور نے جیپ سڑک کے ایک طرف لگا دی۔ میں اترا تو وہ بھی نیچے اتر آئے۔ میں نے ایمن کو اترنے سے منع کر دیا اس لیے وہ جیپ کے اندر بیٹھی رہی۔ ”تم دونوں میں انچارج کون ہے؟“

”میں ہوں جناب۔“ ڈرائیور کے ساتھی نے جواب دیا۔

”تم دونوں نے اپنا تعارف نہیں کرایا۔“

”آپ نے پوچھا نہیں تھا جناب۔“ وہ ادب سے بولا۔ ”میرا نام انعام علی اور یہ میرا ساتھی اذل خان ہے۔“

”میرا نام تم نے سن لیا ہو گا انعام علی۔ یہ بتاؤ کہ اگر راستے میں کوئی دشمن ہمیں روکے یا حملہ کر کے ختم کرنے کی کوشش کرے تو تم لوگ کیا کرو گے؟“

”ہم تربیت یافتہ ہیں جناب دشمن کا مقابلہ کریں گے۔“ انعام علی نے کہا اس کے پاس اے کے سیونٹی فور رائفل تھی۔ رفیق کے پاس بھی ایسی ہی رائفل تھی لیکن میں نہتا تھا۔

”تمہارے پاس مزید کوئی ہتھیار ہے۔“

انعام علی جیپ کے پچھلے حصے کی طرف آیا۔ اس نے دروازہ کھولا اور اس حصے میں رکھے ایک چھوٹے دھاتی بکس کا تالا نمبر ملا کر کھولا اور جب اس نے بکس کھولا تو اس میں کئی طرح کا آتشیں اسلحہ دکھائی دیا تھا، اس میں دو عدد پستول بھی تھے۔ دو شاٹ گنز بھی ایک عدد طویل فاصلے پر مار کرنے والی اسنائپر رائفل اور دو عدد اضافی خودکار رائفلیں تھیں۔ میں نے ایک رائفل اور ایک چھوٹا پستول اور ان کے اضافی میگزین نکال لیے۔ انعام علی نے بکس بند کیا اور ہم دوبارہ جیپ میں آگئے۔ میں نے رائفل اپنے پاس رکھی اور پستول ایمن کی طرف بڑھا دیا۔

”میرا خیال ہے تم اس کا استعمال جانتی ہو۔“

”کیوں نہیں۔“ اس نے پستول لے کر اس کا معائنہ کیا اور پھر اسے معہ اضافی میگزین اپنی جیکٹ میں رکھ لیا۔

”میرا خیال ہے اب تم مطمئن ہو گئی اگر کہیں ہمیں فتح خان یا کسی اور دشمن سے واسطہ پڑ گیا تو ہم بالکل ہی نہتے نہیں ہیں۔ پھر یہ گارڈز بھی ہمارے ساتھ ہیں۔“

ایمن نے گہری سانس لی۔ ”شہباز تمہارے ساتھ رہ کر میں نے یہ دیکھا ہے کہ بعض اوقات پوری فوج بھی کام نہیں آتی اور۔۔۔ بعض دفعہ تم اکیلے ہی کام کر جاتے ہو۔“

میں ہنس دیا۔ ”ذرہ نوازی ہے تمہاری۔“

ہم انگریزی میں بات کر رہے تھے۔ وہ میرے پاس کھسک آئی۔ ”شہباز کبھی کبھی تم بہت شدت سے یاد آتے ہو۔ میری خواہش ہے تم کچھ دن کے لیے ہی سہی لیکن میرے پاس انگلینڈ آ کر رہو، بس میں اور تم ہوں کوئی تیسرا فرد نہ ہو۔“

میں نے کن انکھیوں سے گارڈز کی طرف دیکھا۔ میں نہیں جانتا تھا کہ وہ انگریزی سے واقف تھے یا نہیں۔ وہ بہر حال راجا عمر دراز کے آدمی تھے اور ممکن ہے انگریزی جانتے ہوں۔ میں نے آہستہ سے کہا۔ ”راستے میں اس قسم کی گفتگو مناسب نہیں ہے ہم بعد میں بات کریں گے۔“

”کیوں۔۔۔۔؟“

اس نے مزید کچھ کہنا چاہا لیکن میں نے اس کی بات کاٹی۔ ”پلیز۔“

ایمن منہ بنا کر خاموش ہو گئی۔ میں نے انعام علی سے پوچھا۔ ”اگر تم اس روٹ پر سفر کرتے رہے ہو تو تمہیں اندازہ ہے کہ ہم کتنی دیر میں اسلام آباد پہنچ سکتے ہیں؟“

”سات سے دس گھنٹے میں۔“ اس نے جواب دیا۔ ”موسم اور راستے پر منحصر ہے۔ پر کہیں لینڈ سلائیڈنگ ہو گئی تو بہت دیر بھی لگ سکتی ہے۔“

اس موسم میں عام طور سے زمین سخت ہو جاتی ہے اس کے باوجود لینڈ سلائیڈنگ ہوتی رہتی ہے کیونکہ درخت کم ہونے سے چٹانوں پر مٹی کی گرفت کم ہو جاتی ہے۔ ہماری عافیت اسی میں تھی کہ کہیں لینڈ سلائیڈنگ سے واسطہ نہ پڑے۔ ورنہ سفر اگلے دن بھی جاری رہ سکتا تھا۔ دو گھنٹے بعد ہم سوات میں داخل ہو رہے تھے۔ اس بار پورا شہر برف سے ڈھکا ہوا تھا۔ لگتا تھا یہاں چند دنوں میں شدید برف باری ہوئی ہے۔ انعام علی نے پوچھا کہ اگر ہم چاہیں تو یہاں کسی ہوٹل میں رک کر چائے کافی پی سکتے ہیں لیکن میں نے سفر جاری رکھنے کو کہا۔ کچھ دیر بعد ہم سوات شہر کو پیچھے چھوڑ کر وادی میں سفر کر رہے تھے۔

اذل خان اچھا ڈرائیور تھا اور پوری توجہ سے اور مناسب انداز میں ڈرائیونگ کر رہا تھا، ایسا لگتا تھا وہ اس راستے سے اچھی طرح واقف ہے اور اسے معلوم ہے کہ کہاں رفتار تیز رکھنی ہے اور کہاں کم رفتار ہی مناسب ہو گی۔ ایمن بور ہو رہی تھی ایک بار اس نے فتح خان اور سویرا کا ذکر چھیڑنا چاہا لیکن میں نے اسے منع کر دیا۔ وہ جھنجلائی۔

www.paksociety.com

"پھر میں کیا کروں؟"

"تم اپنی بات کرو، تم ان سالوں میں کیا کرتی رہیں مجھے کبھی سکون سے بیٹھ کر بات کرنے اور تمہارے بارے میں جاننے کا موقع ہی نہیں ملا۔ تو کیوں نہ ابھی جان لوں۔"

اس نے گہری سانس لی۔ "یہ لمبی کہانی ہے۔ پاپا کی گم شدگی کے وقت میں سولہ سال کی تھی اور دو سال مجھے ڈیوڈ شا کی نگرانی میں گزارنے پڑے تھے اس دوران میں وہ پاپا کی جاگیر اور خطاب ہتھیانے میں کامیاب رہا تھا۔"

"میرا خیال ہے انگلینڈ جیسے قانون پرست ملک میں اس قسم کا کام ممکن نہیں ہے۔ ڈیوڈ شا کو یہ دونوں چیزیں کسی نہ کسی قانونی راستے سے ملی ہوں گی۔"

ایمن ایک لمحے کے لیے ہچکچائی پھر بولی۔ "اصل میں اس نے اس سلسلے میں رائج ایک وصیت سے فائدہ اٹھایا ہے جو جاگیر کے سلسلے میں چلی آرہی ہے۔ اگر جاگیر اور خطاب کا مالک بغیر اولاد نرینہ چھوڑے غائب ہو جائے تو اس کی موت یا واپسی تک جاگیر اس کے بھائی یا سب سے قریبی کزن کو ملے گی۔ ڈیوڈ شا پاپا کا سب سے نزدیکی کزن ہے۔ اس نے اس شق کا فائدہ اٹھا کر جاگیر اور جائداد پر قبضہ کرلیا۔"

میں نے ایمن کی بات پر غور کیا۔ "گم شدہ آدمی کی واپسی یا اس کی موت کی تصدیق تک۔ اب برٹ شا کی موت کی تصدیق ہو جائے گی۔ اس کا مطلب ہے اس سے آگے بھی جاگیر اور خطاب کے سلسلے میں وصیت کی کوئی نہ کوئی شق ہوگی؟"

"بالکل ہے اس صورت میں یہ جاگیر اور خطاب گم شدہ شخص کو واپس یا اس کی اولاد کو ملے گی۔"

میں نے چونک کر اسے دیکھا۔ "اس کا مطلب ہے کہ جاگیر اور خطاب اب واپس تمہیں مل جائے گا۔"

"شاید۔" وہ سوچتے ہوئے بولی۔ "لیکن ڈیوڈ شا نہایت چالاک آدمی ہے، مجھے ڈر ہے وہ کوئی چال چل کر اپنا قبضہ برقرار رکھے گا۔ اس کے پاس دولت بھی ہے اور وہ بڑے سے بڑا وکیل کرسکتا ہے۔"

"تم وکیل نہیں کرسکتی ہو؟"

"اس کے پائے کا نہیں کرسکتی۔ تم جانتے ہو میں اچھا کماتی ہوں لیکن ہوں تو ایک ملازم پیشہ لڑکی اور میرے پاس زیادہ جمع پونجی نہیں ہے۔ میں بہت اچھا وکیل نہیں کرسکتی..... اور آج کل انصاف عدالت کے بجائے اچھے وکیل سے ملتا ہے۔"

میں نے ٹھنڈی سانس لی۔ "تم ٹھیک کہہ رہی ہو آج کل انصاف اسی طرح ملتا ہے اس لیے دولت والا جیت جاتا ہے چاہے وہ حقدار نہ ہو اور غریب حق پر ہوتے ہوئے روتا پیٹتا رہ جاتا ہے۔ ہمارے ہاں بھی برٹش عدالتی نظام فرق اتنا ہے کہ ہمارے کرپٹ ہو چکا ہے اور تمہارے ہا کرپٹ نہیں ہے۔"

"ہمارے ہاں بھی اس میں بہت خرابیاں آ ہیں۔" اس نے سرد آہ بھری۔ "میں نے کہا نا اب ہمار ہاں بھی انصاف اسے ملتا ہے جو بڑا وکیل کرسکتا ہو۔"

ہم سوات کی وادی سے نکل آئے تھے اور اس د سڑک اونچے نیچے پہاڑوں میں بل کھاتی گزر ر تھی۔ یہاں اکثر جگہوں پر برف صاف کر دی گئی تھی بعض مقامات پر برف موجود تھی اور جیپ کو برف پر سے گزرنا پڑتا تھا ایسی جگہوں پر اس کی رفتار بہت سست ہو تھی۔ اول خان نے جیپ ایک ایسے راستے پر گھما دی تھی میں نے پہلے نہیں دیکھا تھا۔ یہ شاید نیا راستہ تھا جو فاصلہ کم دیتا۔ مگر یہاں سڑک تنگ اور بعض مقامات سے خاصی خرا تھی۔ میں ایمن سے بات کر رہا تھا کہ اچانک اول خان نے جیپ روک دی۔ ہم نے چونک کر سامنے دیکھا تو سڑک برف کا بہت بڑا تودا نما گرا نظر آیا اور اسے ہٹائے بغیر سڑک سے گزرنا ممکن نہیں تھا۔ یہ لینڈ سلائیڈنگ نہیں تھی بلکہ او سے برف کا ڈھیر پھسل کر سڑک پر آگیا تھا اور اس پر سے گزارنا خطرے سے خالی نہیں تھا۔ انعام علی نے مڑ کر کہا "جناب یہ برف ہٹانی پڑے گی۔"

"برف کیسے ہٹاؤ گے؟"

"ہمارے پاس بیلچے ہیں جناب۔" اول خا بولا۔ "ایسے سفر میں برف صاف کرنے کے لیے رکھنے پڑ ہیں۔"

"بس تو برف صاف کرو۔" میں نے کہا۔

وہ دونوں نیچے اتر گئے۔ انہوں نے پچھلے حصے سے عدد بیلچے برآمد کیے جو شاید برف ہٹانے کے لیے تھے کیونکہ ہلکے اور چوڑے پھل والے تھے۔ اندر گرمائش کے لیے کا انجن چلتا چھوڑ دیا تھا۔ میں نے ایمن سے کہا۔ "سنو! تم تمہیں ڈیوڈ شا کے خلاف میری کسی مدد کی ضرورت ہو تو تیار پاؤ گی۔ اس میں مالی مدد بھی شامل ہے۔"

اس نے حیرت سے مجھے دیکھا۔ "میں جانتی ہو تمہارا تعلق کھاتے پیتے خاندان سے ہے لیکن اس قسم کے مقدمات میں رقم پانی کی طرح استعمال ہوتی ہے۔"

"تم اس کی فکر مت کرو۔ اس کا انتظام بھی ہو جا گا۔"

"اگر تمہارا اشارہ راجا عمر دراز کی طرف ہے تو میں چاہوں گی۔" اس نے کہا۔ "میرے ساتھ اس کا جو اس کے بعد میں اس کی طرف سے کوئی مدد قبول نہیں لی۔"

"میں راجا کی بات نہیں کررہا ہوں میرے اپنے بھی ہیں۔" میں نے سنجیدگی سے کہا۔ "میں تو اپنے لیے کسی سے کچھ مانگنے کا قائل نہیں ہوں کسی اور کے لیے کیسے تا ہوں۔"

وہ مسکرائی۔ "میں بھول جاتی ہوں تم کیسے شخص ہو کاش تم ..." اس نے جملہ ادھورا چھوڑ کر گہری سانس لی۔

"کیا کاش.....؟"

"چھوڑو اس بات....." اس کی بات اس بار بھی وری رہ گئی اور اس بار اس کا سبب ایک فائر تھا۔ میں نے کر سامنے دیکھا۔ انعام علی کے دونوں ہاتھ فضا میں بلند اور اس کے ماتھے سے خون کا فوارہ اچھل رہا تھا۔ اگلے ہی وہ پیچھے جا گرا تھا۔ اول خان وحشت زدہ انداز میں طرف دیکھ رہا تھا کہ ایک فائر ہوا اور وہ اوندھے منہ نظر آیا۔ میں نے خودکار انداز میں نیچے جھکتے ہوئے کو سیٹ کے نیچے دبایا۔

"سر مت اٹھانا۔" میں نے کہا اور دروازہ کھولتے ے ڈھلان والی طرف اتر گیا۔ میرا اندازہ تھا کہ فائر پہاڑ طرف سے ہوئے ہیں۔ میں نیچے اترا تھا کہ میرے کانوں فتح خان کی منحوس آواز آئی۔

"شہباز خان سامنے آجاؤ تمہارا دونوں آدمی ختم ہوگیا ہے۔"

جیپ کا انجن چل رہا تھا اور مجھے خیال آیا کہ میں اسے لے جاسکتا تھا لیکن فتح خان کے سر میں شیطان کا دماغ تھا۔ فوراً ہی دو فائر اور ہوئے اور پہاڑ کی طرف والے پ کے دونوں ٹائر ختم ہوگئے۔ دھماکوں کے ساتھ جیپ اس ف جھک گئی تھی۔ ایمن نے چیخ ماری تو میں فکرمند ہوگیا۔

"ایمن تم ٹھیک ہو؟"

"ہاں میں ڈر گئی تھی۔" وہ اندر سے بولی۔

"فتح خان۔" میں نے بلند آواز سے کہا۔ "تم کیوں ے پیچھے پڑ گئے ہو؟"

"شہباز خان کیا کرے اس کے سوا اور کوئی راستہ بھی ہیں ہے۔ اب اگر تم میرے دس گننے تک ہتھیار ڈال کر اور اٹھا کر سامنے نہیں آیا تو جیپ کو راکٹ لگے گا اور اس کے اتھ تمہارا ٹکڑا بھی اڑ جائے گا۔ ایک ...دو .... تین.... چار....."

فتح خان کے انداز سے لگ رہا تھا کہ وہی کرے گا جو کہہ رہا تھا۔ اس نے ایک منٹ کے اندر دو انسانوں کو مار کر اپنی سنجیدگی کا ثبوت بھی دے دیا تھا۔ وہ سات تک پہنچ گیا تھا۔ میں نے چلا کر کہا۔

"فتح خان اگر میں سامنے آؤں تو کیا ضمانت ہے کہ تم گولی نہیں چلاؤ گے؟"

"میں پاگل نہیں ہے۔" وہ بولا۔ "مارنا ہوتا تو سیدھا گاڑی پر راکٹ مارتا اور تم ابھی فرشتوں کو حساب دے رہا ہوتا۔"

پاگل تو وہ ہو رہا تھا اس لیے مستقل میرے پیچھے پڑا ہوا تھا۔ میں نے گہری سانس لی۔ "ٹھیک ہے۔"

میں نے رائفل پھینک دی اور ہاتھ اٹھا کر جیپ کے عقب سے نکل آیا فوراً ہی فتح خان نے کہا۔ "مس شا کو باہر لاؤ۔"

"تمہیں اس سے کیا مطلب ہے؟"

"اسی سے تو مطلب ہے۔" فتح خان بیہودہ لہجے میں بولا۔ "تم سے کیا مطلب ہوسکتا ہے۔"

"فتح خان تم جانتے میرے جیتے جی تم اسے کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتے۔" میں نے ٹھہرے ہوئے انداز میں کہا۔ "اس لیے بہتر ہوگا پہلے تم مجھے گولی مار دو۔"

"شہباز خان میں تم کو جانتا ہے اس لیے ایسی کوئی حرکت نہیں کرے گا۔" اس نے گویا مجھے تسلی دی۔ "پر ابھی میرے کو تم دونوں سے کام ہے۔ مس شا ابھی تک باہر نہیں آیا۔"

فتح خان کہیں دور تھا اور کسی ہلکی طاقت والے میگا فون سے بات کر رہا تھا جس کی آواز میں زیادہ گونج نہیں تھی۔ اس لیے پہاڑ پر ہونے کے باوجود اس کی آواز گونج نہیں رہی تھی۔ اس کی وارننگ کے بعد ایمن بھی گاڑی سے باہر آگئی تھی اس نے ہاتھ نہیں اٹھایا تھا۔ فتح خان نے للکار کر کہا۔ "مس شا اپنا ہاتھ اٹھاؤ۔ مجھے پتا ہے تم انگریز کتنا مکار ہوتا ہے۔"

اس کی بات پر ایمن نے بھنا کر ہاتھ اٹھا لیے تھے اور دانت پیس کر زیر لب بولی۔ "ذلیل کمینہ آدمی۔"

"تم دونوں ایسے ہی ہاتھ اٹھا کر رکھے گا۔ میرے ہاتھ میں رائفل ہے اور میرا نشانہ تم دیکھ چکا ہے۔"

میں سوچ رہا تھا کہ بھلا فتح خان کو الہام ہوا تھا کہ ہم یہیں سے گزریں گے۔ ہم کوئی اور روٹ بھی تو اختیار کرسکتے

تھے اور سب سے اہم بات کہ اس کا راجا عمر دراز کے محل میں کوئی جاسوس تھا جس نے اسے آگے اطلاع دی ہو گی۔ جاسوس کے بغیر یہ کسی طرح ممکن نہیں تھا کہ فتح خان اس طرح ہمیں روک لیتا۔ اچانک فتح خان نے کہا۔ ”اول خان ان کا تلاشی لو۔“

فتح خان کی آواز سن کر بہ ظاہر مرے پڑے اول خان کے جسم میں حرکت پیدا ہوئی اور وہ اُٹھ کر ہماری طرف بڑھا اس نے اپنی رائفل اُٹھانے کی کوشش نہیں کی تھی۔ ایمن دم بہ خود رہ گئی اور میں نے گہری سانس لی تو یہ غدار اول خان تھا۔ انعام علی تو یقینی مارا گیا تھا۔ میں نے اس کے سر سے خون کا فوارہ اُچھلتے دیکھا تھا۔ لیکن اول خان نے ڈراما کیا تھا تا کہ میں بے چوں چرا ہتھیار ڈال دوں اور میں نے واقعی ایسا ہی کیا تھا۔ وہ قریب آیا تو میں نے کہا۔ ”تم نے راجا عمر دراز سے غداری کی ہے؟“

”نہیں میں تو فتح خان کا آدمی ہوں۔“ اس نے بدلے لہجے میں کہا۔ ”راجا کے پاس بھرتی ہو گیا تھا۔ پر کام فتح خان کے لیے کرتا ہوں۔“

”تو غداری اور کسے کہتے ہیں؟“

ایمن خوف زدہ تھی۔ ”شہباز یہ سب کیا ہے؟“

”فتح خان۔“ میں نے سرد آہ بھری۔ ”لگتا ہے یہ قبر میں بھی ہمارا پیچھا نہیں چھوڑے گا۔“

اول خان نے ہم دونوں کی تلاشی لی اور نہایت صفائی سے ایمن کا پستول اور اضافی میگزین نکال لیے۔ اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ ہم کتنے مسلح تھے۔ ہم اسے گھورتے رہے لیکن اس کے خلاف کچھ کر نہیں سکتے تھے۔ ایمن پھر منمنائی۔ ”میں نے تم سے کہا تھا نا کہ راستے میں کچھ بھی ہو سکتا ہے۔“

”کیا تمہیں کوئی خدشہ تھا؟“

اس نے سر ہلایا۔ ”جب فتح خان کی قید میں تھی تو ایک بار اس نے مجھ سے کہا کہ اگر اسے ہیرے نہ ملے تو وہ ان کے برابر رقم پھر بھی حاصل کر لے گا اور میرے توسط سے حاصل کرے گا اس لیے مجھے شروع سے خدشہ تھا کہ فتح خان میرا اتنی آسانی سے پیچھا نہیں چھوڑے گا۔ دیکھ لو اس نے ٹھیک ہی کہا تھا۔“

میں نے اس کی بات پر غور کیا۔ اس دوران میں اول خان ہماری تلاشی لے کر اور اسلحہ سمیٹ کر پہاڑ کی طرف جا چکا تھا۔ کچھ دیر بعد وہ خالی ہاتھ نیچے آیا۔ اس نے گاڑی کا انجن بند کر کے چابی اپنے قبضے میں لی پھر پہلے انعام علی کی لاش کھینچ کر کھائی میں لڑھکائی اور اس کے بعد بیلچے سے برف صاف کرنے لگا۔ اس کا یا فتح خان کا مقصد کیا تھا یہ میری سمجھ میں نہیں آیا تھا۔ کیا ہمیں اسی گاڑی میں آگے کی طرف سفر کرنا تھا۔ میں اور ایمن بدستور ہاتھ اُٹھائے کھڑے تھے۔ میں نے فتح خان سے کہا۔

”ہمیں کب تک اسی طرح ہاتھ اُٹھائے کھڑے رہنا پڑے گا۔“

”بس کچھ دیر اور۔“

”فتح خان کیا تم نے اپنی صورت نہ دکھانے کا فیصلہ لیا ہے اب دور دور سے بات کرو گے۔“

”ابھی تم سے دور سے ہی بات کرے گا۔“ وہ بولا۔

اول خان طاقتور شخص تھا اس نے دس منٹ میں سڑک سے اتنی برف صاف کر دی جس سے گاڑی گزر سکتی تھی۔ میں سوچ رہا تھا کہ کیا فتح خان اکیلا ہے اور اس وجہ سے وہ سامنے آنے سے گریز کر رہا ہے۔ اس کے ساتھ صرف اول خان تھا اور وہ بھی ہمارے ساتھ آیا تھا۔ اگر فتح خان نے صرف ایک آدمی کے ساتھ ہمیں روکا تھا تو اس کی عقل پر شبہ کیا جا سکتا تھا۔ صرف ایک آدمی کے ساتھ مجھے قابو رکھنا کتنا مشکل تھا یہ بات وہ بھی جانتا تھا۔ تب اس کا کیا مقصد ہو سکتا تھا۔ مجھے لگا بہ ظاہر مقصد وہ نہیں ہے جو نظر آ رہا ہے فتح خان کسی اور چکر میں تھا۔ بہر حال جو بھی تھا وہ جلد سامنے آنے والا تھا۔ اول خان سڑک صاف کر کے پھر اوپر کی طرف چلا گیا۔ اس نے یا فتح خان نے ہم سے نہ تو چلنے کو کہا تھا اور نہ ہی ان کا ایسا کوئی ارادہ لگ رہا تھا۔ اچانک فتح خان نے حکم دیا۔

”شہباز خان.... دونوں ہاتھ سر پر رکھ کر گھٹنوں کے بل کھڑے ہو جاؤ۔“

مجھے خطرے کا احساس ہوا۔ ”وہ کیوں؟“

جواب میں ایک فائر ہوا اور گولی میرے پیر سے چند انچ آگے سڑک پر لگی۔ میں بے ساختہ پیچھے ہوا تھا۔ فتح خان نے سفاک لہجے میں کہا۔ ”شہباز خان میرے کو مجبور مت کرو کہ اگلا گولی تمہارے پاؤں میں مارے۔“

میں نے بادل ناخواستہ اس کے حکم کی تعمیل کی اس نے ایمن کے لیے کوئی حکم نہیں دیا تھا۔ وہ بدستور کھڑی رہی۔ پھر اول خان اوپر سے آتا دکھائی دیا۔ وہ گاڑی کی طرف آیا اور اس نے پچھلے حصے سے جیک، پانا اور اضافی ٹائر نکال کر گاڑی کو جیک پر اُٹھانا شروع کر دیا۔ اس جگہ وہ نظر نہیں آ رہا تھا بس کبھی کبھی اس کی جھلک نظر آتی تھی۔ اس نے پھرتی سے دس منٹ میں دونوں پہیے بدلے اور پھر پنکچر ہونے والے ٹائر اور

واپس عقبی حصے میں رکھ دیا۔ پھر اس نے اسلحے والا بکس اٹھایا اور اسے بھی لے کر اوپر چلا گیا۔

میں اب بھی سمجھ نہیں پایا تھا کہ آخر اس کا مقصد کیا تھا۔ یقیناً وہ فتح خان کی ہدایات پر عمل کر رہا تھا۔ وہ کوئی پندرہ منٹ بعد دوبارہ نیچے آیا۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ نہتا تھا۔ اسے مسلح ہونے کی ضرورت بھی نہیں تھی کیونکہ اس کا باس رائفل لیے ہمارے سروں پر موجود تھا اور دوسرے اگر میں اسے قابو کر بھی لیتا تو فتح خان کو اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ وہ نیچے آیا۔ اس کے ہاتھ میں ایک سیاہ واسکٹ نما چیز تھی۔ وہ اس نے ہم سے کوئی دس فٹ کے فاصلے پر رکھ دی اور وہ جلدی سے پیچھے ہوا اور گھوم کر سڑک کے بالکل کنارے کھائی کے ساتھ جا کھڑا ہوا تھا جہاں اس نے کچھ دیر پہلے انعام علی کی لاش اور برف گرائی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا کہ فتح خان اسے ایک ایک قدم کے بارے میں ہدایات دے رہا تھا اور وہ ان پر لفظ بہ لفظ عمل کر رہا تھا۔ اس معاملے میں فتح خان خوش قسمت تھا کہ اسے مجرم ہوتے ہوئے بھی وفادار اور جانثار ساتھی مل جاتے تھے۔

”فتح خان یہ کیا ہے؟“

”ابھی بتاتا ہے۔“ اس نے کہا۔ ”پہلے ایمن سے بولو۔ اپنا جیکٹ اور شرٹ اُتار کر اسے پہن لے۔“

فتح خان کے لہجے میں شرارت تھی۔ میں چونکا۔ ”کیوں پہن لے؟“

”سوال مت کرو۔“ اس بار فتح خان غرایا۔ ”اس سے بولو یہ پہن لے ورنہ میں اس طرح گولی مار دے گا۔“

فتح خان نے اپنا جملہ مکمل ہوتے ہی فائر کر دیا تھا۔ پہلے میں سمجھا کہ اس نے مجھے اور ایمن کو ڈرانے کے لیے فائر کیا ہے لیکن پھر ایک چیخ سنائی دی میں نے گھوم کر دیکھا تو اول خان جو آرام سے سڑک کے کنارے کھڑا تھا۔ گولی اس کے سینے میں لگی اور وہ لڑکھڑا کر پیچھے ہٹا اور پھر کھائی میں گر گیا۔ میرے یا ایمن کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ وہ اپنے ہی ساتھی کو گولی مار دے۔ ایمن چلا اُٹھی۔ ”یہ کیا کیا تم نے؟“

”اب تم کو پتا چل گیا کہ میں کیا کرے گا۔“ فتح خان نے سرد لہجے میں کہا۔ ”اگر تم نے دو منٹ کے اندر جیکٹ نہیں پہنا تو میں شہباز کو بھی اسی طرح گولی مار دے گا۔“

”ایمن تم یہ نہیں پہنو گی یہ بکواس کرتا ہے۔“ میں نے کہا ایمن کانپنے لگی تھی۔ شاید اس نے بھی محسوس کر لیا تھا کہ جیکٹ میں کوئی خطرناک چیز تھی۔ فتح خان نے کچھ نہیں کہا تھا البتہ نصف منٹ بعد اعلان کیا۔

”مس شا تمہارے پاس ڈیڑھ منٹ باقی ہے۔“

”شہباز میں پہن رہی ہوں۔“ ایمن روہانسے انداز میں بولی۔ ”ورنہ یہ وحشی تمہیں بھی مار دے گا۔“

”تم نہیں پہنو گی۔“ میں نے آہستہ سے کہا۔ ”یہ مجھے مارنے کی جرأت نہیں کر سکتا۔“

میری آواز فتح خان تک نہیں جا سکتی تھی لیکن اس نے محسوس کر لیا کہ میں ایمن کو منع کر رہا ہوں اس نے پھر فائر کیا اور اس بار بھی گولی مجھ سے چند انچ دور زمین میں لگی۔ اس نے کہا۔ ”مس شا ایک منٹ رہ گیا ہے۔“

ایمن تیزی سے جیکٹ کی طرف بڑھی اور اسے اُٹھا لیا۔ ”ایمن یہ کیا حماقت کر رہی ہو۔“ میں نے اسے روکنے کی کوشش کی۔ جیکٹ اُٹھا کر اس نے مجھے دیکھا۔

”شہباز میں تمہاری زندگی کا خطرہ مول نہیں لے سکتی۔“

فتح خان بولا۔ ”تم عقل مند ہے مس شا، اب اپنا جیکٹ اور شرٹ اُتار دو بس اندر والا کپڑا پہنے رہو اور اس پر یہ پہن لو۔“

”فتح خان۔“ میں غرایا۔

”شہباز خان تم چپ رہے گا۔“

”ہاں پلیز تم مت بولو۔“ ایمن نے کہا اور جیپ کی آڑ میں آ گئی۔ یہاں سے فتح خان اسے واضح نہیں دیکھ سکتا تھا لیکن مجھے دکھائی دے رہی تھی۔ میں نے ایک بار پھر اسے روکنے کی کوشش کی لیکن اول خان کی موت اور فتح خان کی دھمکی نے اسے دہلا دیا تھا اس نے جیکٹ کے بعد شرٹ بھی اُتارنی شروع کی تو میں نے منہ موڑ لیا تھا۔ فتح خان کا مقصد کسی حد تک میری سمجھ میں آ گیا تھا لیکن مجھے یا ایمن کو اتنی مہلت ہی نہیں ملی تھی کہ اس صورتِ حال سے عہدہ برا ہو سکتے۔ فتح خان نے نہایت پلاننگ سے کام لیا اور اول خان کو مار کر ایک تو اس نے ہمیں نفسیاتی لحاظ سے مرعوب کر لیا اور دوسرے اس سے چھٹکارا بھی حاصل کر لیا۔ وہ شاید راجا عمر دراز کے محل کی حد تک اس کے لیے کارآمد تھا اور اس سے باہر بیکار ہو گیا تھا۔ فتح خان بیکار چیز ٹھکانے لگانے کا قائل تھا۔

فتح خان نے کہا۔ ”مس شا ابھی تم کپڑے نہیں پہنے گا پہلے سامنے آؤ۔“

ایمن جیکٹ پہن کر سامنے آ گئی۔ شانوں سے کمر تک سیاہ جیکٹ نے اس کے مرمریں پیکر کو چھپا لیا تھا۔ یہ اس کے وجود پر اس طرح فٹ آ گئی تھی جیسے اسی کے لحاظ سے بنائی گئی

www.paksociety.com

ہو۔ یہ کسی قدر پھولی ہوئی تھی اگر ایمن اپنے ملک میں اور گرمی کے موسم میں ہوتی تو لوگ اسے نئے فیشن کی چیز سمجھتے۔ بہ ظاہر دیکھنے میں یہ خطرناک نہیں لگ رہی تھی۔ اس کے دودھیا بازو سیاہ جیکٹ میں بہت نمایاں ہو رہے تھے۔ چند لمحے کو میں بھول گیا کہ سچویشن کتنی سنگین ہو رہی ہے۔ اس طرح دیکھنے پر ایمن بھی پریشانی کے باوجود شرما گئی تھی۔ ”ایسے کیا دیکھ رہے ہو؟“

یہ خاصا اکسانے والا سوال تھا کہ کیا دیکھ رہے ہو اور مزید کیا دیکھنا چاہتے ہو۔ میں نے ٹھنڈی سانس لی۔ ”بہت غلط موقع پر تمہیں اس طرح دیکھ رہا ہوں۔“

”بس عاشق معشوقی کا کھیل نہیں چلے گا۔“ فتح خان کی آواز آئی اور اس بار میگا فون کے بغیر ہی پاس سے آئی تھی۔ وہ سڑک سے ذرا بلند ایک درخت سے ٹیک لگائے کھڑا تھا اور اسی لباس میں تھا جس میں وہ آخری بار مجھے نظر آیا تھا اس کا مطلب تھا کہ فرار کے بعد وہ خانہ بدوشی کی زندگی گزار رہا تھا اور اگر اس کے پاس کوئی ٹھکانہ تھا تو وہ صرف سر چھپانے کی حد تک تھا اس کا شیو بھی بڑھ گیا تھا۔ اسے دیکھ کر ایمن نے جلدی سے اپنے بازو سمیٹ لیے۔ فتح خان اس کی طرف دیکھ کر مسکرایا۔ ”شہباز خان تم محبت کے معاملے خوش قسمت ہے۔ سویرا تم سے محبت کرتا ہے اور یہ بھی تمہاری خاطر موت کا جیکٹ پہننے کو تیار ہو گیا۔“

”موت کی جیکٹ۔“ میرے اور ایمن کے منہ سے بیک وقت نکلا تھا۔ فتح خان نے سر ہلایا اور بولا۔

”مس شا تم نے جیکٹ کا نیچے والا ہک نہیں لگایا ہے۔“

ایمن نے جیکٹ بٹن لگا کر بند کر دی تھی لیکن نیچے ایک دھاتی بکل ٹائپ کی چیز نظر آ رہی تھی۔ یہ ایسا بکل تھا جو مخالف کھانچے میں فٹ ہو کر بند ہو جاتا تھا۔ جیسے ہی ایمن نے ہک لگایا جیکٹ سے ایک عجیب سے سنسناتی سی آواز آئی اور اس کے سامنے ایک چھوٹی سی روشنی جلنے بجھنے لگی تھی۔ ایمن دہشت زدہ نظر آنے لگی۔ ”یہ.... یہ کیا ہے؟“

”مس شا یہ ایک بارودی جیکٹ ہے اور اس میں موجود بم اتنا طاقتور ہے کہ تمہارے آس پاس جو بھی ہوگا وہ مارا جائے گا۔ بکل لگانے سے یہ ایکٹی ویٹ ہو گیا ہے۔“ فتح خان بولا پھر اس نے اپنی جیب سے ایک چھوٹا سا جدید قسم کا ریموٹ نکالا۔ اس پر نمبر لگے تھے اور اوپر ایک سرخ بٹن لگا تھا۔ اس نے ریموٹ اوپر کر کے اس کے کچھ بٹن دبائے اور پھر اس کا رُخ ایمن کی طرف کر کے سرخ بٹن دبا دیا وہ بے ساختہ مجھ سے دور ہوئی تھی۔ لیکن بٹن دبانے سے کچھ نہیں ہوا تھا۔ فتح خان مسکرایا۔ ”ڈرو مت مس شا، ابھی یہ صرف ایکٹی ویٹ ہوا ہے پر ایسے نہیں پھٹے گا۔ اگر تم نے اب بکل کھولا یا جیکٹ کو کسی جگہ سے کاٹا تو یہ پھٹ جائے گا۔ اسے صرف ایک ہی طریقے سے اُتارا جا سکتا ہے۔ اس ریموٹ کی مدد سے۔“ فتح خان نے کہا اور ریموٹ میری طرف اُچھال دیا۔ یہ اتنا تھا کہ کسی موبائل جیسا لگتا تھا۔ میں نے ہاتھ بڑھا کر اسے لیا۔ ”میں نے اس کا نمبر لگا دیا ہے اب وہ نمبر دبا کر سرخ بٹن دبائے گا تو جیکٹ ڈی ایکٹی ویٹ ہو جائے گا۔ اس کے علاوہ کسی کا باپ بھی اسے ڈی ایکٹی ویٹ نہیں کر سکتا ہے چاہے دنیا بھر کا ماہر بھی آ جائے۔ یہ بہت جدید جیکٹ ہے۔ یہ واٹر پروف ہے اس سے ایکسرے کا شعاع نہیں گزر سکتا اور نہ ہی کسی اور آلے سے اس کا اندر سے معائنہ کیا جا سکتا ہے۔ ایک بات اور اگر غلط نمبر دبا کر سرخ بٹن دبایا تو سوائے دھماکے کے کچھ نہیں ہوگا۔“

”اور اگر ایسے ہی کوئی بٹن دب جائے تو؟“

”اس سے کچھ نہیں ہوگا بھلے سرخ بٹن دبائے تب بھی کچھ نہیں ہوگا۔ جب تک سات نمبر نہیں ملائے گا تب تک ریموٹ بھی کام نہیں کرے گا۔ ویسے تم چاہے تو احتیاط کے طور پر اس کا سیل نکال لے۔“

میں نے فوری طور پر یہی کیا تھا اور پھر ایمن سے کہا۔ ”کپڑے پہن لو۔“

میری جان خطرے میں پا کر اس نے بلا جھجک جیکٹ پہن لی تھی لیکن اب وہ سکتے کے عالم میں تھی اسے اپنی بات سمجھانے کے لیے اسے ہلانا پڑا تھا۔ تب اس نے معمول کے سے انداز میں شرٹ اور پھر جیکٹ پہنی تھی۔ میں کسی حد تک سمجھ رہا تھا کہ فتح خان نے یہ سب کیوں کیا تھا؟ پھر بھی میں نے اس سے پوچھا۔ ”فتح خان تم یہ سب کیوں کر رہے ہو؟“

”اب تم نے کام کا سوال کیا ہے۔“ وہ مسکرایا۔ ”ایمن شا اسلام آباد جائے گا اور اگر اسے زندہ رہنا ہے تو مجھے پانچ کروڑ ڈالرز دے۔“

”تمہارا دماغ تو ٹھیک ہے۔“ میں نے غصے سے کہا۔ ”یہ کہاں سے دے سکتی ہے پانچ کروڑ ڈالرز۔“

”یہ دلوا سکتا ہے۔ یہ نہیں دے سکتا تو اس کا حکومت دے۔“ فتح خان نے سکون سے کہا۔ ”ایک بات اور بتا دے۔ جیکٹ ایکٹی ویٹ ہوتے ہی اب سات دن یا ایک سو اڑسٹھ گھنٹے کا وقت ہے۔ اس کے بعد بم خود بہ خود پھٹ جائے گا۔ تم وقت نوٹ کر لو اور اس کا حساب رکھو۔“

میں نے گھڑی کی طرف دیکھا۔ دوپہر کا ایک بج کر دس منٹ ہوئے تھے۔ فتح خان نے تقریباً دس منٹ پہلے ہی ہم اکٹی ویٹ کیا تھا۔ میں نے تلخی سے کہا۔ ”فتح خان آج کل تم ذلتوں کی سطح پر اُتر آئے ہو۔ اپنے زور بازو پر بھروسا کرنے کی بجائے ایسے حربے استعمال کر رہے ہو۔“

اس نے بالکل بُرا نہیں مانا تھا۔ ”تم چاہے تو ایسا کہہ سکتا ہے۔ مجھ کو پانچ کروڑ ڈالرز مل جائیں تو میں اس کے لیے ذلیل بننے کو بھی تیار ہوں۔“

ہمارے درمیان گفتگو انگریزی اور اردو میں ہو رہی تھی۔ جب ایمن بھی شامل ہوتی تھی تو انگریزی میں بات ہوتی تھی۔ ورنہ اردو میں بات ہوتی تھی۔ میں نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔ ”یہ ایک عام سی لڑکی ہے اور اب تو اس کا لارڈ باپ بھی نہیں ہے اس لیے حکومت اس کے بدلے پانچ کروڑ ڈالرز نہیں دے گی تم بلاوجہ ایک انسان کو اپنی لالچ کی بھینٹ چڑھا رہے ہو۔“

”اگر پانچ کروڑ ڈالرز نہیں دے گا تو ساری دنیا میں بدنامی سمیٹے گا کہ اپنے ایک شہری کو نہیں بچا سکا۔“

”فتح خان....“

میں نے کہنا چاہا لیکن فتح خان نے میری بات کاٹ کر اشارہ کیا۔ ”شہباز خان اب تم جا سکتا ہے۔“

وہ پیچھے ہٹا تھا تو میں نے جلدی سے کہا۔ ”سویرا کہاں ہے؟“

”وہ شہلا کے پاس ہے اب میرا اور اس کا معاملہ ختم ہو گیا ہے تم جا کر اس سے سویرا کو لے لو۔“

میرا دماغ گھوم گیا تھا۔ ”فتح خان اسے تم نے اغوا کیا ہے اور مجھے تم سے ہی چاہیے۔“

”میرا تلاشی لے لو میرے پاس نہیں ہے۔“ اس نے استہزائیہ انداز میں کہا۔ ”شہباز خان ہوش سے کام لو شہلا نے اس کا کیا کرنا ہے وہ اسے چھوڑ دے گا یا چھوڑ دیا ہوگا اس کا مجھے نہیں معلوم۔“

”وہ تمہارے حکم کے بغیر اسے نہیں چھوڑ سکتی۔“

”میں نے کل اسے بتا دیا ہے کہ ہیرا نہیں ملا اس لیے میرا اور اس کا راہ اب الگ ہے۔“

”اچھا مجھے اس کا پتا بتا دو میں خود....“

”نہیں فتح خان زبان دے چکا ہے شہلا کا پتا نہیں بتا سکتا تم خود تلاش کر لو۔“ وہ بولا اور رائفل کا رُخ میری طرف کر دیا۔ ”اب جاؤ رکو مت ورنہ میں کم سے کم ایک گولی تو مار دے گا۔ جیپ مس شا بھی ڈرائیو کر سکتا ہے یہ تم کو پہلے اسپتال لے جائے گا اور وہاں سے تمہیں پولیس لے جائے گا۔“

حالات نے ایک بار پھر مجھے فتح خان کے سامنے بے بس کر دیا تھا۔ اس نے نہایت مکاری سے کام لیا تھا اور اس طرح سے وار کیا جس کے بارے میں ہم نے سوچا تک نہیں تھا جب جیپ یہاں رکی اور فتح خان کی آواز آئی تو میرا خیال تھا کہ ہم ایک بار پھر اس کے قیدی بن گئے ہیں لیکن اس بار اس نے حکمت عملی بدل دی تھی۔ اس نے ہمیں جسمانی قیدی نہیں بنایا تھا لیکن اس کے باوجود ہم اس کی گرفت میں آ گئے تھے اور اس کے مقاصد کی تکمیل کے لیے مجبور تھے۔ اسے بہر صورت ہیرے یا ان کی مالیت کی رقم درکار تھی اور اس کے لیے وہ کسی بھی حد کو جانے کے لیے تیار تھا۔ ایمن بدستور تنویمی کیفیت میں تھی۔ میں نے اسے ہاتھ سے پکڑ کر جیپ میں بٹھایا اور فتح خان سے کہا۔

”اب جیپ کیسے اسٹارٹ کروں چابی تو اول خان کے ساتھ ہی کھائی میں جا چکی ہے۔“

فتح خان ہنسا اور چابی میری طرف اُچھال دی۔ ”میں احمق نہیں ہے کہ اس سے چابی نہ لیتا۔“

”تم نے اسے کیوں مار دیا؟“

”بیکار تھا اس لیے ضائع کر دیا۔“ وہ بے پروائی سے بولا۔ میں ایک بار پھر اندر سے سلگ اُٹھا تھا وہ انسانی جان کے لیے یوں بات کر رہا تھا۔ میں نے خود پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

”فتح خان ہو سکتا ہے کبھی تم بھی کسی کے لیے بیکار چیز بن جاؤ۔“

وہ مکاری سے مسکرایا۔ ”تو بے شک ضائع کر دے مجھے۔ اب تم غور سے سنو اس لڑکی کو ایمبیسی تک پہنچانا تمہارا کام ہے اور یہ کام جلد ہو جانا چاہیے۔ جتنا جلدی یہ اپنوں کے پاس جائے گا اس کا جان بچنے کا اتنا ہی امکان ہوگا۔“

”میں کس خوشی میں یہ کام کروں جب کہ تم میرے معاملے سے ہاتھ اُٹھا چکے ہو؟“ میں نے تلخی سے کہا۔

”ایمن تمہارا بھی کچھ لگتا ہے۔ اس لیے تم یہ کام کرے گا۔ ویسے تمہارا مرضی ہے تم اسے یہاں چھوڑ جائے میں خود اسے ایمبیسی تک پہنچا سکتا ہے۔ اب تم جیپ میں بیٹھ کر چل دو تمہارے پاس وقت کم ہے۔“

وہ ٹھیک کہہ رہا تھا میرے پاس وقت کم تھا۔ میں پیچھے آیا اور جیپ کی ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی۔ جب تک میں جیپ اسٹارٹ کرتا اوپر فتح خان اتنی دیر میں درختوں میں کہیں غائب ہو چکا تھا۔ ایمن کی حالت بہتر ہو گئی تھی۔ مگر وہ اب بھی خوف زدہ نظر آ رہی تھی۔ اسے حوصلہ دینے کے لیے میں

ہو۔ یہ کسی قدر پھولی ہوئی تھی اگر ایمن اپنے ملک میں اور گرمی کے موسم میں ہوتی تو لوگ اسے نئے فیشن کی چیز سمجھتے۔ بہ ظاہر دیکھنے میں یہ خطرناک نہیں لگ رہی تھی۔ اس کے دودھیا بازو سیاہ جیکٹ میں بہت نمایاں ہو رہے تھے۔ چند لمحے کو میں بھول گیا کہ سچویشن کتنی سنگین ہو رہی ہے۔ اس طرح دیکھنے پر ایمن بھی پریشانی کے باوجود شرما گئی تھی۔ ”ایسے کیا دیکھ رہے ہو؟“

یہ خاصا اکسانے والا سوال تھا کہ کیا دیکھ رہے ہو اور مزید کیا دیکھنا چاہتے ہو۔ میں نے ٹھنڈی سانس لی۔ ”بہت غلط موقع پر تمہیں اس طرح دیکھ رہا ہوں۔“

”بس عاشق معشوق کا کھیل نہیں چلے گا۔“ فتح خان کی آواز آئی اور اس بار میگا فون کے بغیر ہی پاس سے آئی تھی۔ وہ سڑک سے ذرا بلند ایک درخت سے ٹیک لگائے کھڑا تھا اور اسی لباس میں تھا جس میں وہ آخری بار مجھے نظر آیا تھا اس کا مطلب تھا کہ فرار کے بعد وہ خانہ بدوشی کی زندگی گزار رہا تھا اور اگر اس کے پاس کوئی ٹھکانہ تھا تو وہ صرف سر چھپانے کی حد تک تھا اس کا شیو بھی بڑھ گیا تھا۔ اسے دیکھ کر ایمن نے جلدی سے اپنے بازو سمیٹ لیے۔ فتح خان اس کی طرف دیکھ کر مسکرایا۔ ”شہباز خان تم محبت کے معاملے خوش قسمت ہے۔ سویرا تم سے محبت کرتا ہے اور یہ بھی تمہاری خاطر موت کا جیکٹ پہننے کو تیار ہو گیا۔“

”موت کی جیکٹ۔“ میرے اور ایمن کے منہ سے بیک وقت نکلا تھا۔ فتح خان نے سر ہلایا اور بولا۔

”مس شا تم نے جیکٹ کا نیچے والا ہک نہیں لگایا ہے۔“

ایمن نے جیکٹ بٹن لگا کر بند کر دی تھی لیکن نیچے ایک دھاتی بکل ٹائپ کی چیز نظر آ رہی تھی۔ یہ ایسا بکل تھا جو مخالف کھانچے میں فٹ ہو کر بند ہو جاتا تھا۔ جیسے ہی ایمن نے ہک لگایا جیکٹ سے ایک عجیب سے سنسناتی سی آواز آئی اور اس کے سامنے ایک چھوٹی سی روشنی جلنے بجھنے لگی تھی۔ ایمن دہشت زدہ نظر آنے لگی۔ ”یہ.... یہ کیا ہے؟“

”مس شا یہ ایک بارودی جیکٹ ہے اور اس میں موجود بم اتنا طاقتور ہے کہ تمہارے آس پاس جو بھی ہوگا وہ مارا جائے گا۔ بکل لگانے سے یہ ایکٹی ویٹ ہو گیا ہے۔“ فتح خان بولا پھر اس نے اپنی جیب سے ایک چھوٹا سا جدید قسم کا ریموٹ نکالا۔ اس پر نمبر لگے تھے اور اوپر ایک سرخ بٹن لگا تھا۔ اس نے ریموٹ اوپر کر کے اس کے کچھ بٹن دبائے اور پھر اس کا رُخ ایمن کی طرف کر کے سرخ بٹن دبا دیا وہ بے ساختہ مجھ سے دور ہوئی تھی۔ لیکن بٹن دبانے سے کچھ نہیں ہوا تھا۔ فتح خان مسکرایا۔ ”ڈرو مت مس شا، ابھی یہ صرف ا[یکٹی] ویٹ ہوا ہے پر ایسے نہیں پھٹے گا۔ اگر تم نے اب بکل کو جیکٹ کو کسی جگہ سے کاٹا تو یہ پھٹ جائے گا۔ اسے صرف ایک ہی طریقے سے اُتارا جا سکتا ہے۔ اس ریموٹ کی مدد سے“ فتح خان نے کہا اور ریموٹ میری طرف اُچھال دیا۔ یہ اتنا تھا کہ کسی موبائل جیسا لگتا تھا۔ میں نے ہاتھ بڑھا کر اسے لیا۔ ”میں نے اس کا نمبر لگا دیا ہے اب وہ نمبر دبا کر سرخ دبائے گا تو جیکٹ ڈی ایکٹی ویٹ ہو جائے گا۔ اس کے کسی کا باپ بھی اسے ڈی ایکٹی ویٹ نہیں کر سکتا ہے چاہے دنیا بھر کا ماہر بھی آ جائے۔ یہ بہت جدید جیکٹ ہے۔ یہ پروف ہے اس سے ایکسرے کا شعاع نہیں گزر سکتا اور نہ کسی اور آلے سے اس کا اندر سے معائنہ کیا جا سکتا ہے۔ اور بات اور اگر غلط نمبر دبا کر سرخ بٹن دبایا تو سوائے دھماکے کچھ نہیں ہوگا۔“

”اور اگر ایسے ہی کوئی بٹن دب جائے تو؟“

”اس سے کچھ نہیں ہوگا بھلے سرخ بٹن دبائے تب کچھ نہیں ہوگا۔ جب تک سات نمبر نہیں ملائے گا تب ریموٹ بھی کام نہیں کرے گا۔ ویسے تم چاہے تو احتیاط طور پر اس کا سیل نکال لے۔“

میں نے فوری طور پر یہی کیا تھا اور پھر ایمن کہا۔ ”کپڑے پہن لو۔“

میری جان خطرے میں پا کر اس نے بلا جھجک جیکٹ پہن لی تھی لیکن اب وہ سکتے کے عالم میں تھی اسے اپنی بات سمجھانے کے لیے اسے ہلانا پڑا تھا۔ تب اس نے معمول سے انداز میں شرٹ اور پھر جیکٹ پہنی تھی۔ میں کسی حد سمجھ رہا تھا کہ فتح خان نے یہ سب کیوں کیا تھا؟ پھر بھی نے اس سے پوچھا۔ ”فتح خان تم یہ سب کیوں کر رہے ہو؟“

”اب تم نے کام کا سوال کیا ہے۔“ وہ مسکرایا۔ ”مس شا اسلام آباد جائے گا اور اگر اسے زندہ رہنا ہے تو مجھے پانچ کروڑ ڈالرز دے۔“

”تمہارا دماغ تو ٹھیک ہے۔“ میں نے غصے سے کہا۔ ”یہ کہاں سے دے سکتی ہے پانچ کروڑ ڈالرز۔“

”یہ دلوا سکتا ہے۔ یہ نہیں دے سکتا تو اس کا حکومت دے۔“ فتح خان نے سکون سے کہا۔ ”ایک بات اور سن لو۔ جیکٹ ایکٹی ویٹ ہوتے ہی اب سات دن یا ایک سو اڑسٹھ گھنٹے کا وقت ہے۔ اس کے بعد بم خود بہ خود پھٹ جائے گا۔ تم وقت نوٹ کر لو اور اس کا حساب رکھو۔“

میں نے گھڑی کی طرف دیکھا۔ دوپہر کا ایک بج

[رُ]کے ہوئے تھے۔ فتح خان نے تقریباً دس منٹ پہلے ہی [ایکٹی] ویٹ کیا تھا۔ میں نے تلخی سے کہا۔ ”فتح خان آج کل تم بزدلوں کی سطح پر اُتر آئے ہو۔ اپنے زور بازو پر بھروسا کرنے کی بجائے ایسے حربے استعمال کر رہے ہو۔“

اس نے بالکل بُرا نہیں مانا تھا۔ ”تم چاہے تو ایسا کہہ سکتا ہے۔ مجھ کو پانچ کروڑ ڈالرز مل جائیں تو میں اس کے لیے [کچھ بھی] دینے کو بھی تیار ہوں۔“

ہمارے درمیان گفتگو انگریزی اور اردو میں ہو رہی تھی۔ جب ایمن بھی شامل ہوتی تھی تو انگریزی میں بات ہوتی تھی۔ ورنہ اردو میں بات ہوتی تھی۔ میں نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔ ”یہ ایک عام سی لڑکی ہے اور اب تو اس کا لارڈ باپ بھی نہیں ہے اس لیے حکومت اس کے بدلے پانچ کروڑ ڈالرز نہیں دے گی تم بلاوجہ ایک انسان کو اپنی لالچ کی بھینٹ چڑھا رہے ہو۔“

”اگر پانچ کروڑ ڈالرز نہیں دے گا تو ساری دنیا میں بدنامی سمیٹے گا کہ اپنے ایک شہری کو نہیں بچا سکا۔“

”فتح خان.....“

میں نے کہنا چاہا لیکن فتح خان نے میری بات کاٹ کر اشارہ کیا۔ ”شہباز خان اب تم جا سکتا ہے۔“

وہ پیچھے ہٹا تھا تو میں نے جلدی سے کہا۔ ”سویرا کہاں ہے؟“

”وہ شہلا کے پاس ہے اب میرا اور اس کا معاملہ ختم ہو گیا ہے تم جا کر اس سے سویرا کو لے لو۔“

میرا دماغ گھوم گیا تھا۔ ”فتح خان اسے تم نے اغوا کیا ہے اور مجھے تم سے ہی چاہیے۔“

”میرا تلاشی لے لو میرے پاس نہیں ہے۔“ اس نے استہزائیہ انداز میں کہا۔ ”شہباز خان ہوش سے کام لو شہلا نے اس کا کیا کرنا ہے وہ اسے چھوڑ دے گا یا چھوڑ دیا ہوگا اس کا مجھے نہیں معلوم۔“

”وہ تمہارے حکم کے بغیر اسے نہیں چھوڑ سکتی ہے۔“

”میں نے کل اسے بتا دیا ہے کہ ہیرا نہیں ملا اس لیے میرا اور اس کا راہ اب الگ ہے۔“

”اچھا مجھے اس کا پتا بتا دو میں خود.....“

”نہیں فتح خان زبان دے چکا ہے شہلا کا پتا نہیں بتا سکتا تم خود تلاش کر لو۔“ وہ بولا اور رائفل کا رُخ میری طرف کر دیا۔ ”اب جاؤ رکو مت ورنہ میں کم سے کم ایک گولی تو مار دے گا۔ جیپ مس شا بھی ڈرائیو کر سکتا ہے یہ تم کو پہلے اسپتال لے جائے گا اور وہاں سے تمہیں پولیس لے جائے گا۔“

حالات نے ایک بار پھر ہمیں فتح خان کے ہاتھوں بے بس کر دیا تھا۔ اس نے نہایت مکاری سے کام لیا تھا اور اس طرح سے وار کیا جس کے بارے میں ہم نے سوچا تک نہیں تھا جب جیپ یہاں رکی اور فتح خان کی آواز آئی تو میرا خیال تھا کہ ہم ایک بار پھر اس کے قیدی بن گئے ہیں لیکن اس بار اس نے حکمت عملی بدل دی تھی۔ اس نے ہمیں جسمانی قیدی نہیں بنایا تھا لیکن اس کے باوجود ہم اس کی گرفت میں آ گئے تھے اور اس کے مقاصد کی تکمیل کے لیے مجبور تھے۔ اسے بہر صورت ہیرے یا ان کی مالیت کی رقم درکار تھی اور اس کے لیے وہ کسی بھی حد کو جانے کے لیے تیار تھا۔ ایمن بدستور تنویمی کیفیت میں تھی۔ میں نے اسے ہاتھ سے پکڑ کر جیپ میں بٹھایا اور فتح خان سے کہا۔

”اب جیپ کیسے اسٹارٹ کروں چابی تو اول خان کے ساتھ ہی کھائی میں جا چکی ہے۔“

فتح خان ہنسا اور چابی میری طرف اُچھال دی۔ ”میں احمق نہیں ہے کہ اس سے چابی نہ لیتا۔“

”تم نے اسے کیوں مار دیا؟“

”بیکار تھا اس لیے ضائع کر دیا۔“ وہ بے پروائی سے بولا۔ میں ایک بار پھر اندر سے سلگ اُٹھا تھا وہ انسانی جان کے لیے یوں بات کر رہا تھا۔ میں نے خود پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

”فتح خان ہو سکتا ہے کبھی تم بھی کسی کے لیے بیکار چیز بن جاؤ۔“

وہ مکاری سے مسکرایا۔ ”تو بے شک ضائع کر دے مجھے۔ اب تم غور سے سنو اس لڑکی کو ایمبیسی تک پہنچانا تمہارا کام ہے اور یہ کام جلد ہو جانا چاہیے۔ جتنا جلدی یہ اپنوں کے پاس جائے گا اس کا جان بچنے کا اتنا ہی امکان ہوگا۔“

”میں کس خوشی میں یہ کام کروں جبکہ تم میرے معاملے سے ہاتھ اُٹھا چکے ہو؟“ میں نے تلخی سے کہا۔

”ایمن تمہارا ابھی کچھ لگتا ہے۔ اس لیے تم یہ کام کرے گا۔ ویسے تمہارا مرضی ہے تم اسے یہاں چھوڑ جائے میں خود اسے ایمبیسی تک پہنچا سکتا ہے۔ اب تم جیپ میں بیٹھ کر چل دو تمہارے پاس وقت کم ہے۔“

وہ ٹھیک کہہ رہا تھا میرے پاس وقت کم تھا۔ میں پیچھے آیا اور جیپ کی ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی۔ جب تک میں جیپ اسٹارٹ کرتا اوپر فتح خان اتنی دیر میں درختوں میں کہیں غائب ہو چکا تھا۔ ایمن کی حالت بہتر ہو گئی تھی۔ مگر وہ اب بھی خوف زدہ نظر آ رہی تھی۔ اسے حوصلہ دینے کے لیے میں

ہو۔ یہ کسی قدر پھولی ہوئی تھی اگر ایمن اپنے ملک میں اور گرمی کے موسم میں ہوتی تو لوگ اسے نئے فیشن کی چیز سمجھتے۔ بہ ظاہر دیکھنے میں یہ خطرناک نہیں لگ رہی تھی۔ اس کے دودھیا بازو سیاہ جیکٹ میں بہت نمایاں ہو رہے تھے۔ چند لمحے کو میں بھول گیا کہ چویشن کتنی سنگین ہو رہی ہے۔ اس طرح دیکھنے پر ایمن بھی پریشانی کے باوجود شرما گئی تھی۔ ”ایسے کیا دیکھ رہے ہو؟“

یہ خاصا اکسانے والا سوال تھا کہ کیا دیکھ رہے ہو اور مزید کیا دیکھنا چاہتے ہو۔ میں نے ٹھنڈی سانس لی۔ ”بہت غلط موقع پر تمہیں اس طرح دیکھ رہا ہوں۔“

”بس عاشق معشوق کا کھیل نہیں چلے گا۔“ فتح خان کی آواز آئی اور اس بار میگا فون کے بغیر ہی پاس سے آئی تھی۔ وہ سڑک سے ذرا بلند ایک درخت سے ٹیک لگائے کھڑا تھا اور اسی لباس میں تھا جس میں وہ آخری بار مجھے نظر آیا تھا اس کا مطلب تھا کہ فرار کے بعد وہ خانہ بدوشی کی زندگی گزار رہا تھا اور اگر اس کے پاس کوئی ٹھکانہ تھا تو وہ صرف سر چھپانے کی حد تک تھا اس کا شیو بھی بڑھ گیا تھا۔ اسے دیکھ کر ایمن نے جلدی سے اپنے بازو سمیٹ لیے۔ فتح خان اس کی طرف دیکھ کر مسکرایا۔ ”شہباز خان تم محبت کے معاملے خوش قسمت ہے۔ سویرا تم سے محبت کرتا ہے اور یہ بھی تمہاری خاطر موت کا جیکٹ پہننے کو تیار ہو گیا۔“

”موت کی جیکٹ۔“ میرے اور ایمن کے منہ سے بیک وقت نکلا تھا۔ فتح خان نے سر ہلایا اور بولا۔

”مس شا تم نے جیکٹ کا نیچے والا ہک نہیں لگایا ہے۔“

ایمن نے جیکٹ بٹن لگا کر بند کر دی تھی لیکن نیچے ایک دھاتی بکل ٹائپ کی چیز نظر آ رہی تھی۔ یہ ایسا بکل تھا جو مخالف کھانچے میں فٹ ہو کر بند ہو جاتا تھا۔ جیسے ہی ایمن نے بک لگایا جیکٹ سے ایک عجیب سے سنسناتی سی آواز آئی اور اس کے سامنے ایک چھوٹی سی روشنی جلنے بجھنے لگی تھی۔ ایمن دہشت زدہ نظر آنے لگی۔ ”یہ.... یہ کیا ہے؟“

”مس شا یہ ایک بارودی جیکٹ ہے اور اس میں موجود بم اتنا طاقتور ہے کہ تمہارے آس پاس جو بھی ہوگا وہ مارا جائے گا۔ بکل لگانے سے یہ ایکٹی ویٹ ہو گیا ہے۔“ فتح خان بولا پھر اس نے اپنی جیب سے ایک چھوٹا سا جدید قسم کا ریموٹ نکالا۔ اس پر نمبر لگے تھے اور اوپر ایک سرخ بٹن لگا تھا۔ اس نے ریموٹ اوپر کر کے اس کے کچھ بٹن دبائے اور پھر اس کا رُخ ایمن کی طرف کر کے سرخ بٹن دبا دیا وہ بے ساختہ مجھ سے دور ہوئی تھی۔ لیکن بٹن دبانے سے کچھ نہیں ہوا تھا۔ فتح خان مسکرایا۔ ”ڈرو مت مس شا، ابھی یہ صرف ا... ویٹ ہوا ہے پر ایسے نہیں پھٹے گا۔ اگر تم نے اب بکل کو جیکٹ کو کسی جگہ سے کاٹا تو یہ پھٹ جائے گا۔ اسے صرف ا... ہی طریقے سے اُتارا جا سکتا ہے۔ اس ریموٹ کی مدد سے“ فتح خان نے کہا اور ریموٹ میری طرف اُچھال دیا۔ یہ ا... تھا کہ کسی موبائل جیسا لگتا تھا۔ میں نے ہاتھ بڑھا کر اسے لیا۔ ”میں نے اس کا نمبر لگا دیا ہے اب وہ نمبر دبا کر سرخ دبائے گا تو جیکٹ ڈی ایکٹی ویٹ ہو جائے گا۔ اس کے کسی کا باپ بھی اسے ڈی ایکٹی ویٹ نہیں کر سکتا ہے چا... دنیا بھر کا ماہر بھی آ جائے۔ یہ بہت جدید جیکٹ ہے۔ یہ ا... پروف ہے اس سے ایکسرے کا شعاع نہیں گزر سکتا اور نہ کسی اور آلے سے اس کا اندر سے معائنہ کیا جا سکتا ہے۔ ا... بات اور اگر غلط نمبر دبا کر سرخ بٹن دبایا تو سوائے دھماکے کچھ نہیں ہوگا۔“

”اور اگر ایسے ہی کوئی بٹن دب جائے تو؟“

”اس سے کچھ نہیں ہوگا بھلے سرخ بٹن دبائے تب کچھ نہیں ہوگا۔ جب تک سات نمبر نہیں ملائے گا تب ریموٹ بھی کام نہیں کرے گا۔ ویسے تم چاہے تو احتیاط طور پر اس کا سیل نکال لے۔“

میں نے فوری طور پر یہی کیا تھا اور پھر ایمن کہا۔ ”کپڑے پہن لو۔“

میری جان خطرے میں پا کر اس نے بلا جھجک جیک... پہن لی تھی لیکن اب وہ سکتے کے عالم میں تھی اسے اپنی با... سمجھانے کے لیے اسے ہلانا پڑا تھا۔ تب اس نے معمول... سے انداز میں شرٹ اور پھر جیکٹ پہنی تھی۔ میں کسی حد تک سمجھ رہا تھا کہ فتح خان نے یہ سب کیوں کیا تھا؟ پھر بھی م... نے اس سے پوچھا۔ ”فتح خان تم یہ سب کیوں کر رہے ہو؟“

”اب تم نے کام کا سوال کیا ہے۔“ وہ مسکرایا۔ ”ا... شا اسلام آباد جائے گا اور اگر اسے زندہ رہنا ہے تو مجھے پا... کروڑ ڈالرز دے۔“

”تمہارا دماغ تو ٹھیک ہے۔“ میں نے غصے سے کہا۔ ”یہ کہاں سے دے سکتی ہے پانچ کروڑ ڈالرز۔“

”یہ دلوا سکتا ہے۔ یہ نہیں دے سکتا تو اس کا حکوم... دے۔“ فتح خان نے سکون سے کہا۔ ”ایک بات اور دے۔ جیکٹ ایکٹی ویٹ ہوتے ہی اب سات دن یا ایک اڑسٹھ گھنٹے کا وقت ہے۔ اس کے بعد بم خود بہ خود پھٹ جا... گا۔ تم وقت نوٹ کر لو اور اس کا حساب رکھو۔“

میں نے گھڑی کی طرف دیکھا۔ دوپہر کا ایک بج ک...

... مد ہوئے تھے۔ فتح خان نے تقریباً دس منٹ پہلے ہی ... ایکٹی ویٹ کیا تھا۔ میں نے تلخی سے کہا۔ ”فتح خان آج کل ... دہشت گردوں کی سطح پر اُتر آئے ہو۔ اپنے زور بازو پر بھروسا کرنے کی بجائے ایسے حربے استعمال کر رہے ہو۔“

اس نے بالکل برا نہیں مانا تھا۔ ”تم چاہے تو ایسا کہہ سکتا ہے۔ مجھ کو پانچ کروڑ ڈالرز مل جائیں تو میں اس کے لیے ... دہشت گرد بننے کو بھی تیار ہوں۔“

ہمارے درمیان گفتگو انگریزی اور اردو میں ہو رہی تھی۔ جب ایمن بھی شامل ہوتی تھی تو انگریزی میں بات ہوتی تھی۔ ورنہ اردو میں بات ہوتی تھی۔ میں نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔ ”یہ ایک عام سی لڑکی ہے اور اب تو ا... کا لارڈ باپ بھی نہیں ہے اس لیے حکومت اس کے بدلے پانچ کروڑ ڈالرز نہیں دے گی تم بلاوجہ ایک انسان کو اپنی لالچ کی بھینٹ چڑھا رہے ہو۔“

”اگر پانچ کروڑ ڈالرز نہیں دے گا تو ساری دنیا میں بدنامی سمیٹے گا کہ اپنے ایک شہری کو نہیں بچا سکا۔“

”فتح خان....“

میں نے کہنا چاہا لیکن فتح خان نے میری بات کاٹ کر اشارہ کیا۔ ”شہباز خان اب تم جا سکتا ہے۔“

وہ پیچھے ہٹا تھا تو میں نے جلدی سے کہا۔ ”سویرا کہاں ہے؟“

”وہ شہلا کے پاس ہے اب میرا اور اس کا معاملہ ختم ہو گیا ہے تم جا کر اس سے سویرا کو لے لو۔“

میرا دماغ گھوم گیا تھا۔ ”فتح خان اسے تم نے اغوا کیا ہے اور مجھے تم سے ہی چاہیے۔“

”میرا تلاشی لے لو میرے پاس نہیں ہے۔“ اس نے استہزائیہ انداز میں کہا۔ ”شہباز خان ہوش سے کام لو شہلا نے اس کا کیا کرنا ہے وہ اسے چھوڑ دے گا یا چھوڑ دیا ہوگا اس کا مجھے نہیں معلوم۔“

”وہ تمہارے حکم کے بغیر اسے نہیں چھوڑ سکتی ہے“

”میں نے کل اسے بتا دیا ہے کہ ہیرا نہیں ملا اس لیے میرا اور اس کا راہ اب الگ ہے۔“

”اچھا مجھے اس کا پتا بتا دو میں خود....“

”نہیں فتح خان زبان دے چکا ہے شہلا کا پتا نہیں بتا ... تم خود تلاش کر لو۔“ وہ بولا اور رائفل کا رُخ میری طرف کر دیا۔ ”اب جاؤ ڈرو مت ورنہ میں کم سے کم ایک گولی تو مار دے گا۔ جیپ مس شا بھی ڈرائیو کر سکتا ہے یہ تم کو پہلے اسپتال لے جائے گا اور وہاں سے تمہیں پولیس لے جائے گا۔“

حالات نے ایک بار پھر مجھے فتح خان کے سامنے بے بس کر دیا تھا۔ اس نے نہایت مکاری سے کام لیا تھا اور اس طرح سے وار کیا جس کے بارے میں ہم نے سوچا تک نہیں تھا جب جیپ یہاں رکی اور فتح خان کی آواز آئی تو میرا خیال تھا کہ ہم ایک بار پھر اس کے قیدی بن گئے ہیں لیکن اس بار اس نے حکمت عملی بدل دی تھی۔ اس نے ہمیں جسمانی قیدی نہیں بنایا تھا لیکن اس کے باوجود ہم اس کی گرفت میں آ گئے تھے اور اس کے مقاصد کی تکمیل کے لیے مجبور تھے۔ اسے بہر صورت ہیرے یا ان کی مالیت کی رقم درکار تھی اور اس کے لیے وہ کسی بھی حد کو جانے کے لیے تیار تھا۔ ایمن بدستور تنویمی کیفیت میں تھی۔ میں نے اسے ہاتھ سے پکڑ کر جیپ میں بٹھایا اور فتح خان سے کہا۔

”اب جیپ کیسے اسٹارٹ کروں چابی تو اول خان کے ساتھ ہی کھائی میں جا چکی ہے۔“

فتح خان ہنسا اور چابی میری طرف اُچھال دی۔ ”میں احمق نہیں ہے کہ اس سے چابی نہ لیتا۔“

”تم نے اسے کیوں مار دیا؟“

”بیکار تھا اس لیے ضائع کر دیا۔“ وہ بے پروائی سے بولا۔ میں ایک بار پھر اندر سے سلگ اُٹھا تھا وہ انسانی جان کے لیے یوں بات کر رہا تھا۔ میں نے خود پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

”فتح خان ہو سکتا ہے کبھی تم بھی کسی کے لیے بیکار چیز بن جاؤ۔“

وہ مکاری سے مسکرایا۔ ”تو بے شک ضائع کر دے مجھے۔ اب تم غور سے سنو اس لڑکی کو ایمبیسی تک پہنچانا تمہارا کام ہے اور یہ کام جلد ہو جانا چاہیے۔ جتنا جلدی یہ اپنوں کے پاس جائے گا اس کا جان بچنے کا اتنا ہی امکان ہوگا۔“

”میں کس خوشی میں یہ کام کروں جب کہ تم میرے معاملے سے ہاتھ اٹھا چکے ہو؟“ میں نے تلخی سے کہا۔

”ایمن تمہارا بھی کچھ لگتا ہے۔ اس لیے تم یہ کام کرے گا۔ ویسے تمہارا مرضی ہے تم اسے یہاں چھوڑ جائے میں خود اسے ایمبیسی تک پہنچا سکتا ہے۔ اب تم جیپ میں بیٹھ کر چل دو تمہارے پاس وقت کم ہے۔“

وہ ٹھیک کہہ رہا تھا میرے پاس وقت کم تھا۔ میں پیچھے آیا اور جیپ کی ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی۔ جب تک میں جیپ اسٹارٹ کرتا اور فتح خان اتنی دیر میں درختوں میں کہیں غائب ہو چکا تھا۔ ایمن کی حالت بہتر ہو گئی تھی۔ مگر وہ اب بھی خوف زدہ نظر آ رہی تھی۔ اسے حوصلہ دینے کے لیے میں

ہنسا۔ ”اس وقت تو اتنی بہادری سے جیکٹ پہن لی تھی اور اب یہ حالت ہوگئی۔“

اس نے میرے شانے پر سر رکھ دیا۔ ”اس وقت میں تمہارے لیے فکر مند تھی مجھے لگ رہا تھا کہ فتح خان کہیں تمہیں گولی ہی نہ مار دے۔“

”تم نے بہت عجلت دکھائی۔“ میں نے توجہ سامنے رکھتے ہوئے کہا، یہاں سڑک بہت تنگ اور خراب تھی۔ درحقیقت میں نہیں جانتا تھا کہ میں کہاں تھا اور اس سڑک پر سفر کرتے رہنے کے سوا میرے پاس کوئی اور راستہ نہیں تھا تاہم یہاں رکے رہے اور فائرنگ بھی ہوئی مگر اس دوران میں یہاں کوئی اور گاڑی یا آدمی نظر نہیں آیا تھا۔ شاید یہ مکمل طور پر ویران جگہ تھی۔ ممکن ہے آگے چل کر کوئی آبادی مل جاتی اور پھر میں درست راستے کا تعین کرسکتا یہ تو طے تھا کہ اول خان ہمیں جان بوجھ کر اس راستے پر لایا تھا کیونکہ وہ ڈرائیور تھا اس لیے راستے کا تعین اس پر چھوڑ دیا گیا تھا اور اس نے نہ صرف ہمیں لا پھنسایا بلکہ اپنی جان سے بھی گیا مجھے افسوس انعام علی کا ہو رہا تھا جو اول خان کی سازش کی بھینٹ چڑھ گیا۔ ان دونوں کی لاشیں یہاں بے گور و کفن پڑی تھیں اور انہیں ان کے لواحقین تک پہنچانا لازمی تھا لیکن میں راستے میں بھی راجا عمر دراز کے محل سے رابطہ نہیں کرسکتا تھا۔ ہاں عبداللہ ہی اس معاملے میں کچھ کرسکتا تھا۔

ایمن بولی۔ ”اول خان کی موت نے مجھے ہلا دیا تھا۔ فتح خان حد سے زیادہ سفاک ہے۔“

میں نے سر ہلایا۔ ”اس نے بہت ترقی کرلی ہے خاص طور سے جب سے ڈیوڈ شا کے زیر سایہ آیا ہے۔“

”ڈیوڈ شا۔“ ایمن چونکی۔ ”شہباز کہیں یہ اس کی سازش تو نہیں ہے؟“

”ممکن ہے لیکن میرا خیال یہی ہے کہ فتح خان اصل میں ہیروں کے لیے پاگل ہو رہا ہے۔ اسے ہیرے نہیں ملے اس لیے وہ ان کے مساوی دولت حاصل کرنا چاہتا ہے اور اس کے لیے اس نے یہ طریقہ کار استعمال کیا ہے۔ آج کل اس کا دماغ بہت شیطانی رفتار سے کام کر رہا ہے اور وہ مجھے بھی حیران کر رہا ہے۔ جیسے یہی اس جیکٹ کا خیال۔ اس نے شاید پہلے ہی طے کرلیا تھا کہ وہ اگر ہیرے حاصل نہ کرسکا تو تمہارے ساتھ کیا کرے گا۔ ممکن ہے اس صورت میں برٹ شا بھی نہ مارا جاتا اور فتح خان تمہیں اسی طرح چھوڑ دیتا۔“

”شاید۔“ اس نے سرد آہ بھری۔ ”لیکن اب پاپا اس دنیا میں نہیں ہیں اور میں....“ اس نے جیکٹ کو ہاتھ لگایا جو لباس تلے تھی۔ ”شہباز اگر برٹش حکومت تاوان دینے کو تیار نہ ہوئی تو سات دن بعد میرا وجود اس دنیا میں نہیں ہوگا۔“

”ایسا نہیں ہوگا۔“ میں نے اسے تسلی دی۔ ”یہ برٹش گورنمنٹ کی ساکھ کا معاملہ بھی ہے اس لیے میرا خیال ہے وہ فتح خان کو رقم ادا کردے گی۔“

”اور اگر نہیں دی؟“

”تب بھی اس کا کوئی نہ کوئی حل نکل آئے گا۔“

”کاش ایسا ہو میرا سر چکرا رہا ہے۔“ اس نے پشت سے سر ٹکا لیا۔

”بہتر ہوگا تم آرام کرو، میں جلد از جلد اسلام آباد پہنچنے کی کوشش کرتا ہوں۔“

ایمن نے سر ہلایا اور سیٹ بیلٹ باندھتے ہوئے سیٹ کو ذرا جھکا لیا۔ میں نے جیپ کی رفتار تیز کی اب سڑک کشادہ تھی اور آس پاس دور پہاڑوں پر آبادی کے آثار نظر آ رہے تھے۔ میرا خیال تھا کہ جلد مجھے سڑک کے ساتھ بھی کوئی آبادی یا بازار ملے گا۔ میرا اندازہ درست ثابت ہوا تھا کچھ دیر بعد سڑک کے ساتھ دکانیں اور مکانات نظر آنے لگے۔ موسم کی وجہ سے بیشتر دکانیں بند تھیں اور صرف ایک چائے خانہ کھلا ہوا تھا۔ میں نے اس کے پاس ہی جیپ روکی اور انجن بند کرکے چابی سمیت نیچے اتر آیا۔ ایمن آنکھیں بند کرکے لیٹی تھی میں نے اسے ڈسٹرب کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ جیپ کے شیشے اس قسم کے تھے کہ باہر سے اندر نہیں دیکھا جاسکتا تھا اور دروازے لاک تھے اس لیے کوئی اندر نہیں آسکتا تھا۔

میں اُتر کر چائے خانے میں آیا جو غیر معمولی طور پر آباد تھا۔ مقامی لوگ ایک دوسرے سے جڑے بیٹھے چائے کے پیالے پر پیالے انڈیل رہے تھے۔ اصل چیز گرمی تھی چاہے وہ چائے میں تھی یا چائے خانے میں تھی۔ وہاں دھواں بھرا تھا اس کے باوجود مجھے اندر آکر بہت سکون ملا تھا باہر غضب کی سردی تھی۔ میرے لباس کی وجہ سے چائے خانے کے مالک نے مجھے خصوصی پروٹوکول دیا اور ایک غلیظ سطح والی میز پر میلا کپڑا مار کر اسے مزید غلیظ کردیا۔

”بیٹھو صاحب چائے نکالے۔“

”کیوں نہیں دوست۔“ میں بلا تکلف کرسی پر بیٹھ گیا تو اس کا چہرہ کھل اٹھا تھا اس نے جلدی سے اپنا بہترین کپ نکالا اور پتیلے سے اُبلتی چائے نکال کر اس میں چینی ملانے لگا لیکن میں نے منع کردیا۔ شکر ہے دودھ اتنا زیادہ نہیں تھا کہ اسے دودھ پتی کہا جاتا۔ میں نے پہلا گھونٹ لے کر کہا۔ ”میں اپنی بیوی کے ساتھ سوات سے اسلام آباد جا رہا ہوں لیکن شاید غلط رستے پر آنکلا ہوں کیا کوئی مجھے راستہ بتا سکتا ہے۔“

”کیوں نہیں صاحب۔“ چائے خانے کا مالک کہیں سے ایک میلا لیکن بہترین قسم کا نقشہ نکال لایا اور اسے میز پر پھیلا کر مجھے سمجھانے لگا کہ میں کس طرح جلد از جلد اسلام آباد پہنچ سکتا ہوں۔ میں نے راستہ سمجھ لیا بلکہ سمجھ گیا لیا۔ اس سڑک سے نکلتا تو باقی راستہ میرا جانا پہچانا تھا اس پر درجنوں بار سفر کر چکا تھا بس اس سڑک پر پہلی بار آیا تھا۔ شکریے کے ساتھ میں نے ایک نوٹ میز پر رکھا اور باہر نکل آیا۔ ایمن جاگ گئی تھی اور عقبی آئینے میں دیکھ کر بال بنا رہی تھی۔ مجھے دیکھ کر اس نے بال سمیٹے اور بینڈ سے پونی باندھ لی۔ اس کی ریشمی بال زیادہ لمبے نہیں تھے انہیں کھلا چھوڑتی تو مشکل سے شانوں سے نیچے آتے تھے۔ لیکن بہت گھنے اور ریشم کی سی نرمی اور ساخت لیے ہوئے تھے۔ مجھے سویرا کے اخروٹی رنگ کے بال یاد آئے جو اتنے لمبے تھے کہ اس کی کمر سے بھی نیچے آتے تھے۔

”ایسے کیا دیکھ رہے ہو؟“ ایمن نے کہا تو میں چونکا میں بہ ظاہر ایک ٹک اسے دیکھ رہا تھا حالانکہ میرا ذہن کہیں اور تھا میں نے مسکرا کر کہا۔

”دیکھ رہا ہوں اب تم زیادہ خوب صورت ہوتی جارہی ہو۔“

”اچھا۔“ وہ خوش ہوگئی۔ ”مجھ میں کیا اچھا لگا؟“ وہ مغربی عورت تھی اور اگر میں اسے کھل کر بھی بتاتا کہ مجھے اس میں کیا اچھا لگ رہا ہے تو وہ بالکل بُرا نہیں مناتی اور اسے اپنے حسن کا خراج سمجھ کر قبول کرتی۔ میں نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی۔ ”سب کچھ۔“

”کیا سب کچھ؟“

”سب کچھ سے مراد سب کچھ ہی ہوتا ہے۔ یعنی تم میں کوئی کمی یا خرابی نہیں ہے۔“ میں نے کہا تو وہ سمجھ گئی کہ میں اس موضوع پر بات نہیں کرنا چاہ رہا۔ اس لیے اس نے بات بدل دی۔

”راستہ معلوم کیا؟“

”ہاں بس یہی ایک راستہ ہے جو میرے لیے انجان ہے یہاں سے نکلیں گے تو پھر اسلام آباد تک میں آنکھ بند کرکے بھی ڈرائیونگ کرسکتا ہوں۔“

”ایسا مت کرنا۔“ وہ ہنسی۔ ”میں تمہیں زندہ سلامت دیکھنا چاہتی ہوں۔“

”میرا بھی ایسا کوئی ارادہ نہیں ہے۔“ میں نے کہا۔ ”میں تو صرف مثال دے رہا تھا کہ راستے سے اتنا واقف ہوں۔“

میں نے جیپ آگے بڑھا دی۔ ایمن اب بہتر نظر آرہی تھی اس نے ابتدائی خوف پر خاصی حد تک قابو پالیا تھا۔ اس نے عقبی حصے میں دیکھا جہاں ایک ہاٹ پاٹ رکھا تھا اس کے ساتھ چائے اور کافی کے تھرماس بھی تھے۔ دو بج رہے تھے اور اگر درمیان میں فتح خان والا معاملہ نہ آجاتا تو اس وقت مجھے بھوک لگ رہی ہوتی۔ ایمن نے کھانے کا پوچھا۔ میں نے انکار کردیا۔ ”نہیں تم کھالو میں ذرا دیر بعد کھاؤں گا۔“

”کافی نکال دوں۔“

”نہیں میں توجہ سے ڈرائیونگ کرنا چاہتا ہوں۔“

سڑک ایک بار پھر تنگ اور موڑ والی ہو رہی تھی۔ یہ بڑی اونچی پُرپیچ پہاڑیاں تھیں جن سے گزرتی سڑک بھی بار بار گھومنے پر مجبور ہو رہی تھی۔ یہاں ذرا سی بے پروائی حادثے کا سبب بن سکتی تھی۔ میں پوری توجہ سے ڈرائیو کر رہا تھا اور ایمن کھانے پینے میں مصروف تھی مجھے ایک بار پھر اس کے اعصاب کی مضبوطی پر حیرت ہوئی۔ اگر کوئی عام عورت ہوتی تو اس وقت اس پر غشی یا ہسٹریا کے دورے پڑ رہے ہوتے۔ اسے بھی شروع میں سکتہ ہوا تھا لیکن اب اس نے خود کو سنبھال لیا تھا اور سکون سے سینڈوچز کھا رہی تھی۔ ایسا لگا جیسے اس نے بارودی جیکٹ کو اپنا لباس سمجھ کر قبول کرلیا ہو۔ سینڈوچز کھا کر اس نے اپنے لیے کافی نکالی اور میری طرف دیکھا۔

”شہباز میرا خیال ہے اس معاملے میں تمہارا سامنے آنا مناسب نہیں ہوگا۔“

”تم نے ٹھیک سوچا ہے۔ میں پولیس کو اور اس سے بھی زیادہ مرشد کو مطلوب ہوں اس لیے میرا منظر عام پر آنا مناسب نہیں ہوگا دوسرے اگر میں تمہارے ساتھ نتھی ہوا تو ممکن ہے اس سے تمہارا یہ معاملہ کوئی اور رُخ اختیار کر جائے۔ میرا خیال ہے ڈیوڈ شا اس معاملے میں اپنا اثر بھی استعمال کرے گا کہ تاوان کی ادائیگی نہ ہونے پائے۔“

”اسے کیسے پتا چلے گا؟“

”اسے معلوم ہوجائے گا میں نے تمہیں بتایا تھا کہ وہ اس خطے میں مغربی طاقتوں کا ایجنٹ ہے اور کچھ مخصوص مقاصد کے تحت یہاں آتا جاتا رہتا ہے۔“

”مجھے یاد ہے لیکن میں نے کبھی اس بارے میں غور نہیں کیا۔“

”اس کے یہاں تعلقات بھی ہیں اور برٹش حکام پر اثر بھی رکھتا ہے اس کے لیے معلوم کرنا دشوار نہیں ہوگا۔ کم سے کم اسے برٹ شا کی موت کی اطلاع ضرور ملے گی اور وہ لازی

www.Paksociety.com

یہاں سے معلومات حاصل کرے گا۔ پورا امکان ہے کہ تمہارا معاملہ بھی اس کی نظر میں آجائے گا۔ اس کے بعد وہ اسے اپنے مفاد کے لیے استعمال کرنے کی کوشش ضرور کرے گا۔"

"ہوسکتا ہے۔" اس نے تسلیم کیا۔ "واقعی وہ مجھ سے چھٹکارے کے لیے تاوان کی ادائیگی کی مخالفت کرے گا۔ اس طرح پاپا کے ساتھ ساتھ مجھ سے بھی نجات مل جائے گی اور وہ بدستور جاگیر اور خطاب پر قابض رہے گا۔"

"جاگیر کی مالیت کیا بنتی ہے؟"

"جاگیر اور پیلس ہی تقریباً بیس ملین پاؤنڈز مالیت کے ہیں۔" ایمن نے ٹھنڈی سانس لی۔ "اور میں چالیس ہزار پاؤنڈز سالانہ کی ملازمت کرنے پر مجبور ہوں۔ میرے پاس لندن میں کرائے کا ایک چھوٹا سا فلیٹ ہے۔"

میں نے اسے تسلی دی۔ "فکر مت کرو اس مسئلے سے نمٹ لیں اس کے بعد تمہاری جاگیر کا بھی کچھ کرتے ہیں۔ اب ڈیوڈ شا اس پر اتنی آسانی سے قابض نہیں رہ سکے گا۔"

اس نے سرد آہ بھری۔ "کاش ایسا ہی ہو، مجھے جاگیر کی اتنی پروا نہیں ہے لیکن میں اسے ڈیوڈ شا کے قبضے میں بھی نہیں دیکھ سکتی ہوں۔"

"تمہیں معلوم ہے ڈیوڈ شا نے مجھے ایک پیشکش کی تھی اور میں اسے قبول کرنے پر مجبور بھی ہوگیا تھا۔ لیکن اس کے آدمی نے بدعہدی کی اور اس کی وجہ سے میں ڈیوڈ شا کے معاہدے سے آزاد ہوگیا۔"

"کیسا معاہدہ؟"

"ڈیوڈ شا نے میری مرشد سے دشمنی ختم کرانے کا معاہدہ کیا اور اس کے بدلے مجھے اس کے ساتھ ہمالیائی وادی تک جانا تھا۔ جس کا کبھی تمہارے دادا ولیم شا نے سفر کیا تھا راجا عمر دراز کے ساتھ۔"

اس نے سر ہلایا۔ "ڈیوڈ شا کے دماغ میں بھی خاندانی پاگل پن آگیا ہے۔ مجھے تو یہ وادی کا چکر دیوانگی ہی لگتا ہے۔"

میں نے سر ہلایا۔ "میں تم سے متفق ہوں اگر ہمالیہ میں کچھ لوگ ساری دنیا سے الگ ایک جگہ سکون سے بیٹھے ہیں تو کیا ضروری ہے کہ ان کو زبردستی باقی دنیا سے روشناس کرایا جائے۔ اس سے کئی طرح کی بین الاقوامی مسائل بھی کھڑے ہوسکتے ہیں کیونکہ صرف چین اور بھارت کے درمیان کئی ہزار میل متنازعہ سرحد ہے اور مغربی طاقتیں ان دونوں ممالک کو لڑا کر اپنا مفاد حاصل کرنا چاہتی ہیں۔ ممکن ہے وادی کی دریافت دونوں ملکوں میں موجود تنازعے کو جنگ کی حد تک لے جائے۔"

ایمن نے حیرت سے میری طرف دیکھا۔ "تم اس معاملے کو اتنی گہرائی سے دیکھتے ہو؟"

"ہاں کیونکہ میں دونوں ممالک کی باہمی آویزش خود دیکھ اور بھگت چکا ہوں۔ یہ ایک لاوا ہے جو اندر ہی اندر پک رہا ہے اور باقی دنیا کو اس کا علم اس وقت ہوگا جب یہ پھٹ پڑے گا۔" میں نے کہا اور ایمن کو بھارت اور پھر چین میں گزارے وقت کے بارے میں مختصر بتایا۔ ایمن حیرت زدہ سی سن رہی تھی۔ جب میں خاموش ہوا تو اس نے کہا۔

"میرا خدا یہ تو لگ رہا ہے جیسے میں جیمس بانڈ فلم کا کوئی منظر سن رہی ہوں۔"

میں نے اسے بھارتی فوج کے ساتھ کشمکش کے واقعات تو سنائے ہی نہیں تھے ورنہ وہ ماننے سے انکار کر دیتی۔ وہ واقعات ایسے تھے کہ اب میں سوچتا ہوں تو خود مجھے خواب جیسے لگتے ہیں۔ میں نے ایمن کو بریف کیس کے بارے میں نہیں بتایا تھا یہ اس کے لیے غیر متعلق چیز تھی اس لیے تذکرہ فضول تھا۔ بریف کیس اور سویرا دونوں شہلا کے پاس تھے اور میرا اپنے ساتھیوں سے رابطے کا کوئی ذریعہ نظر نہیں آیا تھا میں جس آبادی میں رکا تھا وہاں نہ تو بجلی تھی نہ فون اور نہ ہی کوئی دوسری سہولت تھی۔ لازمی بات ہے جب بجلی ہی نہیں ہے تو موبائل سروس بھی دستیاب نہیں ہوگی اب مجھے آگے جاکر ہی ایسی جگہ ملتی جہاں فون یا موبائل سروس ہوتی۔

اس دوران میں اس تنگ اور انجانے راستے سے نکل کر میں اپنے جانے پہنچانے راستے پر آگیا تھا۔ یہاں سے اسلام آباد کا سفر تقریباً پانچ گھنٹے کا تھا اور اس وقت تین بج رہے تھے تقریباً تین گھنٹے بعد یہاں روشنی نہ ہونے کے برابر رہ جاتی لیکن اس سے آگے سفر ہیڈ لائٹس کی روشنی میں کیا جا سکتا تھا۔ ایک جگہ دس منٹ کے لیے رک کر میں نے پیٹ پوجا کی اور تقریباً ٹھنڈی ہوجانے والی کافی پی اور آگے روانہ ہو گیا۔ ایک گھنٹے کے مزید سفر کے بعد مجھے پہلی آبادی ملی جس میں بجلی اور فون کی سہولت موجود تھی۔ خوش قسمتی سے وہاں ایک پی سی او بھی کھلا دکھائی دیا تھا۔ میں نے جیپ اس کے سامنے روک دی۔ پی سی او کے مالک نے چارج ریٹ لگا رکھے تھے جو نارمل سے کئی گنا زیادہ تھے۔ بہر حال وہ دور دراز ہونے کا فائدہ اُٹھا رہا تھا۔ میں نے اسے عبداللہ والی کوٹھی کا نمبر دیا اور اس نے نمبر ملا کر ریسیور مجھے تھما دیا۔ دوسری بیل پر کسی نے کال ریسیو کی۔ میں نے کہا۔

"عبداللہ سے بات کراؤ۔"

"آپ کون ہیں؟" دوسری طرف سے پوچھا گیا۔

"یہ میں عبداللہ کو بتاؤں گا تم کہہ دو کہ ہاتھ والا فون پر ہے۔"

عبداللہ جانتا تھا کہ ہاتھ والا میں ہوں میرا ہاتھ حکیم تاؤس کے علاج سے بچ گیا تھا۔ ایک منٹ سے بھی پہلے وہ لائن پر تھا وہ دوڑتا ہوا آیا تھا اس کی سانس پھولی ہوئی تھی لیکن اس نے میرا نام لینے سے گریز کیا۔ "آپ.... کہاں ہیں؟"

"فی الحال راستے میں ہوں اور تمہاری طرف آرہا ہوں۔ یہ بتاؤ کہ وہاں کیا احوال ہے؟"

"آپ کے لیے خوشخبری ہے۔" عبداللہ کے لہجے میں چہک تھی۔ "بھابی مل گئی ہیں۔ یہیں کوٹھی میں ہیں۔"

"شکر اللہ کا۔" میں نے سکون کا طویل ترین سانس لیا۔ "کوئی مسئلہ تو نہیں ہوا؟"

"نہیں مسئلہ نہیں ہوا باقی آپ آئیں گے تو معلوم ہو جائے گا۔" اس نے جواب دیا۔

"میں تقریباً پانچ گھنٹے میں پہنچ جاؤں گا۔ دوسروں کے ساتھ مجھے وہیں ملنا جہاں مجھے گورے کے آدمیوں سے چھڑایا تھا۔"

"سمجھ گیا جناب۔" عبداللہ نے کہا اور میں نے خدا حافظ کہہ کر فون رکھ دیا۔ اگرچہ کوٹھی کے فون محفوظ تھے لیکن احتیاط لازمی تھی۔ پی سی او کا مالک مجھے ذرا شک سے دیکھ رہا تھا کیونکہ میں نے تقریباً ساری ہی گفتگو گول مول انداز میں کی تھی۔ مگر مجھے اس کی ذرا بھی پروا نہیں تھی مجھے خوشخبری ہی اتنی بڑی ملی تھی۔ سویرا فتح خان اور شہلا کی قید سے نکل آئی تھی۔ میں پی سی او والے کو ادائیگی کرکے واپس آیا تو ایمن میرے چہرے سے بھانپ گئی۔

"لگتا ہے اچھی خبر ہے؟"

"ہاں سویرا مل گئی ہے اور اب محفوظ جگہ ہے۔" میں نے چہک کر کہا تو میرے والہانہ انداز پر اس کا رنگ ایک لمحے کو بدلا لیکن فوراً ہی اس نے خود کو سنبھال کر کہا۔ "مبارک ہو یہ تو بہت اچھی خبر ہے۔"

"ہاں ایک مسئلہ تو حل ہوا مگر تمہارا مسئلہ ابھی باقی ہے۔"

"تم میری فکر مت کرو، میرا مسئلہ حل ہو جائے گا اور اگر نہ ہوا تو...." اس نے جان کر بات اُدھوری چھوڑ دی۔

"ایسا نہیں ہوگا ایمن۔" میں نے ٹھوس لہجے میں کہا۔ "بے شک فتح خان ہیروں کے پیچھے پاگل ہے لیکن اتنا بھی نہیں کہ اپنے پیچھے ہمیشہ کے لیے دشمن لگا لے۔ وہ اچھی طرح جانتا ہے کہ اس کی وجہ سے میرے کسی بھی ساتھی کو ذرا نقصان ہوا تو میں ساری زندگی اس کا پیچھا نہیں چھوڑوں گا۔ مجھے امید ہے کہ اس مسئلے کا کوئی درمیانی حل نکل آئے گا۔"

"درمیانی حل؟" اس نے میری طرف دیکھا۔

"ممکن ہے فتح خان تاوان کی رقم کو نیچے لے آئے یا کوئی اور راستہ نکل آئے۔"

"تاوان کی رقم سے کوئی فرق نہیں پڑے گا کیونکہ اگر برٹش حکومت نے اسے انا کا مسئلہ بنالیا تو وہ پانچ ڈالرز تاوان بھی نہیں دے گی۔ خاص طور سے ایسا کوئی مسئلہ میڈیا میں آجائے تو حکومتیں اسے انا کا مسئلہ بنالیتی ہیں اگر خاموشی سے معاملہ نمٹ رہا ہو تو مان جاتی ہیں۔"

ایمن ٹھیک کہہ رہی تھی اگر ایسے معاملات اندرونِ خانہ طے ہوجائیں تو حکومتیں آسانی سے تاوان ادا کردیتی ہیں لیکن بات کھل جائے تو پھر معاملہ بگڑ جاتا ہے۔ یہاں بات عزت اور ساکھ کی آجاتی ہے اور ایسے مواقعوں پر حکومتیں اپنے شہریوں کو قربان کردیتی ہیں۔ میں نے کہا۔ "اگر ڈیوڈ شا درمیان میں آیا تو امکان ہے کہ معاملہ خاموشی سے طے نہیں ہوگا۔ وہ اسے کسی طریقے سے پبلک بھی کرسکتا ہے۔"

ایمن نے گہری سانس لی۔ "شہباز مجھے سب سے زیادہ خطرہ اسی بات کا ہے وہ میرا دشمن بنا ہوا ہے۔"

مجھے ایک خیال آیا۔ "ایمن تم فکر مت کرو امید ہے کہ ڈیوڈ شا ایسا کرنے سے پہلے مجھ سے بات کرے گا۔"

اس نے حیرت سے میری طرف دیکھا۔ "تم سے کیا بات کرے گا وہ؟"

"بس کرے گا ابھی میں وضاحت نہیں کرسکتا کیونکہ خود میرے ذہن میں بھی واضح نہیں ہے۔"

لیکن ایمن سچ مچ بہت ذہین نکلی وہ سمجھ گئی۔ "شاید تم ڈیوڈ شا سے ہونے والی ڈیل کی طرف اشارہ کر رہے ہو۔ وہ اس موقع سے فائدہ اُٹھا کر تم سے دوبارہ ڈیل کی بات کرے گا۔"

"اور ممکن ہے وہ تم سے جاگیر اور خطاب سے مستقل دست برداری کا معاہدہ بھی کرلے کیونکہ یہ اب اس کی عزت کا معاملہ بھی بن گیا ہوگا۔ اگر اس سے جاگیر اور خطاب چھن گیا تو وہ سوسائٹی میں کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہے گا۔ دوسری بات فتح خان اس کے لیے کام کرتا رہا ہے اور ڈیوڈ شا اس پر اتنا اثر رکھتا ہے کہ یہ مسئلہ حل کرادے۔ اگر وہ فتح خان کو حکم دے گا تو اس میں انکار کی مجال نہیں ہوگی۔"

ایمن حیران ہوئی تھی۔ "فتح خان اس سے اتنا دبتا ہے؟"

"فرض کرو کہ اگر ڈیوڈ شا تم سے معاہدہ کرنا چاہے کہ تم اگر زندہ رہنا چاہتی ہو تو جاگیر اور خطاب سے دست بردار ہو جاؤ تو تمہارا کیا ردِعمل ہوگا؟"

"جاگیر اور خطاب واپس حاصل کرنا میری بھی خواہش ہے لیکن فی الوقت میں زندہ رہنا چاہتی ہوں۔" اس نے کہا۔ "اگر وہ مجھ سے جاگیر اور خطاب سے دست بردار ہونے کو کہے گا تو میرے پاس اس کی بات مان لینے کے سوا اور کوئی راستہ نہیں ہوگا۔"

"مگر اس معاملے میں محتاط رہنا، میرا خیال ہے ڈیوڈ شا ویسے تو بڑا باوقار بنتا ہے لیکن موقع کی مناسبت سے اپنی بات سے پھر جانا اس کے لیے انوکھی بات نہیں ہوگی۔"

"تم نے اسے بالکل ٹھیک پہچانا ہے شہباز وہ ایسا ہی ہے اس کے قول و فعل پر ذرا بھی اعتبار نہیں کیا جاسکتا۔"

"بہر حال یہ معاملہ اس وقت دیکھا جائے گا جب ڈیوڈ شا اس میں ملوث ہوگا۔"

پیٹ بھرنے کے بعد ایمن کو اونگھ آنے لگی تھی، دورانِ گفتگو ہی اس کی آنکھیں خمار آلود ہونے لگی تھیں۔ میں نے اسے آرام کرنے کو کہا اور خود ڈرائیو پر توجہ دینے لگا۔ بعض مقامات پر سڑک کھلی اور سیدھی ہو جاتی تھی اس کا فائدہ اُٹھاتے ہوئے میں تیز ڈرائیو بھی کر رہا تھا لیکن اتنی تیز بھی نہیں جس میں حادثے کا خطرہ ہو۔ پانچ بجے کے بعد اندھیرا چھانے لگا تھا اور ہم مری کے پاس تھے۔ ایک ہوٹل پر رک کر جو برف باری کا سیزن دکھانے کے لیے کھلا تھا ہم نے چائے پی اور منہ ہاتھ دھو کر تازہ دم ہوئے تھے۔ حیرت انگیز طور پر ہوٹل پوری طرح بک تھا جب سے اس علاقے میں سڑکوں کا نظام بہتر ہوا تھا مری اور اس کے آس پاس ہل اسٹیشن پر تقریباً سارے سال رش رہنے لگا تھا۔ یہاں بھی برف باری ہوئی تھی بلکہ آسمان پر بادل تھے اور شاید مزید برف گرنے والی تھی۔ تازہ دم ہو کر ہم آگے روانہ ہوئے۔ ایمن نے اصرار کیا کہ وہ ڈرائیو کر لیتی ہے میں تھک گیا ہوں لیکن میں نے منع کر دیا۔

"میں ٹھیک ہوں تم فکر مت کرو۔ ویسے بھی کچھ دیر کا سفر رہ گیا ہے ہم شاید ایک گھنٹے بعد اسلام آباد میں ہوں گے۔"

آدھے گھنٹے بعد ہی اوپر سے اسلام آباد اور پنڈی کی روشنیاں نظر آنے لگی تھیں۔ درمیان میں مارگلہ آیا تو یہ روشنیاں چھپ گئیں۔ ساڑھے سات بجے ہم راول چوک کے پاس تھے۔ مجھے امید تھی کہ عبداللہ اور میرے دوسرے ساتھی راول جھیل کے اس کنارے موجود ہوں گے، جہاں مارشل مجھے مرشد کے آدمیوں کے حوالے کرنے کے لیے لایا تھا۔ راول چوک سے میں اس طرف مڑا تو ایمن چونک گئی۔ "اس طرف کہاں جا رہے ہو؟"

"ایمن تمہیں جلد از جلد سفارت خانے پہنچانا ہے تاکہ برٹش حکام اس مسئلے کا حل نکالیں۔ اب یہ بتاؤ کہ تم انہیں کیا کہانی سناؤ گی؟"

"بہت سادہ کہانی ہوگی۔ فتح خان نامی بدمعاش نے مجھے دھوکے سے میرے باپ کا حوالہ دے کر انگلینڈ سے بلایا اور یہاں بلا کر میری مدد سے میرے باپ سے ہیرے نکلوانے کی کوشش کرنے لگا۔ اس کوشش میں میرا باپ اپنی جان سے گیا تو اس نے رقم حاصل کرنے کا یہ دوسرا طریقہ سوچا اور مجھے بارودی جیکٹ پہنا کر چھوڑ دیا۔"

"مناسب کہانی ہے۔" میں نے سر ہلایا۔ "لیکن اس کی جزئیات کا خیال رکھنا ممکن اسکاٹ لینڈ یا کسی دوسری ایجنسی کے اہلکار تم سے پوچھ گچھ کرنے آجائیں۔"

"اس کی فکر مت کرو کہانی بنانی مجھے آتی ہے اس میں کسی غیر متعلق فرد کا ذکر نہیں آئے گا۔ تم بھول رہے ہو کہ میں بنیادی صحافی ہوں اور کہانی بنانا مجھے آتی ہے۔"

"واقعی میں بھول گیا تھا۔ اصل میں ہمارے ہاں صحافیوں کی بس ایک ہی قسم ہوتی ہے اور ہم ان کے سوا کسی کو صحافی نہیں سمجھتے۔"

"مغرب میں ماحولیاتی صحافیوں کا رتبہ بڑا ہوتا ہے جہاں عام صحافی قدم بھی نہیں رکھ سکتا ہے وہاں ہم بڑی آسانی سے پہنچ جاتے ہیں۔ مخصوص قوانین کے تحت ہمیں سرکاری دستاویزات تک رسائی بھی حاصل ہوتی ہے۔"

ہم جھیل کے پاس پہنچ گئے تھے۔ رات ہونے پر جھیل کے پانی سے بخارات اُٹھ رہے تھے۔ سردی کی بنا پر جگہ سنسان تھی۔ ورنہ گرمیوں میں یہاں شام کے وقت بھی خاصی رونق ہوتی ہے۔ میں نے جیپ ایک نمایاں جگہ روکی اور اس کی ہیڈ لائٹس جلتے چھوڑ کر نیچے اتر آیا۔ رات چھا چکی تھی اور ابھی دھند کا آغاز تھا اس لیے میں دور سے بھی دیکھا جاسکتا تھا مزید نمایاں ہونے کے لیے میں ہیڈ لائٹس کے سامنے آگیا اور اس کا فوری ردِعمل ہوا۔ کہیں پاس سے ہی ایک گاڑی اسٹارٹ ہوئی اور تیزی سے جیپ کے پاس آ کر رکی اور اس سے وسیم اور سفیر اُتر کر میری طرف جھپٹے اور پھر دونوں بیک وقت لپٹ گئے۔

"بدمعاش..... غائب ہونے کے عادی مجرم۔" سفیر نے مجھے مکا مارا۔ وسیم ہنستے ہوئے بولا۔

"میں اس جیسی بے تکلفی نہیں دکھا سکتا لیکن جذبات میرے بھی کم نہیں ہیں۔"

"ہاں بھائی دھکے کھا کر آنے والے کو تم لوگ بھی مار پیٹ لو۔" میں نے سرد آہ بھری۔ "لیکن پہلے یہ بتاؤ کہ عبداللہ کہاں ہے؟"

"آجاؤ یار یہ تمہارے فراق میں تڑپ رہا ہے۔" سفیر نے بلند آواز سے کہا تو ایک طرف سے رائفل بدست عبداللہ برآمد ہوا اور میرے گلے لگ گیا۔

"آپ کو ٹھیک دیکھ کر خوشی ہوئی۔"

"لیکن سب ٹھیک نہیں ہے۔" میں نے کہا۔ "سب سے پہلے تو راجا صاحب کو اطلاع دینی ہے کہ انہوں نے ہمارے ساتھ جو محافظ روانہ کیے تھے ان میں سے ایک غدار نکلا اور اس نے دوسرے کو مروا دیا وہ فتح خان کے لیے کام کر رہا تھا۔"

"فتح خان۔" وہ تینوں چونکے وسیم نے کہا۔ "یہ حرامزادہ کہاں سے آگیا؟"

"آ نہیں گیا میں مستقل اسی کی قید میں تھا اور صرف دو دن پہلے مجھے راجا صاحب کے آدمیوں نے آزاد کرایا تھا۔ وہ مجھے اور مہرو کو اس وادی کی طرف لے گیا تھا جہاں برٹ شا نے ہیرے چھپا رکھے تھے۔ صرف ہیروں کے حصول کے لیے اس نے سویرا کو حویلی سے اغوا کیا۔"

"ہم نے اسے شہلا سے حاصل کر لیا ہے لیکن وہ خود فرار ہونے میں کامیاب رہی۔" سفیر نے کہا۔

"مجھے عبداللہ سے پتا چل گیا ہے۔ بہر حال فتح خان برٹ شا کو بھی لے آیا اور اس نے دھوکے سے ایمن شا کو انگلینڈ سے بلوا لیا مقصد برٹ شا پر دباؤ ڈالنا تھا۔ مگر ایک موقع پر برٹ شا کو اس کے ساتھی نے گولی مار دی اور فتح خان ناکام رہا پھر راجا صاحب کے آدمیوں نے ہمیں آزاد... کرا لیا۔ فتح خان نے ہار نہیں مانی اور جب میں اور ایمن یہاں آنے کے لیے نکلے تو اس نے راستے میں راجا صاحب کے غدار کی مدد سے ہمیں ٹریپ کر لیا اور پھر ایمن کو بارودی جیکٹ پہنا دی۔ اس وقت وہ میرے ساتھ ہے اور اسے سامنے آئے بغیر برٹش ایمبیسی تک پہنچانا ہے۔"

"میرے خدا۔" عبداللہ کے منہ سے نکلا۔

"اس معاملے میں وقت محدود ہے کیونکہ جیکٹ نہایت جدید قسم کی ہے اسے نہ تو کسی اور طریقے سے کھولا جاسکتا ہے نہ اس کا ایکسرے لیا جاسکتا ہے اور نہ کسی اور طریقے سے اس کا اندر سے معائنہ کیا جاسکتا ہے۔ سات دن بعد یہ خود بہ خود بلاسٹ ہو جائے گی۔"

"پھر یہ کیسے اُترے گی؟" سفیر نے پوچھا۔

میں نے جیکٹ کو ناکارہ کرنے والا ریموٹ دکھایا۔ "فتح خان کا کہنا ہے کہ اسے پانچ کروڑ ڈالرز ادا کر دیے جائیں تو وہ اس ریموٹ کا کوڈ نمبر بتا دے گا نمبر دبا کر ریموٹ کا سرخ بٹن دبانے سے جیکٹ ڈی ایکٹی ویٹ ہو جائے گی اور اسے اُتارا جاسکے گا۔"

"پانچ کروڑ ڈالرز۔" سفیر نے کہا۔ "اس کا دماغ خراب ہے؟"

"لگ تو ایسا ہی رہا ہے۔" میں نے کہا اور جیپ کی طرف دیکھا۔ "اب ایمن کو اس طرح سفارت خانے پہنچانا ہے کہ کوئی اسے کسی غیر متعلق آدمی کے ساتھ نہ دیکھ سکے۔ یعنی اس سے ہمارا ذرا سا تعلق بھی ثابت نہ ہو۔"

"میں سمجھ گیا۔" عبداللہ نے کہا۔ "اس کا سب سے آسان طریقہ ہے کہ مس ایمن کو کسی ایسی جگہ پہنچا دیا جائے جہاں سے یہ سفارت خانے سے رابطہ کر سکے اور وہ خود آ کر اسے لے جائیں۔"

"یہی مناسب ہوگا۔" میں نے کہا۔ اس دوران..... ایمن بھی اُتر کر نیچے آگئی۔ سب نے اس سے ہاتھ ملایا۔ اس کے باپ کی موت کا افسوس کیا اور اس مشکل پر ہمدردی کا اظہار کیا۔

"میں تم سب کی شکر گزار ہوں۔" ایمن نے کہا اور میری طرف دیکھا۔ "میں ایمبیسی تک چلی جاؤں گی بس تم مجھے کسی ایسی جگہ پہنچا دو جہاں میں فون پر رابطہ کر سکوں۔"

"اتفاق سے ہم بھی یہی سوچ رہے تھے۔" میں نے کہا۔ "ہم تمہیں اکیلا چھوڑیں گے لیکن تم سے دور نہیں رہیں گے جب تک تم محفوظ ہاتھوں میں نہیں پہنچ جاتیں۔"

ایمن نے سر ہلایا۔ فیصلہ ہوتے ہی ہم وہاں سے واپسی کے لیے روانہ ہوئے۔ عبداللہ، سفیر اور وسیم کے ساتھ مزید کوئی نہیں تھا۔ وہ ایک گاڑی میں آئے تھے۔ ایک معروف جگہ پہنچ کر ہم نے ایمن کو اُتار دیا اور اس نے ایک ٹیکسی کی۔ جب وہ ٹیکسی روانہ ہوئی تو میری جیپ اور سفیر کی گاڑی اس کے پیچھے تھی۔ ایمن ٹیکسی میں جناح سپر پہنچی۔ وہاں اس نے ایک گارمنٹ سینٹر کے سامنے ٹیکسی رکوائی اور اُتر کر اندر چلی گئی۔ اس کے پاس مقامی کرنسی تھی۔ اسے ٹیکسی کا کرایہ ادا کرنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی تھی۔ ہم بھی کچھ دور رک گئے تھے۔ سفیر میرے پاس آگیا۔ وہ کہانی سننے کے لیے بے چین تھا لیکن میں نے انکار کر دیا۔

"مجھے معاف کرو صبح سے ڈرائیونگ کر رہا ہوں اور کہانی ایک ہی بار سناؤں گا۔ ہاں تم بتاؤ کہ سویرا تک رسائی کیسے حاصل کی؟"

"تمہارے غائب ہوتے ہی ہم نے شہلا کی تلاش شروع کر دی تھی۔ پھر عبداللہ کہیں سے ایک ہونق نوجوان کو پکڑ لایا جس کا وزن پچاس کلوگرام ہوگا اس میں نصف وزن اس کے بالوں اور عینک کا ہے۔ لیکن وہ کمپیوٹر جینئس ہے۔ اسے تم عرف عام میں ہیکرز کہہ سکتے ہو۔ اس نے شہلا کے بینک اکاؤنٹ کا نمبر اور پھر اس کا کریڈٹ کارڈ نمبر حاصل کرلیا۔ وہ جان لیتا تھا کہ کریڈٹ کارڈ کہاں استعمال ہو رہا ہے۔ دو تین بار شہلا نے ایک ہی جگہ اپنا کریڈٹ کارڈ استعمال کیا تو ہم کھٹک گئے اور اس سپر اسٹور کی نگرانی شروع کر دی۔ جلد شہلا وہاں پھر آئی اور ہم نے اس کے ٹھکانے کا پتا چلا لیا۔ یہ کل رات کی بات تھی۔ صبح وسیم اور عبداللہ نے اپنے ساتھیوں سمیت وہاں چھاپہ مارا اور سویرا مل گئی لیکن شہلا فرار ہونے میں کامیاب رہی۔"

"لعنت بھیجو اس پر، اس عورت سے دور رہنا ہی اچھا ہے ہماری قید میں ہو تب بھی ہمارے لیے مصیبت بنتی ہے۔"

"بھائی عورت نام ہی مصیبت کا ہے۔" سفیر ہنسا۔ "مجال ہے صبح سے جو لفٹ کرائی ہو، دونوں سویرا کے ساتھ لگی ہیں۔"

"تو بیٹے سویرا کا احسان مانو کہ کچھ دیر کے لیے جان چھڑا دی۔" میں نے کہا پھر ہچکچا کر پوچھا۔ "وہ ٹھیک تو ہے نا اسے کوئی تکلیف تو نہیں دی ان لوگوں نے؟"

سفیر ہنسا۔ "بیٹے تو بھی کم زن مرید نہیں نکلے گا ابھی سے اس کی کتنی فکر لگی ہے تجھے؟"

"تو کیا نہیں ہوگی فکر۔" میں نے بھنا کر کہا۔ "وہ فتح خان جیسے دشمن کی قید سے آئی ہے۔"

"اچھا نا.... ٹھیک ہے پرنی الحال بھابی کا لفظ سننے کے لیے تیار نہیں ہے۔"

"کیونکہ ابھی وہ بھابی بنی نہیں ہے۔" میں نے ملائمت سے کہا۔ "یہ بتا کہ شہلا کے ٹھکانے پر بریف کیس ملا یا نہیں؟"

"نہیں بریف کیس وہاں نہیں تھا حالانکہ ہم اس کے چکر میں پورا ایک گھنٹا وہاں رکے تھے۔"

"یعنی وہ شہلا کے قبضے میں ہے؟" میں نے کہا اور اسی لمحے میری توجہ گارمنٹ اسٹور کے سامنے رکنے والی ایک سیاہ اور بڑی لگژری گاڑی کی طرف گئی اس سے دو سفید فام اُترے اور کسی طرف دیکھے بغیر سیدھے اسٹور میں چلے گئے۔

چند منٹ بعد وہ ایمن کو لیے اندر سے برآمد ہوئے اور اسے گاڑی میں بٹھا کر رخصت ہو گئے۔ مجھے ایک لمحے کو بے چینی ہوئی تھی لیکن پھر میں نے خود کو سمجھایا کہ ایمن کے لیے یہی بہتر تھا۔ اس کے اپنے اسے بہتر تحفظ دے سکتے تھے۔ وہ جس مشکل میں پھنس گئی تھی اس میں سے یہی لوگ اسے نکال سکتے تھے بس ایک ہی خطرہ تھا کہ کہیں ڈیوڈ شا معاملے میں نہ کود پڑے۔ وہ اسے بگاڑ کر رکھ دیتا اور یہ بھی ممکن تھا کہ موت ہی ایمن کا مقدر بن جاتی۔ یہی سوچ کر میں ہچکچا گیا تھا۔ سفیر نے میرا خیال بھانپ لیا اس نے میرے شانے پر ہاتھ رکھا۔

"پریشان مت ہو یار یہ گورے بڑے حرامی ہوتے ہیں اس مسئلے کا بھی کوئی نہ کوئی حل نکال لیں گے۔"

"مجھے خوف ہے کہ ڈیوڈ شا درمیان میں آ گیا تو ایمن کے لیے اچھا نہیں ہوگا کیونکہ برٹ شا کی لاش ملنے سے جاگیر اور خطاب اس سے چھن جانے کا امکان ہے۔ گویا ایمن اس کی راہ کی سب سے بڑی رکاوٹ ثابت ہو سکتی ہے۔ وہ اس سے بہرصورت چھٹکارا حاصل کرنا چاہے گا۔"

"میرا نہیں خیال کہ وہ اتنی آسانی سے کچھ کر سکے گا۔" سفیر نے کہا۔ "بے شک وہ برطانیہ کا ایجنٹ ہے لیکن وہاں رول آف لاء ہے اور اس سے ہٹ کر تو کچھ نہیں ہوتا۔"

"خطرہ اس بات کا ہے کہ کہیں ڈیوڈ شا معاملے کو پبلک نہ کر دے اس صورت میں برٹش حکومت پر دباؤ آ جائے گا کہ وہ تاوان ادا نہ کرے کیونکہ یہ قوم کی عزت کا معاملہ ہے اور جہاں قوم کی بات آ جائے وہاں عام طور سے فردِ واحد قربان ہو جاتا ہے۔" میں نے اسے اصل خدشے سے آگاہ کیا۔

"دیکھتے ہیں بھائی ابھی تو سات دن ہیں کیا سات دن تک یہیں رہنے کا ارادہ ہے۔" سفیر نے کہا تو میں چونکا اور گاڑی اسٹارٹ کر دی۔

"آج کل کہاں بسیرا ہے؟"

"عبداللہ کی کوٹھی میں کیونکہ جناب کے اغوا کے بعد ہمیں وہ ٹھکانہ بھی مشکوک لگنے لگا تھا۔ اس لیے اسے خالی کر دیا۔ ویسے وسیم نے جی ٹی روڈ پر ایک فارم ہاؤس کرائے پر لے لیا ہے۔ کوئی چھ کنال کا ہے، اس میں تین بیڈ کی چھوٹی سی کوٹھی بھی ہے۔ ایک چوکیدار ہے۔ دور دور تک کوئی آبادی نہیں ہے اس لیے چھپنے کے لیے بہترین جگہ ہے اور پھر روڈ کے بالکل ساتھ ہے اس لیے آنے جانے میں بھی سہولت رہے گی۔"

"تو اس میں منتقل کیوں نہیں ہوئے؟"

"آج ہونے کا ارادہ تھا لیکن پتا چلا کہ جناب کی تشریف آوری ہو رہی ہے اس لیے ارادہ کل تک کے لیے ملتوی کر دیا۔ اب تم ہی فیصلہ کرو گے۔"

وسیم اور عبداللہ دوسری گاڑی میں پیچھے تھے۔ بیس منٹ بعد ہم کوٹھی پر تھے۔ اندر آتے ہوئے میرے دل کی دھڑکن ذرا تیز ہوئی تھی۔ مونا اور سعدیہ باہر آ گئی تھیں۔ اُترتے ہی انہوں نے دونوں طرف سے دبوچ لیا۔ میں نے جلدی سے کہا۔ "آرام سے .... آرام سے اصل بندے دوسری گاڑی میں ہیں آپ نے غلط بندہ پکڑ لیا ہے اور کمال ہے دونوں نے پکڑ لیا ہے۔"

"بات مت کرو۔" مونا روہانسے انداز میں بولی۔ "کتنا تنگ کرتے ہو ہمیں۔"

"ارے تو کیا میں نے کہا تھا آ بیل مجھے لے جا۔" میں نے کہا۔ "دوسرے میں چوڑیاں پہن کر تمہاری طرح گھر تو نہیں بیٹھ سکتا۔"

"بے چارے کو اندر تو آنے دو۔" وسیم نے اپنی بیگم سے کہا جو صرف رو رہی تھی۔ یوں میری گلوخلاصی ہوئی اور ہم اندر آئے میرا خیال تھا کہ سویرا اندر موجود ہوگی لیکن وہ کہیں نظر نہیں آئی۔ سفیر میری بے چینی بھانپ گیا۔

"کیا بات ہے دوست یہ نظر کس کو تلاش کر رہی ہے۔"

"کسی کو نہیں۔" میں نے گڑبڑا کر کہا۔

مونا نے سفیر کو گھورا۔ "تمہیں کیا اگر شوبی کسی کو تلاش کر رہا ہے ہوگا کوئی ایسا اپنا جو ہم سے بھی زیادہ اپنا ہو۔"

میں نے سر پکڑ لیا۔ "یہاں آ کر غلطی کی، رہتا فتح خان کی قید میں تو زیادہ سکون سے رہتا۔"

"بھئی تم سب ان کے پیچھے نہ پڑو، آپ میرے ساتھ آیئے۔" سعدیہ نے حقیقی ہمدرد کا کردار ادا کیا اور میں فوراً اس کے ساتھ چل پڑا۔ وہ مجھے ایک کمرے تک لائی اور مسکرا کر بولی۔

"یہاں ہیں وہ محترمہ جنہیں آپ یہاں وہاں تلاش کر رہے تھے۔"

"بروٹس یو ٹو۔" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا اور دروازے پر دستک دی۔ جب کوئی جواب نہیں ملا تو میں کھول کر اندر داخل ہو گیا۔ سعدیہ جا چکی تھی۔ میں نے دروازہ بند کیا تو آئینے کے سامنے کھڑی سویرا نے پلٹ کر مجھے دیکھا اور پھر جیسے اُڑ کر آئی تھی۔ ایک رنگ و خوشبو کا جہاں تھا جو میرے بازوؤں میں سمٹ آیا اور اس کے آنسو میرا سینہ بھگو رہے تھے۔ میں نے پیار سے اس کے بال سہلائے۔

"تم ٹھیک ہو نا انہوں نے تمہیں کوئی تکلیف تو نہیں دی؟"

اس نے سر اُٹھا کر دیکھا۔ "اس سے زیادہ تکلیف کی بات اور کیا ہوتی کہ میں آپ سے دور تھی اور آپ بھی ان کے قیدی تھے۔"

"شکر ہے اللہ کا میں تمہیں اپنے سامنے صحیح سلامت دیکھ رہا ہوں۔" میں نے اسے الگ کیا۔ وہ میرے لیے مقدس ہستی تھی اور میں نہیں چاہتا تھا کہ اتنے قرب سے میرے اندر اس کے لیے ذرا سا بھی کوئی جذباتی خیال آئے۔ اس نے سردی کی مناسبت سے ہلکی سبز ویلوٹ کا سوٹ پہن رکھا تھا اور اس کے ساتھ ذرا گہرے سبز رنگ کا سوئیٹر تھا۔ کھلے بال شانوں اور پشت پر پھیلے تھے اور اس کے پاس سے مسحور کن خوشبو آ رہی تھی۔ پتا نہیں اس نے کوئی خوشبو لگائی تھی یا یہ اس کی اپنی خوشبو تھی۔ مجھے پتا نہیں چلا کہ میں اسے کتنے والہانہ انداز میں دیکھ رہا ہوں اس کا رنگ شفق کی طرح گہرا ہونے لگا اور پھر اس نے شرمائے لہجے میں کہا۔

"پلیز مجھے اس طرح مت دیکھیں۔"

میں چونکا اور گہری سانس لی۔ "میں نے آج تک تمہیں اس طرح نہیں دیکھا جس طرح میں دیکھنا چاہتا ہوں۔"

"آپ ٹھیک ہیں نا؟" اس نے میرا بازو تھام لیا۔ "کتنے کمزور ہو گئے ہیں اور آپ کی شیو بھی بڑھی ہوئی ہے۔"

"بس یہ نو دس دن بھٹکتے ہوئے گزر گئے۔" میں نے کہا۔

اس نے بازو سے پکڑ کر مجھے کرسی پر بٹھایا اور خود میرے سامنے نیچے قالین پر بیٹھ گئی۔ میں بے چین ہو گیا۔ "یہ کیا تم نیچے کیوں بیٹھ گئی ہو؟.... اوپر بیٹھو۔"

"مجھے اس طرح اچھا لگ رہا ہے۔"

"پھر بھی...."

"نہیں آپ بتائیں آپ پر کیا گزری؟"

اس کا لہجہ بتا رہا تھا وہ نہیں اُٹھے گی۔ "سویرا مجھ پر جو گزری اور تمہارے بارے میں جو سوچیں آتی تھیں وہ میں لفظوں میں بیان نہیں کر سکتا ہوں۔"

اس نے اپنی نازک انگلیوں سے میرے کھردرے ہاتھ سہلائے۔ "پھر بھی میں جاننا چاہوں گی۔"

وہ میرا ہاتھ سہلاتی رہی اور میں اسے بتاتا رہا کہ ان نو دس دنوں میں مجھ پر کیا گزری تھی۔ درحقیقت یہ نصف مہینے سے زیادہ کا عرصہ تھا کیونکہ فتح خان نے مجھے چھ دن بے ہوش

www.paksociety.com

www.Paksociety.com

بھی رکھا تھا۔ جب میں خاموش ہوا تو اس نے یقین سے کہا۔ ”اب ایسا کبھی نہیں ہوگا۔“

”سویرا میرے دشمن حد سے بڑھتے جا رہے ہیں اور میں مجبور ہوں ان کی سطح پر نہیں آسکتا۔“

”آپ ایسا سوچیے گا بھی مت‘ ورنہ مجھے بہت دکھ ہو گا۔“

اچانک مجھے خیال آیا۔ ”سویرا حویلی خبر دی؟“

”بالکل جب ہم شہلا کے ٹھکانے سے آ رہے تھے تب ہی میں نے کال کر کے بابا کو بتا دیا تھا۔ آپ یقین کریں میری آواز سن کر وہ رونے لگے تھے اتنے دنوں میں انہوں نے یہ بات اپنی اور ماں جی کی ذات سے آگے نہیں جانے دی تھی۔ میری وجہ سے شمی اور آپا کو بھی آنے سے روک دیا تھا۔“

”بابا آپا کے بعد سب سے زیادہ محبت تم سے ہی کرتے ہیں۔“

”نہیں وہ آپ سے بھی بہت محبت کرتے ہیں۔“ وہ کھڑی ہوگئی۔ ”اب آپ پہلے نہا کر چینج کرلیں میں نے کپڑے استری کر دیے ہیں۔ آپ کے کمرے میں ہیں۔“

”میرا کمرا کون سا ہے؟“

”آپ جانتے ہیں جہاں آپ پہلے بھی رکے تھے۔ عبداللہ بھائی نے وہ کمرا آپ کے لیے ہی مخصوص کر دیا ہے اب اس میں کوئی اور نہیں رہتا۔“

”اچھا۔“ مجھے تعجب ہوا۔ ”میں تو شاید یہاں دس دن بھی نہیں رکا ہوں گا۔“

”شہباز آپ خوش قسمت ہیں جو آپ کو ایسے بے لوث لوگ اور ان کی محبت ملی ہے۔“

”وہ تو مجھے پہلے بھی میسر رہی ہے۔“ میں نے معنی خیز انداز میں کہا تو وہ شرما گئی تھی۔ پھر اس نے رک رک کر کہا۔

”وہ محبت بے لوث نہیں ہوتی......“ وہ کہتے ہی کمرے سے نکل گئی تھی اور میں بادل ناخواستہ اپنے کمرے کی طرف آیا کیونکہ مونا اور سعدیہ سے صبر نہیں ہوا تھا اور وہ نازل ہوگئی تھیں۔ مجھے بیتو کا خیال آیا جب سے میں آیا تھا وہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ مونا نے بتایا کہ اس کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی نزلہ اور تیز بخار ہوگیا ہے اس وقت دوا لے کر سو رہا ہے بلکہ اسے زبردستی سلایا گیا ہے۔ سویرا نے کریم کلر کی شرٹ اور بلیک پینٹ استری کی تھی اس کے ساتھ ہی اس کے ہاتھ کا بنا ہوا براؤن سوئیٹر تھا۔ وہ اس سے پہلے بھی کئی بار میرے لیے سوئیٹر بنا چکی تھی۔ اس لیے ہاتھ میں لیتے ہی مجھے یقین ہوگیا کہ یہ سویرا نے بنایا ہے۔ نئی چپل بھی رکھی تھی اور کپڑوں کے ساتھ رومال بھی تھا۔ میں واش روم میں آیا وہاں شیونگ کا سامان بھی تھا۔ میں نے پہلے شیو کی۔ سر کے بالوں کی تراش ٹھیک تھی اور ابھی بُرے نہیں لگ رہے تھے۔ کتنے عرصے بعد گرم پانی سے جی بھر کر غسل کیا تھا۔ اگر سفیر آ کر مداخلت نہ کرتا تو میں دیر تک ہی نہاتا۔ اس نے اطلاع دی کہ کھانا لگ گیا اور مرد حضرات مجھے بُرا بھلا کہہ رہے ہیں کیونکہ میرے آنے تک خواتین نے کھانا کھولنے سے انکار کر دیا ہے۔

”بس دس منٹ آیا۔“ میں نے کہا۔

”اگر دس منٹ سے ایک سیکنڈ بھی اوپر ہوا تو ہم سب آ کر جس حال میں ہے اسی حال میں لے جائیں گے۔“ سفیر نے دھمکی دی۔ خود میرا بھوک سے بُرا حال ہو رہا تھا اس لیے جلدی سے جسم خشک کر کے کپڑے پہنے اور بال سنوار کر ڈائننگ روم میں آگیا۔ کھانے میں وہ سب کچھ تھا جو مجھے بہت پسند تھا۔ میرے بیٹھتے ہی کھانا شروع ہوگیا۔ ابھی میں نے چند لقمے لیے تھے کہ عبداللہ کے ایک ساتھی نے آ کر مجھے اطلاع دی۔

”جناب آپ کا فون ہے۔“

میں چونکا۔ ”میرا فون....“

سب کے ہاتھ رک گئے تھے۔ میں نے اُٹھتے ہوئے کہا۔ ”میں دیکھتا ہوں۔“

”ایک منٹ۔“ وسیم نے عجلت میں کہا اور عبداللہ کے ساتھی سے پوچھا۔ ”اس نے اپنا نام بتایا ہے؟“

”نہیں جی بس اتنا کہہ رہا ہے کہ شہباز صاحب سے بات کرنی ہے۔“

”تم نے یہ تو نہیں کہا کہ شہباز یہاں موجود ہے۔“ سفیر نے پوچھا۔

عبداللہ کا آدمی پریشان ہوگیا تھا۔ ”نہیں جناب.... کیا مجھ سے غلطی ہوئی ہے؟“

”تمہیں اسی وقت منع کر دینا چاہیے تھا۔“ عبداللہ خشک لہجے میں کہتا ہوا اُٹھا۔ ہم سب اس کے ساتھ ہو لیے۔ فون لاؤنج میں رکھا تھا۔ عبداللہ نے اسپیکر فون آن کیا اور ہمیں چپ رہنے کا اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ ”کون بات کر رہا ہے۔“

”مرشد علی۔“ دوسری طرف سے آواز آئی۔ ”شہباز ملک سے بات کراؤ۔ میں جانتا ہوں وہ اس وقت یہاں ہے۔“

ہم سب ساکت رہ گئے تھے۔

جاری ہے

بیت بازی

قارئین

(ناہید فراز، راولپنڈی کا جواب)

انجم حیات........راولپنڈی

رات بھر رکھتی ہے مجھ کو بے قرار و مضطرب
سلوٹ اک نادیدہ ایسی بھی مرے بستر میں ہے

فراست ترمذی........ملتان

روداد الم سن کر مانا وہ ہنسا ہوگا
پھر اپنی جفاؤں پر نادم بھی ہوا ہوگا

اختر حسین اختر........کاموکی

ربط ان سے بہرحال قائم رہا
لاکھ دشمن لگاتے بجھاتے رہے

(انجم حیات، لاہور کا جواب)

واصف چنگاری........جیک آباد

وہ دل ہی گیا ترے ملنے کی جو دعا نہ کرے
میں تجھ کو بھول کے زندہ رہوں خدا نہ کرے

مہتاب عظیم چنگیزی........کوئٹہ

وہ ہوا رخصت تو میں خود سے بچھڑ کر رہ گئی
اپنی اس چاہت کا خود مجھ کو بھی اندازہ نہ تھا

دعا زہرا........فیصل آباد

وہ جو مشکل تھا بہت آسان کیسے ہوگیا
کم سخن آنکھوں میں دل کی بات کیسے آگئی

(آصفہ حیات، کراچی کا جواب)

ناہید قمر........کراچی

کسی پر مہرباں ہونے سے پہلے
محبت بھی ستارہ دیکھتی ہے

(فرحت حسین، چنیوٹ کا جواب)

منظر علی خان........ٹاؤن شپ لاہور

یہی تو اک تمنا رہی ہے دنیا میں
ہمیں عروج ملے وہ جسے زوال نہ ہو

(رفعت کوثر، رحیم یار خان کا جواب)

شکیل الرحمٰن........کھاتاں

اُٹھا ساغر کہ دنیا چار دن ہے
قیامت کی گھڑی آئی کہ آئی

(نوشین ممتاز، لاہور کا جواب)

ایاز حسین بھٹ........میرپور آزاد کشمیر

میں زندگی کے حقائق سے آشنا بھی نہ تھا
میں زندگی کا ہمیشہ مزاج داں بھی رہا

ناہید یاسمین........شادی پور

مانگے تو اگر جان بھی ہنس کے تجھے دے دیں
تیری تو کوئی بات بھی ٹالی نہیں جاتی

ممتاز اصغر........ڈینہ، جہلم

میں تیرے پیار کے ساحل پہ کھڑا ہوں تنہا
میری چاہت میری اُلفت کا سمندر تو ہے

فرحت رحمٰن........خیرپور میرس

موسم موسم آنکھوں کو اِک سپنا یاد رہا
صدیاں جس میں سمٹ گئیں وہ لمحہ یاد رہا

آصف علی خان........کراچی

موڑ تو بے شمار آئیں گے
تھک نہ جانا جدا نہ ہوجانا

(حبیب الرحمٰن، گوجرہ کا جواب)

شمیم اطہر چنوتی........العین، یو اے ای

گزر جا بن کے سیلِ تند رو کوہ و بیاباں سے
گلستاں راہ میں آئے تو جوئے نغمہ خواں ہوجا

حسن اطہر نیازی........منڈی بہاء الدین

گل خوب کھلاتے رہو لیکن یہ رہے یاد
کھلنے کو ابھی اِک گلِ دشنام ہے باقی

تحسین فاروقی........احمد پور سیال

گھنے درختوں کے سائے سدا نہیں ہوتے
تو کسی در پہ آگیا ہو تو خبر ہو تجھ کو

(سلطان فریدالدین، قطر کا جواب)

محمد قیصر........ملک وال

اس عمر میں خوش فہمیاں اچھی نہیں ہوتیں
اس عمر کو وعدوں کے حوالے نہیں کرنا

حسین ارشاد........ملتان

اِک عمر کی رفاقت پل بھر میں ختم کر دی
اے دوست حرج کیا تھا کچھ دیر سوچنے میں

گلشن حبیب محمد.........چتوکی
اے سوز عدو اپنا بہت دور تھا بیٹھا
اِک دوسرے کا خون بہانے سے ملا گیا
فراز بٹ.........نوشہرہ
افسانۂ ہستی کو ترتیب تو سب دیں گے
یہ بات الگ سب کا انداز جدا ہوگا
محمد خادم حسین.........اوکاڑہ
افراد کے ذہنوں میں پلتی ہے ریا کاری
مشروط ہے انساں سے انساں کی وفاداری
زاہد بخش.........پشاور
اس قدر صدمے اٹھا کر مبتری
محو حیرت ہوں کہ زندہ رہ گیا
سلطان فتح علی.........نگر (گلگت)
آج کوئی پتھروں کے مول بھی لیتا نہیں
ورنہ محسن ہم بھی کل تک بے بہا ہیروں میں تھے
ابوذر محسن.........لنڈن
ابھی تو ضد ہے اسے راستہ بدلنے کی
کبھی وہ روئے گا خود میری چاہتوں کے لیے
فرحانہ سعید قاسمی.........ڈلوال چکوال
اے حسرتِ نگاہ یہ کیا راز ہے آخر
وہ سامنے آتے ہیں تو دیکھا نہیں جاتا
(فصاحت اللہ، اوسلو، ناروے کا جواب)

منظر علی خان.........لاہور
اب ہوائیں ہی کریں گی روشنی کا فیصلہ
جس دیے میں جان ہوگی وہ دیا رہ جائے گا
نذر محمد گل.........چنیوٹ
اس اُجڑی بستی میں آنکھ رکھنے والا میں
آنکھ رکھنے والے کو دیکھنا تو ہوتا ہے
آفتاب قیصر.........جھنگ
ان دیوں کے ساتھ میرا نام بھی لکھنا جنہیں
بجھتے بجھتے روشنی تقسیم کرنی پڑ گئی
انعم رفیق.........گجرات
اب تجھے کیسے بتائیں کہ کسی کا اپنا
شہر کی بھیڑ میں کھو جائے تو کیا ہوتا ہے
(زرینہ جونیجو، لاڑکانہ کا جواب)
سعید احمد چاند.........کراچی
یہ میرا پیار اتنا بھی بے اثر نہ ہو
میں تجھے ٹوٹ کے چاہوں تجھے خبر نہ ہو

(ملک ثاقب شادنولی، حویلیاں کا جواب)
شاہد خیال.........لڈن وہاڑی
یہ آنکھیں خواب دکھاتی ہیں اس بشر کی مجھے
جو دیکھتا بھی نہیں ہے نگاہ بھر کے مجھے
علی حیدر.........خانیوال
یہاں تو پل میں بدل لیتے ہیں خدا بھی کئی
وہ ساری عمر ہی میرا طواف کیا کرتا
(عصمت آرا، حیدرآباد کا جواب)

راجا ثاقب نواز ثاقب.........رتی ٹبی ساہیوال
زرد پتے جب شاخوں سے گرتے ہیں روتے ہوئے
سوچتا ہوں کتنی آوازوں کا مدفن ہے ہوا
آفتاب منظر.........حاصل پور
زندگی موت کے طوفان سے ٹکرائی ہے
تب کہیں جا کے کوئی شکل نظر آئی ہے
نازش سلطانی.........رحیم یار خان
زندگی کی رمق سے عاری ہے
موت کو بھی ترس رہا ہے جسم
نعمان فرحت.........چنیوٹ
زہے لطافتِ غم میں وہاں ہوں اب راغب
جہاں تصورِ عشرت گناہ ہوتا ہے
(محترمہ فاطمہ تبسم، جہلم کا جواب)
محمد اختر.........رحیم یار خان
یونہی بے سبب نہ پھرا کرو کوئی شام گھر بھی رہا کرو
وہ غزل کی سچی کتاب ہے اسے چپکے چپکے پڑھا کرو
(تابش نہی، تلہ گنگ کا جواب)
خالد یوسفی.........لیہ
یارانِ رفتگاں کا کھلے حال کس طرح
بھیجا نہیں کسی نے بھی لکھ کر عدم سے خط
(محمد سعید قاسمی، ڈلوال کا جواب)
نصرت جاوید.........حویلی لکھاں
نہ دل نے مانی کوئی بات لاکھ سمجھایا
کہ وہ زمانے میاں قیس و کوہکن کے گئے

☆☆☆

بیت بازی کا اصول ہے جس حرف پر شعر ختم ہو رہا ہے اسی لفظ سے شروع ہونے والا شعر ارسال کریں۔ اکثر قارئین اس اصول کو نظر انداز کر رہے ہیں۔ نتیجتاً ان کے شعر تلف کر دیے جاتے ہیں۔ اس اصول کو مدِ نظر رکھ کر ہی شعر ارسال کریں۔

علمی آزمائش
80
30 مئی 2012ء

میرے خیال سے اس مرتبہ دریافت کی گئی شخصیت کا نام .... ہے۔

نام:

پتا:

انعام یافتہ ہونے کی صورت میں مجھے جاسوسی ☐ سسپنس ☐ پاکیزہ ☐ سرگزشت ☐ بھجوایا جائے
کسی ایک پر ☑ کیجیے۔

کوپن کے ہمراہ اپنے جوابات مورخہ 30 مئی 2012ء تک علمی آزمائش 80 پوسٹ بکس نمبر 982 کراچی 74200 پر ارسال کریں۔

مقابلہ
بیت بازی

قارئین کے مسلسل اصرار پر ادبی ذوق کی تسکین کے لیے اک نیا سلسلہ ”بیت بازی“ شروع کیا گیا ہے۔ آپ اپنے پسندیدہ شعر کے آخری حرف سے شروع ہونے والا شعر ارسال کرسکتے ہیں۔

نام ....

پتا ....

....

محترم / محترمہ .... کے شعر کے جواب میں شعر ارسال کر رہا ہوں اسے شامل اشاعت کر لیں
(شعر الگ کاغذ پر ہے) 41

مقابلہ بیت بازی
پوسٹ بکس نمبر 982 کراچی 74200

اگر آپ کو
ماہنامہ جاسوسی ڈائجسٹ، ماہنامہ سسپنس ڈائجسٹ، ماہنامہ پاکیزہ، ماہنامہ سرگزشت
کے حصول میں دقت پیش آرہی ہے یا آپ کو اپنے علاقے کے بک اسٹال سے کوئی شکایت ہے اور آپ کے علاقے میں بروقت پرچہ نہیں پہنچ رہا تو
شکایت فیکس کریں
مندرجہ ذیل ٹیلی فون نمبروں پر بھی رابطہ کر سکتے ہیں
ثمر عباس 0301-2454188
بدرالدین سرکولیشن منیجر 35802552-35386783-35804200
فیکس نمبر 35802551
جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز
63-C فیز II ایکسٹینشن ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی مین کورنگی روڈ کراچی
فون: 35895313 فیکس: 35802551

علمی آزمائش۔ 80

ادارہ

ماہنامہ سرگزشت کا منفرد انعامی سلسلہ

علمی آزمائش کے اس منفرد سلسلے کے ذریعے آپ کو اپنی معلومات میں اضافے کے ساتھ انعام جیتنے کا موقع بھی ملتا ہے۔ ہر ماہ اس آزمائش میں دیے گئے سوال کا جواب تلاش کر کے ہمیں بھجوایئے۔ درست جواب بھیجنے والے پانچ قارئین کو ماہنامہ سرگزشت، سسپنس ڈائجسٹ، جاسوسی ڈائجسٹ اور ماہنامہ پاکیزہ میں سے ان کی پسند کا کوئی ایک رسالہ ایک سال کے لیے جاری کیا جائے گا۔

ماہنامہ سرگزشت کے قاری "یک علمی سرگزشت" کے عنوان تلے منفرد انداز میں زندگی کے مختلف شعبوں میں نمایاں مقام رکھنے والی کسی معروف شخصیت کا تعارف پڑھتے رہے ہیں۔ اسی طرز پر مرتب کی گئی اس آزمائش میں دریافت کردہ فرد کی شخصیت اور اس کی زندگی کا خاکہ لکھ دیا گیا ہے۔ اس کی مدد سے آپ اس شخصیت کو بوجھنے کی کوشش کریں۔ پڑھیے اور پھر سوچیے کہ اس خاکے کے پیچھے کون چھپا ہوا ہے؟ اس کے بعد جو شخصیت آپ کے ذہن میں ابھرے اسے اس آزمائش کے آخر میں دیے گئے کوپن پر درج کر کے اس طرح سپردِ ڈاک کیجیے کہ آپ کا جواب ہمیں 30 مئی 2012ء تک موصول ہو جائے۔ درست جواب دینے والے قارئین انعام کے مستحق قرار پائیں گے۔ تاہم پانچ سے زائد افراد کے جواب درست ہونے کی صورت میں بذریعہ قرعہ اندازی انعام یافتگان کا فیصلہ کیا جائے گا۔

اب پڑھیے اس ماہ کی شخصیت کا مختصر خاکہ

298ھ بمطابق 1875ء میں لکھنو اور کانپور کے درمیان واقع اناؤ ضلع کے قصبہ موہان میں ایک صاحبِ علم گھرانے میں پیدا ہوئے۔ علم حاصل کرنے کا جنون تھا۔ ادبی دنیا کو زیر و زبر کر رہے تھے کہ صحافت سے دلچسپی پیدا ہو گئی۔ اخبار سے وابستگی ہوئی تو ایسے ایسے مضامین لکھے کہ حکمراں طبقے میں ہلچل مچ گئی۔ اربابِ اقتدار نے گرفتاری کا حکم جاری کر دیا۔ ایسے وقت میں گرفتاری عمل میں آئی جب شیر خوار بچی نعیمہ سخت علیل تھی۔ انہیں لے جا کر چکی کی مشقت پر لگا دیا گیا۔ ہر روز ایک من گیہوں ہاتھ کی چکی سے پیستے۔ اس دور میں انہوں نے جو کچھ لکھا وہ ادب میں شہکار کہلایا۔ ان کی نظمیں زبان زدِ عام ہوتی گئیں۔ 13 مئی 1951ء کو انہوں نے دنیا سے کوچ کیا۔

علمی آزمائش 78 کا جواب

شاہ ولی اللہ محدث دہلوی سرزمین دہلی پر 1703ء میں پیدا ہوئے۔ اس وقت مغل اقتدار چراغِ سحری کی طرح ٹمٹما رہا تھا۔ اس دور میں گمراہی اور فتنوں کے دروازے کھل گئے تھے۔ ان فتنوں کے سدِباب کے لیے علمی و فکری ضرب لگانے میں اہم کردار ادا کیا۔ بہت ساری اہم کتب تالیف کیں۔ تصنیفات کی فہرست بھی بہت طویل ہے۔ برصغیر میں قرآن مجید کا پہلا بامحاورہ سلیس فارسی میں ترجمہ کیا اور واقعی ولی اللہ کے منصب پر نظر آئے۔

انعام یافتگان

1۔ نصرت شاہ، جہلم -2 شاہنواز، رحیم یار خان -3 فصیحہ بتول، لاہور
4۔ نعمان خان، حیدر آباد -5 نعیب الحسن، کوئٹہ

ان قارئین کے علاوہ جن لوگوں کے جوابات درست تھے۔

کراچی سے: نصرت فاروقی، وجیہہ الحسن، کاوش اختر، یاسر توفیق، محمد مناف فاضلانی، فرزانہ پروین، منور علی، ناصر افروز، انصار حسین، رجب علی مرزا، علی احمد، خلش مضطر، الطاف بی بی، یاسر توفیق، محمد نصرت ایاز، کلیم اللہ فہمی، عنایت مسیح، تنویر حسین زیدی، جبار علی، کہکشاں تسنیم، ابرار احمد، نور احمد، بختاور شاہ، فہیم اللہ فاروقی، نواز علی شاہ، ملک سرفراز گوندل، نگار صہبائی، نجم الدین حیدر۔ لاہور سے: ممتاز الحسن، ارشاد علی، مختار اختر، گل زیبا، برق ضیائی، حمیرا انجم، الحاج کرم الٰہی اعوان، تابش عطاری، خاور احمد، اکرام صدیقی، فہیم مرزا، احمد بشیر بٹ، عقیل سندھو، نازش

[illegible]، ناصر حسین، زبیر اسلم، انصار الحق، احمد علی مشرقی، ارباز خان، ملک جاوید، ابرار احمد، [illegible] نعمان [illegible] خان۔ ملتان سے: بیگم احمد دین، توفیق سلطان، مناف سید، فضل الحق، جمیل ملک، بہادر خان، کوکب جہاں، فہیم اللہ، [illegible] احمد ملتانی، جنید ارشد، نداء یونس، اشرف علی شیروانی، عزادار حسین، زبیر شاہ، مہوش، نذر ولی خان [illegible]، نگار سلطانہ، [illegible] جہاں، [illegible] خان، [illegible] چوہان، قدوس بخش، اللہ دتہ، فاضل خان اچکزئی، قدرت اللہ، نثار احمد، اختر علی سعید۔ جہلم سے: نذر کلیم چغتائی، [illegible] عثمان علی شاہ، شناور ترمذی، فصاحت حسین، نعیم الحسن زیدی، ندیمہ امتیاز۔ چکوال سے: فرحانہ سعید قاسمی، نصرت جاوید، فرید احمد، اقبال حسن، صدر الدین، نزریاب خان، کمال احسن کمال، ملک شفاعت، اجمل شاہین۔ کوئٹہ سے: ممتاز احسن، نذر خان، تقی چنگیزی، نصرت چنگیزی، [illegible]، خاقان اعوان، فصاحت حسین۔ سرگودھا سے: محمد نعیم ظفر، نزہت پروین، منور ساجد منیر، سلیم اللہ خان، خلیق حق، خضر حیات، [illegible] فصیح الزماں، محمد بلال احمد۔ شجاع آباد سے: زوار حسین زیدی، ارباخان۔ حیدر آباد سے: امتیاز حسن، جمیہ سلطان، فتح شیر خان، نواز عثمان [illegible]، آمنہ قائم خانی، عبدالقیوم، حسن خان، فصاحت اللہ، انور علی زبیری، کاشان خان، مرزا فرحال بیگ۔ حاصل پور سے: اختر عباس، خالد [illegible]، مہوش ملک، شیخ فخر الدین، انجم فراز، نرگس خیال۔ ڈی جی خان سے: فرحت اللہ شیرازی، نعمت خان، گل شیر میو۔ ڈی آئی خان سے: بصیر الدین نصیر، فتح یاب خان، رانا وجدان، محمد سہیل انجم، سیماب عائشہ نواز۔ رحیم یار خان سے: آصف اقبال، محمد فیصل بخاری، فرحت [illegible] لغاری، نسیم سلطان، کلیم اثر، زاہد طوری بنگش، اسلم توفیق، ساجد حسن، نثار علی، فرزانہ رفیق، قیصر ملک، انجم صدیق، فہد احمد، عثمان راہی۔ کھاتاں سے: سلیم کامریڈ۔ بہاولپور سے: نازش کریم، شمیم دلو، فہیم شیخ، میثم حسن، مسرت اسلم، حمیرا کوکب واسطی، ساغر تسنیم۔ بہاولنگر سے: نبیل احمد، نصیر جاوید، فرزند احمد، یعقوب افتخار، نزہت فردوس، بابا روفی۔ کمالیہ سے: فرحت شاہ، نواب شاہ، محمد الطاف فاروق، اصغر حسین خان، سلطنت خان۔ جہانیاں سے: زبیر خان، خضر خان، عبدالشکور اختر (غریب آباد) ممتاز وحید۔ کوٹ ادو سے: اطہر حسین سید، نبیل اشرف ملک۔ شہم سلطان سے: نوید انصاری، زبیر بٹ، سنجیدہ احمد۔ مظفر گڑھ سے: نوید تو تائی، عزیز حسن عزیز، جام اکبر علی ماہزہ، محمد امین۔ حسن ابدال سے: کرم الٰہی، سید احمد رضا، فردوس ستارہ، آصف شاہ، سید خالد حسین۔ پاک پتن سے: سدرہ شفیق، حافظ گل عمر، غازی شاہ، عبدالجبار، فتح محمد (منگیرہ) سیاں والی سے: نوشین احمد، نعمان نیازی (گرین ٹاؤن) فرحت الاسلام، ممتاز سلیم، تانیہ نیازی، سلمان خورشید، کائنات۔ ٹنڈو آدم سے: شریف الرحمٰن، ثمن شاہ۔ جھنگ سے: ڈاکٹر عمران فاروق، ڈاکٹر محمد اسلم جاوید (باغ) خانیوال سے: سید احتشام اشرف مشہدی (جہانیاں) اسلام آباد سے نہال احمد (راول ڈیم) فصیح اقبال، محمد فیض احمد، نور عین مرتضٰی، ارشاد بھٹ، زاہد خان، نرگس افتخار، زہیب حسن خان، کائنات مرزا، نسیم زیدی، انور یوسف نوشاہی، خاقان خان، اطہر حیات، اکبر حیات، فرحت احسان، زیب النسائی، ثناء اللہ بخاری، انور یوسف زئی، ممتاز احمد، غزالہ تبسم، ثمینہ عزیز، مہناز عرفان، مسرت اسلم ملک، ثمین جاوید۔ راولپنڈی سے: حافظ محمد اقبال، سلیم خان، نورین زرین، یاسمین اختر ناز، عرفان اللہ فاروقی، محمد سہیل، ظفر اسماعیل، ثمینہ عزیز، نوید اسلم، شاہینہ شیخ، منظر ڈڈیال، بے بی اسلام شیخ، حلیم اللہ خان، اختر علی صدیقی، خبیلہ خان، ملک محمد حیات، سائیں علی، نہال احمد، کالے خان، آصف محمد، نواز احمد درانی، شکیب احسن، نگار بانو۔ ضلع ٹوبہ ٹیک سنگھ سے: سیاں ساجد علی دواکھری (گوجرہ) محمد سعید بٹ، مسعود جعفری۔ ہری پور ہزارہ سے: صفدر حسین جعفری (تحصیل غازی) خورشید احمد (کھلابٹ ٹاؤن شپ) محمد مختار، ملک کامران۔ اٹک سے: محمد سجاد، عظیم خان (کامل پور موسیٰ) آسیہ رفیق، کامران چوہدری، اسلم توفیق، ثنا ابرار، شازیہ۔ میرپور خاص سے: جھری اموالکہ (ٹنڈو جان محمد) صفیہ رشید، محمد عالم شاہ، مختار الدین عطاری، نزہت سلیم، فصیح بیگ، عنایت قائم خانی، تنویر مرزا بیگ، آفتاب انصاری، عنایت باری۔ مظفر آباد، آزاد کشمیر سے: حبیب الرحمٰن حبیب، جاوید قادری عطاری، اختر شیرازی، فرحت زیدی۔ گوجرانوالہ سے: سعدیہ شیریں عظیمی (قلعہ دیدار سنگھ) سہیل اشرف، ساجد اسلم، غنا ممتاز، فرحت عباسی۔ مسلم باغ سے: رحمت اللہ خان (قلعہ سیف اللہ) فرحت خورشید، سمعیہ اشرف، غلام بدر الدجیٰ، شبیر ملک۔ سیالکوٹ سے: نوید شہزاد خواجہ (خادم علی روڈ) ڈاکٹر عبدالغفار، کوکب سلمان، فریحہ سلطان۔ شیخوپورہ سے: قاسم نصیب (صفدر آباد) طاہر الدین، سلمٰی مہر، ثاقب علی، خورشید حسن، طالب مولیٰ۔ صوابی سے: ضیاء الرحمٰن، مولوی شفیق الرحمٰن (زروبی، ٹوپی) محمد منظور۔ لیہ سے: خالد یوسفی، امروز اسلم مغل، ہمیس ناظر، عبدالقادر، رابعہ مبین۔ برو زئی پچھ سے: ملک جاوید محمد خان سرکانی درانی، سہیل احمد، ثاقب شاہ۔ اوکاڑہ سے: صاحب جان، اشعر محمد، سعید احمد، حسن ابرار، نعمت خان، زاہد جان، صالح الدین، زین الاسلام، بشیر احمد سلطانی، حافظ فیروز الدین اوکاڑوی، سید احسن محمد محمود، محمد سلام، چوہدری سلمان ملک، زرگل خانزادہ، فرحت جہاں، نوشین اختر، محمد فیروز۔ واہ کینٹ سے: بشریٰ افضل، نصیب الاسلام بخاری، خالد خان، محمد ذیشان، نصرت اللہ، سلیم الدین احمد، فیصل چشتی، عطاء الجلیل، فیصل ملک، کائنات فیصل، ملک صغیر۔ پشاور سے: سمندر خان، سعید الدین، سلطان شاہ، ملک فیروز، تقی طوری بنگش، صاحب جان، ابرار الحسن، ثنا علی (یونیورسٹی) عباس علی سید، خضر حیات۔ قصور سے: مظہر علی، ذیشان شاہ، ارشاد علی بٹ، مشتاق تقی، عمران وردک۔ خوشاب سے: زرولی خان، کمال ترک، ہارون جہانگیر، آصف محمد۔ خیرپور میرس سے: فرخندہ تاثیر، الدیار جمالی، بنت شبیر عابدی، احسن نقوی۔ ہوتی مردان سے: معراج الدین (صوابی روڈ پار)

ممالکِ غیر سے: اختر شاہ (العین) فضل اللہ (مسقط) اریب حسن (دمام) نوشین سید (ٹورنٹو، کینیڈا)

۔ پر کھڑی رہوں اور لڑکے کے مجھے آنکھ ماری ہے۔ میں نے
... دروازہ بند کیا اور اندر چلی آئی۔ تہیہ کر لیا کہ اب
۔ پر کھڑی نہیں ہوا کروں گی۔ یہ کیا دیوانگی ہے جو
... ہو لی ہے۔ دیکھا جب میں نہیں جاؤں گی اور خواہ
... خوار ہوں گی۔ کسی دن امی بھی پوچھ لیں گی کہ
۔ پر کیا ڈھونڈ لگانے جو جاتی ہو امی چیک جاتی ہے۔
... تین بزرگوں کو بھی جاتی تھی جن کا کام ہی ادھر

ادھر لگانا تھا۔ انہوں نے اگر ابو سے کہہ دیا کہ طلعت دروازے پر بہت کھڑی ہونے لگی ہے تو قیامت آجائے گی۔

میں رات میں یہ تہیہ کر کے سوئی تھی کہ اب دروازے پر کھڑی نہیں ہوں گی لیکن دوسرے دن کالج سے آتے ہی دروازے پر پہنچ گئی تھی اور پھر وقفے وقفے سے دروازے جا کر جھانک آتی تھی کہ شاید وہ نظر آجائے لیکن بدروق کی

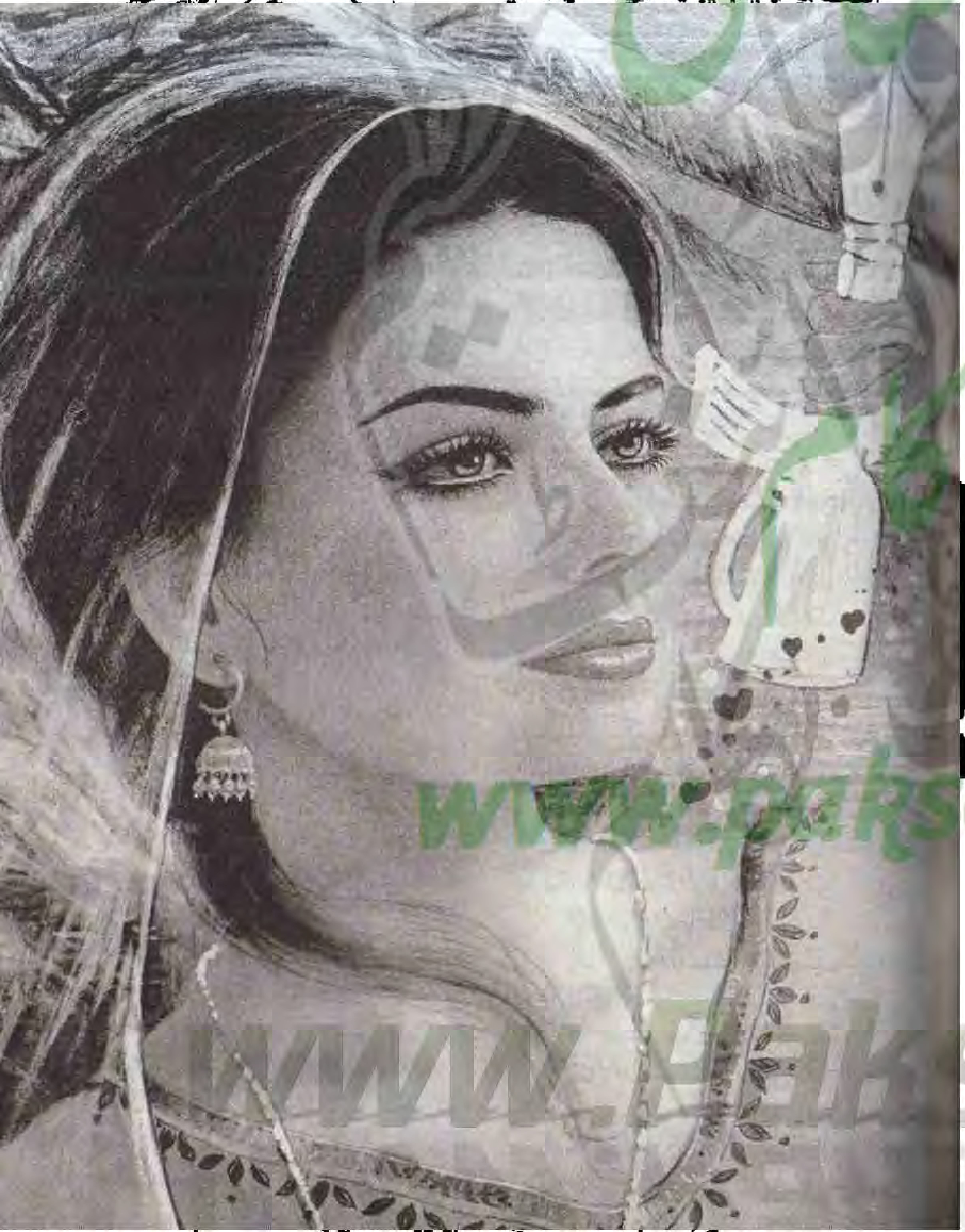

انتقام

جناب معراج رسول صاحب
السلام علیکم!
میں مقدر کی ستائی ہوئی ایک دکھی عورت ہوں لیکن اس میں قسمت سے زیادہ میری بے وقوفی کا ہاتھ ہے۔ انسان سوچتا کچھ ہے اور ہوتا کچھ اور ہے۔ میرے منگیتر نے کس طرح میری زندگی میں انگارے بھرے ہیں! آپ قارئین بھی ملاحظہ کریں پھر فیصلہ کریں کہ میری غلطی کی اتنی بڑی سزا کیا صحیح ہے؟
طلعت
(لاہور)

عارف سے میری منگنی ہو چکی تھی لیکن میرا گناہ یہ تھا کہ میں کسی اور لڑکے کا پیچھا کرنے لگی تھی جس کا نام مجھے بعد میں ذیشان معلوم ہوا تھا۔ اس لڑکے کو میں نے پہلے پہل اپنے دروازے پر کھڑے ہو کر گلی سے گزرتے دیکھا تھا۔ یہ لڑکا میرے محلے کا نہیں تھا لیکن یہ بند گلی نہیں تھی کہ کوئی اور گزر ہی نہ سکتا ہو۔ مجھے سمجھ لینا چاہیے تھا کہ کوئی راہ گیر ہوگا اس طرف سے گزرا ہوگا لیکن اس میں کچھ ایسی کشش تھی کہ میں دروازے سے ہٹنا بھول گئی تھی۔ وہ کب کا نظروں سے اوجھل ہو گیا تھا لیکن میری نظریں تو جیسے واپس آنا ہی بھول گئی تھیں۔ امی مجھے آواز نہ دیتیں تو شاید میں دروازے پر کھڑے کھڑے سوکھ جاتی۔

"کیا کر رہی تھیں تم دروازے پر اتنی دیر سے؟"

"امی، دو بچوں کی لڑائی ہو رہی تھی، وہ دیکھ رہی تھی۔ قسم سے ایسا دلچسپ تماشا تھا کہ بس۔"

"کالج میں پہنچ گئی لیکن بچپنا نہیں گیا۔ چل چائے کا وقت ہو گیا ہے، چائے بنا لے۔"

"اچھا امی!"

میں تو خود یہ چاہتی تھی کہ امی کے سامنے سے ہٹ جاؤں اور آنکھیں بند کر کے اس لڑکے کو دیکھتی رہوں۔ میں باورچی خانے میں گئی اور واقعی اس لڑکے کے بارے میں سوچنے لگی۔ کچھ سوتے، کچھ جاگتے جیسے تیسے چائے بنائی اور امی کو لا کر دے دی۔

اپنے کمرے میں جا کر پھر سوچنے لگی۔ شہزادوں جیسی چال والا یہ لڑکا کون تھا؟ کاش وہ دوبارہ نظر آجائے بلکہ بار بار نظر آتا رہے۔ پھر میں تمام تر سنجیدگی کے باوجود اپنی بے وقوفی پر ہنس پڑی تھی۔ وہ کوئی اس محلے میں رہتا تھوڑی ہے۔ یہ ضروری تو نہیں کہ وہ گزرنے کے لیے ہمیشہ اسی گلی کا انتخاب کرے۔ یہ سوچتے ہی میں بجھ سی گئی تھی۔

میں نہ تو آوارہ مزاج تھی اور نہ ایسی حسن پرست۔ اس سے پہلے کبھی ایسا ہوا بھی نہیں تھا کہ کوئی لڑکا مجھے اچھا لگا ہو۔ میں تو لڑکیوں میں مشہور تھی کہ کسی کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھتی ہی نہیں ہوں۔ اس لڑکے میں نہ جانے ایسی کیا کشش تھی کہ جی چاہتا تھا وہ پھر گزرے۔ میں پھر اسے دیکھوں۔ میں چپکے سے پھر دروازے پر گئی کہ شاید وہ جہاں آیا ہو وہاں سے واپس جا رہا ہو اور نظر آجائے۔ بہت دیر کھڑی رہی، اس کے سوا کچھ بھی نہیں ہوا کہ ایک اوباش سا لڑکا میری طرف دیکھ کر آنکھ مارتے ہوئے گزر گیا۔ میں اپنی نظروں میں خود گر گئی۔ میں اب ایسی ہو گئی کہ آوارہ لڑکیوں کی طرح

کے سوا باہر کچھ بھی نظر نہیں آتا تھا۔ اس کا کوئی وقت تو مقرر تھا نہیں کہ میں دروازے پر ہوتی اور وہ گزر رہا ہوتا۔

دو تین دن میں دروازے کا طواف کرتی رہی اور پھر صبر کر کے بیٹھ گئی اور سوچ لیا کہ دنیا بہت چھوٹی ہے لیکن یہاں جو ایک بار نظر آتا ہے دوبارہ نظر نہیں آتا۔

دن پر دن گزرتے چلے گئے۔ اس کا خیال بھی ذہن سے نکل گیا تھا کہ ایک شمع پھر جل گئی۔

امتحان کے دن نزدیک آ رہے تھے اور میری انگلش بہت کمزور تھی خاص طور پر گرامر۔ محلے میں ایک اسکول ٹیچر رہتی تھیں۔ وہ تھیں تو اسکول ٹیچر لیکن انگریزی میں ایم اے کیا ہوا تھا۔ تھرڈ ڈویژن تھیں اس لیے کالج میں ملازمت نہیں مل سکی تھی۔ مجھے ان کی ڈویژن سے کیا تھا، مجھے تو ابتدائی گرامر پڑھنی تھی۔ میں نے امی سے ذکر کیا۔ اگر شہلا باجی مجھے گھر آ کر انگریزی پڑھا جایا کریں۔ امی نے ان سے ذکر کیا۔ شہلا باجی بیوہ تھیں اور اکیلی رہتی تھیں۔ اس لیے امی کو کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ ابو کے سامنے ذکر آیا تو انہوں نے بھی اجازت دے دی۔

''کیا حرج ہے۔ وہ بے چاری اکیلی تو رہتی ہے۔ نہ میاں ہے اور نہ کوئی جوان بیٹا۔ کالج سے آنے کے بعد چلی جایا کرو۔''

میں شہلا باجی کے گھر ٹیوشن پڑھنے جانے لگی۔ ابھی دو دن گزرے تھے۔ تیسرے دن میں گئی تو ڈرائنگ روم کے صوفے پر اسی لڑکے کو بیٹھے ہوئے دیکھا جسے دیکھنے کی خواہش مجھے دروازے پر لے جاتی تھی۔ میری تو سانس بند ہونے لگی لیکن فوراً ہی یہ خیال آیا کہ یہ لڑکا شہلا باجی کے گھر کیوں بیٹھا ہے؟ کیا شہلا باجی نے پارسائی کا ڈھونگ رچایا ہوا تھا اور آج رنگے ہاتھوں پکڑی گئیں۔

''ذیشان! تم دوسرے کمرے میں چلے جاؤ۔''

''یہ پردہ تو نہیں کرتیں۔''

''پھر بھی...... اچھا نہیں لگتا کہ تم یہاں بیٹھے رہو۔''

''لیجیے صاحب، چلا جاتا ہوں۔''

وہ لڑکا میری طرف بھرپور نظروں سے دیکھتا ہوا ڈرائنگ روم سے چلا گیا۔

اسے یوں اچانک دیکھ کر خوشی بھی ہوئی تھی لیکن یہ دکھ بھی ہو رہا تھا کہ وہ یہاں کیوں ہے؟ میں تو صرف منگیتر ہوں، کسی کی...... شہلا باجی تو بیوہ ہوتے ہوئے اپنے بیٹے کے برابر والے کے ساتھ رنگ رلیاں منا رہی ہیں۔''

شہلا باجی نے میری حیرانی کو بھانپتے ہوئے کہا ''میرا چھوٹا بھائی ہے ذیشان۔''

''کبھی دیکھا نہیں۔ میں نے تو سنا تھا آپ اکیلی رہتی ہیں۔'' میرے لہجے میں یقیناً طنز چھپا ہوا تھا۔

''یہ بڑی لمبی کہانی ہے پھر کبھی سناؤں گی۔'' انہوں نے کہا اور پڑھانا شروع کر دیا۔

میں دل ہی دل میں ان کی چالاکی پر ہنس رہی تھی۔ کسی جوان لڑکے کو گھیر گھار کر لے آئی ہیں اور دنیا کو سمجھانے کے لیے بھائی مشہور کر دیا ہے۔

کچھ دیر میں وہ لڑکا پھر اندر آیا ''باجی، ایک پچاس روپے دے دو۔ میں ذرا باہر جا رہا ہوں۔''

''کب آؤ گے؟''

''جب یہ پچاس روپے خرچ ہو جائیں گے۔''

شہلا باجی اٹھ کر چلی گئیں۔ وہ یقیناً ذیشان کو پچاس روپے دینے گئی ہوں گی۔ کچھ دیر میں آئیں اور پھر پڑھانے بیٹھ گئیں۔ میرا دل آج کتابوں سے زیادہ کہیں اور تھا۔ میں ساری صورت حال پر غور کر رہی تھی۔ شہلا باجی اچانک میری نظروں سے گر گئی تھیں۔ اس لیے کہ انہوں نے ایک غیر لڑکے کو اپنے گھر میں جگہ دی تھی اور اس سے بھی زیادہ اس لیے کہ انہوں نے اس لڑکے کا انتخاب کیا تھا جو میرے دل میں اتر گیا تھا۔

میں وہاں سے لوٹی تھی تو یہ سوچ کر آئی تھی کہ اب ٹیوشن ختم۔ اب شہلا باجی کے گھر نہیں جاؤں گی۔ لیکن مجھ میں قوت فیصلہ تھی ہی کم۔ دوسرے دن میں پھر شہلا باجی کے گھر پہنچ گئی۔ میں جانتی تھی کہ مجھے شہلا باجی سے زیادہ ذیشان کی کشش یہاں لائی ہے۔ اندر پہنچتے ہی گھر کی ویرانی نے مجھے دبوچ لیا۔ ذیشان کی خوشبو سے گھر خالی تھا۔

''آپ کے بھائی نظر نہیں آ رہے ہیں۔'' میں نے کچھ دیر بعد پوچھا۔

''ابھی تو کہیں نکلا ہے، آ جائے گا۔''

''آپ ان کے متعلق کچھ بتانے والی تھیں۔''

''ارے ہاں، صرف اس لیے بتا رہی ہوں کہ تمہارا تجسس دور ہو جائے۔ یہ بہت چھوٹا تھا۔ کوئی آٹھ دس سال کا ہوگا کہ اس کو کسی نے اغوا کر لیا تھا۔''

''اچھا...... اغوا کر لیا تھا؟''

''ہاں، لیکن وہ کوئی بُرے لوگ نہیں تھے۔ بے اولاد تھے اور یہ بچپن میں بہت خوبصورت تھا۔''

''خوبصورت تو اب بھی ہیں۔''

''جن لوگوں نے اسے اغوا کیا تھا وہ اسے دبئی لے گئے۔ ذیشان کے کہنے کے مطابق وہ میاں بیوی تھے۔ ان لوگوں نے اسے اولاد کی طرح پالا۔ یہ تو وہاں آرام سے تھا

یہاں ہم سب کی جان پر بن گئی۔ اس کے غم میں پہلے ابا بیچارے ہوئے پھر اماں چلی گئیں۔ ایک ہم سب سے بڑے بھائی ہیں، وہ اسے تلاش کرتے رہے اور پھر تھک ہار کر بیٹھ گئے۔ کسی کو کچھ معلوم نہیں تھا کہ ذیشان کہاں گیا؟ اس نے ہم سب کو بھولا نہیں تھا لیکن دبئی میں تھا بھاگ کہیں نہیں سکتا تھا۔ برسوں بعد اسے اب موقع ملا۔ دبئی سے بھاگ آیا۔ ابھی کوئی پندرہ بیس دن پہلے تو آیا ہے۔ بڑے بھائی کے پاس رہ رہا ہے۔ ابھی کل کہہ رہا تھا کہ باجی مستقل تمہارے پاس رہنے آ جاؤں گا۔

میں اپنی کامیابی پر مسکرا دی۔ وہ میری وجہ سے شہلا باجی کے پاس مستقل رہنے آ رہا ہے۔

میں نے دل ہی دل میں توبہ کی کہ شہلا باجی کو میں نے کیا سمجھ لیا تھا۔ مجھے یقین ہو گیا کہ ذیشان ان کا واقعی بھائی ہے۔ اس کی کہانی سن کر افسوس بھی ہوا کہ اس بے چارے کا بچپن ماں باپ، بہن بھائیوں سے دور گزر گیا۔

میں وہاں دیر تک بیٹھی رہی۔ باجی نے کہہ دیا تھا کہ آنے والا ہے۔ شاید وہ آ جائے۔ کل تو شہلا باجی پر غصہ تھا، میں نے اسے صحیح طور پر دیکھا بھی نہیں تھا۔

میری قسمت اچھی تھی۔ اسی وقت دروازے پر دستک ہوئی۔

''لو شیطان کا نام لیا اور آ گیا شیطان!'' باجی نے کہا اور دروازہ کھولنے چلی گئیں۔ وہی تھا اور بے تکلفی سے ڈرائنگ روم میں آ گیا تھا۔

''دوسرے کمرے میں جا کر بیٹھو۔'' باجی نے سرزنش کی۔

''باجی، مجھے کیا کوئی خطرناک بیماری ہے جو آپ کی شاگرد کو لگ جائے گی۔ یہ جب آتی ہیں آپ مجھے دوسرے کمرے میں بھیج دیتی ہیں۔''

''بیماری کیا خطرناک ہوگی، تم تو خود ہی خطرناک ہو۔ چلو اٹھو یہاں سے۔'' باجی نے اس کا کان مروڑتے ہوئے کہا۔

''کیا کر رہی ہیں باجی! ان کے سامنے تو بے عزتی نہ کریں۔ بس ایک چائے پلوا دیں۔ اس کے بعد جہاں کہیں گی، چلا جاؤں گا۔'' اس نے نہایت ہوشیاری سے باجی کو کچن میں بھیج دیا۔

''ہماری باجی کی شاگرد کا نام کیا ہے؟''

''طلعت۔''

''میرا نام نہیں پوچھیں گی؟''

''مجھے باجی نے بتا دیا ہے۔''

''پھر تو یہ بھی بتا دیا ہوگا کہ میں آپ کی وجہ سے باجی کے

ڈاکٹر ہاشمی

شاعری نہ اخلاقیات کی مبلغ ہے، نہ کسی سیاسی جماعت کا دستور، شاعری تو ایسی چیز ہے جسے کسی معینہ تعریف میں قید نہیں کیا جا سکتا۔ شاعر کی نظر میں قدرت اور اس کا مشاہدہ جس قدر حقیقت پسندانہ ہوگا اس کے ذہنی اور وجدانی تجزیوں کی کیفیت اسی قدر شفاف اور لطیف ہوگی۔ زندہ شعر کہنے کے لیے بڑے کربِ تنہائی کی ضرورت ہوتی ہے۔

(شاعری از ڈاکٹر ہاشمی)

مرسلہ: نوازش علی زیدی، پشاور

پاس مستقل رہنے آ گیا ہوں۔''

''امتحان ختم ہوتے ہی میری ٹیوشن بھی ختم ہو جائے گی۔''

''بھئی جب امتحان میں فیل ہو جاؤ گی تو پھر آؤ گی پڑھنے، یہ سلسلہ تو چلتا ہی رہے گا۔''

''توبہ کریں، میں کیوں فیل ہونے لگی تھی۔''

''بات یہ ہے طلعت صاحبہ۔ ہماری باجی نے آج تک جس کو بھی پڑھایا ہے، وہ پاس تو ہوا ہی نہیں ہے۔ میری مانیں تو ٹیوٹر بدل لیں، مجھ سے پڑھیں، مجھ سے۔''

''ہاں، تاکہ نہ صرف فیل ہو جاؤں بلکہ کالج سے بھی نکالی جاؤں۔''

بات یہیں تک پہنچی تھی کہ باجی چائے لے کر آ گئیں۔ اب ظاہر ہے چائے ختم ہونے تک مجھے وہاں بیٹھنا تھا۔ اس دوران ذیشان کی خوش مذاقی جاری رہی۔ چنچل لڑکے کس لڑکی کو پسند نہیں ہوتے اور اس کا ہر جملہ ہنسی میں ڈوبا ہوا تھا۔ صورت تو خیر بے مثال تھی ہی، باتیں بھی لاجواب کرتا تھا۔

بات یہیں تک پہنچی تھی کہ باجی چائے لے کر آ گئیں۔ اب ظاہر ہے چائے ختم ہونے تک مجھے وہاں بیٹھنا تھا۔ اس دوران ذیشان کی خوش مذاقی جاری رہی۔ چنچل لڑکے کس لڑکی کو پسند نہیں ہوتے اور اس کا ہر جملہ ہنسی میں ڈوبا ہوا تھا۔ صورت تو خیر بے مثال تھی ہی، باتیں بھی لاجواب کرتا تھا۔

اسی دوران ایک واقعہ نے تو مجھے اس کا گرویدہ ہی بنا دیا۔ ہوا یہ کہ میں کالج میں تھی، پیریڈ آف تھا۔ وقت گزاری کے لیے میں اپنی دوست نسرین کے ساتھ کینٹین میں آ گئی تھی۔ ابھی ہم نے آرڈر دیا ہی تھا کہ باہر شور سا بلند ہوا۔ ایسا

لگا جیسے کچھ لوگ لڑ پڑے ہوں۔ میں گھبرا کر باہر نکل آئی۔ بس یہی غلطی تھی۔ مجھے پتا نہیں تھا کہ بات اتنی بڑھ گئی ہے کیونکہ اسی وقت کہیں دور سے فائر ہوا تھا۔ بس ایک فائر ہوا تھا کہ ایسا لگا جیسے پورا کالج میدان جنگ بن گیا ہو۔ ہر طرف سے فائرنگ کی آواز آنے لگی۔ گولیاں جب چلتی ہیں تو کسی کو پہچان کر نہیں لگتی ہیں۔ ایسی ہی بھٹکی ہوئی ایک گولی آئی اور میرے بازو کو چھوتی ہوئی گزر گئی۔ خون دیکھ کر مجھ پر غشی طاری ہوگئی اور میں درد کو بھی بھولتی چلی گئی۔

جب ہوش آیا تو میں اسپتال میں تھی۔ وہاں میرے گھر والوں کے ساتھ ذیشان بھی موجود تھا۔ اس نے بتایا کہ اتفاقاً وہ کالج کے سامنے سے گزر رہا تھا۔ اندر فائرنگ ہوئی تو وہ سامنے کی ایک دکان میں پناہ کے لیے گھس گیا پھر جب پولیس آئی اور زخمیوں کو باہر لایا گیا تو اس نے مجھے دیکھ لیا۔ اسی نے گھر والوں کو خبر دی تھی۔

تین دن بعد اسپتال سے گھر لوٹ آئی۔

میں گھر آئی تو لامحالہ اپنے منگیتر عارف اور ذیشان کے درمیان موازنہ کرنے پر مجبور ہوگئی۔ دونوں میں بڑا فرق تھا جو میں نے اب تک محسوس نہیں کیا تھا لیکن ذیشان سے ملاقات کے بعد محسوس کر رہی تھی۔ عارف بزرگوں کی طرح سنجیدہ تھا۔ شکل صورت بھی بس انسانوں جیسی تھی۔ منگیتر تھا اور رشتے دار بھی۔ چاہتا تو گھمانے لے جاسکتا تھا۔ صبح شام ملنے آسکتا تھا لیکن توبہ کرو، کبھی توفیق نہیں ہوئی۔ مہینے دو مہینے میں چکر لگالیا کرتا تھا۔ وہ بھی اس طرح کہ میری خیریت ایسے دریافت کرتا تھا جیسے میری بیماری کا سن کر آیا ہو۔

"خیریت ہے طلعت، طبیعت تو ٹھیک ہے؟"

جان ہی تو جل کر رہ جاتی تھی۔ یہ سمجھ کر صبر کرلیتی تھی کہ سارے ہی لڑکے ایسے ہوتے ہوں گے۔ گرلز کالج تھا اس لیے لڑکوں سے واسطہ بھی نہیں پڑا تھا۔ گھر میں کوئی بھائی بھی نہیں تھا۔

ذیشان سے صرف دو ملاقاتوں ہی نے مجھے بتا دیا کہ عارف میں کوئی بوڑھی روح ہے۔ عارف کے پاس اس کے سوا کچھ نہیں تھا کہ وہ دولت مند باپ کا بیٹا تھا اور کسی وقت خود بھی بڑا بزنس مین بن سکتا تھا۔

میں اگلے دن باجی کے گھر گئی تو ذیشان کی بے تکلفی مزید بڑھ گئی تھی۔ اس کے جملوں میں مزید شوخی آگئی تھی بلکہ موقع ملتے ہی اظہارِ عشق بھی کر بیٹھا تھا۔ اس کے عشق میں تو پہلے ہی مبتلا تھی لہٰذا میں بھی اپنی پسندیدگی کیوں چھپاتی؟ میں نے یہ تک بتا دیا کہ میں نے اسے گلی سے گزرتے ہوئے دیکھا تھا۔ اسی دن سے میں اس کی تلاش میں تھی۔ میرا گوہر مقصود مجھے مل گیا۔

ایک دن اس نے مجھ سے کہا کہ صبح کے وقت شہلا باجی اسکول گئی ہوئی ہوتی ہیں۔ میں کالج جانے کے لیے گھر سے نکلوں اور شہلا باجی کے گھر پہنچ جاؤں۔ اکیلے بیٹھ کر خوب باتیں کریں گے۔ میرے لیے کیا مشکل تھا۔ کالج کے لیے بس اسٹاپ تک جاتے ہوئے شہلا باجی کا گھر راستے ہی میں پڑتا تھا۔ ذیشان دروازے پر کھڑا میرا انتظار کر رہا تھا۔ میں نے اِدھر اُدھر دیکھ کر اطمینان کرلیا کہ کوئی دیکھ تو نہیں رہا ہے اور دروازہ پار کرلیا۔ ذیشان نے دروازہ اندر سے بند کرلیا اور میرے پاس آکر بیٹھ گیا۔

دوپہر ہوئی تو شہلا باجی کے آنے سے پہلے میں وہاں سے نکل آئی۔ مجھے خوشی تھی کہ ذیشان دوسرے لڑکوں کی طرح ثابت نہیں ہوا تھا۔ وہ مجھ سے شادی کرنا چاہتا تھا۔ شادی کا نام آتے ہی مجھے خیال آیا تھا کہ میری تو منگنی ہوچکی ہے لیکن میں نے اسے کچھ نہیں بتایا۔ منگنی ہوئی تھی، کوئی نکاح تو نہیں ہوگیا تھا۔ سوچتی تھی جب وقت آئے گا، منگنی توڑ دوں گی۔

امتحانوں سے پہلے کالج حسب روایت بند ہوگئے تھے لیکن میں نے گھر والوں کو کچھ نہیں بتایا تھا۔ روز اس طرح کالج جاتی تھی اور شہلا باجی کے گھر پہنچ جاتی تھی۔

اس دوران وہ دوسرے لڑکوں کی طرح ثابت بھی ہوچکا تھا لیکن مجھے کوئی اعتراض نہیں ہوا۔ میں تو اس کی محبت میں پاگل ہو رہی تھی۔ ایمان کی حد تک یہ یقین بھی ہوچکا تھا کہ وہ مجھ سے شادی کرے گا۔

ایک دن دوپہر کا وقت تھا۔ ایک عورت امی کے پاس آئی۔ میں گھر پر ہی تھی لیکن میں ان لوگوں کے پاس بیٹھ کر کیا کرتی۔ اُٹھ کر دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ مجھے کیا معلوم تھا وہ کیا باتیں کر رہی ہیں؟

میں سوگئی تھی۔ سو کر اُٹھی تو امی میرے پاس آکر بیٹھ گئیں اور بڑی ترکیب سے شہلا باجی کا تذکرہ نکال لیا۔ مجھے کیا معلوم تھا، انہیں ذیشان کے بارے میں معلوم ہوچکا ہے۔ امی نے پوچھا تو میں نے اس وقت بھی یہی بتایا کہ شہلا باجی اکیلی رہتی ہیں۔ ان کے ساتھ کوئی نہیں ہے۔ امی کو شاید مجھ سے یہ امید نہیں تھی۔

"مجھے تم سے یہ امید نہیں تھی کہ جھوٹ بولوگی۔ آدمی جھوٹ اس وقت بولتا ہے جب اس کی چوری پکڑی جارہی ہو۔ زبیدہ نے مجھے سب کچھ بتا دیا ہے۔"

"کیا بتا دیا ہے اس نے؟"

"یہ کہ شہلا نے کوئی لڑکا پھانس لیا ہے جو اس کے ساتھ رہتا ہے۔"

"امی وہ تو اس کا بھائی ہے۔ رہتا کہاں ہے، ملنے آجاتا ہے۔ میں نے اسے ایک مرتبہ دیکھا ہے۔"

"ایسی عورتیں بھائی بنا کر ہی تو کام نکالتی ہیں۔ کوئی بھائی وائی نہیں ہے۔"

"یہ ان کا معاملہ ہے، ہمیں کیا؟"

"ہمیں کوئی سروکار کیوں نہ ہو؟ تم وہاں جاتی ہو، جانا بند کرو۔ کل کلاں کو باتیں بنیں گی۔"

"امی، میں وہاں پڑھنے جاتی ہوں۔ میری پڑھائی کا حرج ہوگا۔"

"کوئی ضرورت نہیں ہے۔ زبیدہ بھی کہہ رہی تھی کہ طلعت کو وہاں جانے سے روکو۔"

"زبیدہ خالہ کو ہمارے معاملات میں دخل دینے کی کیا ضرورت ہے؟"

"آج یہ بات زبیدہ کی زبان پر آئی ہے، کل پورا محلہ کہے گا۔ بس کوئی ضرورت نہیں ہے وہاں جانے کی۔"

اگر امی نے یہ بات مجھے پہلے بتا دی ہوتی تو میں سمجھ بھی جاتی لیکن اب تو بات بہت آگے بڑھ گئی تھی۔ اب میں ماننے والی نہیں تھی لیکن میں بہ ظاہر چپ ہوگئی۔ میرے دل میں چور تھا اس لیے زیادہ احتجاج بھی نہیں کرسکتی تھی۔ بس موقعے کی تلاش میں تھی کہ کسی طرح ایک مرتبہ ذیشان سے مل لوں۔ اس کا موقع جلد ہی مل گیا۔ امی کہیں گئی ہوئی تھیں۔ میں گھر سے نکلی اور شہلا باجی کے گھر پہنچ گئی۔ اتفاق یہ ہوا کہ ذیشان بھی وہاں موجود تھا۔

"تمہاری پڑھائی اچھی خاصی چل رہی تھی، تم نے آنا کیوں چھوڑ دیا؟"

"امی کو اعتراض ہے کہ ذیشان یہاں ہوتا ہے اس لیے مجھے نہیں آنا چاہیے۔ اس وقت بھی امی کہیں گئی ہوئی تھیں اس لیے آگئی۔"

"ٹھیک ہے طلعت۔ جیسا تمہاری امی کہیں ویسا کرو۔ مت آیا کرو یہاں۔"

شہلا باجی کسی کام سے اُٹھ کر کمرے سے باہر گئیں تو میں نے ذیشان سے بات کی۔

"ذیشان، اب میں یہاں نہیں آسکتی۔ ہم لوگ کہیں باہر مل لیا کریں گے۔"

"یہاں تک نہیں آسکتیں، باہر کیسے ملوگی؟"

"یہاں کی اور بات ہے۔ سب کی نظریں لگی ہوئی ہیں۔ ہم کہیں باہر مل لیا کریں گے، کسی کو معلوم بھی نہیں ہوگا۔" ہم نے

کون کہتا ہے کہ؟

اولاد نہیں ہوسکتی

آج بھی لاکھوں گھرانے اولاد کی نعمت سے محروم سخت پریشان ہیں۔ مایوسی گناہ ہے۔ انشاءاللہ اولاد ہوگی۔ خاتون میں کوئی اندرونی پرابلم ہو یا مردانہ جراثیم کا مسئلہ۔ ہم نے دیسی طبی یونانی قدرتی جڑی بوٹیوں سے ایک خاص قسم کا بے اولادی کورس تیار کیا ہے۔ جو آپ کے آنگن میں بھی خوشیوں کے پھول کھلا سکتا ہے۔ آپکے گھر میں بھی خوبصورت بیٹا پیدا ہوسکتا ہے۔ آج ہی گھر بیٹھے فون پر تمام حالات سے آگاہ کرکے بذریعہ ڈاک وی پی VP بے اولادی کورس منگوائیں۔

المُسلم دارالحکمت رجسٹرڈ (دواخانہ)

ضلع وشہر حافظ آباد۔ پاکستان

0300-6526061

0547-521787

فون اوقات

صبح 9 بجے سے رات 11 بجے تک

آپ ہمیں صرف فون کریں

دوائی آپ تک ہم پہنچائیں گے

اسی وقت ایک پارک میں ملنے کا وقت مقرر کرلیا۔

دوسرے دن میں کالج کے لیے نکلی مگر کالج نہیں گئی۔ پارک میں ذیشان میرا منتظر تھا۔ ہم کچھ دیر وہاں بیٹھے رہے پھر ایک ہوٹل میں جاکر بیٹھ گئے۔ اسی وقت ہم نے آیندہ ملاقات کے لیے دن اور وقت طے کرلیا۔ میں گھر چلی آئی۔

کسی کو ذرا بھی شک نہیں ہوا۔ ہم اسی طرح ملتے رہے۔ پھر ذیشان نے ایک دوست تلاش کرلیا جو اکیلا رہتا تھا۔ ہماری ملاقاتیں اس کے ہاں ہونے لگیں۔

اسی دوران عارف کئی مرتبہ آیا لیکن میں نے اس سے سیدھی طرح بات بھی نہیں کی۔ اس سرد مہری کو امی نے بھی محسوس کیا، عارف نے بھی لیکن کوئی بات کسی کے ہاتھ میں نہیں تھی۔ میرا کوئی راز معلوم نہیں تھا اس لیے سب نے خاموشی اختیار کیے رکھی لیکن مجھے تو معلوم تھا کہ اس سرد مہری کا نتیجہ بالآخر کیا نکلے گا۔ ذیشان سے جتنی جلدی میری شادی ہوجائے اتنا ہی اچھا ہے۔ میں نے ذیشان پر زور دینا شروع کردیا کہ وہ شادی کرے۔ اسے اور مجھے پہلی مرتبہ احساس ہوا کہ وہ شادی کیسے کرے گا؟ وہ تو کہیں نوکر بھی نہیں۔ بڑے بھائی اور شہلا باجی کے پیسوں پر عیش کررہا ہے۔ اس نے مجھ سے وعدہ کیا کہ وہ کہیں نوکری ڈھونڈے گا، میں خوش ہوگئی۔

کئی مہینے گزر گئے۔ مجھے محسوس ہوا کہ وہ نوکری ڈھونڈنے میں سنجیدہ نہیں۔ شاید کوئی کام کرنا ہی نہیں چاہتا۔ جب شادی کے بغیر ہی اس سے مل رہی ہوں تو اسے نوکری ڈھونڈنے اور شادی کرنے کی کیا ضرورت ہوگی۔ یہ سوچ کر میں نے اس سے ملنا بند کردیا۔ ہفتہ بھی نہیں گزرا تھا کہ اس کے ہوش ٹھکانے آگئے۔ ایک دن میں کالج جارہی تھی کہ وہ میرے سامنے آگیا۔ میں نے بھی کچھ نہیں سوچا اور اس کے ساتھ شہلا باجی کے گھر چلی گئی۔ اس وقت شہلا باجی گھر پر نہیں تھیں۔

"طلعت، تم نے یہ بھی نہیں سوچا کہ یوں ملنا جلنا بند کردو گی تو مجھ پر کیا گزرے گی۔"

"میں تو آپ کو یہ موقع دے رہی تھی کہ آپ آرام سے نوکری ڈھونڈ لیں۔"

"نوکری کوئی ہاتھ میں رکھی ہے، میں ڈھونڈ تو رہا ہوں۔"

"دیکھو ذیشان! اب میرے گھر والے میری شادی کا سوچ رہے ہیں۔ میں اگر تمہارا نام پیش کروں تو کس سہارے پر کروں؟"

"بس کچھ دن ٹالتی رہو، میں پوری کوشش کررہا ہوں کہ کوئی نوکری پکڑ لوں۔ پھر شہلا باجی کو تمہارے گھر بھیجوں گا۔"

وہ مجھے چھوڑنے گلی تک آیا اور بس یہی غضب ہوگیا۔ اس مرتبہ کسی اور نے نہیں، خود امی نے مجھے دیکھ لیا تھا۔ میری ساری احتیاط دھری کی دھری رہ گئی۔ وہ تو یہی سمجھی ہوں گی کہ میں شہلا باجی کے گھر جاتی ہوں اور ذیشان وہاں ہوتا ہے۔ یہ بات ایسی نہیں تھی جسے وہ نظر انداز کردیتیں۔ میں گھر پہنچی تو وہ تیار بیٹھی تھیں۔

"کہاں گئی تھیں تم؟"

"شہلا باجی سے ایک سوال پوچھنا تھا اس لیے چلی گئی تھی۔"

"کیا تمہیں نہیں معلوم تھا کہ وہ صبح کے وقت گھر پر نہیں ہوتی ہیں۔"

"وہ کبھی کبھی جلدی گھر آجاتی ہیں۔ میں نے کہا پوچھ لوں۔ گھر پر ان کا بھائی تھا۔ اس نے بتایا شہلا باجی نہیں ہیں۔ میں اسی وقت باہر آگئی۔"

میرا اکھڑا ہوا لہجہ صاف بتا رہا تھا کہ میں جھوٹ بول رہی ہوں۔ امی نے میری چٹیا پکڑ لی۔

"مجھے بے وقوف بنالی ہے۔ سچ سچ بتا ذیشان سے تیرا کیا تعلق ہے؟"

"کچھ بھی تو نہیں امی۔ تمہاری قسم، میرا ذیشان سے کوئی تعلق نہیں۔"

"کم بخت، یہ تو سوچ تیری منگنی ہوچکی ہے۔ عارف باہر جانے کی تیاری کررہا ہے۔ وہ چاہتا ہے شادی کرکے تمہیں بھی ساتھ لے جائے۔ ذرا سوچ، وہاں تک بات پہنچ گئی تو کیا ہوگا؟"

"اماں، میں سچ کہہ رہی ہوں۔ ذیشان سے میرا کوئی تعلق نہیں۔"

"طلعت، میری لاج رکھ لیجیو۔ جو تو کہہ رہی ہے خدا کرے وہ سچ ہو۔ ذیشان سے تیرا کوئی تعلق نہ ہو۔" امی نے میرے آگے ہاتھ جوڑ لیے۔

اللہ قسم مجھے اس وقت امی پر بہت رحم آیا تھا لیکن میں دل کے ہاتھوں مجبور تھی۔ اس وقت تو شکر ادا کیا کہ بات ٹل گئی۔ امی نے میری قسموں پر یقین کرلیا لیکن میں عارف کی طرف سے پریشان ہوگئی تھی۔ اس نے اگر شادی میں جلدی کی تو بھانڈا پھوٹ جائے گا۔ عارف کی کوئی ایسی کمزوری بھی میرے ہاتھوں میں نہیں تھی کہ میں منگنی توڑ دیتی۔ ذیشان کو بھی ابھی تک معلوم نہیں تھا کہ میری منگنی ہوچکی ہے۔

اب میرا شہلا باجی کے گھر جانا خطرناک ہوسکتا تھا۔ میں دوسرے دن ایک جنرل اسٹور پر گئی اور شہلا باجی کے گھر فون کیا۔ ظاہر ہے ذیشان ہی کو فون اٹھانا تھا۔ اسے میں نے ایک

...لیا اور ساری صورتِ حال اس کے سامنے رکھ دی۔ یہ ...می نہیں بتایا کہ میری منگنی ہوچکی ہے۔ اس نے بتایا کہ وہ ...ی کے لیے کوشش کررہا ہے۔

ہم گھر سے باہر ملنے لگے تھے۔

اس نے ایک روز یہ خوش خبری سنائی کہ اسے ایک آفس ...لرک کی نوکری مل گئی ہے۔ یہ کوئی جاذبِ نظر ملازمت ...ہیں تھی لیکن ملازمت تو تھی۔ اب کوئی بات نکلتی تو میں ذیشان ...ام پیش کرسکتی تھی۔

اب میں نہیں، وہ ضد کررہا تھا کہ شہلا باجی کو میرے گھر ...۔ میں اسے یہ بتانا نہیں چاہتی تھی کہ میری منگنی ہوگئی ...میں پہلے منگنی ختم کرنے کا کوئی بہانہ ڈھونڈنا چاہتی تھی۔ ...اس لیے اسے ٹالتی رہی۔ وہ اتنی جلدی میں تھا کہ اس نے مجھ ...پوچھے بغیر ایک روز شہلا باجی کو میرے گھر بھیج دیا۔ میں ...انہیں دیکھ کر کھٹکی تو ضرور تھی لیکن مجھے یہ معلوم نہیں تھا کہ وہ ...دے کر آگئی ہیں۔

انہوں نے امی سے بات کی "بہن! طلعت مجھے بہت اچھی لگتی ہے، میرا بھائی دبئی سے آگیا ہے۔ یہاں اس نے ...بھی کرلی ہے۔ اگر آپ ہمیں کسی قابل سمجھیں تو میں یہ ...ہوں گی، میرے بھائی ذیشان سے طلعت کی شادی ...ہوجائے۔ اگر آپ یہ رشتہ قبول کرلیں گی تو میری عزت ...ائی ہوگی۔ ذیشان میرے پاس ہی رہتا ہے۔ طلعت ...جائے گی تو میرے گھر میں رونق ہوجائے گی۔"

امی سکون سے ان کی باتیں سن رہی تھیں۔ مسکراہٹ ان کے ہونٹوں پر تھی۔ میں دوسرے کمرے کی کھڑکی سے دیکھ ...رہی تھی۔ سن بھی رہی تھی اور دل ہی دل میں دہل بھی رہی تھی ...کہ اب بات کھلنے والی ہے۔

"بہن، جہاں بیری ہوتی ہے وہاں پتھر آتے ہی ...ہیں۔" امی نے کہا "تمہارا شکریہ کہ تم نے ہمیں اس قابل سمجھا ...لیکن بات یہ ہے کہ طلعت کی منگنی ہوچکی ہے۔ ہمارے رشتے ...داروں میں ایک لڑکا ہے، اسی سے ہوئی ہے۔"

"بہن، مجھے یہ معلوم نہیں تھا ورنہ میں ہرگز نہ آتی۔"

"تمہیں معلوم بھی کیسے ہوتا، تمہارا ہمارا اتنا ملنا جلنا تو ...نہیں۔"

اس سے زیادہ شہلا باجی کیا کہتیں۔ کچھ دیر بیٹھیں اور ...پھر اٹھ کر چلی گئیں۔

ان کے جانے کے بعد امی نے مجھے بتایا کہ وہ کیوں آئی تھیں۔ میں پہلے ہی سن چکی تھی لیکن انجان بنی رہی۔ پھر امی کے دل کی بات زبان پر آگئی۔

"مجھے جس بات کا ڈر تھا، آخر وہی ہوا۔"

"کیا ہوا امی!"

"شہلا یونہی تو نہیں آگئی ہوگی؟"

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ تم نے اسے یہاں آنے کو کہا ہوگا۔"

"میں اگر کہتی تو منگنی کا انہیں معلوم ہوتا۔"

"ہاں یہ بھی ہے۔" امی سوچ میں پڑ گئیں۔

میں نے امی کو اس وقت تو مطمئن کردیا تھا لیکن اب بات وہاں آگئی تھی کہ مجھے کچھ نہ کچھ کرنا تھا۔ پھر میں نے وہ قدم اٹھایا جس کی توقع میں خود سے بھی کبھی نہیں کرسکتی تھی۔ میں میڈیکل اسٹور پر گئی اور عارف کو فون ملایا۔ ایسی دیوانگی طاری تھی کہ اس سے صاف لفظوں میں کہہ دیا کہ میں کسی اور سے محبت کرتی ہوں اور اس سے شادی کرنے والی ہوں اس لیے اس منگنی کو ختم سمجھو۔ چاہو تو امی کو بتادو۔ اگر میری عزت رکھنا چاہتے ہو تو الزام اپنے سر لے لو۔ مجھے ٹھکرا دو اور منگنی ختم کردو۔ میں آزاد ہوجاؤں گی۔ اس نے مجھ سے وعدہ کرلیا کہ وہ یہ منگنی ختم کردے گا۔

اس کے دل پر جو گزری ہوگی اس کا احساس مجھے اب ہوتا ہے، اس وقت نہیں ہوا تھا۔

وہ وعدے کا پکا نکلا۔ دو تین دن بعد اس کی والدہ ہمارے گھر آئیں۔ اتنی شرمندہ تھیں کہ بات کرتے کرتے آنکھیں چھلکنے لگی تھیں۔

"بہن، کیا بتاؤں..... لڑکا میرے ہاتھ میں تو ہے نہیں۔ کتنے شوق سے منگنی کی تھی اور اب کہتا ہے مجھے طلعت سے شادی نہیں کرنی۔ منگنی ختم کردو۔"

"آپ لوگوں نے مذاق سمجھا ہوا ہے۔ میری بچی کے چار سال برباد کردیے اور اب تم چلی آئیں کہ منگنی ختم کردو۔"

"جب کرنے والا ہی نہیں مانتا تو میں کیا کرسکتی ہوں؟"

"تم لوگوں نے جو کچھ میری بچی کے ساتھ کیا ہے، تمہارے آگے آئے گا۔"

"اے بہن، کوسنے تو مت دو۔ منگنیاں کیا ٹوٹتی نہیں ہیں۔ میں نے تو اسی وقت کہا تھا نکاح کردو۔ رخصتی بعد میں ہوجائے گی۔"

"اچھا ہوا نکاح نہیں کیا تھا۔ میری بچی پر تو طلاق کا داغ لگ جاتا۔"

مختصر یہ کہ دونوں میں خوب جھڑپ ہوئی۔ عارف کی والدہ اٹھ کر چلی گئیں۔ مجھے نہیں معلوم کہ عارف نے ان سے کیا کہا تھا بہرحال وہ منگنی ختم کرکے چلی گئیں۔

www.Paksociety.com

امی کو دکھانے کے لیے میں امی کے کندھے پر سر رکھ کر خوب روئی۔ میں یہی ظاہر کرنا چاہتی تھی کہ منگنی ٹوٹنے کا مجھے افسوس ہوا ہے۔ امی کو یہ شک ہو ہی نہیں سکتا تھا کہ منگنی ٹوٹنے میں میرا ہاتھ ہے۔ یہ تو میرے دل کا چور تھا جو مجھے رُلا رہا تھا۔

شام میں ابو گھر آئے اور امی نے انہیں بتایا تو افسوس انہیں بھی ہوا لیکن انہوں نے امی کو سمجھایا۔

"خدا جو کرتا ہے اس میں بہتری ہوتی ہے۔ اچھا ہوا یہ لوگ ابھی کھل گئے۔ ابھی کیا گیا تھا، منگنی ہی تو ہوئی تھی۔"

دل کو کتنی ہی تسلی دے لی جائے۔ یہ کوئی معمولی حادثہ تو تھا نہیں۔ گھر میں سوگ کی سی کیفیت تھی۔ امی بھی چپ تھیں، ابو بھی خاموش تھے۔

جب کچھ صدمہ کم ہوا تو امی نے مجھ سے ذیشان کا ذکر کیا۔

"تجھے یاد ہے، ایک دن شہلا آئی تھی؟"

"ہاں، یاد تو ہے۔"

"وہ اپنے بھائی کا رشتہ لائی تھی۔ میں نے لڑکا دیکھا ہے۔ ہے تو خوبصورت، اس وقت میں نے منع کر دیا تھا۔ عارف جو بیچ میں تھا۔ اگر تیری مرضی ہو تو شہلا سے بات کروں؟"

"امی، آپ کی مرضی ہے۔ میں تو وہاں شادی کروں گی جہاں آپ لوگ کہیں گے۔"

"مجھے تو ٹھیک ہی لگتا ہے۔ اکیلا ٹھیلا ہے۔ شہلا کے ساتھ رہتا ہے۔ شہلا اپنا خود کماتی ہے۔ چار پیسے تم ہی پر خرچ کرے گی۔ تمہاری محتاج نہیں ہوگی۔"

"امی، عادت کی بھی اچھی ہیں۔ میری تو وہ دوست بن گئی تھیں۔ آپ ہی نے ان کے گھر جانے سے منع کر دیا تھا۔"

"اس وقت میں نے ٹھیک کیا تھا۔ اب کی بات اور ہے۔ وہاں جانے کو تو میں اب بھی نہیں کہوں گی۔ شہلا کو بلا کر بات کرتی ہوں۔ لڑکیوں کی منگنی ٹوٹ جاتی ہے تو ہزار باتیں بنتی ہیں۔ شہلا خود آئی تھی اس لیے شاید وہ منگنی ٹوٹنے پر بھی رشتے پر تیار ہو جائے۔"

"جیسی آپ کی مرضی۔"

امی کو یہ معلوم ہی نہیں تھا کہ میں ذیشان سے برابر مل رہی ہوں۔ اسے میں نے یہ بھی بتا دیا تھا کہ میں نے منگنی توڑ دی ہے۔

امی نے ابو سے بات کی۔ وہ بھی منگنی ٹوٹنے کے بعد اتنے فیڈ اپ ہو گئے تھے کہ تھوڑی سی حیل و حجت کے بعد ذیشان کے رشتے پر تیار ہو گئے۔ انہیں بس ایک اعتراض تھا کہ عارف کے مقابلے میں ذیشان کی آمدنی کم ہے لیکن امی نے یہ کہہ کر انہیں راضی کر لیا کہ طلعت کی قسمت اچھی ہو، وہ ترقی بھی کر لے گا۔ ابھی وہ جو کچھ کماتا ہے، ان دونوں لیے بہت ہے۔

شہلا باجی کو ایک مرتبہ پھر بلا لیا گیا۔ رشتہ طے ہو گیا۔ یہ شگون بھی لے لیا گیا کہ طلعت ذیشان کی قسمت کی تھی۔ اللہ نے کیسا بندوبست کیا۔ اچھی بھلی منگنی ٹوٹ گئی۔

میں دلہن بن کر شہلا باجی کے گھر آ گئی۔ مجھے ذیشان ہو رہا تھا کہ وہ واقعی دوسرے لڑکوں کی طرح ثابت نہیں ہوا نے میرے ساتھ وقت نہیں گزارا بلکہ شادی کی۔ پھر یہ وہ لڑکا جسے ایک نظر دیکھ کر میں سب کچھ بھول گئی تھی اور میں نے ا حاصل کر لیا۔ اپنی قسمت پر جتنا بھی ناز کرتی، کم تھا۔

ذیشان کی محبت میں کوئی کمی نہیں آئی تھی۔ وہ میر ساتھ اسی محبت سے پیش آ رہا تھا جس طرح شادی سے ملتا تھا۔ شہلا باجی بھی دوستوں کی طرح چھیڑ چھاڑ میں لگی ر تھیں۔ میرا گھر جنت بنا ہوا تھا لیکن پھر کسی کی نظر لگ گئی۔

ابھی چھ مہینے گزرے تھے کہ شہلا باجی کا اچانک ا ہو گیا۔ اچھی بھلی سوئی تھیں۔ رات میں کسی وقت ہارٹ ہو گیا۔ جوانی کی موت ہی سمجھ لو۔ زیادہ سے زیادہ 45 ہوں گی۔ اتنا اچانک انتقال ہوا تھا کہ پورا محلّہ سہم کر رہ گیا تھا۔ ذیشان کی حالت تو بہت ہی غیر ہو گئی تھی۔ صدمہ مجھے کچھ کم نہیں ہوا تھا۔

شہلا باجی کے صدمے سے نکلنے میں کئی مہینے لگ گئے تھے۔ رفتہ رفتہ حالات معمول پر آنے لگے۔ ذیشان دل لگا نوکری کر رہے تھے لیکن اب مجھے محسوس ہونے لگا تھا کہ زند صرف محبت سے نہیں گزرتی۔ اچھی آمدنی بھی ضروری ہو ہے۔ ذیشان کی آمدنی محدود تھی۔ اتنی محدود کہ مہینے میں ایک مرتبہ بھی کھل کر شاپنگ نہیں کر سکتے تھے۔ کسی مہینے ایک لے لی تو دوسری چیز کے لیے اگلے مہینے کا انتظار۔ میں ذیشا سے کہتی رہتی تھی کہ اپنی آمدنی بڑھائے۔ کہیں پارٹ ٹ کر لے یا اپنا کاروبار کرنے کے بارے میں سوچے لیکن ذیشان اُن مردوں میں سے تھا جنہیں کام سے زیادہ آرا پسند ہوتا ہے۔ اس کے کان پر جوں ہی نہیں رینگتی تھی۔ ہمارے جھگڑے شروع ہو گئے۔ اس کے باوجود وہ سنجیدہ ہوتا تھا۔ اب تو وہ یہ بھی کہنے لگا تھا کہ یہ تو تمہیں شادی سے پہلے سوچنا تھا کہ میری آمدنی کتنی ہے۔ کہتا وہ ٹھیک ہی تھا لیکن میں نے تو یہ سوچا تھا کہ آہستہ آہستہ ترقی کر لے گا۔ یہ کب معلوم تھا کہ پتھر بنا ایک جگہ پڑا رہے گا۔ سچی بات یہ ہے کہ اب مجھے عارف کا خیال آنے لگا تھا۔ اس کے بارے میں کئی

ملی کہ اس نے اپنا الگ بزنس شروع کر دیا ہے۔ لاکھوں کما رہا ہے، وغیرہ وغیرہ۔ مجھے پچھتاوا تو نہیں تھا لیکن یہ ضرور تھی کہ ذیشان بھی ترقی کرے۔ میں عارف کو لوں کہ میرا انتخاب غلط نہیں تھا۔

میں سوچتی ضرور تھی لیکن سوچنے سے کیا ہوتا ہے۔ ہماری ی کو دو سال ہو گئے تھے لیکن ہم وہیں کے وہیں تھے۔ ہوں جیب میں پیسے نہ ہوں تو آدمی وقت سے پہلے ہو جاتا ہے۔ یہی حال ہمارا ہو گیا تھا۔ ہم دونوں روایتی بی کی طرح گھر میں قید ہو کر رہ گئے تھے۔ ذیشان میں پہلے والی شوخی نہیں رہی تھی بلکہ چڑچڑا ہو گیا تھا۔ اب تقاضوں پر وہ کاٹ کھانے کو دوڑنے لگا تھا۔ میں نے راتے کچھ کہنا ہی چھوڑ دیا۔

اس روز ذیشان کا موڈ نہ جانے کیوں ضرورت سے خوشگوار تھا۔ اس نے صبح ہی سے کہہ دیا تھا کہ شاپنگ لے چلیں گے۔ ابھی تنخواہ کا دن نہیں آیا تھا اور وہ شاپنگ کہہ رہا تھا۔ میرے لیے یہ حیرت کی بات تھی۔

"خیریت تو ہے، آج کیا راستے میں حاتم طائی مل گیا اس نے کہا لو بھائی، یہ رقم لے لو اور بیوی کو شاپنگ ا۔"

"کیوں مذاق کرتی ہو۔ مجھے بونس ملا ہے، پوری ایک ا۔"

"ہاں، ہم اسی قابل رہ گئے ہیں کہ جب بونس ملے تو پنگ کو چلے جائیں۔"

"یار، اس وقت تو طنز مت کرو۔"

"طنز کی کیا بات ہے، سچ تو کہہ رہی ہوں۔ تنخواہ اتنی ہو کہ تنخواہ میں شاپنگ کیا کریں۔"

"تنخواہ بھی اتنی کر لوں گا۔ ابھی جو ہے اسی میں گزارہ ..."

وہ آفس چلا گیا۔ میں اکیلے گھر میں اکیلی رہ گئی۔ کوئی ی نہیں تھی کہ جی بہلا رہتا۔ اس وقت جی کچھ زیادہ ہی ہو گیا تھا لہٰذا امی کی طرف چلی گئی۔ وہاں عارف آیا ہوا الامحالہ سامنا کرنا پڑا۔

"طلعت، کیسی ہو، طبیعت تو ٹھیک ہے؟" اس نے وہی اپنا جملہ دُہرایا جو وہ اکثر کہا کرتا تھا لیکن اس وقت بہت عجب معلوم ہوا۔ اس وقت وہ یہی پوچھ سکتا تھا۔

"اللہ کا شکر ہے۔ میں اپنے گھر میں ٹھیک ہوں۔"

"ذیشان صاحب کیسے ہیں؟"

"وہ بھی ٹھیک ہیں۔ ضروری نہیں جس کے پاس گاڑی ہو وہی ٹھیک ہوتا ہے۔"

"میں نے یہ تو نہیں کہا۔ تمہارا ہمدرد ہوں اسی لیے خیریت پوچھ لی۔"

"آپ کا شکریہ!" میں نے کہا اور کمرے میں چلی گئی۔

امی نے مجھے بتایا کہ وہ منگنی توڑنے پر معافی مانگنے آیا ہے۔ شرمندہ ہے اپنے کیے پر۔

"وہ شرمندہ ہو رہا ہے تو تم بھی غصہ تھوک دو۔ سیدھی طرح بات کر و اس سے۔ آخر رشتے داری ہے ہماری۔"

"اس آدمی کی وجہ سے میں جہنم میں جھونکی گئی ہوں۔"

"کیا پھر کوئی بات ہوئی ہے؟"

"بات کیا ہوئی ہے۔ وہی چند روپے اور پورا مہینا۔"

"بیٹی، یہ تو تیرا نصیب ہے۔ نہیں تھا تیرے مقدر میں عیش۔ ذیشان تیرے ساتھ تو ٹھیک ہے؟"

"ایسے ٹھیک ہونے کا کیا کروں؟"

"بیٹا، وہ تیرا خیال رکھتا ہے، یہی بہت ہے۔ ذرا سوچ اس کے پاس دولت ہوتی اور تجھے منہ نہ لگاتا...... پھر تو کیا کرتی؟ دولت سے پیٹ بھر جاتا ہے، روح تشنہ رہ جاتی ہے۔"

"یہ سب کہنے کی باتیں ہیں۔ عارف کو دیکھو کیسا شاندار سوٹ پہنے ہوئے ہے اور باہر کیسی شاندار گاڑی کھڑی ہوئی ہے۔"

"ہاں بیٹا!" اماں نے ایسی ٹھنڈی سانس بھری کہ میرا کلیجا کٹ کر رہ گیا۔ میں اپنی پریشانیاں سنا کر امی کو کیوں اداس کرتی ہوں۔ میں دل پر پتھر رکھ کر عارف کے سامنے آ کر بیٹھ گئی اور اس سے ہنس ہنس کر باتیں کرنے لگی تا کہ امی خوش ہو جائیں۔ عارف ان کا رشتے دار بھی تو تھا۔

گھر آئی تو ذیشان آفس سے آ چکے تھے۔ میں جلدی جلدی تیار ہوئی۔ رکشا کے بجائے آج انہوں نے ٹیکسی کی تھی۔ ہم مارکیٹ پہنچ گئے۔

یہ ایک سپر مارکیٹ تھی۔ یہاں ہر چیز کی دکانیں تھیں۔ ذیشان نے مجھ سے کہا تھا کہ وہ مجھے سوٹ پیس، فینسی چپل اور کچھ امیٹیشن جیولری دلائے گا۔ وہ واقعی آج حاتم طائی بنا ہوا تھا۔

ہم بہت سی شاپنگ کر چکے تھے، صرف سوٹ پیس خریدنا رہ گیا تھا۔ ذیشان ان مردوں میں سے نہیں تھے جو بازار میں گھوم کر خوش ہوتے ہیں۔ ان کا کہنا تو یہ تھا کہ بس ایک دکان پر بیٹھو اور جو خریدنا ہے خرید لو۔ اس وقت بھی وہ میرے ساتھ گھومتے گھومتے تھک گئے تھے بلکہ بور ہو گئے تھے۔ جب میں کپڑے کی دکان میں داخل ہوئی تو ان کا پارہ یک ایک چڑھ گیا۔

"یہ کپڑے کی چوتھی دکان ہے جس میں تم ایک معمولی سا سوٹ پیس خریدنے کے لیے داخل ہو رہی ہو۔"

"اب کہیں کوئی کپڑا پسند نہیں آ رہا ہے تو میں کیا کروں؟"

"ہر دکان پر ایک ہی سا کپڑا ہے مگر تمہیں تو شوق ہے وقت ضائع کرنے کا۔"

"آپ کو جلدی ہو رہی ہے تو رہنے دیں، پھر کبھی آ جائیں گے۔"

"پھر کسی دن بھی یہی ہوگا۔ جب اتنا وقت گزارا ہے تو کچھ اور سہی۔ چلو یہاں بھی دیکھ لو۔"

وہ میرے ساتھ ہی دکان میں داخل ہوا تھا لیکن بار بار پہلو بدل رہا تھا۔ پھر اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

"تم اچھی طرح بھاؤ تاؤ کر لو۔ میں سگریٹ لے کر آتا ہوں۔"

میں نے شکر بھیجا کہ اب میں آرام سے خریداری کر سکوں گی۔

اس کے جاتے ہی مارکیٹ میں ایک زوردار دھماکا ہوا۔ میں صرف اتنا ہی دیکھ سکی تھی کہ دکاندار ہوا میں اچھلا تھا۔ خود مجھ پر کیا بیتی مجھے کچھ یاد نہیں۔ صرف اتنا یاد ہے کہ بے پناہ شور کی آوازیں میرے کانوں میں آ رہی تھیں۔ میری آنکھ کھلی تو میں اسپتال میں تھی۔ ذیشان کے مطابق مجھے دوسرے دن ہوش آیا تھا۔

میرا آدھا چہرہ اور بازو پٹیوں میں جکڑا ہوا تھا۔ مجھے کچھ معلوم نہیں تھا کہ مجھ پر کیا گزری ہے اور کیوں گزری ہے لیکن جلد ہی معلوم بھی ہو گیا کہ مارکیٹ میں بم دھماکا ہوا تھا۔ ذیشان مارکیٹ سے باہر نکل چکے تھے اور میں اس کی زد میں آ گئی تھی۔

یہ ایک حادثہ تھا۔ یہ حکومت کی ذمے داری تھی کہ اس میں زخمی ہونے والوں کا بہتر سے بہتر علاج کرایا جائے لیکن ان زخمیوں کو جن میں، میں بھی شامل تھی، سرکاری اسپتال میں ڈال دیا گیا تھا۔ اعلانات بہت سے ہو چکے تھے۔ عمل کسی پر بھی نہیں ہوا۔ کوئی سرکاری اہلکار پلٹ کر بھی نہیں آیا کہ اے زخمیو، تم پر کیا گزری۔ معاوضہ دینے کا اعلان ہوا، وہ بھی ہوا میں تحلیل ہو گیا۔

میں ایک مہینے بعد گھر آئی تو اس حال میں تھی کہ میرا آدھا چہرہ بُری طرح مسخ ہو چکا تھا۔ ایسا کہ دیکھنے والا فوراً منہ پھیر لے۔ میرا بازو بھی جلا تھا لیکن .... بازو تو آستین میں چھپا رہتا تھا، چہرے کو کیا کرتی؟

ذیشان کا ردِعمل فطری تھا۔ وہ میری طرف دیکھنے سے کترا رہے تھے۔ بیڈ روم میں آتے تھے تو فوراً لائٹ آف کر دیتے تھے۔ کوشش کرتے تھے کہ زیادہ سے زیادہ گھر سے باہر رہیں۔ میں اس صورتِ حال سے اُلجھنے لگی تھی۔

"ذیشان! مجھے احساس ہے کہ میرا چہرہ بگڑ گیا ہے۔ آپ میری طرف دیکھنے سے بھی گریزاں ہیں۔ آپ میری پلاسٹک سرجری کیوں نہیں کرا دیتے؟"

"تم تو ایسے کہہ رہی ہو جیسے یہ کوئی معمولی بات ہے۔ جلد اتنی زیادہ خراب ہو گئی ہے کہ اس کے لیے بیرونِ ملک جانا پڑے گا۔ تمہارے پاس تو اتنے زیور بھی نہیں ہیں کہ بیچ کر چلی جاؤ۔"

مجھے ایک مرتبہ پھر احساس ہوا کہ میں نے ذیشان سے شادی کر کے غلطی کی۔ قلاش شوہر محبت دے سکتا ہے، علاج نہیں کرا سکتا۔

وہ یہی کہتے رہے تھے کہ پیسوں کا انتظام کر رہا ہوں لیکن مجھے معلوم تھا کہ مجھے دیکھ کر نفرت سے منہ تو پھیر سکتے ہیں، پیسوں کا انتظام نہیں کر سکتے۔ اب تو وہ زیادہ تر گھر سے باہر ہی رہنے لگے تھے۔

ایک دن دروازے پر دستک ہوئی۔ میں نے دروازہ کھولا تو باہر عارف کھڑا تھا۔

"ذیشان گھر پر ہیں؟"

"وہ تو نہیں ہیں۔"

"میں نے تمہارا سنا تھا۔ دیکھنے چلا آیا۔ جب ذیشان ہوگا اس وقت آ جاؤں گا۔"

"آیئے، اندر آ جایئے۔ وہ بھی آ جائیں گے۔"

"نہیں، میں چلتا ہوں۔ وہ نہ جانے کیا سوچے؟"

"کچھ نہیں سوچیں گے۔ میرے رشتے دار کیا آتے نہیں ہیں۔"

"میں بزنس ٹور پر امریکا گیا ہوا تھا۔ پرسوں آیا ہوں ورنہ پہلے آ گیا ہوتا تمہیں دیکھنے۔"

"آپ کا بہت بہت شکریہ!"

"تم نے پلاسٹک سرجری کیوں نہیں کرائی؟ آج کل تو بہت سے جدید طریقے آ گئے ہیں۔"

"ذیشان کہہ رہے ہیں اس کے لیے بیرونِ ملک جانا پڑے گا۔ وہ پیسوں کا انتظام کرتے تو پھر رہے ہیں، دیکھو کیا ہوتا ہے؟"

ہم دونوں حکومت کی بے حسی اور ذیشان کے طرزِ عمل وغیرہ پر باتیں کرتے رہے پھر وہ یہ کہہ کر اُٹھ گیا کہ کسی دن ذیشان کی موجودگی میں آئے گا اور اس سے بات کرے گا۔

اس کے چلے جانے کے بعد میں اپنے ماضی کی طرف لوٹ گئی۔ ایک عارف ہے جو گھومنے پھرنے کے لیے امریکا جاتا ہے۔ ایک ہم ہیں کہ علاج کے لیے بھی نہیں جا سکتے۔ اگر میری شادی عارف سے ہوئی ہوتی تو میرا علاج کب کا ہو چکا ہوتا۔

چار چھ روز بعد عارف پھر آیا۔ اس دن بھی اتفاق سے ذیشان گھر پر نہیں تھے۔

"طلعت، تم نے مجھے ٹھکرا دیا تھا لیکن میں آج بھی تم سے محبت کرتا ہوں۔"

"اب ان باتوں کا کیا فائدہ؟"

"میں فائدے کے لیے نہیں کہہ رہا ہوں۔ میں نے تو یہ بات اس لیے کہی کہ میری محبت کا تقاضا ہے کہ میں تمہیں بیرونِ ملک لے جا کر تمہارا علاج کراؤں۔"

"آپ پر میرا کیا حق ہے؟"

"بقول تمہارے میں تمہارا رشتے دار بھی تو ہوں۔"

"میں ذیشان سے بات کر کے دیکھوں گی۔"

میں نے ذیشان سے بات کی تو ان کے چہرے پر عجیب طرح کی حقارت اُبھر آئی۔ لبِ لباب یہ کہ میرا سابق منگیتر میرا علاج کرائے، یہ ان کی غیرت کے منافی تھا۔ اس روز ذیشان سے میری خوب جھڑپ ہوئی۔

عارف پھر آیا تو میں نے یہ تجویز رکھی کہ اگر ذیشان بھی ہمارے ساتھ چلے تو ہم چل سکتے ہیں۔

"اسے تمہاری پروا نہیں اور تم اسے ساتھ لے جانے کی بات کر رہی ہو۔"

"وہ جیسا بھی ہے، میرا شوہر تو ہے۔"

"وہ تمہاری بدصورتی کو بہانہ بنا کر دوسری لڑکیوں کے ساتھ عیش کرتا پھر رہا ہے اور تم اسے شوہر کہہ رہی ہو۔"

"دوسری لڑکیوں کے ساتھ.....؟"

"ہاں، میں نے خود اسے دیکھا ہے لیکن اس سے مت کہنا ورنہ وہ تمہارا جینا دوبھر کر دے گا۔"

عارف بیٹھا تھا کہ ذیشان آ گیا۔ بہ ظاہر اچھی طرح ملا لیکن اس کے چلے جانے کے بعد اس نے مجھ پر الزامات کی بوچھار کر دی۔ میں نے بھی بے نقط سنائیں۔ اسے ان لڑکیوں کا بھی طعنہ دے دیا جن کے ساتھ وہ گھومتا پھرتا ہے۔ اسی دن کے بعد سے ہم میں فاصلے بڑھتے چلے گئے تھے۔

عارف کو میں نے گھر آنے سے منع کر دیا تھا لیکن معاملہ علاج اور اس کی تیاریوں کا تھا لہٰذا میں اس سے باہر جا کر ملنے لگی۔ وہ مجھے فون کر دیتا اور میں اس کے بتائے ہوئے مقام پر پہنچ جاتی۔

معاملہ وہیں کا وہیں تھا۔ ذیشان مجھے اس کے ساتھ بھیجنے پر تیار نہیں تھے اور عارف، ذیشان کو ساتھ لے جانے پر رضامند نہیں تھا۔

ان ملاقاتوں میں، میں عارف کے بہت قریب آ گئی تھی۔ یہ سوچنے لگی تھی کہ عارف میری بدصورتی کے باوجود مجھ سے محبت کرتا ہے جبکہ ذیشان کی محبت نفرت میں بدل گئی ہے۔ پھر ایک دن عارف کے دل کی بات زبان پر آ گئی۔

"اگر تم ذیشان سے پیچھا چھڑا لو تو میں اب بھی تمہارا ہاتھ تھامنے کے لیے تیار ہوں۔ تمہیں امریکا لے جا کر تمہارا علاج بھی کراؤں گا اور تم سے شادی بھی کر لوں گا۔"

یہ ایسا مضبوط سہارا مجھے مل گیا تھا کہ ذیشان مٹی کا ڈھیر معلوم ہونے لگا۔ میں نے اس سے جان بوجھ کر لڑنا شروع کر دیا۔ جواب میں وہ بھی لڑتا تھا۔ پھر ایک روز میں نے اس سے طلاق کا مطالبہ کر دیا۔ وہ تو شاید خود بھی یہی چاہتا تھا۔ میں امی کے گھر آ گئی۔ انہوں نے بھی مجھے سمجھایا لیکن میں کسی کی بات سننے کو تیار نہیں تھی۔ ذیشان نے مجھے طلاق دے دی۔

میں نے عارف کو یہ خبر اسی طرح سنائی جیسے کوئی بہت بڑی خوش خبری ہو۔ وہ بھی کھل اُٹھا۔

"میں یہ خبر سننے کے لیے کب سے بے تاب تھا۔ آج تم نے دل خوش کر دیا۔ بس عدت کے دن پورے کر لو۔ پھر ہم امریکا چلیں گے۔"

"میں نے تمہیں ٹھکرا کر غلطی کی تھی عارف، مجھے معاف کر دو۔"

"تم میری تھیں، مجھے مل گئیں بس تیاری کر دو۔"

میری عدت کے دن پورے ہوئے تو میں نے عارف کو فون کیا۔ ایک مرتبہ پھر پچھتاوا میرے سامنے کھڑا تھا۔

"میں کل مستقل قیام کے لیے امریکا روانہ ہو رہا ہوں۔ سوچ رہا ہوں اب شادی بھی کر لوں۔"

"تم نے ......"

"دیکھو طلعت، تم نے منگنی توڑ کر میری توہین کی تھی۔ میرا انتقام پورا ہو گیا۔ تم میری نہیں ہوئیں، میں نے تمہیں ذیشان کا بھی نہیں رہنے دیا۔ معاف کرنا، تم جیسی بدصورت لڑکی سے میں شادی نہیں کر سکتا۔"

میرے ہاتھ سے ٹیلی فون چھوٹ گیا۔

www.paksociety.com

دھول بھرا سناٹا

جناب ایڈیٹر صاحب
السلام علیکم!
میری زندگی میں اب دھول بھرے سناٹے کا راج ہے۔ میں نے جو بویا وہی کاٹ رہا ہوں۔ زندگی کو پرتعیش بنانے کے لیے میں نے جو کوشش کی تھی وہ چور راستے کی تھی اسی لیے خداوند تعالیٰ نے ایسی سزا دی ہے کہ میں سسک سسک کر زندگی گزارنے پر مجبور ہوں۔

انور علی
(کراچی)

میں نے کال بیل کا بٹن دبایا تو تھوڑی دیر بعد ایک ملازم نے دروازہ کھول دیا۔ اس نے میرے خوبصورت کپڑوں اور چمک والے جوتوں پر ایک نظر ڈالی اور ادب سے بولا ”آئیے، انور صاحب! اندر آجائیے۔“

اس نے مجھے ایک سجے سجائے ڈرائنگ روم میں بٹھا دیا جو خوشبو سے مہک رہا تھا۔

تھوڑی دیر بعد ڈرائنگ روم میں رمشا داخل ہوئی۔ اس نے بہت شوخ رنگ کی فراک پہن رکھی تھی۔ اس کے خوبصورت براؤن بال پونی کی صورت میں بندھے ہوئے تھے۔ وہ منہ پھلا کر بولی ”انور! آج تم پھر دیر سے آئے ہو۔ ہم کب سے تمہارا انتظار کر رہے ہیں؟“

”سوری!“ میں نے کہا ”میں ایک ضروری کام میں پھنس گیا تھا۔“

میری عمر اس وقت صرف چودہ سال تھی اور رمشا دس گیارہ سال کی ہوگی لیکن وہ روٹھتی تھی تو بالکل الہڑ دوشیزہ لگتی تھی۔

”رمشا! اب اپنا موڈ درست کرلو، آئندہ ایسا نہیں ہوگا۔“

رمشا کھلکھلا کر باہر کی طرف بھاگی۔ میں اسے پکڑنے کے لیے اس کے پیچھے پیچھے بھاگا۔ وہ لان میں پہنچ گئی اور اچانک مالی سے پانی کا پائپ چھین لیا۔ پھر اس نے پانی مجھ پر پھینکا تو ایک دم میری آنکھ کھل گئی۔

میں اپنے غلیظ اور بوسیدہ بستر پر تھا اور سر پر اماں کھڑی تھیں اور چیخ رہی تھیں ”کیا نشہ کر کے سوتا ہے؟ میں کب سے تجھے آوازیں دے رہی ہوں۔ جلدی سے اٹھو، ورنہ اب استاد دیر برداشت نہیں کرے گا۔“

”اٹھتا ہوں اماں!“ میں نے منہ بنا کر کہا اور بڑبڑاتا ہوا غسل خانے کی طرف چلا گیا جہاں پرانی اور میلی سی پانی کی ٹنکی رکھی تھی۔ میں نے وہیں بیٹھ کر ہاتھ منہ دھویا اور سوچتا رہا کہ اماں نے فضول میں مجھے نیند سے بیدار کر دیا۔ میں حسین خواب دیکھ رہا تھا۔

پھر میں نے تیل اور میل میں ڈوبے ہوئے کپڑے پہنے، چائے کے ساتھ باسی روٹی کھائی اور ورکشاپ کی طرف روانہ ہوگیا۔

میں گزشتہ چار سال سے اس ورکشاپ میں کام کرتا تھا۔ میں دس سال کا تھا تو ابا کا انتقال ہوگیا تھا اور گھر کی ساری ذمے داری مجھ پر آپڑی تھی۔

میں ان دنوں چھٹی جماعت میں پڑھ رہا تھا اور میرے ٹیچرز کا خیال تھا کہ میں بہت ذہین ہوں اور ایک دن اسکول کا نام ضرور روشن کروں گا لیکن اسکول کا نام روشن کرنے سے پہلے ہی میری امیدوں کے تمام دیے گل ہوگئے۔

ابا ایک سرکاری دفتر میں ملازم تھے۔ ان کی تنخواہ ہم افراد کے لیے کافی ہوتی تھی۔ گھر بھی اپنا تھا اور ابا کا ارادہ تھا کہ وہ ہاؤس بلڈنگ سے قرض لے کر اس گھر کو ڈراؤ... سے تعمیر کرائیں گے لیکن وقت نے انہیں اتنی مہلت ہی نہ دی۔ یوں مجھے اس ورکشاپ پر کام کرنا پڑا۔

ورکشاپ کا مالک جبار بہت غصیلا اور بدتمیز تھا۔ گالیاں تو اس کی زبان پر رہتی تھیں۔

ہمارے محلے کے چاچا اکرام سے اس کی دوستی تھی۔ وہ مجھے جبار کے پاس لے گئے تھے۔

استاد نے سر سے پیر تک میرا جائزہ لیا، پھر بولا ”دیکھ بھئی الو! اگر تجھے کام سیکھنا ہے تو بہت محنت کرنا پڑے گی، ... کوئی چھٹی برداشت نہیں کرتا ہوں، چوری چکاری بھی مجھے ... پسند نہیں ہے۔“

”استاد!“ میں نے پُراعتماد لہجے میں کہا ”نہ میں چور ہوں اور نہ کام سے جی چراتا ہوں۔ پہلے جس طرح اسکول میں محنت سے پڑھتا تھا، اسی طرح یہاں بھی محنت سے کام کروں گا۔“

”ابے، تیری تو زبان بھی بہت چلتی ہے مگر یہاں اپنی زبان پر قابو رکھنا، یہاں کاریگروں میں مجید سب سے بڑا ہے، اس کے بعد احمد ہے۔ ان دونوں سے زبان درازی مت کرنا ورنہ نقصان میں رہے گا۔ مجید تو غصے کا اتنا تیز ہے کہ جو چیز ہاتھ میں ہو، کھینچ مارتا ہے۔“ پھر وہ اکرام چچا سے بولا ”ابھی تو میں اسے دس روپے روز دوں گا اور صبح شام دو وقت کی چائے بھی ملے گی۔ ہاں کھانا اسے گھر سے لانا پڑے گا۔“

”تمہاری بہت مہربانی استاد!“ اکرام چچا نے کہا ”بے چارہ یتیم بچہ ہے۔ کوئی ہنر ہاتھ میں آیا تو اس کا مستقبل بھی بن جائے گا۔“

”ٹھیک ہے بے!“ استاد جبار نے مجھ سے کہا ”کل سے آجائیو اور ہاں، اپنے یہ اجلے کپڑے اتار کر کوئی میلا سوٹ پہن کر آنا۔ یہاں ایسے کپڑوں کا کوئی کام نہیں ہے۔“

میں نے دیکھا، وہاں ہر لڑکا میل اور تیل میں لتھڑے ہوئے کپڑوں میں ملبوس تھا، ان کے ہاتھوں پر بھی کالک تھی جو بے خیالی میں ان کے چہرے پر بھی لگ گئی تھی۔

میں ایک صاف ستھرے اسکول میں پڑھتا تھا اور چمکتی ہوئی یونیفارم پہن کر اسکول جاتا تھا۔ ان غلیظ لڑکوں کا حلیہ دیکھ کر میں گھبرا گیا۔ میں نے سوچا کہ میں اماں سے جا کر صاف صاف انکار کردوں گا کہ میں اس غلیظ ورکشاپ میں کام نہیں کروں گا۔

گھر پہنچ کر جب میں نے اماں کو بتایا کہ وہاں کا ہر آدمی غلیظ ہے اماں! ورکشاپ کا فرش نہ صرف تیل کے داغوں سے اَٹا ہوا ہے بلکہ دیواروں پر بھی تیل گریس اور پینٹ کے داغ ہیں۔

میری بات سن کر اماں رونے لگیں۔ اماں کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر میرا دل گویا کٹنے لگا تھا۔ وہ روتے ہوئے بولیں ”اب یہی کچھ کرنا ہوگا انو بیٹے! اگر یہ آسرا بھی نہ رہا تو فاقوں کی نوبت آجائے گی۔“ وہ پھر بلک بلک کر رونے لگیں۔ اپنی بے بسی پر یا شاید میرے انکار پر۔

میں نے ان کے آنسو صاف کرتے ہوئے کہا ”رومت اماں! میں وہاں کام کروں گا۔“

دوسرے دن اماں نے مجھے ایک پُرانی جینز اور شرٹ نکال دی۔ میرے یہ پُرانے کپڑے جنہیں میں بدرنگ سمجھ کر چھوڑ چکا تھا، ان لڑکوں کے کپڑوں سے کہیں بہتر تھے جو ورکشاپ میں کام کررہے تھے۔

اماں نے کھانے کے اسی ڈبے میں گھی لگا کر دو روٹیاں رکھ دیں اور کہا کہ وہاں چائے تو ملتی ہے، انہیں چائے کے ساتھ کھالینا۔“

ورکشاپ میں پہلا دن تو مجید نے مجھے مختلف اوزاروں، پانوں وغیرہ کے نام اوکرانے میں ہی گزار دیا۔ استاد نے مجھے مجید کے حوالے کردیا تھا۔ اسے سب مجید بھائی کہتے تھے۔

استاد کی طرح وہ بھی بہت اجڈ اور بدزبان آدمی تھا۔ وہ بھی استاد ہی کی طرح گالیاں دیا کرتا تھا۔

دوسرے دن سے میں نے کام سیکھنا شروع کردیا۔

استاد میں اور مجید میں ایک اچھی بات یہ تھی کہ وہ دونوں اپنے کام میں ماہر تھے اور سکھانے کے معاملے میں بھی بخیل نہیں تھے۔

میں مجید کو پانے، اسکرو ڈرائیور پکڑاتا جاتا اور اس کے کام کو بہت توجہ سے دیکھتا رہتا۔

دو ہفتے بعد میں نے ایک گاڑی کا ڈسٹری بیوشن کیپ کھول کر صاف کیا، گاڑی میں نیا فلٹر لگایا اور ڈسٹری بیوشن کیپ دوبارہ فٹ بھی کردیا۔

مجید اس وقت کسی کام سے گیا ہوا تھا۔ اس نے مجھ سے صرف اتنا کہا تھا کہ انو! اس کرولا کا ڈسٹری بیوٹر کیپ کھول دے۔ میں آکر دیکھتا ہوں کہ اس میں کیا خرابی ہے؟

مجید واپس آیا تو گاڑی کا بونٹ بند دیکھ کر

”انو......!“

”جی مجید بھائی!“ میں نے جلدی سے کہا۔

”الو کے پٹھے! میں نے تجھ سے کہا تھا کہ اس گاڑی ڈسٹری بیوشن کیپ کھول کر رکھنا، تو ابھی تک ایسے ہی ہاتھ پر ہاتھ رکھے بیٹھا ہے؟“

”مجید بھائی!“ میں نے سنجیدگی سے کہا ”میں نے کیپ صاف کرکے دوبارہ لگادیا ہے۔ گاڑی کا ایک پلگ کام نہیں کررہا تھا اور فلٹر میں بھی کچرا تھا، میں نے سب بدل دیا ہے۔ ذرا گاڑی اسٹارٹ کرو۔“

اس نے بے یقینی سے مجھے دیکھا اور گاڑی میں بیٹھ کر سیلف لگایا تو پہلے ہی سیلف پر گاڑی اسٹارٹ ہوگئی۔

”ارے واہ انو! تو نے تو کمال کردیا، اتنی جلدی تو نے بھی کام نہیں سیکھا تھا۔“

”مجید بھائی! ایک بات اور......“ میں نے سنجیدگی سے کہا ”آیندہ چاہے مجھے مار لینا لیکن مجھے گالی مت دینا۔ گالی مجھ سے برداشت نہیں ہوتی ہے۔“

”اچھا چل، آیندہ سے تجھے کبھی گالی نہیں دوں گا بہن......“ اس نے پھر ایک گالی بکی پھر جلدی سے بولا ”یار انو! میری زبان پھسل جاتی ہے۔ بچپن کی عادت ہے چھوٹتے چھوٹتے ہی چھوٹے گی۔“

پھر تو میں نے اتنی تیزی سے کام سیکھا کہ مجید کے بعد اب میرا ہی نام لیا جانے لگا۔ اس دوران میں احمد کسی دوسری ورکشاپ میں چلا گیا تھا۔ اس کے باوجود وہاں ایسے لڑکے موجود تھے جو چھ چھ اور آٹھ آٹھ سال سے کام کررہے تھے لیکن میں نے صرف دو سال میں ان سب کو پیچھے چھوڑ دیا تھا۔ اس کی وجہ ایک تو یہ تھی کہ میں ان لوگوں کے مقابلے میں تعلیم یافتہ تھا، ذہین بھی تھا اور کام سیکھنے پر توجہ دیتا تھا۔ دوسرے کام چور تھے، وہ کام کرنے میں سستی دکھاتے تھے اور جان بوجھ کر کام چوری کرتے تھے۔

استاد اور مجید دونوں میرے کام سے بہت خوش تھے۔ مجید کے خیال میں مجھے اب مزید سیکھنے کے بجائے پریکٹس کی ضرورت تھی۔ استاد کا کہنا تھا کہ ابھی پورا مکینک بننے کے لیے ایک آنچ کی نہیں بلکہ کئی آنچ کی کسر تھی۔ اس نے اب میری دیہاڑی میں بھی اضافہ کردیا تھا۔ اب وہ مجھے تیس روپے روزانہ دیتا تھا۔ اس کے علاوہ دوپہر کا کھانا بھی میں استاد اور مجید کے ساتھ کھایا کرتا تھا۔

گاڑی ٹھیک ہونے پر اکثر لوگ ٹپ بھی دیتے تھے لیکن میں بہت خوبصورتی سے انکار کردیتا تھا۔ مجھے اس ٹپ اور خیرات سے نفرت تھی۔ مجھے ایسا لگتا تھا جیسے وہ لوگ مجھ پر ترس کھا رہے ہوں، میری غربت کا مذاق اُڑا رہے ہوں۔

اس کے برعکس دوسرے لڑکے ٹپ پر چیل کی طرح جھپٹتے تھے۔

مجید اکثر مجھے سمجھاتا تھا ”دیکھ انو! یہ لوگ ٹپ دے کر کوئی احسان نہیں کرتے، یہ ہمارا حق ہے۔ تو انکار کیوں کرتا ہے؟“

”مجید بھائی! مجھے لگتا ہے کہ یہ لوگ مجھے خیرات دے رہے ہیں۔ مجھے اپنی محنت سے جو ملتا ہے، وہی کافی ہے۔“

میں نے ایک نائٹ اسکول میں داخلہ بھی لے لیا تھا۔ ورکشاپ سے گھر آنے کے بعد میں نہا دھو کر، صاف ستھرے کپڑے پہن کر اسکول چلا جاتا تھا۔

ایک دن میں ایک گاڑی کے انجن پر کام کررہا تھا، اس کا فالٹ ہی میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ بیٹری پوری طرح چارج تھی، پلگ بھی نئے تھے۔ ڈسٹری بیوٹر وائر بھی ٹھیک تھا اور اس کا کیپ بھی میں نے اچھی طرح صاف کردیا تھا۔

مجید اس وقت موجود نہیں تھا۔ میری مدد کے لیے ورکشاپ کا ایک لڑکا بھی تھا جو مجھے مختلف پانے اور اسکرو ڈرائیور وغیرہ اٹھا کر دے رہا تھا۔

مجھے نہیں معلوم تھا کہ استاد اپنے کیبن سے میری پریشانی دیکھ رہا ہے۔

جب کافی دیر تک گاڑی کی خرابی میری سمجھ میں نہیں آئی تو استاد اپنے کیبن سے نکل کر میرے پاس آگیا اور بولا ”کیا بات ہے انو، کیا خرابی سمجھ میں نہیں آرہی ہے؟“

”سب کچھ ٹھیک ہے استاد!“ میں نے کہا ”لیکن گاڑی اسٹارٹ ہونے کا نام ہی نہیں لے رہی ہے۔“

”کنڈنسر چیک کرو۔“ استاد نے کہا۔

”میں سب کچھ چیک کرچکا ہوں۔ کرنٹ بھی آرہا ہے لیکن......“

”ایک منٹ!“ استاد نے چابی لگا کر اگنیشن آن کردیا، اور ڈیش بورڈ کی طرف دیکھ کر بولا ”ابے یار! گاڑی میں پیٹرول تو ہے ہی نہیں، یہ کیا ہوا سے اسٹارٹ ہوگی؟“

”فیول کا گیج خراب ہے استاد!“ میں نے بے زاری سے کہا ”میں نے بھی گاڑی کے مالک سے یہی پوچھا تھا، اس نے بتایا تھا کہ میں نے ابھی گاڑی میں پانچ لیٹر پیٹرول ڈلوایا ہے۔“

”گاڑی کے پلگ......“

”سب پلگ بالکل ٹھیک ہیں۔ دو پلگ شارٹ ہوگئے تھے، وہ میں نے تبدیل کردیے ہیں۔“

استاد کے چہرے پر مسکراہٹ آگئی ”اچھا مکینک ہے تو انو بیٹا، جو اپنے فن کے ساتھ ساتھ ذہن بھی استعمال کرتا ہے۔ ابھی دیکھ، گاڑی کیسے اسٹارٹ ہوتی ہے۔“ پھر وہ میرے ساتھ کام کرنے والے لڑکے سے بولا ”چل بے، کسی گاڑی سے پیٹرول نکال کر لا۔“

”کتنا پیٹرول استاد؟“ لڑکے نے پوچھا۔

”اتنا پیٹرول لے آ کہ میں وہ پیٹرول تجھ پر چھڑک کر آگ لگا سکوں۔“ استاد نے تلخ لہجے میں کہا ”ابے، کسی بوتل میں تھوڑا سا پیٹرول لے آ۔“

لڑکا جلدی سے پیٹرول لے آیا۔

استاد نے تھوڑا سا پیٹرول کاربوریٹر میں ڈالا اور مجھ سے بولا ”اب سیلف لگا دے۔“

میں نے سیلف لگایا تو گاڑی پہلے ہی سیلف پر اسٹارٹ ہوگئی لیکن فوراً ہی بند بھی ہوگئی۔

”ابے گاڑی میں پیٹرول ہے ہی نہیں، جب مالک

یورپ کے جن ماہرین کے کارناموں کا تذکرہ ہر خاص و عام کی زبان پر رہتا ہے، وہ بھی اصلاً مسلمانوں کے مرہونِ منت ہیں مثلاً واسکوڈی گاما جس نے ہندوستان کی کھوج لگائی تھی، اس کی رہنمائی کرنے والا ایک مسلمان جہاز راں شہاب الدین احمد ابن ماجہ نجدی تھا۔ حرکیات کا اصول جو عام طور سے نیوٹن کے اصول کی حیثیت سے معروف ہے اسے سب سے پہلے ابوالبرکات بغدادی نے پیش کیا تھا۔ آج کل 17 ویں صدی عیسوی کے ریاضی فرمٹ (Fermet) کے آخری غیر حل شدہ تھیورم کا بہت چرچا ہے جس کو 1994ء میں امریکی ریاضی داں Wiles نے حل کرنے کا دعویٰ کیا۔ مگر اس سلسلے میں دسویں صدی عیسوی کے ریاضی داں ابومحمود حامد الخجدی کو بالکل فراموش کردیا جاتا ہے جس نے اسے پہلے ہی حل کردیا تھا۔

اقتباس: قرونِ وسطیٰ کے مسلمان از غلام قادر لون

مرسلہ: صالح ابوبکر پاکستانی، دمام سعودیہ

یہاں لایا تو گاڑی کے دو پلگ کام نہیں کر رہے تھے۔اس وجہ سے......"

"میں سمجھ گیا استاد!" میں نے کہا "یہاں تک پہنچتے پہنچتے گاڑی کا پیٹرول ختم ہوگیا۔گاڑی کے پلگ خراب ہوں تو وہ دو گنے سے زیادہ پیٹرول کھاتی ہے۔"

"اب کسٹمر اس بات کو تو مانے گا نہیں' اس لیے گاڑی میں پیٹرول ڈلوا۔اس کی قیمت بھی سروس میں لگا دینا۔"

پھر استاد خود مجھے کام سکھانے لگا۔اس کے ساتھ کام کر کے مجھے اندازہ ہوا کہ وہ واقعی اپنے فن کا ماہر تھا۔اس نے گاڑی کے انجن کی مختلف اوزاروں کے بارے میں بتایا کہ کس طرح کی آواز میں گاڑی میں کیا خرابی ہوسکتی ہے۔

میں دو ہی مہینے میں آواز سن کر اندازہ لگا لیتا تھا کہ گاڑی میں کیا خرابی ہوسکتی ہے؟

اس ورکشاپ پر میں نے پہلی دفعہ رمشا کو دیکھا تھا۔وہ خوبصورت سی نیلی آنکھوں اور بھورے بالوں والی لڑکی مجھے پہلی نظر میں اچھی لگی تھی۔اس کا باپ البتہ انتہائی مغرور اور بد اخلاق تھا۔

اس دن اتفاق سے استاد اور مجید دونوں ہی نہیں تھے۔

اس کی چمکتی دمکتی ہنڈا سوک وہاں آ کر رکی تو میری نظر اس خوبصورت لڑکی پر پڑی۔میں اسے دیکھتا کا دیکھتا رہ گیا۔وہ بھی بہت دلچسپی سے مجھے دیکھ رہی تھی۔

جب لڑکی کے باپ نے دو تین دفعہ ہارن بجایا تو مجھے ہوش آیا اور میں اس کے نزدیک پہنچ کر بولا "جی صاحب، گاڑی میں کوئی پرابلم ہے؟"

"جبار کہاں ہے؟" اس نے درشت لہجے میں پوچھا۔

"استاد تو کام سے گئے ہوئے ہیں۔" میں نے کہا۔

"اور مجید؟" اس نے پھر تحقیر آمیز لہجے میں پوچھا۔

"وہ بھی نہیں ہیں۔آپ مجھے بتائیں سر! گاڑی میں کیا پرابلم ہے؟"

"تجھے بتاؤں؟" اس نے حقارت سے مجھے دیکھا "یہ پندرہ لاکھ کی گاڑی ہے، تو تو اس کا بیڑا غرق کر دے گا۔"

"آپ گاڑی کو اسٹارٹ تو کریں سر!" میں نے اس کی کڑوی کسیلی باتیں پیتے ہوئے کہا۔

"اچھا!" اس نے پھر حقارت سے کہا اور گاڑی اسٹارٹ کر دی۔

میں نے گاڑی کی آواز غور سے سنی، پھر اپنی تسلی کے لیے بونٹ کھول کر میں نے آواز سنی اور اس سے کہا "جناب، انجن بند کر دیں۔"

اس نے انجن بند کر دیا۔

"آپ کی گاڑی کی کلچ پلیٹس ختم ہوگئی ہیں سر! گاڑی گرم بھی ہو رہی ہوگی، اس کے ریڈی ایٹر میں بھی خرابی ہے۔ پانی انجن میں پوری طرح سرکولیٹ نہیں کر رہا ہے۔"

"تیرا کیا دماغ خراب ہے؟" وہ انتہائی درشت لہجے میں بولا۔

"میرا دماغ بالکل صحیح ہے سر! میں تو......"

"اوئے بس کر!" وہ حقارت سے بولا "میں تم مکینکوں کے ہتھکنڈوں کو بہت اچھی طرح جانتا ہوں۔ میں نے یہ گاڑی چھ مہینے پہلے شوروم سے نکلوائی ہے، زیرو میٹر......اور تو مجھے بے وقوف بنا رہا ہے کہ گاڑی کی کلچ پلیٹس کام نہیں کر رہی ہیں۔"

"اگر آپ کو مجھ پر اعتبار نہیں ہے تو گاڑی کو کمپنی ورکشاپ میں کیوں نہیں لے جاتے ہیں؟"

"اچھا تو بکواس بند کر۔ مجھے مشورے مت دے سمجھا۔"

"ٹیکنو یج پلیز سر!" میں نے سرد لہجے میں کہا۔میں اُن دنوں میٹرک میں پڑھ رہا تھا اور میری انگلش کلاس میں سے اچھی تھی۔

"وہاٹ!" وہ درشت لہجے میں بولا اور گاڑی کا دروازہ کھول کر نیچے اُتر آیا۔

وہ خاصا دراز قد آدمی تھا۔

"تو......تو مجھے کہہ رہا ہے کہ میں زبان سنبھال کر بات کروں یو باسٹرڈ! یہ جملہ تو نے کہاں سے سیکھ لیا؟"

میں نے اسے انگریزی میں جواب دیا "اپنی عزت اپنے ہاتھ ہوتی ہے۔اگر تمہیں کام نہیں کرانا ہے تو یہاں سے چلتے پھرتے نظر آؤ، باسٹرڈ!"

اسے مجھ سے اس لہجے اور اس جملے کی توقع نہیں تھی۔ اس کے جواب میں نہ صرف مجھے ماں کی گالی دی بلکہ ایک زوردار تھپڑ بھی میرے چہرے پر رسید کر دیا۔

میں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، نزدیک پڑا ہوا بھاری رنچ اُٹھا لیا اور اس کے سر پر مارنے ہی والا تھا کہ پیچھے سے کسی نے رنچ پکڑ لیا۔

میں تلملا کر پلٹا تو مجھے مجید نظر آیا۔اسی نے میرا ہاتھ روکا تھا۔

"کسٹمر کے ساتھ یہ سلوک نہیں کرتے اتو!" اس سمجھانے والے انداز میں کہا۔

"چاہے کسٹمر تمہیں انتہائی غلیظ گالیاں دے، مارے پیٹے؟" میں نے چیخ کر کہا۔

"تو بہت بڑا بدمعاش ہے؟" گاڑی والا چیخ کر بولا "میں ابھی تیری ساری بدمعاشی نکالتا ہوں۔"

گاڑی کو جذباتی انداز میں ریورس کرنے کے بعد وہ تیزی سے ایک طرف روانہ ہوگیا۔

"اپنے غصے پر قابو پانا سیکھ اتو!" مجید نے کہا "جانتے ہو یہ......کون تھا؟" اس نے حسب عادت جملے کے درمیان میں ایک موٹی سی گالی فٹ کرتے ہوئے کہا "یہ شہر کا معروف بزنس مین جاوید الٰہی ہے۔"

"یار، وہ بزنس مین ہو یا سرکاری ملازم۔" میں نے کہا "اسے گالم گلوچ اور مار پیٹ کا حق کس نے دیا ہے؟"

"اچھا چھوڑ!" مجید نے کہا "یہ ہمارا بہت پرانا کسٹمر ہے۔یہ پھر آئے گا۔استاد اس کا غصہ ٹھنڈا کر دے گا۔چل یار، کھانا کھالیں۔استاد کو پتا نہیں کب آئے؟"

ہم دونوں استاد کے کیبن میں بیٹھ کر کھانا کھانے لگے۔

ہم نے کھانا ختم بھی نہیں کیا تھا کہ ورکشاپ میں پولیس کی ایک موبائل داخل ہوئی۔

"یہ آگئے مفتے!" مجید نے کہا۔پولیس والے اکثر اپنی موبائلیں ٹھیک کروانے آتے تھے لیکن پیسے نہیں دیتے تھے۔

"یار! تو دیکھ......" مجید نے کہا "میں تو بہت تھک گیا ہوں۔"

میں کیبن سے باہر نکلا تو انسپکٹر نے مجھے آواز دی "اے لڑکے! اِدھر آ۔" وہ شاید نیا تھا اور مجھے پہچانتا نہیں تھا۔

"جی سر!" میں نے نزدیک جا کر کہا۔

"اتو کون ہے؟" اس نے درشت لہجے میں پوچھا۔

"اتو یہی ہے صاحب!" اس کے ساتھ بیٹھے ہوئے ڈرائیور نے کہا۔

"تم ذرا تھانے چلو۔" انسپکٹر نے کہا۔

"سر، وہاں کوئی گاڑی خراب ہوگئی ہے کیا؟" میں نے ہنس کر پوچھا۔

"موبائل میں بیٹھ۔" انسپکٹر نے درشت لہجے میں کہا "وہاں چل کر معلوم ہوگا کہ گاڑی خراب ہوئی ہے یا تیرا دماغ!"

مجید بھی کیبن سے نکل آیا اور بولا "کیا بات ہے صاحب! کیا اتو کے خلاف کوئی رپورٹ ہے؟"

"تو زیادہ بکواس مت کر۔" انسپکٹر نے اسے جھڑک دیا۔

میں خاموشی سے موبائل میں بیٹھ گیا۔میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ آخر معاملہ کیا ہے؟

موبائل جب تھانے پہنچی تو میری نظر اس گاڑی پر پڑی جس کے مالک سے میرا جھگڑا ہوگیا تھا۔اچانک سارا معاملہ میری سمجھ میں آ گیا۔گویا پولیس اس شخص کی شکایت پر مجھے تھانے اُٹھا لائی تھی۔

تھانے پہنچ کر ایک سپاہی نے مجھے بے دردی سے گھسیٹ کر وین سے باہر نکالا اور میری گردن پر ایک زوردار ہاتھ جما کر بولا "اندر انچارج صاحب کے کمرے میں چل!"

تھانے کا انچارج انتہائی خرانٹ قسم کا رشوت خور افسر تھا۔وہ مجھے اچھی طرح جانتا تھا۔میں نے کئی دفعہ اس کی ذاتی گاڑی بھی "مفتے" میں ٹھیک کی تھی۔

"کیوں اوئے!" اس نے مجھے دیکھ کر کہا "اب تیرے اتنے دماغ ہوگئے ہیں کہ تو کسٹمر پر ہاتھ بھی اُٹھانے لگا ہے۔" انسپکٹر نے درشت لہجے میں کہا۔

"غلطی ان صاحب کی ہے سر!" میں نے کہا "پہلے انہوں نے مجھے گالی دی اور تھپڑ مارا!" میں نے کہا۔

"پھر تو نے کیا، کیا؟" انسپکٹر نے پوچھا۔

"اس نے تو مجھے مارنے کے لیے ایک وزنی پانا اُٹھا لیا تھا۔اگر اس کا ساتھی اسے پکڑ نہ لیتا تو اب تک وہاں میری لاش پڑی ہوتی۔" اس شخص نے کہا۔

"آپ فکر نہ کریں ملک صاحب!" انسپکٹر نے کہا "میں اسے ایسی سزا دوں گا کہ یہ دوبارہ کسی کسٹمر سے بدتمیزی کرنا بھول جائے گا۔"

"پاپا!" لڑکی نے پہلی دفعہ زبان کھولی "آپ نے پہلے اسے گالیاں دینا شروع کیں، پھر گاڑی سے اُتر کے اسے تھپڑ مارا۔"

"تم چپ رہو رمشا!" ملک نے اسے جھڑک دیا۔

یوں مجھے معلوم ہوا کہ اس نازک اندام سی حسین لڑکی کا نام رمشا ہے۔

"اسے بند کر دو۔" انسپکٹر نے ایک سنتری سے کہا۔"ایک دو دن یہاں رہے گا تو اس کے دماغ کی ساری اکڑ نکل جائے گی۔"

سنتری مجھے تھپڑ اور ٹھڈے مارتا ہوا حوالات کی طرف لے گیا اور گردن پکڑ کر مجھے اندر دھکیل دیا۔

اپنی توہین اور بے بسی پر میری آنکھوں میں آنسو آگئے۔

مجھے امید تھی کہ ابھی تھوڑی دیر میں استاد آ کر مجھے چھڑا لے گا لیکن شام سے رات ہوگئی۔وہاں نہ استاد آیا، نہ

www.Paksociety.com

www.Paksociety.com

مجید۔

میرے دل میں ان دونوں کے خلاف بھی نفرت کی اک لہر اُٹھی اور میں نے فیصلہ کرلیا کہ یہاں سے نکلنے کے بعد میں استاد کے ساتھ کام نہیں کروں گا لیکن اصل مسئلہ تو یہ تھا کہ میں وہاں سے نکلوں گا کیسے؟“

رات کو پولیس والوں نے مجھ پر تشدد کیا۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ مجھ سے ایسا کون سا گناہ سرزد ہو گیا ہے جس کی پاداش میں مجھ پر اتنا تشدد کیا جارہا ہے؟

رات بھر تشدد کرنے کے بعد مجھے ان لوگوں نے پھر حوالات میں بند کردیا۔

موبائل کا ڈرائیور بھلا آدمی تھا۔ وہ خاموشی سے میرے پاس آیا اور بولا ”انو! تو فکر مت کر۔ تیرا استاد تجھے چھڑانے کی کوشش کررہا ہے۔ اگر آج ان لوگوں نے تجھے نہیں چھوڑا تو وہ شام تک کسی وکیل کو لے کر آئے گا۔“

”لیکن میں نے کیا، کیا ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”ملک نے انسپکٹر کو دس ہزار روپے دیے ہیں۔“ اس نے سرگوشی میں کہا۔

”مجھے مارنے پیٹنے کے؟“ میں نے حیرت سے پوچھا۔

”ہاں، تو نے اس کی بے عزتی جو کی تھی۔“ پھر وہ آہستہ سے بولا ”اب میری بات غور سے سن۔ ابھی تک تیری گرفتاری کا کوئی ثبوت ہی نہیں ہے اور پرچہ بھی نہیں کٹا ہے۔ اگر تیرا استاد پولیس والوں کو کچھ رقم دے دے تو تیری جان چھوٹ سکتی ہے۔“ یہ کہہ کر وہ چلا گیا۔

میرے ذہن میں آندھیاں سی چلنے لگیں۔ اس ملک نے محض اس وجہ سے مجھے حوالات میں بند کرواکے تشدد کرایا کہ میں نے اس کی گالیوں کے جواب میں گالی دی تھی۔ میرے جسم کا رواں رواں انتقام کی آگ میں جلنے لگا۔

شام کو ایک سنتری حوالات کے دروازے پر آیا اور بولا ”انو! چل تجھے صاحب نے بلایا ہے۔“

میں سمجھ گیا کہ صاحب، ملک سے ملے ہوئے رشوت کے دس ہزار روپے کو حلال کرنا چاہتا ہے۔ شاید مجھ پر تشدد کا ایک نیا سلسلہ شروع ہونے والا ہے۔

انچارج کے کمرے میں استاد کو دیکھ کر میری آنکھوں میں آنسو آگئے۔

”لیں جی جبار صاحب! آپ اپنے بندے کو لے جائیں۔ آپ ناحق ایس ایس پی صاحب کے پاس گئے۔ میں نے اسے شبے میں گرفتار کیا تھا لیکن وہ شبہ ہی تھا۔ میں تو آج خود اسے چھوڑنے والا تھا۔“

”چلو انو!“ استاد نے کہا۔

میں اس کے ساتھ اُٹھ کر خاموشی سے باہر آ گیا۔ استاد ایک گاڑی بھی لایا تھا۔ مجھ سے چلنا دوبھر ہو رہا تھا۔ میں جیسے تیسے گاڑی تک پہنچا اور اس میں بہت مشکل سے بیٹھا۔ پولیس والوں نے مجھے بہت بے دردی سے مارا تھا۔

استاد نے مجھے بتایا کہ میں نے ایس ایچ او سے پہلے ہی بات کی تھی لیکن اس وقت اس نے مصروفیت کی وجہ سے بات کرنے سے انکار کردیا، ایس ایس پی صاحب کی گاڑی بھی اکثر آتی رہتی ہے ہماری ورکشاپ میں۔ ان سے بھی میری اچھی سلام دعا ہے۔ میں سیدھا ان کے پاس پہنچ گیا۔ پھر ان کے ایک ہی فون پر انسپکٹر نے تمہیں چھوڑ دیا۔“

”استاد! یہ فون تم کل بھی تو کرا سکتے تھے؟“ میں نے منہ بنا کر کہا۔

”میں نے تو کوشش کی تھی لیکن ایس ایس پی صاحب کراچی سے باہر تھے۔ وہ آج صبح ہی تو پہنچے ہیں۔“

”اماں پتا نہیں کیا سوچ رہی ہوں گی؟“ میں نے کہا۔

”تم ان کی فکر مت کرو۔ ورکشاپ کا ایک لڑکا تمہارے گھر اطلاع دے آیا تھا کہ آج کام بہت ہے۔ انو آج نہیں آئے گا۔“

ایسا ایک دو دفعہ پہلے بھی ہوا تھا اس لیے اماں نے یقین کرلیا ہوگا۔

استاد وہاں سے سیدھا مجھے ایک ڈاکٹر کے پاس لے گیا۔ ڈاکٹر نے مجھے ایک انجکشن لگایا اور کچھ دوائیں لکھ دیں اور تاکید کی کہ انہیں تین دن تک پابندی سے استعمال کرنا۔

اب میرے ذہن میں اُٹھتے بیٹھتے صرف ایک ہی خیال رہتا تھا، ملک سے انتقام!

پھر وقت خوش گوار اور ناخوشگوار یادیں سمیٹے بیت گیا۔

میں نے بی اے کرلیا۔ اب میں سنجیدگی سے سوچ رہا تھا کہ میں دبئی یا سعودی عرب نکل جاؤں لیکن وہاں بھی حالات اب وہ نہیں رہے تھے جو اب سے بیس سال پہلے تھے۔ وہاں سے تو لوگ واپس آرہے تھے۔

ایک دن میں شاپنگ کر رہا تھا کہ مجھے ایک انتہائی حسین لڑکی دکھائی دی۔ اس کی آنکھیں دیکھ کر میں پہچان گیا کہ وہ رمشا ہے۔ وہ اس وقت اپنی کسی دوست کے ساتھ تھی۔

اس نے بھی مجھے دیکھ لیا اور مجھے اس کی آنکھوں میں بھی شناسائی کی جھلک نظر آئی۔ پھر وہ مسکرا کر میری طرف بڑھی تو میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔

”آپ ...... انو ...... ہیں نا! وہی مکینک ...... جو ......“

”جی ہاں، میں انو ہوں، انور علی!“ میں نے کہا ”آپ کیسی ہیں؟“

”میں بالکل ٹھیک ہوں۔“ وہ مسکرا کر بولی۔ وقت کے ساتھ ساتھ اس کی آواز میں بھی ایک نغمگی آ گئی تھی۔

”آپ کیا ابھی تک اسی ورکشاپ میں ہیں؟“

”جی ہاں۔“ میں نے کہا ”میں اسی ورکشاپ میں ہوں لیکن اس کے ساتھ ساتھ میں نے بی اے بھی کرلیا ہے...... اب سوچ رہا ہوں کہ ایم اے بھی کر ہی لوں۔“

”ارے، یہ تو بہت اچھی بات ہے۔“ رمشا مسکرا کر بولی۔

”یہ کون صاحب ہیں رمشا؟“ اس کی دوست مسکرا کر بولی ”ذرا ہم سے بھی تو تعارف کراؤ۔“

”بھئی یہ انور علی صاحب ہیں، یہ بہت اچھے مکینک ہیں۔“

”اگر ہمارے ملک کے سارے مکینک اتنے ہینڈسم اور اسمارٹ ہو جائیں تو......“

”تو کیا؟“ میں نے مسکرا کر پوچھا ”یہ آپ مجھ پر طنز کررہی ہیں یا میری تعریف کررہی ہیں؟“

”نہیں، میں آپ کی تعریف کررہی ہوں۔ ایسا مکینک میں نے پہلی دفعہ دیکھا ہے۔“

”آپ کی تعریف کا بہت شکریہ!“ میں نے ہنس کر کہا۔

اب میری آمدنی اچھی خاصی تھی، مجید نے اپنی الگ ورکشاپ کھول لی تھی۔ استاد نے مجھے ورکشاپ میں تیس فی صد کا پارٹنر بنالیا تھا۔ اسے خوف تھا کہ کہیں میں بھی اسے چھوڑ کر نہ چلا جاؤں۔

میرے گھر کی حالت بھی سدھر گئی تھی۔ اب میرے گھر میں کائی زدہ غسل خانہ نہیں بلکہ کمروں کے ساتھ خوبصورت ٹائلز والے باتھ روم تھے۔

مجھے ہر طرح کا عیش و آرام میسر تھا۔ اماں کی صحت بھی قابلِ رشک تھی۔ بس میرے دل میں ایک ہی خلش تھی۔ ملک سے بدلہ لینے کی خلش! میں نے قسم کھائی تھی کہ میں اس سے اپنی توہین کا بدلہ ضرور لوں گا۔

رمشا ایک مرتبہ پھر مجھے اسی شاپنگ سینٹر میں ملی۔ اس مرتبہ وہ تنہا تھی۔ وہ مجھ سے بے تکلف ہو کر باتیں کرنے لگی۔

میں نے ہنس کر کہا ”محترمہ رمشا ملک صاحبہ! اگر آپ کو اعتراض نہ ہو تو میرے ساتھ ایک کپ چائے پی لیں۔“

”مجھے اعتراض ہے۔“ رمشا نے کہا ”میں تمہارے ساتھ چائے نہیں پی سکتی۔“

مجھے شدید مایوسی نے گھیر لیا۔ ”جیسے آپ کی مرضی!“ میں نے کہا۔

”لیکن مجھے تمہارے ساتھ کافی پینے میں کوئی اعتراض نہیں ہے۔“ وہ مسکرا کر بولی۔

”اصل میں چائے مجھے پسند نہیں ہے۔ میں آئس کریم کافی پیتی ہوں یا پھر کولڈ ڈرنک۔“

”تو پھر تشریف لائیے۔“

میرے پاس ہمیشہ ورکشاپ میں آئی ہوئی کوئی نہ کوئی گاڑی ہوتی تھی۔ اس دن بھی میرے پاس جدید ماڈل کی ایک کرولا تھی۔ میں اسے گاڑی میں بٹھا کر ایک فائیو اسٹار ہوٹل کے ریسٹورنٹ میں لے گیا۔ وہاں کے خوابناک ماحول میں ہم نے کافی تو کم ہی پی، ایک دوسرے کو زیادہ دیکھا۔

پھر تو رمشا اکثر مجھے ملنے لگی۔ میں اسے کبھی لانگ ڈرائیو پر لے جاتا، کبھی سی سائڈ پر۔

ایک دن میں نے ہمت کرکے کہا ”رمشا! ایک بات کہوں، بُرا تو نہیں مانو گی؟“

”ایسی کون سی بات ہے انو!“ اس نے ہنس کر کہا ”کہ تمہیں میرے بُرا ماننے کا خطرہ ہے؟“

”ایسی ہی بات ہے۔“ میں نے کہا ”لیکن میری ایک ریکوئسٹ ہے، اگر بُرا بھی مانو تو پلیز...... مجھ سے ملنا مت چھوڑنا۔“

”فار گاڈ سیک...... انو!“ رمشا نے کہا ”اتنی مسٹری کی کیا ضرورت ہے؟“

”رمشا...... بات...... اصل میں...... یہ ہے کہ...... میں...... تمہیں پسند...... کرنے لگا ہوں۔“ میں نے ہمت کرکے کہہ دیا۔

رمشا کا چہرہ سرخ ہوگیا۔ اس کی پلکیں جھک گئیں اور وہ چند لمحے کو تو بالکل خاموش ہوگئی۔

میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا کہ ابھی رمشا کہے گی۔ دو ٹکے کے مکینک! تمہاری جرأت کیسے ہوئی یہ بات منہ سے نکالنے کی۔ میں نے ہنس کر دو باتیں کیا کرلیں کہ تم تو آپے سے باہر ہوگئے۔

رمشا نے آہستہ آہستہ اپنی گھنی پلکیں اُٹھائیں اور تھرتھراتے ہوئے لہجے میں بولی ”تم نے یہ بات کہنے میں اتنی دیر کیوں لگائی؟“

”رمشا! میں اکثر سوچتا تھا کہ اگر میں نے یہ بات کہی اور تم ناراض ہوگئیں تو میں اس ملاقات سے بھی جاؤں گا۔ میں تمہیں کھونے کا تصور بھی نہیں کرسکتا رمشا!“

www.paksociety.com

"میں بھی تمہارے بغیر زندہ رہنے کا تصور نہیں کرسکتی انو!" رمشا نے جذباتی لہجے میں کہا۔

"آج کا دن ہماری زندگی کا بہت یادگار دن ہے۔ آج میں اس کے ایک ایک پل کو انجوائے کرنا چاہتا ہوں۔ میں اسے سیلی بریٹ کرنا چاہتا ہوں۔"

پھر ہم لانگ ڈرائیو پر نکل گئے۔ پھر رمشا نے سی فوڈ کھانے کا پروگرام بنالیا۔ ہم سی ویو پر واقع ایک ریسٹورنٹ کے لان میں جابیٹھے۔

میں نے کھانا کھاتے ہوئے اس سے کہا "رمشا، کیا تمہارے والد مجھے قبول کرلیں گے؟"

"انہیں قبول کرنا پڑے گا۔" رمشا نے ہنس کر کہا "میں ان کی اکلوتی بیٹی ہوں۔ وہ میری بات ہر صورت میں مانیں گے انو۔ تم ابھی سے اس کی فکر مت کرو۔"

"رمشا، تمہیں یاد ہے، جب تمہارے والد ہماری ورکشاپ میں گاڑی لائے تھے تو......"

"مجھے سب کچھ یاد ہے، تمہاری بے بسی اور توہین کے احساس سے آنکھوں میں آنے والے آنسوؤں نے مجھے بھی رُلا دیا تھا۔ میں نے تو پولیس اسٹیشن میں بھی صاف صاف کہہ دیا تھا کہ پہل ڈیڈی نے کی تھی۔"

"لیکن تم جانتی ہو، اس کے بعد کیا ہوا تھا؟"

"اس کے بعد کیا ہوا تھا؟" اس نے حیرت سے پوچھا۔

"تمہارے والد نے پولیس انسپکٹر کو دس ہزار روپے دیے تھے۔ اس لیے کہ وہ دو دن تک مجھ پر بدترین تشدد کرے، پولیس نے ساری رات مجھ پر بہت تشدد کیا۔ اس کے نشانات آج بھی میرے جسم پر موجود ہیں۔ دوسرے دن اگر میرے استاد ایس ایس پی سے ٹیلی فون نہ کراتے تو میں پھر ساری رات پولیس کے ہاتھوں پٹتا رہتا۔"

"ارے...... ڈیڈی نے ایسا کیا؟" رمشا نے حیرت سے پوچھا "میں تو سمجھ رہی تھی کہ پولیس نے تمہیں چھوڑ دیا ہوگا۔ انو! بات بہت پُرانی ہے لیکن اس کے باوجود میں ڈیڈی کی طرف سے معافی مانگتی ہوں۔" اس نے اپنے خوبصورت ہاتھ جوڑ دیے۔

"ارے ارے! یہ خوبصورت ہاتھ معافی مانگنے کے لیے نہیں ہیں۔" میں نے کہا "میں تو اس بات کو بھول بھی گیا تھا۔" میں نے ڈھٹائی سے جھوٹ بولا "تم اگر دوبارہ مجھے نہ ملتیں تو شاید مجھے یاد بھی نہ آتا کہ کبھی کسی ملک نے مجھ پر پولیس کے ذریعے تشدد بھی کرایا تھا۔"

"واقعی ایسا ہوا تھا؟" رمشا نے حیرت سے پوچھا۔

"ہاں، ایسا ہی ہوا تھا۔" میں نے تلخ لہجے میں کہا "لیکن میں نے کہا نا کہ میں اس بات کو بھول چکا ہوں۔ اب ذرا اچھی اچھی باتیں کرو۔"

پھر میں نے جان بوجھ کر موضوع تبدیل کردیا۔

ہم کھانا کھا کر فارغ ہوئے تو گاڑی میں بیٹھتے ہوئے رمشا نے کہا "ویسے ایک بات ہے، تمہارے پاس روز ایک نئی گاڑی ہوتی ہے۔"

"یہ گاڑیاں تو کسٹمرز کی ہوتی ہیں۔" میں نے کہا "تمہارے باپ کے پاس تو اتنی دولت ہے کہ وہ دنیا کی کوئی بھی کار خرید سکتا ہے۔ وہ پراڈو ہو یا بی ایم ڈبلیو یا پھر مرسیڈیز بینز...... وغیرہ۔"

"مجھے طعنہ دے رہے ہو؟" رمشا نے منہ پھلا کر کہا۔

"طعنہ؟" میں نے حیرت سے کہا "طعنہ کیسا؟ میں تو حقیقت بیان کررہا ہوں۔ ویسے مجھے حیرت ہے کہ تم نے ابھی تک اپنی ذاتی گاڑی نہیں خریدی۔"

"میرے پاس ذاتی گاڑی ہے۔" رمشا نے کہا "مجھے ڈرائیونگ بھی آتی ہے لیکن مجھے ڈرائیو کرتے ہوئے خوف محسوس ہوتا ہے۔"

"کیوں بھئی؟" میں نے کہا "ڈرائیونگ تو آج کل ہر وہ لڑکی کرلیتی ہے جس کے پاس گاڑی موجود ہو۔"

"یہ کئی برس پُرانی بات ہے۔" رمشا نے کہا "میں نے اُن دنوں نئی نئی ڈرائیونگ سیکھی تھی اور بہت اعتماد اور مہارت سے ڈرائیونگ کرتی بھی تھی۔ ایک دفعہ میں ماموں جان کو لے کر ائرپورٹ جارہی تھی۔ وہ اسلام آباد میں رہتے تھے اور انہیں فلائٹ پکڑنی تھی۔ وقت کم تھا اس لیے میں بہت تیز رفتاری سے ڈرائیونگ کررہی تھی۔ میں اسٹار گیٹ کے سگنل کے پاس پہنچی تو وہ ایک دم زرد ہوگیا۔ میں نے سوچا کہ میں سگنل کے سرخ ہونے تک نکل جاؤں گی۔ بس یہی میری سب سے بڑی غلطی تھی۔ بائیں جانب سے آنے والی ایک پجیرو کا ڈرائیور بھی بہت جلدی میں تھا۔ وہ سگنل زرد ہوتے ہی گولی کی رفتار سے میرے سامنے آگیا۔ میں تو تھی ہی بہت اسپیڈ میں۔ پھر ایک دھماکا ہوا، خوفناک دھماکا۔ دھماکے کے ساتھ ہی مجھے گاڑی کے شیشے ٹوٹنے کی آواز سنائی دی، پھر سب کچھ تاریکی میں ڈوب گیا۔

مجھے ہوش آیا تو میں اسپتال میں تھی۔ میرے سر اور پسلیوں میں شدید چوٹ آئی تھی لیکن کوئی چوٹ بھی زیادہ سنگین نہیں تھی۔

اس حادثے میں ماموں جان اپنی زندگی سے ہاتھ

دھو بیٹھے تھے۔ گاڑی کچھ ایسے رُخ سے ٹکرائی تھی کہ ماموں جان اور پجیرو کا ڈرائیور دونوں ہی اپنی زندگی ہار چکے تھے۔ میں نہ جانے کیسے اس خوفناک حادثے میں بچ گئی تھی۔ لیکن اس کے بعد سے میں نے کبھی ڈرائیونگ نہیں کی۔ میرے ذہن پر ایسا خوف سوار ہوگیا کہ گاڑی کے اسٹیئرنگ پر بیٹھتے ہی میرے ہاتھ پیر کانپنے لگتے ہیں اور آنکھوں کے سامنے دھندسی چھا جاتی ہے۔"

"یہ کوئی ایسا مسئلہ نہیں ہے رمشا!" میں نے کہا "بس تمہارے ذہن پر ایک خوف طاری ہوگیا ہے اور کچھ نہیں ہے۔ میں تمہیں اس خوف سے بھی نجات دلا دوں گا۔" میں نے کہا۔

میں اس دن گھر پہنچا تو بہت خوش تھا۔ میری اس خوشی کو اماں نے بھی بھانپ لیا اور بولیں "کیا بات ہے انو! آج تو زیادہ ہی خوش ہے۔"

"اماں، بات ہی ایسی ہے۔" میں نے کہا "بس تم اب تیاری کرلو۔"

"کس بات کی؟" اماں نے حیرت سے پوچھا۔

"بہو لانے کی اور کس بات کی؟" میں نے ہنس کر کہا۔

"اس کا مطلب ہے کہ تُو نے کوئی لڑکی پسند کرلی ہے؟"

"ہاں اماں! تمہیں بھی تو مجھ سے یہی شکایت تھی نا کہ میں شادی نہیں کررہا۔"

"وہ تو سب ٹھیک ہے بیٹا!" اماں نے کہا "لیکن لڑکی کون ہے، کیسی ہے، کس خاندان کی ہے؟ یہ سب تو دیکھنا ہی پڑے گا۔"

"ضرور دیکھو اماں!" میں نے کہا "لڑکی بہت بڑے باپ کی بیٹی ہے۔ خوبصورت اور تعلیم یافتہ ہے۔ میں کل لڑکی کو یہاں لے آؤں گا۔ تم خود اس سے مل لینا۔"

"لڑکی کو یہاں لے آئے گا؟" اماں نے حیرت سے کہا پھر میرا کان پکڑ لیا اور کھینچتے ہوئے بولیں "سچ بتا انو! کب سے چل رہا ہے یہ چکر؟"

"اماں، کان تو چھوڑ دے۔" میں نے کہا۔

اماں نے ہنستے ہوئے کان چھوڑ دیا۔

"اماں! اس لڑکی کو میں بچپن سے جانتا ہوں لیکن ابھی ایک مہینے پہلے ہی اس سے ملاقاتیں شروع ہوئی ہیں۔"

"انو بیٹا!" اماں نے کہا "لڑکی اگر اچھے خاندان کی ہے، خوبصورت اور پڑھی لکھی ہے اور تجھے پسند بھی ہے تو میں اعتراض کیوں کروں گی؟" پھر وہ ہنس کر بولیں "چل، تو ہاتھ منہ دھولے، میں تیرے لیے کھانا نکالتی ہوں۔"

"اماں، آج شام کو استاد نے چائے کے ساتھ اتنے سموسے، سینڈوچز اور دوسری چیزیں کھلادی ہیں کہ اب پیٹ میں گنجائش ہی نہیں ہے۔ تم بس مجھے اپنے ہاتھوں کی گرما گرم اور مزے دار چائے پلا دو۔" یہ کہہ کر میں ہنستا ہوا باتھ روم میں چلا گیا۔

دوسرے دن رمشا ملی تو پھر ہم ساحل سمندر کی طرف نکل گئے۔ میں نے ہنس کر کہا "رمشا! میں نے تو اپنی اماں سے بات بھی کرلی ہے، وہ تم سے ملنے کو بے تاب ہیں۔"

"تم نے ان سے کیا کہا انو! وہ نہ جانے کیا سوچ رہی ہوں گی کہ کیسی لڑکی ہے جو شادی سے پہلے ہی لڑکوں سے ملتی ہے۔ مجھے تو بہت شرم آئے گی ان سے ملتے ہوئے۔"

"میری اماں نہایت سادہ اور معصوم ہیں رمشا!" میں نے کہا "جو لڑکی میری نظروں میں اچھی ہے، وہ اس کے بارے میں کوئی غلط بات کیسے سوچ سکتی ہیں؟"

میں زبردستی اسے اماں سے ملوانے لے گیا۔

گھر کے سامنے گاڑی روک کر میں نے اُترتے ہوئے کہا "رمشا! یہ میرا غریب خانہ ہے۔ میں اس گھر میں پیدا ہوا اور جوان ہوا ہوں، یہ چھوٹا سا گھر میری جنت ہے۔"

"جنت کے لیے کسی محل کی ضرورت نہیں ہے انو!" رمشا نے کہا۔

"میں تمہیں اس لیے بھی اپنے گھر لایا ہوں کہ تم میرا گھر دیکھ سکو، میرا رہن سہن دیکھ سکو، میرے گھر میں نہ تو ملازموں کی فوج ہے، نہ کسی بھی کمرے میں ائرکنڈیشنر ہے، میرے گھر کا فرنیچر......"

"انو پلیز......!" رمشا نے بُرا مان کے کہا "ایسی باتیں کروگے تو میں یہیں سے لوٹ جاؤں گی۔ میں نے تمہارے اسٹیٹس اور گھر سے نہیں بلکہ تم سے محبت کی ہے۔"

اس کی بات سن کر میرے اندر اطمینان سا اُتر آیا۔ میں اسے گھر میں لے گیا۔

اماں اسے میرے ساتھ دیکھ کر ہی سمجھ گئیں کہ یہ وہی لڑکی ہے جس کا ذکر میں نے ان سے کیا تھا۔

"اماں! یہ رمشا ہے۔" میں نے تعارف کرایا۔

اماں نے جھٹ اسے سینے سے لگا کر پیار کیا اور ڈھیروں دعائیں دیں۔ "ماشاء اللہ، لڑکی تو چاند کا ٹکڑا ہے۔" اماں نے تعریفی نظروں سے رمشا کا جائزہ لیا "خوبصورت، بھولی بھالی اور معصوم۔"

رمشا اس وقت شرم سے دُہری ہوئی جارہی تھی۔

"تم کہاں رہتی ہو بیٹی؟" اماں نے پوچھا۔

"اماں...... سوری ...... آنٹی! میں ڈیفنس میں رہتی ہوں۔" رمشا نے کہا۔

"تم بھی مجھے اماں ہی کہو۔" اماں نے کہا "تمہارے منہ سے یہ لفظ بہت اچھا لگ رہا ہے۔" پھر اماں مسکرا کر بولیں "تم لوگ بیٹھو، میں تمہارے لیے چائے لے کر آتی ہوں۔"

"اس کی ضرورت نہیں ہے اماں!" رمشا نے کہا "مجھے چائے پینا ہوگی تو میں خود ہی بنالوں گی۔"

"کام تو بیٹا تم ساری زندگی کروگی۔" اماں نے کہا "اس وقت تو میرے ہاتھوں کی چائے پی لو۔" اماں مسکراتی ہوئی کچن کی طرف چلی گئیں۔

"انو! تمہاری اماں تو بہت اچھی ہیں، بہت محبت کرنے والی اور......"

"بس بس۔" میں نے کہا "کہیں میری اماں کو نظر نہ لگا دینا۔"

اماں نے رمشا کو بہت پسند کیا تھا۔ اب وہ اُٹھتے بیٹھتے اسی کے گن گاتی تھیں۔

ایک دن میں گھر سے نکل رہا تھا تو اماں نے کہا "انو! تو مجھے رمشا بیٹی کے گھر کب لے جائے گا۔ بھئی، میں اس کے ماں باپ سے مل کر تیری شادی کی بات تو پکی کردوں۔"

"اماں، کچھ دن صبر سے کام لو۔ رمشا کے ڈیڈی بزنس کے سلسلے میں ملک سے باہر گئے ہوئے ہیں۔ ان کے لوٹتے ہی میں تمہیں ان کے گھر لے چلوں گا۔"

حقیقت بھی یہی تھی۔ رمشا کے ڈیڈی ان دنوں پاکستان سے باہر تھے۔ اس لیے رمشا اپنے گھر میں بات نہیں کرسکی تھی۔

مجھے نہ جانے کیوں ایک دھڑکا سا لگا ہوا تھا کہ ملک اس رشتے پر راضی نہیں ہوگا۔ ویسے بھی وہ مجھے بھولا نہیں ہوگا۔

رمشا کو یقین تھا کہ وہ اپنے ڈیڈی کو ہر حال میں راضی کرلے گی۔

"اور اگر وہ راضی نہ ہوئے تو؟" میں نے ایک دن رمشا سے پوچھا۔

"انہیں راضی ہونا پڑے گا انو!" رمشا نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

"لیکن فرض کرو، وہ راضی نہ ہوئے تو؟"

"تو......؟" رمشا نے اُلٹا مجھ سے سوال کردیا۔

"تو میں تو شاید زندہ نہ رہ سکوں۔" میں نے کہا۔

"بزدلوں والی بات مت کرو انو۔" رمشا نے کہا۔

"اس میں بزدلی اور بہادری کا کیا سوال؟" میں نے کہا "میں تو تمہارے بغیر زندہ رہنے کا تصور بھی نہیں کرسکتا۔"

"تو کیا میں کرسکتی ہوں؟" رمشا کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ "اگر ڈیڈی راضی نہ ہوئے تو نہ ہوں، میں ہر حال میں تمہاری ہوں۔ میں ان کے فیصلے کے خلاف بغاوت کرنے کا حوصلہ بھی رکھتی ہوں اور حق بھی۔ وہ کل واپس آرہے ہیں۔" رمشا نے کہا "میں شاید دو تین دن تک تم سے نہ ملوں۔"

"کیوں؟" میں نے کہا۔

"ارے بابا! تمہارا مقدمہ لڑنے کے لیے کچھ وقت تو چاہیے نا۔" وہ مسکرا کر بولی۔

☆☆☆

اس دن صبح ہی سے میری طبیعت کچھ بوجھل بوجھل سی تھی۔ کچھ بھی اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ میں نے صرف ایک کپ چائے پی اور گھر سے روانہ ہوگیا۔

اب میں خود کسی بھی گاڑی کا کام نہیں کرتا تھا، میرے اور استاد کے تربیت یافتہ لڑکے ہی سارا کام کرتے تھے۔ ہاں، کبھی کسی کی سمجھ میں گاڑی کی خرابی نہ آئے تو میں یا استاد اس گاڑی کو دیکھ لیتے تھے۔

اس دن میں استاد کے ساتھ کیبن میں بیٹھا تھا کہ ایک ہنڈا اسٹی ورکشاپ میں آکر رکی۔ وہ بالکل نئی گاڑی تھی۔

اس میں سے جو شخص باہر نکلا، اسے دیکھ کر میں بھی حیران رہ گیا اور استاد بھی۔

استاد زیرِلب بڑبڑایا "یہ یہاں کیسے آگیا؟"

وہ ملک تھا، رمشا کا باپ!

"تم بیٹھو، میں دیکھتا ہوں۔" استاد نے کہا اور کیبن سے باہر نکل گیا۔

"کیسے ہو جبار!" ملک کی آواز آئی۔

گزرے ماہ و سال نے اس پر ذرا بھی اثر نہیں کیا تھا۔ بس اس کے بال کنپٹیوں کے پاس سے کچھ سفید ہوگئے تھے۔ اس کی صحت اب بھی پہلے کی طرح قابلِ رشک تھی۔

"میں ٹھیک ہوں ملک صاحب!" استاد نے کہا "آپ آج اِدھر کا راستہ کیسے بھول گئے؟"

"یار! میری گاڑی چلتے چلتے، ایک دم بہت گرم ہورہی ہے۔ یا تو اس کا ریڈی ایٹر لیک ہے یا پھر کوئی اور خرابی ہے۔"

"میں ابھی دیکھتا ہوں۔" استاد نے کہا۔

"ابھی مجھے ایک بہت ضروری میٹنگ میں جانا ہے۔" ملک نے کہا "میں ٹیکسی سے چلا جاؤں گا۔ میرا ڈرائیور بھی ایک ہفتے کی چھٹی پر ہے ورنہ گاڑی وہی لے جاتا۔ میں شام

کو واپسی میں گاڑی لے جاؤں گا۔"

"آپ ٹیکسی کی زحمت مت کریں ملک صاحب!" استاد نے کہا "میری گاڑی لے جائیں، یہ کسی کسٹمر کی نہیں، بلکہ میری ذاتی گاڑی ہے۔" استاد نے اپنی کرولا کی طرف اشارہ کیا "آپ کی گاڑی کی طرح نئی تو نہیں ہے لیکن یہ آپ کو دھوکا نہیں دے گی۔"

ملک استاد کی گاڑی لے کر چلا گیا۔

استاد نے گاڑی کا بونٹ کھولا ہی تھا کہ اچانک اس کے سیل فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ اس نے سیل فون جیب سے نکالا اور اسے کان سے لگا کر بولا "ہیلو!...... کیا...... اچھا، میں...... میں آرہا ہوں۔"

استاد کو حواس باختہ دیکھ کر میں بھی کیبن سے باہر نکل آیا اور بولا "استاد، خیریت تو ہے؟"

"خیریت نہیں ہے انو!" استاد نے کہا "میری بیوی کا فون تھا۔ وہ بتارہی تھی کہ میرے چھوٹے بیٹے کو بہت زبردست کرنٹ لگا ہے۔ میں گھر جارہا ہوں۔"

"میں بھی چلتا ہوں۔" میں نے کہا۔

"ارے یار، اتنی پریشانی کی بات نہیں ہے۔ تمہارا یہاں رہنا ضروری ہے۔" پھر وہ پریشان ہوکر بولا "یار! میری گاڑی تو ملک صاحب لے گئے۔"

"واہ استاد!" میں نے ہنس کر کہا "ہمیں گاڑیوں کی کیا کمی۔ تم وہ کلٹس لے جاؤ جو نصیر نے ابھی ابھی تیار کی ہے۔ اس کا مالک آیا بھی تو میں کہہ دوں گا کہ استاد گاڑی کی ٹرائی لینے گیا ہے۔ ویسے وہ آیا بھی تو شام ہی کو آئے گا۔"

استاد وہ گاڑی لے کر چلا گیا۔ جاتے جاتے اس نے مجھ سے کہا کہ تم ذرا ملک صاحب کی گاڑی دیکھ لینا، کسی لڑکے پر مت چھوڑنا۔

حیرت انگیز بات یہ تھی کہ اس کی گاڑی میں وہی نقص تھا جو آج سے برسوں پہلے ہوا تھا۔ اس کی پلگ پلیٹیں تو ٹھیک تھیں، ریڈی ایٹر کا پانی انجن میں سرکولیٹ نہیں کررہا تھا۔

میں نے امیر سے کہا کہ اس گاڑی کا ریڈی ایٹر کھولو۔

اس نے ریڈی ایٹر کھولا۔ میں نے دیکھا، اس کا پائپ چوک ہوگیا تھا۔ میں نے گاڑی کی وہ خرابی دس منٹ میں دور کردی۔

اچانک میرے ذہن میں ایک شیطانی خیال آیا۔ اگر میں ملک کی گاڑی کا بریک ناکارہ کردوں تو......؟ تو میرا انتقام بھی پورا ہوجائے گا اور میرے راستے کی سب سے بڑی دیوار بھی ہٹ جائے گی۔

میرے ذہن میں آندھیاں سی چلنے لگیں۔ پھر مجھے سوائے انتقام کے کچھ بھی یاد نہ رہا۔

وہ بالکل نئی گاڑی تھی لیکن میں جانتا تھا کہ اس کے بریک ناکارہ کیسے کیے جاسکتے ہیں؟ بریک ایک دم ناکارہ نہیں ہوتے بلکہ ایک دن، دو دن یا پھر بعض اوقات چار پانچ دن بعد بھی ناکارہ ہوسکتے ہیں۔

گاڑی کے بریک ناکارہ کرتے ہوئے میرا چہرہ پسینے میں ڈوب گیا۔ میں ایک انسان کی جان لینے کی منصوبہ بندی کررہا تھا۔ پھر میں نے خود کو یہ سوچ کر تسلی دی کہ ملک نے میرے ساتھ کون سا اچھا سلوک کیا تھا۔ اس نے نہ صرف مجھے تھپڑ مارا تھا بلکہ پولیس والوں کو پیسے کھلا کر مجھے تشدد کا نشانہ بھی بنوایا تھا۔ ایک مرتبہ پھر انتقام کا جذبہ مجھ پر حاوی ہوگیا۔ میں نے گاڑی کے بریک مخصوص انداز میں ناکارہ کردیا۔

میں بونٹ بند کرکے فارغ ہوا ہی تھا کہ استاد کی گاڑی ورکشاپ میں داخل ہوئی۔

"خیریت تو ہے استاد!" میں نے اپنے چہرے کا پسینا پونچھتے ہوئے پوچھا "ہاں یار! سب خیریت ہے، بیٹے کو معمولی سا کرنٹ لگا تھا جسے میری بیوی نے اتنا بڑا مسئلہ بنادیا۔ میں گھر پہنچا تو وہ اطمینان سے بیٹھا ناشتا کررہا تھا۔" پھر وہ چونک کر بولا "تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے۔ تمہیں اس موسم میں اتنا پسینا کیوں آرہا ہے؟"

"آں......" میں نے چونک کر کہا "ہاں استاد...... میری طبیعت کو کیا ہوا! تم تو جانتے ہو کہ مجھے کچھ زیادہ ہی پسینا آتا ہے۔ ویسے بھی اب کام کرنے کی عادت نہیں رہی ہے نا۔" میں نے بات بنائی۔

"ملک کی گاڑی ٹھیک کردی؟" استاد نے پوچھا۔

"ہاں استاد!" میں نے جواب دیا "وہ ریڈی ایٹر کا ایک پائپ چوک ہوگیا تھا، اس لیے گاڑی گرم ہورہی تھی۔"

"ذرا اسٹارٹ کرو۔" استاد نے کہا۔

میں نے نصیر سے کہا "گاڑی اسٹارٹ کرو۔"

نصیر نے گاڑی اسٹارٹ کی، استاد نے آواز سنی پھر بونٹ اُٹھا کر اس کے ریڈی ایٹر کا جائزہ لیا۔

اس وقت میرا دل بہت زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ میں نے گاڑی کے بریکوں میں گڑبڑ کی تھی۔ پہلی نظر میں تو استاد کو بھی معلوم نہیں ہوسکتا تھا بلکہ اسے تو اس وقت معلوم ہوتا جب گاڑی کا بریک بالکل ناکارہ ہوجاتا۔ میرے دل کا چور مجھے خوف زدہ کررہا تھا۔

استاد نے اپنا اطمینان کرنے کے بعد بونٹ بند کردیا۔

www.paksociety.com

www.paksociety.com

☆☆☆

شام کو ملک آیا تو میں جان بوجھ کر کیبن سے باہر نہیں نکلا۔ استاد نے اسے گاڑی کی چابی دی اور اسے رخصت کردیا۔

یہ بات بھی میرے حق میں تھی کہ ملک کا ڈرائیور چھٹی پر تھا۔ وہ کافی تجربے کار آدمی تھا۔ گاڑی کے بریک کی گڑبڑ کا احساس اسے وقت سے پہلے ہو جاتا۔

اب میں دن رات یہ خبر سننے کے لیے بے تاب تھا کہ ملک کی گاڑی کا ایکسیڈنٹ ہو گیا اور ملک جہنم رسید ہو گیا۔

اس وقت جانے مجھے کیا ہو گیا تھا؟ وہ اس لڑکی کا باپ تھا جس سے میں محبت کا دعوے دار تھا لیکن انتقام کی آگ میں رمشا کی محبت بھی کہیں گم ہو گئی تھی۔

تین دن بعد رمشا مجھے ملی تو وہ بہت افسردہ تھی۔

"کیا ہوا رمشا؟" میں نے پوچھا "خیریت تو ہے؟"

"تم ٹھیک ہی کہتے تھے انو!" رمشا نے کہا "ڈیڈی نے میری بات ماننے سے انکار کردیا ہے۔"

"کیا!" میں نے صرف اتنا کہا۔ میرا دل گویا ڈوب رہا تھا۔

"میں نے ہر طرح سے ڈیڈی کو سمجھانے کی کوشش کی لیکن ان کی ایک ہی رٹ ہے کہ وہ کنگلا تم سے نہیں، تمہاری دولت سے پیار کرتا ہے اور پھر تم خود سوچو، ایک گھٹیا موٹر مکینک کو میں اپنا داماد کیسے بنا سکتا ہوں۔"

"پھر...... پھر تم نے کیا فیصلہ کیا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"میرا فیصلہ تو وہی ہے جو پہلے تھا۔ میں تمہاری ہوں اور تمہاری رہوں گی۔" رمشا نے اٹل لہجے میں کہا۔

"لیکن کیسے؟"

"شادی کرنے کے دوسرے طریقے بھی تو ہیں۔" رمشا نے کہا "ہم کورٹ میرج کر سکتے ہیں۔"

"تم اتنا بڑا قدم اٹھانے کی ہمت رکھتی ہو۔" میں نے پوچھا۔

"ہاں، میں تمہارے لیے کچھ بھی کر سکتی ہوں۔"

"رمشا! ملک صاحب اس شادی کو کبھی قبول نہیں کریں گے۔ وہ اپنی دولت کے ذریعے مجھے قصوروار ٹھہرا دیں گے۔ جب وہ بغیر کسی وجہ کے ایسا کر سکتے ہیں تو اب تو یہ ان کی عزت وانا کا مسئلہ ہوگا۔"

"ہوا کرے۔" رمشا نے کہا "یہ میری بھی انا کا مسئلہ ہے انو!"

"اچھی طرح سوچ لو رمشا!" میں نے کہا۔

"میں نے بہت اچھی طرح سوچ لیا ہے۔ ہاں، اگر تم میرے اس فیصلے سے خوف زدہ ہو تو بات دوسری ہے۔ پھر تو میں کچھ بھی نہیں کر سکوں گی...... کچھ بھی نہیں کر سکوں گی انو!" وہ بلک بلک کر رونے لگی۔

"پاگل لڑکی!" میں نے کہا "تو نے یہ کیسے سمجھ لیا کہ میں اس فیصلے سے خوف زدہ ہوں۔ میں تیار ہوں، بولو...... کب چلنا ہے کورٹ؟"

"اب ایسی بھی جلدی نہیں ہے۔" رمشا پہلی دفعہ مسکرائی "اگلے ہفتے تک انشاء اللہ میں اپنا گھر چھوڑ دوں گی۔" رمشا نے کہا "میں......"

اس کا جملہ ادھورا رہ گیا کیونکہ اس کے سیل فون کی گھنٹی بجنے لگی تھی۔

اس نے سیل فون کان سے لگایا اور بولی "جی ماما!...... کیا...... کب؟...... اب ڈیڈی کیسے ہیں...... اچھا میں آرہی ہوں۔"

میں سمجھ گیا کہ ملک کسی خوفناک حادثے کا شکار ہو گیا ہے اور اس کی ماں اسے یہی اطلاع دے رہی ہے۔

"کیا ہوا رمشا؟" میں نے اپنے بے قابو دل پر قابو پا کر پوچھا۔

"ڈیڈی کی طبیعت اچانک بگڑ گئی ہے۔" اس نے کہا "طبیعت تو ان کی صبح ہی سے خراب تھی۔ اس لیے وہ آج آفس بھی نہیں گئے تھے۔"

"چلو، میں تمہیں چھوڑ دیتا ہوں۔" میں نے کہا "پریشان مت ہو، انہیں کچھ بھی نہیں ہوگا۔" میں نے رسمی طور پر کہا لیکن میں جانتا تھا کہ انہیں آج کچھ نہیں ہوا تو کل ہوگا۔

رمشا کو اس کے گھر چھوڑ کر میں بھی اپنے گھر چلا گیا۔

دوسرے دن میں ورکشاپ پہنچا تو ورکشاپ میں کام کرنے والے ایک لڑکے نصیر نے ایک اندوہناک خبر سنائی "انو بھائی! وہ ملک صاحب کی گاڑی کا بہت زبردست ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے۔"

"کیا......؟" میں نے بناوٹی حیرت کا مظاہرہ کیا ورنہ میں تو جانے کب سے یہ خبر سننے کو بے چین تھا۔ "کب ہوا ہے ایکسیڈنٹ؟"

"کل رات کو۔" اس نے جواب دیا۔

اسی وقت استاد آگیا اور بولا "یار انو! تمہیں معلوم ہوا، وہ ملک صاحب کی گاڑی کا ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے؟"

"ہاں، مجھے ابھی نصیر نے بتایا ہے۔"

"کل شام ملک صاحب کو دل کا دورہ پڑا تھا۔" استاد نے بتایا "ان کا ڈرائیور بھی موجود نہیں تھا اس لیے گاڑی ان کی بیٹی چلا رہی تھی۔"

"کیا؟" میں نے چیخ کر پوچھا "گاڑی رمشا چلا رہی تھی؟"

"ہاں یار!" استاد نے افسردگی سے جواب دیا "وہ شاید بہت تیز رفتاری سے جا رہی تھی یا پھر دوسرے ڈرائیور کی غلطی تھی۔ ان کی گاڑی ایک ویگن سے ٹکرا گئی تھی۔"

"اب ان کا کیا حال ہے؟" میں نے بے چینی سے پوچھا۔

"یہ تو مجھے نہیں معلوم!" استاد نے کہا۔

"میں ابھی آتا ہوں۔" میں نے کہا "ملک صاحب کس اسپتال میں ہیں؟"

"وہ جناح اسپتال میں ہیں۔" نصیر نے بتایا۔

میں نے گاڑی نکالی اور جناح اسپتال کی طرف دوڑا دی۔

میں گاڑی پارکنگ میں کھڑی کر کے پاگلوں کی طرح ایمرجنسی وارڈ کی طرف بھاگا۔

میں نے استقبالیہ پر بیٹھی ہوئی لڑکی سے پوچھا "کل یہاں ایکسیڈنٹ کا ایک کیس آیا تھا۔ ملک صاحب، ان کی بیگم اور بیٹی رمشا تھیں اس گاڑی میں۔"

"کیا نام بتایا آپ نے؟" لڑکی نے پوچھا۔

"رمشا!" میں نے ہیجانی انداز میں کہا۔

"جی...... ملک آفتاب...... رمشا ملک اور مسز ملک!" اس نے مانیٹر پر دیکھتے ہوئے کہا "ملک صاحب تو اس وقت کارڈیو میں ہیں۔"

"اور ان کی بیگم اور بیٹی؟"

"ان کے بارے میں ڈاکٹر اعجاز کو معلوم ہوگا۔ وہی اس وقت ڈیوٹی پر تھے۔"

میں پاگلوں کی طرح ڈاکٹر اعجاز کو تلاش کرنے لگا۔

وہ مجھے وہاں مل ہی گئے۔ میں نے ان سے پوچھا "ڈاکٹر صاحب، کل ملک صاحب اور ان کی بیگم......"

"ہاں، میں ملک صاحب کو جانتا ہوں۔" ڈاکٹر اعجاز نے کہا "وہ اس وقت کارڈیو میں ہیں۔ انہیں بہت شدید ہارٹ اٹیک ہوا تھا۔" پھر وہ افسردگی سے بولا "لیکن میں ان کی بیگم اور بیٹی کو نہ بچا سکا...... وہ دونوں بہت بُری طرح زخمی تھیں۔ بیگم ملک تو راستے ہی میں ایکسپائر ہو گئی تھیں۔ ان کی بیٹی تین گھنٹے تک موت وزندگی کی کشمکش میں مبتلا رہی، پھر...... وہ بھی......"

"نہیں ڈاکٹر صاحب!" میں نے پھٹی پھٹی آواز میں کہا "رمشا نہیں مر سکتی......" پھر مجھے کچھ ہوش نہ رہا۔

☆☆☆

مجھے ہوش آیا تو میں اسپتال ہی کے کسی کمرے میں تھا۔ ایک نرس نے جھک کر پوچھا "اب آپ کی طبیعت کیسی ہے مسٹر انور؟"

"میں ابھی تک زندہ کیوں ہوں؟" میں نے گلوگیر لہجے میں کہا۔

"تجھے کیا ہو گیا ہے انو!" استاد کی آواز پر میں نے سر گھما کر اسے دیکھا "تو کیسی باتیں کر رہا ہے؟"

"مجھے تیرے دکھ کا اندازہ ہے بیٹا!" اماں کی آواز آئی "لیکن اللہ کی مرضی یہی تھی۔"

اب میں انہیں کیسے بتاتا کہ اس میں میری مرضی کا بھی دخل ہے۔ میں نے اپنے ہاتھوں سے اپنی محبت کو مار دیا تھا۔ مجھے اپنے ہاتھوں پر خون کے چھینٹے نظر آتے تھے۔

میں رمشا کی قبر پر پہنچا اور بلک بلک کر روتے ہوئے بولا "رمشا! تم مجھے چھوڑ کر چلی گئیں، تم نے بہت اچھا کیا۔ میرے ساتھ یہی ہونا چاہیے تھا۔ میں ہی قاتل ہوں رمشا! میں ہی قاتل ہوں......" میں پھر بلک بلک کر رونے لگا۔

اچانک کسی نے پشت سے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔

میں نے گھوم کر دیکھا تو سکتے میں رہ گیا۔ وہ ملک صاحب تھے۔ وہ بھی آنسو بہا رہے تھے۔ وہ روتے ہوئے مجھ سے لپٹ گئے اور بولے "مجھے معاف کر دینا انور!...... مجھے معاف کر دینا بیٹا، میں نے تمہیں سمجھنے میں بہت بڑی غلطی کی...... مجھے معاف کر دینا۔"

معافی تو مجھے مانگنا چاہیے تھی کہ میں نے ان کی بیٹی اور بیوی کی جان لے لی تھی۔ وہ بے چارے اپنی بیٹی کے قاتل سے معافی مانگ رہے تھے۔

میں نے بلکتے ہوئے کہا "آپ بھی مجھے معاف کر دیجیے گا انکل!...... آپ بھی مجھے معاف کر دیں۔"

وہ مجھے معاف بھی کر دیتے تو کیا اللہ بھی مجھے معاف کرے گا؟ کاش...... کاش میں نے ایسا نہ کیا ہوتا...... کاش...... اللہ بھی مجھے معاف کر دے...... کاش!"

لیکن میری سزا اتنی جلدی پوری کیسے ہوگی؟ لگتا ہے میری پکار آسمانوں تک جاتی ہی نہیں۔ اب تو بس آنکھیں ہیں اور دھول بھرا سناٹا ہے۔

www.Paksociety.com

دوسری شادی

جناب مدیراعلیٰ
سلام خلوص!
یہ میری اپنی آپ بیتی نہیں ہے۔ بس اتفاقیہ طور پر میں اس کا ایک کردار بن گیا۔ مگر میرے داخلے کے بعد کہانی نے ایک نیا رُخ اختیار کرلیا۔ ہمارے معاشرے میں اکیلی عورت کو کیسی کیسی پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے، آپ بھی ملاحظہ کریں۔

نوید احسن
(کراچی)

وہ مجھے ریل کے سفر میں ملا تھا۔

میں کراچی سے لاہور جارہا تھا کہ حیدرآباد کے اسٹیشن پر وہ ڈبے میں داخل ہوا۔ اس کی عمر بہ مشکل گیارہ بارہ برس کی ہوگی۔ بہت معصوم اور خوبصورت شکل۔ صاف ستھرا لباس، کسی اچھے خاندان کا معلوم ہوتا تھا۔

وہ کچھ خوفزدہ اور اپنے آپ سے نظر چُراتا ہوا محسوس ہورہا تھا۔

غنڈے بدمعاش قسم کے لوگ ایسے لڑکوں کو تاڑ لیا کرتے ہیں اور یا تو انہیں بہلا پھسلا کر اپنے ساتھ لے جاکر جرائم پیشہ بنادیتے ہیں یا پھر کسی اور انداز سے انہیں برباد کردیا جاتا ہے۔

اس لیے مجھے اس لڑکے کی طرف سے فکر ہونے لگی تھی۔

نہ جانے کیوں وہ لڑکا میرے برابر میں ہی آکر بیٹھ گیا تھا۔ شاید اس پورے ڈبے میں ایک میں ہی اسے شریف دکھائی دیا ہوں گا۔ میں نے اس سے پوچھا۔ ”بیٹا۔ تم کہاں جاؤ گے؟“

”جی۔ لاہور۔“ اس نے گھبراتے ہوئے بتایا۔

”کیا اکیلے جارہے ہو؟“ میرا دوسرا سوال تھا۔

اس پر وہ اور زیادہ گھبرا گیا تھا۔ ”جی۔ جی نہیں۔ وہ اسی برابر والے ڈبے میں ہیں۔“

میں سمجھ گیا تھا کہ وہ جھوٹ بول رہا ہے۔ اگر اس کی ماں اس کے ساتھ ہوتی تو اسے بھی ماں کے ساتھ ہونا چاہئے تھا۔ مجھے اس کی طرف سے صرف یہ پریشانی تھی کہ وہ کہیں غلط لوگوں کے ہتھے نہ چڑھ جائے۔ اس لیے میں نے اس سے کہا۔ ”بیٹا۔ جھوٹ بولنے کی ضرورت نہیں ہے۔ سچ سچ بتادو تم کس کے ساتھ جارہے ہو۔“

وہ اندر سے ویسے ہی گھبرایا ہوا تھا۔ میرے سخت لہجے نے اسے اور بھی خوفزدہ کردیا۔ اس لیے اس نے ڈر کر بتادیا تھا۔ ”کوئی نہیں انکل۔ میرے ساتھ کوئی نہیں ہے۔ میں اکیلا ہی جارہا ہوں۔“

”اس کا مطلب یہ ہوا کہ گھر سے بھاگ کر جارہے ہو۔“ میرا لہجہ کچھ اور سخت ہوگیا تھا۔ جو اس کے لیے بہت ضروری تھا۔

”جی۔“ اس نے اپنی گردن جُھکائی تھی۔

”کراچی میں کہاں رہتے ہو؟“

”ناظم آباد۔“ اس نے بتایا۔

ناظم آباد کراچی کا ایک ایسا علاقہ ہے جہاں متوسط طبقے کے کھاتے پیتے لوگ رہا کرتے ہیں۔ گویا میں نے اس کے بارے میں جو اندازہ لگایا تھا وہ درست ثابت ہوا تھا۔

اس نے پھر اپنی کہانی بتائی۔ عام سی کہانی تھی۔ لڑکے ان ہی حالات میں گھروں سے فرار ہوا کرتے ہیں۔ اس کا باپ مرچکا تھا۔ ماں نے دوسری شادی کرلی تھی جبکہ سوتیلا باپ اسے پسند نہیں تھا۔ بس اسی بنا پر کاشان گھر سے بھاگ نکلا تھا۔ کاشان اس بچے کا نام تھا۔

”یہ بتاؤ کیا تمہارا دوسرا باپ تم پر سختی کرتا ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”نہیں۔“ اس نے انکار میں گردن ہلادی۔ ”نہیں۔ سختی تو نہیں کرتے۔“

”پھر کیوں بھاگ رہے ہو؟“

”بہر حال قصہ مختصر یہ کہ حیدرآباد اُتر کر میں نے اس بچے کو بھی اُتارا حالانکہ میرے ٹکٹ کا نقصان ہوگیا تھا لیکن یہ ثواب کا کام تھا اور یہ مجھے کرنا تھا۔

ہم واپسی کی گاڑی میں بیٹھے اور میں اس بچے کو واپس اس کے گھر لے آیا۔

اس کی ماں کا رورو کر بُرا حال تھا۔ میں جب کاشان کو لے کر پہنچا تو ایک ہنگامہ سا مچ گیا تھا۔ میں نے کاشان کو اس کی ماں کے حوالے کردیا تھا۔ اس کا سوتیلا باپ مجھے ڈرائنگ روم میں لے آیا تھا۔ ”آپ کی بہت مہربانی جو آپ کاشان کو ساتھ لے آئے۔ ورنہ اس کی ماں رورو کر اپنی جان دے دیتی۔“

”یہ بہت نازک سچویشن ہوتی ہے فرید صاحب۔“ میں نے کہا۔ ”اس بچے کی زندگی تباہ ہوسکتی تھی۔ لیکن خدا نے مجھے بھیج دیا۔ اب میں اپنا فرض سمجھتے ہوئے آپ سے کچھ سوالات کروں گا۔ امید ہے آپ بُرا نہیں مانیں گے۔“

”نہیں۔ نہیں آپ ضرور پوچھیں۔“

”آپ کا سلوک اس کے ساتھ کیسا ہے؟“

”مجھے اندازہ تھا کہ آپ کو یہی پوچھنا ہے۔“ اس نے ایک گہری سانس لی۔ ”کیونکہ ہمارے معاشرے میں سوتیلی ماں یا سوتیلے باپ کا امیج بہت ہی ظالمانہ ہوا کرتا ہے۔ یہ خونخوار قسم کی مخلوق ہوتی ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ کچھ ایسے ہی ہوں۔ لیکن خدا گواہ ہے کہ میں نے کاشان کو ہمیشہ سینے سے لگا کر رکھا ہے۔ بہت پیار دیا ہے اس کو۔ آپ چاہیں تو اس سے پوچھ سکتے ہیں۔“

”جی ہاں۔ وہ اس کا اعتراف کرچکا ہے۔“ میں نے بتایا۔ ”اس نے بتایا ہے کہ آپ اس سے بہت پیار کرتے ہیں۔“

”شکر ہے۔“ اس نے ایک گہری سانس لی۔ ”کم از کم اسے میرے پیار کا احساس تو ہے۔ اب اس بے وقوف سے یہ معلوم تو کریں کہ وہ گھر سے کیوں بھاگا تھا؟“

”ابھی نہیں۔ ابھی اس سے کچھ نہ کہیں۔ اس کے ساتھ بالکل نارمل ہوجائیں۔“ میں نے کہا۔ ”یہ باتیں میں اس سے معلوم کرلوں گا۔ آپ لوگ اپنے رویّے سے کچھ بھی ظاہر نہ ہونے دیں۔ میں اس کا دوست بن کر آہستہ آہستہ اس سے سب معلوم کرلوں گا۔ میرا خیال ہے کہ اس کے ساتھ کوئی ذہنی پیچیدگی ہے۔“

اس دوران میں اس کی بیوی یعنی کاشان کی ماں بھی آگئی تھی۔ وہ ایک دبلی پتلی خوبصورت عورت تھی جو بار بار میرا شکریہ ادا کئے جارہی تھی۔ کاشان بھی اس کے ساتھ ہی آیا تھا۔ اس نے اپنا لباس بدل لیا تھا۔ اب وہ سہما سہما نہیں بلکہ خاصا پُراعتماد دکھائی دے رہا تھا۔ اس نے اپنی ماں کا ہاتھ مستقل تھام رکھا تھا جیسے اپنی ماں سے اسے واقعی پیار ہو جبکہ سوتیلے باپ کی طرف دیکھتے ہوئے اس کی آنکھوں میں سرد مہری سی دکھائی دینے لگتی۔

میں کچھ دیر بیٹھنے کے بعد ان لوگوں سے اجازت لے کر آگیا۔

مجھے لاہور جانا بہت ضروری تھا۔ اس لیے دوسری شام

کی گاڑی سے لاہور کے لیے روانہ ہوگیا۔ میری واپسی ایک ہفتے کے بعد ہوئی تھی۔ ایک ہفتے کے بعد میں پھر ان لوگوں کے گھر پہنچ گیا۔

کاشان کا باپ نوید اس وقت نہیں تھا۔ کاشان تھا۔ اس نے بڑی گرم جوشی سے میرا استقبال کیا تھا۔ ''آئیں انکل آئیں۔ آپ تو اتنے دنوں کے بعد آئے ہیں۔''

''بیٹے میں لاہور چلا گیا تھا۔''

میرے آنے کا سن کر اس کی ماں بھی چلی آئی۔

ہمارے درمیان بہت دیر تک گپ شپ ہوتی رہی۔ کاشان کو خود سے قریب کرنے کے لیے میں نے کئی اُلٹے سیدھے لطیفے بھی سنائے۔ پھر میں نے اس کی ماں سے کہا۔ ''اگر آپ کی اجازت ہو تو میں کاشان میاں کو ٹھکانے پر لانے کے لیے اپنے ساتھ لے جا رہا ہوں۔''

وہ سمجھ گئی کہ میں کاشان کو کیوں لے جانا چاہتا ہوں۔

''کیوں نہیں بھائی صاحب۔ آپ لے جائیں اس کو۔ آپ پر تو پورا بھروسا ہے۔''

میں کاشان کو اپنے ساتھ لے آیا۔

خوب تفریح کراتا رہا۔ کھانا کھلایا۔ آئس کریم کھلائی۔ وہ مجھ سے بے تکلف ہوگیا۔ پھر میں نے اس سے پوچھا۔

''بیٹے۔ ایک بات بتاؤ لیکن سچ سچ بتانا۔''

''جی انکل بولیں۔''

''تمہیں اپنے نئے ابو کیوں پسند نہیں ہیں۔''

''اس لیے کہ وہ مما کے ساتھ ہوتے ہیں۔'' اس نے جواب دیا۔

میں سمجھ گیا کہ یہی پرابلم ہوسکتی ہے۔ ایسے بے شمار بچے ہیں جو اپنے باپ کے علاوہ اپنی ماں کے پاس کسی اور کے وجود کو برداشت نہیں کرسکتے۔ یہ ایک نفسیاتی ردِعمل ہوتا ہے اور کبھی کبھی بہت شدید بھی ہو جایا کرتا ہے۔

میں نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔ ''دیکھو بیٹا۔ بات یہ ہے کہ جب تمہارے اپنے ابو اس دنیا میں نہیں رہے تو نئے ابو آگئے۔ ایسا ہوتا ہی رہتا ہے۔ تمہاری امی کو کسی سہارے کی ضرورت تھی نا۔ ورنہ تم لوگ کہاں رہتے۔ کون تمہاری پرورش کرتا؟''

''امجد انکل تو بہت اچھے ہیں۔'' اس نے بتایا۔

''کون امجد انکل۔'' یہ ایک نیا نام میرے سامنے آیا تھا۔

''وہی جن کی دکان ہے۔'' اس نے کہا۔ ''وہ تو میرا بہت خیال رکھتے ہیں۔ بہت پیار کرتے ہیں۔''

اس نے بتایا کہ امجد بھی اس کی ماں سے شادی کا خواہش مند تھا۔ وہ لوگ اس کی دکان سے سودا لیا کرتے تھے لیکن اس کی ماں نے نوید سے شادی کرلی تھی۔ کچھ کچھ سمجھ میں آنے لگا تھا۔ اس لیے میں نے اب اس قصے کو اس کے اختتام تک پہنچانے کے لیے یہ فیصلہ کیا کہ میں اس کی ماں سے بات کروں گا۔

یہ موقع بھی چار پانچ دنوں کے بعد ملا تھا۔

''یہ بتائیں۔ یہ امجد کون ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''امجد۔'' وہ چونک پڑی۔ ''اس کے بارے میں کاشان نے بتایا ہوگا۔''

''جی ہاں۔ وہ کہہ رہا تھا کوئی دکاندار ہے۔''

''جی ہاں۔ ایک خبیث قسم کا انسان ہے۔'' اس نے بتایا ''میں پہلے اس کی دکان سے سودا لیا کرتی تھی۔ یہ اتفاق ہے کہ میں اپنے پہلے شوہر کے ساتھ بھی اسی محلّے میں رہا کرتی تھی۔ ان کے انتقال کے بعد نوید سے میری شادی ہوئی اور آج تک یہیں ہوں۔''

''امجد کی کیا کہانی ہے۔''

''کوئی خاص نہیں۔ شوہر کے انتقال کے بعد اس آدمی نے دو تین بار مجھ سے شادی کی بات کی تھی لیکن میں نے انکار کردیا تھا کیونکہ وہ ایک کمینہ صفت انسان ہے۔ بس اتنی سی بات ہے۔ پھر نوید سے میری شادی ہوگئی۔''

''کیا امجد شادی شدہ ہے۔''

''جی ہاں۔ شادی ہو چکی تھی۔ بیوی کو طلاق دے چکا ہے۔ اس کے علاوہ اس آدمی سے اور کوئی تعلق نہیں تھا۔''

''میرا خیال ہے کہ کاشان میاں اس سے ملاقات کرتے رہتے ہیں۔'' میں نے کہا۔ ''کیونکہ وہ امجد کی بہت تعریف کر رہے تھے۔''

''پتا نہیں۔ مجھے نہیں معلوم۔ میں تو یہ سن کر پریشان ہوگئی ہوں۔''

''آپ پریشان نہ ہوں۔ اب یہ معاملہ میرے پاس ہے۔ میں اسے سنبھال لوں گا۔''

ایک بار میں نے کاشان سے کہا کہ وہ مجھے دور سے امجد کی دکان دکھا دے۔ میرے پوچھنے پر اس نے بتا دیا تھا کہ وہ امجد کے پاس آتا جاتا رہتا ہے۔ میں نے اس سے کہا کہ وہ میرے بارے میں امجد کو کچھ نہیں بتائے۔

کاشان نے مجھے امجد کی دکان دکھا دی۔ ایک دوپہر جب اس کی دکان خالی نظر آرہی تھی۔ میں اس کے پاس پہنچ گیا۔ میرا اندازہ درست تھا۔ وہ ایک خبیث صورت انسان تھا جس کی آنکھوں سے مکاری ظاہر ہو رہی تھی۔

میں نے یوں ہی اس سے دو چار چیزیں خریدلیں اور اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے لگا۔ وہ کچھ باتونی بھی واقع ہوا تھا۔ اس دن اس سے کوئی خاص بات معلوم نہیں ہوسکی تھی لیکن اس کی فطرت کا اندازہ ہوگیا تھا۔

دو دنوں کے بعد میں کچھ خریدنے کے بہانے اس کی دکان پر پہنچ گیا۔ اس سے پھر باتیں ہونے لگیں۔ ''کیا بات ہے صاحب۔ کیا آپ اس محلّے میں رہنے لگے ہیں۔''

''بس یار۔ یہی سمجھ لو۔ یہاں سے دو گلی چھوڑ کر۔'' میں نے یوں ہی ایک پتا بتا دیا۔ ''نئی نئی جگہ ہے نا۔ اسی لیے گپ شپ کرنے تمہارے پاس آجایا کرتا ہوں۔''

''یار۔ ضرور آجایا کرو۔'' وہ بھی بے تکلف ہوگیا تھا۔

''امجد تم تو اس محلّے کے دکاندار ہو۔ اسی لیے میں سمجھتا ہوں کہ تم سے تو ہر ایک کی دوستی ہوگی۔''

''یار۔ دوستی بھی ہے اور سب کے حالات بھی جانتا ہوں۔'' اس نے اپنی آنکھوں کو نچاتے ہوئے کہا۔ ''ایسا کون ہے جو مجھ سے چھپا ہوا ہے۔''

''ہاں بھئی مزے ہیں تمہارے۔''

''مزے کیا۔ بس لوگوں کو دیکھ دیکھ کر خون جلتا رہتا ہے۔'' اس نے کہا۔ ''ایک سے ایک نام نہاد شریف۔ اندر سے کچھ اور باہر سے کچھ اور۔''

''ہاں۔ یہ تو ہے۔ ہمارا پورا معاشرہ ہی ایسا ہوگیا ہے۔'' میں نے اس کی بات پر تبصرہ کیا۔

''اب یہی دیکھیں صاحب۔ ہمارے محلّے میں ایک عورت رہتی ہے۔'' اس نے بتایا ''اس کا شوہر مر چکا ہے۔ تو میں نے سوچا چلو۔ اس کو سہارا دینے کے لیے اس سے شادی کرلیتے ہیں لیکن اس نے صاف انکار کردیا۔''

''ہوسکتا ہے کہ اس کا تعلق کسی اور سے ہو۔''

''ہاں جی۔ یہ تعلق کچھ دنوں کے بعد سامنے آگیا۔'' وہ بُرا سا منہ بنا کر بولا۔ ''اس نے ایک اور بندے سے شادی کرلی حالانکہ اس کا ایک بیٹا بھی ہے۔ پھر بھی میں نے سوچا چلو شادی ہوگئی تو اس کو سہارا مل جائے گا۔ بیٹے کو اپنی دکان میں لگا دوں گا۔''

''چلو یہ سب تو ہوتا ہی رہتا ہے۔'' میں نے تسلی دی۔ ''اب وہ تمہارے ہاتھ سے نکل گئی ہے۔ اب کسی اور کو ڈھونڈ لو۔''

''ابھی کہاں نکلی ہے جی۔'' وہ مکاری سے ہنس پڑا۔ ''ابھی تو میں نے اپنا کیس شروع کیا ہے۔ دیکھ لینا وہ مجبور ہو کر پھر میرے پاس آئے گی۔''

''ایسا کون سا کیس شروع کردیا ہے؟''

پھر اس نے مجھ پر بھروسا کرتے ہوئے بتا دیا کہ وہ کیا کر رہا تھا۔ اس نے کاشان کو اس کے نئے باپ کے خلاف بھڑکانا شروع کردیا تھا۔ وہ دونوں کو ایک دوسرے کا دشمن بنانے میں لگا ہوا تھا اور بڑی حد تک اپنے مقصد میں کامیاب بھی ہوتا جا رہا تھا۔ یعنی کاشان کی حد تک اس کی سازش کامیاب جا رہی تھی۔ ''لیکن یار۔ اس سے تمہارا کیا فائدہ ہوگا۔'' میں نے پوچھا۔

''یہ لو جی۔'' وہ ہنس پڑا۔ ''تم بھی بہت بھولے آدمی ہو۔ دونوں میں جب نفرت بڑھے گی تو پھر اس عورت کو دونوں میں سے ایک کا ساتھ دینا پڑے گا۔ شوہر کا یا پھر بچے کا اور میں دعوے سے کہتا ہوں کہ وہ بچے کے لیے شوہر کو چھوڑ دے گی کیونکہ بچہ اس کے پہلے شوہر کی یادگار ہے۔''

''اوہ اب سمجھا۔'' میں نے گردن ہلائی۔ ''یعنی تم یہ سمجھتے ہو کہ طلاق ہو جائے گی۔''

''ہاں بھئی۔ صاف صاف طلاق۔ کیس ختم۔ وہ ایک بار پھر بے سہارا ہو جائے گی اور اس بارا سے کوئی نہیں پوچھے گا۔''

''اور تم آگے بڑھ کر اسے سہارا دو گے۔''

''بالکل۔'' وہ ہنستے ہوئے بولا۔ ''میں نے تو جی جڑ پر ہاتھ صاف کیا ہے۔ اب دیکھتا ہوں کہ وہ مجھ سے کس طرح بھاگتی ہے۔''

دل تو چاہ رہا تھا کہ اس کمینے کو مارنا شروع کردوں لیکن اس کا کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ اس سازشی انسان سے نمٹنے کے لیے یہ ضروری تھا کہ ان لوگوں کو جب سے پہلے اس محلّے سے ہٹا دیا جائے تاکہ کاشان اس سے نہ مل سکے۔

میں نے نوید کو یہ تو نہیں بتایا تھا کہ یہ سب کیا ہو رہا تھا۔ کاشان کو بہکانے والا کون تھا لیکن اسے یہ مشورہ دیا کہ وہ فوری طور پر محلّہ چھوڑ دے۔ ویسے بھی وہ کرائے کا مکان تھا جسے آسانی سے چھوڑا جا سکتا تھا۔

نوید ایک سمجھ دار آدمی تھا اور بیٹے کے مستقبل کے لیے اس کی بیوی یعنی کاشان کی ماں بھی پوری طرح اس کا ساتھ دے رہی تھی۔ اس لیے انہوں نے اسی ہفتے اپنا مکان تبدیل کردیا۔ وہ وہاں سے چلے گئے۔ اس وقت سب سے زیادہ اعتراض کاشان کو ہوا تھا لیکن بعد میں وہ بھی سیٹ ہوگیا۔

ایک ہفتے کے بعد میں پھر صورتِ حال جاننے کے لیے اس دکاندار امجد کے پاس پہنچ گیا۔ دو چار چیزیں خریدلیں اور اِدھر اُدھر کی باتوں کے بعد دریافت کیا۔ ''ہاں بھئی۔ تمہارا معاملہ کہاں تک آگے بڑھا؟''

www.Paksociety.com

''کون سا معاملہ؟''

''وہی۔ اس عورت کا۔ جس کے بیٹے کو تم اپنی طرف کر رہے تھے۔''

''ارے لعنت بھیجو ان لوگوں پر۔ کم بخت محلہ چھوڑ کر چلے گئے ہیں۔'' اس نے تلخ ہو کر کہا۔ ''ایسا لگتا ہے جیسے انہیں میری پالیسی کا پتا چل گیا تھا۔ اسی لیے یہاں سے چلے گئے۔''

''تو اب کیا ارادے ہیں تمہارے۔''

''اب کیا ہونا ہے۔ اب تو میں نے ان کا دھیان ہی چھوڑ دیا ہے۔ نیکی کا تو زمانہ ہی نہیں رہا۔''

کئی دنوں کے بعد میں کاشان اور اس کے گھر والوں سے ملنے گیا تھا۔ کاشان کی ماں بہت خوش دکھائی دے رہی تھی۔ ''بھائی صاحب۔ آپ کا بہت بہت شکریہ۔ آپ نے بہت اچھا مشورہ دیا تھا۔ اب شاید سب ٹھیک ہو گیا ہے۔ کاشان کا رویہ اب نوید صاحب کے ساتھ بالکل ٹھیک ہے۔ دونوں ایک دوسرے سے گھنٹوں باتیں کرتے رہتے ہیں۔''

''ظاہر ہے کہ اب درمیان میں بہکانے والا نہیں رہا۔ اس لیے۔''

''جی ہاں بھائی صاحب۔''

''نوید صاحب سے کہیے گا کہ وہ کسی بھی حال میں کاشان کو اس پُرانے محلّے کی طرف جانے نہ دیں۔'' میں نے کہا۔ ''وہ آدمی موقع پاتے ہی پھر سانپ کی طرح ڈس سکتا ہے۔''

''جی ہاں۔ اتنا تو اندازہ ہو گیا ہے۔''

میں وہاں سے چلا آیا۔ بہ ظاہر یہ کہانی ختم ہو گئی تھی۔ لیکن یہ کہانی ختم نہیں ہوئی تھی۔ ابھی ایک دو تماشے اور ہونے تھے اور یہ تماشے اس وقت شروع ہوئے جب کاشان کی ماں کا فون آیا۔ میں اسے اپنا نمبر دے گیا۔ ''بھائی صاحب۔ مہربانی ہو گی۔ آپ ذرا آ جائیں۔ کچھ گڑبڑ ہو گئی ہے۔''

خدا جانے کیسی گڑبڑ ہو گئی تھی۔ بہرحال میں اس کے گھر پہنچ گیا۔ کاشان کی ماں بہت پریشان سی کھڑی تھی۔ ''بھائی صاحب۔ اب ایک مسئلہ اور کھڑا ہو گیا ہے۔''

''وہ کیا؟''

کاشان کے ابو (نوید) مجھ سے ناراض ہو گئے ہیں۔''

''ارے۔ وہ کیوں؟''

''ان کا یہ خیال ہے کہ میں ہر وقت کاشان کے پیچھے لگی رہتی ہوں۔ مجھے ان کی کوئی پروا نہیں ہے۔ بہت موڈ خراب ہے ان کا۔''

''آپ پریشان نہ ہوں۔ نوید ایک معقول انسان ہیں۔ میں انہیں سمجھانے کی کوشش کرتا ہوں۔''

میں نے جب نوید سے بات کی تو پھر بہت سی باتیں سامنے آئیں۔ کاشان کی ماں کو واقعی اپنے شوہر سے زیادہ اپنے بیٹے یعنی کاشان کی فکر رہتی تھی۔

کاشان کی خاطر وہ نوید کی طرف دھیان نہیں دے پا رہی تھی کیونکہ اسے یہ خوف لگا رہتا تھا کہ وہ کہیں پھر بھاگ نہ جائے۔ یہ ایک اُلجھی ہوئی سچویشن تھی اور میرا خیال ہے کہ ان لوگوں کے ساتھ ضرور پیش آتی ہے جو دوسری شادی کرتے ہیں اور پہلی بیوی یا پہلے شوہر کی اولاد بھی ہوتی ہے۔

ایڈجسٹ کرنا بہت مشکل ہو جاتا ہے۔ خاص طور پر عورت دوراہے پر آ کر کھڑی ہو جاتی ہے۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ کیا کرے اور کیا نہ کرے۔ کاشان کی ماں کے ساتھ بھی ایسا ہی معاملہ تھا۔

میں نے نوید کو اپنے طور پر بہت سمجھانے کی کوشش کی کہ وہ کسی طرح کاشان کو اپنے پیار کے ذریعے قابو میں کرنے کی کوشش کرے۔ لیکن وہ بد دل ہو رہا تھا۔ ''نہیں جناب۔ اب یہ بہت مشکل ہو رہا ہے۔'' اس نے کہا۔ ''میں اپنی سی کوشش کر کے تھک چکا ہوں۔''

نوید کے لہجے میں بہت تلخی تھی۔

''تو پھر کیا سوچا ہے آپ نے؟''

''اب ہم سب ایک دوراہے پر آ کر کھڑے ہو گئے ہیں۔'' اس نے کہا۔ ''ایک طرف تو میں ہوں۔ اور دوسری طرف کاشان ہے۔ اب اس بے چاری کے لیے یہ مسئلہ ہے کہ وہ میرا ساتھ دے یا اپنے بیٹے کا ساتھ دے۔ اس کی نفسیاتی حالت خراب ہوتی جا رہی ہے۔ اس کی نیندیں اُڑ گئی ہیں۔ اسی لیے میں نے یہ سوچا ہے کہ میں اپنے آپ کو اس سے الگ کر لوں۔ وہ میرے بغیر تو زندگی گزار سکتی ہے۔ لیکن اپنے بیٹے کے بغیر مر جائے گی۔''

یہ بہت تلخ فیصلہ تھا اس کا۔ بے رحم۔ لیکن شاید فیصلے میں ان سب کی بھلائی تھی۔ ورنہ سب کے سب تباہ ہو جاتے۔

دونوں میں علیحدگی ہو گئی۔ یہ ایسا دکھ تھا کہ جس کے لیے ہمدردی بھی نہیں کی جا سکتی تھی۔ دنیا پر یہ ایک عام سا واقعہ ہے لیکن کیسی تلخیاں چھپی ہوئی اور یہ کیسی بے رحم سچائی ہے کہ اگر شوہر یا بیوی کا انتقال ہو جائے اور بچے بھی ہوں تو بچے دوسری شادی کو قبول نہیں کر پاتے۔ کیا یہ مسئلہ ہمارے این جی اوز کے لیے سوچنے کا نہیں ہے۔ کیا اس کے لیے کوئی نفسیاتی اسکول شروع نہیں کیا جا سکتا؟

اپیل

مکرمی مدیر اعلیٰ

سلام مسنون!

میں ایک سو فیصد سچّی روداد بھیج رہا ہوں۔ یہ صرف لفظی تصویر نہیں ایک سبق ہے۔ اس مادی دنیا کے انسانوں کے لیے جو یہ سمجھتے ہیں کہ یہ دنیا بس ہم تک محدود ہے۔ اگر آپ دیکھیں تو وسیلے کا ایک سلسلہ ہے جو لامحدود ہے۔

محمد سلیم اختر

(راولپنڈی)

یہ ایک اتفاق ہے کہ میرا نام عابد ہے اور میری بیوی کا نام عابدہ۔ اس اتفاق پر ہم دونوں بہت ہی خوش ہوئے تھے اور اب بھی ہیں۔ مجھے شادی کے بعد معلوم ہوا عابدہ کو سماجی بہبود کے کاموں میں حصہ لینے کا بہت شوق ہے۔ وہ اپنی پڑھائی کے دوران ایک دو بار سیلاب زدگان کی امداد کے لیے اسکول کی طرف سے چندہ اکٹھا کرنے کی مہم میں بھی شریک ہوئی تھی۔ تب سے اس کا شوق بڑھ گیا تھا...... اور اب شادی کے بعد بھی وہ اس شوق کو جاری رکھے ہوئے تھی۔

ہماری شادی ہوئے پانچ سال بیت گئے تھے مگر ہم اولاد کی نعمت سے محروم تھے۔ نقص عابدہ میں تھا۔ میں مسلسل اس کا علاج کرا رہا تھا۔ اولاد نہ ہونے کی وجہ سے وہ سماجی بہبود کے سلسلے میں وقت نکال لیتی تھی۔ محلے میں کوئی عورت یا بچہ بیمار ہوجاتا تو وہ ان کے ساتھ اسپتال جاتی۔ کسی لڑکی کی شادی ہورہی ہوتی تو وہ اس کے گھر والوں کا ہاتھ بٹاتی۔ کسی کے بچے بچی کا کوئی اسکول کا مسئلہ ہوتا تو عابدہ وہاں بھی موجود ہوتی۔ کوئی فوتگی ہو جاتی...... تو ان لوگوں کے دکھ میں برابر کی شریک ہوتی۔ محلے کی عورتیں اور بچیاں اسے بہت چاہتی تھیں۔ محلے میں ہر طرف "عابدہ، عابدہ" ہی ہوتی۔ میں دفتر سے واپس آتا تو وہ کم ہی گھر پر ملتی۔ پوچھنے پر امی بتاتیں کہ وہ فلاں کے ساتھ بازار یا اسپتال گئی ہوئی ہے۔ مجھے غصہ تو بہت آتا مگر ضبط کر جاتا کہ وہ نیکی کمانے گئی ہے۔ میں اسے نیکی کے کاموں سے اس لیے منع نہ کرتا تھا کہ وہ اپنی یا میری جیب سے کوئی رقم خرچ نہ کرتی تھی۔ بس وہ نام کی ہمدردی کرتی تھی۔ اس نے آج تک کسی بھی غرض مند کی مالی مدد نہ کی تھی۔ حالانکہ اکثر عورتیں مالی مدد کی غرض سے اس کے پاس آتی تھیں مگر وہ ہر ایک کو بڑی خوبصورتی سے ٹال دیتی تھی۔ میری تنخواہ بھی اتنی نہ تھی کہ میں کسی کی مالی مدد کرتا۔ بس گزارہ ہوجاتا تھا۔

میرا جی چاہتا تھا کہ کسی کی مالی مدد کروں، صدقہ اور خیرات دوں مگر جیب اس کی اجازت نہ دیتی تھی۔ مجھے عابدہ کی بھی ایسی ہمدردی اچھی نہ لگتی تھی۔ میں نے ایک دوبار اسے کہا بھی کہ اس کام کو چھوڑ دو اور گھر کی طرف توجہ دو۔ امی اب بوڑھی ہوگئی ہیں، تم ان کا ہاتھ بٹایا کرو۔ مگر وہ نہ مانی...... اور اپنی نمود کا سلسلہ جاری رکھا...... مگر آہستہ آہستہ مالی مدد نہ ملنے کی وجہ سے عورتیں اس سے دور ہوتی گئیں۔ جب عابدہ نے محسوس کیا کہ محلے میں اس کا وقار کم ہونے لگا ہے تو اس نے شہر کے یتیم خانے میں جانا شروع کردیا۔ میں نے اس کی وجہ پوچھی تو کہنے لگی "میں یتیموں کی حالت زار کا جائزہ لینا چاہتی ہوں۔"

"کیوں نہ ہم یتیم خانے سے کوئی بچہ گود لے لیں؟" میں نے اپنی خواہش کا اظہار کیا۔

"نہیں، ہرگز نہیں...... میں اللہ کی رحمت سے مایوس نہیں ہوں۔ وہ میری گود ضرور ہری کرے گا۔"

اس نے فیصلہ کن لہجے میں کہا تو میں خاموش ہوگیا۔

☆☆☆

ایک دفعہ وہ یتیم خانے گئی تو اس نے دیکھا کہ کچھ بچے ایک پھٹی پرانی کتاب کو ایک دوسرے سے چھیننے کی کوشش کر رہے ہیں اور اس کوشش میں وہ لڑائی اور دھینگا مشتی بھی کر رہے ہیں۔

عابدہ نے ان کو ڈانٹتے ہوئے پوچھا "تم کیوں شور مچا رہے ہو...... اور لڑ بھی رہے ہو۔ شاید تم نہیں جانتے کہ تمہیں اس کی سزا بھی مل سکتی ہے۔"

"بیگم صاحب...... اس نے میری کتاب چھین لی ہے۔" ایک لڑکا دوسرے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔

"یہ جھوٹ بولتا ہے، کتاب اس نے چھینی ہے۔" دوسرا لڑکا چلایا۔

"بالکل غلط...... بیگم صاحبہ! کتاب میرے پاس تھی اور یہ دونوں مجھ سے چھین رہے تھے۔" تیسرا لڑکا روتے ہوئے بولا۔

یتیم خانے کی منتظمہ سے عابدہ نے رابطہ کیا تو اس نے عابدہ کو بتایا کہ یہ لڑائی جھگڑا تو یہاں کا روز کا معمول ہے۔ ان بچوں کو کتابیں پڑھنے کا شوق ہے مگر ہمارے پاس کتابیں کم ہیں اور بچے زیادہ۔

اس بات کا عابدہ پر بہت اثر ہوا۔ مگر واپس گھر آنے تک وہ اس واقعے کو ذہن سے نکال چکی تھی...... پھر بھی اس نے مجھے اس بارے میں بتا دیا۔ میں نے بھی اَن سنی کردی۔

☆☆☆

کچھ دنوں بعد ہمارے پڑوس میں ایک شادی تھی۔ اس شادی میں ہماری یونین کونسل کے چیئرمین ملک صاحب بھی مدعو تھے۔ جب عابدہ کو پتا چلا کہ ملک صاحب بھی آرہے ہیں تو اس نے مجھے اعتماد میں لے کر ملک صاحب سے ملاقات کی...... باتوں باتوں میں عابدہ نے ملک صاحب سے یتیم خانے کی منتظمہ کی شکایت کی اور بچوں کے لیے کتابوں کا ذکر بھی کیا۔

"اچھا!" چیئرمین صاحب بولے "یہ تو افسوس کی بات ہے کہ بے چارے یتیم بچے پڑھنے کا شوق رکھتے ہوئے بھی کتابوں کو ترسیں۔ کیا ہی اچھا ہو کہ ہم یتیم خانے کو کتابیں مہیا کرنے کا بندوبست کردیں۔ ہاں یاد آیا، میں نے اپنے بچوں کے لیے جب وہ چھوٹے تھے تو کہانیوں کی بہت سی کتابیں خریدی تھیں اور شاید اب کسی اسٹور میں پڑی ہوں گی، مگر کون کاٹھ کباڑ میں ان کو ڈھونڈے پھر بھی میں کچھ کروں گا۔"

یہ کہہ کر چیئرمین صاحب چلے گئے اور عابدہ منہ بنائے گھر لوٹ آئی۔

لیکن پھر بھی اسے یقین تھا کہ چیئرمین صاحب کتابوں کا

اپیل ضرور کریں گے، یوں اس کی شان میں بھی اضافہ ہوگا۔

اگلے روز چیئرمین کو ضلعی ناظم سے ملنے جانا تھا۔ ناظم صاحب بھی بہت ہی بھلے مانس تھے۔ ان کی ساری زندگی اپنے ملازموں، یتیموں اور بیواؤں کی فکر میں گزری تھی۔ چیئرمین صاحب نے ان سے یتیم خانے میں کتابوں کی کمی کا ذکر کیا اور بڑے ہی درد بھرے لہجے میں کہنے لگے "میں چاہتا ہوں کہ کہیں سے کتابوں کا بندوبست ہوجائے تو مجھے چین بھی آئے اور میری واہ واہ بھی ہوجائے۔"

"اس میں پریشان ہونے کی کیا بات ہے ملک صاحب!" ناظم صاحب بولے۔ "مجھے کل صبح روزنامہ "ورج" کے دفتر جانا ہے۔ میں ایڈیٹر بخاری سے کہہ دوں گا کہ وہ اس سلسلے میں اخبار میں اپیل شائع کرادے۔"

چیئرمین صاحب مطمئن ہوکر لوٹ آئے۔ اگلے روز جب ناظم صاحب اخبار کے دفتر گئے اور ایڈیٹر صاحب سے اپیل کے سلسلے میں بات کی تو اس نے فوراً ایک رپورٹر کو بلا کر اپیل لکھ ماری...... جس کا مضمون کچھ یوں تھا۔

"یتیم بچے جو قوم کی امانت ہی نہیں، مستقبل بھی ہیں۔ کتابوں کو ترس رہے ہیں۔ کیا آپ ان کی علمی پیاس نہیں بجھائیں گے؟ یقیناً بجھائیں گے...... ان یتیموں کو زیورِ تعلیم سے آراستہ کیجئے۔ ان کو کتابیں دیجئے...... نہ صرف ثواب کمائیں بلکہ جنت میں گھر بھی بنوائیں۔"

☆☆☆

اگلے روز اپیل شائع ہوئی جس میں یتیم خانے کا پتا بھی درج تھا۔ عابدہ نے وہ اپیل پڑھی تو اخبار ساتھ لے کر یتیم خانے چلی گئی۔ پورا دن گزر گیا مگر کوئی بھی شخص کتابیں دینے نہ آیا۔ یوں ہی تین دن گزر گئے۔ عابدہ روزانہ ہی جاتی مگر اداس سی ہوکر لوٹ آتی کہ کسی نے بھی اس اپیل پر کان نہ دھرے تھے۔

پانچویں دن چھٹی تھی۔ لہٰذا میں بھی عابدہ کے ساتھ چل پڑا۔ ہم یتیم خانے کے مین گیٹ پر پہنچے تو دیکھا کہ ایک شخص جس نے پھٹے پُرانے کپڑے پہنے ہوئے تھے، اس کے ساتھ ایک دبلی پتلی لڑکی تھی جس نے پرانی کتابوں کا بنڈل اُٹھا رکھا تھا۔

"تم کون ہو اور کس سلسلے میں آئے ہو؟" عابدہ نے جلدی سے ان سے پوچھا۔

"بیگم صاحبہ! اخبار میں اپیل شائع ہوئی تھی کہ یتیم خانے کے لیے کتابیں چاہئیں۔ ہم گاؤں میں رہتے تھے اس لیے

"عرب" کا لفظ اعراب سے ہے، جس کے معنی گنوار لوگ یا بادیہ نشیں ہے۔ اسلام سے قبل یہ لوگ قبائل کی صورت میں رہتے تھے۔ یہ خانہ بدوش قبائل تہذیب و تمدن کے اصولوں سے ناآشنا تھے اور وہ کسی منظم و منضبط معاشرے کے افراد نہ تھے بلکہ بدوی طرزِ حیات کے عادی تھے۔ اگرچہ شہروں میں بھی لوگ مستقل سکونت پذیر تھے مگر ان کی تعداد بہت قلیل تھی۔

پروفیسر ڈاکٹر فضل کریم کے مضامین سے اقتباس
تلاش: اظہر جمیل صدیقی، کراچی

اخبار دیر سے پڑھا...... ہم یہ کتابیں لائے ہیں۔"

بچی نے کتابوں کا بنڈل عابدہ کی طرف بڑھا دیا۔ اس کے چہرے پر خوشی اور اطمینان کی جھلک تھی۔

"گاؤں میں پرائمری اسکول ہے۔ وہاں سے میں نے پانچ جماعتیں پڑھ لی ہیں۔" اس نے وضاحت بھی کردی۔

"تمہارا نام......؟" عابدہ نے دونوں کو مخاطب کرکے پوچھا۔

"وہ کس لیے بیگم صاحبہ!" لڑکی کا باپ بولا۔

"اس لیے کہ میں اخبار میں اس عطیے کے اعلان کے ساتھ تمہارا اور تمہاری بیٹی کا نام بھی شائع کراؤں گی۔"

"ہمارا نام رہنے دیں...... میں تو ایک معمولی اور غریب آدمی ہوں۔" یہ کہہ کر وہ بچی کی انگلی پکڑے وہاں سے چل دیا۔

میں اور عابدہ ان باپ بیٹی کو دور تک جاتے دیکھتے رہے مجھے "تار" یاد آگیا...... جب ایک طرف سے پیغام دیا گھنٹی کی صورت میں بجایا جاتا تھا اور دوسری طرف سے اسے وصول کیا جاتا تھا...... بالکل ایسا ہی ہوا تھا۔ یتیم خانے کے بچوں نے ایک پیغام دیا تھا، غریب شخص نے وہ پیغام سنا اور اپنا فرض نبھانے چل پڑا۔ باقی لوگ، چیئرمین صاحب اور ناظم صاحب، میں اور عابدہ...... سب کے سب تار کے نظام کے ان کھمبوں کی مانند تھے...... جو صرف پیغام ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچاتے ہیں...... اس کے علاوہ وہ اور کچھ بھی نہیں کرسکتے...... کیونکہ ہم بے جان اور بے حس کھمبے ہی تو ہیں۔

www.Paksociety.com

www.Paksociety.com

بلف

جناب مدیراعلیٰ
السلام علیکم!
میں کوئی رائٹر نہیں ہوں لیکن سرگزشت بڑے شوق سے بڑھتا ہوں۔ دوسروں کی کہانی پڑھتے پڑھتے خیال آیا کہ اپنے ایک دوست کا واقعہ بھی لکھ کر بھیج دوں۔ شاید آپ کو پسند آجائے اور وہ سرگزشت میں جگہ حاصل کرلے۔ دولت خان کا یہ واقعہ سبق آموز ہے اسی لیے بھیج رہا ہوں کہ کوئی اور اس لالچ میں نہ آجائے۔

محمد طفیل
(حیدر آباد)

اس کے والدین نے اس کا نام دولت خان اس لیے رکھا تھا کہ وہ بڑا ہوکر دولت مند بن جائے۔

لیکن جب وہ بڑا ہوا تو دولت خان کے بجائے غریب خان بن گیا۔۔۔ بدنصیب خان بن گیا۔ اس لیے کہ دولت ہمیشہ اس سے دور بھاگتی تھی۔ اس نے جس دھندے میں بھی ہاتھ ڈالا وہ چوپٹ ہوگیا، راس نہیں آیا۔ اس نے جہاں کہیں بھی روپیہ لگایا وہ ڈوب گیا۔ کچھ لوگ ایسے خوش قسمت ہوتے ہیں کہ ان کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ مٹی کو ہاتھ لگاتے ہیں تو وہ سونا بن جاتی ہے لیکن یہاں معاملہ برعکس تھا۔ اس نے سونے کو ہاتھ لگایا تو وہ مٹی بن گیا۔

دولت خان نے بہت سے تلخ تجربوں اور گھاٹا اُٹھانے کے بعد تنگ آکر سوچا کہ اسے دولت کمانے کے لیے کوئی شارٹ کٹ راستہ اختیار کرنا ہوگا۔ کچھ ایسے تجربے اور راستے ہیں جن میں محنت کم ۔۔۔۔۔ اور آمدنی بے پناہ ہوتی ہے اور نقصان کا نام ونشان تک نہیں ہوتا۔ یہی وجہ تھی کہ ایک خاص کام کے پیشِ نظر وہ حیدر آباد سے کراچی آیا تھا۔ کراچی۔۔۔ میں وہ اپنا تابناک مستقبل بنا سکتا تھا۔

اس کا ایک دوست کراچی میں مستقل طور پر رہ رہا تھا۔ اس نے دولت خان کو شہر کی ایک ایسی پارٹی کے سرغنہ کا نام اور پتا بتا دیا تھا جس کی مدد سے کم وقت میں زیادہ سے زیادہ کمانے کا اسے موقع ۔۔۔ مل سکتا تھا۔ اس کا دوست تین برس پیشتر ایک معمولی آدمی تھا۔ کراچی آنے کے بعد امیر کبیر بن گیا۔ اسے ایک شرط پر بتایا تھا کہ وہ پارٹی کا نام اور کاروبار خفیہ رکھے گا۔ اسی میں اس کی سلامتی اور بقا ہے اور فائدہ بھی۔ کیونکہ اس پارٹی کا بزنس ہی ایسا تھا۔ یہ انتہائی خفیہ طور پر ہی کیا جاسکتا تھا۔ اس کے سوا چارہ بھی نہیں تھا۔

دولت خان نے اپنے دوست پر یہ ظاہر کردیا تھا کہ وہ راتوں رات دولت مند بننے کے لیے ہر طرح کے پاپڑ بیلنے کو تیار ہے۔ پھر وہ اپنے دوست سے اس پارٹی کا پتا لے کر سہراب گوٹھ پہنچا تاکہ اس سے سودا طے کیا جائے۔ ابوالحسن اصفہانی روڈ کی ایک عمارت میں جو دو کمروں کا فلیٹ تھا اس میں پارٹی کا قیام تھا۔ دولت خان نے جب اپنے دوست کا خط اسے دیا تو اس نے بڑی گرم جوشی سے دولت خان کو خوش آمدید کہا۔

"آپ کے دوست ریاض مرزا نے فون پر بتا دیا تھا کہ آپ کو دولت کی سخت ضرورت ہے۔" پارٹی نے کہا۔

"جی ہاں۔" دولت خان نے سر ہلا دیا "دولت کی کسے ضرورت نہیں ہوتی، اس کے چکر میں ہی تو کراچی آیا ہوں۔"

"اس سلسلے میں۔۔۔۔۔ ہم آپ کی ہر ممکن مدد کریں گے۔" پارٹی نے جواب دیا "ہم آپ کو ایک ایسا شارٹ کٹ راستہ بتائیں گے جو آپ کو راتوں رات دولت مند بنا سکتا ہے۔ راتوں رات نہ سہی جلد از جلد بنا سکتا ہے۔"

"کیا آپ کے پاس کوئی جادو منتر ہے جس سے میں ایک دولت مند آدمی بن جاؤں؟" دولت خان نے پوچھا۔

"نہیں میرے دوست۔۔۔۔۔ روپیہ ایسے حاصل نہیں کیا جاسکتا۔" پارٹی نے جواب دیا "ایسا ہوتا تو دنیا میں سب سے زیادہ اور بڑے دولت مند جادوگر ہوتے۔۔۔۔۔ اس کے حصول کے لیے محنت اور لگن کی ضرورت ہوتی ہے۔ ہم خود بھی محنت کرتے ہیں اور اس لیے آپ کو بھی مشورہ دے رہے ہیں کہ محنت کریں۔۔۔۔۔ ہم آپ کی مدد کریں گے۔ آپ سے تعاون کریں گے۔ اس میں دونوں کا بھلا ہوگا۔۔۔۔۔ لیکن ایک بات آپ جانتے ہوں گے کہ بغیر بیج کے فصل نہیں اُگتی ہے۔۔۔۔۔ اس لیے آپ کو اچھی فصل کے لیے بیج کی ضرورت ہوگی۔۔۔۔۔ ۔۔۔۔۔ دولت حاصل کرنے کے لیے آپ کو کچھ رقم بیج کے طور پر استعمال کرنا پڑے گی اور کچھ محنت بھی کرنی ہوگی۔"

"مجھے کیا کرنا ہوگا؟" دولت خان نے اسے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

"سنیے۔۔۔۔۔ میں تفصیل سے سب کچھ بتاتا ہوں۔" وہ کہنے لگا "ہماری کمپنی کو آپ جیسے ہی ضرورت منداور باحوصلہ لوگوں کی ضرورت ہے۔ ہم آپ پر اعتماد کریں گے اور آپ ہم پر کریں گے۔ دراصل ہماری کمپنی جعلی نوٹ کا دھندا کرتی ہے۔ پریشان ہونے کی قطعی ضرورت نہیں، ہمارا طریقہ کار ایسا ہے کہ کوئی شخص یہ شناخت نہیں کرسکتا کہ نوٹ اصل نہیں ہیں۔ ہوشیار سے ہوشیار آدمی بھی انہیں پہچان نہیں سکتا۔۔۔۔۔ اس کام میں تھوڑا بہت جوکھم تو ہے لیکن اس میں جو

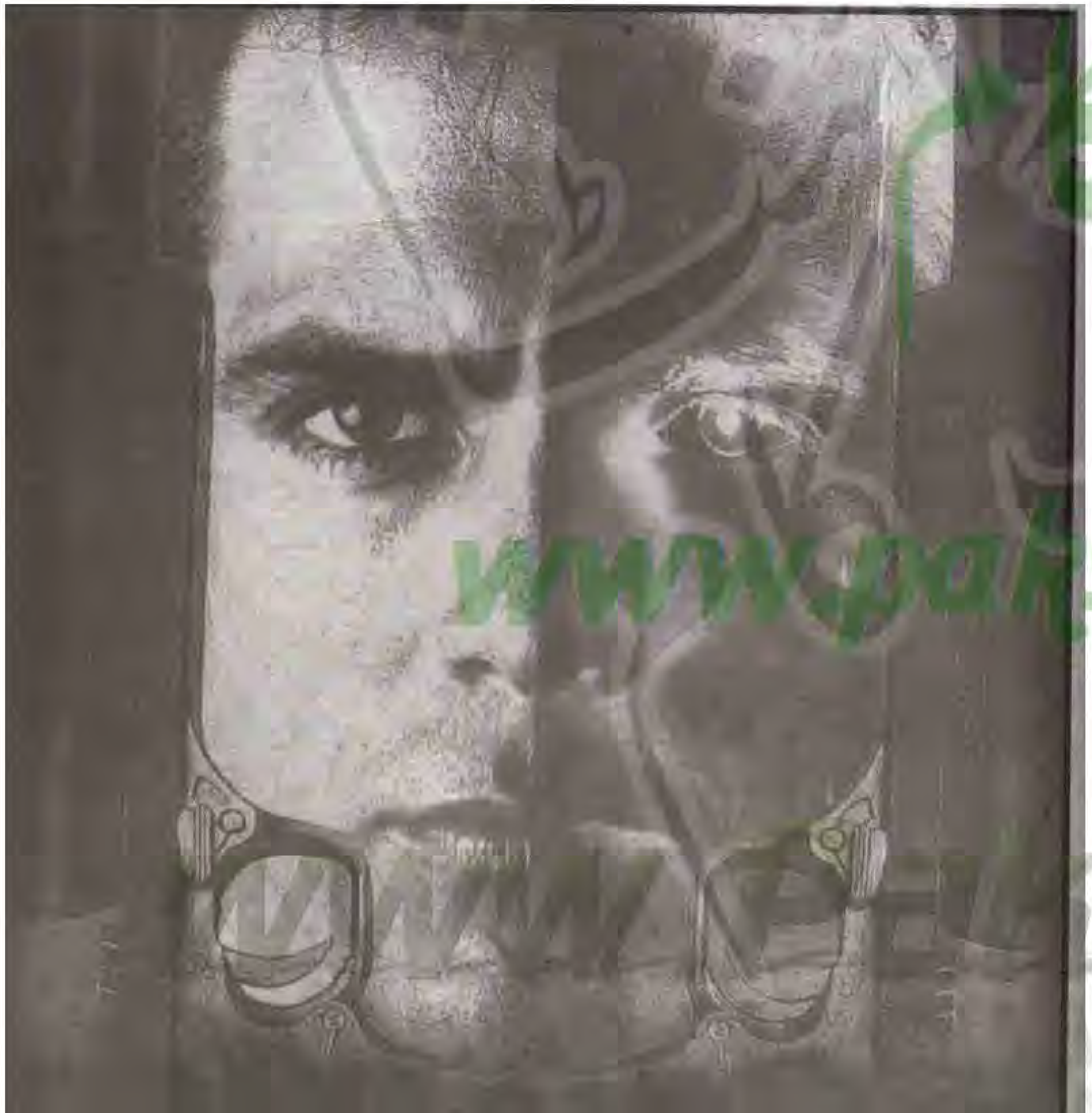

www.paksociety.com

منافع کی شرح ہے وہ کسی کاروبار میں نہیں ہے۔ آپ سے صرف بیس ہزار کی رقم لے کر ہم اس کے بدلے آپ کو ایک لاکھ روپے کے جعلی نوٹ دیں گے۔ میں آپ کو پھر یقین دلاتا ہوں کہ نوٹ ایسے ہیں کہ کوئی بھی انہیں جعلی سمجھ نہ سکے گا۔ آپ ہمیں صرف بیس ہزار روپے دیں گے اور ہم آپ کو ایک لاکھ روپے دیں گے...... آپ کو اسی ہزار روپے کا کھلا منافع ہوگا...... آپ کا کام یہ ہوگا کہ احتیاط سے ہمارے نوٹ نکال دیں۔ ذرا سی ہوشیاری اور محنت سے آپ اتنا بڑا منافع کما لیں گے...... ایک بار پھر میں یہ بات دُہرا دوں کہ ہمارے نوٹ بالکل سرکاری نوٹ جیسے ہوں گے۔"

کچھ دیر اور ان کے درمیان تفصیلی گفتگو ہوئی اور پھر سودا طے ہوگیا۔ دولت خان کو اس کے دوست نوازش نے یہ اسکیم بتائی تھی۔ اب سب کچھ طے ہو جانے کے بعد دولت خان کو بیس ہزار کی رقم لے کر طے کی ہوئی جگہ جانا تھا جہاں اسے ایک لاکھ روپے کے جعلی نوٹ ملنے تھے۔

☆☆☆

کچھ دن بعد دولت خان ایک درمیانہ سا بریف کیس لے کر پہلے سے طے کی ہوئی جگہ پر پہنچ گیا تھا۔ رات کے آٹھ بجے اس نے اس مکان کا دروازہ ایک مخصوص انداز سے کھٹکھٹایا۔ دروازہ کھلتے ہی وہ اندر گھس گیا۔ پارٹی کے دو آدمی وہاں پہلے سے موجود تھے۔ تھوڑی دیر تک بات چیت ہوئی پھر دولت خان نے اپنا بریف کیس آگے کی طرف بڑھا دیا اور چابی سامنے والے آدمی کے حوالے کردی۔ کوڈ نمبر سے بریف کیس مقفل کرنے کے لیے منع کیا ہوا تھا۔ پھر پارٹی کے آدمی نے بریف کیس دولت خان کی طرف بڑھایا اور چابی بھی سونپ دی۔ دولت خان نے بریف کیس کھول کر دیکھا۔ اندر ہزار اور پانچ سو کے نوٹوں کی گڈیاں تھیں۔ جیسے ہی دولت خان بریف کیس بند کرنے لگا، سامنے والے شخص نے کہا۔

"نہیں...... میرے دوست نہیں، اس طرح نہیں...... احتیاط ضروری ہے۔ جس طرح ہم نے آپ کی رقم گنی...... اسی طرح آپ بھی ہماری رقم کی گنتی کریں۔ ہم دونوں اپنے اپنے دھندے میں ایماندار ہیں لیکن پھر بھی ہمارا اصول ہے کہ احتیاط بہتر ہے...... میں نے آپ کی رقم گن کر دیکھ لی...... لہٰذا آپ بھی ہماری رقم گن کر تسلی کر لیں۔"

دولت خان کو پورا پورا بھروسا تھا کہ اس طرح کے سودوں میں بے ایمانی نہیں ہوتی...... ان کے دلوں میں کھوٹ نہیں ہوتی، بے ایمانی کرنے کی صورت میں ان کا کاروبار چل نہیں سکتا۔ اس کا دل رقم گننے کو نہیں چاہ رہا تھا لیکن سامنے والے آدمی کے اصرار پر اسے گننا پڑا۔ اس نے ہزار کے نوٹوں کا ایک بنڈل اُٹھایا اور اسے گنا۔ پچیس ہزار، پچیس ہزار کے دو بنڈل تھے۔ اسی طرح پانچ پانچ سو کے بنڈل بھی بنائے ہوئے تھے لیکن تمام نوٹوں کے بنڈل نئے نہیں تھے۔ ان میں پُرانے نوٹ بھی تھے۔ جب وہ ان پُرانے نوٹوں کو دیکھنے لگا تو اس شخص نے کہا۔

"ہم ہر لحاظ سے محتاط رہتے ہیں...... ایک تو تمام نوٹ نئے نہیں رکھتے............ ان میں کچھ میلے کر دیتے ہیں...... کچھ میں سلوٹیں ڈال دیتے ہیں تاکہ کسی کو شبہ نہ ہو...... دوسری اہم بات یہ ہے کہ ہم نوٹوں کے نمبروں کی ایک یا دو سیریز ایک ساتھ نہیں رکھتے...... بلکہ مختلف سیریز کے نوٹ گڈی میں رکھتے ہیں...... ایسا کرنے میں تھوڑی بہت محنت تو کرنی پڑتی ہے، اس لیے ایسا کرنے میں ہم ایک بہت بڑی مصیبت سے بچ جاتے ہیں، پھر کسی بات کا کوئی خطرہ لاحق نہیں رہتا۔"

دولت خان نے تمام رقم گننے کے بعد بریف کیس بند کر دیا اور اسے مقفل کر کے چابی جیب میں رکھ لی۔ پھر ان دونوں نے ایک دوسرے سے گرم جوشی سے مصافحہ کیا اور الوداع کہا۔ پھر دولت خان جعلی نوٹوں سے بھرا بریف کیس لیے گلیوں سے گزرنے لگا۔ اس کے دل میں نہ جانے کیا آیا۔ اس نے ایک جگہ رک کر بریف کیس کھول کر اس میں سے ہزار کے پچیس نوٹوں کی گڈی نکال کر کریں اُڑس لی۔ پھر اس نے بڑی سڑک پر جانے سے گریز کیا۔ اسے رکشا یا ٹیکسی کی تلاش تھی اس لیے وہ ایک ڈبل روڈ پار کر کے پوسٹ آفس کے پاس آیا۔ وہاں بھی اسے کوئی سواری نہیں ملی پھر اس کی چھٹی حس نے بتایا کہ کوئی اس کے تعاقب میں ہے۔ اس کے ہاتھ میں چونکہ بریف کیس تھا اس لیے شاید کوئی بدمعاش اس کے تعاقب میں لگ گیا تھا۔ یوں بھی یہ علاقہ جرائم پیشہ افراد کا تھا۔ یہاں منشیات فروخت ہوتی تھی۔ اسلحہ بھی ملتا تھا۔ کرایہ پر اور قیمتاً بھی۔ جیب کترے بھی ہوتے تھے۔ شریف قسم کے لوگ یہاں دن کے وقت بھی گزرتے ہوئے ڈرتے تھے۔ اس کے علاوہ یہاں قحبہ خانے بھی تھے، شراب اور شباب بھی دستیاب تھی اس خیال سے کہ کوئی بدمعاش اس کے تعاقب میں ہے اس کے سارے جسم میں سنسنی دوڑ گئی۔ اس نے فیصلہ کرلیا کہ بدمعاش نے چاقو یا پستول دکھا کر بریف کیس چھیننے کی کوشش کی تو وہ بریف کیس اس کے سر پر دے مارے گا۔ بریف کیس قدرے بھاری بھی تھا، پھر اس نے پلٹ کر دیکھا۔ وہ بدمعاش نہ تھا بلکہ ایک پولیس والا تھا۔

اس نے تیز تیز قدم اُٹھا کر چلنا شروع کر دیا۔ اس نے

تیس چالیس قدموں کی مسافت طے کی ہوگی کہ عقب سے ایک تیز آواز گونجی۔

"ٹھہرو...... رک جاؤ۔"

دولت خان نے دھڑکتے دل سے مڑ کر دیکھا۔ وہی دراز قد پولیس والا تیزی سے لپکتا ہوا اس کی طرف آ رہا تھا۔ وہ چاہتا تو بھاگ کر کسی گلی میں گھس جاتا لیکن پولیس والا بھی اس کا پیچھا کر کے پکڑ لیتا دوسرا مشکوک ہو جاتا اس لیے دولت خان رک گیا۔

چند لمحوں کے بعد وہ تین آدمیوں کے نرغے میں تھا۔ ایک پولیس والا تھا۔ باقی دوسرے دو جو تھے، نہ جانے کہاں سے آ گئے تھے۔ شاید وہ پہلے والے سپاہی کے پیچھے تھے۔ وہ نیم تاریکی کے باعث انہیں دیکھ نہ سکا تھا۔ صرف ایک سپاہی وردی میں تھا۔ باقی دونوں سادے لباس میں تھے۔ ان کی وضع قطع بدمعاشوں جیسی تھی۔ یوں بھی پولیس والوں کی وضع قطع اور ان کے چہرے مہرے اور مونچھیں ڈاکوؤں کے جیسی ہی تھیں۔ وہ ڈاکو ہی لگتے تھے۔ ان میں سے ایک کے ہاتھ میں پلاسٹک بیگ تھا، دوسرے کے ہاتھوں میں پولیس والا ڈنڈا تھا۔

"ہم لوگوں کا تعلق پولیس سے ہے...... اس علاقے کے تھانے کے سپاہی ہیں۔" ایک نے کہا جو سادے لباس میں تھا "اس علاقے میں منشیات کا دھندا ہوتا ہے...... شاید تم ہیروئن اس بریف کیس میں بھر کے فروخت کرنے جا رہے ہو، ہم بریف کیس کی تلاشی لیں گے۔"

دولت خان کے جسم میں خوف کی لہر دوڑ گئی اور اس کی رگوں میں لہو منجمد ہونے لگا اس کی پیشانی عرق آلود ہو گئی۔ تاہم اس نے ہمت یکجا کر کے کہا "دیکھیے...... میں ایک شریف آدمی ہوں...... میرے پاس نہ تو ہیروئن ہے اور نہ ہی چرس۔ آپ کو خواہ مخواہ شک ہو رہا ہے۔"

اس کی بات کے جواب میں ایک زناٹے دار تھپڑ اس کے منہ پر پڑا تو اس کا دماغ جھنجھنا گیا۔ اسے چھٹی کا دودھ یاد آ گیا۔ وہ بُری طرح بوکھلا گیا اور اس کے ہاتھ سے بریف کیس چھوٹتے چھوٹتے بچا، اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

"اس علاقے میں کوئی شریف آدمی نہیں آتا۔" تھپڑ مارنے والے نے کہا "اس علاقے میں اسمگلر، منشیات فروش، اسلحہ فروش اور جرائم پیشہ رہتے ہیں...... یہاں وہ لوگ آتے ہیں جنہیں ڈکیتی کی وارداتیں کرنی ہوتی ہیں اور اسلحہ کرائے پر لے جاتے ہیں۔"

"آپ میری بات کا یقین کیوں نہیں کرتے کہ میں یہاں کسی غلط کام سے نہیں آیا ہوں۔" وہ اپنا گال سہلاتے ہوئے بولا۔

ڈنڈا بردار نے اس کی کمر پر ڈنڈا رسید کرتے ہوئے کہا "تھانے چلو...... وہاں چل کر معلوم ہو جائے گا کہ تم کتنے شریف ہو۔"

تھانے کا نام سنتے ہی دولت خان کے ہوش اُڑ گئے۔ اس نے دل میں سوچا کہ بہت بُرے پھنسے۔ لینے کے دینے پڑ رہے ہیں۔ کاش! اس نے یہ سب کچھ پہلے سوچ لیا ہوتا۔ یہ علاقہ واقعی بدنام اور جرائم پیشہ لوگوں کا تھا۔ اس نے رات کے وقت یہاں آ کر کتنی بڑی حماقت کی لیکن وہ کیا کرتا۔ پارٹی نے اس سے کہا تھا کہ رات کا وقت ہی موزوں رہے گا اس لیے وہ چلا آیا تھا۔

وہ تینوں اسے تھانے کے ایک کمرے میں لے آئے جس میں تین چار کرسیاں اور ایک میز تھی۔ پھر ڈنڈا بردار نے کہا۔

"اب تم بتاؤ کہ کتنے شریف ہو؟ بریف کیس کھول دو۔ بریف کیس دیکھ کر تمہاری شرافت کا اندازہ ہو جائے گا۔"

"بریف کیس میں نے کوڈ نمبر سے مقفل کیا ہوا ہے۔" اس نے بہانہ بازی کی "اس کا کوڈ نمبر یاد نہیں آ رہا ہے، بھول گیا ہوں۔"

"لاتوں کے بھوت باتوں سے نہیں مانتے۔" وردی والے سپاہی نے کہا "ہم تو چھٹی کا دودھ یاد دلا دیتے ہیں، کوڈ نمبر کیا ہے؟"

اس نے اتنا کہہ کر دولت خان پر تھپڑوں کی بارش کردی۔ اس کے منہ سے خون نکل آیا "اب یاد آیا......؟"

دولت خان نے سوچا کہ اس کی سلامتی اسی میں ہے کہ وہ ان کی بات مان لے ورنہ وہ اسے جان سے مار کر اس کی لاش کسی ویرانے میں پھینک دیں گے۔ پولیس تشدد کر کے قیدیوں اور بے گناہوں کو مار دیتی ہے۔ ان پر آنچ نہیں آتی، قانون کے ہاتھوں سے یہ کہہ کر بچ نکلتے ہیں کہ...... ملزم دل کا مریض تھا، اس پر اچانک دل کا دورہ پڑا تھا جو جان لیوا ثابت ہوا تھا۔

ڈنڈا بردار سپاہی، ڈنڈا لہراتا ہوا اس کی طرف بڑھا تو دولت خان نے اسے ہاتھ کے اشارے سے روکتے ہوئے پھولی سانسوں کے درمیان کہا "ایک منٹ...... ایک منٹ...... میرے پاس اس کی چابی ہے، ابھی بریف کیس کھولتا ہوں۔"

اس کے سوا چارہ نہیں...... تھا کہ وہ بریف کیس کھول دے۔ اس نے جیب سے چابی نکال کر دل پر جبر کر کے بریف کیس کھول کر میز پر ان کے سامنے رکھ دیا پھر وہ جیب

سے رومال نکال کر ہونٹوں سے خون صاف کرنے لگا۔

بریف کیس میں نوٹوں کے بنڈل دیکھ کر ان کی آنکھوں میں ایک سنسنی خیز چمک اُبھر آئی ۔ وردی پوش سپاہی نے استہزائیہ لہجے میں کہا۔

''اچھا تو یہ معاملہ ہے.....؟ ہیروئن خریدنے آئے تھے تاکہ کسی امریکی یا یورپی سیاح کے ہاتھ فروخت کردو۔''

''جی نہیں.....'' دولت خان نے نفی میں سر ہلایا'' میں منشیات فروشی نہیں کرتا، میرا کسی سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ میں ایک سیدھا سادا بزنس مین ہوں۔''

ان میں سے تیسرے آدمی جس نے اس کی خاطر تواضع کی تھی، اس نے دولت خان کے ایک اور تھپڑ رسید کرنے کے بعد کہا۔

''جتنے منشیات فروش ہیں وہ اپنے آپ کو اسمگلر یا منشیات فروش تھوڑی کہتے ہیں...... وہ بزنس مین کہتے ہیں۔ ہمیں اس بات سے کب انکار ہے کہ تم تاجر نہیں ہو..... آپ تو جناب......!'' اس کا لہجہ طنزیہ ہوگیا'' بین الاقوامی بزنس مین ہیں۔ انٹرنیشنل بزنس مین..... تاجروں کے تاجر، بہت بڑے تاجر۔''

اس کی بات سن کر اس کے ساتھی ہنسنے لگے۔ وردی والا سپاہی بولا'' یار پپو! تم نے بالکل صحیح ارشاد فرمایا۔''

ڈنڈا بردار نے ہنستے ہوئے کہا'' سنو بے..... اپنی جان کی امان چاہتے ہو تو سب کچھ سچ سچ اُگل دو..... ورنہ ہمیں وہ سب طریقے آتے ہیں کہ بے زبان جانور کیا..... مردے بھی بول اٹھتے ہیں اور اُگل دیتے ہیں، تمہارا باپ بھی قبر سے آ کر بتا دے گا۔''

''یار، اتنی باتیں کرنے اور سمجھانے کی کیا ضرورت ہے؟'' وردی پوش سپاہی بولا'' ذرا اس بزنس مین کو ہمارا ایک سیمپل تو دکھا دو۔''

''ایک منٹ...... پلیز، ٹھہرو...... میں بتاتا ہوں کہ اصل بات کیا ہے؟ سختی اور تشدد کرنے کی ضرورت نہیں۔ بات یہ ہے کہ میرے اس بریف کیس میں جو رقم ہے وہ جعلی نوٹ کی شکل میں ہے۔ میں نے بیس ہزار روپے میں ایک لاکھ روپے خریدے ہیں۔''

''واہ... پتر! تُو تو استادوں کا بھی استاد نکلا..... تُو تو بہت بڑا مجرم ہے۔ یار بٹ! رجسٹر لاؤ اور اس کے خلاف کیس درج کرو۔''

دولت خان گڑگڑانے اور منتیں کرنے لگا۔ وردی پوش نے رجسٹر لا کر اس کا بیان قلم بند کیا۔ دولت خان نے دیکھا کہ اتنے میں ایک چپراسی چائے وغیرہ رکھ کر چلا گیا۔ دولت خان بُری طرح پھنس گیا تھا۔ ایک سپاہی اور دوسرا ہزار اور پانچ سو کے نوٹوں کی گڈی، بریف کیس سے نکال کر چائے پیتے ہوئے نوٹ گننے لگے تو دولت خان کو فرار کی ایک تدبیر سوجھی۔ اس نے دھڑکتے دل سے پوچھا۔

''واش روم کدھر ہے؟ بڑے زور کا پیشاب لگا ہے۔''

وردی پوش سپاہی نے بے پروائی سے باہر کی طرف اشارہ کیا'' گیٹ کے پاس واش روم ہے۔''

دولت خان کو امید نہیں تھی کہ اسے اکیلے جانے دیا جائے گا، وہ لڑکھڑاتے قدموں سے واش روم میں پہنچا۔ اس نے دیکھا کہ ان تینوں میں سے کوئی اسے نہیں دیکھ رہا تھا۔ اس نے موقع غنیمت جانا، احاطے سے باہر آ کر وہ ایک سمت بگٹٹ بھاگا۔ اس نے بہت دور آنے کے بعد پلٹ کر دیکھا، کوئی اس کے تعاقب میں نہیں تھا۔ پھر اس نے تاریک گلی سے مین روڈ پر آ کر ایک رکشا روکا اور اس سے بولا'' الاعظم پہنچا دو، جہاں حیدرآباد جانے والی بسوں کا اڈا ہے۔''

حیدرآباد پہنچ کر اسے یاد آیا کہ پچیس ہزار کی گڈی تو کمر میں اُڑسی ہوئی ہے۔ اس نے نکال کر جیب میں رکھی اور میرے گھر آنے کے لیے رکشے میں بیٹھ گیا۔ جب مجھے اس نے خود پر گزری سنائی تو میں نے کہا'' لالہ! تم بہت بڑے خطرے سے نکل آئے ہو۔''

''وہ کیسے؟'' اس نے پوچھا۔

''یہ کام بہت ہو رہا ہے۔ ابھی میرے ایک اور دوست کے ساتھ بھی ایسا ہی واقعہ ہوا ہے۔''

''کیسا واقعہ؟'' اس نے سوالیہ انداز میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''وہ نقلی پولیس والے ہوتے ہیں۔ سب کچھ پری پلان ہوتا ہے۔ یہ دیکھو اخبار۔'' یہ کہہ کر میں نے ایک پُرانا اخبار ڈھونڈ کر وہ خبر نکالی اور اخبار اس کے سامنے رکھ دیا۔ خبر میں پکڑے گئے مجرموں کا بیان تھا کہ وہ لوگ اصلی نوٹ ہی دیتے ہیں پھر نقلی پولیس جا کر انہیں ایک نقلی پولیس چوکی میں لے آتی ہے جہاں سے خریدار کو فرار کرا دیتے ہیں۔''

''او یارا، یہ تو بہت خراب زمانہ آ گیا ہے۔'' دولت خان نے کہا۔

''واقعی زمانہ بڑا خراب آ گیا ہے۔ باپ پر بھی بھروسا نہیں کیا جا سکتا۔ اب تم یہیں رہو۔ حیدرآباد میں بہت سے کام ہیں۔ یہیں نوکری تلاش کر لو۔'' میں نے مشورہ دیا۔

محترمہ عذرا رسول صاحبہ

السلام علیکم!

یہ دنیا ایک ایسا اسٹیج ہے جس پر ہم سب اداکاری کیے جارہے ہیں۔ مگر کچھ لوگ انتہائی منفرد اداکاری بھی کرتے ہیں جو عام آدمی کے بس کی بات نہیں، تبھی تو وہ انفرادی تشخص حاصل کرلیتے ہیں۔ اب یہی دیکھیں، میرے دوست کے ساتھ جو کچھ ہوا، کیا عام طور پر ایسا ہوتا ہے؟ اسی لیے میں نے اس واقعے کو لکھا ہے تاکہ دوسرے لوگ عبرت حاصل کریں۔

انصار حسین

(کراچی)

یہ کہانی میرے ایک دوست فرقان اسلم کی ہے اور اس نے یہ کہانی نہ صرف مجھے سنائی ہے بلکہ میں اس کا چشم دید گواہ بھی ہوں۔

میرا خیال ہے کہ ایسا واقعہ پاکستان کے کسی حصے میں بھی کسی کے ساتھ پیش نہیں آیا ہوگا، آپ چاہیں تو اسے غلط سمجھ سکتے ہیں۔ بہتر یہی ہے کہ آپ یہ منفرد انداز کی کہانی خود اسی کی زبانی سن لیں۔

''مجھے یہ اندازہ نہیں تھا کہ اس کے اتنے بھائی بھی ہو سکتے ہیں۔ ایک دن وہ مجھے اپنے گھر لے گئی تھی جہاں اس کے بھائیوں سے ملاقات ہوئی وہ کل ملا کر نو تھے۔

اور سب کے سب انتہائی کیم شحیم خطرناک انداز کے،

www.Paksociety.com

ایسا لگتا تھا جیسے مار دھاڑ ان کی شخصیت میں شامل ہو۔ پتا چلا کہ ان لوگوں نے اپنے گھر کے آنگن میں ایک اکھاڑہ بنا رکھا تھا جس میں صبح شام ورزش بھی کیا کرتے اور شام کے وقت مارشل آرٹ کی ٹریننگ بھی لیتے تھے۔

میں جس لڑکی کی بات کر رہا ہوں۔ اس کا نام شہناز ہے۔

میں نے اسے ایک مارکیٹ میں دیکھا تھا۔ وہ ایک دکان سے سبزیاں خرید رہی تھی۔ میں نے اسے دیکھا اور دیکھتا ہی رہ گیا۔ کیا حسن تھا اس کا۔ رنگ گرچہ زیادہ صاف نہیں تھا لیکن اس کے چہرے پر بلا کی ملاحت تھی۔ ایسی کشش بہت کم دیکھنے میں آتی ہے۔

میں اس دکان سے کچھ فاصلے پر کھڑا ہوا اس کی طرف دیکھتا رہا۔ اس نے بھی یہ اندازہ لگا لیا تھا کہ میں اس کی طرف متوجہ ہو رہا ہوں اسی لیے اس کے چہرے پر ناگواری کے تاثرات تھے۔

پھر یہ ہوا کہ وہ جب سودا خرید کر جانے لگی تو ایک مناسب فاصلے سے میں نے بھی تعاقب شروع کر دیا۔ نہ جانے کیوں میں اس کے لیے پاگل ہی ہو گیا تھا یا شاید محبت اسی کو کہتے ہیں کہ انسان بے بس ہو کر رہ جاتا ہے۔ اس لڑکی نے مجھے بے بس کر دیا تھا۔

وہ پیدل ہی ایک طرف جا رہی تھی اور میں اس کا تعاقب کر رہا تھا۔ اپنے انجام سے بے خبر کوئی طاقت تھی جو مجھے اس کی جانب کھینچ رہی تھی۔

پھر وہ ایک مکان میں داخل ہو گئی اور میں باہر کھڑا اس مکان کی طرف دیکھتا رہا، کچھ دیر بعد میں وہاں سے واپس آ گیا جہاں میں نے اپنی گاڑی کھڑی کی تھی (واضح رہے کہ میرا یہ دوست خوش حال انسان ہے)

رات بھر میں اس کے بارے میں سوچتا رہا اور دوسرے دن اپنی گاڑی لے کر اس کے مکان کے سامنے پہنچ گیا۔ میں یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ اس کے معمولات کیا ہیں۔ وہ کس وقت گھر سے نکلتی ہے۔ کہاں جاتی ہے، کس وقت واپس ہوتی ہے وغیرہ وغیرہ۔

مجھے زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا تھا۔ کچھ دیر بعد وہ گھر سے نکلی تھی اور اس بار بھی اکیلی ہی تھی اور اس کا رُخ مارکیٹ ہی کی طرف تھا۔

جب وہ خاصا آگے بڑھ گئی تو میں آہستہ آہستہ گاڑی اس کے قریب لے گیا۔ اس نے گاڑی کی آواز پر مڑ کر میری طرف دیکھا اور اس کی بھنویں تن گئیں۔ اس نے اپنی رفتار کر دی۔ وہ کترا کر ایک طرف نکل گئی تھی۔

بہرحال کئی دنوں تک یہی ہوتا رہا۔

کہا جاتا ہے کہ مسلسل جدوجہد سے پتھر بھی پگھل جاتے ہیں تو اس کی برف بھی پگھلنے لگی اور ایک دن اس نے مجھے مسکرا کر دیکھ لیا۔ اب میں اس ملاقات کی داستان کو طول نہیں کروں گا۔ بس اتنا جان لیں کہ ہم ایک دوسرے سے ملنے لگے تھے۔

پہلے ہی دن میں اسے ایک شاندار ہوٹل میں لے گیا جہاں اس نے مجھے اپنے بارے میں بتایا۔ ”میرا نام شہناز ہے۔“

”اور میں فیصل ہوں۔“ میں نے اپنا تعارف کروایا۔

”کیا کرتے ہیں آپ؟“

”پہلے تم بتاؤ۔ تم کیا کرتی ہو۔“

”میں پرائیویٹ بی اے کر رہی ہوں۔“ اس نے بتایا ”ویسے آپ بہت ضدی اور دھن کے پکے انسان ہیں۔“

”وہ کس طرح؟“

”آپ نے کسی نہ کسی طرح مجھے گھیر ہی لیا۔“ اس نے کہا۔

”نہیں شہناز میں نے تمہیں نہیں بلکہ تم نے مجھے گھیرا ہے۔ میں نے جب پہلی بار تمہیں دیکھا تو پہلی نظر میں ہی بے بس ہو گیا تھا۔“

”آپ یقین کریں گے یہی میرا حال ہوا تھا۔“

مجھے دنیا کی شاید سب سے بڑی خوشی مل گئی تھی۔ محبت حاصل ہو جائے تو یہی کیفیت ہوا کرتی ہے۔ انسان بادلوں میں پرواز کرنے لگتا ہے۔ وہ اپنے آپ کو سکندر اعظم محسوس کرتا ہے۔ جس نے آدھی دنیا فتح کر لی ہو۔

میں سکندر اعظم ہی تو تھا جس نے شہناز جیسی لڑکی کی محبت اور توجہ حاصل کر لی تھی۔ اب ہم تقریباً روزانہ ملا کرتے تھے۔ اس کے ساتھ سب سے اچھی بات یہ تھی کہ اسے جب بلاتا وہ فوراً چلی آتی۔ اکثر ہم رات گئے تک گھومتے رہتے۔ ایسا لگتا تھا جیسے اس پر کوئی پابندی نہ ہو۔

ایک دن جب میں نے دریافت کیا تو اس نے جواب دیا۔ ”کس بات کی پابندی! گھر والوں کو مجھ پر بہت بھروسا ہے۔ بس اور کیا چاہیے۔“

ایک شام اس نے کہا۔ ”آج مجھے ایک شرٹ چاہیے۔ مردانہ۔“

”وہ کیوں؟“

”بھائی کو دینا ہے۔“ اس نے بتایا۔ ”اس کی برتھ ڈے ہے۔“

”چلو ابھی دلوائے دیتا ہوں۔“

میں اسے لے کر ایک اسٹور میں آ گیا۔ یہاں اس نے کہا۔ ”فیصل ایک شرٹ لے گئی تو دوسرے بھائی ناراض ہو جائیں گے مجھے نو شرٹ لینی ہوں گی۔“

”نو۔“ میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ ”نو شرٹس کی کیا ضرورت ہے؟“

”اس لیے کہ میرے نو بھائی ہیں۔“ اس نے مسکراتے ہوئے بتایا۔

میں بے ہوش ہوتے ہوتے بچا تھا۔ ”نو بھائی۔“

”ہاں صرف نو۔“ اس نے کہا۔ ”اور میں نے انہیں تمہارے بارے میں سب کچھ بتا دیا ہے۔“

”یہ کیا غضب کیا تم نے؟“

”کچھ بھی نہیں ہوا۔ وہ سب بھائی بہت کھلے ذہن کے ہیں۔ میں نے تمہارے بارے میں انہیں سب کچھ بتا دیا ہے وہ میری خوشی کے لیے سب کچھ کر گزرنے کو تیار ہیں۔ خود سوچو جس طرح تمہارے بلانے پر میں گھر سے بے دھڑک نکل آتی ہوں کوئی اور ہوتی تو آ سکتی تھی۔“

”ہاں یہ بات تو ہے۔“

”اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ سب میری خوشی میں خوش ہیں اس لیے تمہیں مدعو بھی کیا ہے کل چلنا ہے تمہیں۔“

بہرحال میں اس کے گھر پہنچ گیا جہاں اس کے نو بھائی موجود تھے اور سب کے سب انتہائی خطرناک قسم کے باڈی بلڈر جن کو دیکھ کر میرے ہوش اُڑ گئے تھے۔

”دیکھو بھائی۔“ سب سے بڑے بھائی نے مجھے مخاطب کیا۔ ”یہ جو ہماری بہن ہے نا۔ یہ ہم سب کی لاڈلی ہے، بہت پیار ہے ہمیں اس سے، اس لیے اس کو کبھی دکھ مت دینا۔“

”سوال ہی نہیں پیدا ہوتا جناب۔ میں اس سے بے پناہ محبت کرتا ہوں۔“

”اگر اس کی آنکھ میں آنسو آئے تو میں تمہاری گردن اُڑا دوں گا۔“ ایک اور بھائی نے اپنے بازوؤں کی نمائش کرتے ہوئے کہا۔

”آپ لوگ میری طرف سے بے فکر رہیں میں اسے پھولوں کی طرح رکھوں گا۔“

اس کے بعد کچھ دیر تک آپس میں باتیں ہوتی رہیں پھر وہ سارے بھائی ورزش کے اکھاڑے کی طرف چلے گئے۔ ان کے جانے کے بعد شہناز نے پوچھا۔ ”دیکھ لیا نا، میرے بھائی جان دینے والے ہیں۔“

”جان لینے والے بھی دکھائی دیتے ہیں۔“ میں نے کہا۔ ”ویسے اس بات کی خوشی ہوئی کہ یہ سب تم سے اتنی محبت کرتے ہیں۔“

”خود پریشانیاں برداشت کر لیں گے لیکن مجھے پریشان نہیں ہونے دیتے۔“

اس کے بعد یہ ہوا کہ ایک طرف تو شہناز سے میرا تعلق اور بھی گہرا ہو گیا تھا اور دوسری طرف میرے اخراجات میں بے پناہ اضافہ ہو گیا تھا۔

میں شہناز کے لیے کچھ خریدتا تو اسے اپنے بھائی یاد

جن ایک ایسی مخلوق ہے جس کا مادۂ تخلیق آگ ہے۔ یہ مخلوق انسانوں کی نگاہ سے پوشیدہ رہتی ہے۔ جن کے معنی ڈھانپنا اور پوشیدہ کرنا ہیں لہٰذا اس مادہ سے جو لفظ آتے ہیں ان میں پوشیدگی کے معنی پائے جاتے ہیں چنانچہ جنین اس بچہ کو کہتے ہیں جو ماں کے پیٹ میں ہو اور قبر کو بھی کہتے ہیں، جنۃ گھنے باغ کو کہتے ہیں جو زمین کو ڈھانپ لے۔ جنون اور جنۃ اس بیماری کو کہتے ہیں جو عقل کو پوشیدہ کر دے وغیرہ۔

قرآن حکیم میں جن کا استعمال کبھی انس کے مقابلے پر ہوتا ہے اس صورت میں اس سے مراد ہر روحانی مخلوق ہوتی ہے خواہ وہ فرشتے ہیں یا شیطان ہوں یا جن۔ بعض مفسرین کے نزدیک تمام فرشتے بھی جن ہیں۔ علما نے روحانی مخلوق کی تین قسمیں بیان کی ہیں۔ نمبر ایک وہ جو نیک ہی نیک ہیں اور وہ فرشتے ہیں۔ نمبر 2 وہ جو بد ہی بد ہیں اور وہ شیطان ہیں اور تیسرے وہ جن میں نیک بھی ہیں اور بد بھی اور وہ جن ہیں۔ لیکن شیطانوں اور جنات کا مادۂ تخلیق آگ ہے مگر فرشتوں کا مادۂ تخلیق نور ہے۔ ان سب میں سے جنات میں عقل و شعور ہوتا ہے جن کو ”جن“ اس لیے کہا جاتا ہے کہ وہ انسانی آنکھوں سے نظر نہیں آتا۔ قرآن حکیم میں جنات اور شیاطین کا تقریباً 74 دفعہ ذکر ہوا ہے۔ جنات کو اللہ تعالیٰ نے انسانوں سے پہلے پیدا کیا تھا۔

تلاش: نبیلہ اظہر، کراچی

آجاتے مجبوراً ان بھائیوں کے لیے کچھ نہ کچھ لینا پڑتا تھا۔ ایک دن وہ بہت پریشان تھی۔ میں نے پوچھا تو اس نے بتایا "پریشانی یہ ہے کہ گھر میں پیسوں کی بہت تنگی ہو رہی ہے۔ کچھ بھی نہیں ہے۔ گھر کے اخراجات پورے نہیں ہو رہے۔"

"کیا تمہارے بھائی کام نہیں کرتے؟"

"نہیں بدقسمتی سے کوئی کام نہیں کرتا۔" اس نے بتایا۔ "سب کے سب ورزش ہی کرتے رہتے ہیں کچھ دنوں پہلے تک ایک چھوٹی سی دکان تھی جس کو سب مل کر چلا رہے تھے اب وہ دکان بھی نہیں رہی۔"

"تم بتاؤ میں تمہارے گھر کے لیے کیا کر سکتا ہوں۔"

"کوئی ایسا راستہ نکل آئے کہ مہینے کے پندرہ بیس ہزار روپے آنے لگیں تو سکون مل جائے۔"

"چلو مہینے کے بیس ہزار تم مجھ سے لے لیا کرو۔" میں نے کہا۔

تھوڑے انکار کے بعد وہ مان گئی۔ میں نے اسے ہر ماہ بیس ہزار دینا شروع کر دیا اور یہ سلسلہ آٹھ مہینوں تک چلتا رہا۔ تحفے تحائف وغیرہ اس کے علاوہ تھے۔ ان مسٹنڈوں کو کھلا کھلا کر میری حالت خراب ہو گئی تھی۔ مطلب یہ تھا کہ اگر میں کبھی شہناز کو ہوٹل میں مدعو کر لیتا تو وہ سارے بھائی بھی پہنچ جاتے اور جو بل ہزار بارہ سو کا بننا چاہیے وہ دس بارہ ہزار کا بنتا۔ کم بخت سب کے سب بے تحاشا کھایا کرتے تھے۔

میرے ایک دوست نے مشورہ دیا۔ "بھائی تو کن چکروں میں پڑا ہوا ہے۔ اگر اس سے شادی کرنی ہے تو شادی کر کے جان چھڑا لے۔"

"ہاں شہناز اس قابل تو ہے کہ اس کو بیوی بنا لیا جائے۔"

"تو ختم کرو اس کہانی کو۔"

ایک دن میں اپنا رشتہ خود ہی لے کر ان کے پاس پہنچ گیا۔ بڑا بھائی میری بات سن کر بپھر گیا تھا۔ "دیکھ بھائی ہم نے شہناز کو پیار کرنے کی آزادی تو دے رکھی ہے لیکن شادی کرنے کی نہیں۔"

"کیا......!" میں نے حیران ہو کر اس کی طرف دیکھا۔ "کیا آپ اس کی شادی نہیں کریں گے؟"

"نہیں ہم نے اس کی شادی کا کبھی نہیں سوچا اور جہاں تک تم سے ملنے ملانے کا تعلق ہے تو تم پر اور اس پر کوئی پابندی نہیں ہے۔ تم دونوں زندگی بھر ایک دوسرے سے مل سکتے ہو۔ تمہیں کوئی پرابلم نہیں ہو گی، ہم سب بھائیوں کی طرف سے میں گارنٹی دیتا ہوں۔"

میں یہ سن کر ٹھنڈا ہو گیا تھا۔ چکر آنے لگے تھے کہ ایسا تو کبھی نہیں ہوا ہو گا۔

مرتا کیا نہ کرتا میں شہناز سے ملتا رہا اور اس کے اور اس کے بھائیوں کے اخراجات پورے کرتا رہا۔

میری زندگی عذاب بن کر رہ گئی تھی، ایک بار میں نے جب شہناز سے معذرت کر لی کہ اب میں اسے پیسے نہیں دے سکوں گا تو دوسرے دن اس کے سارے بھائی میرے دفتر آ گئے تھے۔

اور وہ اس طرح مطالبہ کر رہے تھے جیسے یہ ان کا حق ہو۔ بہت ہی خوفناک تیور تھے ان کے، میں نے گھبرا کر وظیفہ دوبارہ بحال کر دیا تھا۔

ایک دن میں نے پریشان ہو کر شہناز سے کہا "ہماری محبت اپنی جگہ لیکن اب ہمارے درمیان پیسو کا رشتہ نہیں ہونا چاہیے۔"

"اگر یہ رشتہ نہ ہو تو پھر بھائی تم سے ملنے بھی نہیں دیں گے۔"

"دیکھو۔ تمہارے بھائیوں نے تو شادی سے ہی انکار کر دیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ اب ہمیں ایک دوسرے سے دور ہو جانا چاہیے۔"

لیکن ایسا بھی نہیں ہو سکا اس کے سارے بھائی گھر پہنچ گئے تھے۔ "تم میں اتنی ہمت کہاں سے آ گئی کہ ہماری بہن کو چھوڑنے کا سوچ سکو۔"

"دیکھیں جناب ہماری شادی نہیں ہوئی ہے۔ جان پہچان اور دوستی ہے اور یہ تو کسی وقت بھی ختم ہو سکتی ہے۔"

"ہمارے یہاں ایسا دستور نہیں ہے جس سے دوستی ہو گئی بس ہو گئی۔ اب تم نے اس دوستی کو ختم کرنے کی کوشش کی تو ہم سب مل کر تمہاری ٹانگیں توڑ دیں گے۔"

"تو میرے بھائیو میری کہانی کچھ یوں ہے کہ پانچ برسوں سے میں شہناز کے ساتھ اس کے پورے خاندان کو بھگت رہا ہوں۔ اب میں اس سے زبردستی ملتا ہوں۔ محبت ہوا ہو گئی ہے کاش اس دن وہ دکان پر مجھے دکھائی نہ دیتی کاش میں اس کے حسن کے چکر میں آ کر اپنے آپ کو یوں برباد نہ کرتا۔

اب میں اس سے جان چھڑانا چاہتا ہوں لیکن اس کے تو عدد بھائی میری ٹانگیں توڑنے کے لیے میرے پیچھے آ جاتے ہیں، اب دیکھیں یہ سلسلہ کب تک چلتا ہے؟

بے گناہ گنہگار

جناب ایڈیٹر صاحب

السلام علیکم!

میرا پیشہ ایسا ہے کہ بے شمار دکھ بھری کہانیاں سامنے آتی رہتی ہیں مگر آج جس کہانی کے ساتھ میں حاضر ہوا ہوں، یہ میری زندگی کا ایک ناقابلِ فراموش واقعہ ہے۔ کتنا عجیب اور ضمیر پر بوجھ بن جانے والا واقعہ ہے یہ۔

شہزاد حسین زاہد
(لاہور)

میرا نام اسد حمزہ ہے، پیشے کے لحاظ سے میں منصف ہوں۔ جج کے فرائض سرانجام دیتے ہوئے مجھے پانچ سال ہو چکے ہیں۔ میری بیوی کا نام آسیہ ہے اور ہمارے دو بچے مقدس اور شہزاد ہیں۔

بنیادی طور پر میرا تعلق پاکپتن شریف کے ایک گاؤں فیروز پور چشتیاں سے ہے۔ میری شادی میری خالہ زاد سے ہوئی تھی جو لو میرج بھی تھی اور ارینج میرج بھی۔ میرے سسرال والے بھی میرے ہی گاؤں میں رہتے تھے اس لیے گاؤں سے ہمارا رشتہ ٹوٹا نہ تھا۔ بس جاب کی وجہ سے میں اپنی بیوی کے ساتھ شہر میں رہتا تھا۔ ہر ایک دو ماہ بعد گاؤں کا چکر ضرور لگتا مگر ان دنوں مصروفیت عروج پر تھی اس لیے پچھلے پانچ ماہ سے ہم گاؤں نہ جا سکے۔ آسیہ جب بھی کہتی تو میں وعدہ کر لیتا مگر عین وقت پر کوئی ایسی مصروفیت آ جاتی کہ ارادہ کینسل کرنا پڑتا مگر آج اس کا غصہ اور بے چینی دیکھ کر میں نے طے کر لیا کہ ہفتہ کو ہم چلے چلتے ہیں اور اتوار کا دن گزار کر واپس آ جائیں گے۔

ہفتہ والے دن گیارہ بجے ہم روانہ ہوتے۔ ڈھائی گھنٹے

بعد پاکپتن پہنچے۔ شہر سے نکل کر ہماری گاڑی گاؤں جانے والی سڑک پر تھوڑا فاصلہ ہی طے کر پائی تھی کہ پتا چلا کہ اس سڑک کی مرمت ہو رہی ہے اس وجہ سے سڑک بند ہے۔

اب دو صورتیں تھیں۔ یا تو ہم واپس شہر جاتے اور وہاں سے دوسری سڑک پکڑتے یا پھر وہیں سے نہر کے کنارے کنارے سفر کرتے ہوئے ''بدھو والی جھال'' سے پُل کراس کر کے گاؤں جانے والی سڑک پکڑ لیتے۔ واپس جانے کی بجائے میں نے گاڑی نہر کے برابر والے کچے راستے پر ڈال دی اور اسپیڈ کم کر کے چلنے لگا۔ تقریباً دو کلومیٹر کا فاصلہ طے کرتے ہی سنسان علاقہ شروع ہو گیا۔ کہیں کہیں کھیتوں پر کام کرتا کوئی آدمی نظر آ جاتا۔ اس سوکھی نہر کے اس کنارے آمد و رفت بھی نہ ہونے کے برابر تھی۔ یہ سنسان علاقہ ابھی پندرہ کلومیٹر مزید تھا، اس کے بعد ہی آبادیاں شروع ہوتیں۔

ہم آپس میں ہلکی پھلکی گفتگو کرتے جا رہے تھے تبھی میری نظر ایک چرواہے پر پڑی جو بکریوں اور بھیڑوں کے ایک ریوڑ کے ساتھ ایک درخت کے نیچے کھڑا ہو کر ''ڈھینگے'' کی مدد سے درخت کی ٹہنیاں کاٹ کاٹ کر ریوڑ کے آگے پھینک رہا تھا۔ شاید وہ کوئی بڑی ٹہنی کاٹ رہا تھا کیونکہ وہ زور زور سے کئی جھٹکے دے چکا تھا مگر ٹہنی ابھی نہیں کٹی تھی۔ ڈھینگا ایک ایسا اوزار ہوتا ہے جو ایک لمبے بانس کے سرے پر لوہے کا ایک تیز دھار گول برچھی لگا کر تیار کیا جاتا ہے۔ اس کی مدد سے درخت کے اوپر چڑھے بغیر نیچے ہی کھڑے ہو کر ٹہنیاں کاٹی جا سکتی ہیں۔ ہمارے اس کے قریب پہنچنے سے پہلے ہی ٹہنی کٹ گئی۔ یہ ایک بھاری شاخ تھی جو کٹ کر سیدھی اس چرواہے کے سر پر گری۔ اس کی چیخ واضح طور پر ہم نے سنی۔ وہ تیورا کر گرا تھا۔ اتنی دیر میں ہم اس کے قریب پہنچ چکے تھے۔ میں نے جلدی سے بریک لگائے اور گاڑی سے اُترا پھر اس کی طرف دوڑ لگائی۔ چیک کیا تو وہ بے ہوش تھا اور اس کے سر سے خون بہہ رہا تھا۔ میں نے جلدی سے شاخ ایک طرف ہٹا کر اس کے زخم کا معائنہ کیا تو سر میں ایک گہرا سوراخ پڑ چکا تھا۔ اِدھر اُدھر نظر دوڑائی تو کھیتوں میں کام کرتا ایک آدمی نظر آیا۔ میں نے چیخ کر اسے پانی لانے کو کہا۔ اس نے جواب دیا کہ یہاں پانی نہیں ہے۔ میں قریبی ڈیرے سے لاتا ہوں، اس نے بھی دوڑ لگا دی تھی۔ آسیہ سے دوپٹا لے کر میں نے پھاڑ کر پٹیاں بنا لیں تاکہ خون روک سکوں مگر پانی ضروری تھا اور وہ ہمارے پاس بھی نہیں تھا۔ میں نے سوچا کہ تھوڑا پانی پلا کر اسے اپنی گاڑی میں ڈال کر اسپتال پہنچانا ضروری ہے۔ جب تک میں پٹی باندھ کر فارغ ہوا۔ کھیتوں میں کام کرنے والا آدمی پانی لے کر آتا دکھائی دیا۔ ابھی وہ کنارے پر ہی رہا تھا کہ چرواہے نے اکھڑے اکھڑے سانس شروع کر دیے اور پانی کے پہنچنے سے پہلے ہی وہ ما ہو گیا۔ میں نے جلدی سے اس کی نبض پکڑی جو نہ ملی۔ ا دھڑکن اور سانس ہر چیز بتا رہی تھی کہ وہ مر چکا ہے۔ م پانی لانے والے آدمی سے پوچھا کہ کیا وہ اسے جانتا اس نے بتایا کہ یہ اسی کے گاؤں کا ہے۔ میں نے اسے کہ وہ جائے اور اس کے ورثا کو اطلاع کرے۔ ان کے آ تک مجھے وہیں رکنا تھا۔ آسیہ اور بچے بھی گاڑی اُتر آئے۔ بچوں نے ایسا واقعہ پہلی بار دیکھا تھا، انہوں رونا شروع کر دیا تو میں نے آسیہ سے کہا کہ وہ گاڑی بچوں کو لے کر بیٹھ جائے۔ تقریباً آدھے گھنٹے بعد والے آئے، ان کے ساتھ روتی ہوئی عورتیں بھی چرواہے کی لاش کو ایک چارپائی پر ڈالا گیا۔ لاش اور بکری ریوڑ لے کر جب وہ لوگ روانہ ہو گئے تو ہم بھی گاڑی میں کر چل دیے۔

کچھ عرصے تک یہ واقعہ یاد رہا پھر زندگی کی مصروفیا نے سب کچھ بھلا دیا۔

تقریباً ایک سال بعد کا ذکر ہے، میرے سامنے ا ایسا کیس آیا جس نے مجھے چونکا دیا۔ ملزم کو پھانسی کی سزا گئی تھی۔ ملزم کا موقف تھا کہ وہ بالکل بے گناہ ہے مگر ثبوت اس کے خلاف تھے۔ میں نے ملزم اور مدعیو عدالت میں پیش ہونے کی ہدایت کرتے ہوئے اگلی تاریخ دے دی اور دوسرا کیس نمٹانا شروع کر دیا۔ اگلی تاریخ پر ملزم اور مدعیان کمرائے عدالت میں موجود تھے۔ کو دیکھ کر میرے ذہن میں کھد بدی ہونے لگی۔ مجھے لگا میں اسے جانتا ہوں۔ مگر بہت کوشش کے باوجود مجھے کچھ نہ آیا۔ کارروائی شروع ہو چکی تھی۔ دونوں طرف کے و اپنے اپنے موکل کے حق میں دلائل دے رہے تھے مگر ملزم خلاف ایسے ثبوت مہیا کیے گئے تھے کہ مجھے لگ رہا تھا کہ ا خارج کرنا پڑے گی۔ کارروائی جاری تھی کہ عدالت وقفے کا وقت ہو گیا۔ وقفے کے دوران میں بھی میرا ذہن ا سوچ میں اُلجھا رہا تھا کہ میں نے اسے کہاں دیکھا ہے؟ آ میں ملزم کو اپنے کمرے میں لانے کو کہا۔ دو سپاہی ا ہتھکڑیاں پہنا کر میرے سامنے لے آئے۔

''مجھے لگتا ہے کہ میں تمہیں جانتا ہوں یا کہیں د مگر کوشش کے باوجود کچھ یاد نہیں آ رہا۔ کیا تم میری یہ ا دور کر سکتے ہو؟'' میں نے نرم لہجے میں اس سے پوچ

ے پوچھنے پر اس کی آنکھوں میں شناسائی کی چمک ابھری ہ بے قرار سے لہجے میں بول اُٹھا۔

''سر، میں نے آپ کو پہچان لیا۔ ہم نے آپ کو بہت ل کیا مگر آپ کے بارے میں کچھ بھی نہ جاننے کی وجہ سے ڈھونڈ نہیں پائے۔ میں وہی ہوں جسے آپ نے ایک ہے کی جان بچانے کے لیے پانی لینے بھیجا تھا مگر میرے ے پہلے ہی وہ مر چکا تھا۔ اسی چرواہے کے قتل کے ام میں مجھے پھانسی کی سزا ہوئی ہے۔ میری بے گناہی ت صرف آپ تھے مگر آپ کہیں نہ ملے۔ پلیز سر، مجھے لیں۔ آپ تو اچھی طرح سے جانتے ہیں کہ میں بے گناہ ''

مجھے بھی وہ حادثہ یاد آ گیا۔

''اوہ...... مگر وہ تو ایک حادثہ تھا، تم اس میں کیسے پھنس ؟'' میں نے حیرانی سے پوچھا۔

''اس حادثے سے دو دن قبل میری اس چرواہے سے و دہار دی تھی۔ اس کا ریوڑ میرے کھیتوں میں گھس کر فصل راب کر رہا تھا اور وہ آرام سے کھڑا دیکھ رہا تھا، اس پر میں اسے گالیاں دی تھیں اور دھمکی دی تھی کہ آج کے بعد ایسا ''تو میں تجھے جان سے مار دوں گا۔ بس اسی بات پر مرنے لے کے ورثا نے مجھے پھنسا دیا۔ آپ کے نہ ملنے کی وجہ سے مے خلاف ساری شہادتیں مضبوط ہو گئیں۔ سر، آپ تو ہیں میرا اس کیس سے کوئی تعلق نہیں، آپ مجھے بری یں۔'' اس نے ہاتھ جوڑ دیے۔

''دیکھو، تم بے گناہ ہو، اس بات کا مجھے یقین ہے مگر میں تمہیں رہا نہیں کر سکتا کیونکہ کچھ قانونی تقاضے پورے کرنا گے۔ کیس کی سماعت میں کر رہا ہوں لہٰذا تمہاری طرف گواہ نہیں بن سکتا۔ مگر فکر نہ کرو، یہ حادثہ میری بیوی نے بھی ھا تھا۔ وہ تمہاری طرف سے گواہ بنے گی۔ جہاں اتنا صبر کیا چھ عرصہ اور کرو، تمہارے ساتھ انصاف ضرور ہو گا۔'' ں نے اتنا کہہ کر انہیں جانے کا اشارہ کیا کیونکہ عدالت کا ہونے والا تھا۔

کمرائے عدالت میں پہنچ کر میں نے باقی دلائل سنے انہیں بیس دن بعد کی تاریخ دے دی کیونکہ کیس تو حل تھا۔ اب میری بیوی کو قانون کے مطابق گواہی دینا تھی اس طرح میں یہ کیس سماعت کے لیے منظور کر لیتا مجھے یقین تھا کہ چند ہی پیشیوں پر جیوری کے ممبران رہا کرنے پر متفق ہو جاتے۔ وہ دن بہت ہی مصروف رہا۔ بہت زیادہ تھکن ہونے کی وجہ سے میں آسیہ سے اس بارے میں بات نہ کر سکا۔ دوسرے دن پہنچا تو ایک خوشخبری میری منتظر تھی۔ میری تین ماہ کی چھٹی منظور ہو چکی تھی۔ یہ تین مہینے آسیہ اور بچوں کے ساتھ سیاحت میں گزارنے تھے۔ تمام پروگرام پہلے سے طے تھا لہٰذا ہم دوسرے ہی دن روانہ ہو گئے۔ تین مہینے تک گھومنے کے بعد میں واپس گھر آ گیا۔ ان تین مہینوں میں میرا دوستوں اور کچہری کے معاملات سے تعلق منقطع رہا تھا۔ عدالت میں پھر وہی معمول کے کام چل پڑے۔ دوسرے دن مجھے اچانک وقفے کے وقت میں ''چرواہے کے قتل یا موت'' والا کیس یاد آ گیا۔ مجھے بے چینی سی محسوس ہوئی۔ اس بارے میں صحیح معلومات اسٹینو سے مل سکتی تھیں لہٰذا میں نے اسٹینو کو بلایا اور اس بارے میں پوچھا تو ایک خوفناک انکشاف ہوا۔ میری جگہ پر عارضی جج جو تعینات کیا گیا تھا، اس نے پھانسی کی سزا پر فوری عمل درآمد کا حکم دیا تھا۔ اس بے گناہ انسان کو چرواہے کے قتل کا مجرم گردانتے ہوئے ڈیڑھ ماہ پہلے ہی پھانسی دی جا چکی تھی۔ میرا سر گھومنے لگا۔ مجھے لگا کہ اس بے گناہ کی موت کا ذمے دار میں ہوں۔ سوتے جاگتے، اُٹھتے بیٹھتے وہ شخص ہاتھ جوڑے میرے سامنے آ کھڑا ہوتا اور بری کرنے کی التجائیں کرنے لگتا۔ میری حالت بہت خراب ہو چکی تھی۔ آسیہ اکثر مجھے ٹوکنے لگی کہ بات کیا ہے، آخر میں نے اسے ساری بات بتا دی تو اس نے مجھے تسلی دینے کی کوشش کی کہ تم نے تو اس کے خلاف فیصلہ نہیں

آتش فارسی زبان کا لفظ ہے جس کو عربی میں نار، ترکی میں اوت، سنسکرت میں اگنی، ہندی اور اردو میں آگ کہتے ہیں۔ سائنس کے طالب علم جانتے ہیں کہ لفظ ''آگ'' عام طور پر چیزوں کے احتراق (Combustion) یا جلنے کے نظر آنے والے اثرات کو ظاہر کرتا ہے (آگ کا لفظ وسیع معنوں میں کسی بھی دہکتی ہوئی تپش کے مظاہرے کا احاطہ کرتا ہے) احتراق یا جلنے کے عمل میں جلنے والی چیز کے ایک یا ایک سے زائد جزو کے آکسیجن کے ساتھ کیمیائی ملاپ کے نتیجے میں یہ اثرات پیدا ہوتے ہیں۔ عام فہم زبان میں جب ہوا کی آکسیجن (O2) کسی کاربنی میٹیریل سے کیمیائی ملاپ کرتی ہے تو اس کے نتیجے میں حرارت، شعلہ اور روشنی پیدا ہوتی ہے چنانچہ اسی شعلے کو آتش یا آگ کہتے ہیں۔

پروفیسر ڈاکٹر فضل کریم کے مضامین سے اقتباس
تلاش: اظہر جمیل صدیقی، کراچی

دیا لہٰذا تم اس کے ذمے دار نہیں ہو مگر مجھے سکون نہ ملا۔ میں یقیناً ایک ایسی غفلت کا مرتکب ہو چکا تھا جس کا تدارک ممکن نہ تھا۔ آسیہ سے بات کرنے کے ٹھیک دو دن بعد چھٹی والے دن ہم لوگ لان میں بیٹھے چائے پی رہے تھے جب چوکیدار نے اطلاع دی کہ پاکپتن سے کوئی آدمی آیا ہے اور آپ سے ملنا چاہتا ہے۔

پاکپتن کا نام سن کر میں نے اسے اندر بلالیا۔ وہ اندر آیا تو اس کا حلیہ بتارہا تھا کہ وہ بالکل دیہاتی اور اَن پڑھ ہے۔ میں نے اسے پہچاننے کی کوشش کی کہ شاید وہ میرے گاؤں کا ہو مگر وہ میرے گاؤں کا نہ تھا۔ آسیہ اُٹھ کر اندر چلی گئی۔

''جی فرمایئے؟'' میں نے اس سے پوچھا تو وہ بولا۔

''میرا نام صادق حسین ہے اور میں بابر کا کزن ہوں۔'' بابر پھانسی پانے والے مجرم کا نام تھا۔ اس نے تعارف کروانے کے بعد کہا ''بابر کی آخری خواہش تھی کہ آپ جب بھی واپس آئیں تو اس کا خط آپ تک پہنچادیا جائے۔ اس کی یہ آخری خواہش پوری کرنے کے لیے میں یہاں تک آیا ہوں۔''

اس نے جیب سے ایک بند لفافہ نکال کر میری طرف بڑھادیا۔ آسیہ چائے لے کر آچکی تھی۔ شاید اسے نئی نہیں بنانا پڑی تھی، تبھی وہ اتنی جلدی آگئی تھی۔ صادق حسین چائے پینے میں مصروف ہوگیا جبکہ میں خط پڑھنے لگا۔ خط پڑھ کر میں بالکل ہلکا پھلکا ہوگیا اور میرے ضمیر کی خلش دور ہوگئی۔ خط میں ایسا کیا تھا، آپ بھی ملاحظہ فرمائیں۔

''محترم جناب جج صاحب!

السلام علیکم! مجھے یقین ہے کہ جب میرا یہ خط آپ کو ملے گا، میں پھانسی پاچکا ہوں گا۔ مرنے سے پہلے میں اپنے دل سے ایک بہت بڑا بوجھ ہٹانا چاہتا ہوں۔ مجھے بہتر یہی لگا کہ میں بذریعہ خط ہی سہی، وہ بوجھ آپ سے شیئر کروں۔

جج صاحب! پہلے میں سنتا تھا کہ انسان اپنے اعمال کا نتیجہ اسی دنیا میں پالیتا ہے مگر اب مجھے اس بات پر مکمل یقین ہو چکا ہے۔ یہ دنیا یقیناً مکافاتِ عمل کا نام ہے۔ میں اس کیس میں بے گناہ ہونے کے باوجود گناہگار تھا، کیوں اس کلیے کو سمجھنے کے لیے میری کہانی جاننا ضروری ہے۔ میٹرک کرنے کے بعد میں نے ملازمت کے بجائے کاشت کاری کو ترجیح دی۔ کچھ زمین اپنی تھی، کچھ ٹھیکے پر حاصل کی۔ میرے پاس جو کچھ تھا، وہ سب میں نے خرچ کردیا تھا۔ اب فصل کو کھاد ڈالنا بہت ضروری تھا ورنہ میری فصل اچھی نہ ہوتی اور مجھے نقصان اُٹھانا پڑتا۔ اِدھر اُدھر سے بہت کوشش کے باوجود نہ تو کہیں سے رقم کا بندوبست ہوا اور نہ ہی کھاد اُدھار ملی۔ میں بہت پریشان تھا۔ ایک شام میں فارم ہاؤس پر تنہا اسی سوچ میں بیٹھا تھا، جب میرا ایک دوست وہاں پہنچا۔ اس نے مجھے بتایا کہ وہ گھر سے جھگڑا کر کے آیا ہے اور کراچی جارہا ہے۔ آج رات وہ میرے فارم ہاؤس پر گزارنا چاہتا ہے۔ میں نے اسے سمجھایا کہ جھگڑے تو گھروں میں ہوتے ہی رہتے ہیں، تم گھر چھوڑ کر نہ جاؤ اور پھر کراچی جانے کے لیے کافی پیسوں کی ضرورت ہوگی، میں بھی فی الحال تمہاری مدد کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہوں۔ اس پر وہ بولا کہ رقم کا کوئی مسئلہ نہیں، اس کے پاس بیس ہزار روپے موجود ہیں۔ یہ کہہ کر اس نے جیب سے رقم نکال کر دکھائی تو میں خاموش ہوگیا۔ کچھ دیر بعد میں نے اسے آفر دی کہ اگر وہ دس ہزار مجھے دے دے تو فصل اُٹھاتے ہی میں بارہ ہزار اسے واپس کردوں گا مگر اس نے انکار کردیا اور کہا کہ وہ کراچی جیسے شہر جارہا ہے، وہاں پتا نہیں کیسے حالات پیش آئیں اس لیے اس کے پاس جتنے بھی پیسے موجود ہوں اچھا ہے۔ اس کے آنے سے تھوڑی دیر قبل ہی میرا کھانا آچکا تھا جو ہم دونوں نے مل کر کھایا۔ رات نو بجے تک ہم اپنے اپنے بستر میں بیٹھ کر باتیں کرتے رہے پھر اسے نیند آنے لگی مگر نیند میری آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ تقریباً گیارہ بجے میں اُٹھا اور کمرے کے ایک کونے سے رسّی اُٹھا کر سوئے ہوئے دوست کے گلے میں ڈال دی۔ اس کی آنکھ کھل گئی۔ اپنے گلے میں رسّی پڑی دیکھ کر وہ جلدی سے اُٹھ بیٹھا مگر میں اُچھل کر اس کی پشت کی طرف ہوگیا اور رسّی کو زور سے بل دے کر اس وقت تک مضبوطی سے پکڑے رکھا جب تک وہ تڑپ تڑپ کر ٹھنڈا نہ ہوگیا۔ آگے کے تمام مرحلے آسانی سے طے ہوگئے۔ اس کی جیب سے رقم نکال کر میں نے اپنی جیب میں ڈالی اور فارم ہاؤس کے صحن میں گہرا گڑھا کھود کر اس کی لاش دفنادی۔ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوئی۔ کافی عرصہ گزر گیا، اس کے گھر والے یہی سمجھتے رہے کہ وہ کراچی چلا گیا ہے اور کسی دن آجائے گا۔ میں بھی خوش تھا کہ قتل جیسا جرم کرنے کے باوجود سکون سے پھر رہا ہوں۔ چرواہے والا واقعہ اس واقعے کے ٹھیک سال بعد اسی دن پیش آیا جس دن میں نے وہ قتل کیا تھا اور اسی رات کو میں حوالات میں تھا۔

اس قتل میں بے گناہ ہونے کے باوجود جب میری پھانسی کنفرم ہوگئی تو مجھے یقین ہوگیا کہ مجھے سابقہ قتل کی سزا مل رہی ہے۔ آپ سے التجا ہے کہ دعا کیجیے گا کہ اللہ تبارک وتعالیٰ مجھے معاف فرمادے۔ اس دنیاوی سزا کے بدلے میری آخرت کی سزا مل جائے، فقط بابر۔''

گہرا کنواں

محترمه عذرا رسول صاحبه

السلام علیکم!

ہر باپ اپنی بیٹیوں کی نظر میں بہت بلند مقام رکھتا ہے۔ میری نظر میں بھی میرے ابا بہت اونچا مقام رکھتے تھے مگر ان کا قتل میری امی نے کیا پھر بھی میں خوش ہوں، وجہ آپ کر میری آپ بیتی بتائے گی۔

بانو (کراچی)

گھر میں داخل ہوتے ہی احساس ہوگیا کہ کوئی تبدیلی آئی ہے۔

ایسی تبدیلی بہت دنوں کے بعد نصیب ہوا کرتی ہے۔ میری بہن علیزا لاؤنج کے صوفے پر بیٹھی چاکلیٹ کھانے میں مصروف تھی۔ اس نے ایک نظر میری طرف دیکھتے ہوئے بتایا ''عالیہ! ابو آگئے ہیں۔''

''کہاں ہیں؟'' میں اندر کمرے کی طرف لپکی۔

''وہ گھر میں نہیں ہیں۔'' علیزا نے دوسری خبر دی ''ان کو ماموں اپنے ساتھ لے گئے ہیں۔ امی بھی گئی ہوئی ہیں۔''

میں جھلا کر علیزا کے سامنے بیٹھ گئی ''کیا مصیبت ہے یار! ایک تو تین برسوں کے بعد واپس آئے۔ پھر گھر میں بھی نہیں رہے۔ آتے ہی ماموں کے ساتھ چلے گئے۔''

"یہی تو پرابلم ہے۔" علیزا نے کہا "ماموں انہیں ریسیو کرنے ائرپورٹ گئے تھے۔ وہی لے کر آئے تھے۔ ابو نے صرف اپنا سامان رکھا۔ مجھ سے دو چار باتیں کیں۔ بس اس سے زیادہ اور کچھ نہیں۔ تمہاری خیریت معلوم کی اور ماموں پھر امی کے ساتھ چلے گئے۔"

"کہاں چلے گئے؟" میں نے غصے سے پوچھا۔

"ابو تو جانے کے موڈ میں نہیں تھے۔" علیزا نے بتایا "امی زبردستی انہیں اپنے ساتھ بڑی خالہ کے یہاں لے گئی ہیں۔ خالو کی تعزیت کے لیے۔"

"یار! 'This is not Fair'" میں نے کہا "ابو کے پاس ہم سے ملنے کا وقت ہی نہیں ہوتا۔"

"ابو کے پاس تو شاید ہوتا ہے لیکن امی ملنے نہیں دیتیں۔"

میں اپنے کمرے میں آ کر اپنے بستر پر لیٹ گئی۔

ذہن میں آندھیاں سی چل رہی تھیں۔ میں نے جب سے ہوش سنبھالا تھا، یہی تماشا دیکھتی آئی تھی۔ ابو انگلینڈ میں رہتے تھے اور اچھا بزنس تھا ان کا۔ وہ ہر مہینے اتنی رقم روانہ کیا کرتے کہ ہم بہت آرام سے زندگی گزارا کرتے۔ سب کچھ تھا ہمارے پاس۔ اپنا گھر، گاڑی، بینک اکاؤنٹ۔ وہ سب کچھ جو پیسوں سے خریدا جا سکتا ہے۔ سوائے باپ کی محبت اور شفقت کے۔ امی نے ان کو پیسے کمانے کی مشین سمجھ رکھا تھا۔ وہ انہیں پاکستان آنے ہی نہیں دیتی تھیں۔

ابو سے ہماری باتیں فون پر ہوا کرتیں اور اس وقت احساس ہوتا کہ گھر کی بقا اور سلامتی کے لیے باپ کا ہونا کتنا ضروری ہوتا ہے۔

ابو تین چار برسوں میں صرف ایک بار آیا کرتے تھے۔ دس پندرہ دنوں کے لیے۔ اور یہ وقت بھی ان کا گھر سے باہر ہی گزرا کرتا تھا۔

امی انہیں گھر میں رہنے ہی نہیں دیتی تھیں۔ شاپنگ، دعوتیں، کبھی فلاں ماموں کے ہاں، کبھی فلاں خالہ کے یہاں۔ ہم دونوں بہنیں انتظار میں رہتیں کہ شاید ان کے پاس اتنی فرصت ہو کہ وہ ہماری طرف دھیان دے سکیں۔

ایک بار میں امی سے اُلجھ گئی تھی "امی! آپ نے ابو کے ساتھ کیا سلسلہ لگا رکھا ہے؟"

"کیا مطلب؟" امی نے چونک کر میری طرف دیکھا "کیا کہنا چاہتی ہو؟"

"صرف یہ کہنا چاہتی ہوں کہ ابو آتے ہی لٹتے بڑی ہو جاتے ہیں، آج فلاں ماموں نے بلایا ہے، آج فلاں خالہ کے یہاں دعوت ہے۔ آخر یہ سب کیا ہے؟"

"دیکھو بیٹا! تمہارے ابو کئی کئی برسوں کے بعد ملک واپس آتے ہیں تو خاندان والوں کو تو ان سے ملنے کا حق ہے نا؟"

"واہ...... کیا منطق ہے آپ کی۔ خاندان والوں کا حق ہے لیکن اپنی بیٹیوں کو نہیں ہے۔" میں نے کہا۔

"کیسی بات کر رہی ہو؟ کیا تم دونوں اپنے ابو سے نہیں ملیں؟"

"اگر اسے ملنا کہتے ہیں تو پھر ضرور ملے ہوں گے۔" میں نے کہا "ناشتے کے وقت صرف دس پندرہ منٹ کے لیے۔ اس کے بعد آپ انہیں لے کر نکل جاتی ہیں اور رات اس وقت واپسی ہوتی ہیں جب ہم سو چکے ہوتے ہیں۔"

"آخر تم دونوں کو ان سے بات کیا کرنی ہوتی ہے؟ مل لیتی ہو، اتنا ہی بہت ہے۔"

میں بھنا کر رہ جاتی۔ میری ایک دوست راشدہ مجھ سے کہا کرتی تھی "عالیہ! چاہے تم بُرا مانو یا نہ مانو، لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ تمہاری امی ایک انتہائی درجے کی خودغرض عورت ہیں۔"

"اب ایسا بھی نہیں ہے۔" میں کمزور سا احتجاج کرتی۔

"میری جان! ایسا ہی ہے۔" وہ کہتی "تمہاری امی دونوں سے انکل کو اس لیے ملنے نہیں دیتیں کہ کہیں اولاد کی محبت ان پر غالب نہ آ جائے۔"

"لیکن کیوں؟ باپ اولاد سے محبت نہیں کرے گا تو اور کون کرے گا؟"

"یہی تو پرابلم ہے میری جان! کہ آج رشتوں کی کوئی اہمیت نہیں رہی ہے۔ آج صرف اور صرف پیسا ہے۔ تمہاری امی یہ جانتی ہیں کہ اگر تمہارے ابو وطن واپس آ گئے تو پھر پیسوں کی ریل پیل کہاں سے ہوا کرے گی اور تمہارے ابو کی وطن واپسی کا جواز یہی ہو سکتا ہے، اولاد کی محبت۔ اسی لیے وہ نہیں چاہتیں کہ اولاد کی محبت ان پر غالب آ جائے۔"

"تم ٹھیک کہتی ہو۔" میں نے ایک گہری سانس لی "میں اور علیزا ابھی اسی نتیجے پر پہنچے ہیں۔ اب تم ہی مشورہ دو، ہمیں کیا کرنا چاہیے؟"

"یہ ایک مشکل امر ہے۔" راشدہ نے کہا "ایک طرف تمہارے ابو ہیں اور دوسری طرف تمہاری امی ہیں۔"

"میں نے امی سے ایک بار بات کی تھی۔" میں نے بتایا "لیکن وہ یہ سب سننے کو تیار ہی نہیں ہوئیں۔ ناراض ہو جاتی ہیں۔ البتہ ایک کام ہو سکتا ہے۔"

"وہ کیا......؟"

"میں اپنے افضل ماموں سے بات کرتی ہوں۔ وہ بہت سلجھے ہوئے انسان ہیں۔" میں نے کہا "اور دوسری بات یہ ہے کہ ابو بھی زیادہ تر ان ہی کے ساتھ رہتے ہیں۔"

"ہاں نہیں...... کیا سلجھا ہوا انسان ہے جو اولاد کو باپ سے دور رکھنے کی سازش کرتا رہتا ہے۔"

ابو دس پندرہ دنوں کے بعد واپس چلے گئے تھے۔ ہمیشہ کی طرح اس بار بھی ہم دونوں بہنوں سے ان کی ملاقاتیں بہت کم ہوئی تھیں۔ بس دو چار بار۔

زیادہ تر وقت امی اور خالاؤں اور ماموؤں کے ساتھ گزرا تھا۔

یہ ایک انوکھا رویہ تھا۔

عام طور پر باہر والے جب کچھ دنوں کے لیے واپس آتے ہیں تو جب تک ان کا قیام ہوتا ہے، وہ گھر کے ہی ہو کر رہ جاتے ہیں۔ خاندان والوں اور دوستوں کو شکایات ہی ہوا کرتی ہیں۔

لیکن ابو کے ساتھ معاملہ بالکل برعکس تھا۔

ایسا بھی نہیں تھا کہ انہیں ہم دونوں بہنوں سے پیار نہ ہو، اس کا اندازہ اس وقت ہوتا جب ہم ان سے فون پر بات کرتے۔ وہ اپنا دل کھول کر رکھ دیتے تھے۔

انہوں نے کبھی ہماری کسی فرمائش کو رد نہیں کیا۔ ہم نے جو کہا وہ انہوں نے باہر سے بھیج دیا۔ وہ ایک طرف تو امی کو رقم بھیجا کرتے تو دوسری طرف ہمیں بھی بہت کچھ دیا کرتے۔ اسی لیے ہمیں روپوں پیسوں کی کبھی کوئی کمی نہیں ہوئی بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ ہم عیش کی زندگی گزار رہے تھے۔

ان ہی حالات میں میری ملاقات انور حسین سے ہو گئی۔ ایک بہت کامیاب کاروباری نوجوان۔ باپ کی موت کے بعد اس کے پاس کئی فیکٹریز آ گئی تھیں لیکن وہ ان میں سے ثابت نہیں ہوا جو باپ دادا کی کمائی کو غارت کر دیتے ہیں بلکہ اس نے اپنی محنت سے مزید اضافہ کر دیا تھا۔

وہ ایک انتہائی مہذب انسان تھا۔ اس کے ہونٹ اور اس کی آنکھوں میں ہر وقت ایک نرم سی مسکراہٹ رقصاں رہتی۔ یہ میری خوش نصیبی تھی کہ ایک دن اچانک کسی تقریب میں اس سے ملاقات ہو گئی تھی۔

واقعات اسی طرح آگے بڑھا کرتے ہیں۔ ایک یا دو ملاقاتیں ہوتی ہیں، اس کے بعد اجنبی بھی اپنا اپنا سا لگنے لگتا ہے۔

ہم نے ایک دوسرے کا دل بھی [illegible]
بہت تیزی سے ایک دوسرے کے قریب آتے چلے گئے۔ چونکہ میرے گھر میں سوائے امی اور علیزا کے اور کوئی نہیں تھا اس لیے کوئی رکاوٹ بھی نہیں تھی۔ کوئی ایسا نہیں تھا جو ہمیں ملنے سے روک سکتا۔

ایک بار میں نے انور کی ملاقات امی سے بھی کروا دی۔ امی بھی اس سے مل کر بہت خوش ہوئی تھیں اور علیزا کا تو یہ خیال تھا کہ ہم دونوں شاید ایک دوسرے ہی کے لیے پیدا ہوئے ہیں۔

میں نے انور کی فون پر ابو سے بھی بات کروا دی تھی۔ ابو بھی اس سے گفتگو کر کے بہت خوش ہوئے تھے۔

دونوں بہت دیر تک ایک دوسرے سے باتیں کرتے رہے تھے۔ اس کا مطلب تھا کہ اب اس رشتے میں کوئی رکاوٹ نہیں تھی، میں اور انور ایک دوسرے کے ہو سکتے تھے۔

پھر شادی کی بات بھی ہونے لگی۔

دونوں طرف سے کوئی ایسا دشوار مرحلہ نہیں تھا اسی لیے سب کچھ طے ہو گیا۔ اس وقت میں نے امی سے کہا "امی! اب تو شادی کی تاریخ بھی طے ہو چکی ہے۔"

"تو پھر......؟"

"میرا مطلب ہے کہ اب ابو کو اس موقعے پر آ جانا چاہیے۔"

"وہ کیوں؟" امی بہت سرد لہجے میں بولیں۔

اس وقت مجھے غصہ آ گیا تھا "آپ بھی کمال کرتی ہیں امی۔ بیٹی کی شادی ہونے والی ہے اور آپ سمجھتی ہیں کہ باپ کی موجودگی ضروری نہیں ہے؟"

"ہاں، ایسی کوئی ضروری نہیں ہے۔" امی نے کہا "کوئی

شمارہ اپریل 2012ء کی منتخب سچ بیانیاں

ہماری پیش کش...... آپ کا انتخاب

☆ اول: عکس ماضی...... طیبہ شیریں مصطفیٰ (اوسلو، ناروے)

☆ دوم: بزنس از بزنس...... ارشاد حسین انصاری (کراچی)

☆ سوم: جدائی...... اختر قزلباش (لندن، یوکے)

[illegible]

ہو یا نہ ہو، شادی ہو ہی جاتی ہے اور دوسری بات یہ ہے کہ تمہارے ابو وہاں کام میں مصروف ہیں۔ انہیں کیوں ڈسٹرب کروگی؟"

یہ انتہا درجے کی خودغرضی تھی۔ یعنی ایک آدمی صرف کام ہی کرتا رہے، مشین ہی بنا رہے۔ ہر قسم کے جذبات اور احساسات سے بے نیاز ہوکر۔

بے چارہ اپنی بیٹی کی شادی میں بھی شریک نہ ہوسکے، حد ہوگئی تھی۔

شادی بھی ہوگئی تھی۔ بہت دھوم دھام سے۔ اس وقت ابو سے فون پر بات ہوئی تھی۔ بہت مبارک باد دے رہے تھے۔

ان کی کمی کو انور نے بھی محسوس کیا تھا۔ شادی کی پہلی رات ہی اس نے پوچھا "عالیہ! کیا تمہیں شادی کے وقت انکل کی کمی محسوس نہیں ہوئی؟"

"بالکل نہیں۔" میں سرد لہجے میں بولی "ان کا ہونا یا نہ ہونا ایک ہی جیسا ہوتا۔"

"کیا مطلب؟"

پھر میں نے بتا دیا کہ ابو سے ہم بہنوں کی ملاقات ہی کہاں ہوتی تھی۔ وہ تو ہمارے لیے اجنبی کی طرح ہیں۔"

"یہ کیسے ہوسکتا ہے؟"

"ایسا ہی ہے۔" میں نے ایک گہری سانس لی "اب احساس ہوتا ہے کہ امی اور ان کے خاندان والوں نے ہم دونوں بہنوں کو ابو سے جان بوجھ کر الگ رکھا ہے۔"

"کمال ہے...... وہ کس لیے؟"

"وہ اس لیے کہ کہیں ابو ہماری محبت میں وطن واپس نہ آجائیں اور ایک روبوٹ جو پیسے کما کما کر بھیج رہا ہے، وہ سلسلہ ختم نہ ہوجائے۔"

"انتہا ہوگئی۔" انور نے کہا "یہ تو خودغرضی کی عجیب مثال ہے۔"

"ہر گھر میں کہانیاں ہیں انور۔ باہر سے لوگ کچھ اور دکھائی دیتے ہیں، اندر سے کچھ اور ہوتے ہیں۔" میں افسردگی سے بولی "جبکہ تم نے یہ اندازہ لگالیا ہوگا کہ ابو کتنے نرم دل اور محبت کرنے والے انسان ہیں۔"

"ہاں، اس کا اندازہ تو ان کی باتوں سے ہوجاتا ہے۔ بہرحال یہ سن کر افسوس ہوا ہے۔"

اس کے بعد کئی دنوں تک میں یہ سوچتی رہی کہ کہیں میں نے انور کو یہ راز بتا کر کوئی غلطی تو نہیں کی۔ پھر یہ خیال ہوا کہ ایک نہ ایک دن ان کو معلوم تو ہونا ہی تھا۔

شادی کے بعد میں نے محسوس کیا کہ انور میری امی سے کچھ کھنچے کھنچے سے رہنے لگے تھے۔ یہ ایک فطری امر تھا۔ انہوں نے امی کی فطرت کا اندازہ لگالینے کے بعد اپنے آپ کو ذرا دور ہی کرلیا تھا۔

دوسری طرف علیزا نے بھی اپنا جیون ساتھی چن لیا تھا۔ وہ بھی ایک سلجھا ہوا نوجوان تھا، عدیل...... جو کسی کالج میں پڑھایا کرتا تھا۔

علیزا نے جب امی کو اپنی پسند کے بارے میں بتایا تو وہ بھڑک اٹھی تھیں۔ "ارے کیا ہوا ہے تم کو۔ ایک لیکچرر سے شادی کروگی؟"

"کیوں امی! اس میں کیا برائی ہے؟" علیزا نے کہا "یہ تو بہت قابلِ احترام شعبہ ہے۔"

"ہوا کرے قابلِ احترام۔ لیکن اس میں اتنے پیسے تو نہیں ہیں نا۔"

علیزا بھی امی سے یہ سن کر حیران رہ گئی تھی۔ آخر کیا ہوا تھا امی کو۔ وہ کیوں ہر شے کو پیسوں میں تولنے لگی تھیں۔ ان کی ویلیوز کہاں چلی گئی تھیں؟

بہرحال علیزا اپنی ضد پر اڑی رہی تھی۔ اس نے عدیل کی ملاقات ہم دونوں سے بھی کروادی تھی اور ہمیں بھی عدیل بہت پسند آیا تھا، وہ بہت سلجھا ہوا لڑکا تھا۔

ان دونوں کی منگنی بھی ہوگئی۔ ان ہی حالات میں۔ ابو کو جب اس رشتے کے بارے میں بتایا گیا تو انہوں نے بھی پسندیدگی کا اظہار کیا تھا۔

پھر امی بھی خاموش ہوگئیں۔ عدیل پی ایچ ڈی کے لیے جرمنی چلا گیا تھا۔ شادی ایک سال بعد اس کی واپسی کے بعد ہونی تھی۔

ایک دن انور نے مجھ سے کہا "عالیہ۔ کیا تمہیں معلوم ہے کہ تمہارے اکاؤنٹ میں کتنے روپے ہیں؟"

"پندرہ بیس ہزار کے قریب ہوں گے۔" میں نے بتایا۔

"جی نہیں، محترمہ! آپ ایک لکھ پتی خاتون ہیں۔" اس نے مسکراتے ہوئے کہا "آپ کے اکاؤنٹ میں بیس لاکھ روپے ہیں۔"

"بیس لاکھ!" میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا "یہ بیس لاکھ کہاں سے آگئے؟"

"اس لیے کہ میں نے جمع کروائے ہیں۔" اس نے بتایا۔

میں شور کرتی رہ گئی کہ اس نے ایسا کیوں کیا، لیکن وہ یہی

کہتا رہا کہ یہ سب عام سی باتیں ہیں۔ شوہر اور بیوی کے درمیان کوئی تکلف نہیں ہوتا۔ اس نے یہ رقم اس لیے میرے اکاؤنٹ میں جمع کروائی ہے کہ کہیں مجھے کبھی کسی چیز کی ضرورت نہ پڑ جائے۔

انور ایسا ہی محبت کرنے والا اور بے نیاز قسم کا انسان تھا۔ ٹوٹ کر محبت کیا کرتا اور آنکھیں بند کرکے اعتبار کرتا۔

مجھے فخر تھا کہ قدرت نے مجھے ایسا ساتھی دیا ہے۔

زندگی بہت آرام اور سکون سے گزر رہی تھی۔ ابو سے فون پر ہی باتیں ہوا کرتیں۔ ایک بار ابو نے فون پر بتایا "عالیہ! کچھ دنوں سے میری طبیعت کچھ خراب رہنے لگی ہے۔"

"کیا ہوا ہے آپ کو؟" میں نے پریشان ہوکر پوچھا۔

"بلڈ پریشر رہنے لگا ہے۔" ابو نے بتایا۔

"آپ وطن واپس آجائیں۔" میں نے کہا "آپ کو جتنی محنت کرنی تھی، وہ آپ کر چکے ہیں۔ اب باہر رہنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ کون آپ کی دیکھ بھال کرے گا۔ کون آپ پر دھیان دے گا؟"

"سوچ لو، میرا آنا شاید تمہاری امی کو پسند نہ آئے؟" ابو نے کہا۔

"اب جو ہوگا، دیکھا جائے گا۔" میں غصے سے بولی "اب بہت ہوگئی۔ میں آج ہی امی سے بات کرتی ہوں۔"

میں اسی شام امی کے پاس پہنچ گئی۔ وہ اس وقت کہیں جانے کے لیے تیار تھیں۔ مجھے اچانک دیکھ کر بہت خوش ہوگئی تھیں۔

"عالیہ! تم بھی میرے ساتھ چلو۔" انہوں نے کہا۔

"کہاں چلوں؟" میں نے پوچھا۔

"میں بانو آپا کی طرف جارہی ہوں۔" انہوں نے بتایا "وہ شکایت کررہی تھیں کہ جب سے عالیہ کی شادی ہوئی ہے، اس سے ملاقات ہی نہیں ہوتی۔"

"نہیں امی! مجھے کہیں نہیں جانا۔" میں نے کہا "میں آپ سے ایک بہت ضروری بات کرنے آئی ہوں۔"

"کیا ضروری بات ہے؟"

"امی، میں یہ چاہتی ہوں کہ ابو واپس آجائیں۔" میں نے بتایا "کیونکہ اب ان کی صحت اس قابل نہیں رہی کہ وہ باہر کام کرسکیں اور یہ صرف میری نہیں، بلکہ علیزا کی بھی خواہش ہے۔"

"نہیں، یہ نہیں ہوسکتا۔" امی جلدی سے بولیں "وہ جہاں ہیں، ان کو وہیں رہنے دو۔ وہ وہاں آرام سے زندگی گزار رہے ہیں۔"

"میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ کس قسم کی بیوی ہیں۔" میں تو پھٹ ہی پڑی تھی "آپ کو ان کی صحت کا اتنا بھی خیال نہیں ہے۔"

"جو میں نے کہہ دیا ہے، وہی ہوگا۔" امی نے کہا "میں نہیں چاہتی کہ وہ واپس آئیں۔"

"اوہ، تو سچ آپ کی زبان پر آہی گیا۔" میں تلخ ہوکر بولی۔

"ہاں، آگیا سچ!" امی نے کہا "اور اب میں اس موضوع پر کوئی بات نہیں کرنا چاہتی۔"

انور بھی یہ سن کر حیران رہ گئے تھے "خدا کی پناہ! میرے تو گمان میں بھی نہیں تھا کہ کوئی عورت ایسی بھی ہوسکتی ہے۔"

"لیکن میں بھی اپنے باپ ہی کی اولاد ہوں۔" میں نے کہا "میں ابو کو بلوا کر رہوں گی۔ ہم دونوں بہنیں باپ کے ہوتے ہوئے اب زیادہ عرصے تک یتیم نہیں رہ سکتے۔"

پھر یہ ہوا کہ میں نے اور علیزا نے باری باری انہیں فون کرنا شروع کردیا۔ یہ وہ موقع تھا جب انور کو اپنے کاروباری سلسلے میں دو مہینوں کے لیے یورپ جانا پڑ گیا تھا۔

ان کے جانے کے بعد میں امی کے پاس رہنے کے لیے آگئی۔ ایک بار پھر ہم دونوں بہنیں ایک ساتھ ہوگئی تھیں۔ پرانے دن جیسے واپس آگئے تھے۔ وہی شور شرابا، وہی سیر و تفریح، اسی تفریح میں کبھی کبھی عدیل بھی ہمارے ساتھ ہوا کرتا اور مجھے یہ دیکھ کر خوشی ہوتی کہ وہ بہت مہذب اور سمجھ دار شخص تھا۔ علیزا نے بہت اچھا انتخاب کیا تھا۔

ہم دونوں کی ضد سے مجبور ہوکر ایک دن ابو نے فون پر خوش خبری سنائی کہ وہ واپس آرہے ہیں۔ میں نے امی کو بھی بتا دیا کہ ابو اگلے ہفتے اپنا سب کچھ سمیٹ کر وطن واپس آرہے ہیں۔

اس خبر کو سن کر امی کا ردعمل حیرت انگیز ثابت ہوا۔ وہ اس طرح خاموش ہوگئی تھیں جیسے انہیں بہت صدمہ پہنچا ہو۔

دوسرے دن میرے دونوں ماموں اور دونوں خالائیں بھی آگئیں اور کمرے میں بند ہوکر نہ جانے کس قسم کی میٹنگ میں مصروف ہوگئے۔

ہم دونوں بہنوں کو ان لوگوں کا یہ رویّہ بہت پُراسرار اور حیرت انگیز محسوس ہوا تھا۔ اگر ابو واپس آرہے تھے تو ایسی کون سی قیامت آگئی تھی کہ جس کے لیے انہیں خفیہ میٹنگ کرنے کی ضرورت پیش آگئی تھی۔ یوں سمجھ لیں کہ اس وقت

www.paksociety.com

پورا گھر ایک طرف تھا اور ہم دونوں بہنیں ایک طرف ہوگئی تھیں۔

پتا نہیں کس قسم کی سازش ہونے لگی تھی۔

لیکن ہمیں کوئی پروا نہیں تھی۔ ہمارے لیے تو یہی بہت تھا کہ ابو کی واپسی ہورہی ہے۔ اب ہم دل بھر کر ان کے ساتھ رہیں گے۔ ان کی شفقتوں سے لطف اندوز ہوں گے۔ ان کی دعائیں لیں گے۔ کیونکہ باپ پھر باپ ہی ہوتا ہے۔

ایک ہفتے کے بعد ابو واپس آگئے۔

پہلی خوشی تو ان کی واپسی کی تھی اور دوسری خوشی یہ دیکھ کر ہوئی تھی کہ ان کی صحت ٹھیک تھی۔ بلکہ وہ پہلے سے زیادہ سرخ و سفید ہورہے تھے۔ شاید انہوں نے اپنے آپ پر کنٹرول کرلیا تھا۔

اوہ۔ کیا دن تھے وہ بھی۔

ہم ان سے گپ شپ کرتے، ان کے ساتھ بازار جاتے۔ برسوں کی محرومیوں کا ازالہ شاندار انداز سے ہورہا تھا۔

اور پھر ایک رات ایک بھونچال سا آگیا۔

اس رات ابو دیر سے گھر واپس آئے تھے۔ میں نے ہی گیٹ کھولا تھا۔ امی اور علیزا سو چکی تھیں۔ میں نے جب گیٹ کھولا اور ابو اندر آئے تو ایسا لگا جیسے کوئی اجنبی گھر میں آ گیا ہو۔

ان کی سانسوں سے بدبو کے بھبکے اٹھ رہے تھے۔ ان کے پاؤں بھی ڈگمگا رہے تھے۔ ان کی آواز لڑکھڑا رہی تھی۔ میں یہ دیکھ کر پریشان سی ہوگئی تھی۔ میرے خدا!! ابو نے شراب پی رکھی تھی۔ شراب کی بو ان کے پورے جسم سے اٹھتی ہوئی محسوس ہورہی تھی۔

"ابو...... کیا ہوا ہے آپ کو؟" میں نے بہت دکھ سے پوچھا۔

"جاؤ، سوجاؤ۔" ابو لڑکھڑاتی آواز میں بولے اور ڈولتے ہوئے اپنے کمرے میں چلے گئے۔

میں ابو کو اس حال میں دیکھ کر اندر سے ٹوٹ سی گئی تھی۔ میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ ابو شراب پیتے ہوں گے۔ کمرے میں آئی تو علیزا کو جاگتے ہوئے دیکھا۔

"کیا ہوا......؟" ابو واپس آگئے؟" اس نے پوچھا۔

"ہاں۔" میں نے دھیرے سے جواب دیا۔

"تو...... اتنی پریشان کیوں ہو؟" علیزا نے پوچھا "کیا ابو میں کوئی خاص بات دیکھ لی ہے؟"

"کیا مطلب......؟" میں چونک گئی تھی۔

"عالیہ! میری بہن...... میں کئی بار ابو کو اس حال میں دیکھ چکی ہوں۔" اس نے بتایا "تم کو اس لیے نہیں بتایا کہ تمہیں دکھ ہوتا۔"

"علیزا! میں نے تو کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ ابو شرابی ہوں گے؟" میں نے کہا۔

"اب ہم کیا کرسکتے ہیں؟" علیزا نے ایک گہری سانس لی۔

دوسری صبح ابو ناشتے کی میز پر نظر آئے۔ پہلے کی طرح ہنستے مسکراتے اور دلچسپ باتیں کرتے ہوئے۔ شاید رات کا خمار اتر چکا تھا۔

ابو کی نسبت امی بہت خاموش تھیں۔

ناشتے کے بعد ابو نے ہم دونوں بہنوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "مجھے تم دونوں سے ایک ضروری بات کرنی ہے۔ اسٹڈی روم میں آجاؤ۔"

اس کا مطلب یہ تھا کہ ابو امی کے سامنے نہیں بولنا چاہتے تھے۔ ہم ان کے کہنے پر اسٹڈی روم میں آگئے۔ ابو بھی ہمارے سامنے آکر بیٹھ گئے تھے۔ اس وقت وہ بہت سنجیدہ نظر آرہے تھے۔

"دیکھو بچیو!" ابو نے بات شروع کی "میں آج اپنے بارے میں تم لوگوں کو بتا دینا چاہتا ہوں۔ مجھے افسوس ہے کہ تم دونوں نے مجھے نشے کی حالت میں دیکھ لیا۔ یہ ٹھیک ہے کہ میں شراب پیتا ہوں لیکن اس کی ایک کہانی ہے، ایک پس منظر ہے۔"

"رہنے دیں ابو!" میں جلدی سے بولی "ہم کچھ نہیں سننا چاہتے۔"

"نہیں، سننا ہوگا۔" ابو نے کہا "ورنہ تم دونوں ہی نہ جانے کیا سمجھتی رہو گی اور میں تمہاری نگاہوں میں شرمندہ اور ذلیل ہوتا رہوں گا۔"

"چلیں بتائیں، کیا بات ہے؟"

"بیٹا، میں ایک بار ایک ایسے مرض میں مبتلا ہوگیا تھا جس کا علاج شراب سے ہوسکتا تھا۔" ابو نے بتایا "میں تقریباً ایک مہینے تک شراب کو دوا کے طور پر استعمال کرتا رہا ہوں اور یہ جو الکوحل ہوتا ہے، یہ انسانی جسم میں اپنی جگہ بنا کر بیٹھ جاتا ہے۔ اب یہ حال ہوگیا ہے کہ اگر شراب نہ استعمال کروں تو پورا بدن ٹوٹنے لگتا ہے اور اسی بیماری کے دوبارہ اٹیک کا خطرہ ہوجاتا ہے۔ میں مجبور ہوکر رہ گیا ہوں۔ تم دونوں یقین کرو کہ شراب نوشی میرا شوق نہیں بلکہ میری مجبوری ہے اور مجبوری بھی ایسی کہ اس کے بغیر میں زندہ نہیں رہ سکتا۔"

اس کے بعد ہم کیا کہہ سکتے تھے۔ ہم دونوں خاموش ہوکر رہ گئے۔

ابو کی اس مجبوری نے ہماری زبانوں پر تالے لگا دیے تھے۔ ابو صرف رات کے وقت پیا کرتے تھے اور وہ بھی کہیں باہر جا کر۔ کہاں جاتے تھے، ہمیں اس کا اندازہ نہیں ہوسکا تھا۔

ایک دن میں نے امی سے پوچھ لیا "امی، کیا آپ کو اندازہ ہے کہ ابو ہر رات کو کہاں جاتے ہیں اور اتنی دیر کہاں رہتے ہیں۔"

"ہاں، میں جانتی ہوں۔" امی نے ہونٹ سکیڑ کر بتایا "ہوسکتا ہے کہ تم لوگوں کو بھی معلوم ہوگیا ہو کہ تمہارے ابو شراب پیتے ہیں۔"

"ہاں، یہ ہمیں معلوم ہوگیا ہے۔" میں نے بتایا "اب اسی سلسلے میں ایک بات کہنی ہے۔"

"چلو، وہ بھی کہہ دو۔"

"یہ کوئی اچھی بات نہیں ہے کہ ابو باہر جا کر شراب نوشی کرتے ہیں۔" میں نے کہا "نہ جانے باہر کیا حالات ہوں۔ کیا ہوجائے۔ جب ان کے ساتھ ایک مجبوری ہے تو کیوں نہ گھر ہی پر اجازت دے دی جائے۔"

"یہ تم دونوں کی مرضی ہے۔" امی نے کہا "میں اس سلسلے میں اب کچھ نہیں کہوں گی۔"

پھر میں نے ہی ابو سے بات کی "ابو آپ کو شراب ہی پینی ہے تو گھر لا کر پی لیا کریں۔ ہماری طرف سے اجازت ہے۔ خود امی کو بھی اس پر کوئی اعتراض نہیں ہے۔"

"بیٹا، میں بہت شرمندگی محسوس کروں گا۔" ابو نے کہا۔

"نہیں، اس میں شرمندہ ہونے والی کوئی بات نہیں ہے۔" میں نے دلاسا دیا "یہ آپ کی مجبوری ہے۔"

مختصر یہ کہ ابو نے گھر پر ہی شراب نوشی شروع کردی۔ وہ رات کے وقت کمرے میں بند ہوجاتے اور شراب پیتے رہتے۔ جبکہ امی نے بالکل خاموشی اختیار کر رکھی تھی۔

کئی دن گزر گئے۔

ابو کی شراب نوشی ہماری زندگی کا ایک ناخوشگوار سچ تھا جس کو ہم نہ جانے کس طرح برداشت کیے جارہے تھے۔

پھر ایک رات اچانک ہم پر ایک قیامت ٹوٹ پڑی۔ اس وقت ابو گھر پر نہیں تھے، کہیں باہر گئے ہوئے تھے۔ جب زور زور سے دروازے کی گھنٹی بجنے لگی تھی۔

گیٹ پر مجھے ہی جانا پڑا تھا۔ دو پولیس والے کھڑے ہوئے تھے۔ ان میں سے ایک کانسٹیبل تھا، دوسرا انسپکٹر۔

"کیا امتیاز گھر پر ہیں؟" انسپکٹر نے پوچھا۔

"جی نہیں، ابو تو کہیں باہر گئے ہوئے ہیں۔" میں نے بتایا "لیکن بات کیا ہے؟"

"وہ آجائیں تو ان سے کہنا کل مقامی تھانے پہنچ جائیں۔" انسپکٹر نے کہا "ان کے خلاف رپورٹ درج کرائی گئی ہے۔"

"رپورٹ! کس بات کی رپورٹ؟" میں نے پوچھا۔

"بی بی! ہم تمہارے سوال کا جواب دینے نہیں آئے۔" انسپکٹر نے سخت لہجے میں کہا "بتا دینا اس کو۔"

میں نے واپس آکر جب علیزا اور امی کو بتایا تو امی کوئی تبصرہ کیے بغیر دوسرے کمرے میں چلی گئیں جبکہ علیزا کی پریشانی دیکھنے والی تھی۔

"عالیہ! اب کیا ہوگا؟" علیزا نے پوچھا "ابو نے کیا جرم کیا ہے؟"

"یہ تو ان کے آنے کے بعد ہی پتا چلے گا۔" میں نے کہا۔

رات کو ابو اسی حال میں واپس آئے جس طرح پہلے آیا کرتے تھے حالانکہ درمیان میں انہوں نے گھر میں ہی پینا شروع کردیا تھا لیکن دو چار دنوں سے وہ پھر باہر جانے لگے تھے۔

ہم نے اس وقت ابو کی مدہوشی کی حالت کو دیکھتے ہوئے کچھ نہیں بتایا لیکن جب دوسری صبح ابو کو یہ خبر سنائی تو ان کا رنگ اڑ گیا تھا۔

"ابو بات کیا ہے؟" علیزا نے پوچھا "پولیس آپ کو کیوں تلاش کررہی ہے؟"

"میں ابھی نہیں بتا سکتا۔" ابو بولتے ہوئے اپنے کمرے میں چلے گئے۔

ہم دونوں بہنوں کے برعکس امی کا رویہ بہت حیرت انگیز تھا۔ وہ ہونٹ بھینچے خاموش بیٹھی رہی تھیں۔ امی کے رویے سے ایسا محسوس ہورہا تھا جیسے انہیں ان باتوں سے کوئی دلچسپی ہی نہ ہو۔

کچھ دیر بعد ابو باہر چلے گئے۔

ہم ان کی خیریت سے واپسی کی دعائیں مانگتے رہے تھے۔ ابو کی واپسی بہت دیر میں ہوئی تھی۔

"بتائیں ابو، کیا بات ہے؟" میں نے پوچھا "کیوں بلایا تھا پولیس نے؟"

"بیٹا، یہ میرا معاملہ ہے۔ تم لوگ پریشان نہ ہو۔" ابو

www.paksociety.com

نے دھیرے سے کہا" میں کسی نہ کسی طرح سنبھال لوں گا۔"
"لیکن بات کیا ہے، کچھ پتا تو چلے۔"
میرے بہت اصرار پر ابو نے بتایا کہ انہوں نے شاید اپنی کسی ضرورت کے تحت کسی سے دس لاکھ روپے لیے تھے جو وقت پر ادا نہیں کر پائے اور اب اس نے ان پر کیس کر دیا تھا۔ ابو اس سے دس دنوں کی مہلت لے کر آ گئے تھے اور ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ دس لاکھ کہاں سے لائے جائیں؟
میں نے جب علیزا کو ابو کی اس پریشانی کا بتایا تو وہ بھی چکرا کر رہ گئی تھی" ہائے عالیہ باجی! اب کیا ہوگا؟ بے چارے ابو دس لاکھ کہاں سے لائیں گے؟"
میں نے ابو کی اس پریشانی کا جب امی سے ذکر کیا تو انہوں نے ایک حیرت انگیز بات کہی" بس خاموش ہو جاؤ تم دونوں، اس چکر میں نہ پڑو۔"
"امی، یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں؟" علیزا نے حیران ہو کر پوچھا" ہم کسی غیر کے چکر میں تو نہیں پڑ رہے، یہ تو ابو کا معاملہ ہے۔"
"میں نے ایک بات سمجھا دی ہے نا۔" امی کا لہجہ سخت ہو گیا تھا۔
امی کا رویّہ تو شروع ہی سے ابو کے معاملے میں حیران کن رہا تھا۔ اسی لیے ہم نے توجہ نہیں دی۔ سوال پھر وہی تھا کہ ابو کی مدد کیسے کی جائے؟
ویسے اب ان کی حالت دیکھی نہیں جا رہی تھی۔ وہ بے قراری سے ٹہلتے رہتے تھے۔ انہوں نے بولنا بھی تقریباً ترک ہی کر دیا تھا۔
اور اچانک میرے ذہن میں ایک خیال آ گیا۔ میرے اپنے اکاؤنٹ میں بیس لاکھ تھے۔ کیا وہ پیسے ابو کے کام نہیں آ سکتے تھے؟
باپ سے بڑھ کر اور کون ہو سکتا ہے لیکن اس کے لیے انور کی اجازت ضروری تھی کیونکہ یہ پیسے تو اسی نے دیے تھے۔
میں نے جب انور کو فون کر کے پوچھا تو وہ بڑے پیار سے بولے" میری جان! آخر اس میں پوچھنے والی کون سی بات ہے۔ میں نے تو تمہیں پیسے دیے ہیں۔ اب تم جو چاہے کرو اور اگر وہ تمہارے ابو کے کام آ جائیں تو اس سے اچھی بات اور کیا ہوگی؟"
میں نے جب ابو کو بتایا تو وہ انکار کرنے لگے تھے" نہیں بیٹا! یہ مجھ سے نہیں ہو سکتا۔ میں تم سے پیسے نہیں لے سکتا۔"
"ابو، یہ پیسے آپ کو کوئی غیر نہیں دے رہا، آپ کی بیٹی دے رہی ہے اور بیٹی سے آپ کیا تکلف کر رہے ہیں؟"
علیزا نے بھی ابو کو سمجھایا۔ پھر ابو پیسے لینے پر راضی ہو گئے تھے۔
یہ خبر جب امی کو ملی تو انہوں نے صرف اتنا کہا" تم خود اپنے اچھے بُرے کی ذمّے دار ہو۔ میں نے تو سمجھانے کی کوشش کی تھی۔ اب تم جانو اور تمہارا کام جانے۔"
سچ تو یہ ہے کہ اس وقت بھی امی پر غصہ ہی آیا تھا۔ نہ جانے وہ کیسی بیوی تھیں جن کو اپنے شوہر کی مصیبتوں اور پریشانیوں سے کوئی واسطہ ہی نہیں تھا۔
بہر حال امی کی ناراضی کے باوجود میں نے ابو کو دس لاکھ روپے دے دیے تھے۔ پھر ایسا محسوس ہوا جیسے ابو کی پریشانیاں ایک دم ختم ہو گئی ہوں۔
ہم دونوں کو یہ دیکھ کر خوشی ہوئی تھی کہ چلو ابو کے سر پر جو مصیبت تھی، وہ ختم ہوئی لیکن یہ تو صرف ابتدا تھی، اس کے بعد جو کچھ ہوا وہ بہت اذیت ناک تھا۔
ایک دن میں علیزا شاپنگ کے لیے گئے ہوئے تھے کہ ہم نے ابو کے ساتھ ایک عورت دیکھ لی۔ ابو اس عورت کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے چل رہے تھے اور وہ عورت اپنی صورت اور اپنے انداز ہی سے انتہائی گھٹیا قسم کی دکھائی دے رہی تھی۔
وہ اس طبقے کی معلوم ہو رہی تھی جو انتہائی بدنام طبقہ ہوا کرتا ہے۔ ہم دونوں یہ دیکھ کر گنگ سے رہ گئے تھے۔ ہم نے چھپ کر ابو کا تعاقب کیا۔ ابو اس عورت کو شاپنگ کروا رہے تھے۔
"عالیہ باجی! یہ سب کیا ہے؟" علیزا نے رندھی ہوئی آواز میں پوچھا" کون ہے یہ عورت؟"
"اس عورت کو دیکھ کر ہی اندازہ لگا لو کہ وہ کون ہے؟" میں بہت دکھ سے بولی۔
"لیکن ابو اس کے ساتھ کیا کر رہے ہیں؟"
"ان دونوں کی بے تکلفی سے اندازہ ہو گیا ہوگا کہ وہ کیا کر رہے ہیں؟" میں نے کہا" اب چلو، واپس چلتے ہیں۔ مجھ میں مزید دیکھنے کی ہمت نہیں ہے۔"
ہم چپ چاپ گھر واپس آ گئے۔
ابو نے بہت دکھ پہنچایا تھا۔ میں نے علیزا کو منع کر دیا تھا کہ وہ امی کو نہ بتائے۔ خواہ مخواہ وہ پریشان ہوں گی۔ بہتر ہے کہ ہم پہلے اپنے طور پر معلوم کرنے کی کوشش کریں۔
پھر ایسا لگا جیسے قدرت ہماری مدد کرنے پر آمادہ ہو گئی

ہو۔ وہ سارے بھید کھول رہی ہو جو اب تک ہماری نگاہوں سے اوجھل رہے تھے۔
ایک دن میں کسی کام سے پھر مارکیٹ کی طرف گئی۔ اس دن میں اکیلی تھی۔ میں نے ابو کے ساتھ ایک آدمی کو دیکھا۔ میں نے ایک ہی نظر میں اس آدمی کو پہچان لیا تھا۔ یہ وہی پولیس انسپکٹر تھا جو ابو کو بلانے آیا تھا۔
پہلے تو میں نے یہی سمجھا کہ ابو شاید پھر کسی معاملے میں پھنس گئے ہیں لیکن جب وہ دونوں انتہائی دوستانہ انداز میں ہوٹل میں داخل ہوئے تو بہت کچھ سمجھ میں آنے لگا۔
اس کے بعد میرے گھر میں دکھ دینے والے واقعات کو جیسے پَر لگ گئے تھے۔ ایک کے بعد ایک حادثہ۔ اور ان کی ابتدا اس دن ہوئی جب میں نے ابو سے دوٹوک بات کرنے کا فیصلہ کر لیا۔
اس دن امی اور علیزا کہیں گئی ہوئی تھیں۔ میں نے ابو سے کہا" ابو! مجھے آپ سے ایک بہت ضروری بات کہنی ہے۔"
"ہاں، کہو۔"
"آپ کس عورت کے ساتھ گھومتے پھرتے ہیں؟"
"کیا!" ابو نے چونک کر میری طرف دیکھا" عالیہ! یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟"
"میں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔" میں نے کہا" آپ اس عورت کو شاپنگ کروا رہے تھے۔"
اور اسی دن ابو کی شخصیت کے سارے چھلکے ایک ساتھ اُتر گئے۔ اس وقت میرے سامنے جو آدمی بیٹھا ہوا تھا۔ وہ میرا باپ نہیں تھا بلکہ کوئی اور تھا۔ کوئی ظالم اور بے رحم شخص۔
"ہاں، میں جس عورت کے ساتھ گھومتا پھرتا ہوں، وہ میری Keap ہے، سمجھیں۔" ابو دہاڑنے لگے" میں نے اس کو یہاں آتے ہی رکھ لیا تھا۔"
"خدا کے لیے ابو!" میں کانپ کر رہ گئی تھی" شرم کریں۔ یہ آپ اپنی بیٹی کے سامنے کیسی باتیں کر رہے ہیں؟"
"کیوں، اس میں کیا بُرائی ہے؟" ابو نے کہا" جب میں اپنی بیٹی کے سامنے شراب پی سکتا ہوں تو کیا اپنی داشتہ کا تذکرہ نہیں کر سکتا۔"
"خدا کے لیے ابو!" میں رونے لگی تھی" یہ آپ نے کیسی باتیں شروع کر دیں۔"
"میں نے شروع نہیں کیں، تم نے شروع کی ہیں۔" ابو نے کہا" اور جبکہ بات کھل ہی چکی ہے تو میں یہ بتا دوں کہ میں اس عورت کے بغیر نہیں رہ سکتا اور جہاں تک تمہاری ماں کا تعلق ہے تو اب اس میں رکھا ہی کیا ہے۔"
ابو انتہائی شرم ناک باتیں کر رہے تھے۔ میں پورے بدن سے کانپ رہی تھی۔ میں روتی ہوئی اپنے کمرے میں آ گئی۔ یقین نہیں آ رہا تھا کہ میں یہ سب ابو سے سن رہی ہوں۔
علیزا اور امی جب واپس آئیں تو اس وقت ابو گھر پر نہیں تھے۔ کہیں جا چکے تھے۔ میں نے روتے ہوئے ان دونوں کو سب کچھ بتا دیا۔
اور اس وقت پہلی بار امی پھٹ پڑیں" بہت ضد کر کے بلایا ہے تم دونوں نے۔ اب بھگتو ان کو۔ تم دونوں زندگی بھر مجھے خود غرض اور لالچی سمجھتی رہیں۔ تمہارے سامنے یہ بات تھی کہ میں انہیں تم دونوں سے دور کیوں رکھتی ہوں، تمہارے قریب کیوں نہیں آنے دیتی؟ اب پتا چل گیا نا کہ میں ایسا کیوں کرتی تھی؟ صرف تمہارے لیے۔ تاکہ تمہیں احساس نہ ہو کہ تمہارا باپ اس قماش کا انسان ہے۔ اس کی عزت بچانے کے لیے میں نے اسے گھر سے اور تم دونوں سے دور رکھا تھا۔"
"امی! کیا آپ کو معلوم تھا کہ وہ اس قسم کے انسان ہیں؟" علیزا نے پوچھا۔
"ہاں، صرف مجھے نہیں بلکہ پورے گھرانے کو معلوم تھا۔" امی نے بتایا" اسی لیے تمہارے ماموں اور خالائیں انہیں اپنے ساتھ ساتھ رکھتے تھے۔ گھر سے دور رکھتے تھے تاکہ تم پر ان کی حقیقت نہ کھل جائے اور تم خود کو ایک عیاش اور بدمعاش باپ کی اولاد جان کر اس رشتے ہی سے نفرت نہ کرنے لگو۔"
"میرے خدا......!" میں نے سر تھام لیا" امی! آپ نے ہمیں سمجھایا کیوں نہیں؟"
"کیسے سمجھاتی؟ تمہاری آنکھوں پر تو باپ کی محبت کی پٹی بندھی ہوئی تھی۔" امی نے کہا" حالانکہ میں نے اشاروں اشاروں میں تمہیں کئی بار بتایا۔ تم دونوں میرا رویّہ دیکھتی رہیں۔ اس کے باوجود تمہیں عقل نہیں آئی۔ اور تم نے اپنے دس لاکھ روپے بھی ان کی عیاشی کے لیے ان کے حوالے کر دیے۔"
"وہ دس لاکھ تو شاید کسی مقدمے کے سلسلے میں تھے۔" میری آواز لڑکھڑانے لگی تھی۔
"سب بکواس ہے۔ یہ ایک ڈراما تھا۔" امی نے بتایا" وہ انسپکٹر ریاض ان کا پرانا دوست ہے۔ یہ مجھے کل ہی پتا چلا

www.paksociety.com

ہے۔وہ بھی ان کی عیاشیوں میں برابر کا شریک ہے۔"
اس وقت مجھے یاد آیا کہ امی ٹھیک کہہ رہی تھیں۔ میں نے انسپکٹر اور ابو کو ایک ساتھ ہنستے بولتے ہوئے دیکھا تھا۔خدا کی پناہ! کتنا بڑا جھوٹ، کیسا فراڈ۔اور وہ بھی کس کے ساتھ، خود اپنی بیٹی کے ساتھ۔
ہم دونوں رو رہی تھیں اور امی بولے جا رہی تھیں۔ ہماری آنکھوں سے پٹیاں اتر گئی تھیں۔اب احساس ہو رہا تھا کہ امی نے اپنے شوہر کی عزت بچانے کے لیے کیسے کیسے جتن کیے ہوں گے۔ کتنا صبر تھا اس عورت میں۔
"بتائیں امی، اب کیا ہوگا؟" میں نے پوچھا۔
"سب جو کچھ ہے، وہ برداشت کرو۔" امی نے کہا "تمہارے لیے تو میرا مشورہ ہے کہ تم اپنی سسرال چلی جاؤ۔ انور بھی کچھ دنوں کے بعد آنے ہی والے ہوں گے۔"
"عالیہ باجی تو چلی جائیں، لیکن میرا کیا ہوگا؟" علیزا نے پوچھا۔
"عالیہ! تم کچھ دنوں کے لیے علیزا کو اپنے ساتھ لے جاؤ۔" امی نے کہا "ورنہ یہ اس گھر کے ماحول میں مرجائے گی۔"
"امی! اور آپ...... آپ کیا کریں گی؟" میں نے پوچھا۔
"مجھے کیا کرنا ہے؟" امی کی آنکھوں میں آنسو آگئے تھے "میری قسمت میں جو لکھا ہے، وہ تو ہو کر رہے گا۔"
ہم نے امی کو کیا سمجھا تھا اور وہ کیا نکلی تھیں۔ اسی طرح ابو کو ہم کتنا مظلوم سمجھتے تھے اور وہ کیسے ظالم ثابت ہو رہے تھے۔ خدایا ایسا کیوں ہوتا ہے، کس لیے ہوتا ہے؟
بہرحال میں اسی دن علیزا کو لے کر اپنے اپارٹمنٹ آگئی۔ انور نے شادی کے بعد شہر کے ایک پوش علاقے میں اپنا اپارٹمنٹ بھی خرید لیا تھا۔
یہاں آکر میں نے سکون کا سانس لیا تھا۔ ابو نے تو ہمیں نفسیاتی مریض بنا کر رکھ دیا تھا۔ ہم ابو کی فطرت پر حیران ہوا کرتے اور امی کی حالت پر افسوس کیا کرتے۔
اسی رات امی نے فون پر بتایا کہ ابو نے واپس آکر جب ہم دونوں کو گھر سے غائب پایا تو بہت ہنگامہ کیا تھا۔
ان کا خیال تھا کہ خود امی نے کسی سازش کے تحت ہم دونوں کو گھر سے دور بھیج دیا ہے۔
دوسری صبح ابو کا فون آگیا۔ ہم دونوں کے موبائل نمبر ان کے پاس تھے۔ انہوں نے مجھے فون کیا تھا "کیا بات ہے عالیہ! خیریت تو ہے، تم چلی کیوں گئیں؟"
"ابو۔ انور آنے والے ہیں۔" میں نے بہانہ بنایا "اپارٹمنٹ بہت دنوں سے گندا پڑا ہوا تھا، میں نے سوچا اسے ٹھیک ہی کرلوں۔"
"اور علیزا کو اپنے ساتھ کیوں لے آئیں؟" ابو نے پوچھا۔
"اپنا ہاتھ بٹانے کے لیے۔" میں نے جواب دیا "بہت کام ہے۔ میں اکیلی یہ سب نہیں کرسکتی تھی۔"
"میں سب سمجھتا ہوں۔" ابو دہاڑنے لگے تھے "یہ سب اس کمینی عورت کی سازش ہے۔"
"ابو۔ خدا کے لیے امی کو ایسا تو نہ کہیں۔" میں نے کہا "انہوں نے تو کچھ نہیں کہا ہے، ہم دونوں تو خود ہی آئے ہیں۔"
"میں کوئی بچہ نہیں ہوں جو سمجھ نہ سکوں۔" ابو پھنکار رہے تھے "ٹھیک ہے، دیکھ لوں گا اس کو۔"
ابو نے دوسری طرف سے فون بند کردیا تھا۔
یہ ایک نئی اور بھیانک سچویشن تھی۔ نہ جانے وہ امی کے ساتھ کیسا سلوک کرتے۔ میں نے جب علیزا کو بتایا تو وہ بھی پریشان ہو کر رہ گئی تھی "میرے خدا!! آخر یہ سب کیا ہو رہا ہے۔ کاش ہم نے ابو کو نہ بلایا ہوتا۔ وہ باہر ہی رہتے تو اچھا تھا۔"
"اس زمانے میں ہماری لائف کتنی پُرسکون تھی۔" میں نے کہا "انہیں بلا کر ہم نے خود اپنے پیروں پر کلہاڑی ماری ہے۔"
ایک گھنٹے کے بعد امی کا فون بھی آگیا، وہ ہمیں سمجھا رہی تھیں "دیکھو، تمہارے ابو جو کچھ بھی کہتے رہیں، تم دونوں واپس مت آنا۔ کل رات انہوں نے ایک اور حرکت کی تھی۔"
"وہ کیا؟" میں نے پریشان ہو کر پوچھا۔
"وہ ایک طوائف کو اپنے ساتھ لے آئے تھے۔" امی نے بتایا۔
"کیا!" میرا دماغ گھوم کر رہ گیا تھا "یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں، گھر پر لے آئے تھے؟"
"ہاں، گھر لے آئے تھے۔" امی نے بتایا، ان کی آواز میں بے پناہ کرب تھا۔ "وہ کم بخت صبح یہاں سے گئی ہے۔"
"اوہ، اب تو یہ معاملہ حد سے بڑھ چکا ہے امی!" میں نے کہا۔
"اسی لیے منع کر رہی ہوں کہ وہ کچھ بھی کہتے رہیں، تم

واپس مت آنا۔ میں کسی نہ کسی طرح ان حالات کا مقابلہ کرلوں گی۔"
"کم از کم آپ بھی ہمارے ہی پاس آجائیں۔" میں نے کہا "لعنت بھیجیں اس گھر پر اور ایسے شوہر پر۔"
"ہونا تو یہی چاہیے کہ میں انہیں چھوڑ کر تم دونوں کے پاس ہی آجاؤں۔ لیکن تم اچھی طرح جانتی ہو کہ اس کے بعد ہماری کیا پوزیشن ہوجائے گی۔"
"اس پوزیشن ہی کے خیال نے تو اس حال کو پہنچادیا ہے۔" میں نے کہا "آپ نے ایک چھوٹے سے زخم کو چھپا چھپا کر ناسور بنا دیا۔ اگر ہم دونوں کو شروع ہی میں سب کچھ بتا دیتیں تو آج ایسی نوبت نہیں آتی۔"
"بہرحال بیٹا! جو ہوگیا وہ ہوگیا۔" امی دھیرے سے بولیں "ہاں، ایک بات سختی سے کہہ رہی ہوں، اس پر دھیان رکھنا۔ کسی بھی حال میں اپنے ابو کو اپنے پاس مت بلانا۔ چاہے وہ کچھ بھی کہتے رہیں۔ اپنی محبت کا کتنا ہی واسطہ دیں۔ ان سے ملنے سے انکار کرتی رہنا، تم بھی اور علیزا بھی۔"
"آخر کیوں...... یہ تو بہت سخت قسم کی پابندی ہے۔" میں نے کہا "ایک باپ بیٹی سے ملنے کے لیے آنا چاہے تو بیٹی کس طرح روک سکتی ہے؟"
"کسی طرح بھی ہو، روکنا پڑے گا۔ ایک بار...... اور تم دونوں کو سمجھانے کی کوشش کر رہی ہوں۔ جس طرح پہلے سمجھانے کی کوشش کی، لیکن تم دونوں نے میری بات نہیں سنی، بہرحال اب یہ بتا رہی ہوں۔"
اس کے بعد دو چار دنوں تک خاموشی رہی۔ نہ تو امی نے فون کیا اور نہ ہی ابو کا کوئی فون آیا پھر کافی دنوں بعد ایک دن ابو کا فون آ ہی گیا۔
وہ وہی سب کچھ کہہ رہے تھے جو امی نے کہا۔ وہ ہم دونوں سے ملنے کی خواہش کر رہے تھے "بیٹا، کئی دن ہوگئے ہیں۔ تم دونوں کو دیکھے ہوئے۔ ملنے کے لیے تڑپ رہا ہوں۔ میں آرہا ہوں تمہارے پاس۔"
"نہیں ابو! آج تو ہم دونوں گھر پر نہیں ہیں۔" میں نے کہا۔
"کہاں ہو تم دونوں؟"
"ہمیں ایک دوست نے بلایا ہے۔ ہم اس کے گھر پر ہیں۔"
"میں سمجھ گیا۔ یہ حرکت بھی اسی کمینی عورت کی معلوم ہوتی ہے۔" ابو غصے سے بھناتے ہوئے تھے "اسی نے منع کردیا ہوگا کہ باپ سے مت ملو۔ اسی نے زندگی بھر تم دونوں کو مجھ سے الگ رکھا ہے اور اب پھر اسی چکر میں ہے۔"
"ابو ایسی بات نہیں ہے۔ آپ ان کو غلط مت سمجھا کریں۔"
"خاموش!" ابو زور سے دہاڑے "کیا غلط ہے اور کیا نہیں ہے۔ میں سب جانتا ہوں، میں اس کا دماغ درست کردوں گا۔"
"نہیں ابو!" میں جلدی سے بولی۔ میرے لہجے میں بے پناہ غصہ اور تلخی تھی "آپ امی کو کچھ بھی نہیں کہیں گے۔ اگر آپ نے ایسا کیا تو یہ آپ کے لیے بہت برا ہوگا۔"
"اچھا...... کیا کرلے گی تو؟"
"میں آپ کے خلاف فراڈ کا کیس کردوں گی۔" میں نے کہا "آپ نے مجھ سے فراڈ کرکے دس لاکھ روپے لیے ہیں۔ آنے والا انسپکٹر آپ کا دوست ہے۔ آپ دونوں مل کر عیاشیاں کرتے ہیں۔ میں سب جانتی ہوں۔ میرے پاس سارے ثبوت ہیں۔"
دوسری طرف بالکل خاموشی ہوگئی۔ ابو کو توقع ہی نہیں ہوگی کہ میں اتنی بڑی بات کہہ جاؤں گی۔ میں نے انہیں ہلا کر رکھ دیا تھا۔
لیکن وہ ایسے ہی تھے۔ کاش...... ہم نے انہیں بلایا نہیں ہوتا۔ وہ ہم سے دور ہی بہتر تھے۔
دوسرے دن امی کا فون آگیا۔ وہ مجھ سے کہہ رہی تھیں "بیٹا! کیا ابو سے تمہاری کوئی بات ہوئی تھی؟"
"ہاں۔" میں نے انہیں بتا دیا "اب کیا بات ہوئی؟"
"اب وہ پھر پریشان ہیں۔" امی نے بتایا "بار بار یہی کہتے ہیں کہ عالیہ سے ایسی توقع نہیں تھی کہ وہ مجھے اتنی بڑی بات کہہ جائے گی۔"
ایک لمحے کے لیے میرے دل میں ابو کے لیے نرمی سی محسوس ہونے لگی۔ شاید مجھے یہ نہیں کہنا چاہیے تھا۔ میں نے غلطی کردی تھی۔ پھر احساس ہوا کہ وہ اسی قابل تھے۔ ان کے ساتھ جو بھی ہو وہ کم تھا۔
امی نے پھر کہا "بیٹا، اس کے باوجود میں ایک بار پھر تم دونوں سے کہہ رہی ہوں کہ ان سے ملنے یا انہیں بلانے کی حماقت مت کرنا۔ چاہے وہ سر پٹک کر مرجائیں۔"
"امی! کہیں ایسا تو نہیں کہ خدا کے یہاں میری گرفت ہوجائے کہ میں نے اپنے باپ کے ساتھ ایسا سلوک کیا ہے۔"
"بے وقوف مت بنو۔ ایسے باپ کے لیے کوئی گرفت نہیں ہوگی۔" امی نے کہا "خدا بھی دیکھ رہا ہے۔"

دو چار دن اسی طرح گزر گئے۔ اب انور بھی آنے والے تھے کہ ایک صبح میرے پڑوسی کا فون آ گیا۔ وہ مجھے بتا رہے تھے "عالیہ! میں تمہارا پڑوسی افضل بول رہا ہوں۔"

"جی افضل انکل! خیریت تو ہے نا؟"

"نہیں بیٹا! خیریت نہیں ہے۔" افضل صاحب نے کہا "تم دونوں فوری طور پر گھر آ جاؤ۔"

میں دھک سے رہ گئی۔ خدا جانے کیا بات ہوئی ہوگی۔ میں نے علیزا سے کہا تو وہ بھی زرد پڑ گئی "عالیہ باجی! مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے، کیا ہوا ہوگا؟"

"مجھے کچھ نہیں معلوم۔" میں نے کہا "افضل صاحب نے کچھ نہیں بتایا ہے۔ فوراً گھر چلو۔"

ہم دونوں اسی وقت روانہ ہو گئے۔

ابو کی لاش گیٹ کے اندر ہی پڑی ہوئی تھی جس پر چادر ڈال دی گئی تھی۔ ہم دونوں بہنیں چکرا کر گر پڑی تھیں۔ یہ بہت بڑا سانحہ تھا۔

اندر کمرے میں امی پولیس والوں کے نرغے میں سر جھکائے بیٹھی تھیں۔ ہم دونوں ان سے لپٹ کر رونے لگیں۔

"امی! آپ نے ایسا کیوں کیا، کیوں کر دیا ایسا؟"

"بس بیٹا! ایسی زندگی کا یہی انجام ہونا تھا۔" امی دھیرے سے بولیں۔ اس وقت ان کا چہرہ بالکل سپاٹ ہو رہا تھا۔ کوئی تاثر نہیں تھا۔ ان کی آنکھیں بھی ویران ہو رہی تھیں۔

امی کے سارے رشتے دار جمع ہو چکے تھے۔ ان کا بیان لیا جا چکا تھا۔ یہ ابتدائی بیان تھا۔ امی بار بار خود اعتراف کر رہی تھیں کہ ہاں انہوں نے ہی گولی ماری ہے۔ کیونکہ ان کا شوہر اسی قابل تھا۔

بہرحال امی کو گرفتار کر لیا گیا۔ ہم دونوں بہنوں کی حالت خراب ہو رہی تھی۔ حالانکہ ہمیں سنبھالنے کے لیے پورا خاندان موجود تھا۔

پھر بھی ہم لٹ تو گئے تھے نا۔ ابو مر چکے تھے اور امی ان کے قتل کے الزام میں گرفتار ہو چکی تھیں۔ چونکہ انہوں نے فوری طور پر اپنے جرم کا اعتراف کر لیا تھا اسی لیے انہیں دوسری ہی صبح عدالت میں پیش کر کے جیل بھیج دیا جاتا۔ اس کے بعد یہ کیس چلتا رہتا۔

ہم پر تو اسی دن سے تباہی آنی شروع ہو گئی تھی جس دن ہم نے ابو کو وطن واپس بلوایا تھا۔ بس وہ آغاز تھا، جس کا انجام اب ہمارے سامنے آیا تھا۔

اس کہانی کو اسی طرح ختم ہونا تھا۔

انور کا فون بھی آ گیا۔ انہیں بھی اس حادثے کی خبر ہو چکی تھی اور وہ فوری طور پر وطن واپس آ رہے تھے۔ ہم نے وہ رات اسی گھر میں گزاری تھی۔ جہاں ہر طرف اچھی اور بری یادیں بکھری ہوئی تھیں۔ دونوں خالائیں ہمارے ساتھ ہی تھیں۔ ان کا بھی یہی کہنا تھا کہ ان کی بہن یعنی میری امی ایک صابر عورت ہے۔ جس نے ایسے شخص کے ساتھ اتنے برس گزار دیے، کوئی اور ہوتی تو بہت پہلے خون کر چکی ہوتی۔

صبح خاندان والوں کی ہنگامی میٹنگ بھی ہوئی جس میں طے پایا کہ امی کی رہائی کے لیے کسی اچھے وکیل کا بندوبست کیا جائے گا۔

اسی رات انور بھی واپس آ گئے۔

وہ ہمیں بہت دیر تک تسلی دیتے رہے، کمال کے آدمی تھے۔ میرے خاندان کی پوری کہانی ان کے سامنے آ گئی تھی۔ یعنی ابو شرابی اور عیاش، ماں قاتل۔ اس کے باوجود وہ ہم دونوں سے یہی کہتے رہے کہ "ارے عالیہ! اس میں تم دونوں کا کیا قصور ہوا؟ وہ تو اس شخص کی نیچر ہی ایسی تھی۔ ایسا شخص کسی بھی ماحول اور کسی بھی خاندان میں پیدا ہو سکتا ہے۔ البتہ آنٹی کے لیے میں ضرور کوشش کروں گا۔ انہوں نے تم دونوں کو ایسے باپ سے محفوظ رکھنے کے لیے جتنی قربانیاں دی ہیں، اس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔"

"واقعی، ہمیں اپنی ماں پر فخر ہے۔" علیزا نے کہا۔

عدالت میں امی نے اپنے جرم کا اعتراف کر لیا تھا۔ انور نے ایک اچھے وکیل کی خدمات حاصل کر لی تھیں جس نے دنیا بھر سے شواہد اکٹھے کر کے عدالت کے سامنے پیش کر دیے اور ثابت ہو گیا کہ ابو ایک انتہائی عیاش اور ظالم شخص تھے اور کوئی بھی ان کا خون کر سکتا تھا۔ اس دن جو کچھ ہوا وہ حادثاتی طور پر ہوا تھا۔

عدالت نے امی کو صرف تین برس کی سزا سنائی تھی۔

اور یہ تین برس بھی گزر ہی جائیں گے، امی جیل میں ہیں۔ ہم پابندی کے ساتھ امی سے ملنے جاتے ہیں۔ امی نے یہ بتایا کہ ان کے گھر والوں نے اسی بنیاد پر شادی کی تھی کہ لڑکا ملک سے باہر ہے اور اچھی آمدنی ہے۔ بس اس کے علاوہ انہوں نے کچھ اور جاننے کی زحمت گوارا نہیں کی تھی۔

اور آج میں بھی یہ سب کچھ لکھتے ہوئے یہ سوچ رہی ہوں کہ اس ملک کے اور نہ جانے کتنے رشتے اسی بنیاد پر طے ہو رہے ہوں گے۔

* *

ٹوٹے رشتے

محترمہ عذرا رسول صاحبہ

سلام تہنیت

بچپن سے مجھے پڑھنے پڑھانے کا شوق تھا اور آج بھی یہ شوق قائم ہے۔ میری بچیاں کہتی ہیں کہ مما آپ سارا دن دفتر میں دفتری کاغذات پڑھتی ہیں اور گھر آکر ڈائجسٹ لے کر بیٹھ جاتی ہیں۔ دوسروں کی کہانیاں پڑھتے پڑھتے خیال آیا کہ اپنی آپ بیتی بھی لکھ دوں، پہلی کوشش ہے اگر الفاظ کے انتخاب میں کوئی خامی نظر آئے تو اسے دور کرلیں۔

کوثر زید حسن

(کراچی)

آج میں نے اپنی تیسری اور آخری بیٹی کو بھی رخصت کر دیا۔ ماریہ میری سب سے چھوٹی بیٹی ہے۔ وہ صرف اکیس برس کی ہے۔ اس نے ایک سال پہلے گریجویشن کیا تھا اور ماسٹرز کرنا چاہتی تھی لیکن میں نے اس کی اجازت نہیں دی۔ میں اس کی شادی کرنا چاہتی تھی۔ اس سے بڑی ثنا اور مونا کی شادی چوبیس پچیس برس کی عمروں میں کی تھی۔ دونوں نے ماسٹر کیا تھا اور ماریہ اسی پر روتی رہی کہ جب میں نے بڑی بیٹیوں کو ماسٹر کرایا ہے تو اسے کیوں نہیں کرایا؟ میں نے اسے یا کسی کو بھی نہیں بتایا کہ میں کیوں اس کی شادی میں جلدی کر رہی ہوں۔ ڈاکٹر نے مجھے ایک سال پہلے بتا دیا تھا کہ میرے دل کے ایک وال کی رگیں بند ہو رہی ہیں اور اگر میں نے بروقت علاج اور توجہ نہ کی تو یہ وال ناکارہ ہو جائے گا اور اس

www.paksociety.com

سے دوسرا وال بھی متاثر ہوگا۔ میں نے ڈاکٹرز کے بتائے علاج اور احتیاطی تدابیر پر کوئی توجہ نہیں دی تھی میں نے نہ تو کوئی دوا کھائی اور نہ دوبارہ ڈاکٹر کے پاس گئی۔

اس کے بعد میں نے اپنی ساری توجہ ماریہ کو جلد از جلد اس کے گھر کا کرنے پر مرکوز کرلی۔ ماریہ اور میری دوسری دو بیٹیاں حیران تھیں کہ میں ماریہ کی باری میں اتنی جلدی کیوں کر رہی ہوں؟ ایک بار مونا نے مجھ سے کہا۔ "ماما آپ کو کس بات کی جلدی ہے ابھی تو آپ خود ینگ ہیں۔ ففٹی ٹو ایئرز بھی کوئی عمر ہوتی ہے۔ آپ ویسے بھی اپنی عمر سے دس سال کم لگتی ہیں۔"

مونا ٹھیک کہہ رہی تھی، میرے بال قدرتی طور پر سیاہ تھے اور ان میں بہت کم سفید بال آئے تھے۔ میرے چہرے پر جھریاں نہیں تھیں اور جسم بھی متناسب تھا اس لیے دیکھنے والے مجھے چالیس سے زیادہ کی نہیں سمجھتے تھے۔ لوگ تو یہ بھی کہتے تھے کہ میں ثنا کی بڑی بہن لگتی ہوں۔ میں نے مونا سے کہا۔ "بس بیٹا مجھے ڈر لگتا ہے کہیں اچانک میرا بلاوا نہ آجائے اور یہ آخری فرض پورا ہونے سے رہ جائے۔"

مونا مجھ سے لپٹ گئی تھی۔ "پلیز ماما ایسی بات نہ کریں، ابھی آپ کو بہت جینا ہے۔"

"بیٹا ہر انسان اتنا جیتا ہے جتنی اس کی عمر ہوتی ہے اس سے پہلے نہ وہ مر سکتا ہے اور نہ اس کے بعد جی سکتا ہے۔"

ماریہ اور دوسروں کی مخالفت کے باوجود میں نے ماریہ کے لیے رشتے کی تلاش جاری رکھی۔ بالآخر میری ایک کولیگ کے بیٹے کا رشتہ مجھے پسند آگیا۔ علیہ احمد میرے ساتھ ہی بینک میں کام کرتی تھیں اور ہمارے درمیان فیملی کی سطح پر تعلقات تھے۔ ان کی دو بیٹیاں مائرہ اور سارہ میری بیٹیوں کی سہیلیاں تھیں۔ علیہ کا بیٹا فراز کالج کے بعد اعلیٰ تعلیم کے لیے اسکالرشپ پر کینیڈا چلا گیا تھا۔ وہ تعلیم مکمل کر کے واپس آیا تھا اور ایک اچھی کمپنی میں جاب کر رہا تھا۔ علیہ اس کے لیے رشتے کی تلاش میں تھی جب اسے پتا چلا کہ میں ماریہ کے لیے رشتے کی تلاش میں ہوں تو ایک دن لنچ پر اس نے مجھ سے کہا۔ "کوثر سنو ہم سمدھن کیوں نہ بن جائیں؟"

میں چونکی۔ "کیا مطلب؟"

علیہ ہنسی۔ "کس بات کا، سمدھن کا یا سمدھن بن جانے کا؟"

"دونوں کا۔"

"بھئی سیدھی سی بات ہے تم جانتی ہو فراز میرا ایک ہی بیٹا ہے۔ باہر سے پڑھ کر آیا ہے اور ماشا اللہ اچھی جاب پر سیٹ ہوگیا ہے۔ میں اب اس کے لیے لڑکی تلاش کر رہی ہوں۔ تمہاری بیٹی سے زیادہ موزوں لڑکی اور کون ہو سکتی ہے۔"

فراز میرا دیکھا بھالا لڑکا تھا اور بہت اچھا تھا۔ علیہ کی بات فوراً میرے دل میں اُتر گئی۔ "علیہ میں کچھ دن میں سوچ کر اور سب سے پوچھ کر بتاتی ہوں۔"

"ہاں.... ہاں آرام سے جواب دو، بس یہ بات یاد رکھنا کہ ماریہ اب میری بیٹی ہے۔"

میں نے ماریہ اور دونوں بیٹیوں سے بات کی۔ باقی رشتے داروں میں کوئی ایسا نہیں ہے جس سے اس معاملے میں رائے لی جاتی۔ ماریہ راضی تھی، جب کہ ثنا اور مونا تو بہت خوش تھیں۔ ان کی فراز سے ہنسی مذاق اور بے تکلفی تھی۔ انہیں بھی فراز پسند آیا، یوں یہ رشتہ طے ہوگیا۔ علیہ نے شادی کے لیے چار مہینے کی مہلت مانگی تھی۔ ہمیں بھی اتنا وقت درکار تھا۔ دونوں طرف سے تیاریاں شروع ہوئیں اور دیکھتے ہی دیکھتے چار مہینے کا وقت گزر گیا۔ شادی کا وقت آیا اور میں نے اپنی آخری بیٹی کو بھی رخصت کر دیا۔ شادی اور اس کے انتظامات اتنے اچھے تھے کہ شرکت کرنے والوں نے رشک کیا تھا۔ سب یہی کہہ رہے تھے کہ شوہر کے نہ ہوتے ہوئے بھی میں نے اکیلے بیٹیوں کو کتنے اچھے طریقے سے پالا، ان کی پرورش کی، پڑھایا لکھایا اور اتنے اچھے انداز میں ان کی شادیاں کیں۔ ماریہ کی طرح ثنا اور مونا کو بھی اچھے شوہر ملے تھے۔ ثنا کا شوہر گیس کے محکمے میں افسر تھا اور مونا کا شوہر سول انجینئر تھا اور اپنی فرم چلا رہا تھا۔

ماریہ رخصت ہو کر چلی گئی۔ شادی ہال سے ثنا اور مونا میرے ساتھ آئی تھیں۔ انہوں نے اپنے شوہروں سے کہہ دیا تھا کہ امی بالکل اکیلی ہوگئی ہیں اور پھر شادی کے بعد بھی کچھ رسومات ہوتی ہیں۔ اس لیے وہ میرے ساتھ ٹھہریں گی۔ ثنا کے دو بیٹے تھے اور مونا کا ایک بیٹا اور ایک بیٹی تھی۔ میرے گھر میں ان کے بیڈ روم ابھی تک ویسے ہی موجود تھے اس لیے وہ جب آتیں تو اپنے کمروں میں ٹھہرا کرتی تھیں۔ بچے تھک گئے تھے ان کو لٹا کر وہ میرے پاس آگئیں۔ مونا نے کہا۔

"ماما ہم آپ کے شکر گزار ہیں آپ نے کبھی ہمیں پاپا کی کمی محسوس ہونے نہیں دی۔"

"یہ میری محبت اور میرا فرض تھا۔" میں نے آہستہ سے کہا تو مونا اور ثنا جذباتی ہوگئی تھیں۔ ان کا اصرار تھا کہ میں نے اپنا فرض بہت اچھے طریقے سے نبھایا ہے اور دنیا میں مجھ جیسی مائیں بہت کم ہوتی ہیں۔ ان کی باتیں سن کر میں سوچ رہی تھی کہ کیا واقعی میں نے اپنا فرض بہت اچھی طرح نبھایا

ہے۔ میں نے جو کیا وہ واقعی ٹھیک ہے؟ دنیا کا کوئی قانون، کوئی ضابطہ اسے درست مانے گا جو میں نے اپنی بچیوں کا مستقبل بہتر بنانے کے لیے کیا؟

☆☆☆

میں اسکول سے لوٹی تھی اور گھر میں داخل ہوتے ہی امی اور ابو کے تیز تیز بولنے کی آواز سنی۔ حسب معمول ان میں جھگڑا ہو رہا تھا۔ یہ کوئی نئی بات نہیں تھی۔ جب سے میں نے ہوش سنبھالا تھا ان میں لڑائی ہی دیکھی تھی۔ مجھے نہیں یاد میری زندگی میں ایسا کوئی موقع آیا ہو جب میں نے امی ابو کو ایک ساتھ بیٹھے اور ہنستے بولتے دیکھا ہو۔ صبح سے شام تک وہ جتنی دیر بھی ساتھ رہتے تھے گھر میں مستقل ایک کشیدگی والا ماحول بنا رہتا تھا۔ ابو آٹو پارٹس کا بزنس کرتے تھے۔ امی گھر پر ہی تھیں لیکن دونوں کی آپس میں نہیں بنتی تھی۔ میں نہیں جانتی اس کشیدگی کے پیچھے کیا وجہ تھی؟ ابو کسی کو پسند کرتے تھے اور ان کی شادی امی سے کردی گئی یا امی کسی کو پسند کرتی تھیں اور ان کی شادی ابو سے ہوگئی یا اس کے پیچھے کوئی اور وجہ تھی۔ امی ابو نے کبھی اس کی وضاحت نہیں کی۔ ان کی لڑائیوں میں بھی ایسا کوئی ذکر نہیں آتا تھا۔ وہ بس معمولی معمولی باتوں پر لڑتے تھے۔ چھوٹے چھوٹے گھریلو مسائل تھے جن کا حل بہت آسانی سے بغیر لڑے نکل سکتا تھا لیکن وہ ان کے پیچھے گھنٹوں لڑتے تھے اور ان کی لڑائی اس طرح ختم ہوتی تھی کہ ابو گھر سے چلے جاتے تھے یا رات ہو جاتی اور وہ تھک کر سونے پر مجبور ہو جاتے۔

میں صحن میں چارپائی پر بیٹھ گئی اور انتظار کرنے لگی کہ کب لڑائی ختم ہوتی ہے۔ کچھ دیر بعد ابو بولتے ہوئے باہر آئے اور مجھے دیکھ کر ٹھٹک گئے۔ "کوثر بیٹا تم کب آئیں اسکول سے؟"

"جب آپ دونوں لڑ رہے تھے۔" میں نے تلخی سے کہا اور اٹھ کر اپنے کمرے میں آگئی۔ اس وقت میں دس گیارہ سال کی تھی اور مجھے اتنا اندازہ ہوگیا تھا کہ امی ابو ایک دوسرے کو بالکل پسند نہیں کرتے ہیں۔ ان کی باقی زندگی بھی اسی طرح لڑتے جھگڑتے گزرے گی۔ میں ان کی ایک ہی اولاد تھی۔ قدرت نے مزید بچے نہیں دیے اور اس جہنم میں جلنے کو میں اکیلی رہ گئی تھی۔ یہ سچ ہے ماں باپ کا گھر چاہے وہ کتنا معمولی کیوں نہ ہو بیٹیوں کے لیے جنت سے کم نہیں ہوتا۔ لیکن میرے لیے یہ گھر جہنم تھا۔ خاص طور سے اس وقت جب امی ابو ساتھ ہوتے اور ان میں لازمی جھگڑا ہوتا تھا۔ اس وقت میرا دل چاہتا کہ چیخیں مار مار کر روؤں یا گھر سے کہیں بھاگ جاؤں۔

آپس میں جھگڑے سے قطع نظر امی ابو دونوں مجھ سے بہت پیار کرتے تھے۔ میری ایک ایک بات کا خیال رکھتے، ابو نے مجھے ہر چیز لا کر دی ہوئی تھی، امی میری ہر خواہش پوری کرتی تھیں۔ اگر وہ خیال نہیں رکھتے تھے تو گھر کے ماحول کا خیال نہیں رکھتے تھے۔ میں بچپن سے ترستی رہی کہ کبھی اپنے ماں باپ کو آپس میں ہنستے بولتے دیکھوں اور یقین کریں میری یہ خواہش ایک بار بھی پوری نہیں ہوئی تھی۔ نہ جانے کیا بات تھی امی ابو ایک دوسرے کو دیکھتے تھے اور ان کی تیوریاں چڑھ جاتی تھیں۔ ذرا سی کوئی بات ہوتی اور ان کی لڑائی شروع ہو جاتی تھی۔

امی ابو کی لڑائی ویسی نہیں ہوتی تھی جس میں گالی گلوچ یا نازیبا الفاظ استعمال ہوتے ہیں۔ مار پیٹ کی بھی نوبت نہیں آئی۔ بس دونوں تند و تیز اور نوکیلے جملوں سے ایک دوسرے پر حملے کرتے تھے۔ ان کی لڑائی دھیمے انداز میں لیکن مسلسل یوں جاری رہتی تھی جیسے کسی پتھر پر ہلکی دھار سے پانی گرتا ہے اور یہ پانی بالآخر پتھر میں سوراخ کر دیتا ہے۔ اس گھر میں وہ پتھر میں تھی جس میں تواتر سے ہونے والے جھگڑوں کی بوندوں نے بالآخر سوراخ کر دیا تھا۔ جب میں اسکول میں داخل ہوئی تو عام بچوں کی نسبت میں نے رونا دھونا نہیں کیا تھا بلکہ خوشی خوشی اسکول جانے لگی تھی۔ کیونکہ جتنی دیر میں اسکول میں رہتی تھی گھر کے ماحول سے بچی رہتی۔ جب چھٹی کا وقت قریب آتا تو مجھے ہول اُٹھنے لگتے تھے اور میں گھر کی طرف جاتے ہوئے دعا کرتی کہ ابو گھر پر نہ ہوں لیکن یہ دعا کم ہی قبول ہوتی تھی کیونکہ ابو دوپہر کا کھانا گھر پر کھاتے تھے بلکہ تینوں وقت کا کھانا اور شام کی چائے بھی گھر پر ہی ہوتی

"کیسا ستم ہے کہ اردو اور اردو کے حامیوں پر کوئی فرقہ پرستی کا الزام لگائے، اردو کسی فرقے کی زبان نہیں ہے، کسی مذہب کی زبان نہیں ہے، کسی حکومت کی چلائی ہوئی زبان نہیں ہے، کسی خاص نیت سے مصنوعی گڑھی ہوئی زبان نہیں ہے، یہ تو زندگی کی ریل پیل میں انسانوں کے میل جول کا پھل تھا، لوگوں کی بھاشا کی زبان ہے۔"

(ہندکی مشترکہ زبان، اردو از ڈاکٹر ذاکر حسین، سابق صدر ہندوستان)

مرسلہ: نصرت بجنوری، کراچی

www.Paksociety.com

تھی۔ میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ جب امی ابو کی آپس میں نہیں بنتی تھی تو ابو اپنے کام سے اتنی بار گھر کیوں آتے تھے۔ ایک دن میں نے امی سے پوچھ لیا تھا۔

"امی جب آپ اور ابو کی آپس میں نہیں بنتی ہے تو آپ ایک دوسرے کے ساتھ کیوں رہتے ہیں؟"

"اگر ساتھ نہ رہیں تو کیا کریں؟"

"الگ ہو جائیں۔" میں نے بغیر سوچے سمجھے کہا۔

"نہ صوفی۔" امی سہم گئیں۔ "یہ بات پھر منہ سے نہ نکالنا۔"

"تو پھر لڑتے کیوں ہیں؟" میں نے تنگ آ کر کہا۔

"تیرے ابو لڑتے ہیں مجھ سے۔"

"ابو بھی یہی کہتے ہیں کہ آپ لڑتی ہیں ان سے اور میں نے آپ دونوں کو کبھی خاموش ہوتے نہیں دیکھا ہے۔"

امی سرد آہ بھر کو بولیں۔ "بس میری بچی ہماری قسمت میں یہ لکھا تھا۔"

میں اس وقت بچی تھی الفاظ میں امی ابو کو نہیں بتا سکتی تھی کہ انہوں نے اپنی شادی کو قسمت کے کھاتے میں ڈال دیا تھا لیکن اس میں میرا کیا قصور تھا جو ان کی وجہ سے نفسیاتی مریض بنتی جا رہی تھی۔ ایک دن میں اسکول سے آئی اور حسب معمول صحن میں بیٹھ کر امی ابو کی لڑائی سن رہی تھی کہ نہ جانے مجھے کیا ہوا میں نے زور زور سے ہنسنا شروع کر دیا۔ مجھے تعجب ہو رہا تھا کہ میں ہنس رہی ہوں کیونکہ ہنسنے کی کوئی وجہ نہیں تھی لیکن میں کوشش کے باوجود میں اپنی ہنسی نہیں روک پا رہی تھی۔ میری آواز سن کر امی ابو باہر آئے اور انہوں نے مجھے خاموش کرانے کی کوشش کی لیکن میں چپ نہیں ہوئی بلکہ ہنستے ہنستے بے ہوش ہو گئی۔

امی ابو کے ہاتھ پاؤں پھول گئے اور وہ مجھے لے کر اسپتال کی طرف بھاگے جہاں مجھے داخل کر لیا گیا۔ ڈاکٹرز نے مجھے ہلکا نروس بریک ڈاؤن تشخیص کیا۔ ان کا کہنا تھا کہ میں کسی وجہ سے اپنے اعصاب پر دباؤ برداشت نہیں کر سکی اور میرا نروس بریک ڈاؤن ہو گیا۔ ڈاکٹروں نے امی ابو کو خبردار کیا کہ اگر وجہ دور نہیں ہوئی تو میرا اگلا دورہ شدید بھی ہو سکتا ہے اور میں ہمیشہ کے لیے دماغی مریضہ بن سکتی ہوں۔ میں دو دن اسپتال میں داخل رہی اور پھر گھر آ گئی۔ اس کے بعد گھر میں کچھ دن سکون رہا تھا کیونکہ ابو بہت کم گھر آتے تھے اور جب آتے تو بس میرے پاس بیٹھے رہتے۔ ان چند دنوں میں میں بہت خوش تھی اور میرا خیال تھا کہ شاید اب ہمارے گھر کا ماحول بدل جائے اور ہم بھی نارمل زندگی گزار سکیں۔

لیکن اندرون خانہ امی ابو کیا طے کر رہے تھے اس کا مجھے اندازہ نہیں تھا۔ میرے اسپتال سے آنے کے ایک ہفتے بعد ابو نے اپنا سامان لیا اور گھر سے جانے لگے۔ میں پریشان ہو گئی۔ "ابو آپ کہاں جا رہے ہیں؟"

"میں اس گھر سے ہمیشہ کے لیے جا رہا ہوں۔" ابو نے مجھ سے نظریں ملائے بغیر کہا۔

"مگر کیوں ابو؟"

"کیونکہ..... کیونکہ ہم دونوں میں علیحدگی ہو گئی۔" ابو نے آہستہ سے کہا۔ میں دنگ رہ گئی بارہ سال کی عمر میں مجھے اتنا تو معلوم تھا کہ طلاق کیا ہوتی ہے لیکن گھر کے انتہائی خراب ماحول کے باوجود میں نے کبھی نہیں سوچا تھا کہ امی ابو میں طلاق ہو سکتی تھی۔ میں نے گھبرا کر پوچھا۔

"کیا آپ نے امی کو طلاق دیدی ہے؟"

جب ابو نے سر ہلایا تو میں ایک بار پھر بے ہوش ہو گئی تھی۔ اس بار ہونے والا صدمہ اتنا شدید تھا کہ میں مرتے مرتے بچی تھی۔ ہوش میں آنے کے بعد بھی کتنے دن میری حالت خراب رہی تھی۔ بڑی مشکل سے میں نے اس حقیقت کو قبول کیا کہ امی ابو کے درمیان ہمیشہ کی علیحدگی ہو چکی ہے۔ ابو نے گھر میرے نام کر دیا تھا اور گھر کا سارا خرچ بھی وہی برداشت کر رہے تھے انہوں نے امی کے نام سے بینک اکاؤنٹ کھول دیا جس میں وہ ہر مہینے رقم جمع کرا دیتے تھے اور یہ اتنی ہوتی تھی کہ ہمارے گزارے کے لیے کافی تھی۔ ایک مہینے بعد جا کر میری حالت ایسی ہوئی کہ میں اسکول جا سکتی تھی اور جب میں اسکول پہنچی تو وہاں امی ابو کی علیحدگی کی کہانی پہلے ہی پہنچ چکی تھی اور لڑکیوں نے مجھے اس حوالے سے اتنا تنگ کیا کہ میں نے مجبوراً امی سے کہہ کر دوسرے اسکول میں داخلہ لے لیا۔

آج سے کوئی چالیس سال پہلے ہمارے معاشرے میں طلاق بہت ہی بُری بات سمجھی جاتی تھی۔ جن ماں باپ کے درمیان علیحدگی ہو جاتی تھی ان کے بچوں کو لوگوں کی بہت باتیں سننا پڑتی تھیں۔ یہی میرے ساتھ بھی ہوا۔ میری سہیلیاں مجھ سے کترانے لگی تھیں۔ ہم جس محلّے میں رہتے تھے وہاں گلی میں تقریباً ہر گھر میں امی کا آنا جانا تھا اور ان گھروں سے بھی خواتین ہمارے ہاں آتی تھیں لیکن جب امی ابو میں علیحدگی ہوئی تو محلّے کی خواتین امی سے کھنچ گئی تھیں۔ انہوں نے ہمارے ہاں آنا جانا بھی چھوڑ دیا تھا اور جب امی ان کے گھر جاتیں تو وہ ان سے روکھے انداز میں پیش آتی تھیں۔ رفتہ رفتہ امی نے بھی دوسروں کے گھروں میں جانا

چھوڑ دیا۔ لڑکیاں مجھ سے نہیں ملتی تھیں، اتفاق سے امی ابو کے زیادہ رشتے دار نہیں تھے اور جو تھے ان سے ہمارا ملنا جلنا نہیں تھا۔ ہم ماں بیٹی تنہائی کا شکار ہو گئے۔

میرا خیال تھا کہ ماں باپ کے ساتھ رہنا اور ان کی لڑائی برداشت کرنا دنیا میں سب سے اذیت ناک بات ہے لیکن امی ابو میں علیحدگی کے بعد مجھے اندازہ ہوا کہ ماں باپ ہوں اور ان میں طلاق ہو چکی ہو تو بچّوں کے لیے اس سے زیادہ اذیت ناک امر اور کوئی نہیں ہوتا ہے۔ ابو اب الگ کہیں رہتے تھے اور وہ ہفتے میں ایک بار چند گھنٹوں کے لیے مجھ سے ملنے آتے تھے۔ جب وہ آتے تو امی اپنے کمرے میں بند ہو جاتی تھیں اور اس وقت تک باہر نہیں آتی تھیں جب تک ابو نہیں چلے جاتے تھے۔ اس کے باوجود جب ابو آتے تو محلّے والے عجیب نظروں سے ہمیں دیکھتے تھے۔ ان کی نظروں سے تنگ آ کر امی نے یہ کرنا شروع کر دیا کہ جب ابو کو آنا ہوتا تو وہ گھر سے کہیں چلی جاتی تھیں اور جب ابو جاتے تب واپس آتی تھیں۔ یہ بہت اذیت ناک دن تھے۔ میں اتنی بڑی ہو چکی تھی کہ مجھے ان باتوں کا شعور آ گیا تھا جب میں اسکول آتی جاتی تو مجھے دیکھ کر لوگ معنی خیز باتیں کرتے تھے۔ میں گھر آ کر امی کو بتاتی اور روتی تھی۔ امی بھی سوائے رونے کے اور کچھ نہیں کر سکتی تھیں۔ ایک دن جب ابو آئے تو میں ان سے لڑ پڑی کہ انہوں نے امی کو طلاق دے کر ہماری لیے زندگی اور مشکل بنا دی ہے۔ جب ابو کو پتا چلا کہ محلّے والے کیا بات کرتے ہیں تو انہیں غصہ آ گیا تھا۔

"یہ سب جاہل اور گنوار لوگ ہیں اب تم دونوں یہاں نہیں رہو گے۔"

"پھر ہم کہاں جائیں گے؟"

ابو نے جواب دیا۔ "میرا گلشن اقبال میں ایک پلاٹ ہے میں اس پر مکان بنا کر تم دونوں کو وہاں منتقل کر دیتا ہوں، وہاں اچھے لوگ رہتے ہیں اور کوئی تم سے غلط رویّہ نہیں رکھے گا۔"

ان دنوں میں میٹرک میں تھی جب ابو نے مکان بنا کر ہمیں وہاں منتقل کر دیا۔ یہ بڑا اور خوب صورت مکان تھا۔ اسے ابو نے میرے نام کر دیا اور پُرانا والا مکان فروخت کر دیا۔ ان کا یہ خیال درست نکلا کہ یہاں اچھے لوگ رہتے ہیں اور وہ ہم سے غلط رویّہ نہیں رکھیں گے۔ کسی نے ہمیں تنگ نہیں کیا لیکن جب لوگوں کو پتا چلا کہ امی کو طلاق ہو گئی ہے تو وہ ہم سے ملنے جلنے میں احتیاط برتنے لگے اور اس طرح ملنا جلنا نہیں کرتے تھے جیسے آپس میں ایک دوسرے سے کرتے تھے۔ بہر حال اتنا بھی بہت تھا کہ کوئی ہمیں غلط نظروں سے نہیں دیکھتا تھا اور نہ ہم پر آتے جاتے آوازیں کسی جاتی تھیں۔ علاقہ بھی اچھا تھا اور تمام سہولتیں بھی قریب تھیں۔ میں نے میٹرک کر لیا تو یہیں مجھے ایک اچھے کالج میں داخلہ مل گیا۔ میں نے کامرس لی تھی۔

ابو کے بارے میں مجھے کچھ نہیں معلوم تھا کہ وہ کہاں رہتے تھے اور کس طرح کھانے پینے کا بندوبست کرتے تھے کیونکہ انہیں باہر سے کھانے کی عادت بالکل نہیں تھی اور اسی وجہ سے وہ امی سے لڑائی رہنے کے باوجود گھر پر ہی کھاتے تھے۔ امی ان کے بارے میں سرے سے بات ہی نہیں کرتی تھیں لیکن میں ابو کے بارے میں سوچتی تھی اور کبھی کبھی مجھے لگتا تھا کہ انہوں نے دوسری شادی کر لی ہوگی البتہ یہ ابو سے پوچھنے کی ہمت نہیں ہوئی تھی۔ میں کالج میں تھی تب بھی ابو ہفتے میں ایک بار مجھ سے ملنے آتے تھے۔ ان دنوں وہ کمزور ہونے لگے تھے اور پھر دو سال میں دیکھتے ہی دیکھتے بہت کمزور اور بوڑھے سے ہو گئے تھے حالانکہ اس وقت بھی ان کی عمر پینتالیس سے زیادہ نہیں تھی لیکن دیکھنے میں وہ ساٹھ کے لگنے لگے تھے۔ میں ابو سے پوچھتی کہ وہ اتنے کمزور کیوں ہو گئے ہیں تو وہ ٹال جاتے تھے۔ پھر ایک بار وہ مجھ سے ملنے نہیں آئے تھے۔ میں پریشان ہو گئی اور جب دوسرا ہفتہ بھی ایسے ہی گزر گیا تو میں نے امی سے کہا۔

"مجھے ابو کی فکر ہو رہی ہے۔ وہ مجھ سے ملنے کیوں نہیں آئے؟"

امی نے کہا۔ "ان کی دکان سے معلوم کیا جا سکتا ہے۔"

میں نے مارکیٹ میں ابو کی دکان دیکھ رکھی تھی وہاں پہنچی تو دکان موجود تھی اور ابو کے ساتھ کام کرنے والا لڑکا بھی تھا لیکن ابو نہیں تھے۔ میں نے ابو کے بارے میں پوچھا تو اس نے نہایت آرام سے کہا۔ "انہیں فالج ہو گیا ہے جناح اسپتال میں پڑے ہیں۔"

"کیا؟" میرے منہ سے چیخ نکلی۔ "کسی نے بتایا نہیں۔"

"مجھے پتا ہی نہیں معلوم تھا کہاں سے بتاتا۔" وہ بولا۔

میں اور امی بھاگم بھاگ جناح اسپتال پہنچے تو ابو وارڈ میں لاوارثوں کی طرح پڑے تھے اور ان کی دیکھ بھال تو کیا ٹھیک سے علاج بھی نہیں ہو رہا تھا۔ درحقیقت جب ہم ابو کو دیکھنے گئے تو وہ آخری دموں پر تھے۔ ڈاکٹرز نے بتایا کہ ان کے بچنے کا امکان بہت کم ہے کیونکہ انہیں بہت تاخیر سے اسپتال لایا گیا تھا۔ دوسرے دن ابو انتقال کر گئے اس وقت

ان کے سرہانے میں اور امی تھے۔ ابو کا کوئی دوست بھی نہیں تھا اور جس ملازم پر وہ سب سے زیادہ بھروسا کرتے تھے اس نے انہیں جان بوجھ کر اسپتال پہنچانے میں دیر کی تا کہ وہ بچ نہ سکیں اور سارا کاروبار اس کے ہاتھ میں آجائے۔ اس کی چال اس حد تک کامیاب رہی کہ ابو بچ نہیں سکے تھے لیکن اگلے ہی دن میں نے جا کر دکان پر تالا لگا دیا اور اس لڑکے کو دکان سے بے دخل کر دیا۔ اس نے بدتمیزی کرنے کی کوشش کی تو آس پاس کے دکاندار میری حمایت کے لیے سامنے آگئے۔ یہ ساری آٹو پارٹس کی مارکیٹ تھی اور اس کے صدر نے مجھے تسلی دی کہ وہ دکان فروخت کرانے اور جائز قیمت دلوانے کی پوری کوشش کریں گے۔ بعد میں ان کی کوشش سے قیمت تو مل گئی لیکن یہ نہیں معلوم کہ جائز ملی یا نہیں۔ ابو ایک کرائے کے مکان میں رہ رہے تھے وہاں سے ان کا معمولی سا سامان اور کچھ رقم کے ساتھ دو بینک اکاؤنٹس کی چیک بک ملی تھیں۔ ان میں مجموعی طور پر کوئی ستر ہزار کی رقم موجود تھی۔ دکان کی فروخت سے جو ملا، وہ ملا کر کوئی دو لاکھ روپے بنتے تھے۔ آج سے بتیس سال پہلے یہ اچھی خاصی رقم تھی اگر ہم اسے ٹھیک طرح سے خرچ کرتے تو یہ کئی سال چل سکتی تھی۔ امی نے یہ کیا کہ کچھ رقم سے مکان کے اوپر والا پورشن بنوا کر نیچے کا کرائے پر دے دیا اور خود ہم اوپر آگئے تھے۔ کرائے اور کچھ ڈیپازٹ کی آمدنی سے کسی قدر گزارا ہونے لگا تھا لیکن ابو کی زندگی والی فارغ البالی تو نہیں تھی۔ ایسا لگتا تھا ابو اپنی ساری ہی آمدنی ہمیں دے دیا کرتے تھے اور خود بس گزارے لائق رکھتے تھے۔

یوں ہماری زندگی سے ابو کا باب ختم ہو گیا۔ مالی تنگی ہوئی تو ہم نے اپنی ضروریات محدود کر لیں۔ میں کالج سے آنے کے بعد شام کو بچوں کو ٹیوشن پڑھانے لگی۔ ابو کے انتقال کے دو سال بعد میں نے بی کام کر لیا۔ میں چاہتی تھی کہ کسی بینک میں جاب کر کے گھر چلاؤں لیکن امی نے ملازمت کی اجازت دینے سے انکار کر دیا۔ ''نہیں صوفی اب اچھا دور نہیں ہے، باہر نکلنے والی لڑکیوں کو اچھا نہیں سمجھا جاتا ہے اور ان کے رشتے مشکل سے ہوتے ہیں، میں چاہتی ہوں تیری شادی کر دوں۔''

''اس کے بعد آپ کا کیا ہوگا؟''

''میرا اللہ مالک ہے۔''

''نہیں امی۔'' میں نے کہا۔ ''میں آپ کو چھوڑ کر نہیں جاؤں گی۔ پلیز مجھے جاب کرنے دیں میں گھر چلاؤں گی۔''

امی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ ان کے تاثرات بتا رہے تھے کہ وہ میری بات نہیں مانیں گی۔ پھر انہوں نے میرے رشتے کے لیے کوشش شروع کر دی۔ ہمارا کوئی جاننے والا تو تھا نہیں اس لیے امی نے رشتے کرانے والیوں سے بات کی اور وہ رشتے لانے لگیں۔ اب آئے دن ہمارے ہاں مختلف قسم کی خواتین آنے لگیں اور ان میں سے بیشتر کا رویہ ایسا ہوتا تھا جیسے وہ رشتہ کرانے نہیں بلکہ کوئی چیز خریدنے آئی ہیں اور جب ان کو پتا چلتا کہ امی کو طلاق ہوئی تھی تو وہ اسی وقت رخصت ہو جاتیں اور دوبارہ پلٹ کر نہیں آتی تھیں۔ تنگ آ کر امی نے رشتے کرانے والیوں سے کہہ دیا کہ وہ ان کی طلاق کے بارے میں پہلے ہی بتا دیا کریں۔ وہ پہلے بتانے لگیں تو دیکھنے کے لیے بھی لوگ آنا بند ہو گئے۔

پھر امی نے کہا کہ فیملی والوں کے بجائے ایسے رشتے تلاش کریں جس میں لڑکا خود شادی کا خواہش مند ہو۔ میں نے امی سے کہا۔ ''امی ایسے لوگ ٹھیک نہیں ہوتے ہیں یا تو وہ پہلی بیوی سے چھپ کر شادی کر رہے ہوتے ہیں یا پھر کوئی اور مسئلہ ہوتا ہے۔''

''تب میں کیا کروں۔'' امی نے بے بسی سے کہا۔ ''خاندان والے تو میرے بارے میں سن کر آنے سے پہلے انکار کر دیتے ہیں ہم اتنی حیثیت والے نہیں ہیں کہ لوگ ہماری خامی نظر انداز کر کے بہر صورت رشتہ کریں۔''

''امی اتنی جلدی کی کیا ضرورت ہے میری عمر تو نہیں نکلی جا رہی۔''

امی کا جواب روایتی تھا کہ وہ اپنی زندگی میں مجھے اپنے گھر کا کر دینا چاہتی تھیں۔ اس لیے انہوں نے میری بات نہیں مانی۔ رشتے کرانے والیاں آئے دن ایسے رشتے اُٹھا لاتی تھیں جس میں کوئی اکیلا لڑکا یا مرد شادی کرنا چاہتا تھا اور اس کا آگے پیچھے کوئی نہیں تھا۔ اکثر رشتے تو امی نے مسترد کر دیے اور باقیوں کو میں نے انکار کر دیا۔ کیونکہ یہ رشتے...... ...... مشکوک لگ رہے تھے۔ مگر پھر زید حسن کا رشتہ امی کو بھا گیا۔ زید حسن کے ڈی اے میں آفیسر تھا اور اکیلا تھا۔ رشتے دار تو تھے لیکن سب دور پرے کے تھے۔ باپ کا اس کے بچپن میں انتقال ہو گیا تھا۔ ماں عرصے سے بیمار تھی اور ایک سال پہلے وہ بہو لانے کا ارمان لیے دنیا سے جا چکی تھی۔ زید حسن کا اپنا گھر تھا اچھی نوکری تھی۔ تعلیم یافتہ اور اچھے خاندان سے تھا۔ اس کا خاندان دہلی سے ہجرت کر کے پاکستان آیا تھا۔ شکل صورت کا بھی مناسب تھا۔ امی نے مجھ سے پوچھا تو میں نے انکار کر دیا۔

''امی میں اکیلے رہتے رہتے تنگ آگئی ہوں اگر آپ

www.Paksociety.com پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

www.Paksociety.com

نے میری شادی کرنی ہے تو پلیز کسی بڑے گھر میں کریں۔"

"ارے پاگل آج کل تو لڑکیاں مرتی ہیں کہ سسرال چھوٹا ہو یا سرے سے نہ ہو اور تم ناشکری کر رہی ہو۔"

"امی اس طرح اکیلے رہنے والے پتا نہیں کیسے نکلیں، اگر بعد میں کوئی گڑبڑ ہوئی تو میں یا آپ کس سے فریاد کریں گے۔"

"کچھ نہیں ہوتا بیٹا، زید اچھا لڑکا ہے اور پھر خاندان بھی اچھا ہے۔ میں نے پتا کرایا ہے اس نے کوئی غلط بیانی نہیں کی ہے۔"

"آپ نے بھی رشتہ کرانے والی سے پتا کرایا ہے اسے تو اپنی فیس سے مطلب ہے اس لیے وہ ہر صورت میں رشتہ کرانا چاہے گی بعد میں اس کی بلا سے جو ہوتا رہے۔"

"میری بچی مان جا، ایسا رشتہ بار بار نہیں آتا ہے، مجھے یقین ہے تو زید حسن کے ساتھ بہت خوش رہے گی۔"

امی شروع سے اپنی بات منوانے والی تھیں اور دوسروں کی کم سنتی تھیں، شاید ابو سے بھی ان کے اختلاف کی بنیادی وجہ یہی تھی۔ ابو بھی اسی قسم کے تھے اس لیے ان میں بنی نہیں۔ اس بار بھی مجھے امی کے سامنے جھکنا پڑا تھا۔ انہوں نے زید حسن کے رشتے کے لیے ہاں کر دی اور فوراً ہی شادی کی تاریخ بھی طے کر دی۔ تاریخ بھی صرف دو مہینے بعد کی تھی۔ میں امی سے احتجاج کرتی رہ گئی کہ کم سے کم چھ مہینے بعد کی تاریخ دیں مگر زید حسن کی جلدی تھی اور اس نے دو مہینے سے زیادہ کا وقت دینے سے انکار کر دیا تھا۔ اس نے امی سے کہہ دیا تھا کہ اسے کچھ نہیں چاہیے۔ اس کے گھر میں سب کچھ ہے اس لیے امی کو بہت اہتمام نہیں کرنا پڑا۔ ان کے پاس جتنی جمع پونجی تھی اس سے کام بن گیا اور میں رخصت ہو کر زید حسن کے گھر آ گئی۔

عام طور سے کہا جاتا کہ شادی کی پہلی رات طے کر دیتی ہے کہ میاں بیوی میں آنے والے دنوں میں کیسے تعلقات ہوں گے۔ لیکن میرے معاملے میں یہ کلیہ غلط ثابت ہوا۔ پہلی رات زید مجھ سے بہت گرم جوشی اور محبت سے پیش آیا اور اس کے لیے میرے دل میں شکوک وشبہات تھے وہ خاصی حد تک کم ہو گئے اور میں خوش تھی۔ زید حسن کا گلشن میں ہی اپنا دو سو گز کا خوب صورت گھر تھا۔ جسے اس نے مناسب انداز میں آراستہ کر رکھا تھا۔ اس زمانے میں صاحب حیثیت لوگ ہی گاڑی رکھتے تھے۔ اس کے پاس موٹر سائیکل تھی۔ ہمارے لیے یہی بہت تھی۔ زید کی تنخواہ بھی اچھی خاصی تھی اور وہ خرچ کرنے کے معاملے میں کھلے ہاتھ کا شخص تھا۔

شادی کے پہلے مہینے ہم نے تقریباً روز ہی باہر کھانا کھایا تھا۔ اس دوران وہ خوب ہی خرچ کرتا تھا۔ لیکن عجیب بات تھی کہ اس کا زیادہ زور گھومنے پھرنے اور کھانے پینے والی تفریحات پر ہوتا تھا۔ جہاں تک میری ذات کا تعلق تھا اس پر خرچ کرنے کے لیے اس کے پاس رقم نہیں ہوتی تھی۔ شادی کے ابتدائی دنوں میں اس نے مجھے نہ تو کوئی سوٹ بنا کر دیا اور نہ ہی کوئی تحفہ دیا۔ کیونکہ مجھے خود بھی ان چیزوں کی اتنی پروا نہیں تھی اس لیے میں نے بھی خیال نہیں کیا۔ ایک بار امی نے پوچھا تو مجھے خیال آیا اور میں نے امی سے کہا۔ "نہیں زید نے شادی کے بعد مجھے نہ تو کوئی سوٹ لے کر دیا ہے اور نہ ہی کوئی تحفہ دیا۔"

امی کو تعجب ہوا تھا۔ "یہ کیسا شوہر ہے جسے بیوی کی پروا نہیں ہے۔"

"امی وہ ویسے خرچ کرتا ہے شاید اس کا ذہن بھی ایسا نہیں ہے۔ اکیلے رہنے اور پلنے والے لوگوں کو بہت ساری باتوں کا علم نہیں ہوتا.....۔" میں نے امی کو مطمئن کرنے کے لیے کہہ دیا تھا لیکن خود میں اندر سے کھٹک گئی تھی اس لیے موقع ملتے ہی میں نے زید سے پوچھ لیا۔

"آپ نے کبھی مجھے کوئی چیز گفٹ نہیں کی ہے، لوگ تو شادی کے بعد اپنی بیویوں کو ڈھیر سارے گفٹ دیتے ہیں۔"

"وہ احمق ہوتے ہیں۔" زید نے آرام سے کہا۔ "بھلا یہ بھی کوئی بات ہے، کپڑے اور چیزیں لا دو جنہیں بیویاں ایک دو بار پہن کر پھینک دیں۔ کپڑے اور دوسری چیزیں ہیں نا تمہارے پاس۔"

"چلیں میرے پاس ہیں لیکن آپ کوئی معمولی سی چیز لے آتے۔"

"معمولی ہاہا۔" اس نے قہقہہ لگایا۔ "میں معمولی سی چیز لاتا تو کہتیں کہ یہ کیا لے آیا ہوں، بیوی کو اتنی معمولی سی چیز دیتے ہیں۔" اس نے میرے انداز کی نقل اتاری۔ "میری جان، چھوڑو ان چکروں کو کھاؤ پیو اور مزے کرو بس یہی زندگی ہے۔"

صرف کھانے پینے کو زندگی قرار دینے والے زید کا یہ حال تھا کہ اس کے پاس درجنوں بہترین سوٹ اور دوسرے ملبوسات تھے۔ الماری میں ایک پورا ریک پرفیوم اور اسی قسم کی دوسری چیزوں سے بھرا ہوا تھا۔ اس کے پاس ایک درجن اعلیٰ درجے کے جوتوں کے جوڑے تھے۔ شادی کے بعد بھی وہ اپنے لیے کئی بار یہ چیزیں لے کر آیا تھا جب میں نے ان کا حوالہ دیا تو اس کا موڈ خراب ہو گیا اور اس نے کہا۔ "جاہل عورتوں کی سی باتیں مت کرو، میں باہر جاتا ہوں اچھے گریڈ کا

افسر ہوں مجھے یہ سب مینٹین کر کے رکھنا پڑتا ہے۔"

مجھے بحث کرنے کی عادت نہیں تھی اور دوسری بات یہ کہ شادی کے اوّل دن سے مجھے اس بات کا خوف تھا کہ کہیں میرے گھر میں بھی وہی امی ابو والے جھگڑے نہ ہوں اس لیے میں انتہائی حد تک کوشش کرتی تھی کہ لڑائی جھگڑے والی بات سے دور رہوں۔ زید نے بھی جلد اس بات کو محسوس کر لیا اس لیے جب میں کوئی اختلافی بات کرتی تو وہ جھگڑا کرنے والا لہجہ اپناتا اور میں فوراً چپ ہو جاتی۔ شادی کے دوسرے مہینے میں امید سے ہو گئی لیکن پتا ذرا..... دیر سے چلا تھا۔ جب زید کو پتا چلا تو اس نے کہا۔ "یہ کیا مصیبت ہے ابھی تو ہم زندگی انجوائے کر رہے ہیں۔"

"زید یہ مصیبت نہیں ہماری اولاد ہے اور میری تو خواہش ہے میرے جلدی جلدی اور بہت سارے بچے ہوں۔"

"بہت سارے بچے۔" اس نے بدمزگی سے کہا۔ "تمہارا باپ تو ہے نہیں انہیں کون پالے گا؟"

"ان کا باپ پالے گا۔"

"باپ کے پاس فالتو پیسا نہیں ہے، سوفی معاملہ ختم کراؤ۔"

میں نے بے یقینی سے اسے دیکھا۔ "کیا مطلب؟"

"مطلب صاف ہے تم ابورشن کرالو ابھی تو اسٹارٹ ہے معاملہ آسانی سے ختم ہو جائے گا۔"

"میں ایسا نہیں کروں گی۔"

اس بات پر ہمارا پہلا جھگڑا ہوا اور زید نے مجھے تھپڑ بھی مار دیا۔ میں ششدر رہ گئی تھی۔ پھر میری ہتھیار ڈال دینے والی فطرت آڑے آ گئی اور میں نہ چاہتے ہوئے بھی اس کی بات مان گئی۔ لیکن جب میں نے لیڈی ڈاکٹر سے رجوع کیا تو اس نے بتایا۔ "دیر ہو گئی ہے اب تو تیسرا مہینا ہے اور اس میں ابورشن خطرناک ہو سکتا ہے خاص طور سے جب تمہارا پہلا موقع ہے۔ کیس بگڑ گیا تو تمہاری جان کو بھی خطرہ ہو سکتا ہے اور یہ بھی ممکن ہے تم دوبارہ ماں نہ بن سکو۔"

میں نے زید کو بتایا تو اس نے ماننے سے انکار کر دیا پھر لیڈی ڈاکٹر سے بات کی تب کہیں جا کر اسے یقین آیا۔ مگر وہ جھنجلا گیا تھا بہت دنوں تک اس نے مجھ سے سیدھے منہ بات نہیں کی تھی جیسے اس معاملے میں میرا کوئی قصور ہو۔ اب وہ مجھے باہر لے کر نہیں جاتا تھا۔ اکیلے جاتا اور اکثر رات گئے آتا تھا۔ میں اکیلی گھر میں اس کا انتظار کرتی رہ جاتی تھی۔ ایک رات وہ آیا تو اس کے قدم اور زبان بہک رہی تھی، منہ سے عجیب سے بدبو آ رہی تھی میں سناٹے میں رہ گئی۔

"آپ... آپ پی کر آئے ہیں۔"

"ہاں تو...؟" اس نے تمسخرانہ انداز میں پوچھا۔

"آپ شراب پینے لگے ہیں؟"

"پینے نہیں لگا ہوں عرصے سے پیتا آیا ہوں۔" وہ بولا اور کپڑے بدلنے چلا گیا۔ کپڑے بدل کر آیا تو بستر پر ڈھیر ہو گیا۔ اس رات میں دیر تک اپنے نصیب پر روتی رہی اور مجھے یقین ہو گیا کہ شادی کے معاملے میں میں اپنی ماں سے زیادہ بدقسمت ثابت ہوئی ہوں۔ ابو میں یہ خرابیاں نہیں تھیں۔ ان کی امی سے نہیں بنتی تھی لیکن ان میں کردار کی خامیاں نہیں تھیں۔ وہ اپنی ذات سے زیادہ ہمیں اہمیت دیتے تھے۔ جب کہ زید کو صرف اپنی پروا تھی۔ ہوٹلنگ پر سیکڑوں اڑا دینے والے کو گھر میں چند سو کا سودا ڈالنے کی توفیق بھی اس وقت ہوتی تھی جب میں اس سے بار بار کہتی تھی۔ شادی کے بعد اس نے شاید ہی کبھی میرے ہاتھ میں کوئی رقم دی تھی۔ اپنے چھوٹے موٹے اخراجات کے لیے بھی مجھے اس کے سامنے ہاتھ پھیلانا پڑتا تھا۔ کئی بار مانگنے پر ایک بار رقم ملتی تھی اور وہ بھی جتا جتا کر۔

"میں نے تمہارا ذمہ نہیں لیا ہوا ہے۔"

"تو میرا ذمہ کس پر ہے؟"

"جوان ہو پڑھی لکھی ہو کہیں بھی نوکری مل سکتی ہے خود کماؤ۔"

"میں تو خود نوکری کر کے کمانا چاہتی تھی۔" میں نے تلخی سے کہا۔ "لیکن امی نے شادی کر دی۔ ان کا خیال ہے کہ عورت کا اصل مقام گھر ہے دفتر نہیں۔"

"تب اپنی ماں سے کہو وہ تمہیں خرچا دیا کرے۔" زید حسن نے لاپروائی سے کہا۔

میں نے امی کو ابھی تک اپنے گھر کے حالات سے بے خبر رکھا تھا۔ وہ میری ماں بننے کی خبر پر خوش تھیں اور جلدی جلدی میرے گھر آتی تھیں۔ میں بڑی مشکل سے زید حسن کی حرکتیں ان سے چھپاتی تھی۔ ایک بار میری طبیعت خراب تھی امی رکنے آئی تھیں۔ زید حسن حسب معمول پی کر آیا تو امی حیران ہوئیں۔ میں نے بہ مشکل چھپایا کہ وہ پیے ہوئے ہے۔ میں نے امی سے کہا کہ ان کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے صبح بھی دفتر ایسے ہی چلے گئے تھے۔ پھر اگلے روز میں نے زبردستی طبیعت ٹھیک ظاہر کر کے امی کو گھر بھیج دیا۔ رات میں نے زید سے کہا۔ "آپ کم سے کم امی کا خیال کر لیتے ان کے سامنے پی کر نہ آتے۔"

"پینے سے خدا نے روکا ہے جب میں اس کے سامنے

پی سکتا ہوں تو تمہاری ماں کے سامنے کیوں نہ پی کر آؤں۔" اس نے حسبِ معمول بے پروائی سے کہا۔ "میں نے چھپایا نہیں ہے۔"

"ہاں شادی سے پہلے رشتے کے ساتھ آپ نے بوتل بھی بھیجی تھی۔" میں نے طنز کیا۔

ان حالات میں میں نے ثنا کو جنم دیا۔ آپ یقین کریں ایک کھاتے پیتے شخص کی بیٹی نے سرکاری اسپتال میں جنم لیا جہاں سہولتیں بھی نہ ہونے کے برابر تھیں۔ میں دو دن وہاں لاوارثوں کی طرح داخل رہی اور وہاں پہنچانے کے بعد زید حسن پلٹ کر نہیں آیا تھا۔ امی میری دیکھ بھال کرتی رہیں اور حیران ہوتی رہیں کہ یہ کس قسم کا شخص ہے۔ انہوں نے مجھے اسپتال سے گھر پہنچایا۔ میں نے منت سماجت کر کے امی کو زید حسن سے جھگڑا کرنے سے روکا، میں جانتی تھی اس کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ اُلٹا وہ امی سے بدتمیزی کرتا اور میں ایسا نہیں چاہتی تھی۔ اب امی کو کسی قدر اندازہ ہو گیا تھا کہ زید حسن کس قسم کا شخص ہے۔ انہوں نے کہا۔ "میری بچی مجھے معاف کر دے میں نے کس شخص سے تیرا نصیب پھوڑ دیا ہے۔"

میں نے ٹھنڈی سانس لی۔ "امی یہ واقعی میرا نصیب ہے میں اس سے کسی صورت نہیں بچ سکتی تھی۔"

بیٹی سے زید حسن کو کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ اسے اُٹھاتا تک نہیں تھا۔ پیار کرنا تو دور کی بات ہے، اگر میں کہیں مصروف ہوں اور ثنا رو رہی ہو تو وہ اسے چپ بھی نہیں کراتا تھا۔ گویا وہ صرف میری بیٹی تھی۔ اس کے اخراجات بھی وہ بہت مشکل سے دیتا تھا۔ میرے اصل حالات کا علم ہونے کے بعد بے چاری امی اپنی محدود آمدنی میں سے بھی مجھے کچھ نہ کچھ دیتی رہتی تھیں۔ وقت گزرتا رہا۔ ثنا کے ایک سال بعد مونا دنیا میں آئی۔ اس بار میں نے شروع میں زید کو بتا دیا تھا اور میرا خیال تھا کہ وہ معاملہ ختم کرنے کو کہے گا لیکن اس نے کوئی دلچسپی نہیں لی۔ یوں ایک سال بعد میری دوسری بچی بھی دنیا میں آ گئی تھی۔ میری ذمے داری بڑھ گئی تھی اور زید حسن کی طرف سے مالی تنگی برقرار تھی۔ امی بھی کتنا کرتیں۔ مہنگائی بڑھ رہی تھی اور کرائے کی محدود رقم خود ان کے گزارے کے لیے ناکافی تھی۔

ایک رات زید حسن جلدی گھر آ گیا۔ وہ کھانا باہر سے لایا تھا اور حیرت انگیز طور پر بچیوں کے لیے چیزیں بھی لایا تھا۔ اس نے بتایا کہ وہ سائیڈ بزنس بھی کر رہا ہے اور اس سے کچھ نفع ملا ہے۔ میں نے سوچا کہ معمول کی آمدنی سے وہ شراب پی سکتا ہے اور بزنس کی آمدنی سے نفع ملا تو گھر اور بچیوں کے لیے لایا ہے۔ مجھے اس کی بات پر ایک فیصد اعتبار نہیں آیا تھا۔ مگر میں نے زبان سے کچھ نہیں کہا۔ اس کے بعد زید حسن کا رویہ کسی قدر بدل گیا۔ وہ جلدی گھر آنے لگا۔ مجھ سے اور بچیوں سے اچھے انداز میں پیش آتا اور ہماری لیے چیزیں بھی لاتا تھا اس کی باتوں سے لگتا تھا کہ وہ ہمارے لیے اور بھی کچھ کرنا چاہتا ہے لیکن مالی تنگی کا شکار ہے اس لیے جتنا کرنا چاہتا ہے اتنا کر نہیں پاتا ہے وہ زیادہ کمانے کے لیے بزنس بڑھانا چاہتا ہے لیکن فی الحال اس کے پاس رقم نہیں ہے۔ ایک ہفتے بعد رات کو میں بچیوں کو سلا کر خود بھی سونے کی تیاری کر رہی تھی۔ زید نے کہا۔

"صوفی تمہارا مکان بیچنا چاہیں تو اچھی قیمت میں بک سکتا ہے۔"

میں چونک گئی۔ "میرا مکان کون سا ہے؟"

"جس میں تمہاری امی رہ رہی ہیں۔"

"وہ امی کا ہی ہے۔"

"لیکن تمہارے باپ نے تمہارے نام کیا ہے۔"

"زید حسن وہ مکان امی کا ہے جب تک امی زندہ ہیں۔" میں نے قطعی لہجے میں کہا۔ "آئندہ مجھ سے اس بارے میں بات نہ کیجیے گا۔"

زید حسن خاموش ہو گیا اور خلافِ توقع اس نے مجھ سے لڑائی بھی نہیں کی۔ میرا خیال تھا کہ میرے قطعی جواب سے وہ چپ ہو جائے گا۔ لیکن وہ اتنی آسانی سے ہار ماننے والا آدمی نہیں تھا۔ اس نے دوسرا حربہ استعمال کیا۔ وہ میرے علم میں لائے بغیر امی کے پاس چلا گیا۔ اس نے امی سے پتا نہیں کیا کہا کہ انہوں نے مجھ سے پوچھے بغیر مکان بیچنے پر رضا مندی ظاہر کر دی۔ زید نے ان سے کہا کہ وہ انہیں اپنے مکان کے اوپر ایک کمرا بنا کر دے گا۔ جب امی نے مجھ سے بات کی تو میں حیران رہ گئی۔ "امی آپ کیسے راضی ہو گئیں؟"

"بیٹا تمہاری اور تمہاری بچیوں کی بہتری کے لیے۔"

"امی مجھے زید حسن پر قطعی اعتماد نہیں ہے۔ وہ اس مکان کو بیچ کر کھانے کے چکر میں ہے۔"

"وہ کوئی بزنس کرنا چاہ رہا ہے۔" امی نے دبے انداز میں کہا۔

"نہیں امی، میں یہ مکان کسی صورت فروخت نہیں کروں گی۔"

امی پریشان ہو گئیں۔ "لیکن میں زید کو ہاں کہہ چکی ہوں۔"

"میں اسے دیکھ لوں گی۔" میں نے فکر مندی سے

مجھے اندازہ تھا کہ زید حسن کا ردِعمل کیا ہوگا۔ لیکن اس کا اتنا شدید ہوگا یہ میں نے سوچا نہیں تھا جب میں نے ان بیچنے سے انکار کیا تو وہ طلاق کی حد تک چلا گیا۔ میرے ہاتھ گئے تھے۔ امی کی طلاق کا انجام میرے سامنے تھا میں صورت یہ داغ نہیں لینا چاہتی تھی۔ اس لیے مجبوراً مجھے کی بات ماننا پڑی۔ مکان بک گیا اور اس کی رقم زید حسن ترول میں چلی گئی اور پھر اس کا کچھ پتا نہیں چلا۔ رقم ہاتھ تے ہی زید حسن کا پہلے والا رویہ لوٹ آیا اب اسے نہ کی پروا تھی اور نہ بچیوں کی۔ اس نے امی کو اوپر کمرا بنا کر کا وعدہ بھی بھلا دیا تھا اور اب وہ بے چاری گھر کے میں پڑی تھیں۔ زید حسن کا ان سے رویہ بھی ٹھیک نہیں ل اور اکثر وہ ان سے طنزیہ انداز میں باتیں کرتا تھا۔

دراصل زید حسن سمجھ گیا تھا کہ میں گھر بچانے کے لیے اس کی ہر جائز ناجائز بات ماننے پر مجبور ہوں گی اور وہ اس کا فائدہ اٹھاتا۔ اس وقت ابو کا دیا مکان کئی لاکھ میں بکا تھا اور اس نے یہ رقم عیاشیوں میں اُڑا دی۔ وہ جب گھر آتا تو نشے میں دھت ہوتا تھا۔ اس نے موٹر سائیکل بیچ کر ایک پرانی کار بھی لے لی تھی۔ ایک دن شام کو میں پیدل مونا کو لے کر ڈاکٹر کے پاس گئی تھی۔ اس کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ کچھ دیر پہلے میں نے زید کو دفتر فون کیا تھا اور اس سے جلد آنے کو کہا تھا تاکہ مونا کو ڈاکٹر کے پاس لے جائیں۔ مگر اس نے کہا کہ اسے کام ہے اور وہ جلدی گھر نہیں آ سکے گا اس لیے میں خود مونا کو ڈاکٹر کے پاس لے گئی۔ جب میں اسے ڈاکٹر کو دکھا کر واپس آ رہی تھی تو میں نے سڑک پر زید حسن کی کار دیکھی اس میں وہ ایک لڑکی کے ساتھ تھا۔ وہ لڑکی میں اتنا گم تھا کہ اسے سڑک کے کنارے کھڑی اپنی بیوی اور بچی نظر ہی نہیں آئی تھیں۔ میں صدمے سے سن رہ گئی تھی۔ مجھے زید حسن پر پہلے بھی شبہ تھا کہ وہ دوسری عورتوں کے چکر میں بھی ہے لیکن مجھے یہ اندازہ نہیں تھا کہ وہ انہیں اس طرح سرِعام لے کر گھومتا ہوگا۔ وہ ڈرائیونگ کے دوران جس طرح اس لڑکی سے سر جوڑے ہوئے تھا اس سے ان کے درمیان تعلق واضح تھا۔

میں اب تک زید کی ساری حرکتیں برداشت کرتی آئی تھی۔ وہ شراب پیتا تھا اور رات دیر گئے تک گھر آتا تھا۔ وہ میرا اور بچیوں کا خرچ نہیں دیتا تھا۔ گھر کا سامان تنگی ترشی سے لاتا تھا۔ میں سب برداشت کرتی رہی لیکن اس کی یہ حرکت میری برداشت سے باہر ہو گئی۔ اس رات میری زید حسن سے پہلی سنجیدہ قسم کی لڑائی ہوئی اور میں نے پہلی بار ہی اسے برابر کی سنائی تھیں۔ میں نے اس سے کہا۔ "زید حسن میں نے تمہاری ہر بات برداشت کر لی لیکن یہ برداشت نہیں کروں گی۔"

"تو نہ کرو۔" وہ ڈھٹائی سے بولا۔

میں نے اس کا گریبان پکڑ لیا۔ "تم یہ مت سمجھنا میں تمہیں چھوڑ دوں گی۔"

اس نے ایک جھٹکے سے اپنا گریبان چھڑا لیا۔ "کیا کر لو گی تم ..... بولو کیا کر لو گی؟" اس کے لہجے میں حقارت تھی۔ "تین لفظوں کی مار ہو تم۔"

اس کے الفاظ میں ایسا پتھر پن تھا کہ میں سرد پتھر بن گئی۔ میرے اندر اُبلتا اور کھولتا ہوا لاوا ایک دم جم گیا تھا۔ میرا ردِعمل دیکھ کر وہ مسکرایا اور بولا۔ "اب اپنی اوقات میں رہنا..... ورنہ....."

امی خوف زدہ تھیں انہوں نے بھی جھگڑا سن لیا تھا بعد میں انہوں نے مجھ سے کہا۔ "میری بچی اس سے نہ لڑا کر، اب تو ہمارے سر پر کوئی چھت بھی نہیں ہے۔ اگر اس نے کچھ ایسا ویسا بول دیا تو ہم کہاں جائیں گے؟"

مجھے یہ خیال نہیں تھا کہ زید حسن نے مجھے طلاق دے دی تو ہم کہاں جائیں گے بلکہ مجھے لفظِ طلاق سے ہی خوف آتا تھا۔ میں جانتی تھی اس کے بعد میری اور میری بچیوں کی زندگی کتے سے بھی بدتر ہو جائے گی۔ میں کسی صورت یہ تہمت اپنے اوپر نہیں لینا چاہتی تھی۔ اس لیے زید حسن کی ہر زیادتی کی طرح اس کی یہ حرکت بھی سہنے لگی۔ وہ اپنے معمولات میں مشغول رہا تھا۔ امی یہ سب دیکھتیں اور کڑھتی رہتی تھیں۔ وہ اندر ہی اندر اس بات پر گھلتی رہیں کہ انہوں نے زید حسن سے ضد کر کے میری شادی کرائی اور اس کے نتیجے میں جیسی امی نے گزاری تھی، میں اس سے بھی بُرے حال میں زندگی گزارنے پر مجبور تھی۔

کل دن سے امی کی طبیعت خراب تھی۔ انہیں بھوک نہیں لگ رہی تھی اور جو کھاتیں تو اُلٹی کی صورت میں باہر آ جاتا تھا۔ میں انہیں ڈاکٹر کے پاس لے گئی تو اس نے ڈھیر سارے ٹیسٹ لکھ دیے۔ میرے پاس رقم نہیں تھی کہ ان کے ٹیسٹ کراتی میں نے زید سے کہا تو اس نے بھی انکار کر دیا۔ "آج کل میرا ہاتھ تنگ ہے۔"

"ہمارے لیے آپ کا ہاتھ کبھی کھلا بھی ہوتا ہے؟"

"بکومت اور تمہاری ماں کو یہاں رکھا ہوا ہے یہی میرا احسان ہے۔" وہ غرا کر بولا۔

"میری ماں پر احسان ہے یا اسے تم نے دربدر کر دیا ہے اس کی چھت چھین لی ہے۔"

"مکان تمہارا تھا اس کا نہیں تھا۔"

www.paksociety.com

www.Paksociety.com

"میرا اتھا تو تم نے کس خوشی میں ہضم کرلیا؟"

"میاں بیوی کی چیزیں مشترک ہوتی ہیں۔" اس نے پھر روایتی ڈھٹائی سے کہا۔ میں امی کی بیماری کی وجہ سے مجبور تھی اس لیے میں نے بات بڑھانے سے گریز کیا اور اس سے کہا۔

"پلیز زید امی کی طبیعت بہت خراب ہے اور میرے پاس رقم نہیں ہے۔"

"تو کسی سرکاری اسپتال میں لے جاؤ۔"

"وہاں تک جانے کے لیے بھی تو ٹیکسی رکشے کا کرایہ چاہیے ہوتا ہے۔"

مجبوراً زید نے مجھے کچھ رقم دی اور میں امی کو ایک سرکاری اسپتال لے گئی۔ وہاں انہیں ہیپاٹائٹس تشخیص ہوا۔ اس زمانے میں یہ بیماری اتنی عام نہیں تھی اور اس کا علاج بھی بہت مشکل اور مہنگا پڑتا تھا۔ امی کا سرکاری اسپتال میں علاج ہوتا رہا لیکن ان کی حالت بگڑتی چلی گئی۔ ڈاکٹروں نے جواب دے دیا اور ایک دن اسپتال سے ان کی میت گھر آئی تھی۔ ان دنوں میں امی اور بچیوں کے چکر میں حال سے بے حال ہو گئی تھی۔ امی کے انتقال نے میرے ہوش ہی گم کر دیے تھے اتنی بڑی دنیا میں خدا کے بعد ایک وہی تو میرا سہارا تھیں۔ زید کی بے اعتنائیاں میں اس لیے بھی سہہ جاتی تھی کہ میرے پاس امی تھیں اب وہ بھی نہیں رہی تھیں۔ کتنے دن میں تڑپ تڑپ کر روتی رہی۔ مگر کب تک آخر بچیوں کی خاطر مجھے خود کو سنبھالنا پڑا تھا۔

زید کی بے حسی کا وہی عالم تھا۔ اس نے میت والا دن مشکل سے گھر میں گزارا اور اس کے بعد اگلے ہی روز سے اپنے معمولات شروع کر دیے تھے۔ گھر کی طرف سے اس کی لاپروائی ویسی ہی تھی۔ ثنا اور مونا اب بڑی ہو رہی تھیں۔ ثنا چار سال کی تھی اور مونا تین سال کی۔ میں انہیں اسکول میں داخل کرانا چاہتی تھی۔ زید اس پوزیشن میں تھا کہ چاہتا تو انہیں کسی اچھے پرائیویٹ اسکول میں پڑھا سکتا تھا لیکن اپنی آمدنی کا ایک ایک روپیا اس نے اپنی عیاشیوں کے لیے رکھا ہوا تھا۔ میں نے اس سے کہا۔ "ثنا اسکول جانے کی عمر کو پہنچ گئی ہے اسے کسی اسکول میں داخل کرانا ہے۔"

"تو کرا دو۔" اس نے بے نیازی سے کہا۔

"کیسے کرا دوں اسکول کی... فیس اور دوسرے اخراجات کے لیے رقم ہونی چاہیے۔"

"پرائیویٹ اسکول کے بجائے سرکاری اسکول میں کرا دو وہاں فیس نہیں ہوتی بس کتابیں اور یونیفارم لینا ہوگا۔"

"زید حسن۔" میں نے حیرت سے اسے دیکھا۔ "تم اپنی بچیوں کو سرکاری اسکول میں پڑھاؤ گے؟"

"تو کیا ہوا؟" وہ بدمزگی سے بولا۔ "کیا سرکاری اسکول میں بچے نہیں پڑھتے ہیں تمہاری انوکھی بچیاں ہیں۔"

"زید حسن تمہاری حیثیت ہے تم اپنی بچیوں کو پرائیویٹ اسکول میں پڑھا سکتے ہو۔ مجھے یقین ہے اسکول کی فیس اس ایک بوتل کی قیمت سے کم ہی ہوگی جو تم ایک رات میں پی جاتے ہو۔"

"بکو مت۔" وہ غرا کر بولا۔ "میرے پاس فالتو رقم نہیں ہے۔ اپنی بچی کو پڑھانا ہے تو سرکاری اسکول میں داخل کر دو ورنہ اسے گھر میں بیٹھے رہنے دو۔"

میں ثنا کو سرکاری اسکول میں داخل نہیں کرانا چاہتی تھی۔ مجھے خیال آیا کہ اگر مجھے اپنی بچیوں کے لیے کرنا ہے تو خود ہی کرنا ہے ان کے باپ سے کسی قسم کی توقع کرنا حماقت تھی۔ لیکن میں سوائے جاب کے اور کیا کر سکتی تھی۔ جاب کی صورت میں گھر میں بچیوں کو کون دیکھتا؟ وہ ابھی اس قابل نہیں ہوئی تھیں کہ اپنی دیکھ بھال خود کر سکیں۔ میں اسی فکر میں تھی کہ ان دنوں میں مجھے پھر چکر آنے لگے۔ میں سمجھ گئی کہ اس کیفیت کی وجہ کیا ہو سکتی ہے۔ میں نے جا کر ڈاکٹر کو دکھایا تو اس نے تصدیق کر دی کہ میں ماں بننے والی تھی۔ اس بار میں خود بچہ پیدا کرنا نہیں چاہتی تھی۔ میری دو بچیاں باپ کے ہوتے رُل رہی تھیں تیسرے کو دنیا میں لا کر کیا کرتی؟ میں نے ڈاکٹر سے ابورشن کی بات کی تو اس نے شوہر کی اجازت کے ساتھ پانچ ہزار کا خرچ بھی بتا دیا۔

زید نے ابورشن کی اجازت تو بہ خوشی دیدی لیکن جب پانچ ہزار کا سوال سامنے آیا تو اس نے صاف انکار کر دیا۔ "میرے پاس اتنی رقم نہیں ہے۔"

"لیڈی ڈاکٹر اتنی رقم مانگ رہی ہے۔"

"تو منع کر دو اور پیدا کرو اس بچے کو بھی۔" اس نے زہریلے لہجے میں کہا۔ "ویسے بھی تمہیں بچے پیدا کرنے کا شوق ہے نا؟"

یوں ماریہ کا دنیا میں آنا بھی مقدر بن گیا۔ اس بار مجھے کتنی مشکل ہوئی میں بیان نہیں کر سکتی۔ اس بار مجھے صحیح معنوں میں اندازہ ہوا کہ امی میری کتنی ساری مشکلیں آسان کر دیا کرتی تھیں۔ اب مجھے سہارا دینے والا کوئی نہیں تھا اور ہر چیز سے مجھے اکیلے ہی نمٹنا تھا۔ ماریہ دنیا میں آئی تو میں کتنے دن طبیعت خرابی کی وجہ سے بستر پر پڑی رہی۔ اس حالت میں بچیوں کو بھی دیکھنا ہوتا تھا ان کی خوراک اور گھر کے دوسرے کام بھی دیکھنا پڑتے تھے اور ماریہ کو بھی سنبھالنا ہوتا

تھا۔ آج میں سوچتی ہوں تو مجھے حیرت ہوتی ہے کہ میں نے وہ وقت کس طرح گزارا تھا اور اتنی ساری مشکلات سے کس طرح نبرد آزما ہوئی تھی۔ یہ مشکلات اس وقت سوا ہو گئیں اب زید کی طرف سے مجھے کوئی مدد نہیں ملی نا جسمانی اور نہ مالی مدد۔ حد یہ کہ وہ گھر میں وہی بارہ ایک بجے داخل ہوتا تھا اور میں تھکن سے بے حال ہونے کے باوجود اس وقت تک جاگتی رہتی تھی جب تک زید گھر نہ آ جاتا۔ ورنہ ذرا سی دیر ہونے پر وہ چراغ پا ہو جاتا تھا اور اتنا شور کرتا کہ بچیاں جاگ جاتی تھیں اور مجھے دوبارہ ان کو سلانا پڑتا تھا۔

گھر کی یہ حالت تھی کہ سوائے زید کے ذاتی سامان گھر میں آسائش کا ذرا سا بھی سامان نہیں تھا۔ میرے جہیز کا فرنیچر تھا اور بس۔ میرا یہ حال تھا کہ کپڑوں کے چند جوڑے رہ گئے تھے۔ انہیں ادل بدل کر پہنتی تھی۔ بچیوں کے پاس بھی چند کپڑے تھے۔ ایک سوٹ وہ اس وقت تک پہنتی تھیں جب تک وہ چھوٹا نہ ہو جاتا۔ ان کی اکثر فراکیں اپنے پُرانے ہو جانے والے کپڑوں کو کاٹ کر بناتی تھی۔ ان کے پاس کھلونے نہ ہونے کے برابر تھے۔ وہ پُرانے بوسیدہ جوتے اور چپلیں پہنتی تھیں۔ اپنی بچیوں کی یہ حالت دیکھ کر میرا دل خون کے آنسو روتا تھا۔ یہ اس شخص کی بچیاں تھیں جو ہر مہینے ہزاروں روپے عیاشی میں اڑا دیتا تھا۔

میں زید حسن سے بہت پہلے الگ ہو چکی ہوتی اگر مجھے لفظ طلاق سے خوف نہ آتا۔ میرے اندر اس شخص کے لیے ذرہ برابر گنجائش نہیں رہی تھی۔ مگر ماریہ کے بعد مجھے رہ رہ کر خیال آنے لگا کہ اب مجھے اس سے الگ ہو جانا چاہیے۔ اس کے ساتھ میں اور میری بچیاں جتنی اذیت میں تھیں اس سے بہتر تھا میں اس سے الگ ہو جاتی۔ ممکن ہے اس وقت مجھے اس سے زیادہ سخت حالات دیکھنے پڑتے لیکن کم سے کم یہ اذیت تو نہ ہوتی کہ میں اور میری بچیاں شوہر اور باپ کے ہوتے ہوئے بھی بیوہ اور یتیموں کی سی زندگی بسر کر رہی تھیں۔ پھر طلاق کا خیال میرے اندر پختہ ہونے لگا تھا۔ میں اپنے اندر ہمت پیدا کرنے لگی کہ زید سے طلاق مانگ سکوں۔ اس کے بارے میں مجھے یقین تھا کہ وہ فوراً میرا مطالبہ مان لے گا۔ اصل میں میں خود کو طلاق لینے پر تیار کر رہی تھی۔ پھر ایک دن رات گئے جب زید حسن گھر آیا تو میں نے سوچ لیا آج میں اس سے بات کروں گی۔ اس روز اس کی حالت ہمیشہ سے زیادہ تباہ تھی۔ وہ بہ مشکل اپنے پیروں پر کھڑا تھا اور اس کا چہرہ عنابی سا ہو رہا تھا۔ وہ گھسٹتا ہوا بیڈ روم میں پہنچا اور بستر پر ڈھیر ہو گیا۔ وہ یوں گہرے سانس لے رہا تھا جیسے اس سے سانس نہیں لیا جا رہا ہو۔ اس نے میری طرف دیکھا۔

"صوفی.... مجھے پانی دو میری طبیعت خراب ہو رہی ہے۔"

"کیا ہوا تمہیں؟" میں نے پوچھا۔

وہ اپنا بایاں ہاتھ مسلنے لگا۔ "شاید مجھے ہارٹ اٹیک ہو رہا ہے۔"

"ہارٹ اٹیک؟"

"ہاں مجھے.... کچھ عرصے سے.... تکلیف تھی لیکن میں نے توجہ نہیں دی۔" وہ ڈوبتے انداز میں بولا۔

"ہاں تم نے اس بیماری کو بھی بیوی بچے سمجھ لیا ہوگا۔" میں نے طنز کیا۔ "توجہ دینے کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی ہوگی۔"

"پلیز، یہ ان باتوں کا وقت نہیں ہے تم کال کر کے ایمبولینس منگواؤ اور مجھے اسپتال لے چلو۔"

لیکن جب تک ایمبولینس آتی اور زید حسن کو اسپتال پہنچایا جاتا اس وقت تک ہارٹ اٹیک نے اس کی جان لے لی تھی۔ جب میں صبح اس کی لاش لے کر گھر آئی تو مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہ جس شخص سے میں طلاق مانگنے جا رہی تھی وہ خود دنیا سے گزر گیا ہے اور مجھے بیوہ کر گیا ہے۔ کئی دن تک مجھے یقین نہیں آیا تھا۔ محلے والے اور چند جاننے والے اس موقع پر کام آئے اور انہوں نے مجھے اور بچیوں کو سنبھالے رکھا۔ زید حسن کے دفتر والے آئے تو اس کی تنخواہ لیتے آئے تھے اور پہلی بار مجھے پتا چلا کہ اس کی تنخواہ کتنی تھی، یہ جان کر میری اس سے نفرت دوچند ہو گئی تھی۔ وہ اتنا کما رہا تھا کہ ہمیں بہت اچھی طرح رکھ سکتا تھا لیکن وہ....

میری بچیوں کا نصیب دیکھیں کہ باپ کے مرنے کے بعد قسمت کا در کھلا۔ انہیں اچھا لباس، اچھی خوراک اور اچھا اسکول باپ کے مرنے کی وجہ سے نصیب ہوا۔ صرف تنخواہ ہی نہیں اس کا اچھا خاصا فنڈ اور پنشن بھی مجھے ملی اور سب سے حیرت انگیز بات یہ تھی کہ اس کے بینک اکاؤنٹ میں کوئی ایک لاکھ کے قریب رقم موجود تھی۔ گاڑی اور گھر بھی تھا۔ رقم ہاتھ میں آتے ہی میں سب سے پہلے گھر اور بچیوں کی ضروری چیزیں لائی۔ ثنا اور مونا کو ایک اچھے اسکول میں داخل کرایا جو نزدیک ہی تھا۔ میں ڈرائیونگ نہیں جانتی تھی اس لیے گاڑی فروخت کر دی۔ میرے پاس رقم تھی اور میں کئی سال آرام سے گھر میں بیٹھ کر اپنا اور بچیوں کا گزارا کر سکتی تھی لیکن میں نے رقم کو بچیوں کے لیے محفوظ کرنے کا سوچا اور خود ملازمت کے لیے کوشش شروع کر دی۔

میں بی کام تھی اس لیے جلد مجھے ایک بینک میں ملازمت مل گئی۔ تنخواہ اتنی تھی کہ میں اس میں آرام سے اپنا گھر چلاسکتی تھی۔ ماریہ چھوٹی تھی میں اسے اپنے ساتھ دفتر لے آتی تھی اور دفتر کے برابر میں واقع ڈے کیئر سینٹر میں چھوڑ دیتی۔ بینک آف ہونے کے بعد اسے ساتھ لے کر گھر آتی۔ گھر کے لیے میں نے ایک نوعمر لڑکی نوری کو ملازمہ رکھ لیا۔ صبح میں دفتر جاتے ہوئے ثنا اور مونا کو اسکول چھوڑتی جاتی تھی۔ دوپہر میں نوری بچیوں کو اسکول سے لے آتی۔ اس وقت خواتین کو دو بجے چھٹی دے دی جاتی تھی۔ میں بھی گھر آجاتی۔ ماریہ دو سال کی ہوئی تو اسے بھی نوری کے پاس گھر پر چھوڑنے لگی۔ وہ نوری سے مانوس ہوگئی تھی اس کے ساتھ رہ جاتی تھی۔ تین سال کی عمر میں اسے مونٹیسوری میں ڈال دیا اور وہ بھی بہنوں کے ساتھ اسکول جانے لگی۔ بچیوں کی طرف سے ذرا فراغت ملی تو میں نے ایم اے میں داخلہ لیا اور ماسٹر کرنے پر بینک میں مجھے آفیسر گریڈ میں ترقی مل گئی۔ تنخواہ بڑھی اور دوسری بہت ساری سہولیات ملنے لگیں۔

گھر میں دو بیڈ روم اور ایک ڈرائنگ روم تھا میں نے بینک سے قرض لے کر ایک بیڈ روم اور لاؤنج بنوالیا۔ لاؤنج میں ہی اوپن امریکن کچن بنوایا اور جو پہلے چھوٹا سا کچن تھا اسے باتھ روم بنا دیا۔ گھر کا اندرونی اور بیرونی حصہ اس طرح تبدیل کرایا کہ وہ نیا جدید ڈیزائن کا بنگلا لگنے لگا تھا۔ ثنا اور مونا بڑی ہوگئی تھیں ان کو الگ بیڈ روم دے دیا اور ماریہ میرے ساتھ ہی سوتی تھی۔ ماریہ شادی تک میرے ساتھ ہی رہی تھی۔ ثنا اور مونا اس پر کہتیں کہ وہ میری لاڈلی ہے جبھی میں نے اسے شادی تک اپنے ساتھ رکھا۔ میری تنخواہ اچھی تھی اور میں نے موجود رقم بھی ایسی بچت اسکیموں میں لگادی تھی جہاں وہ کئی گنا زیادہ ہوگئی۔ یہ میں نے بچیوں کی شادی کے لیے رکھ دی تھی۔ ان کی تعلیم اور آنے والے دوسرے اخراجات کے لیے میں رقم جمع بھی کرتی تھی۔

اللہ نے کرم کیا اور میں نے نہ صرف بچیوں کو اچھی تعلیم دلوائی بلکہ ان کی شادیاں بھی اچھے طریقے سے اور اچھے گھرانوں میں کیں۔ جب رشتہ لانے والے سنتے کہ میں جوانی میں بیوہ ہوگئی تھی اور میں نے خود محنت کر کے بچیوں کو پالا ہے تو وہ بہت متاثر ہوتے تھے۔ کبھی کبھی میں سوچتی کہ اس رات زید حسن کو ہارٹ اٹیک نہ ہوتا اور وہ میرے مانگنے پر طلاق دے دیتا تو کیا آج میں اپنی بچیوں کی اتنے اچھے طریقے سے پرورش کرسکتی تھی؟ ان کو اتنی آسائشیں اور سہولتیں دے سکتی تھی۔ یہ ممکن نہیں تھا کیونکہ طلاق کی صورت میں میں خالی ہاتھ زید حسن کے گھر سے بچیوں کو لے کر نکلتی اور شاید بہت محنت کے بعد بھی ان کو اس مقام تک نہ پہنچا سکتی اور نہ ان کی شادیاں اتنے اچھے طریقے سے کرسکتی تھی۔

اگر میں طلاق یافتہ ہوتی تو میری بچیوں کے لیے آنے والے رشتے صرف یہی سن کر واپس چلے جاتے اور آج وہ اپنے گھروں میں خوش وخرم نہ ہوتیں۔ شاید یہی سوچ کر میں نے ایمبولینس کے لیے فوری کال نہیں کی تھی۔ میں سکون سے بیٹھی زید حسن کو دیکھتی رہی جس کا چہرہ پسینے میں بھیگ رہا تھا اور اس کی سانس رک رک کر چلنے لگی تھی۔ جب تک وہ ہوش میں رہا مجھ سے التجا کرتا رہا کہ میں ایمبولینس کے لیے کال کروں یا کسی پڑوسی کو بلالاؤں جو اسے اسپتال لے جائے جہاں اس کی جان بچ جائے۔ میں اس کی التجائیں یوں سنتی رہی جیسے آج تک میری فریادیں سنتا آیا تھا، بے حسی اور پتھر پن کے ساتھ۔ آج میں اس کے لیے بے حس اور پتھر ہوگئی تھی۔ جب وہ بے ہوش ہوگیا اور اس کی نبض بھی تقریباً ڈوب گئی تو میں نے ایدھی کی ایمبولینس کے لیے کال کیا۔ دس منٹ میں ایمبولینس آئی اور زید حسن کو کارڈیو منتقل کیا لیکن وہ راستے میں دم توڑ چکا تھا۔ اسپتال میں ڈاکٹرز نے رسمی کارروائیاں کیں اور اس کی موت کا اعلان کردیا۔ سچ یہ ہے کہ میں نے اس کی موت کا سن کر خوشی محسوس کی تھی اور اس وقت میرا خیال تھا کہ آئندہ بھی اس معاملے میں ضمیر مجھے تنگ نہیں کرے گا۔

لیکن یہ میرا خیال تھا، جب سارے کام نمٹا کر میں رات سونے کے لیے لیٹتی تو یہ سوال اکثر میرے سامنے آکھڑا ہوتا کہ میں نے زید حسن کو قتل کیا ہے؟ کیا میں اس کی قاتل ہوں؟ بے شک وہ ہارٹ اٹیک سے مرا تھا لیکن میں نے طبی امداد کے لیے جان بوجھ کر تاخیر کی تھی اس لیے میں اس کی موت کی ذمے دار تھی۔ میں خود کو بہلاتی تھی کہ وہ شخص اسی قابل تھا۔ اس نے میری اور میری بچیوں کی زندگی جہنم بنا رکھی تھی اور اپنے اعمال کی بھینٹ چڑھا تھا۔ دل کا مرض اس کی عیاشیوں کی وجہ سے اسے لگا تھا۔ اس کے باوجود میرا ضمیر مطمئن نہیں ہوتا تھا بالآخر میں خود کو مجرم سمجھتی تھی۔ ضمیر کی یہ خلش کم سہی لیکن کسی چھوٹی سوئی کی طرح مسلسل مجھے چبھتی رہی تھی۔ یہی وجہ تھی جب ڈاکٹر نے مجھے بتایا کہ میرے دل کا ایک وال بند ہورہا ہے تو میں نے اسی وقت فیصلہ کرلیا کہ میں اس کا علاج نہیں کراؤں گی اور انتظار کروں گی کہ یہ مرض مجھے کہاں تک لے کر جاتا ہے۔ شاید یہ میرے اس جرم کا کفارہ بن جائے۔

✹

دراصل عدنان نے سیکولرازم کے مفہوم کو لچک دار بناتے ہوئے مذہبی پابندیوں کو اٹھانے کی کوششوں کا آغاز کیا تھا اور جبر کے خاتمے کی کوششیں کی تھیں۔ بوڑھا تاجر بھی ایک مذہبی آدمی تھا۔ اندھا کیا چاہے، دو آنکھیں... بس وہ عدنان کا حامی بن گیا لیکن عسکری حلقے وزیراعظم سے سخت ناراض تھے۔

1960ء میں فوج نے بغاوت کر دی۔ پھر خون بہا، پھر لاشیں گریں اور انقلاب نو کی بنیاد پڑی۔

☆☆☆

اس گرم صبح ریڈیو دیر تک خاموش رہا اور مضطرب بوڑھا اپنے کمرے میں ٹہلتا رہا۔ اُس کے باپ نے بھی دفتر جانے سے اجتناب برتا اور بچّوں کو باہر گلی میں کھیلنے سے منع کر دیا گیا کیونکہ فوج اقتدار پر قبضہ کر چکی تھی۔

''ہم نے ترقی کے دشمنوں کو گرفتار کر لیا ہے!'' طویل خاموشی کے بعد جب ریڈیو کی نشریات شروع ہوئیں تو یہ پہلا جملہ تھا جو استنبول کے باسیوں کی سماعتوں سے ٹکرایا۔

''اوہ خدایا!'' بوڑھے کی بیوی نے کہا۔ بوڑھا خاموش رہا۔

گھر میں سکوت طاری تھا۔ وہ سب خوف زدہ تھے۔

''یہ عدنان میندریس کو قتل کر دیں گے۔'' دوپہر کے وقت بوڑھے کی بھرائی ہوئی آواز نے کوٹھی کا سکوت توڑا۔

جلد یہ اطلاع بوڑھے تک پہنچ گئی کہ استنبول کے قرب و جوار سے خاصے افراد گرفتار کیے گئے ہیں۔ وہ حبس زدہ یاسیت سے بھرپور دن تھا۔ مایوسی نے ہر ایک کو اپنی گرفت میں لے رکھا تھا۔

چند دنوں بعد بوڑھے کی پیشگوئی نے حقیقت کا روپ اختیار کر لیا۔ عدنان اور اس کے ساتھیوں کو غدار قرار دیتے ہوئے تختۂ دار پر چڑھا دیا گیا۔

جب پھانسی کی خبر ریڈیو سے نشر ہوئی بوڑھے نے آہ بھرتے ہوئے کہا ''یہاں سچ بولنے کی ممانعت ہے۔ ان درندوں کے سامنے سچ بولنا گناہ ہے۔''

''لیکن آپ تو ہمیں ہمیشہ سچ بولنے کی تلقین کرتے ہیں؟'' کم سن اورخان بول اُٹھا۔ جلد ہی اسے احساس ہو گیا کہ وہ غلطی کر بیٹھا ہے، کیونکہ کمرے میں اچانک گہرا سکوت اور یاسیت چھا گئی تھی۔

''چلو بھاگو یہاں سے!'' دادی نے اسے ڈانٹا اور وہ ان کے کمرے سے بھاگ نکلا۔ اس روز اس نے دادی کا اسکیچ بنایا جس میں وہ مزید خونخوار، مزید بوڑھی نظر آ رہی تھی۔

☆☆☆

ملک میں اتاترک کے نظریات کی تجدید کے لیے زوروشور سے کام جاری تھا۔ حالات بدلنے کے دعوےٰ کیے جا رہے تھے جن میں سے زیادہ تر جھوٹ پر مبنی تھے تاہم اورخان حقیقتاً بدل رہا تھا جس کی وجہ اُس کے تایا انکل آفندی کی اچانک استنبول آمد تھی۔

انکل آفندی نے کئی برس قبل روزگار کی تلاش میں ترکی سے کوچ کیا تھا۔ کہہ کر تو یہ گئے تھے کہ بیرونِ ملک جا کر خاندان کے استحکام کے لیے ہاتھ پاؤں ماریں گے، مگر جلد اُن کے خطوں کی آمد تسلسل کھو بیٹھی۔ چند برسوں بعد پتا چلا کہ انہوں نے باہر بیاہ رچا لیا ہے۔

اورخان کے خاندان والے تو انہیں یکسر بھول چکے تھے لیکن ایک روز وہ اپنی خوبرو بیوی اور اپنی بیٹی یاسمین کے ساتھ اچانک وارد ہو گئے اور سب حیران رہ گئے۔

گوری چٹی یاسمین جلد ہی گھر کے بچّوں میں مقبول ہو گئی۔ وہ تھوڑی تنک چڑھی تھی جس کی وجہ سے ابتدا میں اورخان کا اس سے جھگڑا بھی ہوا لیکن جلد ہی وہ آپس میں گھل مل گئے۔ اب وہ دونوں گھنٹوں باغ میں کھیلتے، ایک دوسرے کا تعاقب کرتے، درختوں پر چڑھتے، قہقہے لگاتے۔ اور سوکیدا اپنے چھوٹے بھائی اور اس کی ننھی دوست کو دور بیٹھا ہونٹوں پر مسکراہٹ سجائے دیکھتا رہتا۔

اورخان کو بچپن میں قطعی اندازہ نہیں تھا کہ غربت بھی کوئی چیز ہے۔ اس کے پاس تمام سہولیات تھیں پھر ایک روز اُس کے بابا کی نئی کار ایک پرانی خستہ حال بستی میں داخل ہوئی۔ تب اس نے پہلی بار پسماندگی کو انتہائی قریب سے دیکھا۔

میلے کچیلے مناظر نے اُس کے ذہن پر اَنمٹ نقوش چھوڑے۔ دماغ میں سوال کلبلانے لگا ''میں ان بچّوں سے کیوں کر مختلف ہوں؟''

اس نے بابا سے بھی پوچھا لیکن باپ کاروباری معاملات میں ایسا اُلجھا تھا کہ اُس کی جانب توجہ نہیں دے سکا۔

بعد میں اُس نے یاسمین کے سامنے یہ سوال رکھا تو اُس نے کاندھے اُچکا کر کہا ''وہ غریب ہیں، اور ہم امیر!''

''کیا مطلب؟'' اورخان امیر غریب کی تفریق سے لاعلم تھا۔

''ہاں، ہمارے پاس پیسے ہیں، ان کے پاس نہیں لیکن ہمیں ان کی مدد کرنی چاہیے۔'' اس کی نیلی آنکھوں میں معصومیت تھی۔

ایک برس بعد انکل آفندی نے اپنے باپ سے لڑ جھگڑ کر گھر چھوڑنے کا اعلان کر دیا۔ اُس وقت تک اورخان کو قطعی

اندازہ نہیں تھا کہ وہ یاسمین سے محبت کرنے لگا ہے۔

یاسمین سے جدائی کے بعد تنہائی نے اسے آن گھیرا۔ کئی دنوں تک اس نے رنگوں کو ہاتھ نہیں لگایا۔ اس دوران سوکیدا خاموشی سے اُس کی حرکات کا جائزہ لیتا رہا۔ اس نے اورخان کو سنبھالنے کی کوشش نہیں کی۔ وہ چاہتا تھا کہ اورخان خود بدلتے ہوئے حالات کا ادراک کرے اور دھیرے دھیرے اُسے واقعی احساس ہونے لگا تھا کہ گھر میں کوئی گڑبڑ ہے۔

''لوگ خاموش ہوتے جا رہے ہیں۔ سب ایک دوسرے سے کھنچے کھنچے سے رہتے ہیں۔'' وہ خود سے کہا کرتا تھا۔

اور پھر ایک روز یہ عُقدہ بھی کھل گیا۔ دراصل گھر میں پیدا ہونے والے تناؤ کا سبب انکل آفندی تھے جنھوں نے جائداد میں اپنے حصے کا تقاضا کر دیا تھا۔

اُس دوپہر اُس کے ماں باپ اونچی آواز میں بحث کر رہے تھے اور وہ پاس ہی کھڑا ہے۔

''آفندی چاہتا ہے کہ اُسے اس کا حصہ دے دیا جائے۔ جائداد فروخت کرنی پڑے گی۔'' مضمحل یاسر پاک اپنی بیوی سے کہہ رہا تھا۔

''یہ کس طرح ممکن ہے؟ ہمارے بچے ہیں۔ مشترکہ گھر، مشترکہ کاروبار ہے۔ ہم کہاں جائیں گے؟'' وہ چلّائی اور اُس کا حسین چہرہ بگڑ گیا۔

اس روز اورخان کو اندازہ ہوا کہ اس کا خاندان اتنا امیر بھی نہیں، جتنا وہ خود کو سمجھتا تھا۔ جُوں جُوں وہ اس بابت سوچتا رہا، پریشانی میں اضافہ ہوتا گیا۔ اسے لگنے لگا کہ وہ اپنے پیارے گھر کو جلد کھو دے گا۔

چند روز بعد اُس کے دُور کے چچا جو گزشتہ کئی برسوں سے اوپری منزل میں ٹھہرے ہوئے تھے کوٹھی چھوڑ گئے اور وہ حصہ کرائے پر چڑھا دیا گیا۔

☆☆☆

اگر مطالعہ ایک ''مرض'' ہے تو یہ مرض اُسے اپنے بابا سے لگا!

وہ اپنے باپ کے قدموں کا تعاقب کرتے ہوئے کتب خانے میں داخل ہو جاتا جہاں کتابوں کی بُو اس کے نتھنوں سے ٹکراتی۔ گو کہ اُس وقت اُسے کتابوں کی اہمیت کا ادراک نہیں تھا تاہم وہ یہ سمجھ چکا تھا کہ پڑھنے لکھنے والے بڑے قابل لوگ ہوتے ہیں۔

کتب خانے میں پندرہ سو سے زائد کتابیں تھیں۔ ایک حصہ مذہبی کتابوں کے لیے وقف تھا، ایک ادبی کتابوں کے لیے۔ ملکی و غیر ملکی ادب کو الگ الگ حصوں میں تقسیم کیا گیا تھا۔

یاسمین کی جدائی کے بعد جس درد نے اورخان کو جکڑا تھا، مطالعے کے طفیل اس کی گرفت ڈھیلی پڑنے لگی۔ اور پھر ایک روز اس پر انکشاف ہوا کہ اس کا شفیق بابا نہ صرف ایک سنجیدہ قاری ہے، بلکہ ایک اچھا لکھاری بھی ہے۔

''آپ لکھتے بھی ہیں؟'' اس نے حیرت کے ساتھ اپنے باپ سے دریافت کیا جو کتب خانے میں بیٹھا ایک ڈائری میں کچھ لکھ رہا تھا۔

''اوہ، ہاں!'' وہ مسکرایا۔ ''اِدھر آؤ۔'' وہ اپنے بیٹے کو اپنے نوٹس دکھانے لگا۔

''اوہ، یہ تو فرانس میں آپ کے قیام کے زمانے کی یادیں ہیں!'' ڈائری کی ورق گردانی کرنے کے بعد اورخان نے کہا۔

''ہاں!'' اُس کے چہرے پر مسکراہٹ تھی۔

اُس کا بیٹا اُس کا پہلا قاری تھا جس کی آنکھوں میں اپنے بابا کی تحریریں پڑھنے کی قوی خواہش نظر آتی تھی۔ ایسی خواہش جسے اُس کا باپ اپنے بھائیوں، اپنے دوستوں کی آنکھوں میں کبھی نہیں دیکھ سکا۔

اِس ملاقات کے بعد وہ ہر اتوار اورخان کے لیے چاکلیٹ لانے لگا۔ غالباً یہ اپنے پہلے قاری کو لبھانے کی کوشش تھی۔

بابا کی ڈائری پڑھتے پڑھتے ایک روز اورخان کے اندر سویا ادیب جاگ اُٹھا۔ وہ میز کے سامنے قلم اور دوات لے کر بیٹھ گیا۔ یہ سفر اُسے نئی دنیا میں لے گیا۔

جو پہلا خیال ذہن میں کوندا وہ اپنی شناخت سے متعلق تھا۔ اُسے یاد تھا، چند ماہ قبل جب وہ ایک غریب بستی میں داخل ہوا تھا تو وہاں پھٹے پرانے کپڑوں میں ملبوس بچّوں کو دیکھ کر اس کے ذہن میں یہی خیال آیا تھا کہ مجھ میں اور ان میں کیا فرق ہے!

اب اورخان ورق سیاہ کرتے ہوئے اس سوال کا جواب ڈھونڈ رہا تھا۔

ٹھیک ان لمحات میں جب وہ سر جھکائے کچھ لکھ رہا تھا، کوٹھی کے سامنے سے گزرتا ایک بوڑھا شخص ٹھٹک گیا۔ اس نے نظر اُٹھا کر کوٹھی کی جانب دیکھا۔ نگاہ کھڑکی پر جا ٹھہری جہاں وہ گہری سوچ میں مستغرق ایک معصوم چہرہ دیکھ سکتا تھا۔ اُس نے بچے کو پہچان لیا۔

''میری پیشگوئی کبھی غلط ثابت نہیں ہوتی!'' بوڑھا نجومی دل ہی دل میں مسکرایا اور قدرے بلند آواز میں بولا۔ اس کی

www.paksociety.com

www.paksociety.com

آواز نیچے تک پہنچی تو اس نے سر اُٹھا کر اُدھر دیکھا۔

☆☆☆

اورخان نے رابرٹ کالج سے ابتدائی تعلیم حاصل کی جو استنبول کا سب سے بڑا، قدیم اور مہنگا نجی اسکول تصور کیا جاتا تھا۔ بھاری فیس کے باوجود اورخان کے باپ نے اپنے لاڈلے بیٹے کے لیے اسی ادارے کا چناؤ کیا تھا۔ یہاں قدم رکھنے کے بعد وہ اپنے وسیع مطالعے اور رنگوں کے استعمال میں مہارت کے طفیل جلد ہی دیگر طالب علموں میں مقبول ہوگیا، خصوصاً لڑکیاں تو اس کی دیوانی تھیں۔

"اورخان، کیا تم میرا اسکیچ بنا دو گے؟" ایک دوشیزہ سوال کرتی۔ "ڈیئر، مجھے تاریخ کے مضمون میں شدید پریشانی کا سامنا ہے، ذرا میری مدد کردو، پلیز!" نیلی آنکھوں والی دوسری لڑکی درخواست کرتی۔

شرمیلے اورخان نے خود کو ان جھمیلوں سے دُور ہی رکھا۔ دراصل اُن ہی دنوں وہ تازہ تازہ کسی کے عشق میں مبتلا ہوا تھا اور یہ تھا اس کا پیارا شہر استنبول!

اسے اپنے قدیم شہر کی گلیاں اچھی لگنے لگی تھیں۔ وہ گھنٹوں آوارہ گردی کرتا لیکن یہ سلسلہ زیادہ عرصے چل نہیں سکا۔ جلد ہی وہ گھر اور کالج تک محدود ہوگیا۔ دراصل اُن دنوں ملک کے حالات انتہائی مخدوش تھے۔ سیاسی صورتِ حال ابتر تھی۔ فوج نے اقتدار سیاست دانوں کو منتقل کر دیا تھا لیکن مخلوط سیاسی حکومت ملک کو ترقی کی راہ پر گامزن کرنے میں ناکام رہی جس کے لیے وہ ڈھکے چھپے الفاظ میں فوج کی آمرانہ پالیسیوں کو ذمے دار ٹھہراتی تھی۔ دوسری جانب ملک کے اُن حصوں میں جہاں کرد آباد تھے بغاوت زور پکڑتی جا رہی تھی۔ استنبول میں بھی اندیشوں نے چہرے سیاہ کر رکھے تھے۔

"کچھ ہونے والا ہے!" لوگ سرگوشیوں میں ایک دوسرے سے کہتے پھر چونک کر اِدھر اُدھر دیکھتے کہ کہیں کسی نے سن تو نہیں لیا۔

اُن ہی دنوں اُس نے عجیب و غریب خواب دیکھنے شروع کیے، جن میں سے چند تو بے حد خوفناک ہوتے۔ وہ صبح بیدار ہونے کے بعد خوابوں کو الفاظ کی صورت ڈائری میں قلم بند کرنے کا ارادہ باندھتا لیکن ناکام رہتا۔ وہ بے رنگ خوابوں کو اپنی پینٹنگز میں اُتارنے کی بھی کوشش کرتا لیکن یہاں بھی بات نہیں بنتی۔

اسکول ہی کے زمانے میں اُس کی دوستی خلیل سے ہوئی، ایسی دوستی جس کی جلد مثالیں دی جانے لگیں۔ وہ ایک دوسرے کے راز دار تھے اور بہترین مشیر تھے۔ دونوں اکثر ساتھ دیکھے جاتے۔ خلیل نے بھی اُس کی دیکھا دیکھی مصوری کی کوشش کی لیکن ناکام رہا۔ ہاں، مطالعے کے میدان میں وہ اس کا ساتھ دے سکتا تھا اور ساتھ دیا بھی۔

آنے والے برسوں میں خلیل اورخان کی تحریروں کا پہلا قاری، پہلا ناقد بننے والا تھا مگر اُس وقت دونوں ہی کو اس کا ادراک نہیں تھا۔

پھر ایک روز خلیل ایک اچھوتے مشورے کے ساتھ وارد ہوا۔ "ہمیں آرکیٹیکٹ بننا چاہیے!" اس مشورے نے اورخان کو تجسس سے بھر دیا۔

قصہ کچھ یوں تھا کہ ان دنوں خلیل کا گھر زیرِ تعمیر تھا اور وہ گھنٹوں ٹھیکے دار کے ساتھ بیٹھا رہتا تھا۔ اس نے بجری، اینٹ اور سیمنٹ کے ملاپ سے عمارت بنتے دیکھی تو سوچا کہ اسے اور اس کے دوست کو یہی پیشہ اپنانا چاہیے۔

جلد ہی دونوں دوستوں نے اعلان کر دیا کہ چاہے کچھ ہوجائے وہ مستقبل میں آرکیٹیکٹ ہی بنیں گے۔ اسکول سے فارغ ہونے کے بعد انہوں نے استنبول ٹیکنیکل کالج میں داخلہ لے لیا لیکن قسمت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ خلیل کو گھریلو حالات کی وجہ سے یونیورسٹی چھوڑنی پڑی جس کے بعد اورخان بھی آرکیٹیکٹ بننے میں دلچسپی کھو بیٹھا۔

"میں بے مقصدیت اور بے حسی کا شکار ہوگیا ہوں!" اُس نے مایوسی سے خود سے کہا۔

وقت کے دھارے میں بہتا اورخان بوڑھے نجومی، اُس کی پیشگوئی کو پوری طرح بھلا چکا تھا۔ اسے قطعی اندازہ نہیں تھا کہ قسمت اپنا فیصلہ کر چکی ہے۔

☆☆☆

"ہمارے سیاست داں فوجی آمروں کی توسیع کے سوا کچھ نہیں!"

سرخی نے اُسے چونکا دیا۔ یہ ایک معروف باغی صحافی کا انٹرویو تھا جس نے حکومتِ وقت پر شدید تنقید کی تھی۔ اُس کی جرأتِ اظہار نے اورخان کو بہت متاثر کیا۔ چند روز بعد اسے اطلاع ملی کہ اس باغی صحافی کو گرفتار کر لیا گیا ہے۔

"کہیں اِسے بھی قتل نہ کر دیا جائے!" اس کے ذہن میں عدنان میندریس کو تختۂ دار پر لٹکانے کی یاد نقش تھی۔

خوش قسمتی سے وہ صحافی اپنی جان سے نہیں گیا لیکن اسے قید و بند کی صعوبتیں برداشت کرنا پڑیں۔ جس اخبار میں اُس کا انٹرویو شائع ہوا تھا، وہ بھی بند ہوگیا۔ تب اورخان کو پہلی بار احساس ہوا کہ اس کے ملک میں اظہار کی آزادی نہیں۔

یہی سوچتے سوچتے وہ ایک روز ایک سرسبز پارک میں جا بیٹھا۔ وہی پارک جہاں برسوں قبل اپنے دادا کی معیت میں وہ ایک پُراسرار مستقبل بین سے ملا تھا۔

خاصے غور و فکر کے بعد اُس نے ایک فیصلہ کیا "میں صحافی بنوں گا!"

یہ ایک ایسا فیصلہ تھا جو مستقبل میں اسے ناول نگاری کی جانب لے گیا۔

☆☆☆

"آمرانہ پالیسیاں ترک کرو، غریبوں کو اُن کا حق دو!"

ہر طرف سرخ جھنڈے، جوشیلے نوجوان، احتجاجی ریلیاں!

ترقی پسند فکر نے حکومتی گرفت کو کمزور کرنا شروع کر دیا تھا۔ ملک کے دیگر علاقوں کی طرح استنبول میں بھی مارکسی سوچ کے حامل نوجوان سڑکوں پر نکل آئے تھے جن کے ساتھ قوم پرست اور مذہبی جماعتیں بھی کھڑی ہوگئیں۔ حالات بگڑنے لگے۔

گو کہ اسے بھی مارکسی فکر نے متاثر کیا تھا اور وہ چھپ کر لینن کی کتابیں پڑھا کرتا تھا لیکن کبھی خود کو کھلی طور پر اس سوچ سے منسلک نہیں کر سکا۔ یونیورسٹی اُن دنوں اکثر بند رہا کرتی تھی اور اورخان اپنے کمرے میں بیٹھ کر رنگوں سے کھیلا کرتا تھا۔

سات برس کی عمر میں رنگوں کے عشق میں گرفتار ہونے والا اورخان تاحال خود کو دریافت نہیں کر سکا تھا۔ سب ہوتے ہوئے بھی کوئی کمی تھی۔ عجیب سی بے کلی تھی۔

اکثر اس کا باپ کمرے میں جھانکتا، اُسے کینوس کے سامنے کھڑا دیکھتا اور خاموشی سے آگے بڑھ جاتا۔

انتشار کے ان ہی دنوں میں ایک روز، نہ جانے کتنے برسوں بعد راہ چلتے اچانک اس کی ملاقات اپنی چچازاد یاسمین سے ہوگئی۔

بازار میں جب ان کا سامنا ہوا، وہ گھبرا گیا کیونکہ اب وہ پہلے سے زیادہ حسین ہوگئی تھی، تاہم جلد ہی خود کو نارمل کرتے ہوئے اس سے گفتگو کرنے لگا۔

اس ملاقات سے قبل وہ سوچا کرتا تھا کہ یاسمین کی یاد آج بھی اس کے دل میں ہے لیکن اپنی پہلی محبت سے برسوں بعد روبرو ہونے کے تجربے نے اسے احساس دلایا کہ وہ اب اُس کے سحر سے نکل چکا ہے۔ اب تو اسے فقط ایک شے سے محبت ہے اور وہ ہے استنبول!

گھر لوٹنے کے بعد اس نے یاسمین کا اسکیچ بنایا اور بہ ذریعہ ڈاک اسے روانہ کر دیا جس پر اس نے لکھا "ہماری دوستی کا پہلا اور آخری تحفہ!"

اُس دن 22 سالہ اورخان نے مصوری کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے خیرباد کہہ دیا۔ یہی وہ موقع تھا جب اس نے صحافی بننے کا ارادہ ترک کر کے حتمی فیصلہ کیا کہ وہ حقیقتاً ایک ناول نگار ہے۔

"اس شہر کی کہانیاں بیان کرنا ہی میری زندگی ہے، میرا پیشہ ہے۔" اس نے جوش سے لرزتے ہوئے نعرہ لگایا۔

اگر اُس وقت بوڑھا نجومی وہاں ہوتا تو اس پُرجوش نوجوان کو دیکھ کر ضرور مسکرا دیتا کیونکہ وہ تو یہ پہلے ہی سے جانتا تھا!

اورخان کو اپنے ناول کے لیے ایک مضبوط کردار، متاثر کن پلاٹ کی ضرورت تھی۔ وہ ایک ایسی صورتِ حال تخلیق کرنا چاہتا تھا جو قارئین کو اپنے سحر میں جکڑ سکے۔

غور و فکر کے بعد اُس نے اپنے بھائی سوکید کی شخصیت کا چناؤ کیا۔ اُسے سامنے رکھتے ہوئے لکھنا شروع کیا اور کہانی آگے بڑھنے لگی۔ مستقبل میں سوکید کا کردار اُس کے کئی ناولز میں نظر آیا۔

ناول شروع کرنے سے قبل اُس نے سوکید کو بھی مطلع کیا "تم میرے ناول کا ایک اہم کردار ہو!"

جواب میں سوکید مسکرایا۔ مستقبل میں سوکید اکنامکس کے مضمون پر تحقیق کر کے اپنی شناخت بنانے والا تھا لیکن اُس وقت وہ فقط اورخان کے ناول کا ایک کردار تھا۔

نوجوان اورخان نے اپنے بچپن کی کہانی، اس وقت کے حالات اور گھریلو ماحول کو برتتے ہوئے اپنے پہلے ناول کا آغاز کر دیا اور کرب کے اتھاہ سمندر میں اُتر گیا۔

☆☆☆

"ناول بے کار ہے... اسے چھاپنا گھاٹے کا سودا ہوگا... تم کبھی بڑے لکھاری نہیں بن سکتے... تم میں تجربے کی کمی ہے..."

یہ اور اس طرح کے سیکڑوں زہریلے جملوں نے اسے توڑ دیا تھا۔ وہ گزشتہ چار برس سے اپنے پہلے ناول کی اشاعت کے لیے بھاگ دوڑ کر رہا تھا۔

اُس نے 1974ء میں اپنی مادری زبان میں لکھنے کا آغاز کر دیا تھا۔ اس وقت عمر ہی کیا تھی، فقط 22 سال جو ادب کو گہرائی سے سمجھنے کے لیے، زندگی کی تفہیم کے لیے کوئی خاص عمر نہیں لیکن وہ لکھتے ہوئے اپنی تحریر میں کلی طور پر شامل ہوجاتا تھا۔ یہی اس کی انفرادیت تھی۔

"اندھیرا اُجالا" (Darkness and Light) اس کی پہلی کاوش تھی اور ہر نوجوان ادیب کی طرح وہ اسے

www.Paksociety.com

شاہکار تصور کرتا تھا۔ اور وہ کچھ ایسا غلط بھی نہیں تھا کہ اس کتاب کے مسودے کو 1979ء میں غیر مطبوعہ ناولوں کے مقابلے میں قومی ایوارڈ سے نوازا جا چکا تھا لیکن اب اسے کوئی چھاپنے کو تیار نہیں تھا۔ یہ ناول استنبول میں مقیم ایک امیر خاندان کی تین نسلوں کی کہانی بیان کرتا تھا جو حقیقتاً اس کی اپنی کہانی تھی۔

ناکامیوں کے اُن دنوں میں وہ اکثر خوابوں میں خود کو ایک ایسے شخص کے طور پر دیکھتا جو رائٹنگ ڈیسک کے سامنے بیٹھا ہے اور گھنٹوں گزر جانے کے باوجود لکھنے سے قاصر ہے۔ یہ خواب اسے افسردہ کردیتے۔

چند دوستوں نے سنجیدہ ادب سے دامن چھڑا کر کمرشل رائٹنگ کی جانب آنے کا بھی مشورہ دیا جہاں شناخت بنانا زیادہ آسان تھا، لیکن اس نے انکار کردیا۔

''میں صبر، خوشی، احتیاط اور یقین کے ساتھ لکھتا ہوں اور جو کچھ لکھتا ہوں، اس پر کامل یقین رکھتا ہوں۔'' وہ جواب دیتا۔

''پھر تو کامیابی کا حصول آسان ثابت نہیں ہوگا!'' ناصح منہ بنا کر کہتے۔

''میں جانتا ہوں۔'' وہ جواب دیتا۔

اُس وقت تک اورخان کے ''دے دے'' کا خواب چکنا چور ہو چکا تھا۔ خاندان بکھر گیا تھا، کاروبار ٹھپ ہو گیا تھا اور معاشی مسائل کا عفریت منہ کھولے کھڑا تھا۔

اُن تلخ دنوں میں دلکش ایلین اُس کی غم گسار بنی رہی۔

ایلین اُس کی سب سے گہری دوست تھی۔ وہ ایک پڑھے لکھے خاندان سے تعلق رکھنے والی تہذیب یافتہ لڑکی تھی، اس پر مستزاد بلا کی حسین تھی۔ سچ تو یہ ہے کہ وہ ایسی لڑکی تھی جس کے لیے اچھے رشتوں کی کمی نہیں تھی لیکن وہ لکھنے کے عشق میں مبتلا ایک نوجوان کو دل دے بیٹھی۔ حالانکہ سہیلیوں نے کئی بار سمجھایا ''اس وجیہہ نوجوان کا مستقبل تاریک ہے، اسے لکھنے لکھانے کے علاوہ کوئی کام نہیں آتا۔''

لیکن اس نے کبھی ان تبصروں کو اہمیت نہیں دی، ہمیشہ اورخان کی دل جوئی کرتی رہی۔

اورخان اور ایلین کی دوستی کا بنیادی سبب ان کے یکساں خیالات اور یکساں طرزِ پرورش تھی۔ ایلین سے پہلی ملاقات کی یاد آج بھی اورخان کے ذہن پر نقش تھی۔

اُسے اچھی طرح یاد تھا، کس طرح اُس دوشیزہ نے اپنے تہذیبی اطوار سے فوراً ہی اُسے گرویدہ بنا لیا تھا۔ یہ تو اُسے بعد میں پتا چلا کہ ایلین نے بھی اُسی اسکول سے تعلیم حاصل کی تھی جس کا وہ طالب علم رہا تھا۔

بے روزگاری اور ناکامیوں ہی کے زمانے میں ایک روز اس نے ایلین کو روایتی ترک مردوں کے انداز میں شادی کی پیشکش کردی تھی۔

''ہمیں سانس لینے کے لیے یکساں فضا میسر تھی۔ ہم ایک سے ماحول میں پروان چڑھے۔ تم بھی ان ہی سڑکوں پر گھومتی رہیں، جس پر میں نے آوارہ گردی کی، سو اب میں چاہتا ہوں کہ تم ہمیشہ ہمیشہ کے لیے میری ہو جاؤ۔ کیا تمھیں میرا ساتھ قبول ہے۔''

''ہاں، مجھے قبول ہے!'' پُراعتماد ایلین نے ازراہِ مذاق شرماتے ہوئے جواب دیا۔

''زبردست!'' نوجوان ادیب نے خوشی سے ناچنا شروع کردیا۔

حالانکہ وہ دن جشن منانے کے لیے قطعی سازگار نہیں تھے۔ 1980ء میں فوج نے ایک بار پھر اقتدار پر قبضہ کرلیا تھا۔ ہزاروں افراد کو مارشل لا ایکٹ کے تحت گرفتار کیا گیا۔ کئی کو تخریب کاری کا مجرم قرار دے کر جیل میں ڈال دیا گیا۔ کئی کو موت کا حق دار ٹھہرایا گیا، لیکن ان تمام باتوں کے باوجود اورخان خوش تھا کہ ایلین نے ''ہاں'' کردی ہے۔

جلد اُسے ایک اور خوش خبری ملی۔ ایک پبلشر نے اُس کا پہلا ناول چھاپنے پر رضامندی ظاہر کر دی تھی۔ نجومی کی پیشگوئی حقیقت کا روپ دھار رہی تھی!

گوکہ Cevdet Bey and Sons کے عنوان سے شائع ہونے والی اُس کی کتاب پر چند حلقوں نے شدید تنقید کرتے ہوئے اِسے روایتی ترک ادب کو سبوتاژ کرنے کی کوشش قرار دیا لیکن سنجیدہ ناقدین نے اُسے سراہا۔

اُسی برس اُس نے اپنی محبوبہ سے شادی کرلی۔ جس روز شادی کی تقریب تھی، شہر کے حالات بڑے ہی غیر متوقع اور ڈرامائی انداز میں بگڑ گئے یہاں تک کے اس کے اہلِ خانہ تقریب ملتوی کرنے کے بارے میں سوچنے لگے لیکن کہتے ہیں ناں جہاں چاہ، وہاں راہ! اس کے بھائی سوکید کا ایک دوست پولیس میں تھا جس نے اُنھیں بھرپور تحفظ فراہم کرنے کا یقین دلایا اور شہر کے مخدوش حالات کے باوجود برات گئی اور دلہن کو لے آئی۔

شادی نے تو جیسے اس کی قسمت ہی بدل دی۔ اگلے ہی برس اسے اپنے ناول کے لیے ''کمال ایوارڈ'' جیسے اہم قومی اعزاز سے نوازا گیا جو ایک بڑی کامیابی تھی۔ اُسی زمانے میں اس نے اپنے دوسرے ناول ''خاموش گھر'' (The Silent

House) پر کام شروع کیا۔

اس کے پاس لکھنے کے علاوہ کوئی ہنر نہیں تھا اور قلم مزدوری سے حاصل ہونی والی آمدنی پر گزر بسر ممکن نہیں تھا لیکن سہولت یہ تھی کہ اُس کی بیوی بھی بطور مورخ خود کو منوانے کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہی تھی، دھیرے دھیرے آگے بڑھ رہی تھی اور اس کوشش کے طفیل چار پیسے ہاتھ آجاتے تھے۔

جدوجہد کے اُن ہی دنوں ''خاموش گھر'' منظرِ عام پر آیا جو ایک ہی خاندان کے تین افراد کی کہانی بیان کرتا تھا جو اپنی دادی سے ملنے استنبول کے نزدیک آباد ایک چھوٹے سے قصبے کا رُخ کرتے ہیں۔

ردِعمل حیران کن رہا!

''تاریخ کو اَچھوتے اسلوب اور منفرد تکنیک میں بیان کرکے اورخان نے کمال کردیا!'' ایک سینئر نقاد نے تبصرہ کیا۔

اور یہ سچ تھا، واقعی اُس نے ناول میں تاریخ نویسی کو نئی بلندیوں سے ہم کنار کردیا تھا۔

جب ناول کو قبولِ عام کی سند حاصل ہوگئی، اُسے ایوارڈز سے نوازا گیا، اورخان نے جشن کا انتظام کیا جس میں اپنے دوستوں کے علاوہ اُن سخت دل پبلشروں کو بھی مدعو کیا جنہوں نے اس کا پہلا ناول چھاپنے سے انکار کردیا تھا۔ توقع کے عین مطابق اُن میں سے کوئی بھی تقریب میں شریک نہیں ہوا۔

''تمھیں اِس ناول کا آئیڈیا کیسے سُوجھا؟'' ایک ہم عصر ادیب نے دعوت والے روز دریافت کیا۔

''اپنی پیاری دادی سے!'' اورخان مسکرایا۔

''کیا مطلب؟'' اس کی آنکھوں میں حیرت تھی۔

''وہ اکثر نیند میں بڑبڑایا کرتی تھیں۔ دلچسپ امر یہ ہے کہ عالمِ غنودگی میں بھی اُن کے منہ سے ادا ہونے والے الفاظ انتہائی بامعنی ہوتے۔ سو مجھے خیال آیا کہ ایسا ناول لکھا جائے جس میں نیند اور بیداری کے درمیان کے تعلق کو دریافت کیا جائے۔''

''شان دار!'' ہم عصر ادیب نے اُس کا کاندھا تھپتھپایا۔

جلد ہی اُسے بڑی ادبی تقریبات میں مدعو کیا جانے لگا۔ لوگ اُس سے آٹوگراف لینے لگا۔ ''خاموش گھر'' کے قارئین میں نوجوانوں کی اکثریت تھی جن میں لڑکیاں بھی تھیں۔ چند لڑکیاں تو اُس کی وجاہت کی وجہ سے اُس کے عشق میں مبتلا ہو گئیں۔

ایسی ہی ایک حسینہ نے اُسے شادی کی بھی پیشکش کردی لیکن جب اُسے پتا چلا کہ اُس کا محبوب مصنف شادی شدہ ہے تو وہ بجھ گئی۔

''وہ کون خوش نصیب ہے؟'' اس نے یاس بھرے لہجے میں پوچھا۔

''وہ میرے گاؤں ہی کی ایک لڑکی ہے، بس والدین نے بچپن ہی میں رشتہ طے کردیا تھا۔'' اس نے منہ بسورتے ہوئے کہا۔

بعد میں جب اس نے یہ قصہ ایلین کو سنایا وہ ہنس ہنس کر دُہری ہوگئی۔

☆☆☆

ایک جانب ستائش تھی، دوسری جانب تنقید!

اورخان کے لیے حالات بگڑ رہے تھے کیونکہ جوں جوں وہ شہرت حاصل کرتا جارہا تھا، حاسدین کی تعداد بڑھتی جارہی تھی۔

اب اس پر کھلے الفاظ میں یہ الزام عائد کیا جانے لگا تھا کہ اس کی تحریروں میں ہم عصر ادیبوں کا رنگ اتنا چڑھ گیا ہے کہ وہ ادبی تخلیقات کے بجائے سرقہ لگتی ہیں۔ البتہ اُسے تنقید کی پروا نہیں تھی۔

اورخان کے مانند جلد ایلین کی قسمت بھی بدلنے والی تھی۔ جس روز اسے امریکا کی کولمبیا یونیورسٹی، نیویارک کی اسکالر شپ ملی۔ میاں بیوی نے جشن منایا۔

''میں اپنے خواب کے بہت قریب ہوں جان!'' اُس نے فرطِ جذبات سے کانپتے ہوئے کہا۔

''ہاں، اور مجھے یقین ہے کہ تم کامیاب رہوگی!'' اس نے اپنی بیوی کی حسین زلفوں میں پیار سے ہاتھ پھیرا۔

''لیکن مجھے ایک بات کا دُکھ ہے۔'' اچانک وہ اداس ہوگئی۔

''اور وہ کیا؟'' اورخان نے اُس کی آنکھوں میں جھانکا۔

''مجھے تم سے دُور رہنا پڑے گا۔'' اس نے سسکی لی۔

''قطعی نہیں!'' اورخان نے اپنی بیوی کو بانہوں میں بھر لیا۔ ''میں ہمیشہ تمہارے ساتھ رہوں گا۔ جہاں تم ہوگی میں بھی وہاں ہوں گا۔'' اس کی آنکھوں میں نمی تھی۔

اورخان کو قطعی اندازہ نہیں تھا کہ وہ قبولیت کی گھڑی تھی۔

ایلین کے جانے کے چند روز بعد جب اورخان کرسی پر بیٹھا میز پر بکھرے کاغذات کو گھور رہا تھا، فون بجا اور اُسے ایک انوکھی خوش خبری ملی۔

اُسے کولمبیا یونیورسٹی، نیویارک میں وزیٹنگ اسکالر کی ملازمت مل گئی تھی۔ اُسے اپنی قسمت پر یقین نہیں آرہا تھا۔

اورخان نے فوراً اپنی بیوی کو فون ملایا۔ ''میں بھی آرہا

www.paksociety.com

ہوں جان!"

"کیا مطلب؟" میلوں دُور بیٹھی ایلن اُس کی بات سمجھ نہیں سکی۔ جب اس نے اپنی بیوی کو تفصیلات بتائیں، وہ حیران رہ گئی۔

☆☆☆

پُراسرار خواب اُس کے تعاقب میں تھے۔

"آقا کون ہے، غلام کون؟ میں کہاں سے شروع ہوتا ہوں، وہ کہاں ختم ہوتا ہے؟ میں وہ کیوں ہوں، جو میں ہوں؟" تاریک خوابوں میں ایک بے چہرہ شخص اُس کا تعاقب کرتا، پیچیدہ سوالات کرتا اور وہ ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھتا۔ اس وقت اس کا جسم پسینے میں شرابور ہوتا۔

دھیرے دھیرے بیداری کی کیفیت میں بھی کوئی اُس کے کانوں میں سرگوشیاں کرنے لگا "آقا کون ہے، غلام کون؟"

چند دنوں تک اذیت میں مبتلا رہنے کے بعد وہ کلی طور پر ان سرگوشیوں کے سحر میں گرفتار ہوگیا۔ انہوں نے ٹھوس سوالات کی شکل اختیار کرلی۔ ان ہی سوالات کا جواب وہ اپنے نئے ناول "سفید قلعہ" (The White Castle) میں ڈھونڈنے والا تھا۔

1985ء میں اورخان بھی نیویارک پہنچ گیا اپنی بیوی، اپنی محبوبہ کے پاس! اب ایک نئی دنیا اس کے سامنے تھی۔

نیویارک میں قدم رکھنے کے بعد جس پہلی چیز نے اُس کی توجہ مبذول کروائی، وہ وہاں کے زرخیز کتب خانے تھے جہاں وہ گھنٹوں بیٹھا مطالعہ کرتا رہتا۔ وہ عجائب گھر کا بھی رُخ کرتا جہاں وہ تاریخ کے ارتقائی سفر کا مشاہدہ کرتا۔

"امریکا کے کتب خانوں نے تو مجھے دیوانہ بنادیا ہے۔" ایک روز اُس نے کھانے کی میز پر اپنی بیوی سے کہا۔

"ہاں! کبھی کبھی مجھے لگتا ہے کہ یہ لائبریریاں میری سوکن ہیں۔"

اس جملے کے اختتام پر کھانے کی میز میاں بیوی کے قہقہوں سے گونج اُٹھی۔

☆☆☆

اُس کا ناول "سفید قلعہ" (The White Castle) شائع ہوچکا تھا، جو ایک اطالوی اسکالر کی کہانی بیان کرتا تھا، ایسے اسکالر کی جو خلافتِ عثمانیہ کے دور میں قیدی بن کر ترکی آتا ہے۔ اس ناول کا ردِعمل شاندار رہا تھا۔ جلد ہی اس نے عوام میں قبولیت حاصل کرلی جس کی اسے خوشی تھی لیکن اندر ہی اندر وہ مضطرب تھا۔

"مجھے یوں لگتا ہے جیسے میں اپنی تخلیقی صلاحیتوں سے انصاف کرنے میں ناکام رہا۔" اس نے ترکی میں مقیم خلیل کو خط لکھا۔ چند روز بعد جب خط کا جواب آیا تو اس کی پریشانی مزید بڑھ گئی۔

دراصل "سفید قلعہ" نے ایک ترک مصنف فواد کریم کو آگ بگولا کردیا تھا۔ اسے یقین تھا کہ اس ناول میں اس کی کتاب (Istanbul in the Time of the Kanuni) سے پورے پورے پیراگراف نقل کیے گئے ہیں۔ اس نے مختلف ادبی پلیٹ فورم پر اس مسئلے کو بڑی شدت سے اُٹھایا۔

ایسی ہی ایک تقریب میں خلیل بھی موجود تھا۔

جب فواد کریم تف اڑا رہا تھا خلیل نے ڈرتے ڈرتے کہا "سر آپ بڑے آدمی ہیں، اورخان نوجوان ہے۔ وہ آپ سے متاثر ہے، اسی وجہ سے آپ کے کام سے استفادہ کیا۔"

"استفادہ؟" وہ پھٹ پڑا۔ "میاں، یہ سیدھا سیدھا سرقہ ہے! میں اس بدمعاش کو دیکھ لوں گا۔"

خلیل نے گہرا سانس لیا اور اپنے دل میں اورخان کو مخاطب کیا۔ "دوست، انکل تمہارا پیچھا نہیں چھوڑیں گے۔"

خط میں اس نے اورخان کو تفصیلات سے آگاہ کردیا۔ اورخان نے تنقید کے جواب میں خاموش رہنے کو ترجیح دی اور اپنے نئے ناول پر کام کرتا رہا۔

☆☆☆

"وہی گلیاں، وہی بازار، وہی لوگ... پیارے استنبول میں لوٹ آیا ہوں!"

استنبول کا عاشق چند برس امریکا میں گزارنے کے بعد واپس آگیا تھا، تاہم وہ خالی ہاتھ نہیں تھا۔ اِن برسوں میں اس نے جم کر دنیا بھر کے ادب کا مطالعہ کیا تھا۔ خصوصاً روسی ادب نے تو اسے دیوانہ بنادیا تھا۔ پھر امریکا میں قیام کی وجہ سے اُس کی مقبولیت میں بھی خاطر خواہ اضافہ ہوا تھا۔ "سفید قلعہ" کا Victoria Holbrook نامی ایک صاحب نے انگریزی میں ترجمہ بھی شروع کردیا تھا۔

1990ء میں جب اس ناول کا ترجمہ امریکا اور برطانیہ میں شائع ہوا، جیسے تہلکہ مچ گیا۔ اسے ہاتھوں ہاتھ لیا گیا اور مابعد جدیدیت کی تحریک کے تحت مشرق میں تخلیق کیے جانے والے چند بہترین ناولوں میں اس کا شمار ہونے لگا۔ "نیویارک ٹائمز" نے تو اپنے تبصرے میں پیشگوئی بھی کردی۔

"مشرقی ادب کے اُفق پر ایک نیا ستارہ نمودار ہوچکا ہے۔"

تبصرہ حقائق پر مبنی تھا کیونکہ جلد مغرب میں اورخان کے کام کو مزید پذیرائی ملنے والی تھی۔ دوسری جانب مغرب میں "سفید قلعہ" کی قبولیت نے فرید کریم کو چلتا پھرتا بم بنادیا تھا۔ وہ ہر محفل، ہر مجلس میں اب کھل کر اورخان پر تنقید کرنے لگا۔

اورخان کے پاس تنقید نگاروں پر توجہ دینے کے لیے وقت ہی کہاں تھا؟ وہ 1985ء میں اپنے ناول "سیاہ کتاب" (The Black Book) پر کام شروع کرچکا تھا جس کی تکمیل کے دوران اُس نے انوکھی اور ناقابلِ بیان مسرت کا تجربہ کیا تھا۔ ناول مکمل کرنے کے بعد اس نے خلیل کو خط لکھا:

"میری عمر 33 برس ہے۔ میں نیویارک میں مقیم ہوں اور اکثر خود سے اپنے بارے میں، اپنی تاریخ کے بارے میں انتہائی مشکل اور پیچیدہ سوالات کرتا ہوں۔ میں کتب خانوں میں تاریخ کھنگالتا ہوں۔ سڑکوں پر مشرقی اور مغربی ثقافتوں کے جداگانہ رنگ دیکھتا ہوں، ان کے ملاپ کے اشکال کا مشاہدہ کرتا اور ایک بڑا ناول لکھنے کے لیے خود کو تیار پاتا ہوں۔ یہ ناول سیاہ کتاب ہی ہے!"

یہ ناول واقعی اُس کی زندگی بدلنے والا تھا تاہم کامیابی مفت ہاتھ نہیں آتی۔ اس منصوبے کی تکمیل کا زمانہ بے قراری اور اضطراب سے بھرپور تھا۔ لکھنے کے دوران وہ ایک اندھے شخص کے مانند آگے بڑھتا رہا۔ کئی بار لگا کہ وہ ناول کا پلاٹ کھودے گا۔

ایلن کو اُس ہیجان کا اندازہ تھا، جس میں اس کا شوہر مبتلا تھا جس کی وجہ سے ابتدا میں ان کے درمیان چند جھگڑے بھی ہوئے لیکن جلد اس نے خود کو سنبھال لیا، البتہ دونوں کے درمیان سرد مہری دَر آئی تھی جو شاید کئی روز قائم رہتی کہ ایک شب ایلن نے اپنے شوہر کو بستر کے کنارے بیٹھ کر آنسو بہاتے دیکھا اور حیران رہ گئی۔

"کیا ہوا جان؟" اُس نے آگے بڑھ کر اورخان کو بانہوں میں بھرلیا۔

"میرا... ناول... مکمل ہوگیا ہے!" وہ ہچکیوں میں فقط اتنا ہی کہہ پایا۔

"مبارک ہو!" اس نے اورخان کا ماتھا چوما۔

استنبول لوٹنے کے بعد اورخان نے دوستوں کو اس ناول کی تکمیل کی اضطراب بھری کہانی کئی بار تفصیلاً سنائی۔

یہ ناول ایک ایسے شخص کی کہانی بیان کرتا تھا جس کی بیوی بے پتا ہوجاتی ہے اور وہ اُس کی تلاش میں نکلتا ہے۔

1990ء میں شائع ہونے کے بعد اس نے کامیابی کے ریکارڈ توڑ دیے۔ زرخیز اور پیچیدہ اسلوب نے اسے نوجوانوں میں سب سے زیادہ پڑھے جانے والے ناول کا درجہ دلا گیا۔ فوراً ہی اس کے ترجمہ پر کام شروع ہوگیا اور وہ استنبول کی ادبی محافل کی جان بن گیا۔

"اب استنبول مجھے اور بھی پیارا لگنے لگا ہے!" ایک روز اس نے خود سے کہا۔

☆☆☆

"تم باپ بننے والے ہو!" جب ایلن نے اس کے کان میں سرگوشی کی، وہ مسرت کے ایک ایسے تجربے سے بھر گیا جسے لفظوں کا فسوں گر خود بھی الفاظ کی صورت بیان کرنے سے قاصر تھا۔

وہ اپنے کیریر کے عروج پر تھا اور اب قدرت اسے ایک اور نعمت سے نوازنے والی تھی۔ گو کہ وہ مغربی فکر کا حامل ایک روایتی مسلمان تھا لیکن اس دن اورخان نے اپنے رب کا دل کی گہرائیوں سے شکریہ ادا کیا۔

1991ء میں اُس کے گھر ایک ننھی پری آگئی جس کا نام "سیاہ کتاب" کی ہیروئن کے نام پر "رویا" رکھا گیا جس کے معنی خواب کے ہیں اور واقعی اورخان کے لیے تو یہ سب ایک خواب ہی تھا۔

☆☆☆

"فلم کا اسکرین پلے لکھنے کے بارے میں کیا خیال ہے دوست؟" جب اس سے یہ سوال ہوا، وہ حیران رہ گیا۔ اس نے کبھی فلم لکھنے کے بارے میں نہیں سوچا تھا۔ غور و فکر کے بعد اس نے فیصلہ کیا کہ یہ تجربہ بھی کرنا چاہیے۔

1992ء کا سال فلم کے اسکرپٹ پر کام کرتے گزرا جو "خفیہ چہرے" کے عنوان سے پردے پر پیش ہوئی اور بہت پسند کی گئی لیکن فلم کی کامیابی کے باوجود اورخان کو شدت سے یہ احساس ستانے لگا کہ فلم اُس کا میدان نہیں۔ اُس وقت تک ناول "سیاہ کتاب" کا انگریزی ترجمہ خاصی داد بٹور چکا تھا۔

1995ء میں اس کا اگلا ناول "نئی زندگی" (New Life) مارکیٹ میں آیا اور ادبی سمندر میں تلاطم آگیا۔ اس ناول نے ترکی کی تاریخ میں سب سے تیزی سے فروخت ہونے والی کتاب کا درجہ حاصل کرلیا۔ دوسری جانب مغرب نے بھی اس پر کام شروع کردیا۔

اب اورخان ترکی میں ایک معروف اور بارسوخ سماجی شخصیت کا درجہ حاصل کرچکا تھا۔ ایک دن اس نے سوچا:

"ادب کی خدمت کافی نہیں، مجھے فلاحی سرگرمیوں میں بھی حصہ لینا ہوگا!"

اس خیال کے ساتھ جب اُس نے غور وفکر شروع کیا تو احساس ہوا کہ اس کے ملک میں جمہوریت کا اُس طرز پر بھی اطلاق نہیں ہوسکا جس کا دعویٰ کیا جاتا ہے۔ آج بھی کردوں کو دوسرے درجے کا شہری سمجھا جاتا ہے، حق تلفی کی جاتی ہے۔

''مجھے کردوں کے حق میں آواز اُٹھانی ہوگی!'' اُس نے اپنی بیوی کے سامنے اعلان کردیا۔

جب یہ اطلاع خلیل کو ملی، وہ دوڑا دوڑا اُس کے گھر آیا''کیا پاگل ہوگئے ہو؟ ویسے ہی تم متنازعہ ہو، ایسے میں بہتر ہے کہ لکھنے لکھانے کا کام کرو۔ اس چکر میں مت پڑو!''

''میں حتمی فیصلہ کر چکا ہوں!'' اس نے ٹھوس لہجے میں کہا۔

''میرے بھائی، تمھیں نتائج کے لیے تیار رہنا چاہیے!'' خلیل نے کہا۔

''میں تیار ہوں!'' اس نے کہا۔ اس وقت اورخان کو قطعی اندازہ نہیں تھا کہ کردوں کی حمایت کا فیصلہ آنے والے وقت میں اس کے لیے عذاب بن جائے گا۔

جلد اورخان اُس ادبی گروہ کا حصہ بن گیا جو کردوں کے حقوق کے لیے آواز بلند کرنے کے باعث متنازعہ تصور کیا جاتا تھا۔ اورخان تو ویسے ہی تنازعات کا شکار تھا، اب لعن طعن کرنے والوں میں مزید اضافہ ہوگیا، دھمکیاں بھی ملنے لگیں لیکن اس نے حکومتی دباؤ کے سامنے جھکنے سے انکار کردیا۔

جب تنقید بڑھنے لگی تو خلیل نے ایک بار پھر متنبہ کیا''سنبھل کر، کہیں تمہارے لیے استنبول میں رہنا مشکل نہ ہوجائے!''

''مجھے اس شہر سے عشق ہے، چاہے کچھ بھی ہوجائے میں یہیں رہوگا۔'' اس کا لہجہ ٹھوس تھا۔

☆☆☆

ان دنوں وہ اپنے ناول ''میرا نام سرخ ہے'' My Name Is Red پر کام کررہا تھا۔ اسراریت سے بھرپور اس ناول میں تاریخ کو اَچھوتے اسلوب اور منفرد تکنیک سے بیان کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔ ساتھ ہی سولہویں صدی کے اواخر میں مشرق اور مغرب کے درمیان بڑھتے تناؤ کی بھرپور منظرکشی کی گئی تھی۔

اشاعت کے بعد ناول کو ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ مغربی ماہرین نے پیشگوئی کردی کہ ناول کا ترجمہ ہوتے ہی ادبی دنیا میں جھلکہ مچ جائے گا۔ یوں تو ماضی میں بھی اورخان کو قابل مترجم میسر آئے لیکن اس ناول کو انگریزی کے قالب میں ڈھالنے کی ذمے داری امریکا کی ڈیوک یونیورسٹی میں مطالعۂ ترکی کا مضمون پڑھانے والے Erdag Göknar نے اُٹھائی۔

جس روز یہ خبر اخبارات کی زینت بنی استنبول کے ایک کافی ہاؤس میں بیٹھے اورخان کے مخالف ادیب نے چائے کا کپ اُٹھاتے ہوئے کہا'' دیکھا، اس بدمعاش کو پھر ایک بڑا مترجم مل گیا۔''

''ہاں۔'' زودرنج نقاد نے سگریٹ سلگایا۔''مغرب متعصب ہے۔ اچھے اچھوں کو چھوڑ کر اس شخص کو پروموٹ کیا جارہا ہے جو کردوں کے ایشو سے فائدہ اُٹھانے کی کوشش کررہا ہے۔''

اِس طرح کے مکالمے کئی جگہ سُننے میں آئے لیکن اورخان کو ان کی پروا نہیں تھی۔ بالآخر 2001ء میں ناول کا انگریزی ترجمہ دنیا بھر میں شائع ہوگیا۔ مغربی ماہرین کی پیشگوئی درست ثابت ہوئی، واقعی جھلکہ مچ گیا۔ فرانسیسی ترجمے پر بھی فوراً ہی کام شروع کردیا تھا۔ دیگر زبانوں کے مترجم بھی اس کی جانب دوڑے۔

اگلے برس اس ناول کے انگریزی اور فرانسیسی تراجم کو اعلیٰ ترین بین الاقوامی اعزازات سے نوازنے کا اعلان کردیا گیا۔ ایک ایوارڈ کے ساتھ 127,000 ڈالر جیسی خطیر رقم بھی ملی۔

ایک بار پھر استنبول کے کافی ہاؤسز میں اورخان پر لعن طعن کی گئی۔ مغرب کو متعصب قرار دیا گیا۔

''یہ ناول بھی سرقہ ہے۔ اور کچھ نہیں!'' اُس کے ایک ہم عصر ادیب نے کہا۔

''میاں، وہ ہمارا تمہارا کام چوری کرکے اپنے ناولوں میں پیش کررہا ہے اور مغرب میں انھیں شاہکار قرار دیا جارہا ہے، تف ہے!'' نقاد نے گلاس بھرتے ہوئے منہ بنایا۔

''اس پر تو ڈالروں کی بارش ہورہی ہے۔'' میز پر بیٹھے ایک پبلشر نے سگریٹ بجھاتے ہوئے کہا۔ یہ شخص اُن پبلشروں میں سے ایک تھا جنہوں نے اس کا پہلا ناول چھاپنے سے انکار کردیا تھا۔

تنقید بےکار ثابت ہوئی۔ اس ناول کو 24 زبانوں کے قالب میں ڈھالا گیا۔

اب اورخان ایک بین الاقوامی ادیب بن گیا تھا، تاہم اس کی زندگی میں کوئی خاص تبدیلی نہیں آئی۔ وہ اب بھی دن میں کئی گھنٹے میز پر ورق بچھائے، ہاتھ میں قلم تھامے، گہری سوچ میں مستغرق بیٹھا رہتا۔

ایک انٹرویو میں اس کی بین الاقوامی شہرت اور ناولوں سے حاصل ہونے والی آمدنی کی بابت سوال کیا گیا تو اس نے جواب دیا:

''میری زندگی میں کوئی خاص تبدیلی نہیں آئی ہے۔ میں اب بھی روزانہ کام کرتا ہوں۔ میں گزشتہ 30 برس سے ادب تخلیق کررہا ہوں۔ ابتدائی 10 برس مجھے پیسوں کی اشد ضرورت تھی لیکن اس وقت کسی نے نہیں پوچھا کہ میاں تم کھاتے کماتے کیا ہو۔ اگلے دس برس میرے ہاتھ کچھ پیسے ضرور آئے، لیکن اس بار بھی کسی نے اُن کے استعمال کے بارے میں سوال نہیں کیا۔ اب گزشتہ 10 برس میں جو رقم میں نے خرچ کی ہے، لوگ کیوں توقع کررہے ہیں کہ میں اس کی تفصیلات بتاؤں گا!''

یوں تو ''میرا نام سرخ ہے'' کو شاندار الفاظ میں خراجِ تحسین پیش کیا گیا لیکن جس رائے نے اورخان کو مسرت سے بھردیا، وہ اُس کی ماں کی رائے تھی۔

ایک روز جب وہ اپنی لائبریری میں بیٹھا تھا، اس کی ماں خاموشی سے اس کے پیچھے آن کھڑی ہوئی۔ جب ممتا کی مہک اس کے نتھنوں تک پہنچی، وہ مڑا۔ اس نے کھڑے ہونے کا ارادہ باندھا لیکن ماں نے کاندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے اسے بیٹھے رہنے کا اشارہ کیا۔ وہ بھی ساتھ والی کرسی پر بیٹھ گئی۔

چند ساعت خاموشی چھائی رہی پھر اس شفیق عورت نے ایک غیر متوقع سوال کیا''تم نے ناول کیسے لکھ ڈالا؟''

''کیا مطلب؟'' وہ بڑبڑا گیا۔

''میں اسے پڑھ کر متحیر رہ گئی۔'' اس کی ماں نے گہرا سانس لیا۔ اورخان خاموشی سے سنتا رہا۔

''میں نے تمہارے تمام ناول پڑھے ہیں لیکن کوئی مجھے حیران نہیں کرسکا کیونکہ میں تمھیں جانتی ہوں۔ تمام ناولوں میں مجھے وہی کچھ پڑھنے کو ملا جس کی میں توقع کررہی تھی لیکن یہ ناول... اس میں کچھ ایسا تھا جو میں نے آج تک تم میں نہیں دیکھا۔''

وہ خاموش ہوگئی۔ چند ساعتیں الفاظ کا چناؤ کرنے میں صرف کیں پھر لائبریری میں اُس کی آواز گونجی:

''مجھے ناول کا مصنف اورخان، اُس اورخان سے زیادہ باصلاحیت اور قابل نظر آیا جو میرا بیٹا ہے جسے میں جانتی ہوں۔''

اورخان کی آنکھوں میں آنسو آگئے، وہ کبھی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اُس کی ماں اتنے شاندار الفاظ میں اس کے کام کو خراجِ تحسین پیش کرے گی۔

''شکریہ!'' اس نے ہچکیوں کے درمیان کہا۔

''تمہارا شکریہ۔ مجھے تم پر فخر ہے بیٹا!'' اس نے آگے بڑھ کر اورخان کا ماتھا چوم لیا۔

☆☆☆

2002ء میں اُس کا اگلا ناول ''برف باری'' (Snow) شائع ہوا جس میں اُس نے مشرق، خصوصاً ترکی میں مذہبی گروہوں کے بڑھتے اثر اور مغرب کے بارے میں پائے جانے والے سخت نظریات کو موضوع بنایا۔ چونکہ اس میں اورخان نے اپنے کلچر، اپنے معاشرے کی خامیوں کو اُجاگر کیا تھا، اس لیے وہ توقع کررہا تھا کہ اس پر کڑی تنقید کی جائے گی۔

وہ دُرست تھا لیکن سو فیصد نہیں!

تنقید تو بہت ہوئی۔ گالیاں دینے والوں کی تعداد میں بھی ناول کی اشاعت کے ساتھ یک مشت اضافہ ہوگیا۔

''ایسے ناولوں کو نوجوانوں سے دُور رکھا جانا چاہیے!'' ایک رجعت پسند اخبار نے سرخی لگائی۔

''اب کیا اس بیہودہ ناول کا بھی انگریزی میں ترجمہ کیا جائے گا؟'' ایک نقاد نے سوال اُٹھایا۔

لیکن تنقید کرنے والوں کی کوشش لاحاصل رہی۔ قارئین خاص طور پر نوجوانوں نے اسے بہت پسند کیا۔

''شاید میں قارئین کے ذہن پڑھنے میں ناکام رہا۔'' ایک روز اس نے اپنے پبلشر سے کہا۔''میں سمجھتا تھا کہ اس ناول کو رَد کردیا جائے گا لیکن اس نے تو فروخت کے ریکارڈ توڑ دیے ہیں۔''

''اورخان، تم وہی لکھتے ہو جو تم خود پڑھنا چاہتے ہو۔ خوش قسمتی سے تمہارے اور قارئین کے ذہنوں میں ہم آہنگی پائی جاتی ہے جو تم لکھتے ہو، وہ ویسا ہی ادب پڑھنا چاہتے ہیں!'' پبلشر نے مسکراتے ہوئے کہا۔

2004ء میں ''برف باری'' کا انگریزی ترجمہ شائع ہوگیا۔ مغربی ناقدین نے اُسے سال کی دس بہترین کتابوں میں سے ایک قرار دیا۔ ترکی کے ناقدین نے اِس رائے پر ناک بھوں چڑھائیں۔

☆☆☆

بظاہر وہ ایک خوش وخرم ازدواجی زندگی گزار رہا تھا لیکن حقیقتاً ایسا نہیں تھا۔

شہرت کے اس سفر میں، سماجی سرگرمیوں کے دوران، قلم دوات سے دوستی کے باعث وہ گزشتہ چند برسوں سے گھر کو، اپنی بیوی کو بُری طرح نظر انداز کرنے لگا تھا۔

اس کا ایک سبب وہ خوفناک خواب اور پُراسرار سرگوشیاں بھی تھیں جو اسے حقیقت سے دور تخیل کی دنیا میں لے جاتیں

اور وہ دنیا و مافیہا سے بیگانہ ہو جاتا۔ دوسرا سبب لڑکیاں تھیں۔ مقبولیت کے باعث اب وہ لڑکیوں میں گھرا رہتا۔ اسے محبت نامے موصول ہوتے، ٹیلی فون آتے، کبھی کبھار کوئی دیوانی گھر کا دروازہ بھی کھٹکھٹا دیتی۔

ابتدا میں تو ایلین اسے شہرت کے بداثرات سمجھتی رہی اور خود کو اپنی تحقیقی و تدریسی سرگرمیوں میں معروف رکھا۔ لیکن جلد ہی اسے احساس ہو گیا کہ اورخان اس میں دلچسپی کھو رہا ہے۔

"کیا اب میں پہلے جیسی خوبصورت نہیں رہی!" ایک دن اس نے آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر خود سے سوال کیا۔

خاموش آئینہ جواب میں فقط ان جھریوں کا عکس دکھاتا رہا جو دھیرے دھیرے اس کے چہرے کا حصہ بنتی جارہی تھیں۔ آئینہ یہ پیغام بھی دے رہا تھا کہ وہ فربہی کی جانب مائل ہے۔

نئے نئے تجربات سے گزرنے والا اورخان آہستہ آہستہ بندھنوں سے آزاد ہوتا جارہا تھا تاہم وہ خود اس عمل سے لاعلم تھا۔

آخر ایک رات بہت سوچ بچار کے بعد ایلین نے اورخان سے علیحدگی کا مطالبہ کر دیا۔

وہ حیران رہ گیا۔ "کیا کہا تم نے؟"

"وہی جو تم نے سنا!" اس نے دھیرے سے کہا۔ "میں غور کر چکی ہوں، تم بھی غور کر لو۔ گڈ نائٹ!" یہ کہہ کر اس نے لائٹ بند کر دی اور اورخان کو تاریکی میں تنہا چھوڑ دیا۔

صبح جب وہ بیدار ہوا ایلین یونیورسٹی جا چکی تھی۔ اس نے تنہائی میں معاملات پر غور کیا اور جلد اسے احساس ہو گیا کہ وہ اب اپنی بیوی کو نظرانداز کرنے لگا ہے۔ پھر مزید غور کرنے پر اس نے جانا کہ وہ واقعی ایلین سے مزید محبت نہیں کرتا مگر وہ اسے طلاق نہیں دینا چاہتا تھا۔

شام میں ایلین نے پھر یہ مسئلہ اُٹھایا۔

اس بار اورخان غصے میں آگیا۔ "کیوں؟ تم مجھ سے کیوں الگ ہونا چاہتی ہو؟"

"تم جانتے ہو اس کی وجہ کیا ہے!" اس نے کہا اور تیزی سے اپنے کمرے میں چلی گئی۔

وہ ساری رات جاگتا رہا۔ اپنی ازدواجی زندگی کے ہر پہلو پر غور کرتا رہا۔ صبح خلیل کی طرف نکل گیا جو اتنی سویرے اُسے گھر کے دروازے پر دیکھ کر حیران رہ گیا۔ دونوں دوست قریبی پارک میں جا بیٹھے جہاں اُن کے درمیان طویل گفتگو ہوئی۔ جب سورج آسمان پر چمکنے لگا، تب ان کا مکالمہ اختتام کو پہنچا۔

خلیل کی باتوں نے اسے احساس دلایا کہ موجودہ حالات میں وہ ایلین کے ساتھ مزید نہیں رہ سکتا کیونکہ وہ علیحدگی کا حتمی فیصلہ کر چکی ہے۔

"اگر ایسا ہے، تو ایسا ہی سہی!" اورخان نے گہرا سانس لیا۔

2002ء میں وہ دونوں علیحدہ ہو گئے لیکن اس وعدے کے ساتھ وہ ہمیشہ دوست رہیں گے اور دونوں ہی نے یہ وعدہ نبھایا!

☆☆☆

"تم غدار ہو... باز آجاؤ ورنہ تمھیں جہنم رسید کرنے میں زیادہ وقت نہیں لگے گا۔"

اس نے بے نام تجسس کے ساتھ اس خط کو کئی بار پڑھا جو اسے چند منٹ قبل موصول ہوا تھا۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب اسے لگاتار دھمکیاں مل رہی تھیں جن کے پیش نظر دوستوں نے اسے حکومت سے سیکورٹی مانگنے کا مشورہ دیا لیکن وہ اسے خاطر میں نہیں لایا۔

2003ء میں اس کی یادداشتوں پر مبنی کتاب "استنبول" شائع ہوئی، جس میں اس نے اپنے محبوب، پیارے شہر کو موضوع بنایا۔ ساتھ ہی اپنی زندگی کے ابتدائی ایام کی تفصیلات فراہم کیں۔

جن دنوں آپ بیتی کی طرز پر تحریر کردہ اُس کی کتاب ادبی حلقوں میں موضوع بحث بنی ہوئی تھی، ایک دوست نے اُس سے کہا:

"کمال کر دیا برادر! کتاب کے دونوں حصے ہی شان دار ہیں۔ یہ فیصلہ صادر کرنا واقعی مشکل ہے کہ پہلا حصہ جو استنبول کے بارے میں ہے، زیادہ بہتر ہے یا وہ حصہ جس میں تم نے اپنی زندگی کے ابتدائی 22 برس کا احاطہ کیا ہے۔"

اورخان مسکرایا "شکریہ دوست لیکن میں تمھیں سچ بتاؤں۔ میری یادداشتوں کا فقط ایک ٹکڑا کتاب کا حصہ بن سکا ہے، اگر میں تفصیلات لکھتا تو کتاب کئی جلدوں میں پھیل جاتی!"

چند روز بعد ایک تقریب میں صحافت کی تعلیم حاصل کرنے والے نوجوانوں نے اس سے سوال کیا "کیا آپ بیتی لکھنا ناسٹلجیا کا اظہار نہیں!"

"نہیں!" اورخان نے نفی میں سر ہلا "میرے نزدیک سوانح عمری لکھنا ماضی کو محفوظ کرنے کا عمل نہیں بلکہ اس سے جان چھڑانے کی کوشش ہے!"

"کیا آپ نے ماضی سے جان چھڑالی؟" ایک من چلے نے سوال کیا۔

"کہہ سکتے ہیں۔" وہ مسکرایا۔

"کہہ سکتے ہیں!" من چلے نے دُہرایا۔ "نوٹ کر لو کل، اہم ترین سرخی ہے!" اور ہال قہقہوں سے گونج اُٹھا۔

☆☆☆

کبھی کبھار ایسا ہوتا ہے کہ وہ لکھتے لکھتے ایک ایسے موڑ پر جا پہنچتا جہاں آگے تاریکی ہوتی۔ وہ روز مرتا، لیکن الفاظ منجمد ہو جاتے اور کہانی آگے بڑھنے سے انکار کر دیتی۔ ایسے ہی ایک دن جب وہ لکھنے سے اوب گیا، اُس نے لمبی چھٹیوں پر جانے کا اعلان کر دیا۔ اورخان کا ارادہ یورپ گھومنے کا تھا۔

"اچھے دنوں کے تعاقب میں جارہے ہو اورخان!" اس کے پبلشر نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"اچھے دن..." اُس نے گہرا سانس لیا۔ "ہر وہ دن جب میں توجہ کے ساتھ اپنے کسی ناول کا ایک ورق مکمل کر لوں، میرے لیے اچھا دن ہوتا ہے۔"

"میں جانتا ہوں، تمہارے لیے لکھنا ہی سب کچھ ہے!" ناشر نے جواب دیا۔

"بے شک میرے لیے لکھنا ہی سب کچھ ہے۔ ورق سامنے رکھ کر ماضی کو کھنگالنا میرے لیے بہت پُرتجسس ہوتا ہے، پر کبھی کبھار قلم، ورق اور میز مجھ سے کہتے ہیں، چھٹی لے لو، آوارا گھومو پھرو۔ پھر ملتے ہیں۔"

کچھ روز بعد وہ سوٹ کیس اُٹھائے ائرپورٹ پر کھڑا تھا۔ یورپ میں اُس کی خوب آؤ بھگت ہوئی۔ بڑے بڑے روزناموں اور ادبی جریدوں میں اُس کے انٹرویوز ہوئے۔

اٹلی میں قیام کے دوران وہاں کے ایک معروف روزنامہ سے وابستہ جھیل سی آنکھوں، سنہری زلفوں والی خوبرو صحافی نے اُس سے انٹرویو کے لیے رابطہ کیا۔ جب وہ مقررہ وقت پر ہوٹل پہنچی اورخان اُس کے حسن سے ششدر رہ گیا۔ گفتگو کے دوران وہ بار بار اپنے بالوں میں ہاتھ پھیرتا رہا۔

جب انٹرویو اختتام کو پہنچنے کو تھا، حسینہ نے سوال کیا "آپ کے چہرے پر ہمیشہ مسکراہٹ نظر آتی ہے۔ اس خوشی کا راز کیا ہے؟"

"اوہ، میں نے کبھی غور نہیں کیا۔" وہ تھوڑا جھجک گیا۔ چند ساعت خاموش رہا۔ اِس دوران جھیل سی آنکھیں اس پر ٹکی رہیں۔ پھر اس کے لب وا ہوئے "دراصل مجھے لکھنے سے عشق ہے۔ میں ان چند خوش نصیبوں میں سے ہوں جنھوں نے اپنے جنون کو پیشہ بنا لیا ہے۔ شاید یہی میری مسرت کا بنیادی سبب ہے۔"

"کیا کامیابیوں کا، شہرت کا یہ سفر آسان رہا؟" دوشیزہ نے سوال کیا۔

"قطعی نہیں! یہ انتہائی سخت تھا، بہت تلخ! اور آج بھی مشکلات سے پُر ہے۔"

"مجھے ایسا لگتا ہے کہ آپ کو چیلنج پسند ہیں!" سنہری بالوں والی لڑکی مسکرائی۔

"شاید!" وہ بھی مسکرا دیا۔

☆☆☆

"تم مذہب اور ملک کے غدار ہو، میں تمھیں قتل کر دوں!"

جتنی دیر میں وہ یہ سمجھ پاتا کہ یہ جملے کس کی زبان سے ادا ہوئے ہیں، نوکیلے پتھر سے ہونے والا وار اُس کا کاندھا زخمی کر چکا تھا۔

وہ لڑکھڑا گیا لیکن جلد ہی اسے مضبوط ہاتھوں نے سنبھال لیا۔ ابھی اسے یورپ سے لوٹے چند ہی دن ہوئے تھے اور آج وہ استنبول کے مرکزی ثقافتی مرکز میں منعقد ایک تقریب میں شرکت کے لیے آیا تھا جس کے اختتام پر اُسے مداحوں نے گھیر لیا۔ وہ مسکراہٹ چہرے پر سجائے اُن کے سوالوں کے جواب دے رہا تھا کہ ایک جنونی شخص نے اس پر حملہ کر دیا۔

خوش قسمتی سے اسے زیادہ چوٹ نہیں آئی، حملہ آور کو بھی قابو میں کر لیا گیا۔

گوکہ وہ معمولی زخمی ہوا تھا لیکن ذرائع ابلاغ نے اس خبر کو بہت ہی سنسنی خیز انداز میں پیش کیا جس کی وجہ سے بین الاقوامی میڈیا کی توجہ بھی اِس واقعے کی جانب مبذول ہو گئی۔

دوسرے روز پھر اُس کے مخالفین بار میں بیٹھے اسے بُرا بھلا کہہ رہے تھے۔

"بڑے نازک مزاج ہیں اورخان صاحب، معمولی زخمی کیا ہوئے کہ ان کے مداح فکرمند ہو گئے۔" ایک شاعر نے قہقہہ لگایا۔

"ارے جناب، یہاں تو کئی ادیب اور صحافی قتل ہو چکے ہیں اور یہ فقط زخمی ہوئے لیکن بین الاقوامی میڈیا خوب شور مچا رہا ہے۔" ایک صحافی نے کہا۔

دوسری جانب اورخان کے دوستوں نے اسے بڑی سنجیدگی سے یہ مشورہ دیا کہ وہ ملک چھوڑ دے کیونکہ کردوں کے حمایت کی وجہ سے حکومت اس سے سخت ناراض ہے۔

اورخان کا جواب واضح تھا "نہیں، کبھی نہیں! میں یہ ملک، یہ شہر کبھی نہیں چھوڑوں گا۔"

ان ہی دنوں فرید کریم اور دیگر ادیبوں کی جانب سے اس کے خلاف سرقے کا کیس دائر کر دیا گیا تھا جسے کورٹ نے

سماعت کے بعد خارج کر دیا۔

"کورٹ بھی اس کے ساتھ ہے!" مقدمہ خارج ہونے کے بعد ایک ادیب نے دانت پیستے ہوئے کہا تھا۔ وہ بے چارہ قطعی نہیں جانتا تھا کہ جلد ترکی کی عدالتیں اورخان کے خلاف بھرپور کارروائی کرنے والی ہیں۔

☆☆☆

2005ء میں اورخان کی مشکلات دوچند ہوگئیں۔ جس کی ایک وجہ اُس کی باغیانہ روش، جدید سوچ تھی اور سچ بولنے کی عادت!

اُس نے سوئزرلینڈ میں صحافیوں کے وفد کو دیے جانے والے ایک انٹرویو کے دوران یہ کہہ دیا تھا کہ پہلی جنگِ عظیم کے دوران ترکی میں تیس ہزار کردوں اور ایک لاکھ آرمینیائی باشندوں کا قتلِ عام ہوا لیکن بدقسمتی سے آج اس بارے میں بات کرنے کی اجازت نہیں!

یہ انتہائی حساس موضوع تھا۔ انٹرویو شائع ہوتے ہی ترکی میں کھلبلی مچ گئی۔ مخالف نے اسے سستی شہرت حاصل کرنے کی گھٹیا چال قرار دیا۔ سڑکوں پر احتجاج ہوا۔ اس سے معافی مانگنے کا مطالبہ کیا گیا۔ ترکی کے آئین کی ایک شق کے مطابق کسی بھی شخص کو ریاست اور پارلیمنٹ کی توہین کی اجازت نہیں۔ اسی شق کو سامنے رکھتے ہوئے ایک نیشنلسٹ وکیل کمال نے اس کے خلاف مقدمہ دائر کر دیا جسے قابلِ سماعت قرار دیتے ہوئے مقدمہ شروع کر دیا گیا۔

اورخان مخالف لابی بھی حرکت میں آگئی۔ اسے جیل میں ڈالنے کا مطالبہ زور پکڑنے لگا۔

"اورخان ملک اور مذہب کا دشمن ہے!" دیواروں پر چاکنگ ہوگئی۔

"اس بدمعاش کو گرفتار کرو!" سیکڑوں افراد یہ کہتے ہوئے سڑکوں پر نکل آئے۔ اس کے مخالفین نے ملک بھر میں ریلیوں کو منظم کیا۔ اس کی کتابیں احتجاجی مظاہروں کے درمیان نذرِ آتش کی گئیں۔ اُس کے پبلشر پر بھی حملہ ہوا۔

خیر خواہوں نے ایک بار پھر ترکی چھوڑنے کا مشورہ دیا لیکن وہ ہٹ دھرم انسان تھا، اس نے اپنا ملک چھوڑنے سے انکار کر دیا۔ "مجھے موت قبول ہے، لیکن اپنے وطن سے دوری نہیں!"

اُن ہی دنوں اورخان نے "بی بی سی" کو ایک انٹرویو دیتے ہوئے کہا "میرا مقصد صرف یہ پیغام دینا تھا کہ ہر شخص کو اظہار کی آزادی ہونی چاہیے جو ترکی کی بقا کی واحد امید ہے۔ میں کسی کی دل آزاری کا سبب نہیں بننا چاہتا تھا!"

ساتھ ہی اُس نے ایک مقامی ٹی وی چینل کو انٹرویو دیتے ہوئے یہ بھی کہا "میں نے مرنے والے کردوں اور آرمینیائی باشندوں کی بات کی تھی لیکن یہ نہیں کہا تھا کہ انہیں ترکوں نے قتل کیا۔"

ان بیانات کے بعد معاملہ ختم ہو جانا چاہیے تھا لیکن سچ بولنے کی عادت شاید اورخان کے منہ کو لگ گئی تھی۔ ان معتدل بیانات کے چند روز بعد اُس نے جرمنی میں منعقد ہونے والی ایک تقریب میں ایوارڈ وصول کرتے ہوئے اس نے ایک بار پھر ببانگ دہل کہا "میں واضح الفاظ میں بتانا چاہتا ہوں کہ پہلی جنگِ عظیم میں ایک لاکھ آرمینیائی باشندے اور تیس ہزار کردوں کا قتلِ عام ہوا!"

ملک میں پھر اس کے خلاف احتجاج شروع ہوگیا۔ دوسری جانب بین الاقوامی دنیا حیران تھی کہ مشرق کے سب سے بڑے ادیب کو کیوں تنازعات میں گھسیٹا جا رہا ہے۔ مغرب کے ایک بڑے نقاد نے اپنے مضمون میں لکھا "مجھے حیرت ہے! اسلامی تصوف کی روایت کو جدید ناول میں برتتے ہوئے مشرق اور مغرب کے درمیان پُل کا کردار ادا کرنے والے اس ادیب کے خلاف معاندانہ رویہ کیوں اختیار کیا جا رہا ہے؟"

دیگر قدرآور شخصیات نے بھی اس کا ساتھ دیا۔ حوزے ساراماگو، گارسیا مارکیز اور جان اپڈیک سمیت اِس عہد کے سات بڑے ادیبوں نے اُس کی حمایت میں ایک مشترکہ بیان جاری کیا۔ یورپی یونین، یورپین پارلیمنٹ اور ایمنسٹی انٹرنیشنل نے بھی اورخان کا ساتھ دینے کا اعلان کر دیا۔

اسی گہما گہمی کے دوران "ٹائم میگزین" نے اُن سو افراد کی فہرست شائع کر دی جنہوں نے میگزین کے نزدیک اپنی انتھک محنت اور نظریات سے دنیا بدل دی تھی۔ اورخان کا نام فہرست میں شامل تھا۔

ان ہی دنوں ایک اہم واقعہ ہوا۔ یورپی یونین نے ترکی کے عدالتی نظام پر اپنے تحفظات کا اظہار کر دیا۔ ترکی میں سرگرم سازشی افراد کو یکدم یہ احساس ہوگیا کہ بین الاقوامی دباؤ کے باعث اُس کے خلاف کارروائی کرنا اب اتنا آسان نہیں۔ اسی باعث جنوری 2006ء میں کورٹ نے اورخان کے خلاف دائر کیے جانے والے کیس کو خارج کر دیا۔

ایک بار پھر مخالفین سڑکوں پر آگئے انہوں نے کورٹ کے فیصلے کو ماننے سے انکار کر دیا۔

"یہ مغرب پرستی ہے... اورخان کے دوستوں نے اسے بچالیا..." احتجاجی سرگرمیوں کے دوران اس قسم کے نعرے بلند

ہوتے رہے۔

اس کے خلاف درخواست دائر کرنے والے وکیل کمال نے سپریم کورٹ کا دروازہ کھٹکھٹانے کا اعلان کر دیا۔

دوسری جانب 2006ء کے وسط میں اورخان کولمبیا یونیورسٹی نیویارک سے وزیٹنگ فیکلٹی کے طور پر منسلک ہوگیا۔

"امریکا کے قدیم کتب خانوں میں آرہا ہوں!" اس نے جہاز میں سوار ہوتے ہوئے دھیرے سے کہا۔

عام خیال تھا کہ وہ ترکی چھوڑ دے گا لیکن وہ جلد ہی استنبول لوٹ آیا، اپنے اس گھر میں جس سے اسے محبت تھی!

☆☆☆

ہر سال کی طرح اس برس بھی ادبی حلقوں میں یہ بحث چھڑی ہوئی تھی کہ اِس بار کسے ادب کے نوبل انعام سے نوازا جائے گا۔ بیش تر ماہرین شام سے تعلق رکھنے والے علی احمد کو مضبوط ترین امیدوار قرار دے رہے تھے۔ چند تو اس پر شرطیں بھی لگا چکے تھے لیکن 12 اکتوبر 2006ء کو سویڈش اکیڈمی نے اعلان کر دیا کہ اس برس اورخان پامک کو اس اعلیٰ ترین اعزاز سے نوازا جائے گا۔

جب اسے یہ اطلاع ملی وہ ششدر رہ گیا۔ گو کہ وہ گزشتہ ان برسوں میں متعدد اعلیٰ ترین اعزازات حاصل کر چکا تھا، لیکن اس نے کبھی نہیں سوچا تھا کہ اسے نوبل انعام سے بھی نوازا جائے گا۔

ٹیلی فون کا تانتا بندھ گیا۔ سیکڑوں گلدستے اس کے نام آئے۔ شام میں تمام دوست اس کے گھر پہنچ گئے۔ اس کی سابق بیوی بھی ان میں موجود تھی۔ مقدمے اور شدید ترین تنقید کے وار سہنے کے بعد آج پہلی بار اورخان خود کو بہت ہشاش بشاش محسوس کر رہا تھا۔

البتہ اِس اعلان نے کہ اورخان کو نوبل انعام سے نوازا جائے گا، اس کے مخالفین کو آگ بگولا کر دیا تھا۔ اب وہ واضح الفاظ میں کہنے لگے کہ یہ ایوارڈ مغرب سے وفاداری کا انعام ہے!

7 دسمبر 2006ء کو اُس نے سویڈش اکیڈمی میں "ابا کا سوٹ کیس" کے عنوان سے ایک لیکچر دیا جسے تاریخی اہمیت حاصل ہے۔ ناقدین کے مطابق ادب کا نوبل انعام حاصل کرنے والی نادر روزگار شخصیات کی جانب سے اِس موقع پر پڑھے جانے والے مضامین میں اورخان کا مضمون بہترین تھا۔ واضح رہے کہ اُس سے قبل فقط ایک مسلم ادیب نجیب محفوظ کو اس اعلیٰ ترین ایوارڈ سے نوازا گیا تھا۔

ایوارڈ وصول کرنے کے بعد اورخان نے دل میں کہا "میں اور نجیب ایک جیسے ہیں۔ دونوں ہی کو اپنوں نے معتوب ٹھہرایا اور غیروں نے سر پر بٹھایا۔"

ان جملے کی ادائیگی کے بعد یک لخت وہ ماضی میں پہنچ گیا، ایک سبزہ زار میں، گھنے درخت کے نیچے بیٹھے ایک نجومی کے روبرو... جس کی زمانہ شناس آنکھوں میں مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔

تب اچانک اورخان کو برسوں قبل کا وہ واقعہ اپنی تمام تر جزئیات کے ساتھ یاد آیا اور اس کے ہونٹوں پر بھی مسکراہٹ پھیل گئی۔ "اگر ددے زندہ ہوتے تو میں انہیں بتاتا کہ وہ نجومی سچا تھا!"

دھمکیوں، تنقید اور ستائش کے ساتھ اورخان نے اپنا سفر جاری رکھا۔

2006ء میں کولمبیا یونیورسٹی سے ہونے والے معاہدے کے تحت نے اُس نے اگلے برس بھی امریکا کا سفر کیا۔ وہ 2007ء میں منعقد ہونے والے کینس فلم فیسٹول کا جیوری ممبر رہا۔ 2008 میں اس کا نیا ناول The Museum of Innocence منظرِ عام پر آیا۔

اسی برس برطانیہ کے Prospect Magazine اور امریکا کے Foreign Policy کی جانب سے منعقد ہونے والے ایک پول میں ووٹ کرنے والوں نے اسے دنیا کا چوتھا بارسوخ اور اہم ادیب قرار دیا۔

2009ء میں اس نے ناول کے موضوع پر اپنے ہم عصروں ادیبوں کے ساتھ لیکچرز کا سلسلہ شروع کیا جسے بہت پسند کیا گیا۔

☆☆☆

محبت ایک بار پھر دل کے دروازے پر دستک دے رہی تھی۔

وہ ایک سانولی، بڑی بڑی آنکھوں، سیاہ بالوں والی ہندوستانی عورت کے عشق میں مبتلا ہوگیا تھا۔ یہ معروف ادیبہ کرن ڈیسائی کا ذکر ہے، جسے 2006ء میں اپنے ناول The Inheritance of Loss کے لیے مین بکر پرائز سے نوازا گیا تھا۔

کافی عرصے سے دونوں کو ساتھ دیکھا جا رہا تھا تاہم دونوں یکساں ادبی نظریات کے حامل تھے، اِس لیے ابتدا میں کسی نے زیادہ توجہ نہیں دی۔ ویسے بھی اورخان کے سیاسی و ادبی مخالفین لٹھ لے کر اسی کے پیچھے پڑے ہوئے تھے، مقدمہ بھی چل رہا تھا، ایسے میں کس کو خیال آتا کہ ہمیشہ مسکرانے والا اورخان محبت میں مبتلا ہوگیا لیکن جلد یہ عقدہ کھل گیا۔

جنوری 2010ء کی حسین صبح، ایک انٹرویو میں اورخان نے یہ قبول کرہی لیا کہ وہ کرن سے محبت کرتا ہے۔

جب کرن سے اِس بارے میں پوچھا گیا، اس نے باحیا مشرقی عورت کی طرح خاموش رہنے کو ترجیح دی۔

تنازعات نے اس معاملے میں بھی اس کا پیچھا نہیں چھوڑا۔ اس انٹرویو کی اشاعت کے چندروز بعد ایک 32 سالہ ترک مصورہ کیرولین نے میڈیا کے سامنے یہ دعویٰ کردیا کہ اورخان تو حقیقتاً اس کی زلف کا اسیر ہے۔

میڈیا نے اس خبر کو خوب مرچ مسالا لگا کر اُچھالا۔ دونوں کی امریکا میں شاپنگ کرتے ہوئے ایک تصویر بھی ذرائع ابلاغ کے ہاتھ لگ گئی۔ جب صحافیوں نے اس خوبرو مصورہ سے رابطہ کیا، اس نے واضح الفاظ میں کہہ دیا "جی ہاں، وہ تصویر حقیقی ہے، وہ مجھ سے محبت کرتا ہے۔"

"اور کرن ڈیسائی ؟" ایک چالاک صحافی نے سوال کیا۔

"بھئی ان کا تعلق فقط ادبی نوعیت کا ہے، اصل میں تو میں ہی اس کی محبوبہ ہوں۔"

صحافیوں کے ہاتھ ایک خبر لگ چکی تھی۔ اب وہ اورخان کا تعاقب کرنے لگے۔ اورخان نے واضح الفاظ میں اعلان کردیا کہ کیرولین سے اس کا کوئی رشتہ نہیں اور وہ جھوٹ بول رہی ہے۔

"پھر آپ اس کے خلاف کارروائی کیوں نہیں کرتے؟" ایک صحافی نے سوال کیا۔

"ضرور میں ایسا کروں گا۔" اورخان نے کہا لیکن عملاً اس نے ایسا نہیں کیا۔ قانونی نوٹس بھیجنے کے بجائے اس نے اپنے وکیل کے توسط سے اس نٹ کھٹ مصورہ کو ایک رسمی نوٹس بھیج دیا جس میں اسے اس قسم کے بیانات دینے سے باز رہنے کا مشورہ دیا گیا۔

اس نوٹس کے بعد یہ صاحبہ خاموش ہوگئیں اور پھر بڑے عرصے بعد جنوری 2012ء میں ٹی وی پر نظر آئیں۔ اس ٹی وی پروگرام میں کیرولین نے ایک بار پھر یہ دعویٰ کیا کہ گزشتہ تین برسوں میں اُس کی اورخان سے متعدد ملاقاتیں ہوچکی ہیں، اس کے پاس اورخان کی ای میل بھی محفوظ ہیں جن کا مواد یہ ثابت کرسکتا ہے کہ وہ درست ہے۔

انٹرویو نشر ہونے کے بعد خلیل نے اسے فون کیا "بھئی محترمہ پھر شروع ہوگئیں۔" اس کی آواز میں شوخی تھی۔

"بس برادر، میں انسان ہوں اور انسان خطا کا پتلا ہے۔" اورخان نے جواب دیا۔ دوسری طرف سے خلیل کا قہقہہ سنائی دیا۔

☆☆☆

مارچ 2011ء میں اورخان کو ایک خوش خبری ملی۔ اس کے مخالف وکیل کمال کی جانب سے دائر کردہ مقدمے کا فیصلہ آگیا تھا۔ چند الزامات میں اُسے بری کردیا گیا تھا، جب کہ چند میں قصوروار قرار دیتے ہوئے معمولی جرمانہ ادا کرنے کا حکم جاری کیا گیا تھا۔

اخبارات میں اس خبر کو نمایاں کرکے شائع کیا گیا، کسی نے قابلِ تحسین قرار دیا، کسی نے اس فیصلے پر تنقید کی، البتہ مغربی میڈیا نے اسے خوش آیند قرار دیا۔

اورخان کے ہم عصر ادیب، نقاد اور پبلشر جو زندگی کی گہما گہمی میں اس معاملے کو بھلا بیٹھے تھے، ایک بار پھر اپنے دل کی بھڑاس نکالنے کے لیے کافی ہاؤسز اور بار میں اکٹھے ہونے لگے۔

"بھائی نوبل انعام کے ساتھ ان صاحب کو تقریباً ڈیڑھ ملین امریکی ڈالر ملے تھے اور جرمانہ کتنا ہوا ہے؟ فقط چھے ہزار لیرا، ہونہہ!" ایک شاعر نے سگریٹ کا گہرا کش لیتے ہوئے کہا۔

"حالانکہ وہ چور ہے، سرقہ کرتا ہے۔" ایک ہم عصر ادیب بولا۔

"بس دوست قسمت!" اورخان مخالف گروپ کے ایک پبلشر نے جام بھرتے ہوئے کہا۔

"ہاں، جناب قسمت کی دیوی اس پر مہربان ہے۔" زود رنج نقاد بولا۔

ہوسکتا ہے کہ اورخان کے مخالفین درست ہوں، شاید قسمت واقعی اس پر مہربان رہی ہو لیکن اس کی اچھوتی صلاحیتوں، کہانی بیان کرنے کی بھرپور قابلیت، محنت اور جرأت سے کوئی انکار نہیں کرسکتا۔ یہی وہ عوامل تھے جنھوں نے اسے اس عہد کا نمایاں ترین ادیب بنا دیا ہے۔

اب تک اس کے ناولوں کا 60 زبانوں میں ترجمہ ہوچکا ہے، جن میں سے کئی زبانوں کے تو وہ نام بھی نہیں جانتا۔ اس کے ناولوں نے ایسے کئی ممالک میں فروخت کے نئے ریکارڈ قائم کیے۔ اندازاً اب تک اُس کی 11 ملین کتابیں دنیا بھر میں فروخت ہوچکی ہیں۔ جو اعزازات ملے ان کی تعداد شاید سیکڑوں سے تجاوز کرچکی ہے، تاہم ان عوامل نے اسے قطعی نہیں بدلا۔ وہ آج بھی بلاناغہ میز کے سامنے بیٹھ کر گھنٹوں کام کرتا ہے۔ آج بھی استنبول میں مقیم ہے، اس شہر میں جو اس کے بیشتر ناولوں کا موضوع بنا، جس کا وہ عاشق ہے، جہاں دفن ہونے کی خواہش کا وہ بارہا اظہار کرچکا ہے۔

جنونِ آزادی

سلیم فاروقی

ہرشخص آزاد زندگی بسر کرنے کا خواہاں ہوتا ہے۔ وہ بھی آزادفضا میں سانس لینے کا خواہش مندتھا کیونکہ وہ پورا ملک ایک قیدخانہ بن چکا تھا۔ اس کھلی جیل سے فرار کے لیے اس نے ایک نایاب طریقہ اپنایا۔

بیوی بچوں کے ساتھ فرار ہونے کی دلچسپ کتھا

ایک وہ دور تھا جب دنیا میں دو سپر پاورز کا وجود تھا اور طاقت کا توازن برقرار تھا۔ دنیا دو بلاکوں میں بٹی ہوئی تھی۔ سرمایہ داری اور اشتراکیت! امریکا بہادر سرمایہ دارانہ نظام کا علم بردار تھا اور سوویت یونین اشتراکیت (کمیونزم) پر یقین رکھتا تھا۔

ان دونوں بلاکوں میں سرد جنگ جاری تھی۔ امریکا اور سوویت یونین کبھی کھل کر آمنے سامنے نہیں آئے تھے، بس اپنے مہروں کے ذریعے اپنی طاقت کا مظاہرہ کرتے رہتے تھے جیسا کہ سوویت یونین نے 71ء کی جنگ میں پاکستان کے ساتھ کیا۔

دونوں ممالک کی چیرہ دستیاں اپنی جگہ لیکن دنیا میں طاقت کا توازن بہرحال برقرار تھا اور امریکا کو یوں دنیا بھر کا چودھری بننے کی آزادی نہیں تھی۔

یہ تو اس دور کا پس منظر ہے۔ میں یہاں عالمی سیاست پر گفتگو کرکے آپ کو بور نہیں کروں گا۔

اس دور میں "آہنی پردے" کے پیچھے بے شمار ناخوشگوار واقعات رونما ہوئے۔ بے شمار افراد نے کمیونزم کی دلدل سے گھبرا کر راہ فرار اختیار کرنا چاہی لیکن ان میں سے چند ہی خوش قسمت ایسے تھے جنہیں "آزادی" نصیب ہوسکی۔

انہی آزادی کے پروانوں میں چیکوسلواکیہ کا ایک نوجوان رابرٹ ہیئر ابھی تھا۔

جب 1968ء میں سوویت یونین نے چیکوسلواکیہ پر قبضہ کیا تو رابرٹ ان دنوں نوجوان تھا۔ اسے اپنے وطن پر کمیونسٹوں کا قبضہ ایک آنکھ نہیں بھایا۔ وہ پررونق بازار جہاں ہردم زندگی کی رونقیں عروج پر رہتی تھیں، جہاں جوان، بوڑھے، بچے سبھی کے چہروں پر زندگی کی چمک تھی، اب وہاں کے گلی کوچوں میں سوویت یونین کی بکتر بند گاڑیاں اور ٹینک دندناتے پھرتے تھے۔ عوام کی جائداد اور مال ودولت کو بحق سرکار ضبط کرلیا گیا تھا اور اشتراکیت کے نام پر نہ صرف انہیں بلکہ ان کی روحوں کو بھی غلام بنالیا گیا تھا۔

رابرٹ کے لیے یہ صورتِ حال سوہانِ روح تھی۔ اس نے آزاد فضا میں آنکھ کھولی تھی اور ایک آزاد ملک کے شہری کی حیثیت سے ہوش سنبھالا تھا۔ وہ زندگی میں بہت کچھ کرنا چاہتا تھا، بہت آگے جانا چاہتا تھا لیکن اشتراکیت کے اس

www.paksociety.com

www.Paksociety.com

جن نے اس کے اور اس جیسے دوسرے نوجوانوں کے پَر کتر دیے تھے۔

چیکوسلواکیہ پر سوویت یونین کے قبضے کے فوراً بعد یعنی 1968ء ہی میں وہ قومی سائیکل ٹیم کا ممبر بن گیا تھا۔ سائیکلنگ تو اس کا محبوب مشغلہ تھا۔ سوویت یونین کے قبضے سے بہت پہلے اس نے سائیکلنگ شروع کی تھی اور جس برس اس کے ملک پر قبضہ ہوا، اسی برس اسے سائیکلنگ کے ایک مقابلے میں آسٹریا کے شہر ویانا جانے کا موقع ملا۔

ویانا کی خوش حالی دیکھ کر اسے رشک بھی آیا اور اس کے دل سے ایک ہوک سی اُٹھی کہ کاش میں ملک پر قبضے سے قبل ہی ویانا آ جاتا تو اس گھٹن کا شکار نہ ہوتا۔

وہاں مختلف ملکوں کے سائیکلسٹ تھے۔ ان کے چہروں پر زندگی کی دمک اور آنکھوں میں آزادی کی چمک تھی۔ ان کی سائیکلیں بھی بہت خوبصورت اور جدید انداز کی تھیں۔ ان کے مقابلے میں رابرٹ کی سائیکل بہت بھدی اور بے ڈھنگی تھی، ہاں مضبوطی میں وہ اپنی مثال آپ تھی۔

ویانا کے پُررونق بازار اور گلی کوچے دیکھ کر اسے اپنے ملک کا شہر پراگ یاد آیا جہاں ہمہ وقت نحوست کے ڈیرے رہتے تھے، جہاں ہر شخص ایک دوسرے کی ٹوہ میں رہتا تھا، جہاں باپ، بیٹے سے اور بیٹا باپ سے اپنے دل کی بات نہیں کہہ سکتا تھا کہ مبادا ان میں سے کوئی سرکاری مخبر ہو اور سزا کے طور پر اسے کسی کڑی مشقت پر لگا دیا جائے یا حالات زیادہ سنگین ہوں تو آہنی سلاخوں کے پیچھے دھکیل دیا جائے۔

رابرٹ نے اپنی انتھک محنت اور لگن سے بہت جلد ایتھلیٹ کی حیثیت سے اپنا ایک مقام بنالیا تھا لیکن یہ سن کر اس کا دل خون کے آنسو روتا تھا کہ ''آزاد دنیا'' میں اس سے کہیں کم تر درجے کے ایتھلیٹ دولت میں کھیل رہے ہیں۔ انہیں دنیا کی ہر آسائش میسر ہے، دنیا میں کہیں بھی آنے جانے پر کوئی قدغن نہیں ہے۔ کوئی پُراسرار انداز میں ان کی نگرانی نہیں کرتا..... رابرٹ کو ہر لمحہ یہی محسوس ہوتا تھا کہ کوئی اس کی نگرانی کر رہا ہے۔

اس سال اس کی ملاقات چیکوسلواکیہ کی ایک حسینہ جینا کا چلی کووا سے ہوئی۔

اس سے مل کر رابرٹ لمحے بھر کو اپنے تمام غم، تمام محرومیاں بھول گیا۔ جینا جیوگرافک سروے آفس میں نقشہ نویس تھی۔

رابرٹ وجیہہ تھا، قومی سطح پر جانا پہچانا جاتا تھا، پھر جینا اس سے متاثر کیوں نہ ہوتی؟ رابرٹ خود بھی پہلی ہی نظر میں اس کی زلف گرہ گیر کا اسیر ہوگیا تھا۔

دونوں میں چند ملاقاتیں ہوئیں تو رابرٹ نے اپنے جذبوں کا کھل کر اظہار کردیا۔ جینا تو گویا اسی انتظار ہی میں تھی۔ اس نے بھی محبت کا جواب محبت سے دیا۔ ان دونوں کی ملاقاتیں رنگ لائیں اور دونوں جلد ہی شادی کے بندھن میں بندھ گئے۔

شاید یہی وہ دور تھا جب رابرٹ کو زندگی میں کچھ رنگینی محسوس ہوئی۔

جینا ایک اچھی اور محبت کرنے والی بیوی ثابت ہوئی۔ وہ ہر ہر قدم پر رابرٹ کے ساتھ رہتی تھی۔

جب رابرٹ کے آنگن میں اس کی بیٹی جانا کی قلقاریاں گونجیں تو زندگی کچھ اور حسین ہوگئی۔ پھر ننھے رچرڈ کی آمد نے ان کے خاندان کی گویا تکمیل کردی۔ اس کے ساتھ ہی اسے اپنی بھاری ذمے داریوں کا احساس بھی ہوا۔

معروف اور نامور کھلاڑی ہونے کے ناتے اس کا معیارِ زندگی چیکوسلواکیہ کے دوسرے لوگوں کی نسبت خاصا بہتر تھا۔ اس کی بیوی جینا کی آمدنی بھی بُری نہیں تھی۔ وہ اپنے ہم وطنوں کے مقابلے میں کہیں بہتر زندگی گزار رہے تھے۔ اس وقت کار رکھنا عام حیثیت باشندوں کے لیے ایک خواب تھا لیکن رابرٹ اور جینا نے اپنی مجموعی آمدنی سے پس انداز کرکے ایک کار بھی خرید لی تھی۔

اس کے باوجود اسے اپنا ملک ایک قید خانہ محسوس ہوتا تھا۔ خاردار تاروں سے گھرا ہوا ایک ایسا قید خانہ جہاں سے باہر نکلنے کی کوئی صورت نہ تھی۔

اسے اپنے ہم وطنوں خصوصاً نوجوانوں پر حیرت بھی ہوتی تھی اور ان کے بے حس رویے پر صدمہ بھی ہوتا تھا۔ شاید ان لوگوں نے اس ''قید خانے'' کو اپنا مقدر سمجھ کر قبول کرلیا تھا لیکن رابرٹ کے دل میں آزادی کی تڑپ ہر گزرتے دن کے ساتھ بڑھتی جارہی تھی۔

اس کی خواہش تھی کہ وہ اپنے بچّوں کو بہترین تعلیم کے ساتھ ساتھ بہترین تربیت بھی دے اور انہیں بہترین انسان بنائے لیکن سوویت یونین کے ساتھ رہتے ہوئے اس کا تصور بھی محال تھا۔ وہاں بچّوں کو وہی تعلیم دی جاتی تھی جو ریاست مناسب سمجھتی تھی۔ گویا وہاں انسان نہیں روبوٹ تیار ہوتے تھے جو ریاست کے اشاروں پر کام کرسکیں۔ ان کی اپنی سوچ صفر ہو۔

وہ اپنے بچّوں کو اس مشینی پیشہ ورانہ زندگی سے نجات دلانا چاہتا تھا لیکن کیسے؟ یہ ایک بہت بڑا سوالیہ نشان تھا۔

ایک عرصے تک دنیا اس بات سے بے خبر رہی کہ ''آہنی پردے'' کے پیچھے کیا کچھ ہوتا ہے، گزرنے والا ہر سال پہلے کے مقابلے میں رابرٹ کے لیے زیادہ اذیّت ناک بنتا جارہا تھا۔ بالکل کسی جیل کے قیدیوں کی طرح خوراک کے لیے طویل قطاریں لگتی تھیں اور ہر سال ان کی طوالت میں پہلے سے زیادہ اضافہ ہوجاتا تھا۔ یہی حال اسپتالوں کا تھا۔ وہاں بھی مریضوں کی لمبی لمبی قطاریں ہوتی تھیں۔ اچھی خوراک کے حصول، حتیٰ کہ تجہیز و تدفین کے مواقع پر بھی سہولیات حاصل کرنے کے لیے رشوت کا چلن عام تھا۔ رشوت کی یہ ادائیگی رابرٹ کے لیے بہت اذیّت ناک تھا۔ وہ کبھی کبھی یہ سوچتا تھا کہ یہ کیسی اشتراکیت ہے؟ ان لوگوں کے قول و فعل میں اتنا تضاد کیوں ہے؟ ان کا نعرہ تو یہی ہے کہ سب انسان برابر ہیں، کسی کو کسی پر فوقیت حاصل نہیں ہے لیکن عملاً ایسا نہیں تھا۔

وہاں بھی ایک مراعات یافتہ طبقہ ایسا تھا جسے دنیا کی ہر آسائش میسر تھی۔ چیکوسلواکیہ کے عام شہریوں کے لیے ایک مخصوص، کھردرے کپڑے کا لباس تھا۔ اس کے برعکس مراعات یافتہ طبقہ بہترین امپورٹیڈ لباس پہنتا تھا، بہترین خوشبویات استعمال کرتا تھا پھر اپنی گاڑیوں میں گھومتا تھا۔

حکومت کا دعویٰ تھا کہ روٹی، کپڑا اور مکان ہر انسان کا بنیادی حق ہے اور ریاست ہر انسان کو یہ سب کچھ مہیا کرے گی۔

ریاست عوام کو یہ چیزیں مہیا بھی کررہی تھی لیکن ان اشیا کا معیار انتہائی پست تھا۔

ہر شادی شدہ جوڑے کو مکان کے لیے درخواست دینا ہوتی تھی۔ نمبر آنے پر انہیں مکان الاٹ کردیا جاتا تھا۔ یہ ایک علیحدہ بات ہے کہ اس مکان کا تعمیراتی معیار کیا ہوتا تھا؟

رابرٹ نے بھی مکان کے لیے درخواست دے رکھی تھی لیکن 1972ء میں اسے یہ جان کا شدید صدمہ ہوا کہ لسٹ میں اس کا نام پہلے نمبر پر تھا جو معقول نذرانہ نہ دینے کے باعث اٹھارہویں نمبر پر چلا گیا ہے۔ ریاستی اہلکاروں نے اس کا جواز یہ گھڑا کہ رابرٹ کے اندر ابھی سیاسی جذبہ نامکمل ہے اور وہ ریاست کے نظریات سے پوری طرح ہم آہنگ نہیں ہے۔

ممکن ہے یہ وجہ بھی رہی ہو، رابرٹ کھل کر تو نہیں، لیکن ڈھکے چھپے الفاظ میں حکومت پر تنقید کردیا کرتا تھا۔

وہ ایک بڑی تعمیراتی کمپنی میں سپروائزر تھا اور اس کا واسطہ دن بھر سیکڑوں لوگوں سے پڑتا تھا۔ ممکن ہے ان میں ہی سے کسی نے مخبری کردی ہو اور رابرٹ ریاست کی نظروں میں معتوب ٹھہرا ہو۔

رابرٹ اگر قومی ہیرو اور نامور شخصیت نہ ہوتا تو ممکن ہے، اسے سپروائزر کے عہدے سے ہٹا کر مزدوری پر لگا دیا جاتا لیکن اس کی مقبولیت دیکھتے ہوئے ایسا نہیں کیا گیا۔ اس کے باوجود رابرٹ کا خیال تھا کہ محض رشوت نہ دینے کی وجہ سے اسے مکان نہیں ملا۔

اس واقعے سے رابرٹ اتنا دل برداشتہ ہوا کہ اس نے اور جینا نے اپنے دوستوں اور ملاقاتیوں سے اُدھار لے کر ایک گھر تعمیر کرلیا۔ اس سے ان کا بجٹ بُری طرح متاثر ہوا لیکن یہ مکان اس مکان سے لاکھ درجے بہتر تھا جو حکومت کی طرف سے اسے ملنے والا تھا۔

رابرٹ کو دوسرا دھچکا اس وقت لگا جب اس کے بچّوں نے اسکول جانا شروع کیا۔

ایک روز اسکول کے پرنسپل نے اسے اور جینا کو بلایا۔ بہ ظاہر اس کا مقصد رابرٹ اور جینا سے بچّوں کی تعلیم کے سلسلے میں مشورہ کرنا تھا لیکن پرنسپل نے دراصل دونوں میاں بیوی کو اس لیے بلایا تھا کہ وہ بچّوں کی مذہبی تعلیم کا سلسلہ فوری طور پر موقوف کردیں۔

رابرٹ اور جینا بنیادی طور پر مذہبی تھے۔ اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ انہوں نے جس ماحول میں ہوش سنبھالا اور تعلیم حاصل کی تھی، وہ آزاد ماحول تھا۔ انہوں نے مذہب کی تعلیم بھی حاصل کی تھی اور وہ ہر ہفتے باقاعدگی سے گرجا بھی جایا کرتے تھے۔

پرنسپل نے کہا ''مسٹر رابرٹ! آپ تو اچھی طرح جانتے ہیں کہ مذہبی تعلیم اور کمیونزم ایک ساتھ نہیں چل سکتے۔ مذہبی تعلیم سے بچے نہ صرف کنفیوز ہوجائیں گے بلکہ عملی زندگی میں بالکل ناکارہ ہوکر رہ جائیں گے۔''

اس نے مذہبی تعلیم و تربیت کا کچھ ایسا بھیانک نقشہ کھینچا گویا مذہبی تعلیم اس کے دونوں بچّوں کو گمراہی کے راستے پر ڈال دے گی۔

رابرٹ کو افسوس ہورہا تھا کہ اس نے جانا اور رچرڈ سے منع کیوں نہیں کیا کہ وہ اسکول میں کسی کو بھی اپنی مذہبی تعلیم کے بارے میں نہ بتائیں۔ رابرٹ اور جینا بچّوں کو مذہبی تعلیم گھر پر دیا کرتے تھے۔

اس وقت تو رابرٹ نے مصلحتاً پرنسپل کی بات سے اتفاق کیا لیکن دل ہی دل میں فیصلہ کرلیا کہ میں اپنے بچّوں کو ہر قیمت پر مذہبی تعلیم دلاؤں گا۔

اس نے فیصلہ تو کرلیا تھا لیکن یہ اتنا آسان نہیں تھا۔

قدم قدم پر ریاست کے مخبر پھیلے ہوئے تھے۔ کون جانے اس کے پڑوسی ہی حکومت کے مخبر ہوں۔ بہ ظاہر رابرٹ کے تعلقات ان سے بہت اچھے تھے لیکن وہاں تو ہر شخص ایک اَن جانے خوف کے سائے میں جی رہا تھا۔ ممکن ہے اس کے بچے ہی کسی سے اس کا تذکرہ کر بیٹھتے تو رابرٹ حکومت کا معتوب ٹھہرتا۔ یوں بھی اس کا ریکارڈ اچھا نہیں تھا لیکن قومی سطح پر ایک نام ور ایتھلیٹ اور سائیکلسٹ ہونے کے ناتے اسے نظر انداز کیا جاتا رہا تھا۔ لیکن آخر کب تک؟ کب تک وہ حکومت کی نظروں سے بچا رہ سکتا تھا۔

اسے ایک دفعہ اس ذہنی اذیت سے پھر گزرنا پڑا جب اس کی بیٹی شدید بخار میں مبتلا تھی۔ اسپتال کے باہر مریضوں کی ایک طویل قطار تھی۔ اس نے جینا کو آفس بھیج دیا کہ دونوں میاں بیوی ایک ساتھ چھٹی نہیں کر سکتے تھے اور خود بیٹی کو لے کر قطار میں بیٹھ گیا۔

بچی کی حالت لحہ بہ لحہ بگڑتی جا رہی تھی اور مریضوں کی قطار تھی کہ چیونٹی کی رفتار سے آگے بڑھ رہی تھی۔

او پی ڈی میں جو لیڈی ڈاکٹر مریضوں کو دیکھ رہی تھی، وہ انتہائی بے حس اور سپاٹ چہرے والی ایک کمینی عورت تھی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے اسے زبردستی یہاں لا کر بٹھا دیا گیا ہو۔ وہ مشینی انداز میں ہر مریض سے ایک سوال کرتی، ضرورت پڑتی تو نبض بھی دیکھ لیتی ورنہ وہ مریض کی طرف دیکھے بغیر نسخے لکھنے میں مصروف رہتی۔

خدا خدا کر کے سوا دو گھنٹے میں رابرٹ کا نمبر آیا۔

"کیا تکلیف ہے؟" بیزار اور سپاٹ چہرے والی لیڈی ڈاکٹر نے رابرٹ سے یوں پوچھا جیسے اس کی سات پشتوں پر احسان کر رہی ہو۔

"بچی کو بہت شدید بخار ہے ڈاکٹر! میرا خیال ہے کہ اسے نمونیا ہو گیا ہے۔"

"اپنا خیال اپنے پاس رکھو مسٹر!" ڈاکٹر نے چبھتی ہوئی آواز میں کہا "ڈاکٹر تم ہو یا میں ہوں؟"

"لیکن آپ اس کی حالت تو دیکھیں......یہ......"

"میں اس کی حالت دیکھ چکی ہوں۔" ڈاکٹر نے بچی کی طرف دیکھے بغیر ایک پرچی پر کچھ لکھتے ہوئے کہا۔

"آپ نے تو اسے ایک نظر دیکھنے کی بھی زحمت گوارا نہیں کی ہے۔" رابرٹ نے تلخ لہجے میں کہا۔

"اپنا اور میرا وقت ضائع مت کریں۔" کرخت چہرے والی ڈاکٹر نے اسے گھورتے ہوئے کہا "ابھی مجھے بہت مریض بھگتانے ہیں۔"

"آپ مریض بھگتاتی ہیں؟" رابرٹ آپے سے باہر ہو گیا "یہ انسانی جانوں کا سوال ہے۔ میں......"

"دیکھیے مسٹر، میرے پاس بحث کے لیے زیادہ وقت نہیں ہے۔ کاؤنٹر سے دوائیں لیں اور یہاں سے جائیں۔ آپ کے پیچھے والے مریض پریشان ہو رہے ہیں۔"

"میں آپ کی شکایت کروں گا۔" رابرٹ بھنا کر بولا۔ "آپ شاید مجھے پہچانتی نہیں ہیں۔"

"میں آپ کو اچھی طرح پہچانتی ہوں۔" ڈاکٹر نے تلخ لہجے میں کہا "اسی لیے اتنی دیر سے آپ کی بات سن رہی ہوں۔ آپ کی جگہ کوئی اور ہوتا تو اب تک اسے سیکورٹی کے ذریعے اُٹھا کر باہر پھنکوا چکی ہوتی۔ آپ میرے کام میں دخل اندازی کے مرتکب ہو رہے ہیں۔ اب آپ تشریف لے جائیے۔"

رابرٹ دوا کی پرچی لیے بغیر وہاں سے اُٹھ گیا۔ اس نے دل میں کہا لعنت ہے ایسے ملک پر جہاں سوائے ذلت اور توہین کے اور کچھ ہے ہی نہیں۔

اس کی بیٹی بخار میں بُری طرح پھنک رہی تھی۔ اسے بغیر نسخے کے کہیں سے بھی دوا نہیں مل سکتی تھی۔ وہ غصے میں وہاں سے اُٹھ کر آیا تھا لیکن اب سوچ رہا تھا کہ میں اپنی بچی کے لیے دوا کا بندوبست کہاں سے کروں؟

اچانک پشت سے کسی نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ اس نے مڑ کر دیکھا، وہ ستائیس اٹھائیس سال کی ایک خوبصورت سی عورت تھی۔

"مسٹر رابرٹ!" اس نے کہا "آپ تو یقیناً مجھے نہیں جانتے ہوں گے لیکن میں آپ کو جانتی ہوں۔ میرا نام پاؤلا ہے اور میں ایک میڈیسن کمپنی میں اسسٹنٹ منیجر ہوں۔ آیئے، میں آپ کو اپنے کوٹے پر دوائیں دلا دوں۔"

"لیکن مس پاؤلا! دوا کا نسخہ تو میں نے اس تنک چڑھی ڈاکٹر سے لیا ہی نہیں۔"

"اس کی آپ فکر مت کریں۔" پاؤلا نے کہا "میں بی فارمیسٹ ہوں اور دواؤں کے بارے میں ان ڈاکٹروں سے زیادہ جانتی ہوں۔ آیئے میرے ساتھ۔ پہلے میں آپ کی بیٹی کا معائنہ کرلوں۔"

"میری جیب میں ابھی اتنے پیسے نہیں ہیں مس پاؤلا!" رابرٹ نے صاف گوئی سے کہا۔ وہ جانتا تھا کہ وہ معصوم اور خوبصورت لڑکی بغیر کسی مالی فائدے کے یہ خدمات سرانجام نہیں دے گی۔

"پیسوں کی ضرورت نہیں ہے مسٹر رابرٹ! آپ تو ہمارے قومی ہیرو ہیں۔"

ہیرو جانے پہچانے جاتے ہیں۔ میں تو یوں بھی آپ کی فین ہوں۔ میں آپ سے پیسے نہیں لوں گی۔ بس اب آپ دیر مت کریں۔ بچی کا بخار بڑھتا جا رہا ہے۔"

پاؤلا اسے وہاں سے کچھ فاصلے پر ایک دوسری عمارت میں لے گئی۔ وہاں اس کا چھوٹا سا کیبن تھا۔ اس نے بچی کا معائنہ کیا۔ اس کا ٹمپریچر چیک کیا، اسٹیتھس کوپ سے اس کے سینے اور پیٹھ کا معائنہ کیا اور بولی "آپ کا خیال درست تھا۔ آپ کی بیٹی کو نمونیا کا حملہ ہوا ہے لیکن پریشان ہونے کی کوئی بات نہیں ہے۔ میں ابھی آپ کو دوائیں لا دیتی ہوں۔ تین دن کی دوا میں آرام آ جائے گا۔ اگر اس کے باوجود بچی صحت یاب نہ ہو تو آپ تین دن بعد میرے پاس آ جائیں۔" یہ کہہ کر وہ چلی گئی۔

اس لمحے پہلی دفعہ رابرٹ کے دل میں یہ خیال آیا کہ یہ ملک اب رہنے کے قابل نہیں ہے۔ وہ قید خانہ تو اسے پہلے ہی لگتا تھا لیکن لوگوں سے سلوک بھی قیدیوں کی طرح کیا جاتا تھا۔ اس میں قصور وہاں کام کرنے والے افراد کا بھی نہیں تھا۔ اس "قید خانے" میں ہر شخص بیزار تھا۔ ہر طرف خود غرضی اور نفسا نفسی کا دور دورہ تھا۔ اسے اس ڈاکٹر کا خیال آیا، صبح سے لے کر دوپہر تک اسے سیکڑوں مریض بھگتانا پڑتے تھے۔ تنخواہیں اتنی قلیل تھیں کہ ہر شخص آنے والے کل سے خوف زدہ تھا۔ ایسے میں کسی سے بھی خوش خلقی کی توقع رکھنا عبث تھا۔ وہاں پاؤلا جیسے ہمدرد لوگ بھی تھے لیکن، ان کی تعداد آٹے میں نمک کے برابر تھی۔

تھوڑی دیر بعد پاؤلا ایک پیکٹ میں دوائیں لے کر واپس آ گئی اور اسے سمجھانے لگی کہ کون سی دوا کس وقت اور کتنی مقدار میں دینا ہے۔ اس کے علاوہ وہ نزلے، زکام، بخار اور سردرد کی بہت سی گولیاں بھی لے آئی تھی۔ وہاں تو سردرد کی ایک گولی حاصل کرنا بھی محال تھا۔

پاؤلا نے دوا کی ایک خوراک تو جانا کو وہیں کھلا دی اور رابرٹ کو تاکید کی کہ ہر چھ گھنٹے بعد اپنی بیٹی کو یہ دوائیں کھلائے۔

"مس پاؤلا!" میں کس منہ سے آپ کا شکریہ ادا کروں؟" رابرٹ نے کہا۔

"میرا شکریہ ادا کرنے کا بس ایک ہی طریقہ ہے۔" وہ مسکرائی "آیندہ ہونے والی سائیکل ریس میں آپ کو ہی جیتنا ہے۔"

"میں پوری کوشش کروں گا۔" رابرٹ نے کہا حالانکہ وہ جانتا تھا کہ آیندہ ہونے والی سائیکل ریس تک وہ ریٹائر ہو جائے گا۔ اسکواش، والی بال اور ٹینس کے کھلاڑیوں کا کیریئر زیادہ دیر تک نہیں چلتا کیونکہ ان کھیلوں میں بہت زیادہ توانائی کی ضرورت ہوتی ہے۔

یہی حال سائیکلنگ کا ہے۔ رابرٹ نے تو پھر بھی اپنی محنت، لگن اور مشق سے مقررہ مدت سے کئی سال زیادہ گزار لیے تھے۔ وہ بین الاقوامی مقابلوں میں تو حصہ نہیں لے سکتا تھا البتہ قومی سطح پر وہ اب بھی ناقابلِ شکست تھا اور سائیکلنگ کر رہا تھا۔

وہ جانا کو لے کر گھر پہنچا تو اس کا موڈ بہت خراب تھا۔ ڈاکٹر کے رویّے نے اسے بہت دل برداشتہ کر دیا تھا۔ اگر پاؤلا نہ آ جاتی تو شاید اس کی بچی اب تک مر چکی ہوتی۔

اس نے بچی کو احتیاط سے میز پر لٹا دیا۔ اس کا بخار خاصا کم تھا اور وہ پُرسکون انداز میں سو رہی تھی۔ جینا ابھی تک آفس میں تھی اور اس کا بیٹا رچرڈ بھی اسکول سے نہیں لوٹا تھا۔

وہ آئینے کے سامنے کھڑا ہو گیا اور بلند آواز میں بولا "میری بات غور سے سنو رابرٹ! اب یہ ملک اس قابل نہیں ہے کہ اس میں مزید رہا جائے، میں بہت جلد یہاں سے نکل جاؤں گا۔"

"کیسے؟" اس کے کانوں میں اس کی اپنی آواز گونجی۔

"کیسے؟" وہ استہزائیہ انداز میں ہنسا "لوگ آخر جیلوں سے بھی فرار ہوتے ہیں، زیادہ سے زیادہ کیا ہوگا، میں محافظوں کے ہاتھوں مارا جاؤں نا...... مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ روز روز کے مرنے سے تو بہتر ہے کہ ایک ہی دفعہ محافظوں کی گولیوں کا نشانہ بن جاؤں۔

ایک دفعہ اگر میں اس زنداں سے نکلنے میں کامیاب ہو گیا تو پھر جینا اور دونوں بچوں کو بھی اس قید سے رہائی دلا دوں گا۔"

وہ جتنا اس بات پر غور کرتا، اتنا ہی اس کا ارادہ پختہ ہوتا جاتا۔

چیکوسلواکیہ کی سرحدوں کی چاروں طرف بہت مضبوط، خاردار تار لگے تھے۔ ان خاردار تاروں پر تھوڑے تھوڑے فاصلے پر محافظوں کے برج بنے تھے، اس کے علاوہ وہاں ہمہ وقت سنتری پہرے پر ہوتے تھے۔ یہ منحوس خاردار تار ہی کمیونزم اور آزاد دنیا کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ تھے۔

رابرٹ کا گھر چیکوسلواکیہ کے شہر براتی سلاوا میں تھا۔ یہ شہر سرحد کے بالکل ساتھ تھا۔ اس سے محض چند فرلانگ کے فاصلے پر آہنی جنگلے کی رکاوٹ تھی۔ اس میں جابجا حفاظتی برج تھے جہاں ہر دم مسلح و چاق و چوبند سنتری موجود رہتے تھے۔

اس کے بعد تقریباً دس بارہ فٹ بلند خاردار تاروں کی دو باڑیں تھیں جو چیکوسلواکیہ اور آسٹریا کی سرحد کے ساتھ کھڑی کردی گئی تھیں۔

ان تمام سرحدی انتظامات کا جائزہ رابرٹ نے دوربین سے بہت باریک بینی کے ساتھ لیا اور وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ اس جیسا بہترین ایتھلیٹ یہ رکاوٹیں دو راتوں میں پار کرسکتا ہے۔ بشرطیکہ وہ محافظوں کی گولیوں سے بچ نکلے۔

اس نے ایک دن جینا کو اعتماد میں لے کر کہا "جینا! میں اس جہنم سے تنگ آ گیا ہوں اور ایک دو برس مزید یہاں رہا تو گھٹ گھٹ کر مرجاؤں گا۔"

جینا نے حیرت سے اپنے شوہر کو دیکھا۔ بُرے سے بُرے حالات میں بھی اس نے ہمیشہ جینا کو حوصلہ دیا تھا، اب وہ خود ہی ایسی مایوسی کی باتیں کررہا تھا۔

جینا نے کہا "رابرٹ! ہمارے پاس خدا کا دیا سبھی کچھ تو ہے۔ رہنے کو مکان ہے، باعزت روزگار ہے، خوبصورت بچے ہیں۔ گھومنے پھرنے کے لیے گاڑی ہے اور اس ملک میں تمہارا ایک نام ہے۔ لوگ تمہیں پسند کرتے ہیں۔ کیا تمہیں اندازہ ہے کہ ہم اس ملک میں بسنے والے دوسرے شہریوں کی نسبت پچاس فی صد زیادہ کماتے ہیں اور......"

"لیکن اس کے باوجود یہ ایک قیدخانہ ہے جینا!" رابرٹ نے کہا۔ "کسی پرندے کو سونے کے پنجرے میں بند کرکے اسے بہترین خوراک کھلائی جائے تو کیا وہ خوش رہ سکے گا؟"

"لیکن رابرٹ! یہ تو ہمارا مقدر ہے۔ اپنے مقدر سے کون لڑسکتا ہے؟"

"میں نے اپنے مقدر سے لڑنے کا فیصلہ کرلیا ہے۔" رابرٹ نے فیصلہ کن لہجے میں کہا "تم جانتی ہو کہ میں بغیر لڑے ہار ماننے کا قائل نہیں ہوں۔ اب وہ چاہے سائیکل ریس ہو یا زندگی کی ریس۔"

"لیکن اس ریس میں ہارنے کا مطلب سمجھتے ہو تم؟" جینا نے کہا۔

"ہاں، میں اچھی طرح سمجھتا ہوں۔ جیسے کسی ہواباز کے لیے پہلی غلطی آخری ہوتی ہے، اسی طرح میرے لیے بھی یہ کوشش آخری ہوگی۔ پھر یا تو میں آزاد فضا میں سانس لوں گا یا پھر زندگی کی قید سے ہمیشہ کے لیے آزاد ہوجاؤں گا۔"

"لیکن تمہارے ذہن میں کیا ہے؟ تم یہ آہنی رکاوٹیں کیسے عبور کروگے؟ محافظوں کی عقابی نظروں اور سرچ لائٹس کی تیز روشنیوں سے کیسے بچوگے؟"

"میرے ذہن میں ابھی کوئی واضح منصوبہ نہیں ہے لیکن میں نے یہ ضرور طے کرلیا ہے کہ مجھے اس زنداں سے ہر قیمت پر نکلنا ہے۔"

"اگر میں کچھ دیر کے لیے تمہاری بات مان بھی لوں تو یہ کیسے ممکن ہے کہ ہم دو بچوں کی موجودگی میں سرحد پار کریں اور محافظوں کی آنکھوں میں دھول جھونک کر تمام رکاوٹیں پار کرجائیں؟"

"ہم نہیں، صرف میں۔" رابرٹ نے کہا "فی الحال صرف میں یہاں سے جاؤں گا، پھر بعد میں تم لوگوں......"

"تم پاگل تو نہیں ہوگئے؟" جینا نے قدرے بلند آواز میں کہا تو رابرٹ نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔

"دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں جینا!" رابرٹ نے کہا۔

"تمہارا کیا خیال ہے کہ تمہارے اس فرار کے بعد حکومت ہمیں زندہ رہنے دے گی؟ وہ مجھے اور بچوں کو دوسروں کے لیے عبرت کا نمونہ بنادے گی تاکہ پھر کوئی اس قسم کے فرار کا تصور بھی نہ کرے۔"

چند لمحے کو تو رابرٹ بھی سنّاٹے میں رہ گیا۔ اس نے اس پہلو پر تو غور ہی نہیں کیا تھا۔ اس کا فرار زیادہ دن پوشیدہ نہ رہتا۔ پھر حکومت نہ صرف اس کا مکان اور گھر کا دوسرا سامان ضبط کرتی بلکہ اس کی بیوی بچوں کے ساتھ اتنا بہیمانہ سلوک کرتی کہ لوگ سن کر ہی کانوں کو ہاتھ لگاتے۔

"دیکھو رابرٹ! اب تم اکیلے نہیں ہو کہ اپنی سائیکل پر فرار ہوکر دیا تا پہنچ جاؤ گے۔ اگر تم نے واقعی یہاں سے فرار کا عہد کرلیا ہے تو پھر ہم سب تمہارے ساتھ جائیں گے، کیوں اور کیسے...... یہ سوچنا تمہارا کام ہے؟"

"گویا تم اس منصوبے میں میری بالکل مدد نہیں کروگی؟"

"میں تو ہر طرح سے تمہارے ساتھ ہوں۔ میں نے ہر ہر قدم پر تمہاری مدد کی ہے تو اب کیسے پیچھے ہٹ سکتی ہوں۔"

"بس تو پھر طے ہوگیا۔" رابرٹ نے ہنس کر کہا "لیکن ابھی اس منصوبے کی بھنک بھی کسی کے کان میں نہیں پڑنا چاہیے ورنہ فرار سے پہلے ہی میں فائرنگ اسکواڈ کے سامنے کھڑا کردیا جائے گا۔"

اس دن کے بعد سے رابرٹ مسلسل اسی مسئلے پر غور کرتا رہا کہ اپنے خاندان سمیت یہاں سے کیسے فرار ہوا جائے؟ کبھی وہ سوچتا کہ وہ کوئی ہوائی جہاز ہائی جیک کرلے اور اسے گن پوائنٹ پر کسی بھی امریکی ریاست میں لے جائے لیکن

یہ منصوبہ خطرناک ہونے کے ساتھ ساتھ ناقابلِ عمل بھی تھا۔

کئی دفعہ اس نے سوچا کہ جینا کو بھی سائیکلنگ کی پریکٹس کرادے، پھر وہ دو سائیکلوں پر فرار ہوسکتے ہیں لیکن جینا میں اب نہ تو وہ توانائی تھی، نہ پھیپھڑوں میں اتنا دم تھا کہ وہ مسلسل دو راتوں تک سائیکل چلاسکتی، وہ بھی ایک بچے اور کچھ ضروری سامان سمیت۔ ہاں وہ خود بہت آسانی سے سائیکل پر یہ سفر کرسکتا تھا۔

وہ دن رات اسی ادھیڑبن میں رہنے لگا۔

ان ہی دنوں چیکوسلواکیہ میں ایک لرزہ خیز واقعہ پیش آیا۔ اسی طرح کی آزادی کے متوالے ایک نوجوان نے فرار کی کوشش کی لیکن وہ سرحدی محافظوں کی نظروں میں آ گیا اور ان لوگوں نے اسے بھون کر رکھ دیا۔ نہ صرف وہ اپنی جان سے گیا بلکہ اس کے پورے خاندان پر عتاب نازل ہوگیا۔ اس کی دو بہنوں کو کسی نامعلوم مقام پر منتقل کردیا گیا۔ ماں باپ کو جیل میں ڈال دیا گیا اور ان کے گھر کا تمام سامان حکومت نے ضبط کرلیا۔

رابرٹ نے یہ خبر بہت تحمل سے سنی۔ جینا نے بھی اسے معنی خیز نظروں سے دیکھا لیکن بولی کچھ نہیں۔ چیکوسلواکیہ کے سرکاری اخبارات اور ٹیلی وژن بار بار اس واقعے کی تشہیر کررہے تھے۔ گویا وہ عوام کو ایک طرح سے دھمکی دے رہے تھے کہ یہاں سے بھاگنے والوں کا کیا انجام ہوتا ہے؟

اس لرزہ خیز واقعے کے بعد بھی رابرٹ کے پائے استقامت میں لرزش نہیں آئی اور اس کا ذہن مسلسل اسی مسئلے میں اُلجھا رہا کہ یہاں سے کیسے فرار ہوا جائے؟

وہاں میڈیا پر قدغن کا یہ عالم تھا کہ چیکوسلواکیہ میں کسی بھی غیرملکی اخبار اور جریدے کا داخلہ ممنوع تھا۔ ٹیلی وژن پر بھی صرف وہی کچھ دکھایا جاتا تھا جو ریاست عوام کو دکھانا چاہتی تھی۔ البتہ ان کمیونسٹ ممالک کے اخبارات اور رسائل یہاں ضرور آتے تھے جو سوویت یونین کے زیرِتسلط تھے۔ اس دور میں میڈیا اتنا برق رفتار تھا بھی نہیں، نہ انفارمیشن ٹیکنالوجی نے اتنی ترقی کی تھی۔ لے دے کر ایک ٹیلی فون کا ذریعہ تھا لیکن اس کے ذریعے بھی غیر ممالک سے رابطہ کرنا گویا گناہ عظیم تھا۔

ایسے دہشت زدہ ماحول میں رہنے والے لوگوں کی ہمت کو داد دینے کو دل چاہتا ہے۔ کمیونزم اور کارل مارکس کا نظریہ بظاہر بنی نوع انسان کی بہتری کے لیے تھا لیکن اس کی عملی تفسیر انسانیت کے لیے اتنی ہی تباہ کن تھی۔ دنیا کا کوئی بھی نظام اگر عدل وانصاف پر قائم ہو تو اس میں بنی نوع انسان کے لیے بہتری ہی بہترین ہوتی ہے۔ کمیونزم میں سب کے لیے بھلائی اور برابری کا دعویٰ تھا لیکن عملی طور پر ایسا نظر نہیں آتا تھا۔

رابرٹ اپنے ایک ساتھی سائیکلسٹ سے ملنے گیا۔ وہ حال ہی میں غیرملکی دورے سے واپس آیا تھا اور نہ جانے کس طرح کچھ غیرملکی رسالے بھی اپنے ساتھ لے آیا تھا۔ وہ رسالے انگریزی میں تھے۔ اس کا دوست انگریزی سے نابلد تھا، وہ کام چلانے کے لیے انگریزی کے چند جملے بول لیتا تھا۔ اس کے برعکس رابرٹ کو غیرملکی زبانیں سیکھنے کا بھی شوق تھا۔ اس نے انگریزی میں بھی اچھی خاصی شُدبُد پیدا کرلی تھی۔

اس کا دوست تو محض رسالوں کی خوبصورت تصویروں اور بہترین چھپائی سے متاثر ہوکر وہ رسالے لے آیا تھا۔

جب رابرٹ نے اس سے یہ رسالے عاریتاً مانگے تو اس نے فراخ دلی سے وہ رسالے رابرٹ کو تحفتاً دے دیے اور بولا "دیکھو رابرٹ! اگر تم ان رسالوں کی وجہ سے پکڑے جاؤ تو میرا نام ہرگز مت لینا۔"

"تم فکر مت کرو۔" رابرٹ ہنس کر بولا "اگر میں پکڑا بھی گیا تو مرتے مرجاؤں گا لیکن تمہارا نام میری زبان پر نہیں آئے گا۔"

اسی ایک واقعے سے یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ سوویت یونین اور اس کے زیرِتسلط علاقوں کے لوگ کس قدر ذہنی اذیت برداشت کررہے تھے۔ ان ممالک میں تحریر وتقریر کی آزادی تو بہت دور کی بات تھی، غیرملکی لٹریچر بھی ان لوگوں کے لیے شجرِممنوعہ تھا اور لوگ یوں چھپ چھپا کر غیرملکی لٹریچر پڑھتے تھے جیسے کسی گناہ کے مرتکب ہورہے ہوں۔

رابرٹ نے ان رسالوں کو اپنے مکان کے تہ خانے میں چھپا دیا اور جینا تک کو خبر نہ ہونے دی۔ وہ رات کی تنہائی میں ان رسالوں کو پڑھنے کی کوشش کرتا تھا۔ کوشش اس لیے کہ اس کی انگریزی بھی بس واجبی سی تھی۔

ایک دن رسالے میں چھپا ہوا ایک مضمون پڑھ کر اُچھل پڑا۔ اس مضمون میں مشرقی جرمنی کے دو خاندانوں کے فرار کی داستان تھی جو گیس کے غباروں کے ذریعے مغربی جرمنی پہنچنے میں کامیاب ہوگئے تھے۔

اس نے وہ مضمون ایک دفعہ پڑھا، دوسری دفعہ پڑھا پھر رات بھر میں کئی دفعہ پڑھ ڈالا۔ انگریزی زبان سے معمولی سی واقفیت کے باعث بار بار پڑھنے سے وہ مضمون اس کی سمجھ میں آ گیا اور اس کے ساتھ ہی اس نے خوشی میں ایک

نعرہ لگایا۔ اس نے اپنے مسئلے کا حل ڈھونڈ لیا تھا۔

وہ دو مہینے تک یہ مضمون پڑھتا رہا اور شدید محنت کے بعد وہ اس مضمون کی جزئیات کو اچھی طرح سمجھ گیا۔ اس نے اس مضمون کو اتنی بار پڑھا تھا کہ وہ اسے حفظ ہو گیا تھا۔

ہر طرف سے مطمئن ہونے کے بعد اس نے اپنا منصوبہ ایک رات جینا کو بتا دیا۔

جینا نے اسے یوں دیکھا جیسے اسے رابرٹ کے ذہنی توازن پر شک ہو۔

اس نے اُلجھے ہوئے انداز میں کہا ”رابرٹ! ہم کسی غبارے میں بھلا کیسے فرار ہو سکتے ہیں؟ پھر ہم چار افراد ہیں، کیا غبارہ اتنا بڑا اور طاقت ور ہوتا ہے کہ وہ ہمارا وزن نہ صرف اُٹھا لے گا بلکہ تیز رفتاری سے ہمیں سرحد پار بھی لے جائے گا؟“

”بالکل لے جائے گا۔“ رابرٹ نے پُرجوش لہجے میں کہا اور بولا ”میں ابھی اس کا ثبوت پیش کرتا ہوں۔“ یہ کہہ کر وہ تیزی سے تہ خانے کی طرف بڑھا۔

جینا یہی سمجھی کہ دن رات کی سوچ اور مایوسی نے اس کے شوہر کے ذہن پر اثر ڈالا ہے۔

رابرٹ تھوڑی دیر بعد تہ خانے سے باہر آیا تو اس کے ہاتھ میں وہی رسالہ تھا جس میں مشرقی جرمنی کے خاندانوں کے فرار کے بارے میں مضمون شائع ہوا تھا۔

جینا انگریزی سے تو نابلد تھی لیکن اس رسالے میں ان غباروں کی رنگین تصاویر بھی تھیں جس میں وہ خاندان فرار ہوئے تھے۔

پھر رابرٹ نے جینا کو سمجھایا کہ جب وہ لوگ مشرقی جرمنی سے مغربی جرمنی تک کا سفر غبارے میں کامیابی سے طے کر سکتے ہیں تو ہم کیوں نہیں کر سکتے۔

”میں نے تو مشرقی اور مغربی جرمنی کا فاصلہ بھی نوٹ کر رکھا ہے۔ یہ فاصلہ چیکوسلواکیہ اور ویانا سے کہیں زیادہ ہے۔“

”لیکن اس قسم کے غبارے کی تیاری بھی تو ایک مرحلہ ہوگی رابرٹ!“ جینا نے کہا۔

”اس مضمون میں وہ سب کچھ ہے جس کی مدد سے ہم نہ صرف گیس کا وہ غبارہ تیار کر سکتے ہیں بلکہ اس میں کامیابی سے فرار بھی ہو سکتے ہیں۔ میں گزشتہ دو ماہ سے نہ صرف اس مضمون میں سر کھپا رہا ہوں بلکہ مختلف لائبریریوں کی خاک بھی چھانتا رہا ہوں اور اب میں بہت اعتماد سے اس قسم کا غبارہ بنا سکتا ہوں۔“

”اگر واقعی ایسا ہو جائے تو......“

”ایسا ضرور ہوگا جینا!“ رابرٹ نے ایک عزم سے کہا۔ ”ہاں، اس میں ففٹی ففٹی چانسز ہیں۔ آر یا پار! اگر ہم مخصوص بلندی پر پہنچنے سے پہلے ہی محافظوں کی نظروں میں آ گئے تو ہمارا نصیب لیکن مرتے وقت بھی کم سے کم مجھے یہ اطمینان تو ہوگا کہ میں نے اس جہنم سے فرار کی ایک کوشش تو کی تھی۔ ہاں اگر تم خوف زدہ ہو تو ابھی......“

”کیسی باتیں کرتے ہو رابرٹ!“ جینا منہ بنا کر بولی ”جب میں نے زندگی کے بہترین پل تمہارے ساتھ گزارے ہیں تو پھر موت بھی تمہارے ساتھ ہنسی خوشی قبول کروں گی۔ بس مجھے بچوں کی فکر ہے۔ ان بے چاروں نے ابھی دنیا میں دیکھا ہی کیا ہے؟“

”اس گھٹن زدہ ماحول میں روز روز مرنے سے تو بہتر ہے کہ وہ ایک ہی دفعہ مر جائیں۔“ پھر وہ چونک کر بولا ”لیکن ہم تصویر کا تاریک پہلو ہی کیوں دیکھ رہے ہیں؟ میں ایک اسپورٹس مین ہوں، میں نے اپنے تجربے سے ہی یہ سیکھا ہے اور میرے استادوں نے بھی مجھے یہی سمجھایا ہے کہ مقابلہ شروع ہونے سے پہلے ہی اگر ہم نے یہ سوچ لیا کہ ہم ہار جائیں گے تو پھر ہار ہی جاتے ہیں۔ اس کے برعکس اگر ہم یہ عزم لے کر میدان میں اُتریں کہ ہمیں ہر صورت میں اور ہر قیمت پر جیتنا ہے تو پھر جیت ہمارا مقدر ہوتی ہے۔“

”ہاں، واقعی......“ جینا نے کہا ”ہمیں اچھی امید رکھنا چاہیے۔“

”بس، اب تم ذہنی طور پر تیار ہو جاؤ اور غبارے کی تیاری کے سلسلے میں میرا ہاتھ بھی بٹاؤ۔“

یہ 1982ء کے اوائل کی بات ہے۔ جب رابرٹ نے فرار کا مصمم ارادہ کر لیا۔ وہ روزانہ کا موسمی ریکارڈ رکھنے لگا۔ ہوا کا رُخ معلوم کرنے کے لیے اس نے شہر کی ریفائنری سے نکلتے ہوئے دھوئیں کی مدد لی۔ اس نے خاص طور پر یہ نوٹ کیا کہ کن ایام میں تیز ہواؤں کے جھکڑ ویانا کی سمت چلتے ہیں۔ مہینے میں کم از کم دو بار ایسا ہوتا تھا جب تیز ہوائیں چیکوسلواکیہ کی سمت سے ویانا کی طرف جاتی تھیں۔ موسم کے حالات بھی اس کے حق میں تھے۔ ہوائیں اگر مخالف ہوتیں تو اسے فرار ہونے میں خاصی دشواری کا سامنا کرنا پڑتا۔

وہ روزانہ کے موسمی حالات کا ایک باقاعدہ چارٹ مرتب کر رہا تھا۔ اس کی کامیابی کا دارومدار اسی موسمی چارٹ پر تھا۔

یونیورسٹی کی تمام لائبریریوں سے گیسی غباروں کے بارے میں اسے جتنی بھی معلومات میسر آ سکیں، اس نے وہ

سب ازبر کر لیں۔ یہ تو اسے اسکول کے زمانے ہی سے علم تھا کہ گرم ہوا ہلکی ہو کر اوپر اُٹھتی ہے۔ اگر وہ گرم ہوا کسی غبارہ نما چیز میں بھر دی جائے تو وہ اسے بھی اوپر لے جائے گی۔ بنیادی مسئلہ تھا ہوا کے رُخ کا۔

اپنا آپریشن اسے ان دنوں میں شروع کرنا تھا جب ہوا کا رُخ ویانا کی طرف ہوتا۔ اس سلسلے میں اس کے پاس سال کے ایک ایک مہینے اور ہر مہینے کے ایک ایک دن کا ریکارڈ موجود تھا جو اس نے ازبر کر لیا تھا۔ البتہ خالص گیس کے غباروں کے بارے میں اسے تمام لائبریریوں سے صرف تین صفحات ہی مل سکے جن کا ایک ایک لفظ اس نے حفظ کر لیا۔ یوں بھی غیر ملکی رسالے میں چھپنے والے مضمون نے اس کی معلومات میں بے پناہ اضافہ کیا تھا اور اب وہ ہر طرح سے تیار تھا۔

سب سے پہلے اس نے تہ خانے میں بیٹھ کر گیس کے اس غبارے کا ڈیزائن تیار کیا۔ اس غبارے میں اتنی گنجائش تھی کہ اس میں چار افراد بہ آسانی سوار ہو سکتے تھے۔

اکتوبر کے اوائل تک اس کا پیپر ورک ہر طرح سے مکمل ہو گیا۔ رابرٹ نے غبارے کی ہر ہر جزئیات پر بہت اچھی طرح غور کیا تھا کیونکہ اگر اس کا یہ منصوبہ ناکام ہو جاتا تو پھر اس کا پورا خاندان ختم ہو جاتا۔

اس بڑے غبارے کی تیاری کے لیے اسے اٹھارہ سو مربع گز ساٹن نما کپڑے کی ضرورت تھی۔

جب سے مشرقی جرمنی کے جوڑے کے فرار کی خبر آئی تھی، پولیس نے اس کپڑے کی بڑی مقدار میں خریداری پر نظر رکھنا شروع کر دی تھی۔ رابرٹ نے اس کا حل یہ نکالا کہ اس کپڑے کو تھوڑی تھوڑی مقدار میں مختلف دکانوں سے خریدا اور اپنے کام میں جت گیا۔

اس کا تہ خانہ ہی اس کا ورک شاپ تھا۔ جب دونوں بچے سو جاتے تو رابرٹ اور جینا خاموشی سے تہ خانے میں اُتر کے اپنے کام میں مصروف ہو جاتے۔

یہ انتہائی تھکا دینے والا کام تھا۔ رابرٹ ڈیزائن کے مطابق کپڑے کی پیٹرن کاٹتا اور جینا انہیں سینے میں لگ جاتی۔ اس کام میں انہیں بہت سی راتیں کالی کرنا پڑیں۔

غبارہ بنانے کے لیے رابرٹ ساٹن نما کپڑے کے بارہ تھان لایا تھا اور ہر تھان کی لمبائی پچانوے فٹ تھی۔ عام حالات میں اگر کوئی رابرٹ اور جینا کو چار گنا معاوضے پر بھی کام کرنے کو کہتا تو وہ انکار کر دیتے لیکن رابرٹ کے دل میں آزادی کی تڑپ فزوں تر ہوتی جا رہی تھی۔ اب تو جینا بھی آزادی اور خوش آیند مستقبل کے خواب دیکھنے لگی تھی۔

غبارے میں سوار ہونے کے لیے رابرٹ نے ہلکی لیکن مضبوط اسٹیل کا ایک ایسا جنگلا بھی تیار کر لیا جس میں چار افراد بہت آسانی سے کھڑے ہو سکتے تھے۔

اس جنگلے کو غبارے سے باندھنے کے لیے تینتیس مضبوط رسیوں کی ضرورت تھی۔ رابرٹ نے مختلف دکانوں سے انتہائی مضبوط قسم کی رسیاں بھی خرید لیں اور جنگلے کے وزن کو سہارا دینے کے لیے اس نے درمیان میں کوہ پیماؤں والی ایک انتہائی مضبوط رسّی کا انتخاب کیا۔

یہ کام انہوں نے اکتوبر کے اوائل میں شروع کیا تھا اور اب دسمبر شروع ہو چکا تھا۔ کرسمس کے موقع پر اس ویران اور وحشت زدہ شہر میں زندگی کے آثار نظر آ جاتے تھے۔ لوگ دکانوں پر شاپنگ کرتے نظر آتے، بچوں کے کچھ بھدے کھلونے بھی مارکیٹ میں آ جاتے جن کے رنگ اور ڈیزائن ایک ہی ہوتے۔ ایسا لگتا تھا جیسے کھلونے بنانے والی فیکٹریاں صرف ایک ہی سانچے پر سارے کھلونے نکالتی ہیں۔

بازاروں میں اس کے باوجود کرسمس کی چہل پہل تھی لیکن جینا اور رابرٹ اپنے کام میں مصروف تھے۔ ابھی سلائی کا بہت سا کام باقی تھا۔

رات رات بھر جاگنے کی وجہ سے ان دونوں کی صحت پر بھی بُرے اثرات مرتب ہو رہے تھے، آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے پڑ گئے تھے اور دونوں میاں بیوی شکل ہی سے بیمار دکھائی دیتے تھے۔

رات بھر جاگنے کے بعد جب وہ اپنے کام پر جاتے تو اکثر اوقات اونگھنے لگتے۔

اس سلسلے میں رابرٹ اور جینا دونوں کو اپنے افسرانِ بالا سے جھڑکیاں بھی سننے کو ملی تھیں اور انہیں یہ دھمکی بھی دی گئی تھی کہ اگر یہی صورتِ حال برقرار رہی تو ان کی شکایت حکامِ بالا تک پہنچا دی جائے گی۔

رابرٹ ان کی تلخ و ترش باتوں کو محض اس لیے سہہ جاتا تھا کہ اب اس کا مشن تقریباً تکمیل کے قریب تھا۔

رات رات بھر جاگنے کے باوجود ان کے کام کی رفتار بہت سست تھی۔ وہ گویا چھ آدمیوں کا کام تھا جو وہ دونوں کر رہے تھے۔ اس کے ساتھ ہی انہیں اپنی دوسری ذمے داریاں بھی نبھانا ہوتی تھیں۔ دفتروں کو جانا، بچوں کو اسکول چھوڑنا، کھانا پکانا، کپڑے اور برتن دھونا، سبھی کچھ لازمی تھا۔

یہ دیکھ کر جینا نے کرسمس کے بعد اپنی ملازمت سے استعفیٰ دے دیا تاکہ اپنا تمام تر وقت غبارے کی تیاری میں

لگا سکے۔ انہیں ہر دم یہ خوف بھی رہتا تھا کہ اگر کسی پڑوسی کے کان میں بھنک بھی پڑ گئی تو ان کی بقیہ زندگی جیل کی آہنی سلاخوں کے پیچھے گزرے گی یا انہیں نشانِ عبرت بنانے کے لیے فائرنگ اسکواڈ کے سامنے کھڑا کر دیا جائے گا۔

جینا کے کل وقتی کام کی بدولت ایسٹر تک رابرٹ کا غبارہ آزمائشی پرواز کے لیے تیار تھا۔

اس رات دونوں میاں بیوی نے اپنے طور پر چھوٹا موٹا جشن منایا۔ بچوں کو لے کر باہر گئے۔ کھانا بھی باہر ہی کھایا اور مہینوں بعد جب وہ رات کو بستر پر لیٹے تو انہیں ایسی نیند آئی کہ انہیں اپنی سدھ بدھ نہ رہی۔

اس خوشی میں رابرٹ نے دوسرے دن چھٹی کی درخواست بھیج دی۔

بچوں کو ابھی کچھ بھی علم نہیں تھا کہ ان کے والدین کس ادھیڑبن میں مصروف ہیں۔ اس وقت اس کی بیٹی جانا کی عمر چودہ سال تھی اور رچرڈ اس سے دو سال چھوٹا تھا۔ دونوں بچے خاصے سمجھ دار تھے لیکن رابرٹ نے اس حد تک احتیاط برتی تھی کہ اپنے بچوں کو بھی اپنے منصوبے کی ہوا نہیں لگنے دی تھی۔

غبارے کی آزمائشی پرواز کا مرحلہ آیا تو بہت سوچ بچار کے بعد رابرٹ نے اپنے آبائی گاؤں لوجکا کی غیر آباد پہاڑیوں کا انتخاب کیا۔ لوجکا اس کے شہر براتسی لاوا سے تقریباً ساڑھے پانچ سو کلومیٹر کی دوری پر تھا۔

وہ اس موقعے پر بھی بچوں کو کچھ بتانا نہیں چاہتا تھا۔ اس نے سوچا تھا کہ جب غبارے کی آزمائشی پرواز کامیاب ہو جائے گی تو وہ اپنے دونوں بچوں کو بھی اس راز میں شریک کر لے گا۔ پھر فوراً ہی وہ غبارے میں سوار ہو کر اپنے نئے سفر پر نکل جائیں گے۔

رابرٹ نے غبارے کا تمام ساز و سامان اس وقت گاڑی میں رکھا جب پورے شہر پر موت کا سا سکوت طاری تھا۔ اکثر ان دونوں کو راتوں کو بھی ڈیوٹی پر جانا ہوتا تھا اس لیے بچے ان کی غیر موجودگی کے عادی تھے۔

پھر جینا اور رابرٹ انتہائی خوشی کے عالم میں لوجکا کی طرف روانہ ہو گئے۔ جوش میں رابرٹ نے گاڑی کی رفتار انتہائی تیز کر دی۔ جینا نے اسے ٹوکا "نارمل اسپیڈ سے چلو رابرٹ! اگر ٹریفک کے کسی اہلکار کو شبہ ہو گیا تو وہ ہمیں لوجکا پہنچنے سے پہلے ہی دھر لے گا۔ گاڑی کی تلاشی ہوگی اور ہمارا تیار کیا ہوا غبارہ اور دوسرا ساز و سامان برآمد ہوگا تو ہمارے پاس اس کی موجودگی کا کوئی بھی جواز نہیں ہوگا۔"

"کہتی تو تم ٹھیک ہو۔" رابرٹ نے رفتار آہستہ کرتے ہوئے کہا "لیکن ہمیں صبح سے پہلے واپس بھی آنا ہے۔"

"ہم اگر معمول کی رفتار سے بھی چلتے رہے تو صبح تک واپس آ جائیں گے۔ غبارے کی آزمائشی پرواز میں ہمیں کتنی دیر لگے گی، زیادہ سے زیادہ آدھا گھنٹا یا چالیس منٹ!"

ابھی وہ یہ گفتگو کر ہی رہے تھے کہ انہیں سڑک کے کنارے ٹریفک پولیس کی گاڑی دکھائی دی جس کی چھت پر نیلی روشنی کا بلب گردش کر رہا تھا۔ تشویش ناک بات یہ تھی کہ ٹریفک پولیس کا ایک اہلکار انہیں رُکنے کا اشارہ کر رہا تھا۔

"مارے گئے۔" رابرٹ منہ ہی منہ میں بڑبڑایا اور گاڑی سڑک کے کنارے لگا دی۔

اس نے اپنی جگہ سے اُترنے کی کوشش نہیں کی۔ ٹریفک اہلکار ٹہلتا ہوا اس کی طرف آیا اور کرخت لہجے میں بولا "لائسنس!"

رابرٹ نے خاموشی سے لائسنس نکال کر اس کے ہاتھ پر رکھ دیا۔

ٹریفک پولیس کے اہلکار نے ٹارچ کی روشنی اس کے کارڈ پر ڈالی اور بولا "مسٹر رابرٹ! آپ کی رفتار مقررہ حد سے کچھ زیادہ تھی۔"

"آفیسر! شاید میرا اسپیڈو میٹر درست کام نہیں کر رہا ہے۔" رابرٹ نے انتہائی نرم لہجے میں کہا۔

ٹریفک پولیس کے اہلکار نے مسکرا کر کہا "اگر میں غلطی پر نہیں ہوں تو آپ مشہور ایتھلیٹ اور معروف سائیکلسٹ مسٹر رابرٹ ہیں؟"

"آپ نے بالکل درست پہچانا آفیسر!" رابرٹ نے کہا "اصل میں مجھے فوری طور پر اپنے آبائی قصبے لوجکا پہنچنا ہے۔ میرے بھائی کی حالت بہت نازک ہے۔ شاید اسی وجہ سے میری گاڑی کی رفتار کچھ زیادہ تھی۔"

"احتیاط سے کام لیں مسٹر رابرٹ!" پولیس والے نے کہا "میں تو آپ کا فین ہوں، ویسے میں نے تو کچھ دیکھا ہی نہیں لیکن ہر آدمی تو آپ کے ساتھ رعایت نہیں کرے گا۔"

"تھینک یو ویری مچ آفیسر!" رابرٹ نے طویل سانس لے کر ممنونیت سے کہا "میں اب پوری احتیاط سے ڈرائیونگ کروں گا۔"

اچانک ٹریفک پولیس والے نے اپنی جیب سے ایک نوٹ بک نکالی تو رابرٹ کا خون خشک ہو گیا۔ وہ نوٹ بک رابرٹ کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا "مسٹر رابرٹ! سوری اس وقت میرے پاس آٹوگراف بک تو نہیں ہے۔ آپ اس نوٹ بک پر مجھے آٹوگراف دے دیں تاکہ میں بھی فخر سے اپنے ساتھیوں اور بچوں کو دکھا سکوں کہ قومی سطح کے ایک معروف ایتھلیٹ سے میری ملاقات ہو چکی ہے۔"

یہ سن کر رابرٹ کی جان میں جان آئی اور اس نے پولیس والے کو آٹوگراف دے دیا۔ پولیس والے نے انتہائی ادب و احترام سے اسے جانے کی اجازت دے دی۔

اس مرتبہ ڈرائیونگ کرتے ہوئے رابرٹ خاصا محتاط تھا۔ اور وہ بغیر کسی رکاوٹ کے لوجکا پہنچنے میں کامیاب ہو گئے۔

رابرٹ اس علاقے میں پیدا ہوا تھا، اس کا بچپن اور لڑکپن اسی علاقے میں گزرا تھا۔ وہ یہاں کے پہاڑی سلسلے سے بھی اچھی طرح واقف تھا۔ وہ سیدھا اس غیر آباد پہاڑی سلسلے تک پہنچ گیا۔

وہاں پہنچ کر دونوں میاں بیوی نے تھرموس نکال کر گرما گرم کافی پی اور تازہ دم ہونے کے بعد اپنے مشن میں مصروف ہو گئے۔

رابرٹ نے اپنے بنائے ہوئے دو سو اسی پونڈز کے غبارے کو پہاڑیوں میں ایک کھلی اور ویران جگہ پر جوڑا، پھر ایک بجلی کے پنکھے سے اس میں ہوا بھرنے کی کوشش کی، پنکھا چلانے کے لیے رابرٹ نے کار کی بیٹری کے علاوہ ایک فاضل بیٹری بھی اس میں جوڑ دی۔ پنکھا پوری رفتار سے گھوما لیکن غبارہ نہ پھول سکا اور رابرٹ نے ایک دفعہ، دو دفعہ پھر تیسری دفعہ غبارہ پھلانے کی کوشش کی لیکن ہوا ساٹن نما کپڑے کے مساموں اور سوئی کے سوراخوں سے خارج ہو رہی تھی اور غبارہ تھا کہ پھولنے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا۔ جینا تو اس صورتِ حال سے بُری طرح مایوس ہوئی۔

رابرٹ نے جھنجلا کر غبارے اور دیگر اجزا کو وہیں چھپایا اور براتسی لاوا لوٹ آیا۔ وہ اس مسئلے سے نمٹنے کا کوئی حل سوچ رہا تھا۔

آخر اسے ایک حل سوجھ ہی گیا۔ رابرٹ اور جینا اگلی رات پھر لوجکا جا پہنچے۔ رابرٹ اپنے ساتھ کئی گیلن آئل پینٹ بھی لے گیا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ اس پینٹ کو کپڑے پر پھیلا کر اس کے سوراخ بند کر دے گا۔

اس نے راتوں رات غبارے کے کپڑے پر پینٹ پھیر دیا لیکن اس کا نتیجہ زیادہ خراب نکلا۔ پینٹ خشک ہو کر جگہ جگہ سے چٹخ گیا اور کپڑا بھی بُری طرح سکڑ گیا اور ان کا بنایا ہوا غبارہ محض کاٹھ کباڑ کا ایک ڈھیر بن کر رہ گیا۔

یہ دیکھ کر رابرٹ پر ایسی مایوسی اور جھنجلاہٹ طاری ہوئی کہ اس نے ایک تیز دھار کلہاڑی سے اپنے ہی بنائے ہوئے غبارے کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔ پھر مزید جھنجلاہٹ میں اس ڈھیر کو آگ لگا دی۔ یوں اس نے اپنے ہاتھوں سے اپنی اور جینا کی چھ ماہ کی شدید محنت کو ٹھکانے لگا دیا۔

اس لمحے اسے یہ بھی خوف نہیں تھا کہ آگ کے شعلے دیکھ کر کوئی محافظ اِدھر آ نکلا تو رابرٹ اسے اس آگ کا کیا جواز پیش کرے گا؟

جینا تو اتنی مایوس ہوئی کہ وہ سسک سسک کر رونے لگی۔ چھ ماہ تک دن رات جاگ کر اس نے اس غبارے کی سلائی کی تھی، مشین چلا چلا کر اس کی پنڈلیاں اکڑ گئی تھیں، نیند پوری نہ ہونے کے باعث اس کا وزن کم ہو گیا تھا، چہرے پر بے رونقی چھا گئی تھی اور آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے پڑ گئے تھے۔

یہی حال رابرٹ کا بھی تھا۔ پاس نے براتسی لاوا واپس جاتے ہوئے ایک مرتبہ پھر اس عزم کا اظہار کیا کہ ہمارا یہ تجربہ ناکام ہو گیا تو کیا ہوا؟ ہم پھر کوشش کریں گے اور اس وقت تک کوشش کرتے رہیں گے جب تک ہم اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو جاتے۔

اس مرتبہ اس نے ایسے کپڑے کا انتخاب کیا جس میں سے ہوا نہیں گزر سکتی تھی، یہ کپڑا پہلے کپڑے کے مقابلے میں کئی گنا زیادہ قیمتی تھا لیکن رابرٹ پر تو آزادی کا جنون طاری تھا، وہ اپنی اور جینا کی تمام جمع پونجی اس منصوبے پر لگا بیٹھا تھا۔ وہ کپڑا برساتیاں بنانے کے کام آتا تھا۔ رابرٹ نے پہلے کی طرح وہ کپڑا بھی پچاس مختلف دکانوں سے خریدا اور دونوں میاں بیوی ایک مرتبہ پھر سرگرمِ عمل ہو گئے۔

غبارے کی تیاری کے سلسلے میں اس کی رسائی ایسے لوگوں تک بھی ہو گئی تھی جو غیر ملکی اشیا اسمگل کر کے چیکوسلواکیہ میں لاتے تھے۔

انہی دنوں اس کے ہاتھ خوش قسمتی سے ایک ویڈیو کیسٹ لگ گئی۔ اس امریکی ویڈیو کیسٹ میں گیس سے اُڑنے والے غبارے کی پرواز کے مناظر تھے۔ یہ مناظر مرحلہ وار دکھائے گئے تھے۔ اس فلم میں مکمل طور پر تیار کیے گئے ایک برنر کی تفصیل بھی تھی۔

رابرٹ نے وہ فلم اتنی بار دیکھی کہ اس کا ایک ایک منظر رابرٹ کے ذہن پر نقش ہو گیا اور کئی ماہ کی مشقت کے بعد وہ بالکل ویسا ہی ایک برنر تیار کرنے میں کامیاب بھی ہو گیا۔

چھ ماہ تک مختلف لائبریریاں چھاننے کے بعد رابرٹ یہ بھی جان چکا تھا کہ عام گیس کے سلنڈروں میں ملنے والی گیس غبارے میں ایندھن کے طور پر بھی استعمال ہوتی ہے۔

ابھی غبارے کی تیاری کا طویل اور تھکا دینے والا کام باقی تھا۔ رابرٹ نے اپنی ملازمت سے استعفیٰ دے دیا اور

کہیں سے جعلی ملازمت کا ایک کارڈ بھی حاصل کرلیا ورنہ چیکوسلواکیہ کی حکومت میں بے روزگاروں کے لیے کوئی گنجائش نہیں تھی۔ ایسے لوگوں کو حکومت گرفتار کرلیتی تھی، پھر انہیں کسی بھی کام پر لگا دیتی تھی۔

ملازمت سے فارغ ہونے کے بعد جینا اور رابرٹ دونوں انتہائی تندہی سے غبارے کی تیاری میں مصروف ہوگئے۔ اس کے ساتھ ہی اس نے اپنے پڑوسیوں میں یہ خبریں پھیلادیں کہ میں جلد ہی ملازمت کے سلسلے میں دوسرے شہر منتقل ہو رہا ہوں۔ اس کے ساتھ اس نے اپنے مکان کے لیے گاہک کی تلاش شروع کردی۔

جلد ہی اسے اپنے مکان کا ایک گاہک مل بھی گیا لیکن ابھی اس کی مشکلات کم نہیں ہوئی تھیں۔ مکان فروخت کرنے کے لیے قانون کے مطابق رابرٹ مقامی ہاؤسنگ اتھارٹی سے منظوری لینے کا پابند تھا۔

مقامی ہاؤسنگ اتھارٹی نے مختلف حیلوں، بہانوں سے اسے منظوری دینے سے انکار کردیا۔ اصل میں ہاؤسنگ اتھارٹی کو اپنے ایک ممبر کے لیے اس مکان کی ضرورت تھی۔ وہ ممبر اس مکان کی قیمت اتنی نہیں دے رہا تھا جتنی رابرٹ کو ملنا چاہیے تھی۔ آخر تنگ آکر رابرٹ نے گھاٹے کا سودا کرلیا اور مکان اسی ممبر کے ہاتھوں فروخت کردیا۔

اس نے گھر کے قیمتی سامان، ٹیلی وژن، فریج اور فرنیچر وغیرہ پہلے ہی بیچ دیا تھا اور اب وہ روانگی کے لیے بالکل تیار تھا۔

اب رابرٹ کے لیے ایک اور آزمائش پیدا ہوگئی۔ اس کا ارادہ تھا کہ وہ جولائی اور اگست کے دوران میں سرحد عبور کرجائے گا لیکن جولائی اور اگست میں تیز ہواؤں کا رُخ جنوب کی جانب تھا۔ رابرٹ کے شہر براتسی لاوا سے ویانا شمال کی طرف تھا۔ گویا ہوا بالکل اس کے مخالف سمت چل پڑی تھی۔

اس دوران میں جینا نے اسے مشورہ دیا کہ اس غبارے کی آزمائشی پرواز بھی کرلی جائے۔ ایسا نہ ہو کہ یہ بھی عین وقت پر ہمیں دھوکا دے دے۔

رابرٹ اس مرتبہ بہت پُریقین تھا۔ اس نے غبارے کی تیاری میں ہر پہلو پر نظر رکھی تھی۔ اس کے باوجود اسے جینا کا مشورہ پسند آیا اور وہ ایک مرتبہ پھر اپنے آبائی شہر لوچکا روانہ ہوگیا تھا کہ وہاں کے ویرانوں میں اپنے نئے غبارے کی آزمائشی پرواز کرسکے۔

اس غبارے میں گزشتہ غبارے کی نسبت چار گنا زیادہ لاگت آئی تھی۔ اس نے نہ صرف غبارے کا جنگلہ مضبوط اسٹیل سے بنایا تھا بلکہ اس کا کپڑا بھی انتہائی قیمتی تھا۔ پھر اس نے غبارے کو ہوا میں اُٹھانے کے لیے گیس کے چار برنر بھی تیار کیے تھے تاکہ اگر ایک برنر کام نہ کرے تو دوسرے سے کام لیا جائے۔ وہ بھی ناکارہ ہوجائے تو تیسرے برنر کو آزمایا جائے۔

پھر غبارے کی رفتار بڑھانے کے لیے بھی بہ یک وقت دو برنر معاون ثابت ہوسکتے تھے۔

وہ ایک مرتبہ پھر اس ویرانے میں موجود تھا۔

جینا کا دل آنے والے لمحات سے بُری طرح دھڑک رہا تھا اور اسے خدشہ تھا کہ کہیں ان کا یہ تجربہ بھی ناکام نہ ہوجائے۔ ناکامی کی صورت میں انہیں شدید مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا۔ جینا اور رابرٹ دونوں اپنی اپنی ملازمتیں چھوڑ چکے تھے۔ گھر کا سودا ہوچکا تھا، گھر کا تمام سامان بھی فروخت ہوچکا تھا اور اب اگر وہ ناکام ہوتے تو ان کے لیے دوبارہ اس ملک میں رہنا پہلے سے کہیں زیادہ دشوار بلکہ ہولناک ہوتا۔

رابرٹ نے اس مرتبہ بجلی کے پنکھے کی بجائے بجلی سے چلنے والے ایک بلور (Blower) کا بندوبست کرلیا تھا۔ پنکھے کے مقابلے میں وہ بلور بہت تیزی اور قوت سے ہوا خارج کرتا تھا۔ رابرٹ نے اس بلور کو کار کی بیٹری سے منسلک کیا اور اسے آن کردیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے غبارے میں ہوا بھرنے لگی اور دس منٹ سے بھی کم عرصے میں وہ آسمان کی طرف تن گیا۔

رابرٹ نے خوشی میں نعرہ لگایا "ہرا!...... میں کامیاب ہوگیا۔"

جینا کی آنکھوں سے خوشی کے آنسو بہنے لگے۔ ڈیڑھ سال کی شدید محنت آخر رنگ لے آئی تھی۔

رابرٹ اُچھل کر غبارے کے جنگلے پر چڑھ گیا۔ پھر ہاتھ بڑھا کر جینا کو بھی اوپر گھسیٹ لیا اور دونوں مارے خوشی کے رقص کرنے لگے۔

جینا کا خیال تھا کہ گیس برنر جلا کر غبارے کی پرواز کی آزمائش بھی کی جائے لیکن رابرٹ نے سختی سے اس کی مخالفت کی۔

اس نے جینا سے کہا "اصل مرحلہ غبارے کی تیاری کا تھا جو ہم نے سر کرلیا ہے۔ برنر بھی ضرور کام کریں گے، اس وقت اگر ہم نے برنر استعمال کیا تو اس سے بہت تیز آواز پیدا ہوگی، پھر غبارہ فضا میں بلند ہوجائے گا تو اس کا شعلہ دور سے دیکھا جائے گا۔ میں کامیابی کے اتنے قریب آکر کسی بھی قسم کا رسک نہیں لے سکتا۔"

رابرٹ نے غبارے کے والو کھول کر ہوا خارج کی اور اسے دوبارہ اپنی گاڑی کی ڈگی میں رکھ کر اپنے شہر روانہ ہوگیا۔

جولائی کا مہینا آدھا گزر چکا تھا لیکن ابھی تک تیز و تند ہواؤں کا رُخ تبدیل نہیں ہوا تھا۔

اب رابرٹ پر اس کٹھن ملک میں ایک ایک لمحہ بھاری تھا۔ جولائی کے بعد اگست میں بھی ہوا کے رُخ میں کوئی تبدیلی رونما نہیں ہوئی تو رابرٹ نے سرحد عبور کرنے کے لیے چیکوسلواکیہ کے ایک شمالی سرحدی قصبے مودیویا کا انتخاب کیا۔

وہ علاقہ اس کے لیے بالکل اجنبی تھا اس لیے اسے وہاں کے راستوں اور حالات کا بالکل علم نہیں تھا لیکن اسے یہ یقین ضرور تھا کہ شمال مغربی ہوا مودیویا سے اس کے غبارے کو بہت تیز رفتاری سے اور آسانی کے ساتھ آسٹریا پہنچا دے گی۔

اس موقعے پر اس کی قومی شہرت اور سائیکلنگ کام آئی۔ اس نے اپنی سائیکل پر اس پورے علاقے کا سروے کیا۔ وہ اگر ایتھلیٹ نہ ہوتا تو اسے بہت دشواریوں کا سامنا ہوتا لیکن اب تو اس کے پاس یہ جواز موجود تھا کہ وہ اپنی پریکٹس کے لیے سائیکلنگ کر رہا ہے۔ محافظوں میں سے بھی بیشتر لوگ اسے نام اور شکل سے پہچانتے تھے اس لیے علاقے کا سروے کرنے میں ذرہ برابر دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔

وہ دراصل ایسی جگہ کی تلاش میں تھا جو درختوں کے جھنڈ میں سرحد سے تقریباً چھ میل کے فاصلے پر ہو۔

جلد ہی اسے ایک ایسی مناسب جگہ مل گئی۔ وہ جگہ قدرے ویرانے میں تھی اور درختوں کے جھنڈ میں گھری ہوئی تھی لیکن ان درختوں کے درمیان میں ایسی سطح زمین تھی جہاں سے غبارے کو بہ آسانی اُڑایا جاسکتا تھا۔

اگست کے بعد ستمبر کا مہینا آیا تب بھی رابرٹ کے شہر کی ہواؤں کے رُخ میں کوئی تبدیلی نہیں آئی لیکن رابرٹ کو اب اس کی فکر بھی نہیں تھی۔ وہ اب مخالف ہواؤں کے ذریعے دوسری جگہ سے سرحد پار کرنے کا فیصلہ کرچکا تھا۔

ستمبر میں اس نے دونوں بچوں کو اسکول جانے سے روک دیا۔ دونوں بچوں نے جب حیرت کا اظہار کیا تو رابرٹ نے مسکرا کر کہا "تم لوگ آیندہ ہفتے سے آسٹریا میں پڑھو گے۔"

دونوں بچوں نے غیر یقینی سے اس کی طرف دیکھا، رابرٹ نے انہیں بھی اعتماد میں لے کر اپنا پورا منصوبہ بتا دیا اور ساتھ ہی یہ تاکید بھی کی کہ کسی کے سامنے بھولے سے بھی اس بات کا تذکرہ مت کرنا ورنہ ہم چاروں کی جان بھی جاسکتی ہے۔

دونوں بچے اتنے سمجھدار تو تھے ہی کہ اپنے باپ کی بات بہ آسانی سمجھ سکیں۔ ملک کے حالات سے تو وہ بھی واقف تھے۔ اب ان دونوں کی سمجھ میں آرہا تھا کہ ان کے والدین کی پُراسرار سرگرمیاں کس سلسلے میں تھیں۔

وہ چھ ستمبر 1983ء کی رات تھی جب رابرٹ اکیلا اپنی منتخب جگہ پر گیا اور غبارے کو درختوں کے جھنڈ میں چھپا کر واپس آگیا۔

سات ستمبر 1983ء کی چمکیلی صبح انہوں نے روانگی کا منصوبہ بنالیا۔ اس دن گھر کا ہر فرد خوش تھا۔

جینا نے جب کچھ ضروری سامان سوٹ کیسوں میں ٹھونسنا شروع کیا تو رابرٹ وہ سامان ساتھ لے جانے سے انکار کردیا اور بولا "ہمیں غبارے میں کم سے کم وزن رکھنا ہوگا تاکہ غبارہ تیزی سے اوپر اُٹھ سکے اور سرحد پار جاسکے۔"

آخر ان لوگوں نے ایک ایک جوڑی کپڑے اور ٹوتھ برش اور پیسٹ کے علاوہ تمام سامان وہیں چھوڑ دیا۔

رابرٹ کو گھر کی فروخت سے جو رقم ملی تھی، اس سے اس نے اپنا قرض چکایا اور بچی ہوئی رقم اپنے پاس محفوظ کرلی۔

پھر وہ رچرڈ کے ہمراہ گرجا گھر گیا اور اپنی اور اپنے خاندان کی سلامتی کی دعا مانگی۔

اسی روز سہ پہر کے وقت وہ اپنی منزل کی طرف گامزن ہوگئے۔

ان سب کے دل آنے والے لمحات کے خوف سے لرز بھی رہے تھے اور انہیں یہ خوشی بھی تھی کہ وہ بہت جلد اس قید خانے سے فرار ہوجائیں گے۔

رابرٹ مناسب رفتار سے ڈرائیونگ کرتا ہوا اس مقام پر پہنچا جہاں اس نے غبارہ چھپا رکھا تھا۔

اس وقت شام کا دھندلکا تیزی سی پھیل رہا تھا اور درختوں کے جھنڈ میں تو کچھ زیادہ ہی تاریکی تھی۔

ان سب لوگوں نے مل کر بھاری بھرکم غبارے کو درختوں کے جھنڈ سے نکال کر زمین پر پھیلا دیا۔ تیزی سے کام کرنے کے باوجود انہیں اس کام میں پورا ایک گھنٹا لگ گیا۔

رابرٹ نے غبارے کے جنگلے کے گرد اسٹین لیس اسٹیل کی موٹی چادر بھی لگائی تھی تاکہ اگر سرحدی محافظ ان پر فائرنگ کریں تو وہ کسی حد تک اس فائرنگ سے محفوظ رہ سکیں۔ پھر اس نے زمین میں کھونٹے گاڑ کر جنگلے کو ان کھونٹوں سے باندھ دیا۔ آہنی جنگلے کے ہر کونے کے ساتھ اس نے پروپین گیس کی ایک ٹنکی پہلے ہی فٹ کردی تھی۔

انہیں صرف ایک گھنٹے پرواز کرنا تھی۔ اس کے بعد اگر

www.Paksociety.com

کہیں سے جعلی ملازمت کا ایک کارڈ بھی حاصل کرلیا ورنہ چیکوسلواکیہ کی حکومت میں بے روزگاروں کے لیے کوئی گنجائش نہیں تھی۔ ایسے لوگوں کو حکومت گرفتار کرلیتی تھی، پھر انہیں کسی بھی کام پر لگا دیتی تھی۔

ملازمت سے فارغ ہونے کے بعد جینا اور رابرٹ دونوں انتہائی تندہی سے غبارے کی تیاری میں معروف ہوگئے۔ اس کے ساتھ ہی اس نے اپنے پڑوسیوں میں یہ خبریں پھیلادیں کہ میں جلد ہی ملازمت کے سلسلے میں دوسرے شہر منتقل ہورہا ہوں۔ اس کے ساتھ اس نے اپنے مکان کے لیے گاہک کی تلاش شروع کردی۔

جلد ہی اسے اپنے مکان کا ایک گاہک مل بھی گیا لیکن ابھی اس کی مشکلات کم نہیں ہوئی تھیں۔ مکان فروخت کرنے کے لیے قانون کے مطابق رابرٹ مقامی ہاؤسنگ اتھارٹی سے منظوری لینے کا پابند تھا۔

مقامی ہاؤسنگ اتھارٹی نے مختلف حیلوں، بہانوں سے اسے منظوری دینے سے انکار کردیا۔ اصل میں ہاؤسنگ اتھارٹی کو اپنے ایک ممبر کے لیے اس مکان کی ضرورت تھی۔ وہ ممبر اس مکان کی قیمت اتنی نہیں دے رہا تھا جتنی رابرٹ کو ملنا چاہیے تھی۔ آخر تنگ آکر رابرٹ نے گھاٹے کا سودا کرلیا اور مکان اسی ممبر کے ہاتھوں فروخت کردیا۔

اس نے گھر کے قیمتی سامان، ٹیلی وژن، فریج اور فرنیچر وغیرہ پہلے ہی بیچ دیا تھا اور اب وہ روانگی کے لیے بالکل تیار تھا۔

اب رابرٹ کے لیے ایک اور آزمائش پیدا ہوگئی۔ اس کا ارادہ تھا کہ وہ جولائی اور اگست کے دوران میں سرحد عبور کرجائے گا لیکن جولائی اور اگست میں تیز ہواؤں کا رُخ جنوب کی جانب تھا۔ رابرٹ کے شہر براٹسی لاوا سے ویانا شمال کی طرف تھا۔ گویا ہوا بالکل اس کے مخالف سمت چل پڑی تھی۔

اس دوران میں جینا نے اسے مشورہ دیا کہ اس غبارے کی آزمائشی پرواز بھی کرلی جائے۔ ایسا نہ ہو کہ یہ بھی عین وقت پر ہمیں دھوکا دے دے۔

رابرٹ اس مرتبہ بہت پُریقین تھا۔ اس نے غبارے کی تیاری میں ہر پہلو پر نظر رکھی تھی۔ اس کے باوجود اسے جینا کا مشورہ پسند آیا اور وہ ایک مرتبہ پھر اپنے آبائی شہر لوجکا روانہ ہوگیا تھا کہ وہاں کے ویرانوں میں اپنے نئے غبارے کی آزمائشی پرواز کرسکے۔

اس غبارے میں گزشتہ غبارے کی نسبت چار گنا زیادہ لاگت آئی تھی۔ اس نے نہ صرف غبارے کا جنگلہ مضبوط اسٹیل سے بنایا تھا بلکہ اس کا کپڑا بھی انتہائی قیمتی تھا۔ پھر اس نے غبارے کو ہوا میں اُٹھانے کے لیے گیس کے چار برنر بھی تیار کیے تھے تاکہ اگر ایک برنر کام نہ کرے تو دوسرے سے کام لیا جائے۔ وہ بھی ناکارہ ہوجائے تو تیسرے برنر کو آزمایا جائے۔

پھر غبارے کی رفتار بڑھانے کے لیے بھی بہ یک وقت دو برنر معاون ثابت ہوسکتے تھے۔

وہ ایک مرتبہ پھر اس ویرانے میں موجود تھا۔

جینا کا دل آنے والے لمحات سے بُری طرح دھڑک رہا تھا اور اسے خدشہ تھا کہ کہیں ان کا یہ تجربہ بھی ناکام نہ ہوجائے۔ ناکامی کی صورت میں انہیں شدید مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا۔ جینا اور رابرٹ دونوں اپنی اپنی ملازمتیں چھوڑ چکے تھے۔ گھر کا سودا ہوچکا تھا، گھر کا تمام سامان بھی فروخت ہوچکا تھا اور اب اگر وہ ناکام ہوتے تو ان کے لیے دوبارہ اس ملک میں رہنا پہلے سے کہیں زیادہ دشوار بلکہ ہولناک ہوتا۔

رابرٹ نے اس مرتبہ بجلی کے پنکھے کی بجائے بجلی سے چلنے والے ایک بلور (Blower) کا بندوبست کرلیا تھا۔ پنکھے کے مقابلے میں وہ بلور بہت تیزی اور قوت سے ہوا خارج کرتا تھا۔ رابرٹ نے اس بلور کو کار کی بیٹری سے منسلک کیا اور اسے آن کردیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے غبارے میں ہوا بھرنے لگی اور دس منٹ سے بھی کم عرصے میں وہ آسمان کی طرف تن گیا۔

رابرٹ نے خوشی میں نعرہ لگایا "ہرا!...... میں کامیاب ہوگیا۔"

جینا کی آنکھوں سے خوشی کے آنسو بہنے لگے۔ ڈیڑھ سال کی شدید محنت آخر رنگ لے آئی تھی۔

رابرٹ اُچھل کر غبارے کے جنگلے پر چڑھ گیا۔ پھر ہاتھ بڑھا کر جینا کو بھی اوپر گھسیٹ لیا اور دونوں مارے خوشی کے رقص کرنے لگے۔

جینا کا خیال تھا کہ گیس برنر جلا کر غبارے کی پرواز کی آزمائش بھی کی جائے لیکن رابرٹ نے سختی سے اس کی مخالفت کی۔

اس نے جینا سے کہا "اصل مرحلہ غبارے کی تیاری کا تھا جو ہم نے سر کرلیا ہے۔ برنر بھی ضرور کام کریں گے، اس وقت اگر ہم نے برنر استعمال کیا تو اس سے بہت تیز آواز پیدا ہوگی، پھر غبارہ فضا میں بلند ہوجائے گا تو اس کا شعلہ دور سے دیکھا جائے گا۔ میں کامیابی کے اتنے قریب آکر کسی بھی قسم کا رسک نہیں لے سکتا۔"

رابرٹ نے غبارے کے والو کھول کر ہوا خارج کی اور اسے دوبارہ اپنی گاڑی کی ڈگی میں رکھ کر اپنے شہر روانہ ہوگیا۔

جولائی کا مہینا آدھا گزر چکا تھا لیکن ابھی تک تیز و تند ہواؤں کا رُخ تبدیل نہیں ہوا تھا۔

اب رابرٹ پر اس گھٹن ملک میں ایک ایک لمحہ بھاری تھا۔ جولائی کے بعد اگست میں بھی ہوا کے رُخ میں کوئی تبدیلی رونما نہیں ہوئی تو رابرٹ نے سرحد عبور کرنے کے لیے چیکوسلواکیہ کے ایک شمالی سرحدی قصبے مودبویا کا انتخاب کیا۔

وہ علاقہ اس کے لیے بالکل اجنبی تھا اس لیے اسے وہاں کے راستوں اور حالات کا بالکل علم نہیں تھا لیکن اسے یہ یقین ضرور تھا کہ شمال مغربی ہوا مودبویا سے اس کے غبارے کو بہت تیز رفتاری سے اور آسانی کے ساتھ آسٹریا پہنچادے گی۔

اس موقعے پر اس کی قومی شہرت اور سائیکلنگ کام آئی۔ اس نے اپنی سائیکل پر اس پورے علاقے کا سروے کیا۔ وہ اگر ایتھلیٹ نہ ہوتا تو اسے بہت دشواریوں کا سامنا ہوتا لیکن اب تو اس کے پاس یہ جواز موجود تھا کہ وہ اپنی پریکٹس کے لیے سائیکلنگ کررہا ہے۔ محافظوں میں سے بھی بیشتر لوگ اسے نام اور شکل سے پہچانتے تھے اس لیے علاقے کا سروے کرنے میں ذرہ برابر دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔

وہ دراصل ایسی جگہ کی تلاش میں تھا جو درختوں کے جھنڈ میں سرحد سے تقریباً چھ میل کے فاصلے پر ہو۔

جلد ہی اسے ایک ایسی مناسب جگہ مل گئی۔ وہ جگہ قدرے ویرانے میں تھی اور درختوں کے جھنڈ میں گھری ہوئی تھی لیکن ان درختوں کے درمیان میں ایسی مسطح زمین تھی جہاں سے غبارے کو بہ آسانی اُڑایا جاسکتا تھا۔

اگست کے بعد ستمبر کا مہینا آیا تب بھی رابرٹ کے شہر کی ہواؤں کے رُخ میں کوئی تبدیلی نہیں آئی لیکن رابرٹ کو اب اس کی فکر بھی نہیں تھی۔ وہ اب مخالف ہواؤں کے ذریعے دوسری جگہ سے سرحد پار کرنے کا فیصلہ کرچکا تھا۔

ستمبر میں اس نے دونوں بچوں کو اسکول جانے سے روک دیا۔ دونوں بچوں نے جب حیرت کا اظہار کیا تو رابرٹ نے مسکرا کر کہا "تم لوگ آیندہ ہفتے سے آسٹریا میں پڑھوگے۔"

دونوں بچوں نے غیر یقینی سے اس کی طرف دیکھا، رابرٹ نے انہیں بھی اعتماد میں لے کر اپنا پورا منصوبہ بتادیا اور ساتھ ہی یہ تاکید بھی کی کہ کسی کے سامنے بھولے سے بھی اس بات کا تذکرہ مت کرنا ورنہ ہم چاروں کی جان بھی جاسکتی ہے۔

دونوں بچے اتنے سمجھ دار تو تھے ہی کہ اپنے باپ کی بات بہ آسانی سمجھ سکیں۔ ملک کے حالات سے تو وہ بھی واقف تھے۔ اب ان دونوں کی سمجھ میں آرہا تھا کہ ان کے والدین کی پُراسرار سرگرمیاں کس سلسلے میں تھیں۔

وہ چھ ستمبر 1983ء کی رات تھی جب رابرٹ اکیلا اپنی منتخب جگہ پر گیا اور غبارے کو درختوں کے جھنڈ میں چھپا کر واپس آگیا۔

سات ستمبر 1983ء کی چمکیلی صبح انہوں نے روانگی کا منصوبہ بنالیا۔ اس دن گھر کا ہر فرد خوش تھا۔

جینا نے جب کچھ ضروری سامان سوٹ کیسوں میں ٹھونسنا شروع کیا تو رابرٹ وہ سامان ساتھ لے جانے سے انکار کردیا اور بولا "ہمیں غبارے میں کم سے کم وزن رکھنا ہوگا تاکہ غبارہ تیزی سے اوپر اُٹھ سکے اور سرحد پار جاسکے۔"

آخر ان لوگوں نے ایک ایک جوڑی کپڑے اور ٹوتھ برش اور پیسٹ کے علاوہ تمام سامان وہیں چھوڑ دیا۔

رابرٹ کو گھر کی فروخت سے جو رقم ملی تھی، اس سے اس نے اپنا قرض چکایا اور بچی ہوئی رقم اپنے پاس محفوظ کرلی۔

پھر وہ رچرڈ کے ہمراہ کرجا گھر گیا اور اپنی اور اپنے خاندان کی سلامتی کی دعا مانگی۔

اسی روز سہ پہر کے وقت وہ اپنی منزل کی طرف گامزن ہوگئے۔

ان سب کے دل آنے والے لمحات کے خوف سے لرز بھی رہے تھے اور انہیں یہ خوشی بھی تھی کہ وہ بہت جلد اس قید خانے سے فرار ہوجائیں گے۔

رابرٹ مناسب رفتار سے ڈرائیونگ کرتا ہوا اس مقام پر پہنچا جہاں اس نے غبارہ چھپا رکھا تھا۔

اس وقت شام کا دھندلکا تیزی سی پھیل رہا تھا اور درختوں کے جھنڈ میں تو کچھ زیادہ ہی تاریکی تھی۔

ان سب لوگوں نے مل کر بھاری بھرکم غبارے کو درختوں کے جھنڈ سے نکال کر زمین پر پھیلادیا۔ تیزی سے کام کرنے کے باوجود انہیں اس کام میں پورا ایک گھنٹا لگ گیا۔

رابرٹ نے غبارے کے جنگلے کے گرد اسٹین لیس اسٹیل کی موٹی چادر بھی لگائی تھی تاکہ اگر سرحدی محافظ ان پر فائرنگ کریں تو وہ کسی حد تک اس فائرنگ سے محفوظ رہ سکیں۔ پھر اس نے زمین میں کھونٹے گاڑ کر جنگلے کو ان کھونٹوں سے باندھ دیا۔ آہنی جنگلے کے ہر کونے کے ساتھ اس نے پروپین گیس کی ایک ٹنکی پہلے ہی فٹ کردی تھی۔

انہیں صرف ایک گھنٹے پرواز کرنا تھی۔ اس کے بعد اگر

www.Paksociety.com

مقدر ساتھ دیتا تو وہ آسٹریا پہنچ جاتے۔

رابرٹ نے جنگلے کے ساتھ احتیاطاً اپنی سائیکل بھی باندھ دی تھی تاکہ اگر انہیں زبردستی نیچے اُترنے پر مجبور کیا جائے تو فرار کے لیے کم سے کم کوئی سواری تو میسر ہو۔ رابرٹ کو یقین تھا کہ وہ اپنی سائیکل پر جینا اور دونوں بچوں کے ساتھ فرار کی کوشش کرسکتا ہے۔

رابرٹ نے کار کے انجن کے ساتھ بلور سے ہوا خارج کرنے والا پائپ فٹ کردیا اور وہ لوگ اندھیرا مزید گہرا ہونے کا انتظار کرنے لگے۔

اچانک رابرٹ کو وہاں سے کچھ فاصلے پر ایک انسانی ہیولا دکھائی دیا۔ رابرٹ نے سرگوشی میں سب کو بالکل خاموش رہنے کی تاکید کی۔ ایک لمحے کے لیے تو وہ سکتے میں رہ گئے اور ان لوگوں نے سانس تک روک لی۔ ان کے دل بُری طرح دھڑک رہے تھے۔ جینا اور رابرٹ کو اپنی شدید محنت اور جمع پونجی ضائع ہونے کے ساتھ ساتھ اپنے خاندان کی زندگیوں کی فکر بھی لاحق ہوگئی تھی۔

وہ کوئی سرحدی محافظ تھا جو چند منٹ بعد کسی دوسری سمت مڑ کر اندھیرے میں گم ہوگیا۔

اتنے ہی عرصے میں رابرٹ کا جسم پسینے میں تر ہوگیا تھا۔ جینا اور دونوں بچوں کی بھی یہی حالت تھی۔ سرحدی محافظ کے جانے کے بعد بھی وہ دیر تک اپنے کشیدہ اعصاب پر قابو پانے کی کوشش کرتے رہے۔

جینا نے اس موقعے پر پانی کی بوتل نکالی اور سب کو دو دو گھونٹ پانی پلایا تاکہ ان کے خشک حلق تر ہوسکیں۔ پھر جینا نے کافی کا تھرماس نکالا اور اس میں سے کافی کا ایک ایک کپ نکال کر خالی تھرماس وہیں پھینک دیا۔

کافی پینے سے ان کی کھوئی ہوئی توانائی خاصی حد تک لوٹ آئی۔

دس بجے کے قریب رابرٹ نے ہوا کا رُخ معلوم کرنے کے لیے ایک ٹشو ہوا میں اچھالا اور یہ جان کر اس نے سکون کا سانس لیا کہ ہوا ان کے موافق تھی۔

رابرٹ نے کار کا انجن اسٹارٹ کیا اور ہوا خارج کرنے والے پائپ کے ذریعے غبارے میں تیزی سے ہوا بھرنے لگا۔ اسے یہ خطرہ بھی تھا کہ کار کے انجن کی آواز سن کر کوئی سرحدی محافظ ادھر نہ نکل آئے۔

تھوڑی ہی دیر میں غبارے نے گولائی اختیار کرلی۔ رابرٹ نے ویلڈروں والے دستانے ہاتھوں میں پہنے اور گیس برنر کو آگ دکھادی۔

برنر میں آگ لگنے سے ایسی زبردست روشنی پیدا ہوئی کہ چند لمحوں کے لیے ان سب کی آنکھیں چندھیا گئیں۔

غبارے کا وزن خاندان کے تمام افراد اور سامان سمیت تقریباً نصف ٹن تھا۔ رابرٹ کی محتاط فطرت کے پیش نظر یہ وزن غبارے کی نسبت کافی کم تھا۔ برنر سے خارج ہونے والی نوسو درجے سینٹی گریڈ کی حرارت سے غبارہ فوراً ہی اوپر اٹھ گیا۔ اس غبارے کی گولائی یعنی محیط ایک سو پچاس فٹ تھا اور بلندی میں یہ غبارہ سات منزلہ عمارت کے برابر تھا۔

خاندان کے چاروں افراد جنگلے کے اس پلیٹ فارم پر ایک دوسرے سے چمٹے ہوئے کھڑے تھے جو صرف ایک مربع گز تھا۔

رابرٹ نے چیخ کر جینا سے کہا ”زمین سے بندھی ہوئی رسّیاں کاٹ دو۔“

جینا نے فوراً ہی رسّیاں کاٹ دیں۔ غبارہ بیس فٹ فی سیکنڈ کی رفتار سے اوپر اُٹھنے لگا۔ گیس برنر کی آواز اتنی گرج دار تھی کہ ان لوگوں کو محسوس ہو رہا تھا کہ وہ بہرے ہو جائیں گے۔ آگ کے شعلے اتنے خوف ناک تھے کہ بچوں کے ساتھ ساتھ جینا بھی سہمی جارہی تھی۔

رابرٹ نے ایک ہاتھ گیس برنر کے والو پر رکھا ہوا تھا تاکہ اگر کسی وجہ سے غبارے میں آگ لگ جائے تو وہ فوراً گیس کا والو بند کردے۔

غبارہ جوں جوں فضا میں بلند ہو رہا تھا، ان کے دل خوشی سے جھوم رہے تھے۔

اچانک ہی ان کی خوشی نے دم توڑ دیا اور خاندان کے ہر فرد کا چہرہ مرجھا گیا۔

گیس برنر کا شعلہ اچانک ہی چھوٹا ہوگیا تھا اور اس کے ساتھ ہی غبارہ نیچے آنے لگا تھا۔

آزادی کی کوشش اور کامیاب پرواز کے جوش میں رابرٹ کو یہ خیال ہی نہیں رہا تھا کہ غبارے کی ایک ٹنکی میں سے سارا ایندھن تقریباً استعمال ہوچکا تھا۔

رابرٹ نے چیخ کر جینا سے کہا ”جینا! غبارے کی دوسری ٹنکی کھولو۔“

جینا دوسری ٹنکی کی طرف لپکی اور وہ اسے کھولنے کی کوشش ہی کررہی تھی کہ غبارہ زمین پر آرہا۔

رابرٹ نے مایوسی سے سر جھٹکا اور آنے والے خوفناک لمحات کے بارے میں سوچنے لگا۔ اسے یقین تھا کہ ابھی کچھ ہی دیر میں انہیں گھیر لیا جائے گا اور اگر فوری طور پر انہیں گولیوں سے نہ بھونا گیا تو پھر چیکوسلواکیہ کی کوئی عدالت ان

زندگی ایک سفر ہے اور ہم سب مسافر

لیکن اس داستان کے مسافر کا سفر طویل، سنسنی خیز اور دلچسپ ہے

حساس اور نرم دل کرداروں کا سفاک و سنگ دل حریفوں سے تصادم

رنگین و سنگین واقعات جو نازک جذبوں اور دل گداز لمحوں میں پروان چڑھتے ہیں

ان کے لیے جو اچھی کہانیوں کے رسیا ہیں

سطر سطر اپنی گرفت میں رکھنے والی اس یادگار سلسلے وار کہانی

آخری اترن، تماشائے عشق، مزاج آشنا اور جنت

کے تخلیق کار **ناصر ملک** کے قلم سے

سسپنس کے تازہ شمارے میں ملاحظہ فرمائیں

پر سازش اور غداری کا مقدمہ قائم کرکے انہیں فائرنگ اسکواڈ کے حوالے کردے گی یا پھر انہیں سوویت یونین کی حکومت کے حوالے کردیا جائے گا جہاں اکثر اس قسم کے قیدیوں کا مقدر سائبیریا کا مقام ہوتا تھا۔

جب کچھ دیر گزرنے کے بعد بھی ہر طرف خاموشی چھائی رہی، انہیں کسی محافظ کی سرچ لائٹ دکھائی نہ دی، کسی کی کرخت آواز سنائی نہیں دی تو ان کے دل میں پھر سے جینے کی امنگ پیدا ہوگئی۔ یہ تائید غیبی ہی تو تھی کہ اتنی چندھیا دینے والی روشنی اور برنر کے شعلے کی گرج دار آواز بھی سرحدی محافظوں کو اس طرف متوجہ نہیں کرسکی تھی۔

رابرٹ نے غبارے کا جائزہ لیا۔ وہ زمین کی طرف آتے ہوئے درختوں کی ٹہنیوں میں اُلجھ کر دو تین جگہ سے پھٹ گیا تھا۔

فوری طور پر غبارے کی مرمت کرنے کا وقت تھا، نہ موقع۔ رابرٹ نے دل ہی دل میں دعا کی کہ کاش یہ غبارہ اس حالت میں پرواز کے قابل ہوجائے، رابرٹ جانتا تھا کہ اسے جو کچھ کرنا ہے، بہت تیزی سے کرنا ہے۔ یہ ضروری نہیں تھا کہ کوئی سرحدی محافظ اس وقت اِدھر نہیں آیا تو بعد میں بھی نہیں آسکتا تھا۔ پھر اسے یہ بھی خدشہ تھا کہ ایندھن کی جو حرارت اس وقت غبارے میں موجود تھی، وہ ضائع ہوگئی تو پھر اس کا دوبارہ اُٹھنا بہت مشکل ہوگا۔

اس نے گیس سلنڈروں کو ٹھیک کرکے دوبارہ برنر کو شعلہ دکھایا، پھر فضا چکا چوند ہوگئی اور غبارہ اوپر اُٹھنے لگا۔

اس مرتبہ جینا نے تیسری ٹنکی پہلے سے تیار کردی تھی تاکہ اس قسم کا حادثہ دوبارہ رونما نہ ہوجائے۔

رابرٹ نے برنر کو پوری قوت سے تھاما ہوا تھا۔ اگر برنر کسی طرف جھک جاتا تو غبارے میں آگ لگ سکتی تھی۔

اچانک ان کے چہروں پر سرچ لائٹ کی تیز روشنی پڑی تو خطرے کے احساس سے ان سب کے ہاتھ پیر پھول گئے۔ سرحدی محافظوں نے پہلے تو ٹریسر گولیوں کی مدد سے سمت معلوم کرنے کی کوشش کی، پھر رائفلیں گرجنے لگیں۔

اس موقع پر رابرٹ کی احتیاط کام آئی اور اس نے اسٹیل کی جو پلیٹ جنگلے کی چاروں طرف لگائی تھی، گولیاں اس سے اچٹ کر گزر گئیں لیکن اس اسٹیل کی پلیٹ سے وہ زیادہ دیر تک محفوظ نہیں رہ سکتے تھے۔ دور مار رائفل کی کوئی گولی ان میں سے کسی کو لگ بھی سکتی تھی یا کوئی گولی سلنڈر سے ٹکرا کر اسے ناکارہ کرسکتی تھی۔

رابرٹ نے برنر کو پورا کھول دیا اور وہ غبارے کو بہت تیزی سے بادلوں کے اوپر لے گیا۔ اسے یہ بھی خدشہ تھا کہ بہت زیادہ بلندی پر جاکر غبارہ تیز و تند ہواؤں کے نرغے میں آکر چکر کھانے لگے گا، پھر ایندھن ختم ہوتے ہی زمین پر گر جائے گا۔

رابرٹ نے امریکا کی بنی ہوئی ویڈیو فلم کو اپنے ذہن میں دُہرایا اور غبارے کو اتنی بلندی پر لے گیا جہاں ہوا سبک رفتار تھی، تیز ہوائیں بہت پیچھے رہ گئی تھیں اور اب ان کا غبارہ بہت ہموار انداز میں محو پرواز تھا۔ بادلوں کو اُڑانے والی ہواؤں کے نرغے سے نکلنے کے لیے اس نے ایندھن کی مقدار میں مزید اضافہ کردیا تھا۔

آٹھ ہزار فٹ کی بلندی پر پہنچ کر وہ نہ صرف سرحدی محافظوں کی فائرنگ سے محفوظ ہوگیا بلکہ تیز و تند ہوائیں بھی نیچے رہ گئیں اور وہ سبک رفتاری سے منزل کی طرف رواں دواں ہوگیا۔

گیس کا دوسرا سلنڈر تقریباً خالی ہوچلا تھا۔

رابرٹ نے چیخ کر جینا سے کہا "تیسرا سلنڈر کھول دو۔"

جینا نے گیس کا تیسرا سلنڈر بھی کھول دیا۔ رابرٹ نے خالی ہونے والے دونوں سلنڈر نیچے پھینک دیے۔

رابرٹ کے پاس ایک طاقت ور دوربین بھی تھی۔ وہ دوربین کے ذریعے مسلسل زمین کا جائزہ لے رہا تھا۔ اسے بادلوں کے بیچ سے کہیں کہیں زمین نظر بھی آرہی تھی۔ وہ گھڑی دیکھ کر سرحد کا اندازہ کررہا تھا۔ اسے اب نیچے کی روشنیاں نظر آرہی تھیں۔

اس سے قبل کہ غبارے کے ایندھن کا تیسرا سلنڈر بھی خالی ہوتا، رابرٹ غبارے کو افقی رُخ پر چلاتے ہوئے ایندھن کی مقدار بہ تدریج کم کرتا گیا اور غبارہ زمین کی طرف آنے لگا۔ وہ تیسرے گیس سلنڈر کو اتنی احتیاط سے استعمال کررہا تھا کہ وہ اسے وقفے وقفے سے بند کردیتا تھا۔

جینا کو خدشہ تھا کہ وہ ابھی چیکوسلواکیہ کی سرحد سے باہر نہیں نکلے ہیں اور وہ اس ملک کی کسی کسٹم چوکی کے نزدیک جا اُتریں گے۔

رابرٹ جانتا تھا کہ اگر ایسا ہوا تو ابھی چوتھے سلنڈر کا ایندھن ان کے پاس موجود ہے۔ کسی بھی خطرے کی صورت میں وہ چوتھے سلنڈر کا برنر کھول کر غبارے کو دوبارہ فضا میں بلند کرکے اپنی اور اپنے خاندان کی جان بچاسکتا تھا۔

چند منٹوں بعد ان لوگوں کو زمین نظر آئی۔ رابرٹ نے تن بہ تقدیر ہوکر غبارے کو زمین پر اُترنے دیا۔ غبارہ انگور کی بیلوں سے ٹکرایا اور پختہ سڑک سے آدھے فرلانگ کے فاصلے

پر ایک کھیت میں جا اُترا۔

ان سب کے ذہنوں میں اب سب سے بڑا سوال یہ تھا کہ وہ اس وقت چیکوسلواکیہ کی سرحد میں ہیں یا سرحد پار کرکے اپنی منزل کو پاچکے ہیں؟ اس پرواز میں پچپن منٹ لگے تھے اور رابرٹ کا خیال تھا کہ اتنے وقت میں ہم نے سرحد عبور کرلی ہوگی۔

جینا کا خیال تھا کہ چیکوسلواکیہ کے اس سرحدی قصبے سے آسٹریا تک تقریباً ایک گھنٹے کی پرواز تھی۔ وہ بھی اس صورت میں کہ وہ مسلسل محو پرواز رہے۔ ان کا غبارہ ایک دفعہ اُڑنے کے بعد زمین پر بھی گرا تھا اور دوبارہ اُڑنے میں اسے پندرہ منٹ تو لگے ہی ہوں گے۔ بہر حال اب تو وہ زمین پر اُتر ہی چکے تھے۔ اب یہ سب کچھ سوچنے کا فائدہ بھی کیا تھا۔ جو کچھ ہونا ہوگا، وہ ابھی چند منٹوں میں ہوجائے گا۔

وہ غبارے سے اُتر کر جب انگور کی بیلوں میں چھپنے کی کوشش کررہے تھے تو گاڑیوں کے انجن کے شور اور ان کی ہیڈ لائٹس سے انہیں اندازہ ہوگیا کہ انہیں دیکھ لیا گیا ہے۔ اب یہ تقدیر پر منحصر تھا کہ آنے والے دوست ہیں یا دشمن؟

ان کے گرد کئی گاڑیاں تھیں جن کے ہیڈ لیمپس کی روشنیوں میں ان کی آنکھیں چندھیا رہی تھیں۔

رابرٹ نے سڑک کی طرف رینگنے کی کوشش کی تو جینا ہذیانی انداز میں بولی "اتنی جلدی مت کرو رابرٹ! پہلے گاڑی کی نمبر پلیٹ پڑھو۔"

چند لمحوں بعد رابرٹ دو آدمیوں کے نرغے میں تھا۔ جینا کا دل بیٹھ گیا۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ چیخ چیخ کر روئے، جانا اور رچرڈ نے تو رونا شروع کردیا تھا۔

چند لمحے بعد رابرٹ دو اجنبیوں کے ساتھ واپس آیا۔

ان میں سے ایک نے نرم لہجے میں جینا سے کہا "میں آپ کو آسٹریا میں خوش آمدید کہتا ہوں مادام!"

تھوڑی دیر بعد رابرٹ اور اس کے خاندان کے دوسرے افراد آسٹریا کے سرحدی قصبے فالکن شائن کی آبادی کے درمیان کھڑے ہوئے تھے۔ وہاں اس وقت فالکن شائن کا میئر بھی موجود تھا۔

میئر نے ہنستے ہوئے رابرٹ سے کہا "ہم لوگ گزشتہ آدھے گھنٹے سے اس غبارے کو اپنے قصبے کی سمت پرواز کرتا دیکھ رہے تھے اور دعا کررہے تھے کہ کہیں غبارہ سرحد پار کرنے سے پہلے ہی نہ گر جائے۔"

انگور کی ایک شاخ غبارے کے جنگلے میں پھنسی ہوئی تھی۔ وہ شاخ انگوروں سے لدی ہوئی تھی۔ رابرٹ نے وہی شاخ کھینچ کر جنگلے سے نکالی اور میٹھے انگوروں کے ذریعے اپنا اور اپنے خاندان کا منہ میٹھا کیا۔ گویا انگور کی یہ شاخ ان کی آزادی کا پہلا ثمر تھی۔

رابرٹ اور اس کے خاندان نے کچھ دن فالکن شائن کے لوگوں کی میزبانی کا لطف اُٹھایا پھر آسٹریا کے نئے شہری کی حیثیت سے رابرٹ کی پہلی ذمے داری یہی تھی کہ وہ ایک غبارے کی امپورٹ پر آسٹریا کی حکومت کو کسٹم ڈیوٹی ادا کرے۔ رابرٹ کے پاس مکان بیچنے کے بعد خاصی رقم محفوظ تھی۔ اس نے آسٹروی شہری کی حیثیت سے اپنی پہلی ذمے داری بہت خوشی خوشی پوری کی۔

چند دن بعد رابرٹ اپنے خاندان کے ساتھ آسٹریا کے ایک خوش حال قصبے دارن برن منتقل ہوگیا۔ وہاں سابقہ تجربے کی بنیاد پر اسے ایک بڑی اور معروف تعمیراتی کمپنی میں ملازمت مل گئی۔ جینا کو بھی اس کی اہلیت کے لحاظ سے بہترین ملازمت ملی۔

رابرٹ نے اپنے دونوں بچوں کو آسٹریا کے ایک اچھے اسکول میں داخل کرادیا۔

رچرڈ نے ہنس کر کہا "ڈیڈی! جس وقت آپ نے مجھ سے یہ وعدہ کیا تھا کہ میں آئندہ آسٹریا کے کسی اسکول میں پڑھوں گا تو مجھے آپ کی بات پر یقین نہیں آیا تھا لیکن آپ نے اپنا وعدہ سچ کر دکھایا۔"

"میں نے پورے دو برسوں تک اپنے مشن کی تکمیل کے لیے جدوجہد کی تھی بیٹا! مجھے یقین تھا کہ میں اپنے مقصد میں ضرور کامیاب ہوجاؤں گا۔"

رابرٹ کو آزاد فضا میں سانس لینے کا موقع ملا تو اس نے ایک دفعہ پھر سائیکلنگ شروع کردی اور بہت جلد آسٹریا میں اس سے کہیں زیادہ نام، شہرت اور دولت کمائی جتنی اس نے چیکوسلواکیہ میں کمائی تھی۔

رابرٹ خاندان کے فرار کے بعد چیکوسلواکیہ میں شہریوں پر عرصۂ حیات مزید تنگ ہوگیا۔ وہ بے چارے برسات میں پہننے کے لیے برساتی کو بھی ترس گئے۔ حکومت نے نہ صرف اس کپڑے کے فروخت پر پابندی لگادی تھی بلکہ برساتیوں کی فروخت بھی قانوناً ممنوع قرار پائی تھی کہ مبادا کوئی اور سرپھرا برساتیاں خرید کر ان سے غبارہ بنالے۔

رابرٹ اور جینا کے دونوں بچوں کی شادیاں ہوچکی ہیں لیکن اس خاندان کو غبارے کا وہ ہولناک سفر اب بھی یاد آتا ہے تو ان کے دلوں کی دھڑکنیں بے ترتیب ہوجاتی ہیں۔

☆

باربی ڈول

محمد اختر

دوسرا اور آخری حصہ

وہ خواب نگر کی شہزادی تھی۔ اس کا حسن جہاں گیر فتنہ سامانی کا سبب تھا۔ اس کے عشاق اس کا نام لے کر آہیں بھرتے اور وہ ان کے دلوں کو ٹھوکروں میں رکھتی۔ اس کے حسن کی جنوں خیزی کو مدِنظر رکھ کر اسے مشورہ دیا گیا کہ اپنے حسن کی جادوگری سے علاقے کے باہر جو دنیا ہے، اسے بھی محظوظ کرو اور اس نے یہ مشورہ مان لیا۔ اس راہ پر چل پڑی جو دولت وشہرت سے نوازتا ہے۔ جب آگے بڑھی تو پھر بڑھتی ہی چلی گئی۔ راستے کی ہر دیوار خود ہی گرتی چلی گئی۔ عکس وفن کی اس دنیا میں اس کا راج قائم ہوگیا تھا۔ وہ فن کی دیوی کہلانے لگی۔ آج بھی اس کی پرستش اسی انداز میں ہوتی ہے۔

عالمی پیمانے پر معروف دوشیزہ کا زندگی نامہ، دوسرا آخری حصہ

وہ دھیمے گیتوں میں تو بہترین تھی ہی ان دنوں تیز اور پُرشور گیتوں میں وہ یہ بھی ثابت کرنے میں کامیاب ہو گئی کہ وہ ہر قسم کے گیت گا سکتی ہے اور بہتر انداز میں گا سکتی ہے۔

"دی ڈفرنس بیٹوین اس (The Difference between us) کو ماریا نے خوب جم کر گایا، اگرچہ زیادہ دھیما گیت تھا مگر سازندوں نے بھی گیت سنتے ہی بے ساختہ کہہ دیا "لو! اس گیت کو تم نے ایسے رچاؤ سے گایا ہے کہ ماریا کیری ذہن میں تازہ ہو گئی۔"

جنیفر نے سر کے اشارے سے شکریہ ادا کیا تو سیتھم گز نے کہا "یہ محض تعریف نہیں لو! اگر اس گیت کو ماریا کیری کے البم میں شامل کردیا جائے تو کسی کو پتا نہیں چلے گا۔ تم نے اس گیت کے ساتھ اتنا ہی انصاف کیا ہے جتنا ماریا کرتی۔"

جنیفر نے صرف اتنا کہا "اس گیت کے رومانی بولوں نے مجھ پر سحر طاری کردیا تھا۔ میں جیسے ان کے تاثر میں کھو سی گئی۔"

"کُڈنٹ فاؤنڈ اینودھر مین (Couldn't found another man) ایک ایسا گیت تھا جو بوائے فرینڈ کے لیے گایا گیا تھا۔ اگرچہ اس کی زندگی میں ابھی تک بوائے فرینڈ یا کوئی مرد نہیں آیا تھا مگر اس کے باوجود اس کے دھیمے گیت کو اس نے اس قدر رچاؤ کے ساتھ نہایت خواب ناک انداز میں اس طرح گایا گویا یہ اس کے دل کی آرزو ہو۔

جب جنیفر کے البم کے گیتوں کی بات چل نکلی ہے تو اس البم کے دیگر گیتوں کے بارے میں بھی بتاتے چلیں کہ انگریزی موسیقی سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے یہ معلومات خاصی اہم ثابت ہو سکتی ہے۔ اس البم میں اگلا گیت "یو میک می اسمائل (Youmakemesmile) جاز طرز کا تھا۔ جو ابتدا میں تو ذرا عجیب سا محسوس ہوتا تھا لیکن دیگر گیتوں کی طرح یہ گیت بھی محبت بھرے بولوں اور عشق کی چاشنی سے لبریز تھا۔ ایسے البم میں ضروری تھا کہ کم از کم ایک ڈرامائی بیلے بھی شامل کیا جاتا۔ اس پر خود جنیفر نے زور دیا تھا۔ اینجلو مانٹرون کو نہیں معلوم تھا کہ جنیفر کس پائے کی رقاصہ ہے۔ جب جنیفر نے کہا کہ اس البم میں ایک بیلے بھی ہونا چاہیے تو اینجلو چونک اُٹھا۔

"بیلے! نہیں، ہم اس کی آڈیو بہتر انداز میں نہیں بنا سکیں گے۔ اس کے لیے تمہیں بہت زیادہ محنت کرنا پڑے گی۔"

جنیفر نے مسکرا کر کہا "آپ مجھ سے واقف ہیں۔ میرے رقص سے ناواقف ہیں! اگر میں نے بچپن سے کوئی چیز محبت کے ساتھ سیکھی ہے تو وہ رقص ہے۔"

"اگر ایسی بات ہے تو میں بھی دیکھنا چاہوں گا۔"

"ان انوور لائف" ایک ایسا ہی بیلے گیت تھا۔ جس میں جنیفر نے اپنے فن کی پختگی کا پوری طرح اظہار کیا۔ اگرچہ گلوکاری میں وہ اس گیت کے دوران استادوں کی سطح تک تو پہنچنے میں ناکام رہی مگر اس نے یہ باور کرا ہی لیا کہ وہ رومانوی دھنوں اور شاعری کو بہت بہتر انداز میں سمجھ سکتی ہے۔ نہ صرف سمجھ سکتی ہے بلکہ بھرپور انداز میں گا بھی سکتی ہے۔ یہ گیت ایسا تھا کہ اس کو سن کر جنیفر کے بارے میں ہر شخص کی رائے یکسر تبدیل ہو گئی۔ اس کی آواز ایسی پختہ اور بھرپور عورت کے تاثر میں رچی ہوئی تھی جو محض اپنے عشق کے بل پر دنیا فتح کرنے کے لیے آمادہ ہو گئی ہو اور جنیفر اس بات کا باقاعدہ طور پر ثبوت پیش کر رہی تھی۔ اسے دنیا فتح کرنے کا موقع مل رہا تھا اور وہ ظاہر کر رہی تھی کہ کم سن ضرور ہے مگر کسی سے کم نہیں ہے۔

رقص والے تیز ٹریک کی نسبت جنیفر دھیمے اور مدھم سُروں والے گیت بہت آسانی سے گا لیتی تھی اس کی وجہ صرف یہی ہو سکتی ہے کہ دھیمے گیتوں میں شاعری کے ساتھ اپنے جذبات شامل کرنے کا موقع بہت آسانی سے مل جاتا ہے۔ تیز اور ہیجان انگیز گیتوں میں ایسے مواقع کم ہی ملتے ہیں۔ تاہم "کانٹ اسٹینڈ ان دی وے آف لو" (Can't stand In the way of love) جیسے پرشور اور ہنگامہ خیز ڈانس ٹریک کو بھی اس نے نہایت عمدگی سے گا لیا اور "فری ٹو بی اے وومن" (Free to be a woman) تو اس البم کا انتہائی غیر معمولی گیت ثابت ہوا۔ یہ دوسرا گیت تھا جو لو نے خود لکھا تھا۔ اب اس کے اندر کی شاعرہ بھی اس کے ساتھ ساتھ جوان ہو رہی تھی اور گزرتے وقت کے ساتھ باہر آرہی تھی۔ دیگر گیتوں کی نسبت یہ محبت بھرا نغمہ نہیں تھا۔ بلکہ اس کا انداز ایسا ہی تھا جیسے اسپائس گرل کا پرانا گیت (Wanna be) نئے دور میں نئے انداز سے گایا جا رہا ہو۔ اس گیت کا مفہوم جب ایک اخباری رپورٹر نے پوچھا تو جنیفر نے ہنستے ہوئے کہا تھا۔

"گیت کے الفاظ بہت سادہ ہیں مگر اس کا پیغام یہی ہے کہ اگر کوئی لڑکا میرا جسم دیکھنے اور آسودہ ہونے کا خواہش مند ہے تو پہلے اسے میرے دل میں جھانکنا ہوگا۔"

"یہ گیت تم نے لکھا ہے، کیا یہ سمجھا جائے کہ یہ پیغام ہے، تمہاری طرف سے کسی بھی لڑکے کے لیے۔"

"اگر یہ پیغام ہو سکتا ہے تو اس میں کوئی قباحت نہیں' میں خود کو ان مخصوص کرداروں میں جکڑے ہوئے نہیں دیکھ سکتی جو صرف عورتوں کے لیے موزوں خیال کیے جاتے ہیں۔"

جینیفر نے اس کے بعد باقاعدہ شاعری شروع کر دی۔ تاہم ناقدین کا کہنا ہے کہ اس کی شاعری میں بیان کیے گئے موضوعات عمومی موضوعات سے مختلف ہیں۔ (جینیفر کی تمام شاعری اب اس کی ذاتی ویب سائٹ پر بھی جاری کر دی گئی ہے۔) مختصراً جینیفر کا یہ البم اس کے لیے ایک اعزاز تھا۔ اس البم کے بعد یہ بات ثابت ہو گئی تھی کہ وہ نہ صرف گا سکتی ہے بلکہ بہت اچھا گا سکتی ہے۔ جب کسی نووارد گلوکارہ کا موزانہ ماریا کیری جیسی پختہ کار گلوکارہ سے کیا جانے لگے تو سمجھ لینا چاہیے کہ اس میں ضرور کوئی بات ہے۔ یہ اسی کم عمر لڑکی کا البم تھا جس کا پہلا البم تین برس قبل منظرِ عام پر آیا تھا۔ اس وقت اسے ننھی سی لڑکی کی شناخت دی گئی تھی مگر تین سال بعد میں اس کا امیج ایک بھرپور عورت کا سا بن گیا۔ البم کا سرورق اس کی جوانی کے اُبال اور ہیجان انگیز جنسیت کو ظاہر کر رہا تھا مگر گیت اس کی شخصیت کا انوکھا زاویہ پیش کر رہے تھے۔ تمام گیتوں میں اس کی شخصیت کا رومانی پہلو سامنے آتا تھا۔ ایسا رومانی پہلو جو کسی نوخیز جنس زدہ امریکی لڑکی کا نہیں ہو سکتا تھا۔ اس البم کے بعد تسلیم کر لیا گیا تھا کہ وہ موسیقی کی دنیا میں بہرطور ایک مقام رکھتی ہے۔ اب موسیقی کی دنیا میں اسے سنجیدگی سے لیے جانے کا وقت آگیا تھا۔ اس نے ایسا شاندار البم دیا تھا کہ بے شمار لوگ چونک کر رہ گئے تھے مگر یہ اس کی بدقسمتی کا تسلسل تھا کہ البم ہاتھوں ہاتھ نہیں بک سکا۔

یہ صورتِ حال ایک بار پھر اسے شکستہ کر دینے کے لیے کافی تھی۔ وہ "پارٹی آف فائیو" کے سیٹ پر بھی دل گیر نظر آنے لگی۔ اس کے ساتھی اداکار اس کی کیفیت کو محسوس کر رہے تھے۔ اسے دلاسا دے رہے تھے سمجھا رہے تھے کہ اس ناکامی میں اس کا کوئی قصور نہیں ہے۔ البم کی تشہیر مناسب انداز میں ہوتی تو یہ البم "ہاٹ کیک" بن جاتا۔

"ہاں لو! اس البم میں سب کچھ ہی تو تھا! میں البم کو اکثر سنتی رہتی ہو۔ اچھی اور دل کو چھو لینے والی شاعری' خوبصورت آوازیں... ہر چیز تو موجود ہے اس میں۔"

"تو پھر یہ ہٹ کیوں نہیں ہوا؟"

اس کی ماں نے کہا "کسی ناکامی کی کئی وجوہات ہو سکتی ہیں۔ ممکن ہے یہ تمہارے حوصلے اور ہمت کا امتحان ہو پھر یہ بات بھی تو مدِ نظر رکھو کہ البم کی تشہیر ہی نہیں ہوئی۔"

"چینلز پر تو گیت پیش کیے گئے تھے۔ اس سے بھی فرق نہیں پڑا۔"

"ایک آدھ مرتبہ چینلز پر گیت چلا دینے سے بات نہیں بنتی۔ تم پارٹی آف فائیو میں ہر مہینے گھر گھر دیکھی جا رہی ہو۔ ان لوگوں سے غلطی ہوئی کہ اس زاویے سے تمہارے نام کو منظرِ عام پر نہیں لایا گیا۔ اگر ایسا کیا جاتا تو تمہارا البم شہرت حاصل کرنے میں وقت نہ لیتا لیکن میں سمجھ رہی ہوں کہ "لیٹس گو بینگ" کو ایسے پرندے کی طرح بے آسرا چھوڑ دیا گیا ہے جیسے کسی پرندے کو اس کے گھونسلے سے نکال دیا جاتا ہے یہ سوچے سمجھے بغیر کہ وہ اُڑ بھی سکے گا یا نہیں۔"

ماں کی اس بات میں وزن تھا۔ وہ صورتِ حال کو سمجھ رہی تھی مگر کچھ بھی کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھی۔ البم پسند کیا گیا تھا۔ اس کے معیار پر کسی نے انگلی نہیں اُٹھائی تھی۔ اس کی کارکردگی کسی مقام پر تنقید کا نشانہ نہیں بنی' جو بھی البم کے بارے میں بات کرتا' پُرجوش نظر آتا مگر پھر بھی مالی اعتبار سے البم ناکام رہا تھا۔ یہ تشہیر کا دور ہے' بغیر تشہیر کے کسی شے کی فروخت کا تصور احمقوں کی جنت میں رہنے کے برابر ہے۔ شائقینِ موسیقی کو اس بات کا علم ہی نہیں ہو سکا کہ جینیفر کا اس قدر عمدہ البم میوزک اسٹوروں میں موجود ہے۔ اگر لوگوں کو پتا چلتا تو اس کی فروخت پر ضرور اثر پڑتا۔ یہ جینیفر کی بدقسمتی ہی تھی کہ البم کے حوالے سے نہ تو کوئی تعارفی پروگرام ہوا۔ نہ اس کے انٹرویو نشر ہوئے' نہ اخبارات اور جرائد میں خبریں شائع ہوئیں' یوں البم اسٹوروں کی شیلفوں میں پڑا رہ گیا۔

اس واقعہ کا ایک ہی اطمینان بخش اور مثبت پہلو ہے جس سے جینیفر کو تسکین مل رہی تھی اور وہ یہ تھی کہ اس نوخیز عمری میں بہت اچھا البم تیار کر دیا تھا۔ وہ اس البم کو دیکھ سکتی تھی۔ سن سکتی تھی اور سمجھ سکتی تھی کہ اس نے ایک قابلِ تعریف کام کر دکھایا ہے۔ یہ البم اس کے لیے اس بنا پر اہم تھا کہ وہ اسے ایک بچی کا البم نہیں سمجھتی تھی' بعد میں شوبز کے ایک جریدے کو انٹرویو دیتے ہوئے اس نے کہا تھا "یہ کسی بارہ سالہ بچی کا کام نہیں تھا۔ بلکہ ایک عورت کا البم تھا۔ میں اپنے آپ کو بھرپور اور پُرشباب عورت کے روپ میں دیکھ رہی تھی۔ اپنے اندر محسوس کر رہی تھی کہ میں بڑی ہو گئی ہوں' یہ گیت کوئی بچی یا ناپختہ لڑکی نہیں کہہ سکتی' اس گیت میں پیش کیا جانے والا خیال ایک بھرپور اور جہاندیدہ عورت کے ہی ذہن میں آسکتا ہے۔"

○*○

اس کا البم فروخت نہیں ہوا تھا مگر پھر بھی اٹلانٹک ریکارڈز والے جینیفر کو ناکام نہیں سمجھ رہے تھے۔ حالانکہ اس البم کو خود انہوں نے ہی ڈبویا تھا۔ وہ جانتے تھے کہ ان کی وجہ سے جینیفر کے کیریئر کی ناکامیوں میں ایک اور گمبھیر اضافہ ہو گیا مگر وہ اس ناکامی کو تسلیم کرنے پر تیار نہیں تھے۔ اب البم کو ناکام البم کے بجائے اچھا البم کہہ کر اس کا تذکرہ کیا جا رہا تھا مگر جینیفر کو اس سے کوئی دلچسپی نہیں رہی تھی۔ وہ پارٹی آف فائیو کے ذریعے اپنے ناظرین کا حلقہ بڑھانے میں مصروف تھی۔ اب ٹی وی پر اس کے دیکھنے والوں کی کثیر تعداد کے ساتھ اس کے چاہنے والوں کی بھی بڑی تعداد بڑھتی جا رہی تھی۔ پارٹی آف فائیو ہر گزرتے دن کے ساتھ مقبولیت حاصل کرتا جا رہا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ جینیفر کی شہرت میں بھی اضافہ ہو رہا تھا۔ وہ سوچ رہی تھی کہ اس کامیابی اور شہرت کے کاندھے پر سوار ہو کر اب آیندہ چند دنوں میں اگر اس نے البم جاری کیا تو وہ اٹلانٹک ریکارڈز والوں کی طرح ناکام نہیں ہو گا۔ اب اس کی سمجھ میں اچھی طرح آگیا تھا کہ میوزک کمپنی والوں سے کیا غلطی ہوئی ہے۔ وہ البم کی ریلیز کے موقع پر یہ طے ہی نہیں کر پائے کہ وہ جینیفر کے ساتھ کیا کریں۔ البم کے تمام گیت اور موسیقی بالغ نظر افراد کے لیے تھی مگر البم کور اس قدر سیکسی اور ہیجان انگیز تھا۔ جو ایک طرف تو حقیقت سے بہت دور تھا اور محض نوجوانوں کو ہی اپنی طرف متوجہ کرتا تھا۔ ایسے نوجوانوں کو جن کے نزدیک خوبصورت اور پُرکشش جسم اوّلین ترجیح ہوتی ہے۔ موسیقی سمجھنے کا ذوق اور شوق ان میں کم ہی ہوتا ہے۔ سارہ ریوز کے کردار میں جو ناظرین اسے ٹی وی پر دیکھ رہے تھے وہ بھی اُلجھ کر رہ گئے تھے انہوں نے سارہ ریوز کا جو امیج اپنے ذہن میں بنا لیا تھا' البم کا کور اس امیج کی دھجیاں بکھیر رہا تھا' یہ بات جینیفر کے چاہنے والوں کے لیے پریشان کن تھی۔

○*○

جنوری 1996ء میں پارٹی آف فائیو نے بہترین ڈراما سیریز کا گولڈن گلوب ایوارڈ حاصل کر لیا۔ اب سیریز کے تمام اداکار ایک خاندان کی طرح ایک دوسرے کی خوشیوں اور دکھوں کے علاوہ زندگیوں تک میں شریک ہو چکے تھے۔ جلد ہی اس سیریز میں سیلنگرز کے دادا کے کردار میں کیرل او کونر کو بھی شامل کر لیا گیا۔ کیرل او کونر "آل ان دی فیم" اور "ان دی ہیٹ آف نائٹ" کے ذریعے پہلے ہی ٹی وی ناظرین میں بے پناہ مقبولیت حاصل کر چکا تھا۔ اس کی شمولیت نے سیریز کی شہرت کو مزید بڑھا دیا مگر اس وقت تک سیریز کے ہر کردار کو یہی دھڑکا لگا ہوا تھا کہ کہیں فوکس والے دوسرے سیزن میں سیریز کو منسوخ نہ کر دیں۔ گولڈن گلوب ایوارڈ ملنے کے بعد ناقدین کی زبردست پذیرائی سے ادارے والے مجبور ہو گئے اور جب تیسرے سیزن کی اقساط کی بھی منظوری دے دی گئی تو تمام اداکاروں نے سکھ کا سانس لیا۔ اب جینیفر کی شمولیت کے بعد سیریز نے رومانی انداز اختیار کرنا شروع کر دیا تھا۔ سارہ ریوز کا کردار سیریز کا مقبول ترین اور مستقل کردار بن گیا تھا۔ اسی سیریز کے دوران جینیفر کی ملاقات دوسری مرتبہ جیری لنڈن سے ہوئی۔ پہلی مرتبہ جیری لنڈن نے جینیفر کو اس وقت دیکھا تھا جب وہ دونوں "مال ڈیٹس" نامی ایک فلم کے لیے آڈیشن دے رہے تھے۔ جیری لنڈن کو وہ اس وقت بھی بہت اچھی لگی تھی مگر وہ کچھ مایوس سا ہو گیا تھا کیونکہ جینیفر اس وقت محض پندرہ برس کی تھی اور اب ایک بار پھر وہ دونوں "پارٹی آف فائیو" میں آمنے سامنے تھے۔ جیری لنڈن کو گرمین ہال بروکے کر کردار میں کاسٹ کیا گیا تھا۔ اب سیریز نے تہلکہ مچانا شروع کر دیا تھا۔ بے شمار چینلوں کی موجودگی اور متعدد ڈراما سیریز کے ہنگاموں میں بھی "پارٹی آف فائیو" کے آن ائیر جاتے وقت لوگ گھروں میں ٹی وی کے سامنے سے نہیں ہٹتے تھے۔ کہانی کچھ یوں تھی کہ سارہ ریوز یعنی جینیفر لوہیوٹ' جولیا سیلنگر (نیوی کیمبل) کی دوست ہے' وہ جزوی ملازمت کے طور پر کچھ پیسے کمانے کے لیے سیلنگر خاندان کے ہاں ملازمت شروع کر دیتی ہے۔ بظاہر تو یہ محسوس ہوتا ہے کہ وہ کچھ جیب خرچ ہی لینا چاہتی ہے۔ لیکن اصل بات یہ تھی کہ وہ بیلی پر جی جان سے مرمٹی تھی' حالانکہ ریوز فیملی کے پاس پیسوں کی کمی نہیں تھی۔

پارٹی آف فائیو میں سارہ کا کردار جینیفر کی زندگی کے اصل کردار سے بہت مشابہہ ہے۔ وہ لوگوں کو خوش کرنا چاہتی ہے اور بیلی کو خوش کر کے خوش رہتی ہے۔ اسے بیلی سے شدید محبت تھی مگر بیلی اپنی پہلی محبوبہ کی موت کا صدمہ جھیل رہا تھا۔ اس کی محبوبہ جل (میگن وارڈ) کوکین کے نشے کی عادی تھی اور اس نشے نے اس سے زندگی چھین لی تھی۔ بیلی کو نہیں معلوم تھا کہ سارہ اس پر مرتی ہے۔ جبکہ سارہ کی ساری کوششیں ہی اس نکتے کے گرد گھوم رہی تھیں کہ بیلی اس کے دل کی حالت سے آگاہ ہو جائے اور اس کوشش میں وہ ہر حد سے گزرنے پر تیار تھی۔

جینیفر لو کے پاس اب سیریز کا سب سے بہترین کردار

www.paksociety.com

تھا۔ بہترین اسکرپٹ اور بہترین کہانی تھی۔ ٹیلی ویژن پر مسلسل چھ برس جدوجہد کے بعد آخر وہ اپنی شناخت بنانے میں کامیاب ہو گئی تھی۔ جلد ہی اس پر یہ حقیقت آشکار ہو گئی کہ اب وہ اسٹار بن گئی ہے۔ ایسی اسٹار جسے دیکھ کر لوگ پہچان لیتے ہیں۔

جینیفر کے گھر کے قریب سیون الیون نامی آئسکریم کی دکان تھی' وہ اکثر وہاں سے گزرتے ہوئے آئس کریم لینے لگ جاتی تھی۔ ایک دن وہ آئسکریم لے کر نکل رہی تھی' دو لڑکیاں بھاگتی ہوئی آئیں اور اس کے سامنے آکر کھڑی ہو گئیں۔

جینیفر نے ان کی طرف دیکھا اور اس کے ماتھے پر شکنیں نمودار ہو گئیں' وہ ان دونوں لڑکیوں کو اچھی طرح جانتی تھی۔ یہ وہی لڑکیاں تھیں جنہوں نے اسکول میں اس کی زندگی اجیرن کر رکھی تھی۔ وہ اس پر کوک پھینکتی تھیں۔ راہ چلتے ٹانگ اڑا دیتی تھیں یا لڑکوں کے ساتھ مل کر اس کے کردار کے بارے میں اوچھی باتیں کرتیں اور نازیبا جملے کہتی تھیں۔

جینیفر انہیں یوں سامنے دیکھ کر ڈر گئی۔ ان کے ہاتھ میں آئس کریم تھی' اسے خدشہ تھا کہ وہ آئس کریم اس کے منہ پر مار دیں گی۔ جینیفر نے خوف زدہ ہو کر پیچھے ہٹتے ہوئے کہا "کیا بات ہے؟ تم کیا چاہتی ہو' میرا راستہ کیوں روک لیا؟"

ایک لڑکی آگے بڑھی اور جھجکتے ہوئے بولی "میں ان پچھلی حرکتوں پر نادم ہوں! پارٹی آف فائیو ہمیں بہت پسند ہے۔ آپ کے کردار سے ہم بہت متاثر ہیں۔ آپ کی اداکاری نے ہمیں آپ کا پرستار بنا دیا ہے۔ اگر بُرا نہ مناؤ تو ہمیں آٹوگراف دے دو۔"

جینیفر نے ان دونوں کی طرف دیکھا' اس کا دل بلیوں اُچھلنے لگا۔ یہ اس کا زندگی کا ایک عمدہ لمحہ تھا۔ وہ اپنے ساتھ ہونے والی زیادتیوں کا بدلہ لینا چاہتی تھی۔ اس کی آنکھوں کے سامنے تمام مناظر ایک ایک کر کے گھومنے لگے اور پھر اس نے سخت لہجے میں ہو کھائی سے جواب دیا "مجھے افسوس ہے! میں تم دونوں کو آٹوگراف نہیں دے سکتی' مجھے ضروری کام سے جانا ہے۔ بائے۔ بائے۔"

یہ کہہ کر جینیفر آگے بڑھ گئی۔ وہ اس سے بھی زیادہ سخت کچھ کہنا چاہتی تھی مگر پھر اس نے اپنا ارادہ بدل دیا۔ وہ ان کی سطح تک آنا نہیں چاہتی تھی۔

جینیفر کے لیے یہ تبدیلی بہت اہم تھی' جو لڑکیاں کل تک اس کی دشمن تھیں۔ اب اس کی گرویدہ ہو گئی تھیں۔ شوبز کے شوق اور اس کی مصروفیت کے باعث اس نے اسکول میں برسوں لوگوں کی باتیں سنی تھیں۔ سب اسے کم تر اور گھٹیا لڑکی سمجھتے آئے تھے' مگر اب ثابت ہو گیا تھا کہ وہ معمولی نہیں ہے' اسے سب سے زیادہ خوشی اس بات کی تھی کہ اسے اچھی اداکارہ تسلیم کر لیا گیا تھا اور یہ بات تو وہ خود بھی جانتی تھی کہ وہ گلوکارہ بہت اچھی ہے۔"

○☆○

روزی کمانے کے شوق اور جنون میں جینیفر نے اپنی تعلیم سے منہ موڑا تھا۔ وہ اس وقت اس عمر میں تھی جو جوان لڑکیوں کی آنکھوں میں سپنوں اور خوابوں میں شہزادوں کے علاوہ کچھ نہیں ہوتا۔ اب وہ کام کے ساتھ ساتھ جونیئر ہائی اسکول کی تعلیم بھی حاصل کر رہی تھی مگر اس کی ساری پڑھائی "پارٹی آف فائیو" یا دیگر سیٹس پر ہی ہوتی تھی۔ اس کے ساتھ ایک اور نو عمر اداکارہ لیس چیسرٹ بھی اس کے ساتھ پڑھ رہی تھی۔ اس کے علاوہ پوری سیریز کی کاسٹ میں وہ واحد لڑکی تھی جس کی عمر اٹھارہ برس سے کم تھی۔

باقی لوگ بارہ اور بعض اوقات چودہ پندرہ گھنٹے بھی کام کرتے تھے مگر جینیفر اور لیسی اپنی کم عمری کی وجہ سے قانون کے سامنے مجبور تھیں۔ انہیں صرف ساڑھے دس گھنٹے سیٹ پر گزارنے کی اجازت تھی۔ اس دوران منظر کی عکس بندی کے دوران وہ پڑھتی تھی۔ جینیفر نے عادت بنا لی تھی کہ وہ اپنی ریکارڈنگ سے پہلے سیٹ پر پہنچ جاتی تھی اور اپنی تین گھنٹے کی پڑھائی سیٹ پر ہی مکمل کر لیا کرتی تھی۔ شوٹنگ کے دوران بہت شور شرابا ہوتا ہے۔ ایک ہنگامہ برپا رہتا ہے مگر جینیفر نے ان ہنگاموں اور شور شرابے کے دوران بھی اپنی توجہ کتابوں اور اسباق کی طرف لگانے کی عادت ڈال لی تھی۔ لوگ شوٹنگ سیٹ پر اسے کتابیں پڑھتے اور اسکول کا کام کرتے دیکھتے تو حیرت سے انگلیاں منہ میں داب لیتے۔ یہ ان کے لیے حیرت انگیز منظر تھا۔ یہ نہیں تھا کہ جینیفر کو سیٹ پر ہونے والے ہنسی مذاق میں مزہ نہیں آتا تھا۔ وہ بہت انجوائے کرتی تھی مگر پڑھائی کے دوران بھول جاتی تھی کہ وہ کہاں بیٹھی ہے۔ سیٹ پر آنے والے انہیں کتابوں میں گم دیکھتے تو بولتے "یہ کیسی فنکارہ ہے؟ یہ تو ایب نارمل ہے یا ذہنی مریضہ ہے۔ ان کے اطراف میں زندگی اپنی تمام رعنائیوں کے ساتھ موجود ہے اور یہ کتاب میں گم ہیں۔۔۔!"

جینیفر ان کی کسی بات کا جواب نہ دیتی' جواب دینے کے لیے کتاب پر سے نظر ہٹانا پڑتی ہے' وہ کتاب میں لکھے

گئے لفظوں کو گھول کر پی رہی تھی' اس کے کانوں میں جو جملے انڈیلے جا رہے تھے وہ انہیں دوسرے کان سے نکال دیتی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ زندگی میں کام ہی کچھ نہیں' ٹھیک ہے دولت جینے کے لیے بہت ضروری ہے مگر زندگی تعلیم کے بغیر اُدھوری ہے۔ وہ اُدھوری نہیں رہنا چاہتی تھی۔ پوری اور بھرپور عورت بننا چاہتی تھی۔ اسے اپنے مطلب کا اسکرپٹ اور اپنی مرضی کا ماحول مل گیا تھا۔ تمام اداکار اور ادارہ اس کی بہت مدد کر رہا تھا۔ اس ٹیم میں اچھے اداکاروں کی علاوہ بہت اچھے مکالمے لکھنے والے بھی شامل تھے۔ جینیفر کے لیے بعض اوقات وہ مکالمے بھی تبدیل کر دیے جاتے تھے۔ جن کی ادائیگی جینیفر کے لیے مشکل ہوتی تھی مگر ایک چیز ایسی تھی جس کو تبدیل کرنے پر کوئی تیار نہیں تھا اور وہ تھا ڈرامے میں بیلی اور جینیفر کا کردار۔۔۔ جینیفر اس سیریل میں جو اداکاری کر رہی تھی۔ وہ اس کی نفسیاتی تبدیلیوں کے عین مطابق تھا۔ سارہ اور جینیفر میں کوئی فرق نہیں تھا۔ جینیفر زندگی میں تبدیلیوں کے جس عمل سے گزر رہی تھی عین وہی صورتِ حال سارہ کے کردار کے ساتھ بھی تھی۔ خود جینیفر کو بھی اب یہی محسوس ہونے لگا تھا کہ اس میں اور سارہ میں ذرہ برابر بھی فرق نہیں ہے۔ حقیقی زندگی میں جینیفر کو کسی لڑکے سے لپٹنے' چپٹنے اور قلابازیاں کھانے کی شدت سے طلب محسوس ہونے لگی تھی۔ سیریز میں سارہ ریوز بھی یہی محسوس کر رہی تھی۔ سارہ ریوز اور بیلی ایک دوسرے کی طلب میں دیوانے ہو رہے تھے مگر اپنی اس کیفیت کے اظہار سے خوف کھا رہے تھے۔ جینیفر اپنے تمام جذبات اور اندرونی کیفیات کو سارہ ریوز کے کردار سے باہر لا رہی تھی۔ جب بیلی فٹ بال ٹیم کے ساتھ پریکٹس کے دوران زخمی ہو گیا تو سارہ تڑپ اٹھی' وہ اسے دلاسا دینے اور پُرسکون کرنے کے لیے اس کے قریب تر آ گئی مگر جب اسے پتا چلا کہ اسے دراصل اپنی آنجہانی محبوبہ سمجھتا ہے اس کے وجود میں اپنی محروم شدہ محبت تلاش کرتا ہے۔ اس کی شخصیت میں اپنی پرانی محبوبہ کا عکس دیکھتا ہے۔ تو وہ تڑپ اٹھی اور اس سے قطع تعلق پر مجبور ہو گئی۔ محبت میں ٹھوکر کھانے والی اور دکھ کو اپنے سینے میں پرورش دینے والی لڑکی کا رول اس خوبصورتی سے وہی لڑکی کر سکتی ہے جو حقیقی زندگی میں ایسی کیفیت سے گزر رہی ہو۔

2 اکتوبر 1995ء کی رات تھی۔ جینیفر اپنی سہیلی سے باتیں کر رہی تھی۔ ول فریڈل نام کا ایک نوجوان اور خوبرو لڑکا اسی وقت اس کی سہیلی سے ملنے آیا۔ جینیفر نے اسے دیکھا تو اس کا دل دھڑکنا بھول گیا۔ پہلی مرتبہ وہ کسی لڑکے کو دیکھ کر حواس باختہ ہو گئی۔ اس کی سہیلی جہاندیدہ تھی۔ سمجھ گئی۔ اس کی چہیتی دوست دل ہار بیٹھی ہے' اس نے کہا "لو! یہ میرا دوست ول فریڈل ہے۔ تمہیں اس سے مل کر بہت خوشی ہوگی۔"

"ہیلو!" ول فریڈل نے اس کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

جینیفر نے اپنا نرم و نازک ہاتھ اس کے مضبوط ہاتھ میں دے دیا۔ اس کی گرفت خاصی مضبوط تھی اور ہتھیلی بھی مردانگی سے بھرپور تھی۔ جینیفر کے پورے جسم میں آگ لگ گئی۔

"ہائے! میں لو ہوں۔۔۔ جینیفر لو ہیوٹ!"

"جس قدر اچھی تم خود ہو' نام بھی اتنا ہی اچھا ہے! کیا ہم اکیلے کہیں نہیں مل سکتے؟" اس نے سرگوشی میں کہا "تو جینیفر گھبرا گئی۔ اس نے اپنی سہیلی کی طرف دیکھا تو وہ کندھے اُچکا کر بولی۔

"اس کا فیصلہ تمہیں ہی کرنا ہو گا لو! میں انتظام کر دوں گی۔"

3 اکتوبر کو یعنی اگلے ہی روز' جینیفر اس لڑکے کے ساتھ زندگی کی پہلی بلائنڈ ڈیٹ پر گئی' اس کی سہیلی نے اس ملاقات کا انتظام کر دیا تھا۔ اس کے گھر کا پچھلا دروازہ کھلا چھوڑ دیا گیا تھا۔ رات نو بجے کے بعد لو اپنی امی سے اجازت لے کر اپنی سہیلی سے ملنے کا کہہ کر گھر سے نکل گئی۔ آج اس نے بہترین تراش خراش کا لباس پہنا تھا' میک اپ پر بھی توجہ دی تھی۔ شرٹ کے اوپری بٹن بھی کھول رکھے تھے۔ وہ کم عمر لڑکی نظر آنا نہیں چاہتی تھی' تمام ہتھیاروں سے لیس ہو کر وہ مقررہ دروازے سے گھر میں داخل ہو گئی۔ اس کی سہیلی کے گھر والے کہیں گئے ہوئے تھے۔ پندرہ منٹ انتظار کرانے کے بعد ول فریڈل آ گیا۔ جینیفر لو کی سہیلی کچھ تیار کرنے کا بہانہ بنا کر چلی گئی۔ دونوں کمرے میں اکیلے رہ گئے۔ دونوں پر ہی گھبراہٹ طاری تھی' لو پہلی مرتبہ کسی سے چھپ کر ملنے آئی تھی۔ چند لمحوں تک باوجود کوشش کے وہ دونوں ہی ایک لفظ بھی منہ سے نہ نکال سکے۔ آخر' ول نے جھجک ختم کرنے کے لیے وہی کچھ کیا جو امریکی لڑکے اور لڑکیاں جھجک ختم ہونے کے بعد کرتے ہیں' جینیفر پکے ہوئے پھل کی طرح اس کی بانہوں میں سما گئی۔ کچھ دیر بعد دونوں کی جھجک ختم ہوئی تو باتوں کا دور چلا' ول فریڈل اچھا لڑکا تھا۔ باتوں سے کسی کا بھی دل جیت لینے کا گر جانتا تھا۔ جینیفر اس کی باتوں کی بارش میں بھیگتی چلی گئی اور جب ملاقات ختم ہوئی تو اس کا دل چیخ چیخ کر

www.Paksociety.com

کہہ رہا تھا ”یہی ہے میرا شہزادہ‘ یہی ہے میرا شہزادہ۔۔۔ میں اسی شہزادے کے انتظار میں جوان ہوئی ہوں۔“

مگر جینیفر کے لیے یہ بات کسی روگ سے کم نہ تھی کہ پہلی ملاقات کے بعد دوسری ملاقات کی نوبت نہ آسکی۔ ان دونوں کی عمروں میں فرق تھا۔ وہ جینیفر سے عمر میں تین سال بڑا تھا‘ مگر پھر بھی ملاقات کے دوران اسے بے بی کہہ کر چھیڑتا رہا اور جب پہلی ملاقات کے بعد کئی دن تک ول نے اس سے رابطہ نہیں کیا تو وہ اندر ہی اندر بکھرنے لگی۔ رفتہ رفتہ دو مہینے گزر گئے۔ وہ ول کو دل دے چکی تھی‘ مگر اس کا فون نمبر تک لینا بھول گئی تھی۔ وہ اپنی سہیلی سے بھی نمبر نہیں لینا چاہتی تھی‘ اس طرح اسے پتا چل جاتا کہ ول نے اسے چکھنے کے بعد اس سے جان چھڑالی ہے۔ یہ اس کے لیے ہتک والی بات تھی۔ وہ تو سمجھ رہی تھی کہ اس کے خوابوں کا شہزادہ اسے مل گیا ہے مگر ”پارٹی آف فائیو“ کی سارہ کی طرح وہ بھی اس معاملے میں ناکام ہو گئی تھی۔ اس کا مطلوبہ محبوب اس کی طرف دیکھنے اور اس سے مراسم رکھنے پر بھی تیار نہیں تھا۔ وہ کوشش کے باوجود ول کا خیال اپنے دل سے اور اس کا نام اپنے ذہن سے نہیں نکال سکتی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ کیا کرے؟ کس کو جا کر اپنے دل کا حال سنائے؟ کیسے بتائے کہ اس کا محبوب اس کی طرف نظر بھر کر دیکھنے پر بھی تیار نہیں ہے۔ ایک مرتبہ اپنی جھلک دکھا کر اسے محبت کا غم دے کر اس سے دور ہو گیا ہے۔

جب معاملہ اس کی برداشت سے باہر ہو گیا تو وہ ول کے اپارٹمنٹ پر پہنچ گئی۔ ول کا گھر اس کے گھر کے قریب ہی تھا۔ ول کا اپارٹمنٹ جس بلڈنگ میں تھا اس کے دروازے پر چوکیدار نے اسے روک لیا اور پوچھا ”کہاں جانا چاہتی ہیں آپ؟“

جینیفر نے کہا ”میں ول برینڈل کی دوست ہوں۔ اس سے ملنے آئی ہوں۔ اس کا اپارٹمنٹ کون سا ہے؟“

چوکیدار نے نظر بھر کر اسے دیکھا۔ شاید وہ ٹی وی نہیں دیکھتا تھا۔ اس نے لو کو نہیں پہچانا۔ اسے وہیں بٹھایا اور انٹرکام پر ول کے اپارٹمنٹ میں رابطہ کیا۔ دوسری طرف ول تھا۔ چوکیدار نے ریسیور لو کے ہاتھ میں تھما دیا۔ لو نے دھڑکتے دل کے ساتھ ریسیور کان سے لگایا اور ول کی آواز پہچان کر بولی ”ول! یہ میں ہوں‘ تمہاری لو!“

”اوہ۔۔۔ ہاں۔۔۔ کیسی ہو لو؟ کوئی کام ہے کیا؟“

اس کے لہجے میں اجنبیت تھی‘ لو کا دل کٹ کر رہ گیا۔ اسے توقع نہیں تھی کہ اس سے ہم آغوش ہونے کے بعد بھی کوئی اس سے اس روکھائی سے بات کر سکتا ہے‘ اس کا تو خیال تھا کہ ول اس کی آواز شناخت کرتے ہی اسے اوپر بلا لے گا‘ یا خود ہی نیچے اس سے ملنے آجائے گا۔ اس نے ڈھٹائی کے ساتھ کہا ”ہاں‘ بہت ضروری کام ہے‘ کیا تم نیچے نہیں آؤ گے؟“

ول برینڈل نے بات بناتے ہوئے کہا ”وہ۔۔۔ دراصل! میں گھر میں بہت مصروف تھا۔ اس لیے۔۔۔ ہاں بولو کیا کام ہے؟“

”میں فلم دیکھنا چاہتی ہوں ول!“ لو نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔

”تو دیکھ لو۔۔۔ یہ بات مجھے بتانے کی تو نہیں ہے۔“

”کیا ہو گیا ہے ول تمہیں! میں تمہارے ساتھ فلم دیکھنا چاہتی ہوں۔“

”مگر لو۔۔۔ میں نے بتایا ناکہ میں ذرا۔۔۔“

”میں کچھ نہیں سننا چاہتی‘ میں یہاں باہر تمہارا انتظار کر رہی ہوں‘ تم تیار ہو کر فوراً نیچے آجاؤ‘ ہم دونوں فلم دیکھیں گے اور پھر ذرا آؤٹنگ بھی کریں گے۔۔۔ میں کھلی ہوا میں چہل قدمی بھی کرنا چاہتی ہوں‘ مگر تمہارے ساتھ۔“

یہ کہہ کر اس نے فون رکھ دیا۔ اسے امید تھی کہ ول ضرور نیچے آئے گا۔ وہ نوے کی دہائی میں جوان ہونے والی لڑکی تھی۔ اس دور کی لڑکیوں کا یہی اسٹائل تھا۔ یعنی لڑکیاں جو چاہتی ہیں وہ کر کے ہی دم لیتی ہیں‘ مگر وہ کر بھی کیا سکتی تھی اس کے سوا۔ اب وہ دروازے پر ہی بیٹھ کر ول کا انتظار کر رہی تھی۔ اسے یقین تھا کہ ول کو اس میں ذرا بھی دلچسپی ہو گی تو وہ ضرور آئے گا۔ یا کم از کم انٹرکام پر دوبارہ رابطہ کرے گا۔

مگر ایسا کچھ بھی نہ ہوا۔ وہ بہت دیر تک دروازے پر بیٹھی رہی۔ نہ تو ول آیا‘ نہ اس نے انٹرکام پر رابطہ کیا۔ وہ اکیلی بیٹھی اندر ہی اندر سلگتی رہی۔ دل ہی دل میں کڑھتی رہی۔ سوچتی رہی کہ آخر اس میں کیا کمی ہے؟ کیا وہ پُرکشش اور بھرپور نہیں؟ کیا وہ حسین اور جاذب نظر نہیں؟ وہ ول کے ساتھ کچھ وقت گزار چکی تھی۔ ایسا کچھ وقت جس کے دوران بہت کچھ ہو گیا تھا۔ اس کے اور ول کے درمیان ایک تعلق پیدا ہو گیا تھا۔ ان دونوں میں بہت سی باتیں مشترک تھیں پھر سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ لو کو بہت پسند آیا تھا۔ لڑکی اسی کی ہوتی ہے جس کو وہ پسند کرتی ہے مگر مجبوری یہ تھی کہ وہ اب لو سے ملنا نہیں چاہتا تھا۔ ول نے اس کی طرف سے آنکھیں بند کر لیں تھیں۔ یا تو وہ ول کو پسند نہیں

آئی‘ یا وہ اس کی مقبولیت کی وجہ سے خوف زدہ تھا۔ لو نے خود اس کی طرف قدم بڑھایا تھا۔ اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ میں دیتے وقت ذرا بھی نہیں ہچکچائی تھی‘ مگر لگتا تھا کہ ول نے چند گھنٹوں کی رفاقت سے لطف اندوز ہونے کے بعد اسے مسترد کر دیا ہے۔

وہ ٹوٹے دل اور تھکے قدموں سے واپس گھر آگئی۔ اس کا دل خون کے آنسو رو رہا تھا۔ پہلی مرتبہ جس پر دل آیا تھا۔ اس نے دل دکھایا تھا۔ اس نے تو نہ جانے کیسے کیسے سپنے دیکھ لیے تھے۔ من چاہا لڑکا مشکل سے ملتا ہے۔ اس کا من چاہا لڑکا اس کو چھوڑ کر گزر گیا تھا اور وہ کچھ بھی نہ کر سکی۔ دکھی ہو کر اپنے خول میں بند ہوتی چلی گئی‘ اپنی زندگی کے پہلے دکھ اور پہلی محبت کو کبھی اپنے دل سے نہ نکال پائی۔

رفتہ رفتہ زندگی معمول پر آنے لگی۔ اس نے اپنی ماں کی محبت اور دیکھ بھال کی چھتری تلے خود کو کسی حد تک سنبھال لیا۔ چند ہفتے اس کی یادوں کی نذر ہو گئے۔ اب اسے ہر خوبصورت لڑکے میں ول کا ہی چہرہ نظر آنے لگا تھا۔ ایسے کسی بھی نازک لمحے میں وہ اکیلی ہو جاتی اور اندر ہی اندر سسکنا شروع کر دیتی۔

ول کی طرف سے کوئی جواب نہیں آیا اور پھر اچانک۔۔۔ اسے کسی اور کی طرف سے آؤٹنگ کی پیش کش ہو گئی۔ وہ تھا اداکار جوائے لارنس۔۔۔ وہ اداکار ہی نہیں‘ لو کی طرح گلوکار بھی تھا اور بہت حد تک دل پھینک واقع ہوا تھا۔ اس نے ایک روز لو کو دکھی دیکھ کر اس کے دل پر ہاتھ رکھ دیا۔ وہ نڈھال سی ہو گئی۔ وہ جوائے لارنس کو اچھی طرح جانتی تھی۔ اس کے افیئرز اور اسکینڈلز بھی اس سے پوشیدہ نہیں تھے‘ مگر اس نے اس وقت جینیفر کے آنسو خشک کیے تھے جب وہ اندر ہی اندر سسک رہی تھی۔ رفتہ رفتہ دونوں ایک دوسرے کے قریب آتے چلے گئے۔ دونوں نے ایک دوسرے کا بہت قریب سے مشاہدہ کیا۔ دونوں کو ہی اندازہ ہو گیا کہ ان میں بہت سی باتیں مشترک ہیں۔ لہٰذا لو اپنی پہلی محبت کی ناکامی کا غم بھلانے کے لیے اس کے ساتھ محبت کے عہدوپیمان کرنے میں مصروف ہو گئی۔ یوں اس کے دل کا معاملہ سدھرتا چلا گیا۔

حقیقی زندگی میں وہ ایک ڈگر پر چل رہی تھی۔ دوسری طرف پارٹی آف فائیو‘ امریکی ٹیلی ویژن کی تاریخ میں مقبولیت کے لیے ریکارڈ قائم کر رہا تھا۔ جینیفر لو اب باقاعدہ طور پر پارٹی آف فائیو کی مستقل رکن بن گئی تھی۔ اس کی ذاتی زندگی کی طرح سیریز میں اس کا سارہ والا کردار بھی جذباتی اُتار چڑھاؤ کا شکار ہو رہا تھا۔ اسی بنا پر اس کی شہرت روز بروز بڑھتی ہی چلی جا رہی تھی۔ سارہ کا کردار نہ صرف اس کے کیریئر پر اثر انداز ہو رہا تھا بلکہ اس کی ذاتی زندگی پر بھی بھرپور اثر ڈال رہا تھا۔ یوں محسوس ہو رہا تھا کہ سارہ ریوز اور جینیفر لو ہیوٹ اصل میں ایک ہی شخصیت ہیں۔ اب رسائل و جرائد میں جینیفر کی زندگی کم اور سارہ ریوز کی زندگی زیادہ ڈسکس ہونے لگی تھی۔ جینیفر لو ہیوٹ کی بات ہوتی تو لوگ اس سے سارہ ریوز مراد لیتے تھے اور جب سارہ ریوز کی بات ہوتی تو لو اس سے جینیفر لو مراد لیتی تھی۔ وہ اس کردار میں اس حد تک ڈوب گئی تھی کہ خود کو اور اپنی نجی زندگی کو بھی بھول گئی۔ سیریز کی کہانی اب یوں چل رہی تھی کہ سارہ ریوز نے پوری سیریز کے مستقل اور بنیادی کرداروں کے بجائے خود ہی مرکزی حیثیت اختیار کر لی تھی۔ بیلی سارہ سے کوئی وعدہ نہیں کرنا چاہتا اور اپنے دوست کو اس بات کی اجازت۔۔۔۔۔ دے دیتا ہے کہ وہ سارہ کے ساتھ ”ڈیٹ“ پر جا سکتا ہے‘ جب سارہ اس کے ساتھ ڈیٹ پر گئی تو دونوں کو گھومتے پھرتے اور پرائیویٹ وقت گزارتے دیکھ کر بیلی کے دل کو جھٹکا سا لگا۔ اس سے یہ بات برداشت نہیں ہو سکی۔ اسے سارہ کی طلب شدت سے محسوس ہو رہی تھی‘ مگر وہ اسی طرح سارہ کی طرف بڑھنا نہیں چاہتا جس طرح ول‘ جینیفر کی طلب کے باوجود اس سے رابطہ منقطع کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ جینیفر ان کرداروں میں اس قدر ڈوب چکی تھی کہ وہ سارہ اور بیلی کے کرداروں کو حقیقی سمجھتی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ سارہ اور بیلی دو مختلف جسموں‘ مگر ایک روح کے مالک ہیں۔ بہت سارے پہلوؤں سے وہ ایک دوسرے کا مذکر اور ایک دوسرے کی مونث ہیں۔ یہ محبت کی پُراذیت شکل تھی۔ وہ ایک دوسرے سے شدید محبت کرتے تھے مگر اپنے جذبات ایک دوسرے سے ہی چھپاتے تھے پھر دسمبر 1995ء میں آن ایئر جانے والی قسط میں جب دو کرداروں چارلی اور کرسٹن کی شادی ہوتی ہے تو سارہ اور بیلی ایک دوسرے کا بوسہ لینے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ وہ دونوں ایک دوسرے کے ہو جاتے ہیں۔ اس قسط نے جینیفر لو کی زندگی میں بھونچال پیدا کر دیا۔ اس کے نام نفرت انگیز خطوط کی بھرمار ہو گئی۔ اس قسم کے خطوط اسے اب بھی ملتے تھے۔ جس روز وہ قسط آن ایئر گئی‘ اس سے اگلے دن آنے والی ڈاک میں جینیفر کے نام کئی خطوط تھے جو زیادہ تر اس جملے سے شروع ہو رہے تھے یہ سارہ عرف جینیفر ہمیں تم سے شدید نفرت ہے مگر ہر خط کے آخر میں اس قسم کے جملے ضرور